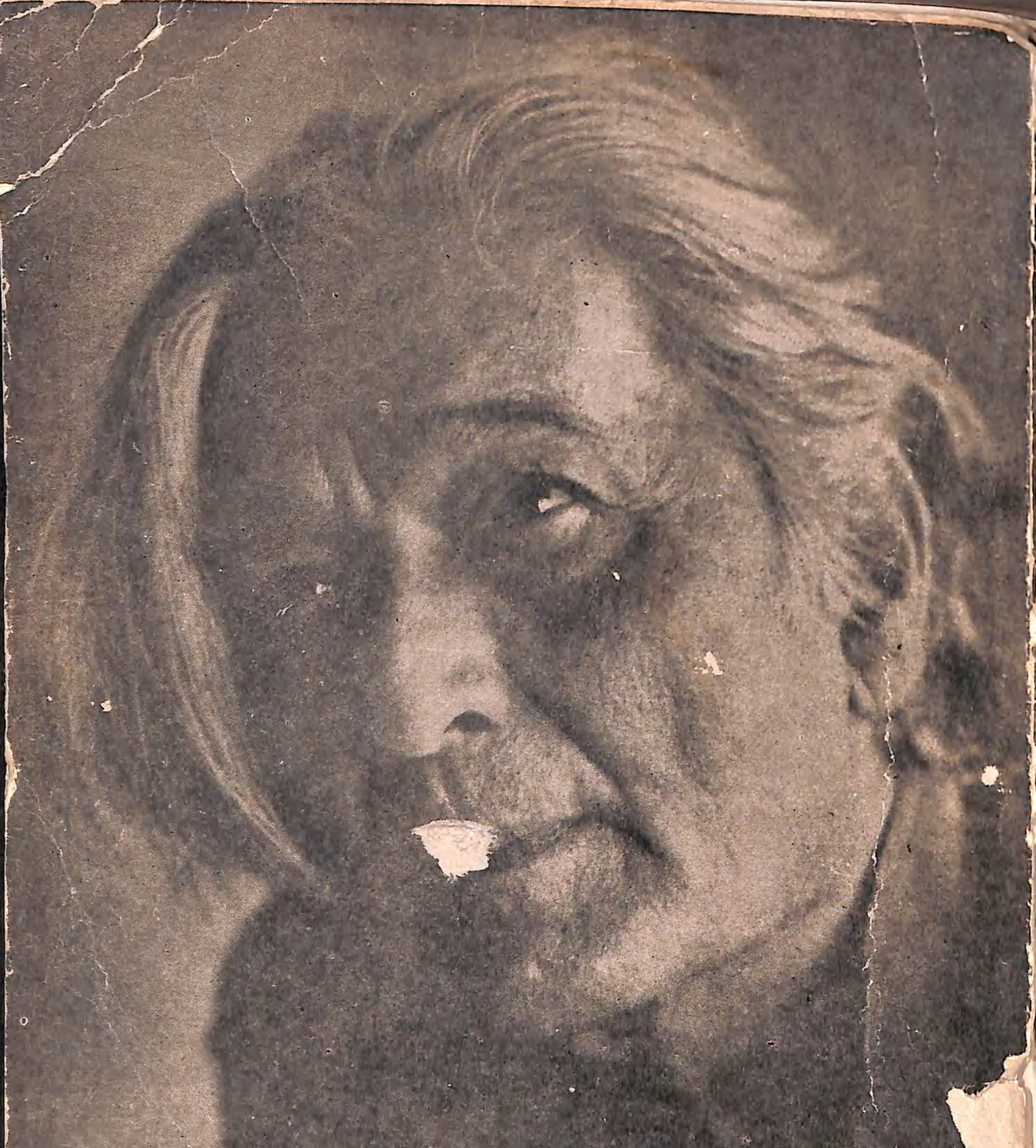


فن اور شخصیت

جاں نثار اختر نمبر

جاں نثار اختر

کے لئے

محبت اور خلوص کے ساتھ

جنہوں نے

عام آدمی کی تکلیف اور خوب صورتی کو
ہندی اور اُردو میں تقسیم نہیں کیا۔

کملیشور

فن اور

میں

جاں نثار اختر

کا

مدّاح ہوں

سورج سنیم

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

۱۔ مقامِ اشاعت : ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاسنہ روڈ۔ دادر۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۴

۲۔ میعادِ اشاعت : ششماہی

۳۔ پرنٹر، پبلیشر، : صابر دت

ایڈیٹر، مالک : صابر دت

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاسنہ روڈ۔ دادر۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۴

میں صابر دت، مالک 'فن اور شخصیت' اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں

دستخط

(صابر دت) پبلیشر

جاں نثار اختر

نمبر

مُدیر:
صابر دت

نگراں:
قرۃ العین حیدر

بیادگار مہندر ناتھ (مرحوم)

جاں نثار اختر نمبر

رسالہ

فن اور شخصیت

بمبئی

(ششماہی)

جلد (۱) مارچ ۱۹۷۶ء شمارہ (3 - 2)

مُدیرِ مُنتظم

احسن خان

مُدیراتِ اعزازی

عصمت چغتائی - خلیق انجم

مُعاونِ مُدیر

وید راہی

مُدیر

صابردت

موجودہ شمارہ

25 روپے

عام شمارہ 10 روپے

تقسیم کار:

علوی بک ڈپو

محمد علی روڈ - بمبئی ۳

اردو گھر

روز ایوینیو، نئی دہلی

مکتبۂ شاہراہ

جامع مسجد اردو بازار دہلی ۶

فن اور فنکار

۴۹ محمد علی روڈ - بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فن اور شخصیت ہر سال آپ کی خدمت میں دو شاہکار پیش کیا کریگا۔

ہر اُس فنکار اور **شخصیت** کے بارے میں جس نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوّری یا زندگی کے کسی اہم شعبہ میں انسانیت کی ترقی اور عوام کی بہبودی کے لئے کوئی کارنامہ کیا ہوگا۔

سالنامہ

ادارہ

جاں نثار اختر نمبر

ترتیب

کوئی مضمون بلا اجازت شائع نہ کیا جائے

پیام

صبحِ نو کا شیدائی

ڈیر صابرؔ!

تم میری شخصیت اور شاعری پر اپنے رسالے کا خصوصی نمبر شائع کرنا چاہتے ہو۔ اگر میں کہوں کہ تمہاری یہ تجویز تمہاری محبت اور شرافت کے علاوہ ادبی سوجھ بوجھ کا بھی پتہ دیتی ہے، تو کچھ غلط نہ ہوگا بہر حال میں چاہتا ہوں گا کہ اس نمبر میں جہاں میرے ادیب دوستوں کے مضامین ہوں گے، وہاں مخالف نظریہ رکھنے والوں کے مضامین بھی ہوں، ہر ایک کو کھل کر بات کہنے کی آزادی ہو ورنہ یہ "نمبر" قصیدہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور بالغ تحقیق سامنے نہ آسکے گی۔ میں جانتا ہوں کہ خصوصی نمبر آج تک "قصیدے" ہی نکلے ہیں یا نکلوائے گئے ہیں جو صرف ردّی کی ٹوکری کے لائق ہوتے ہیں۔ میرے نمبر میں اگر میرے خلاف بھی کچھ لکھا جائے تو ضرور شائع کرو۔ فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کسی نکتہ پر کوئی مخالفت آئندہ کے لئے مجھے بہتر راستہ سجھا سکے۔ اپنے خلاف بھی سننے کا حوصلہ انسان میں ہونا چاہیئے۔ اور وہ مجھ میں ہے:

"اپنے خلاف بات سنیں اور خوش رہیں"
ذہنوں میں وہ طہارت و وسعت کہاں ہے جوشؔ"

البتہ اس کا خیال ضرور رکھنا کہ مجھ پر لکھے گئے مضامین میں جہاں دوسروں کا تذکرہ آنا لازمی ہے، کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے کسی کے جذبات مجروح ہوں۔ کچھ پاسداریاں بھی ضروری ہوتی ہیں۔

"آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں"

تمہارا
جاں نثار اختر

۱۴ر نومبر ۷۵ء

جائزے

آئینہ خانے میں

غزل کا مزاج داں

گھر آنگن کا سوامی

پیام

مہندر ناتھ یادگار نمبر پرائیں

صابر دت مالک، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ سے چھپوا کر ۱۵ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاستہ روڈ دادر بمبئی ۱۴ سے شائع کیا۔

عالی جناب عزّت مآب فخرالدین علی احمد صاحب

صدر جمہوریۂ ہند

پیغام

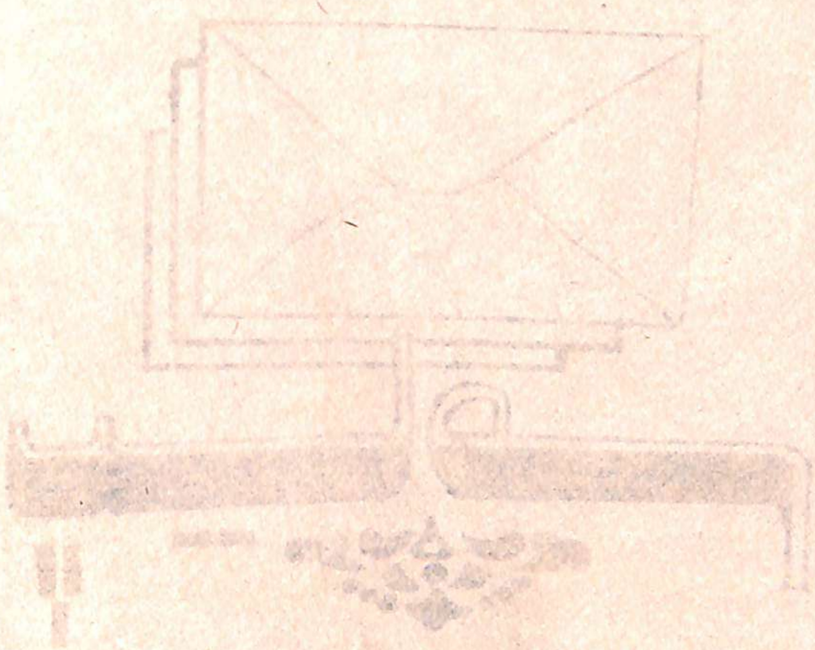
نئی دھلی

۷۔ اپریل سنہ ۱۹۷۶ء

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رسالہ "فن اور شخصیت بمبئی" اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ صحت مند اقدار کو فروغ دینے میں لگا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہندر ناتھ یادگار نمبر نکالنے کے بعد اب "جان نثار اختر نمبر" ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں شائع کر رہا ہے۔ جان نثار اختر صاحب کی شخصیت ادبی دنیا کی جانی مانی ہے۔ ان کا لب و لہجہ سنجیدہ اور انداز بیان انوکھا ہے۔ جو بات کہتے ہیں اس میں ان کے مشاہدہ اور تجربہ کو کافی دخل ہوتا ہے۔

میں جان نثار اختر نمبر کے لئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں اور رسالہ "غن اور شخصیت" کی کامیابی کی تمنا کرتا ہوں۔

فخرالدین



شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم

جمہوریۂ ہند

انفارمیشن ایڈوائزر ۔ نئی دہلی
۱۵ ارمئی ۱۹۷۶ء

جناب والا

وزیر اعظم آپ کے خط کا شکریہ ادا کرتی ہیں ۔ انہیں یہ جان کر مسرت ہے کہ اردو میگزین " فن اور شخصیت " ایک خصوصی نمبر نکال رہا ہے، جو شری جاں نثار اختر کی شاعری پر محمول ہے ۔ وہ اپنی نیک خواہشات رسالے کی کامیابی کے لئے بھیجتی ہیں ۔

آپ کا مخلص
ایچ ۔ وائی ۔ شاردا پرشاد

(انگریزی سے ترجمہ)

محترمہ بیگم عابدہ احمد صاحبہ دام اقبالہا

پیغام

راشٹرپتی بھون ۔ نئی دہلی

۸۔ اپریل سنہ ۱۹۷۶ء

"مجھے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی "جاں نثار اختر نمبر" شائع کر رہا ہے۔

جاں نثار اختر صاحب عرصہ سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب بیان کا ایک اپنا مقام ہے۔

میں "جاں نثار اختر نمبر" کے اجرا کے لئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتی ہوں۔

عابدہ احمد

اُن کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی زندگی اور اُن کی شاعری کو ایک دوسرے سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ویسے ہی اُن کی شاعری اُن کی زندگی کے فلسفہ کا مظہر ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء سے قبل شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی جماعت نکلی جس نے اپنی تصانیف وکلام کا اثر پورے ہندوستان پر چھوڑا۔ جاں نثار اختر اُس جماعت میں الگ سے دکھائی پڑتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کا 'جاں نثار اختر نمبر' نہ صرف اُن کی بلکہ اُن کے اس پورے ماحول کی سچی تصویر پیش کرے گا۔

آپ کا مخلص

نرائن دت تواری

عالی جناب شیخ محمد عبداللہ ——— وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

مجھے یہ جان کر بہت خوشی حاصل ہوئی ہے کہ رسالہ "فن اور شخصیت" جاں نثار اختر نمبر شائع کر رہا ہے۔ جاں نثار اختر کی شخصیت اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کی اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں جس نے اردو شاعری کو جاگیردارانہ طرز فکر کی حد بندیوں سے نکال کر کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کا غماز بنا دیا تھا۔ اور انہیں طبقاتی کشمکش اور سماجی استحصال کے مقابلے کے لئے ایک نیا شعور دیا تھا۔ جاں نثار اختر اپنے اشتراکی نظریات کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے کلاسیکی حسن کو بھی سنوارتے رہے ہیں اور ان کی شاعری غم جاناں اور غم زندگی کے اہم تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ "فن اور شخصیت" کا مجوزہ نمبر جاں نثار اختر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو عوام کے سامنے لانے میں معاون ثابت ہوگا اور میں اس کوشش کے لئے مدیران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں

شیخ محمد عبداللہ

کے۔ ایل۔ پوسوال ——— وزیر ریل و رسائل ہریانہ

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ جریدہ 'فن و شخصیت' کا آئندہ شمارہ 'جاں نثار اختر' نمبر ہوگا۔ شاعر قوم کے معمار کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیوں سے شعرائے کرام کے ولولہ انگیز اور حیات آفریں نغمے قوموں کو بیدار کرتے آئے ہیں۔ حضرت جاں نثار اختر صاحب کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ایک ایسے شاعر ہیں جس نے وقت کے تقاضوں کو اپنی حساس نظروں سے دیکھا اور اپنے ذوق وجدان سے اُن کا احاطہ کیا۔ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور عوام کے احساسات میں حرکت پیدا کرنے میں آپ نے گرانقدر حصہ لیا ہے۔ اختر صاحب نے اردو شاعری کے فروغ کے لئے جو بیش قیمت خدمات سرانجام دی ہیں ان کا احترام اور اعتراف فی الواقع ایک مستحسن اقدام ہے۔

کنہیا لال پوسوال

عالی جناب علی یاور جنگ صاحب گورنر مہاراشٹر

مکرمی ۔

آپ کے خط مورخہ ۳ / مارچ کا شکریہ ۔

جاں نثار اختر صاحب کی شان میں آپ جو خصوصی نمبر "فن اور شخصیت" کا شائع کرنا چاہتے ہیں اس پر میں آپ کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتا ، اس لئے کہ اختر صاحب کا اردو ادب میں خاص رتبہ ہے اور وہ دونوں اعتبار سے یعنی فن اور شخصیت بڑی اعلیٰ ہستی ہیں ۔ ان کا چنا ؤ کر کے آپ نے اپنے رسالہ کو اور بھی قابل قدر بنا دیا اور مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والے اس خصوصی نمبر کا بڑے شوق سے انتظار کریں گے ۔ میں یہ پیغام مخلصانہ طور سے اور بلا قیمت بھیج رہا ہوں البتہ اس امید کا اظہار ضروری ہے کہ خصوصی نمبر کی تقسیم کے وقت آپ مجھے نہیں بھولیں گے ۔

عالی جناب شنکر راؤ چوہان ــــــــ وزیر اعلیٰ مہاراشٹر

محترم

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ اپنے رسالہ "فن اور شخصیت" کا جان نثار اختر نمبر شائع کر رہے ہیں ۔ جاں نثار اختر اپنے انداز کے ایک انوکھے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں اپنا منفرد مقام بنا لیا ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ آج بھی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور اپنی شاعری میں نئے تجربے کر رہے ہیں ۔

اردو ایک خوبصورت اور زندہ زبان ہے ۔ اس کے رسائل و جرائد کو بھی اتنا ہی خوبصورت اور جاندار ہونا چاہئے ۔ میری دعا ہے کہ آپ اس معیار پر پورے اتریں ۔

شنکر راؤ چوہان

عالی جناب نرائن دت تیواری ــــــــ وزیر اعلیٰ اتر پردیش

مکرمی صابر دت صاحب

آداب عرض

مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ رسالہ 'فن اور شخصیت' ، بمبئی کی جانب سے اردو کے محبوب شاعر جناب جاں نثار اختر کے اعزاز میں ایک مخصوص شمارہ 'جاں نثار اختر نمبر' عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے ۔

جناب جاں نثار اختر ایک ترقی پسند فکر کے حامل ہیں اور اردو شاعری کی دنیا میں ایک عرصہ سے جانے مانے جا رہے ہیں ۔ انھوں نے نہ صرف اچھا لکھا ہے بلکہ بہت لکھا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو اکثر بڑے شاعروں میں کم دیکھی جاتی ہے ۔ ان کا نظریہ جہاں ایک طرف پوری دنیا کو سمیٹنا تھا وہاں دوسری طرف چھوٹے چھوٹے لوگوں کے دکھ درد کو گہرائی سے سمجھ سکتے تھے اور پوری شدت سے محسوس کرتے تھے ۔ زندگی کو دیکھنے کا ان کا اپنا ایک خاص انداز ہے جو

جناب رشید احمد صدیقی ________ علی گڑھ

مکرمی ۔ تسلیم ۔ گرامی نامہ ملا ۔ جاں نثار اختر نمبر نکالنے کی خوش خبری موصول ہوئی ۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار کی خدمت میں تہنیت پیش کرتا ہوں کہ آپ اتنا اچھا کام ایسی خوشی اور بلند حوصلگی سے انجام دینا چاہتے ہیں ۔

جاں نثار اختر صاحب کی خدمت میں سلام شوق پہنچا دیئے ۔

مخلص :- رشید احمد

مولانا عبدالماجد دریا بادی ________ دریاآباد

جاں نثار کے والد جناب مضطر خیر آبادی میرے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے ۔ جاں نثار کو " فنِ تغزل " اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے ۔ قصباتی شریف زادوں کے ہاں اخلاق کے پہاڑ پھٹ پڑنے کو تیار ہیں ۔ یہ " شخصیت " ہوئی ۔

کاش اپنی دید کچھ بھی ہوتی کہ بصارت اور بصیرت دونوں سے کچھ کام لے سکتا ۔

دعاگو :- عبدالماجد (دریاآبادی)

مولانا عرشی رام پوری ________ رام پور

گرامی نامہ ملا ۔ بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے اہم شخصیات پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے ۔ یہ روایت اگر آپ قائم رکھ سکے تو بڑی صحت مند روایت ہوگی ۔ اور اس سے آج کا قاری نہیں آئندہ نسلیں بھی استفادہ کر سکیں گی ۔

جاں نثار اختر ترقی پسند تحریک کے ایک قابل قدر نمائندے ہیں ۔ ادھر چند برسوں سے انھوں نے کلاسیکی شاعری کی جو قلم اپنے کلام میں لگائی ہے ۔ اس نے ان کے ہاں کچھ اور بھی لطف پیدا کر دیا ہے ۔

میں آپ کو اس اقدام پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ اختر صاحب کی شخصیت اور فن پر بھی ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں ۔ میری دعا ہے کہ آپ کی کاوشیں بارآور ہوں اور انھیں قبول عام بھی حاصل ہو ۔

زیادہ دعا	عرشی

لال چند پرارتھی

وزیر زراعت و صنعت و حرفت ہماچل پردیش

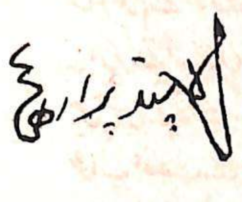
جناب جاں نثار اختر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ گذشتہ چالیس برس سے بھی زیادہ عرصے سے اردو ادب کی ترقی پسند تحریک میں ان کا نام پیش پیش رہا ہے۔ ان کی شاعری آج بھی مقبولِ عام ہے جو کہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں سچائی، لطافت اور دلوں کو چھو لینے کی طاقت ہے۔ اختر صاحب نے اپنی نظریاتی شاعری کی مدد سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری ہمارے ملک کی سیکولر روایات کی آئینہ دار ہے۔ جس کی ایک مثال یہ شعر ہے۔

وحدت کی اسی چنگاری سے دل موم ہوا ہے پتھر کا
اجمیر کی جامع مسجد میں خود عکس ہے جینی مندر کا

اختر صاحب کی شاعری فن برائے فن نہیں، فن برائے زندگی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ ان کی بعض منظومات میں زندگی کے لئے ایک پیغام ہے۔ زندگی کے مسائل سے جدوجہد کرنے کی ترغیب ہے۔ جس کا ایک ثبوت ان کی نظم کا یہ بند ہے۔

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شے کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا ہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو
ہر جہد ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

جناب جاں نثار اختر نظریاتی شاعر ہونے کے ساتھ ایک رومانی شاعر بھی ہیں۔ اور ان کی رومانی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ اور رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن یہ شاعری حقیقت پسندی سے کٹ کر نہیں چلتی۔ اس میں شاعرانہ صداقت ہے۔ "آخری ملاقات"، "سراپا"، "مہکتی ہوئی رات"، "خاکِ دل"، "خاموش آواز"، "تصور"، "بنارس کا سفر" جیسی نظمیں اُن کی ان شاعرانہ خصوصیات کی حامل ہیں۔



تم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہوتا تو میں پوچھتا کہ کہو کیا حال ہے۔ وہ اپنا ایک پٹھان دوست ہے نا ارے وہی عزیز قیسی۔ اس نے کیا خوب کہا ہے ؎

مر جاؤ کوئی نام و نسب پوچھتا نہیں
مُردوں کے سلسلہ میں بہت مہرباں ہے شہر

اب تم نے ایک "زندے" کا انتخاب کیا ہے۔ یہاں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہوگا۔ اور "زندہ" بھی کیسا زندہ کہ جس کی شاعری نے نیا جنم لیا ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ مجھے سوچ سوچ کے مزا آ رہا ہے کہ اپنے مخنی سے پنجابی میاں صابر دت پر چاروں طرف سے بے بھاؤ کی پڑ رہی ہے

وہ ادھر اُدھر بھاگ کر کاٹے کاٹ رہے ہیں اور نکالو نمبر۔

اور پھر یہ اختر بھائی بھی خوب ہیں اپنے۔ اب بتاؤ پہلے تو ماتم کیا کہ "شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے" اب جو اس کی پرائشچت کرنے اس کے تو ساتھ والوں کو بھی نہ چھوڑا۔ اور ہم نئی نسل والوں کا بھی بھٹا بٹھال دیا۔ کچھ ہمارے کہنے کے لئے چھوڑا بھی نہیں۔ وہ تو ہمارے ہاتھ سے نئی غزل کا پرچم چھین رہے ہیں اور اشارہ یہ کہ تم ہم ہی سے کہہ رہے ہو کہ کچھ لکھیں۔

میں ہر چند نہیں ماننے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ماننا پڑتا ہے کہ جاں نثار اختر آج فراق کے بعد ہمارے ہندوستان جنت نشان کے سب سے بڑھیا شاعر ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ ابھی ان کی "کمرشل مارکٹ" نہیں ہے۔ تو بیٹا پکچر بنالو، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ پرنٹ اٹھانے کے لالے پڑ جائیں۔ میری مانو تو دو چار موٹے ڈسٹری بیوٹروں کو پھانس لو۔

ویسے "تسی تے اپنے یار ہو، جیڑا کوئی تواہوں دو چار جوتے مارے گا تو اسی دی اپنا سرا گے کر داں گے"

تمہارا خیر اندیش (عاقبت اندیش)			حسن کمال

اوپیندر ناتھ اشک ———— الہ آباد

جاں نثار اختر بہت پیارا انسان ہے۔
اس سے پیارا شاعر ہے۔

اوپیندر ناتھ اشک

وشنو پربھاکر ———— نئی دہلی

سادگی اور گہرائی ایک ساتھ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ شاعر کے روپ میں اور انسان کے روپ میں بھی۔ جناب جاں نثار اختر صاحب کو یہ دونوں گن کافی بڑی ماترا (مقدار) میں پراپت (حاصل) ہیں۔

شری کنہیا لال کپور ــــــــــ موگا (پنجاب)

جاں نثار اختر غزل پر اور غزل ان پر نثار ہے۔ وہ اتنے بڑے شاعر ہیں کہ کوشش کے باوجود فلم انڈسٹری بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ وہ غزلیں کہتے ہیں یا خود ایک غزل ہیں۔

جناب کیفی اعظمی ــــــــــ بمبئی

برادر صابر دت 'فن اور شخصیت' کا مہندر ناتھ نمبر دیکھ کے میں نے سوچا تھا کہ اپنے فن اور شخصیت پر آپ سے ایسا شاندار نمبر نکلوانے کے لئے نہ جانے کتنے ادیبوں کو مرنا پڑے گا۔ لیکن اس اعلان سے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ جناب جاں نثار اختر کے فن اور شخصیت پر ایک شاندار نمبر شائع کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمارے یہاں کی روایتی مردہ پرستی پر یقین نہیں رکھتے۔ اس کے لئے میری دلی مبارک باد قبول کیجئے۔

جاں نثار اختر صاحب کی شاعری کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے اس کی مستحق ہے کہ ہماری تنقید اس کی طرف ایک سنجیدہ اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے اور ہمارے ادب میں اس کا صحیح مقام متعین کرے۔

آج اختر صاحب کے گرد اُن کے جو مداح جمع ہوئے ہیں وہ طرح طرح کے انفعال کا شکار نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ شرمندگی ہے کہ وہ کیوں بہت دنوں تک اختر صاحب کے مداح نہ ہو سکے۔ کچھ حضرات اس بات پر نادم ہیں کہ کیوں اختر صاحب بہت دنوں تک ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ رہے۔

شکر ہے کہ مجھے اس طرح کی کوئی شرمندگی نہیں۔ میں اختر صاحب کا پہلے بھی مداح تھا اور آج بھی مداح ہوں۔ مجھے اُن کی نئی غزلیں بھی پسند ہیں اور بہت سی پرانی نظمیں بھی، میں ان کے نئے لہجے کو اُن کے پرانے لہجے کی ترقی سمجھتا ہوں انحراف نہیں۔

'فن اور شخصیت' کے جاں نثار اختر نمبر کا مجھے بے حد انتظار رہے۔ کوشش کروں گا کہ میں اس کا پہلا خریدار بن سکوں۔ ان چند سطور کو اس کا آرڈر سمجھئے اور کچھ نہیں۔

کیفی اعظمی

جناب حسن کمال ــــــــــ مدیر 'اردو بلٹز' بمبئی

ڈیئر صابر دت!

تم نے مہندر ناتھ کا بہت خوبصورت نمبر نکالا۔ تمہیں بہت سوں نے مبارکباد دی ہوگی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ شاندار نمبر تو کچھ اس وجہ سے بھی آسانی سے نکل گیا کہ بات ایک "مرحوم" کی تھی۔ اگر ان کی زندگی میں

اور ہر دلعزیز رومانی شاعر جاں نثار اختر پر خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

اختر بھائی نے اپنی کم و بیش چالیس برس کی شاعرانہ زندگی میں ہمیشہ اور ہر آزمائشی گھڑی میں ترقی پسندی اور امن پسندی کو طاقت دی ہے ان کی شاعری رومانیت اور حقیقت پسندی کا ایسا اچھوتا سنگم ہے جو مجاز اور فیض کے علاوہ دوسرے شاعروں کے پاس بہت کم ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اختر بھائی پرانی پیڑھی کے ساتھی ہوتے ہوئے بھی نئی پیڑھی میں یکساں مقبول ہیں۔

نند کشور وکرم

(ہندی)

امرتا پریتم ——————— نئی دہلی

جتنی بار بھی جاں نثار اختر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لگا جتنی گہرائی اُن کے قلم میں ہے اتنی ہی ان کی شخصیت میں ہے۔ ایک بار وہ اور ساحر بمبئی سے دلّی کا سفر کر رہے تھے کہ گاڑی میں اُن سے اتفاقاً میری ملاقات ہو گئی۔ رات بہت ٹھنڈی تھی اور جاں نثار اختر کے سوا کسی کے پاس کوئی گرم کپڑا نہ تھا اور انھوں نے اپنا خوبصورت لحاف مجھے اور ساحر کو دیدیا۔ جو ہم نے آدھا آدھا اوڑھ لیا۔ اور وہ خود کنارے کی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھ گئے۔ لگا کہ ایک دوست کے دل کی گرمائش تھی جو ہمارے گرد تمام رات لپٹی رہی۔۔۔۔۔

میں سوچتی ہوں —— اردو ادب میں بھی اُن کی شعر و شاعری اس آگ کی طرح ہے جس پہ کئی دل والے لوگوں نے اپنے ہاتھ سینکے ہوں گے۔

امرتا پریتم

(پنجابی)

پرمیندر متر ——————— کلکتہ

یقیناً یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ موجودہ صدی کی کئی دہائیوں سے نئی طرز کے باکمال شاعروں کی آواز سے فضا گونج رہی ہے۔ جناب جاں نثار اختر ان نمایاں شاعروں کے ہراول دستہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی شعلہ نوائی سے انصاف اور آزادی کی جدوجہد میں زندگی کے ہر محاذ پر لاکھوں اردو داں عوام کے دلوں میں گرمی اور ذہن کو روشنی ملی ہے۔ ان کی شاعری کا لب و لہجہ نہایت سہل اور نرم ہے مگر اس کی تقلید نہیں کی جا سکتی۔ جاں نثار کی لازوال شاعری سے ہندستانی ادب کا خزانہ مالا مال ہوا ہے۔

پرمیندر متر

(بنگلہ)

شری رام پنڈت ——————— اورنگ آباد

محترم جاں نثار اختر!

آپ کی شاعری اور شخصیت پر جو خصوصی نمبر شائع ہو رہا ہے۔ میں اس کے لئے مبارکباد

جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
جس کو اس درجہ چاہتا ہوں میں
اُس میں تیری سی کوئی بات نہیں

(جاں نثار اختر)

(ہندی)　　　　وشنو پربھاکر

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی ——— ایڈیٹر ہفتہ وار دھرم یگ، بمبئی

برسوں پہلے میں نے جاں نثار کی کچھ نظمیں پڑھیں جن میں 'صفیہ کے نام' جو انہوں نے اپنی محبوب بیوی کی یاد میں لکھی تھی بے حد پسند آئی۔ اس نظم اور جاں نثار کی دوسری نظموں کی سادگی اور گھریلو پن نے میرے من کو بہت چھوا۔ اس کے بعد میں ان کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا رہا ہوں۔

وہ سادگی اور گھریلو پن جو ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ اب ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

ان کی شخصیت اور شاعری پر آپ "فن اور شخصیت" کا ایک ضخیم نمبر نکال رہے ہیں، جاں نثار اس کے صحیح معنوں میں حقدار ہیں۔

میری ان کے لئے نیک خواہشات قبول کیجئے۔

(ہندی)　　　　دھرم ویر بھارتی

اروند کمار ——— ایڈیٹر مادھوری، بمبئی

دلوں کے نرم گوشوں کو چھو لینے والی شاعری کے خالق اور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر پر آپ "فن اور شخصیت" کا خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ اسی سے اپنا پرانا صابر دت کہیں اور اپنا ہو جاتا ہے کیونکہ جاں نثار کا وہی کلام ساری جنتا کا ہے، جو اُن کا بالکل اپنا، بالکل انوکھا ہے۔

گرچہ جاں نثار صاحب سے ملنے کا موقع مجھ کو بہت کم ملا مگر جب بھی ملا ایسا لگا کہ سامنا ایک ایسے شخص سے ہوا ہے جو اوپر کم اور اندر زیادہ ہے۔ ان کی شاعری اور فلمی گیتوں میں ان کی اندر کی شخصیت صاف جھلکتی ہے۔ ان کو پڑھنے اور سننے والا جاں نثار کے اندر کو پہچان سکتا ہے۔

(ہندی)　　　　اروند کمار

نند کشور نوٹیال ——— ایڈیٹر ہندی بلٹز، بمبئی

خوشی کی بات ہے کہ "فن اور شخصیت" اپنے کامیاب مہندر ناتھ یادگار نمبر کے بعد اردو کے مشہور

<u>میرا صفحہ</u>

پڑھنے والوں کے نام

آپ نے مہندر ناتھ یادگار نمبر خریدا اور پڑھا اور اس کی بیحد تعریف کی۔ اس کا میں شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ کو نمبر کی اتنی زیادہ تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ زیادہ تعریف کرنے سے آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا دماغ خراب ہو جائے۔ ابھی تو میں نے کام کی ابتدا کی ہے اور میری منزل کافی دور ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ "فن اور شخصیت" کے دوسرے شمارے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ کیونکہ میرے چند دوست یا بزرگ یا اس شخصیت کے کرم فرماؤں کی (جن پر میں یہ نمبر نکال رہا ہوں) مہربانیوں سے اس ادبی کام میں مجھے قدم قدم پر آہنی دیواروں سے ٹکرانا پڑا۔ ورنہ اس تاریخی دستاویز کو بہت پہلے آپ تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جس کا ہر ادیب اور شاعر اپنے آپ کو عظیم اور اپنی ہر تخلیق کو شاہکار کہتا ہے۔ مزید برآں اردو کا ہر مدیر کہتا ہے کہ زبان مر رہی ہے۔ پڑھنے والے نہیں ہیں۔

مگر یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ جو زبان عوام کے دلوں کی دھڑکن اور خیالات کا وسیلہ اظہار بنی ہو اس کا رسم خط وقت سے متاثر ہو جائے تو ہو جائے مگر وہ زبان مر نہیں سکتی۔ اور بحیثیت ایک نو وارد پبلیشر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر اردو کی کوئی سنجیدہ کتاب سلیقہ سے شائع کی جائے تو اسے خرید کر پڑھنے والوں کی اس ملک میں اس وقت بھی کمی نہیں۔

جدید اردو کی تاریخ میں ایک دور ایسا آ چکا ہے جب پچیس تیس قلم کاروں کا ایک گروہ باڑھ کی طرح آیا اور سماج کی متعدد اہم جگہوں پر چھا گیا۔ ان میں شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد اور صحافی سب ہی شامل تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر طرف انہی لوگوں کا سکہ چلا۔

ان ادیبوں اور شاعروں نے "نیا قانون"، "ان داتا"، "چوتھی کا جوڑا"، "اور انسان مر گیا"، "ایک چادر میلی سی"، "آگ کا دریا"، "آوارہ"، "تاج محل"، "پتھر کی دیوار"، "ایک لڑکا" اور "خاکِ دل" جیسی تخلیقات پیش کر کے باری باری یا ایک ساتھ اپنا رنگ جمایا ـــــ اسی قافلے کا ایک مسافر جو بقول فکر تونسوی سنت کوی ہے اور بقول وید راہی دانشور فقیر، اور جس نے اردو شاعری کو خاموش آواز اور خاکِ دل جیسے خوبصورت مرثیے دیئے آخری لمحہ اور آخری ملاقات جیسی نظمیں دیں، گھریلو عورت کو شاعری کا موضوع بنایا، غزل کے لب و لہجہ کو تازگی بخشی، مجھے یقین ہے میری طرح اس شخصیت سے آپ بھی آشنا ہوں گے ـــــ اس شخصیت کا نام ہے جاں نثار اختر۔

میں نے بڑے پیار اور محنت سے ان کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کیا ہے۔ اب میں آپ سے عصمت چغتائی نمبر (جس کے نگراں علی سردار جعفری ہوں گے) کے ساتھ ملوں گا۔

یار زندہ صحبت باقی

خدا حافظ

آپ کا
صابر دت

دیتا ہوں۔ میں نے آپ کی مختلف نظموں اور پچاسوں رباعیوں کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا ہے۔ جنہیں کبھی کتابی صورت میں پیش کروں گا۔ آپ میرے محبوب شاعر ہیں۔

(مراٹھی)
رام پنڈت

فضل۔ ایس مگر ـــــــــــــــــــــ بمبئی

شری صابر دت
فن اور شخصیت (بمبئی)

گجراتی ادب کے قارئین جاں نثار صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ جاں نثار کے بغیر اردو مشاعرہ ادھورا نظر آتا ہے۔ اُن کی دو کتابیں "گھر آنگن" اور "خاکِ دل" پر جو انعامات ملے ہیں وہ اُن کی شاعری کا اعتراف ہے۔

جاں نثار اختر کے گیتوں نے فلمی دنیا میں جادو جگا دیا۔ ان کے بہت سے گیت مقبول بھی ہوئے ہیں۔ اکثر ہمیں گراموفون پر سننے کو ملتے ہیں۔ نئی پیڑھی کے شاعروں کے وہ امام ہیں۔

(گجراتی)
فضل۔ ایس۔ مگر

ـــــــــــــــــــــ سیتندر شرما

جاں نثار اختر کو سب سے پہلے گیان باغ میں سُننے کا موقع ملا۔ ان کا مترنم کلام سن کر میں چونک پڑا تھا۔ کیونکہ وہ کسی معمولی شاعر کا کلام نہیں تھا۔ بلکہ ایسے غیر معمولی شاعر کی آواز تھی۔ جس کے کلام میں "پسی ہوئی بجلیاں" پوشیدہ تھیں۔ ان کا کلام اُن کے قیمتی تجربوں کا گنجینہ بھی ہے۔

ایسے وقت میں جب ہندوستان میں جغرافیائی علاحدگی اور زبان وخیال کی دُوری کا گھن لگ چکا تھا۔ اور انسانی قلب وشعور بھی اس سے متاثر ہونے لگے تھے۔ اس تاریک ماحول میں جن گنے چنے لوگوں نے انسانیت پرستی کو زندہ رکھا اور شعور وشاعری کے ذریعہ اتحاد کو باقی رکھا اُن میں جاں نثار اختر سر فہرست ہیں۔ گھٹا ٹوپ ماحول میں انسانیت پرستی کی شمع کو جلائے رکھنا واقعی بڑی بات ہے۔

(تیلگو)
سیتندر شرما
ٹائمز آف انڈیا، دہلی

لکشمن کومل

جاں نثار کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا ہے کہ ہماری زندگی کے تمام واقعات مواد ہیں جن کو انہوں نے اپنی شاعری میں بخوبی ڈھالا ہے۔

(سندھی)
لکشمن کومل

کی شادی اسرار بھائی کے دوست جاں نثار اختر سے ہوگئی۔ جو اسرار بھائی کی قسم کی شاعری کرتے ہیں اتنی ہی مقدار میں اکل و شرب کے قائل ہیں۔ اور کمیونسٹ ہیں۔ یعنی سارے عیب شرعی موجود۔ صفیہ آپا کے انتقال کے بعد زیر لب پڑھی۔ اب خاکِ دل، پچھلے پہر اور گھر آنگن (جو چالیس سال کا شعری سرمایہ ہے) کو پڑھتے ہوئے کافی تعداد میں ایسی نظمیں یا اشعار ملے جنہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اقبالؒ کے بعد اردو میں کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اقبالؒ جیسے لوگ جن کے ہاں فرشتوں کے پَر جلیں روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اقبالؒ کی زندگی ہی میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ اور اس نے چند برسوں میں بڑے جاندار شاعروں کا ایک پورا قافلہ تیار کر دیا (ادیب نہ شاعر کسی تحریک کو بناتے ہیں یا ایک موومنٹ ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت کرتا ہے کچھ بحث ہے۔ انگلستان اور فرانس میں انیسویں صدی سے لے کر آج تک جتنی زوردار تحریکیں چلیں انہوں نے ایک مخصوص فضا اور میلانات کی تشکیل کی۔ یہی ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ہوتا رہا اور آج بھی ہو رہا ہے) بہر حال ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو قُم باذن لینن کہہ کر یقیناً جگایا۔ ۳۵ء سے پہلے چند شاعروں کو چھوڑ کر بقیہ کی نحیف و لاغر "رومانی شاعری" پر غور کیجئے۔

ترقی پسندوں کا ذکر آج کل ادبا کر جھگڑے فساد کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ لوگ ایک مخصوص سیاسی مسلک کا پرچار اور نعرہ بازی کرتے تھے۔ تو صاحب ایک نظم یا غزل یا اچھی ہوتی ہے یا بری۔ یا معمولی۔ ایٹیس نے ساری عمر کیا کیا۔ آئرش قوم پرستی۔ انگلستان کے خلاف آئرلینڈ کی سیاسی جدوجہد اور اس سے متعلق شخصیات اور واقعات پر اس نے نظمیں لکھیں اور وہ کیا خوبصورت بلند پایہ چیزیں ہیں۔ "ایسٹر ۱۹۱۶" ایک لرزہ خیز نظم ہے۔ گل گامش سے نے کر گنزبرگ تک عالمی تاریخ کسی نہ کسی روپ میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایران کے کلاسیکل شعرا یورشِ تاتار اور زوالِ بغداد کے TRAUMATIC نتائج سے بے نیاز نہیں تھے۔ خود اقبالؒ اکثر و بیشتر اسلام زندہ باد کرتے تھے۔ اور آج کا عرب بالخصوص فلسطینی اور عراقی شاعر کیا لکھ رہا ہے؟

مغرب میں دو بڑی جنگوں کے دوران گھٹیا شاعری نہیں کی گئی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ (عاجزہ اقبالؒ کے ساتھ ساتھ ایلیٹ کی سخت پرستار ہے) مغربی مسیحی ذہن و روح کا پیغمبر شاعر تھا۔ یعنی اقبالؒ کی طرح ایک مخصوص آفاقی فلسفے کا ترجمان تھا۔ میں قومی شاعری کی بات نہیں کر رہی جو عموماً دوسرے درجے کی ہوتی ہے (جاں نثار اختر کے ہاں بھی "چشتی قطب"، "کبیر تلسی میرا"، "غالب کا امر دیوان"، "تاج محل" وغیرہ کلیشے افراط سے موجود ہیں)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے شعر کہے گئے۔ احسان دانش کے "لیڈروں کا سر لئے پھرتے ہیں کتنے شہر میں" کی قسم کے کلام بلاغتِ نظام کا انبار لگ گیا۔ اسٹالن پر مستقل مناقب و مراثی تصنیف ہوئے۔ بہر حال کم از کم جب نازیوں کے خلاف روسی انتہائی بہادری سے لڑ رہے تھے ساری دنیا اسٹالن کی معترف تھی۔ میں نے اسٹالن کی موت کے چند برس بعد تک اسکاٹ لینڈ میں چند نامور اسکاٹش مغنیوں کو آنجہانی کے متعلق پرجوش بیلیڈ گاتے سنا ہے۔ (جاں نثار اختر کی اصول پرستی قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے بنّے بھائی کے مشورے کے باوجود اسٹالن کی ممی اپنے ریڈ اسکوائر کے مقبرے سے خارج نہیں کی)

جاں نثار اختر کی مارکسسٹ، رومانی، آدرش وادی، غنائیہ شاعری کے متعلق اس شمارے میں اردو کے چند بہترین نقادوں، شاعروں اور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ لہٰذا مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن خاکِ دل میں مجھے "آشنا کے

قرۃ العین حیدر

چند باتیں

اب تک میں نے جاں نثار اختر کو صرف مشاعروں اور ادبی محفلوں میں سنا ہے۔ اور میری اُن سے زیادہ ملاقات نہیں۔ جو اُن کے بارے میں لکھ سکوں۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ ایک مرنجان مرنج، ثقہ اور رنگین طبیعت آدمی ہیں۔ لہٰذا میں نے اُن کی تینوں کتابیں پڑھیں اور اس نمبر کے سلسلے میں چند باتیں میری ناقص عقل میں آئیں وہی آپ کو بتلاتی ہوں۔

پہلی بات یہ کہ کسی شاعر یا نثر نگار کے "فن اور شخصیت" پر اس کی زندگی میں جو کام ہوتا ہے وہ اچھا ہے لیکن اس میں مبالغہ آرائی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمارے ہاں یا تو حد سے زیادہ ثنا خوانی کا دستور ہے یا ایک دم ذاتیات پر اتر کر کیچڑ اُچھالی جاتی ہے۔ اردو میں یہ اصنافِ قصیدہ و کیچڑ صدیوں سے رائج ہیں۔ گویا ہم اپنے قدما و اساتذہ کی پیروی کرتے ہیں۔ شاید ہم لوگ اتنے جذباتی ہیں کہ بات کرتے کرتے بہک جاتے ہیں ـــــــ مغرب کے معترف ہیں مگر اب تک مغربی ضبط و توازن اور sense of proportion حاصل نہیں کیا۔ SUPERLATIVES اور HYPERBOLE کا استعمال صرف اردو کی نہیں سارے ہندوستان بلکہ برصغیر کی کمزوری ہے۔ ابھی کچھ تازہ پاکستانی رسالے دیکھے جن میں چند یقیناً قابل قدر ادبی ہستیوں کو جن سے میں بھی اچھی طرح واقف ہوں قریب قریب ولی اللہ بنا دیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ درجہ ولایت سے آگے تو بات جا نہیں سکتی۔ (میری ایک ناچیز ذاتی رائے یہ بھی ہے کہ کسی بقید حیات ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی اجازت اتنی آسانی سے نہیں دینی چاہیے جو آج کل ہماری یونیورسٹیوں کے ارباب اردو کی طرف سے مل جاتی ہے۔ جب تک ایک فنکار کا سارا سرمایۂ حیات سامنے نہ ہو ایک دانشجو اس کے متعلق کیا فیصلہ کر سکتا ہے)

چنانچہ دراصل میں یہ مضمون لکھنے کے لئے صحیح آدمی نہیں ہوں۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ اس شمارے میں ہندوستان کے بلند پایہ نقادوں اور مصنفوں اور شاعروں نے جاں نثار اختر کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ اُن کی کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

آج کل ہمارے ہاں نئی اور پرانی پیڑھیوں کی درجہ بندی کے بغیر کوئی تنقیدی جائزہ مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ (اور پرانی یا نئی پیڑھی میں شمولیت ایک قسم کی سند یا DISQUALIFICATION کے طور پر استعمال کی جاتی ہے) جاں نثار اختر احقرہ سے پہلے والی نسل کے آدمی ہیں۔ اُن کے نام سے بچپن میں واقفیت محض اتنی تھی کہ "گرلز کالج کی لاری" کے توڑ پر علی گڑھ میں ہمارے ایک نوعمر کزن نے ایک مسخرے پن کی نظم "گرلز کالج کا تانگہ" تصنیف کی تھی۔ مجاز کی بہنیں حمیدہ آپا اور صفیہ آپا لکھنؤ میں والدہ کے پاس اکثر آیا کرتی تھیں اور صفیہ آپا ایک بےحد سویٹ خاتون تھیں۔ پھر سنا کہ صفیہ آپا

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اب تک کیٹس، بائرن اور ٹینی سن پڑھائے جاتے رہے۔ اور ہمارے آرٹ اسکولوں پر رائل اکیڈمی چھائی رہی۔ ایلیٹ وغیرہ سے زیادہ تر اردو والے عرصہ دراز تک ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے جو لوگ مغرب میں کب کے پرانے ہو چکے اُن کو یہاں تازہ بہ تازہ نو بہ نو سمجھا گیا۔ بودلیر، ملارمے، کافکا وغیرہ کے لئے بھی حال میں بہت اکسائٹمینٹ رہا۔

علاوہ ازیں اس وقت انگریزی الفاظ اور فقروں کا بے تحاشا استعمال بھی جو نظموں، تنقیدی مضامین اور افسانوں میں کیا جا رہا ہے قابل غور ہے۔ اکثر جدید نظموں اور افسانوں کے عنوان بھی انگریزی میں ہوتے ہیں (برسبیل تذکرہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جب خاکسار نے کالج کے فرسٹ ایر کے زمانے سے انتہائی عالم بے وقوفی میں افسانے لکھنے شروع کئے اور اُن میں انگریزی الفاظ استعمال کئے تو شدّ و مد سے مطعون کی گئی۔ آج بیشتر نقاد اور افسانہ نگار بے حد و حساب اور اکثر بلا ضرورت انگریزی الفاظ استعمال کر رہے ہیں لیکن ناچیز کو اب بھی اس ادبی جرم کے لئے اسی شدّت سے مطعون کرتے ہیں۔

میں نے الوژن اور وژن لکھنا شروع کیا۔ آج یہ الفاظ اردو میں باقاعدہ شامل ہو چکے ہیں۔

آج سے پچپن برس قبل عظمت اللہ خاں نے "لیمپ" استعمال کیا۔ چنانچہ آج کی زندگی کی عکاسی کے لئے "فٹ پاتھوں" اور "جلتی ماچس" کا استعمال بالکل ناگزیر ہے اور بہر حال انگریزی الفاظ "کمبو کاٹ" اور "لالٹین" کے زمانے سے اردو میں کھپ چکے ہیں۔ جدید فارسی نہایت خوبصورتی سے فرانسیسی الفاظ کو اپنے میں سمو چکی ہے۔ اردو ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔

زندگی کی MYSTREY کے متعلق شاعر ایک صحافی کی مانند سپاٹ بیان دے سکتا ہے۔ یا نہاں خانوں میں جا سکتا ہے یہ ظاہر ہے کہ اس کی فنی صلاحیت اور وجدان پر منحصر ہے۔

اردو میں ہمیشہ NAUNCES کی شاعری کی گئی ہے۔ ایک رومینٹک سمبلسٹ کے مانند فارسی اور اردو کا بڑا شاعر جو موجود ہے اس سے زیادہ کہہ سکتا ہے جیسے بیدل یا غالب۔ جو موجود ہے اس سے بہت زیادہ کہتے تھے۔ اسی وجہ سے لفظ اس کے تصویری، جذباتی اور صوتی پہلو اور پرتو اردو والوں کے لئے بہت اہم ہیں۔

مغربی موسیقی خالص اور توضیحی دو طرح کی ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی رمزیت اور امیجری کو توضیحی موسیقی کہا جا سکتا ہے۔ سرگم کے ہر سُر کی مانند ہر لفظ اپنی روشنی اور تاریکی اتار چڑھاؤ اور رس رکھتا ہے۔ انگریزی میں لفظ کی پہچان جیرلڈ مینلے ہوپکنز، ایلیٹ، ڈبلیو ایچ آڈن اور ڈی لن طامس کے ہاں خصوصیت سے موجود ہے۔ موخر الذکر شعراء کے ہاں لفظ کا رشتہ ماضی اور حال دونوں سے قائم ہے۔ اور لفظ کا ایک مصنوعی تصوراتی لینڈ اسکیپ کے بجائے عصری زندگی سے رشتہ استوار کرنا دورِ حاضر کے اردو شعراء کا بلاشبہ ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔

"پچھلے پہر" کے جاں نثار اختر کے ہاں لفظ کا استعمال سیدھا سادا ہے لیکن نکھر گیا ہے۔ وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ ظاہر ہے SELF - CONSCIONS قسم کی جدید شاعری نہیں کریں گے۔ (وہ خود کہتے ہیں کہ انہوں نے کیٹس اور بائرن کے بعد کے انگریزی شعراء کو نہیں پڑھا) اُن کی اس "سادہ اور پُر سوز" اکہری شاعری میں کہیں کہیں کلاسیکل چین اور جاپان کی جھلک نظر آتی ہے۔ جہاں چاند اردو فارسی کے محبوب کا چہرہ یا جدید شاعر کا سڑا ہوا خربوزہ نہیں تھا۔ لیکن بڑا خوبصورت چاند تھا۔ جاں نثار اختر بھی براہ راست بات کرتے ہیں۔

بیلا ہو کیتکی ہو کہ جمپا کہ چاندنی
ہر پھول سے قریب تھے ہم اپنے گاؤں میں

منوہر پھول کھلے، ہردے کا کنول بھی مسکایا" ("گاندھی جناح ملاقات") "مزدور کے سادہ ماتھے پہ گلرنگ شفق لہرانے لگی" جیسے افسوسناک اشعار کے ساتھ ساتھ اچانک ؎

چاند سے جب بھی یا دل گذرا
دل سے گذرا عکس تمہارا

اور ریاست جیسی نظم بھی ملی۔ جاں نثار اختر ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ بڑی روانی سے اقبالؒ کے رنگ میں پیر رومیؒ کی جگہ کارل مارکس کو سامنے بٹھا کر اُس سے سوال و جواب کرتے ہیں۔ ساقی نامہ کی طرح امن نامہ اور طرزِ جدید کی سادہ اور ذو معنی نظمیں لکھتے ہیں۔ میر کے مقبول رنگ میں شعر کہتے ہیں اور "فٹ پاتھوں" کا ذکر بھی کرتے ہیں ؎

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

ہر کسی فٹ پاتھ پہ چپ چاپ مر سکتے ہیں ہم
کم سے کم حاصل تو ہے ہم کو اجازت اس قدر

اردو شاعری میں "سانیٹ"، "فری ورس"، "بلینک ورس"، "کینٹو"، "ترائیلے" کے بعد اب انگریزی الفاظ کا استعمال معنی خیز ہے۔

یہ مسئلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں اور پرفورمنگ، اور پلاسٹک آرٹس کے لئے بھی دوسری صورتوں میں موجود ہے کہ ہم مغربی فارم تکنیک اور امیجری سے از حد متاثر ہیں۔ روح ہندوستانی یا مشرقی رکھنا چاہتے ہیں اور اسے نیم مغربی قالب میں ڈھالتے ہیں یعنی بوتل میں پری کو بند کرتے ہیں اور شیشے میں جن اتارتے ہیں۔ پہلے شیشہ خالص مشرقی تھا تو نہ زبان اور تکنیک کے مسائل تھے نہ اس قسم کا جھگڑا قلب و نظر کا پیدا ہوا تھا۔ میر، نظیر اکبرآبادی اور میر انیس وضع قدیم کے نیٹو شاعر تھے۔ مرزا غالب گو موڈرن ہندوستانی تھے۔ لیکن وہ بھی فنی ثنویت کی پریشانی سے دوچار نہ ہوئے۔ (فرض کیجئے میر یا غالب انگریزی پڑھ گئے ہوتے اور الیگزینڈر پوپ یا لارڈ ٹینی سن کی طرح لکھنا چاہتے تو ان پر کیا گزرتی)

حقیقت یہ ہے کہ مغرب والا جو ہے نہ اُس نے میناتوری مصوّری کی ہے نہ وہ غزل کہتا ہے نہ ہمارے ناول، افسانے اور شاعری کی اُسے رتی بھر پرواہ ہے (اور یہ گیٹے، رلکے وغیرہ خاورمیانہ سے تھوڑے بہت متاثر ہوئے تھے یا ٹیگور نے ڈبلیو. بی. ایٹس کو متوجہ کیا۔ میں اسے مشرقی "EXOTICA" میں مغرب کی دلچسپی پر محمول کرتی ہوں۔) اس کے برعکس ہم "نیچرل"، رومانی، انقلابی، جدید سے لے کر ایبسرڈ تک مغرب کی خوشہ چینی میں مصروف ہیں۔ چند ہزار سال تک مشرق کے ڈرامے، مصوّری، رقص، سنگتراشی اور نثر و نظم پر STYLISATION کا زبردست تسلط رہا ہے۔ ("غزل" اس کی سب سے قریبی مثال ہے) نشاۃ ثانیہ کے یورپ کے فنی اجتہاد اور آزادی سے ہم انیسویں صدی میں پہنچ کر برٹش راج کی برکت سے متعارف ہوئے، اور انہیں فوراً قبول کر کے ہی اپنے ادب اور آرٹ میں نئی سمتیں تلاش کر سکے۔ لیکن اس فنی اجتہاد، آزادی اور بصیرت سے بھی ہمیں صرف اس حد تک روشناس کیا گیا جس حد تک یہ وکٹورین انگریزی ادب اور رائل اکیڈمی میں رائج تھی۔ کیونکہ خود انگلستان میں فرانس اور جرمنی کی جدید تحریکیں چند سال بعد پہنچی تھیں اور وہ بھی برطانیہ کے حکمران طبقے کے لئے قابلِ قبول نہ تھیں۔ اس صدی کے شروع میں ایذرا پاؤنڈ ایڈتھ سٹ ویل اور ایلیٹ وغیرہ نے نئی شاعری شروع کی۔ اور مصوّروں نے جدید اسلوب کی تصویریں بنائیں۔ لیکن

کے پھول پر پڑتی ہے۔ وہی گلاب اپنے بالوں میں سجالیتی ہے۔ چرنوں کی داسی کو آج ویمنز لِب والے ہندوستان میں! گو جاں نثار اختر صفائی یہ پیش کرتے ہیں کہ مستقبل کی عورت کے بجائے ہندوستان کی روایتی عورت کی تصویر ہے۔ علاوہ ازیں ترقی پسند عنصر یہ ہے کہ "ملک کے ہر آنگن میں ایسی جنت بس سکے۔

ہر بگڑا ہوا ترقی پسند "جدیدیا" ہو جاتا ہے۔ جاں نثار اختر ابھی نہیں بگڑے۔ لیکن چونکہ تنگ ترقی پسندی کے دائرے سے نکل چکے ہیں اس لئے "جدیدیوں" کے نزدیک قابلِ معافی ہیں۔ انھوں نے بھی "اپنی ذات سے "کمِٹ منٹ" کرلیا ہے۔

یہ آج کی اردو تنقید کی ایک اور مرغوب اصطلاح ہے یا آپ کمیٹڈ ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو روسی ہیں یا امریکن تیسری قسم اپنی ذات سے کمٹ منٹ کی بتائی جاتی ہے۔ کس قسم کا کمٹ منٹ؟ صالح قسم کا۔

لیکن کیا یہ بھی ایک اضافی اصطلاح نہیں ہے؟ کس قسم کا صالح؟

اس کو کیا کہیئے کہ ان تمام فیشن ایبل اصطلاحات اور نظریات کے باوجود ہماری شاعری کا کافی بڑا حصہ ("ترقی پسند" اور "جدید"، "خارجی" اور "ذاتی") سطحی اور COMMONPLACE ہے۔ اچھی شاعری بھی سوائے ن۔م راشد کے اور چند دوسرے شعراء کے MINOR KEY اور چیمبر میوزک کی نغمگی ہے۔

جاں نثار اختر میری اس رائے سے متفق ہیں کہ ہمارے زیادہ تر ادیب اور شاعر "مفکر" نہیں ہیں۔ جاں نثار اختر کا خیال ہے کہ عملی زندگی سے اچھی شاعری آتی ہے۔ ہمارے ہاں انسان فکرِ معاش میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ اسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں حصّہ لینے کا وقت نہیں ملتا۔

اس کے باوجود ریڈی میڈ سانچوں کی فراوانی اور اردو زبان کی وسعت کی وجہ سے شاعری کا ہمیشہ سے زور رہا ہے۔ اور آج بھی ہے۔ پہلے پیامِ یار اور جلوۂ یار وغیرہ رسالے نکلتے ہی غزلوں کے لئے تھے جن میں طرحی دو غزلے سہ غزلے شائع ہوا کرتے تھے۔ روایتی شاعری پچھلے ڈھائی سو برس میں ہزاروں نے کی اور صاحبِ دیوان ہوئے۔ رومانی اور ترقی پسند شاعری سینکڑوں نے کی۔ آج بھی سب سے زیادہ کتابیں "جدید شاعری" کی چھپ رہی ہیں اور اردو رسالوں میں اسّی فیصدی تنقیدی مضامین اور مفصل تبصرے شعری مجموعوں پر شائع کئے جارہے ہیں۔ جن کا مضمون اکثر ایک سا ہوتا ہے غالباً ایک مجموعۂ کلام پر تنقید کرنا آسان ہے کہ کتاب ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ نثر کے لئے پڑھنا بہت پڑے گا۔

بیشتر ہندوستانی (اور پاکستانی اور بنگلہ دیشی) ادب کی MEDIOCRITY کی ایک وجہ یہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہمارے لیکھک اور شاعر کو وہ مالی فراغت اور خوشگوار ماحول میسّر نہیں جس میں وہ آرام اور سکون سے بڑا ادب پیدا کرسکے۔ تو صاحب یہ فلسطینی مجاہدین جو ہیں جو دن رات موت سے کھیلتے ہیں اور انتہائی تکلیف دہ ریفیوجی کیمپوں میں زندگیاں بسر کرتے ہیں یہ اتنا شاندار ادب کیونکر تخلیق کر رہے ہیں۔ اور ہم کیوں عام طور پر NON - LITERATURE پیش کرتے ہیں۔

اور یکنیلٹی ان دنوں کسی فن بالخصوص ادب میں عموماً پائی ہی نہیں جاتی۔ ادب کے اس مجموعی معمولی پن کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ناخواندہ سماج صرف آواز اور متحرک تصویر یعنی ریڈیو اور سینما سے لطف اندوز ہونے کے لئے مجبور ہے۔ "انٹلجنٹسیا" کی تعداد انتہائی محدود ہے۔ اس وقت اردو میں یہ صورت حال اور زیادہ ہولناک ہے۔

جاں نثار کہتے ہیں کہ علامتوں اور مفرس ترکیبوں کے ذریعے جو شاعری کی جاتی ہے وہ بڑی شاعری نہیں۔ میں ان کے اس خیال سے قطعی متفق نہیں۔ لیکن اس دھیمی آواز اور سیدھے سادے انداز بیان کے ذریعے جاں نثار اختر تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ 'پچھلے پہر' میں مجھے چند شعر اور پسند آئے ۔

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جلنے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں
اک دھواں ہے ابھی تک مکانوں کے بیچ

ترانے کچھ دیے لفظوں میں خود کو قید کر لیں گے
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے

"دیے لفظ" Given words کا ترجمہ ہے۔

ایک امریکن اصطلاح آج کل ہمارے ہاں مقبول ہے کہ آپ کس طرح دوسروں سے "RELATE" کرتے ہیں ۔!

مختلف النوع سطحات پر جینا صوفی اور فنکار کا ہمیشہ سے اندرونی معاملہ رہا ہے۔ اور اس اندرونی معاملے کو لفظ اور معانی کے ذریعے دوسروں تک پہنچا کر ان سے رابطہ قائم کرنا اس کا فنی مسئلہ۔ صوفیا، اور درباری شعراء اور اصلاح پسند نیچرل شاعر اور رومانی اور انقلابی اور اشتراکی سب کے ایڈیم اُن کے وقتوں کی آواز تھے۔ آج کا شاعر ان سب سانچوں کو توڑ پھوڑ کر گڈمڈ کر دیتا ہے۔ اس شکست و ریخت یا ترکیب نو سے شاعر اور اس کے سماج کا نیوروسیس بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور اس کا فنی اجتہاد بھی۔

انسان کا مقدر اس کا کردار ہے یا اس کا ماحول۔ مغرب میں اس سوال پر بحثیں ہو کر پرانی ہو چکیں۔ رومینٹک دہشت، شر، بدی، گناہ، سادیت، کرب، اضطراب، موت، موت کی خواہش (مغرب میں باز تنظیم کی ایجبری، واگز اور بودیلئیر سے حد درجہ وابستگی وغیرہ) بے چینی، قنوطیت یہ سارے لوازمات ذاتی یا اجتماعی نیوروسس کے مظاہر ہو سکتے ہیں ——— ایکسپرشنسٹک وضع کی نظمیں اور کہانیاں ایک حد کے بعد بڑی آسانی سے GROTESQUE بن جاتی ہیں۔ جو ادب نہیں ہے ——— اور اب "بے چہرہ انسان" بھی ایک اور کلیشے بن چکی ہے (ایک ہوتن ٹوٹ بھی اپنے جنگل میں تنہا نہیں ہوتا) جاں نثار اختر "باہر" سے "اندر" آ چکے ہیں۔ لیکن تنہائی کی کال کوٹھری میں جانے کے بجائے انھوں نے "گھر آنگن" لکھا۔

فراق صاحب کی روپ کی رباعیاں محض اصول کی خاطر کہی گئی ہیں "گوری" اور "ناری" پر جمیل الدین عالی بہت خوبصورت دوہے اور گیت لکھ چکے ہیں۔ وہ "گاؤں کی گوری" محبوبہ تھی۔ جاں نثار اختر کی گوری خالص ہاؤس وائف ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو ہیرو کا درجہ تفویض کیا ہے۔ اس پتی ورتا آدرش مہیلا کا حال یہ ہے کہ ہیرو کے قدموں کی دھول جس گلاب

اندر کمار گجرال

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر میرے دوست بھی ہیں اور پسندیدہ شاعر بھی۔ اتفاق سے وہ شاعروں کے جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب کے سب میرے دوست ہیں اور جاں نثار اختر کی طرح پسندیدہ۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ چالیس سال پہلے جو پہلی نسل آئی تھی اس نے اس عہد کے نامور شاعر پیدا کئے ہیں۔ فیض۔ مجاز۔ مخدوم۔ سردار۔ جذبی۔ جاں نثار اختر اس پہلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری نسل میں ساحر۔ مجروح۔ کیفی۔ تاباں وغیرہ کے نام ہیں۔ ان کا شمار بھی اس عہد کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کے ساتھ ن۔م راشد اور اختر الایمان کے نام بھی آتے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک سے دور رکھا لیکن اپنے انداز میں ترقی پسندی سے قریب رہے۔ یہ بھی ہمارے عہد کے مستند شاعر ہیں۔ ہم اردو شعر و ادب کی اس بہار سے چالیس سال سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس کے ایک خوبصورت اور مہکتے ہوئے پھول کا نام جاں نثار اختر ہے۔ اور ان کے شعر کو پسند کرنا اور اس کی داد دینا سخن فہمی بھی ہے اور غالب کی طرفداری بھی ——— ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار بھی ہیں۔

ترقی پسندی کے بہت سے رنگ ہیں جیسے پھولوں کے بہت سے رنگ ہوتے ہیں اور بہت سے پہلو ہیں۔ جاں نثار اختر نے اپنے لئے مارکسزم کا انتخاب کیا۔ اور اس رنگ میں کامیاب شاعری کی۔ ہم اس پورے عہد کو جس سے ان کی شاعری کا شباب تعلق رکھتا ہے۔ نہرو اور سوشلزم کا عہد کہہ سکتے ہیں اور آج کا عہد جس کو اندرا گاندھی کا عہد کہنا چاہیئے۔ نہرو کے عہد کی توسیع ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری پہلے کے عہد میں بھی معتبر تھی اور آج کے عہد میں بھی معتبر ہے۔

جاں نثار اختر کو نظم، غزل، رباعی، تینوں صنفوں پر پوری قدرت حاصل ہے لیکن ان کا مذاق جدید ہونے کے باوجود کلاسیکی ہے اور یہ ان کے والد بزرگوار مضطر خیر آبادی کی وراثت ہے۔ اس لئے شاید انہوں نے اس عہد کی ایک اہم صنف آزاد نظم کو زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا۔ اس صنف کو ن۔م۔ راشد۔ مخدوم۔ فیض۔ سردار اور اختر الایمان نے اپنے انداز سے استعمال کیا ہے اور آج کے جدید شعراء استعمال کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اردو شاعری کا مستقبل ہے لیکن اس کے باوجود اس صنف سے بے توجہی کی وجہ سے جاں نثار اختر کی شاعری میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی ہے۔ میں نے اس بات کا ذکر صرف یہ جتلانے کے لئے کیا ہے کہ جاں نثار اختر نے ترقی پسندی اور جدیدیت کو اپنایا لیکن اپنے انفرادی مزاج کے ساتھ، اور انفرادی مزاج کے شاعر کے لئے بڑی چیز ہے۔

چنانچہ ہم سب مع ترقی پسندوں کے (جو عوامی ادب کی بات کرتے ہیں ۔ تحریک کے عروج کے دور میں بھی ان کی تخلیقات شہری مڈل کلاس کے چند ہزار افراد تک پہنچ سکیں) ایک نوع کا CULTIST ادب تخلیق کرنے میں مشغول ہیں ۔ روس اور جاپان اور مغربی ممالک میں رسالوں اور ادبی کتابوں کے قارئین کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچتی ہے ۔ اردو میں رسالے اور کتاب کا اڈیشن ایک دو ہزار سے آگے نہیں جا پاتا ۔ لامحالہ ہمارے اور قارئین کے ذہنی افق بھی اتنے ہی محدود رہیں گے ۔ ہمارے چند سو یا ہزار انٹلکچوئیل برٹش کونسل یا یو ۔ ایس ۔ آئی ۔ ایس ۔ میں تازہ ترین کتابیں پڑھ کر ایک دوسرے سے ان کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں یا جو یونیورسٹیوں اور علمی اور ادبی اداروں سے وابستہ ہیں وہ سیمینار منعقد کرتے ہیں یا مختلف ادبی مشاہیر واساتذہ کے "ڈے" منا ——— لیتے ہیں ۔

اب آپ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں یہ سارے بحث و مباحثے ترقی پسندی جدیدیت وغیرہ کے ایک بے انتہا محدود CULT کے لئے کئے جا رہے ہیں ۔ ملک کے ساٹھ کروڑ عوام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ۔ جاں نثار اختر چونکہ ساحر اور مجروح کے مانند سینما کے لئے بھی لکھتے ہیں ، آواز اور متحرک تصویر سے وابستہ ناخواندہ سماج تک پہنچ چکے ہیں ۔ علاوہ ازیں "گھر آنگن" چونکہ SIMPLISTIC ہے اردو میں بھی زیادہ مقبول ہوئی ہے اور دیوناگری حروف میں چھپ کر بھی خوب پڑھی جائے گی ۔

اس وقت یہ ادبی فضا کا منظر نامہ ہمارا ہے ۔ ان حالات میں ایک نفیس اور ترقی پذیر شاعر کی بازیافت اور تفصیلی تعارف میں سمجھتی ہوں اس نئے اردو رسالے کا کارنامہ ہے ۔

اب میرا کہا سنا معاف اور آگے مضامین پڑھئے ۔

دلیپ کمار

حسنِ تغزل کے ساتھ معنی آفرینی

جاں نثار اختر ایسے قادر الکلام شاعر کا شاعرانہ وقار اُردو ادب میں اُس کا مناسب مرتبہ اُسکے کلام کی سوشل، سماجی اور رومانی Significance تو وہی سخن فہم اور مستند حضرات مقرر کر سکتے ہیں جو اُردو زبان سے اُس کی تاریخی پس منظر اور اسکے ارتقا کے علاوہ دیگر contemporary شعراء کی کاوشوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

میرے لئے جاں نثار اختر کی شخصیت ایک مجسّم Paradox کی سی ہے —— بمبئی جیسے گنجان شہر میں جہاں ہر شخص بے تعلق، اپنی نجی دھن میں رواں دواں —— سخت منہمک اور مصروف یا پھر قطعی شل اور بے حس، اُس بمبئی میں یہ کھویا کھویا، عجز و انکسار میں ڈوبا ہوا عظیم شاعر، شاعر لگتا ہی نہیں۔ جان پڑتا ہے آس پاس کے لوگوں سے، لوگوں کی باتوں سے، اس شہر سے، شہر کی ہنگامی آمد و رفت اور اس کی واردات‌وں سے، جاں نثار اختر کا کوئی تعلق نہیں ہے — وہ کسی انجان دھن میں گم ہے — اُسکی آنکھوں سے ایک عجیب گہرے روحانی کرب اور شدید ترین تنہائی کی ملی جلی کیفیت جھلکتی ہے — وہ اپنا کلام پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی لطف اٹھانے کے لئے پڑھ رہے ہیں، یا پھر کسی اور کو سنا رہے ہیں جو ان کی خیالی توجہ کا مرکز ہے!

میں نے اکثر دیکھا creative arts کے ضمن لوگ بمبئی شہر کا Referece اس طرح دیتے ہیں جیسے کوئی گالی ہو — علیٰ ہذا القیاس فلم انڈسٹری سے تعلق بھی رسوائی کی دلیل قرار دی جاتی ہے۔ یہ بات تکلیف دہ ہے — سچ پوچھئے تو بمبئی شہر میں خود بمبئی کے رہنے والے کم ہیں۔ بیشتر آبادی اُنہیں لوگوں کی ہے جو کہیں نہ کہیں سے آئے جبراً نہیں عمداً آئے۔ تلاش یار میں سہی یا فکر معاش کے لئے۔ غور طلب بات ہے کہ اردو ادب اور شاعر کو ملک کا وہ خطہ ہی نہ نواز سکا جہاں اردو زبان پیدا ہوئی — آگرے، لکھنؤ کا ذکر تو چھوڑیئے بلد الہند دلّی، دلّی جس کی گلیوں میں میر — غالب — ذوق اور داغ جیسے خداوندانِ شعر و سخن کا طوطی بولتا تھا۔ اُس دلّی نے بھی بد ذوقی کا شرمناک ثبوت دیا کہ خود اپنے ہی گھر میں اردو بے گھر ہو گئی — اس کے مدِّ نظر رواداری طور سے سوچئے تو بمبئی شہر کے لئے یہ ایک نمایاں اعزاز اور credit کی بات ہے کہ جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری جیسے نامور ان شعر و سخن بمبئی میں سکونت پذیر ہیں اور خدا لگتی کہئے تو خوش ہیں!۔

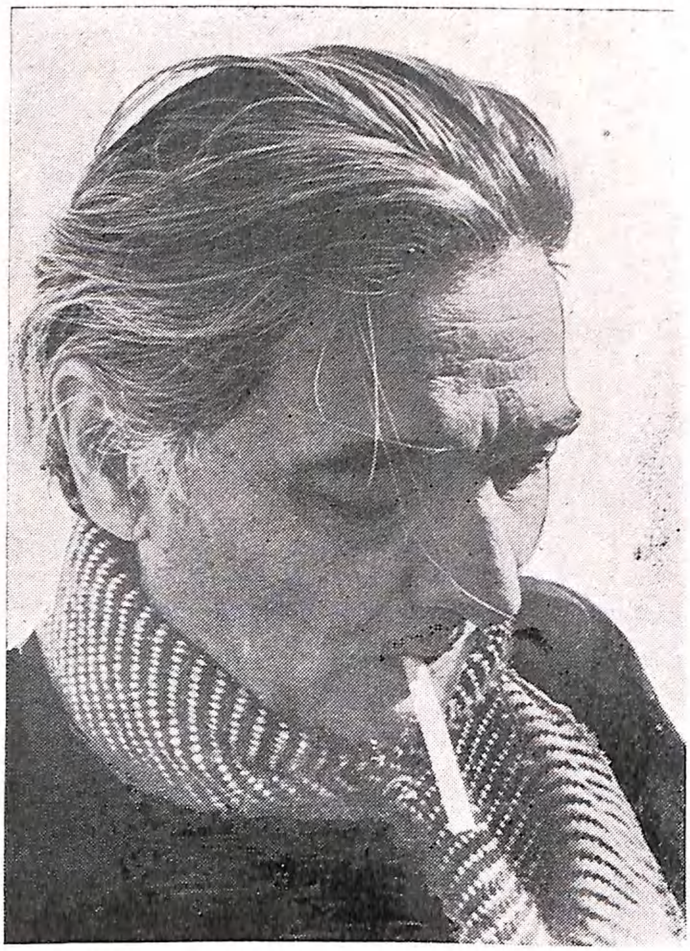
جب میں یہ محسوس کرتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ جو بہار اردو شاعری میں چالیس برس پہلے آنا شروع ہوئی تھی اس کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے اور وہ اب بھی تر و تازہ ہے اور اس کی تازگی برقرار رکھنے میں ان کے دوسرے ہم عصروں کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر کی تخلیقات کا بھی بڑا دخل ہے۔ اب وہ اپنی عمر کی ساٹھویں منزل سے گزر رہے ہوں گے یا اس سے آگے نکل چکے ہوں گے لیکن ان کی شاعری اب تک جوان ہے۔ ان کی قوتِ تخلیق جس کے نمونے روز سامنے آتے ہیں یہ اعلان کر رہی ہے کہ ان کی شاعری کی تازگی دیر تک قائم رہے گی اور آنے والی نسلیں ہماری طرح اس سے لطف اُٹھائیں گی۔

میری رائے میں

"ترقی پسند ادیبوں کے کارواں میں جو لوگ نظریاتی انتہا پسندی سے اپنی تخلیقات کے حسن کو بچا سکنے میں کامیاب ہوئے ان میں جاں نثار اختر کا نام سرفہرست ہے۔ جدیدیت کی انتہا پسندی کی گذشتہ دہائی میں غزل اور نظم کی روایتی توسیع پسندی کو برقرار رکھنے میں بھی اختر صاحب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاں نثار اختر آج کے عہد کی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ادب کے ہر گروپ سے اپنے آپ کو تسلیم کروا چکی ہے اور ایسی شخصیت پر نمبر نکالنا ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کا بہترین ذریعہ ہے۔"

رحمٰن نیّر

مدیر "روبی"، "بیسویں صدی"



JAN NISAR AKHTAR

Nature could never live and breathe and bloom
Until the Poet comes to make her live.

Without the Poet nature meets her doom
Nature gives nothing only Poets give.

I have known little birds with singing throats
Waiting for some one to describe their song
Poets are born packed with a wealth of notes
out pouring, which to singing birds belong.

AKHTAR! your parents, when they gave you birth,
were hardly conscious you would bear—

The seven hews of a rainbow rendering the earth,
and intimate neighbour, to God's distant heaven.

HARINDRANATH CHATTOPADHYYE

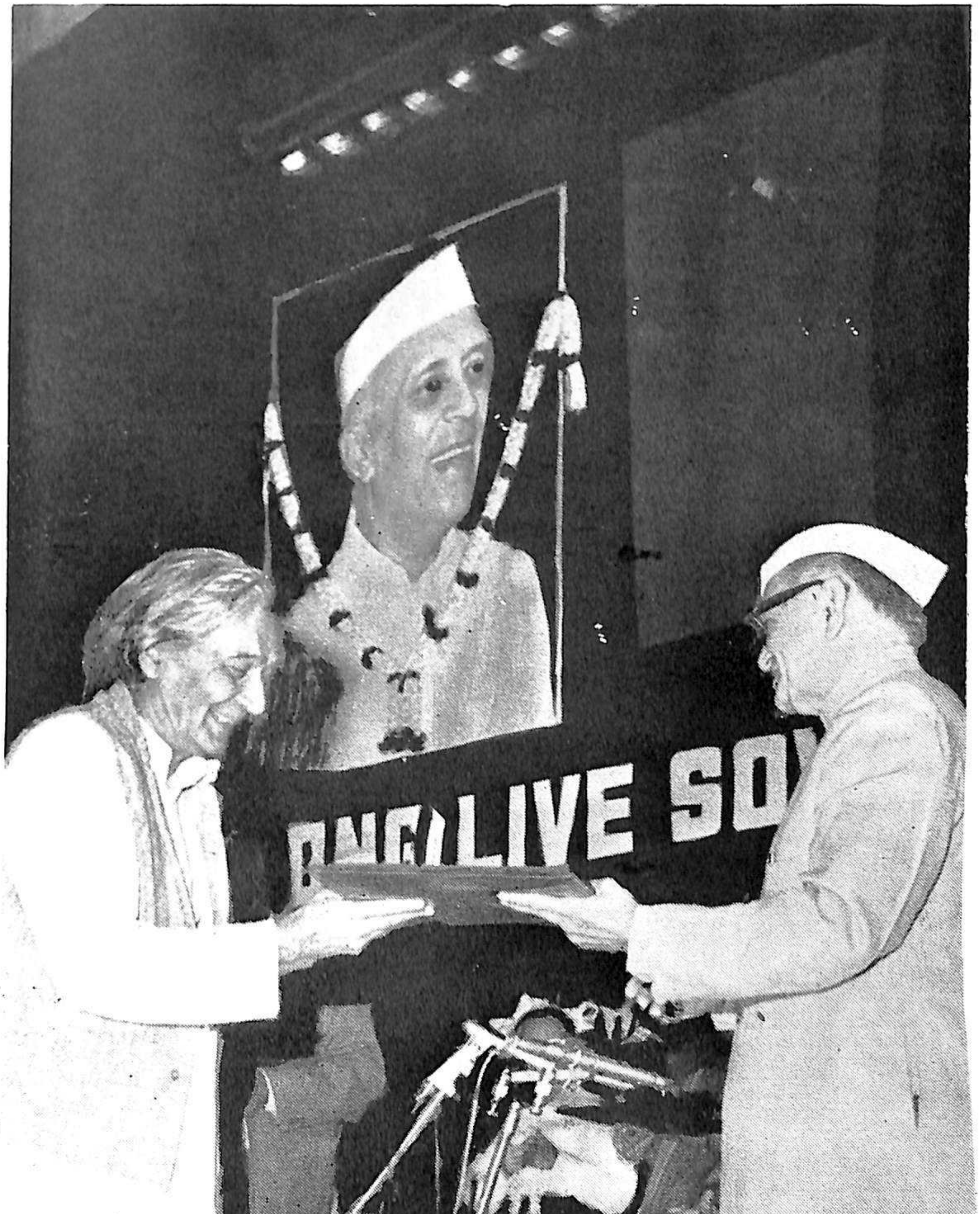
فن اور شخصیت

ویسے فلمی نغمہ نگاری کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ وقت طلب کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے والی بات ہے۔ اکثر گیت کار بندھی ہوئی دھنوں پر تک بندی کر کے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ لیاقت نہ ہو تو سیاست سے بھی کام چل سکتا ہے۔ Salesman-ship کے لئے self promotion داؤں پیچ کی جانکاری بھی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسی صورتحال سے ظاہر ہے جاں نثار اختر جیسا کم گو اور عجز پسند انسان کہاں پنپ سکتا ہے۔ چنانچہ جاں نثار کو بھی انہی دشوار گذار مرحلوں اور اذیتوں سے ہو کر گذرنا پڑا۔ جن سے نکل کر ساحر، کیفی، اور مجروح نے اپنا موجودہ مقام حاصل کیا۔ اپنے خیال کی ندرت، جادوئی لطیف انداز بیان، اور بندھے ہوئے meters میں بھی روانی اور حسن تغزل کے ساتھ معنی آفرینی پیدا کرنے کی عمدہ صلاحیت نے اُن کو آج فلمی نغمہ نگاروں کی صف اوّل میں کھڑا کر دیا ہے۔ Show-Business کی اصطلاح میں he has arrived and arrived the hard way اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی creative creed یا اپنے شاعرانہ اور سماجی aspiration سے جاں نثار بے تعلق ہو گئے۔ روزی کمانے کے لئے لوگ کتنے کام کرتے ہیں۔ کیسے کیسے جتن کرتے ہیں، ہم خوش ہیں کہ career-wise جاں نثار کا ذریعہ معاش بھی Poetry-oriented ہے۔ وہ اپنے کام میں معیاری ہیں بازاری نہیں۔

ساحر، کیفی اور مجروح نے جو فلموں سے پایا ہے اُس سے کہیں زیادہ انہوں نے film media کو دیا۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ جاں نثار اختر بھی اُسی vintage کی شخصیت ہیں! جس افق پر یہ اب اُبھرے ہیں، دُور دُور اور بہت دیر تک چمکتے رہیں گے۔ انشاء اللہ!



جاں نثار اختر شریمتی اندرا گاندھی
وزیر اعظم ہند کو اپنی کتاب
'خاکِ دل' اور 'ہندوستاں ہمارا'
کے بارے میں وضاحت کرتے
ہوئے :-



جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند جاں نثار اختر کو
سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیتے ہوئے۔



اں نثار اختر، صابر دت اور فراق گورکھپوری

ایک یادگار تصویر
لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سنہ ۱۹۴۴ء

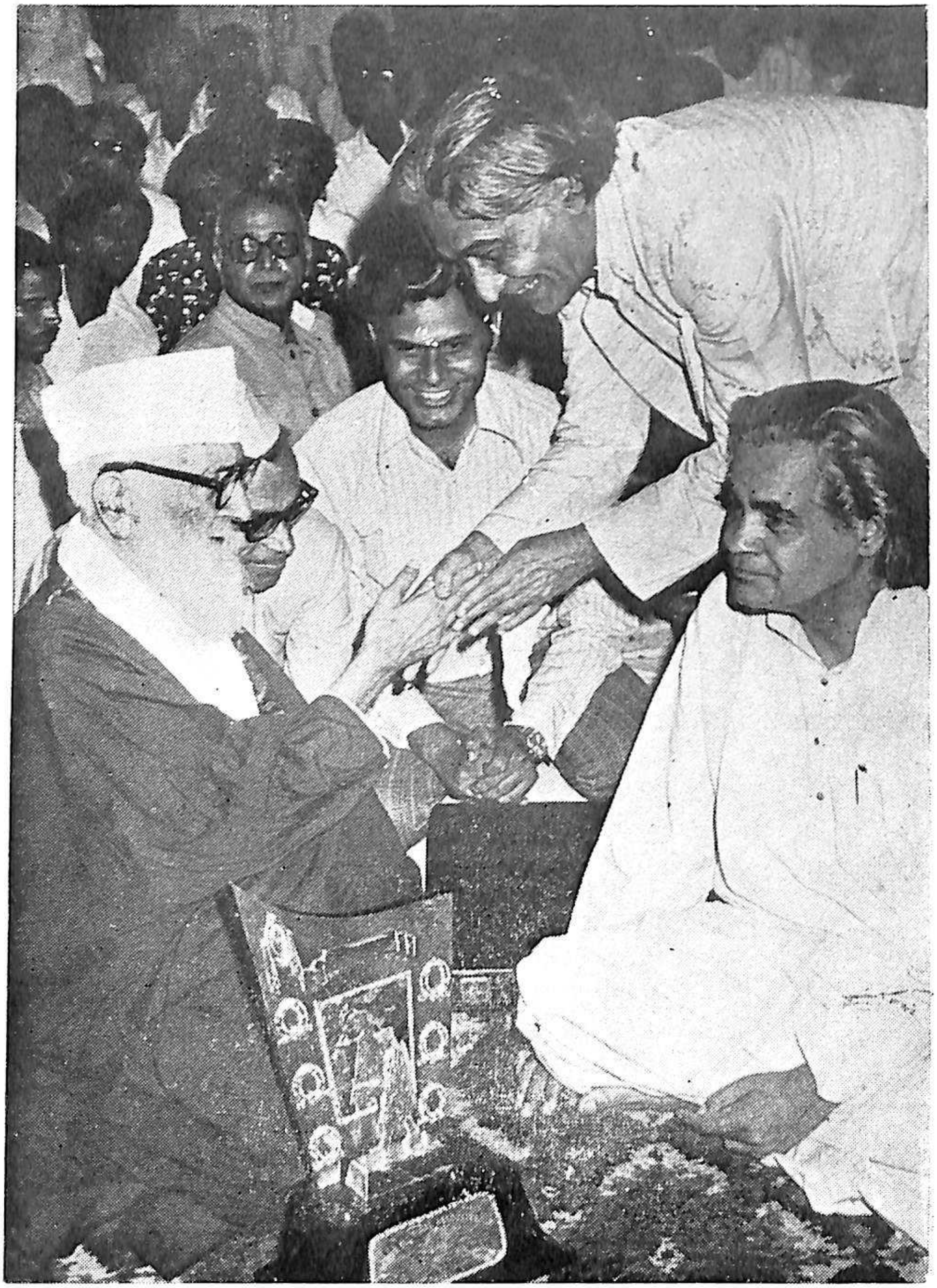




تاجکستانی شاعر
ترسون زادہ
کے ساتھ



ازبکستان کی شاعرہ
زلفیہ خانم
کے ساتھ



جاں نثار اختر مولانا عبدالماجد دریابادی
سے مصافحہ کرتے ہوئے۔



اردو کے مقبول پاکستانی شاعر
فیض احمد فیض کے ساتھ



پنجابی کی مشہور شاعرہ
امرتا پریتم کے ساتھ



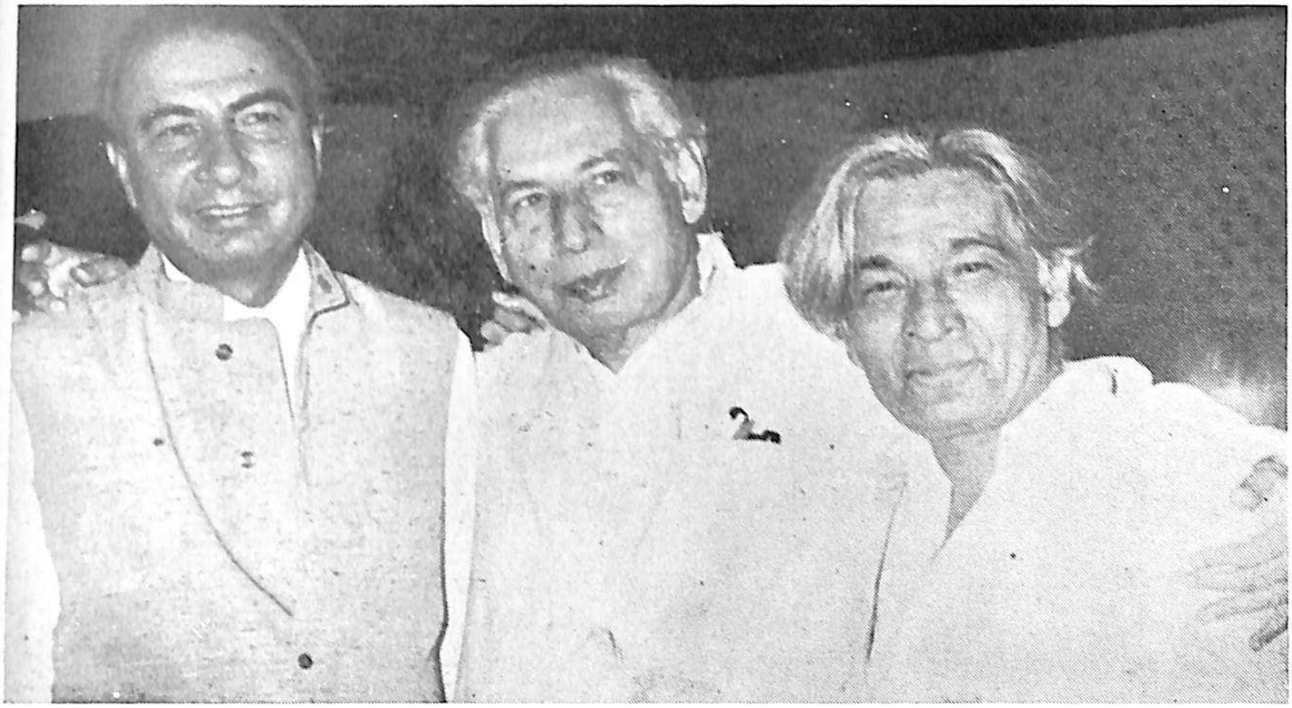
جاں نثار اختر

اور

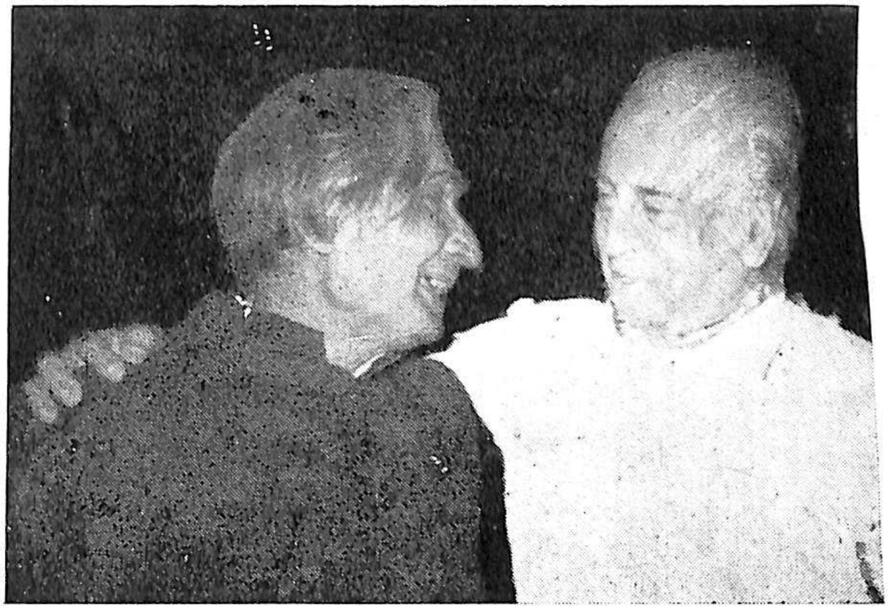
علی سردار جعفری



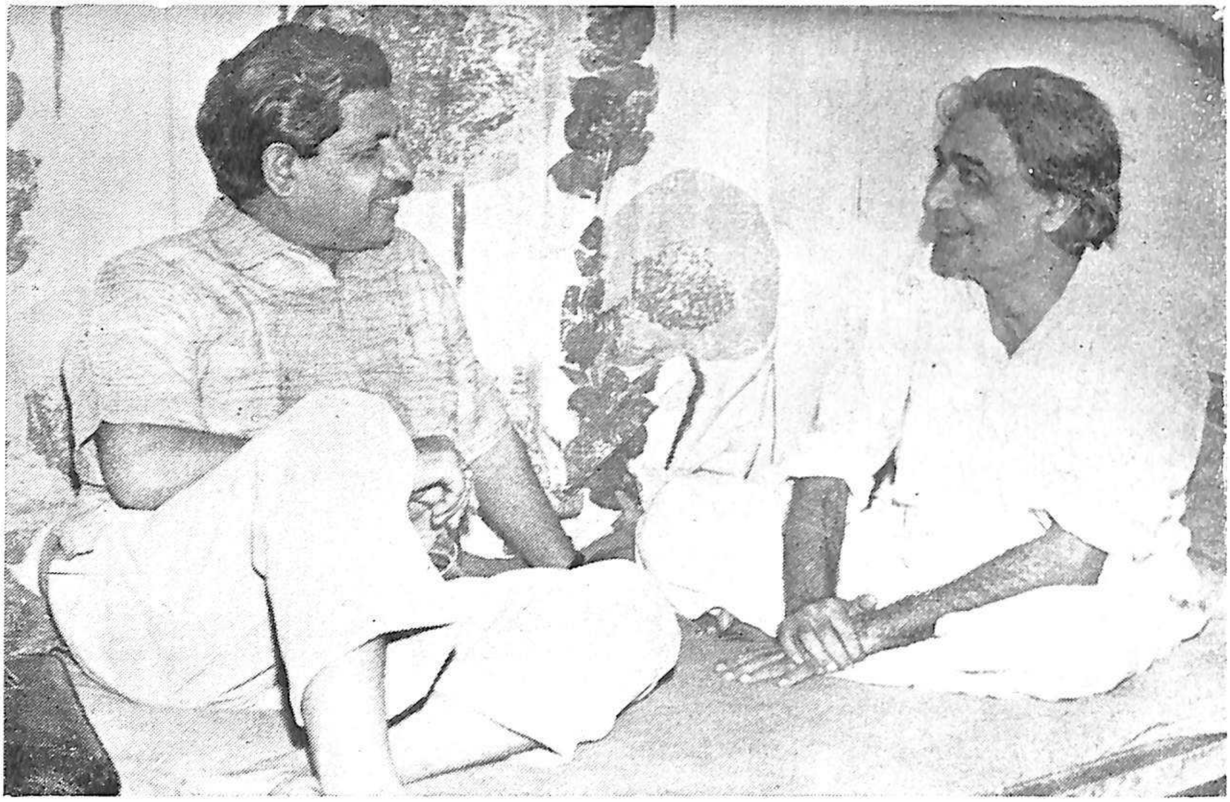
(دائیں سے بائیں) سلمیٰ صدیقی، کرشن چندر، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، نوشاد، جاں نثار اختر



جاں نثار اختر، سجاد ظہیر اور ساحر لدھیانوی

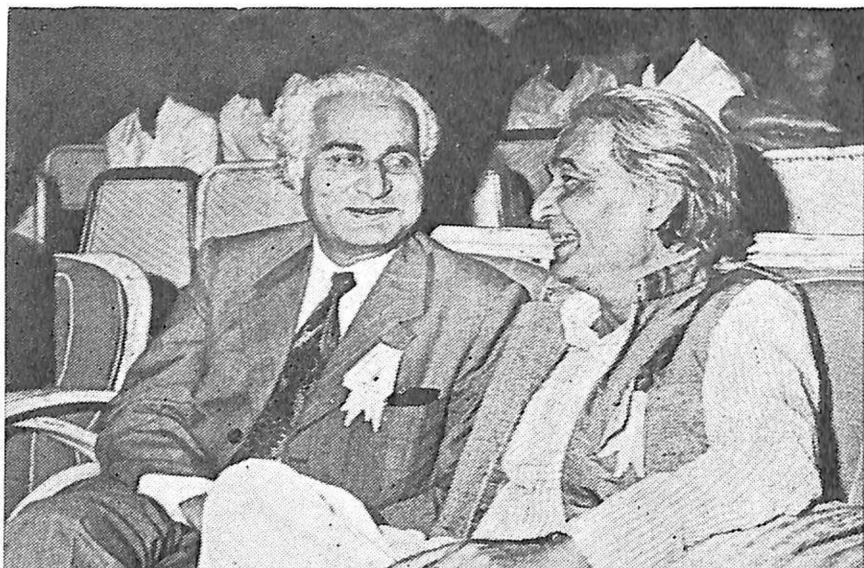


مشہور انگریزی ادیب
ملک راج آنند کے ساتھ



جاں نثار اختر اور کشمیری لال ذاکر

مشہور شاعر
اختر سعید خاں
کے
ہمراہ



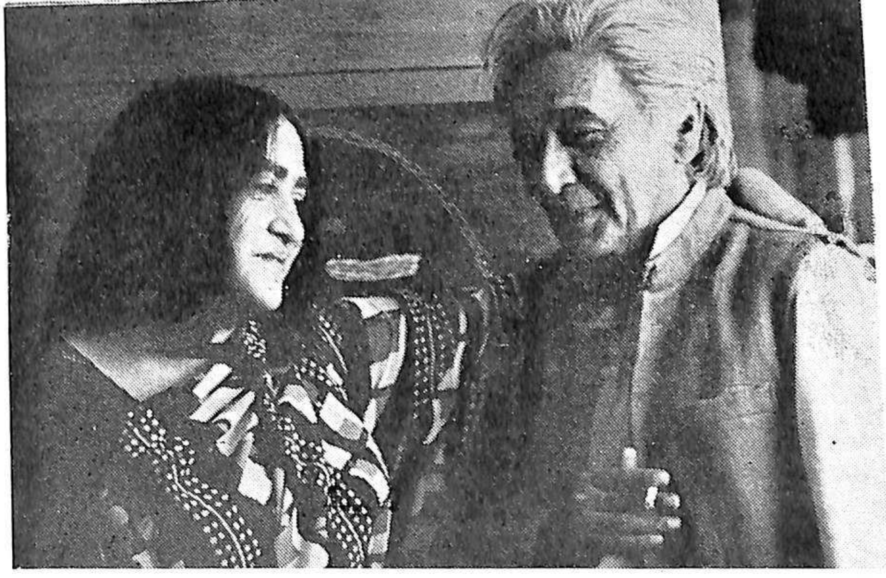


جاں نثار اختر

اور

عصمت چغتائی

★



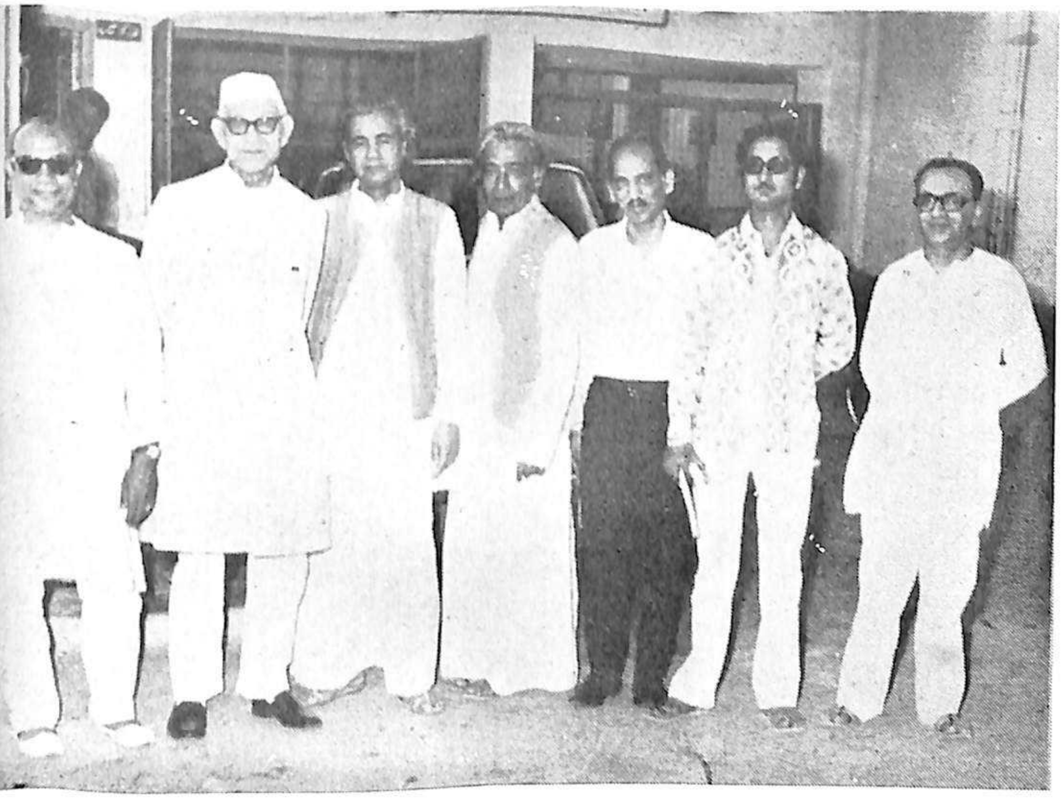
جاں نثار اختر اور واجدہ تبسم



ساحر لدھیانوی
جاں نثار اختر کے
مجموعہ
"نذر بتاں"
کا مطالعہ کرتے
ہوئے۔



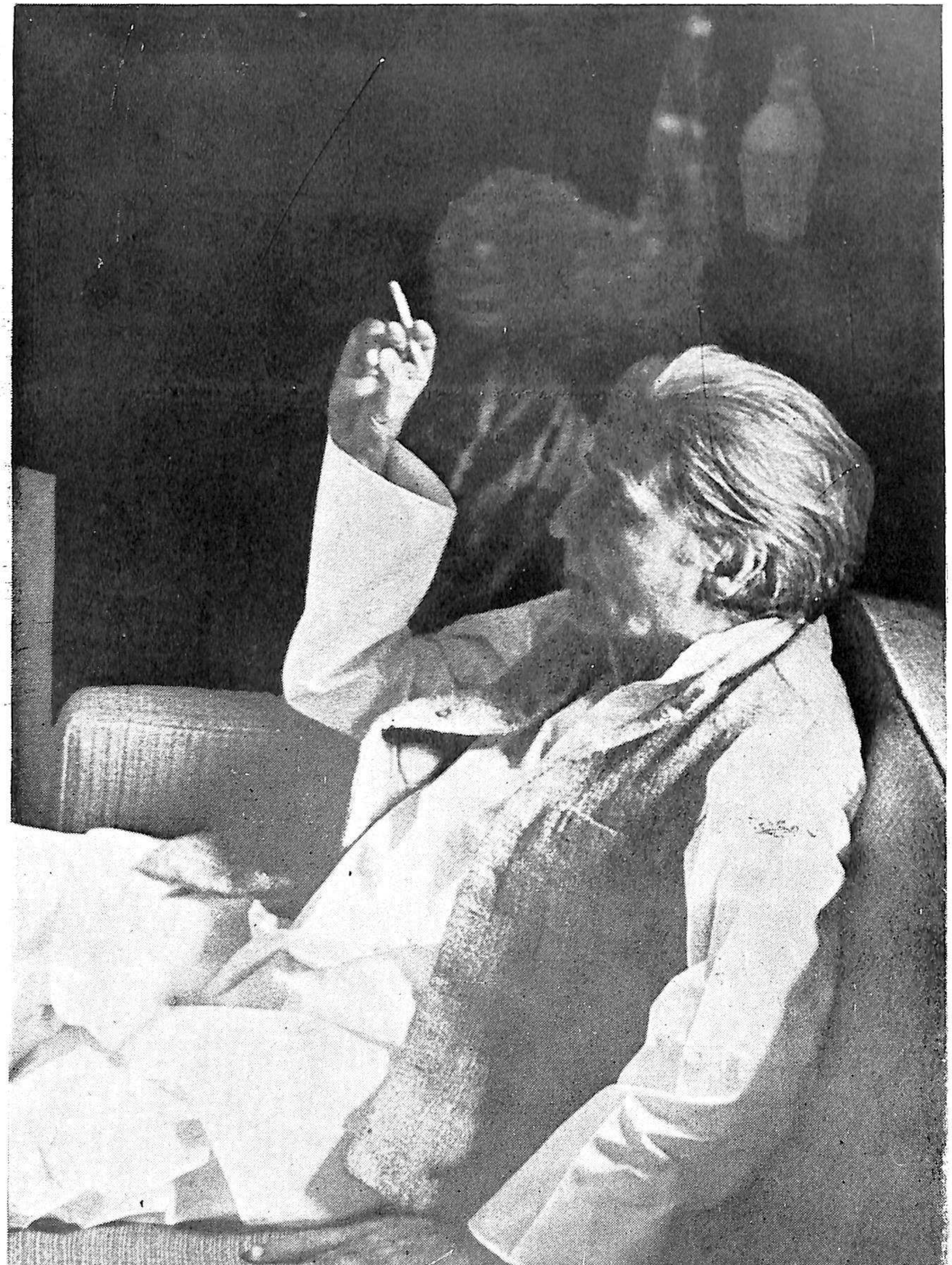
مشہور ہندی شاعر
ہری ونش رائے بچن
کے ساتھ

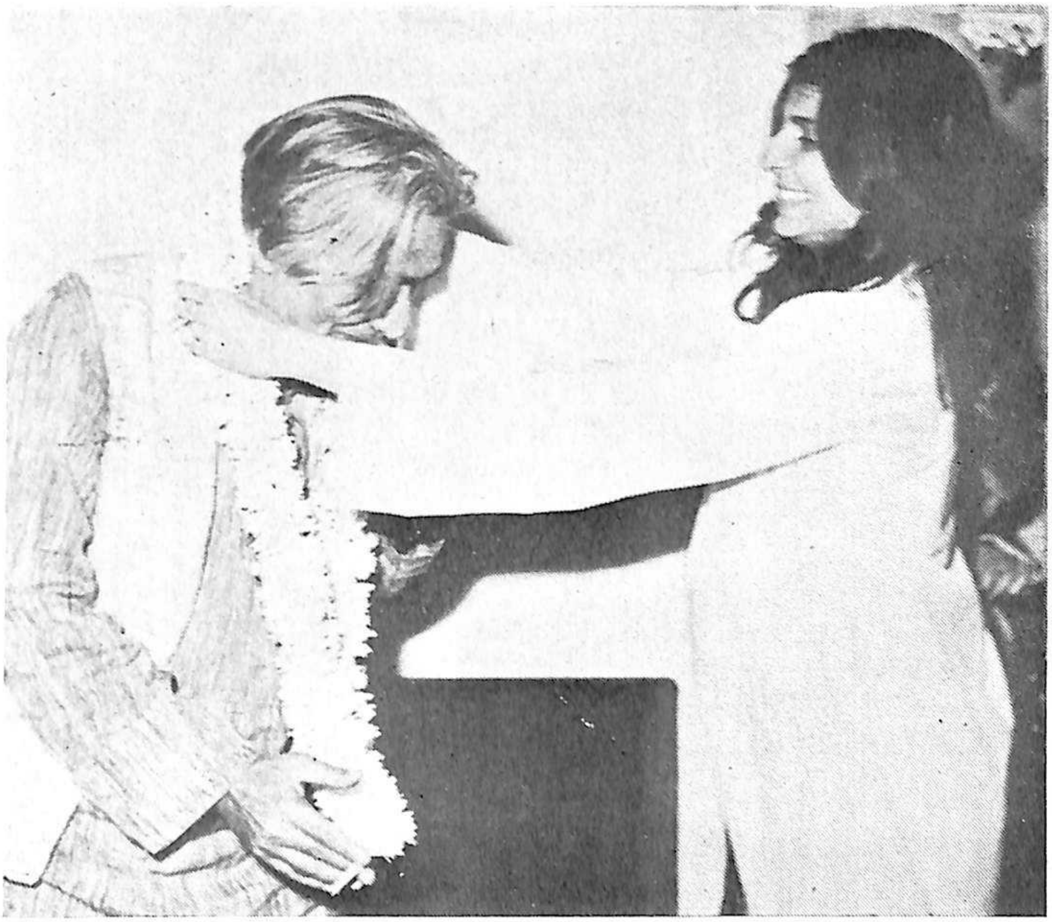


(دائیں سے بائیں) عابد علی خاں (مدیر سیاست)، حسن کمال (اردو بلٹز) شمیم جے پوری، جاں نثار اختر، سردار جعفری
آنند نارائن ملاّ اور لاہوتی



جاں نثار اختر
مشہور مصوّر
حسین کے ساتھ

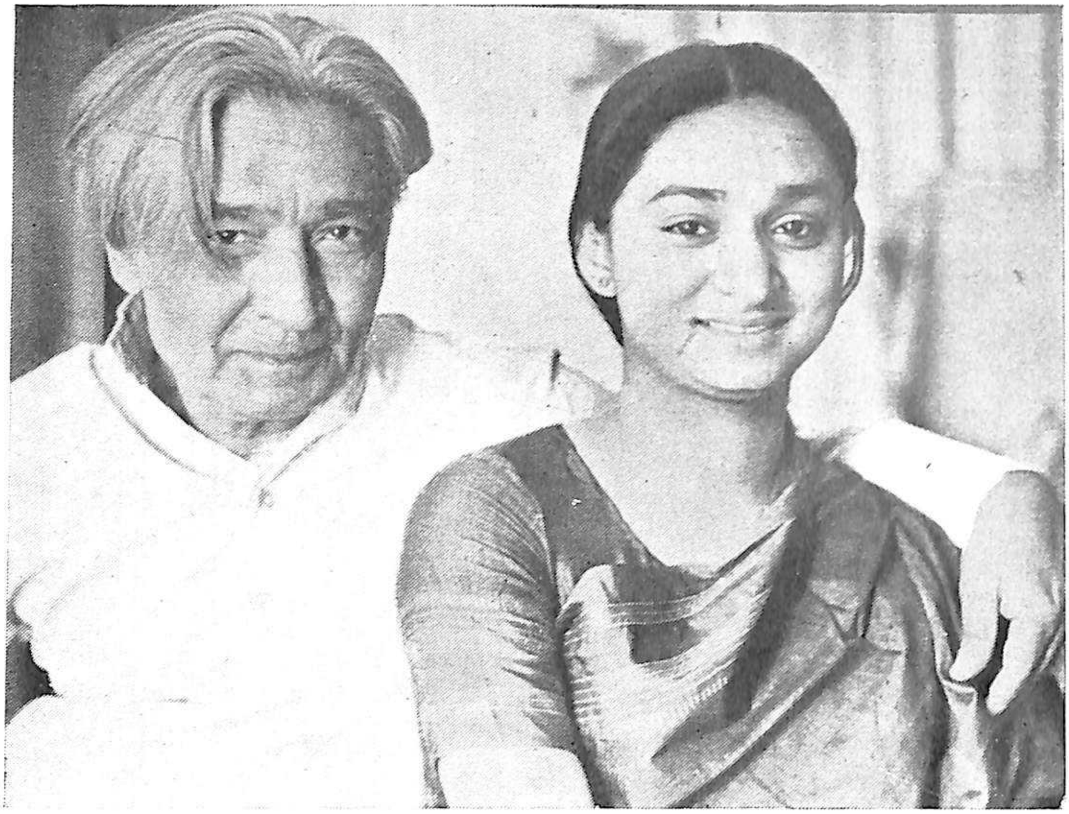




صدر "روح غزل" دہلی جاں نثار اختر
کو پھول مالا پہنا رہی ہیں



ڈاکٹر کشور سلطان
جنہوں نے
جاں نثار اختر کی
شاعری پر
پی. ایچ. ڈی کی
ڈگری حاصل کی.



جاں نثار اختر
اپنی بڑی صاحبزادی
عنیزہ کے ساتھ
جس پر ان کی مشہور
آفاق نظم
"آخری لمحہ"
اس رسالہ میں



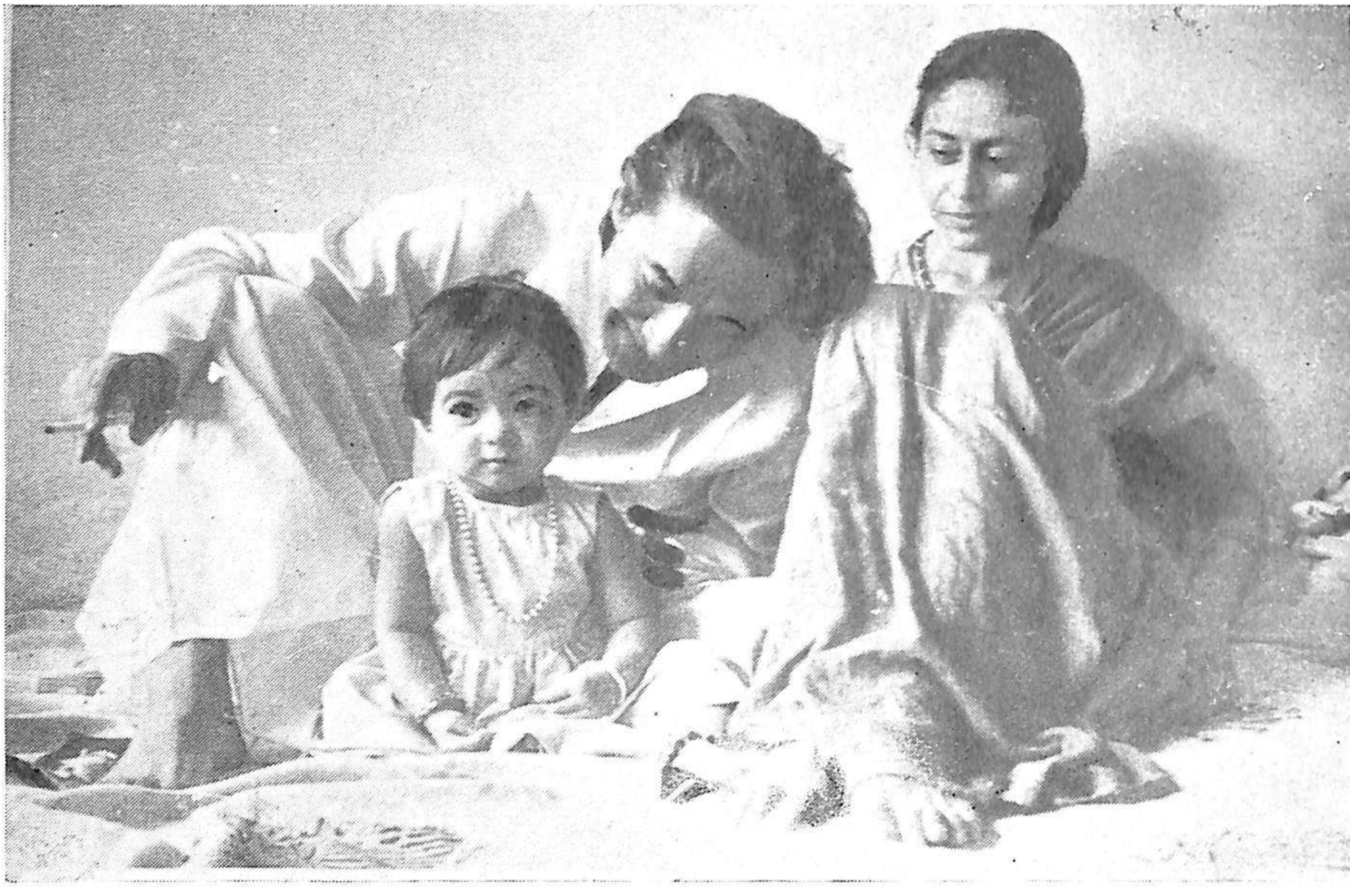
اپنی بیٹی
البینا
کے ساتھ



بیگم صفیہ اختر
(مرحومہ)



بیگم خدیجہ اختر



بیگم خدیجہ اختر اور جاں نثار اختر اپنی بچی عنیزہ کے ساتھ



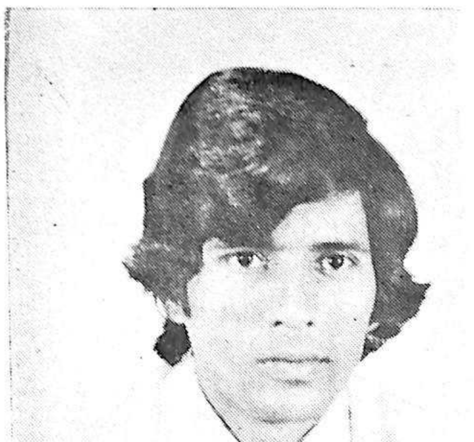
بیگم خدیجہ اختر، جاں نثار اختر اور ان کی بچی
عنیزہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ



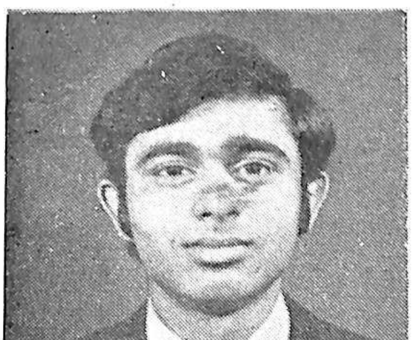
ایک یادگار تصویر: جاں نثار اختر
جاوید اور سلمان کے ساتھ



جاں نثار اختر جاوید کے ساتھ



ڈاکٹر سلمان اختر



شاہد خورشید اختر



جاں نثار اختر
دلیپ کمار کے ساتھ



جاں نثار اختر مشہور سنگر
محمد رفیع کے ہمراہ

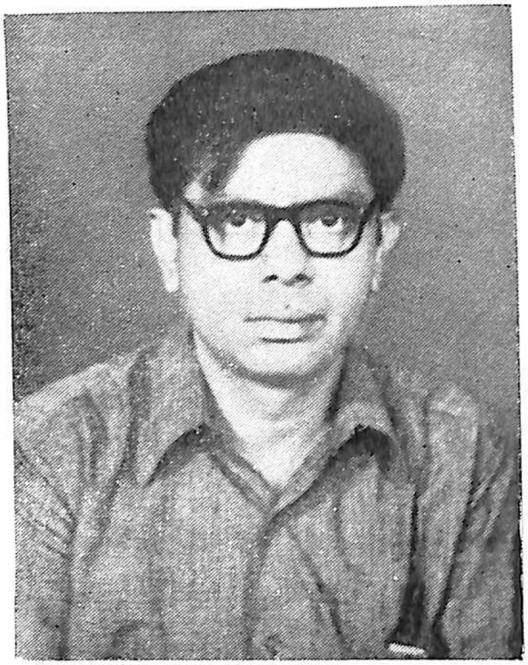


فلم "مجنوں" کی مہورت پر

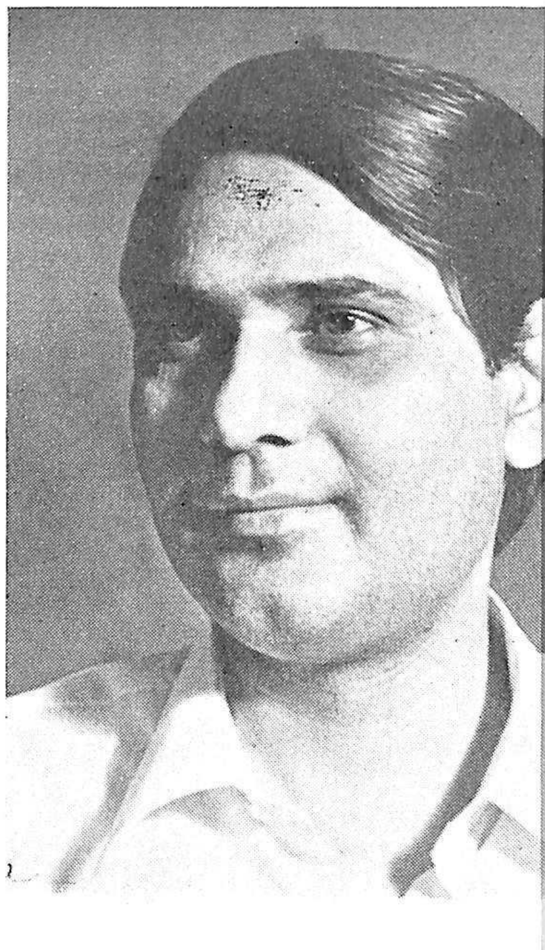
مدیرانِ اعزازی



عصمت چغتائی



خلیق انجم



ویدراہی

معاون مدیر



احسن خان

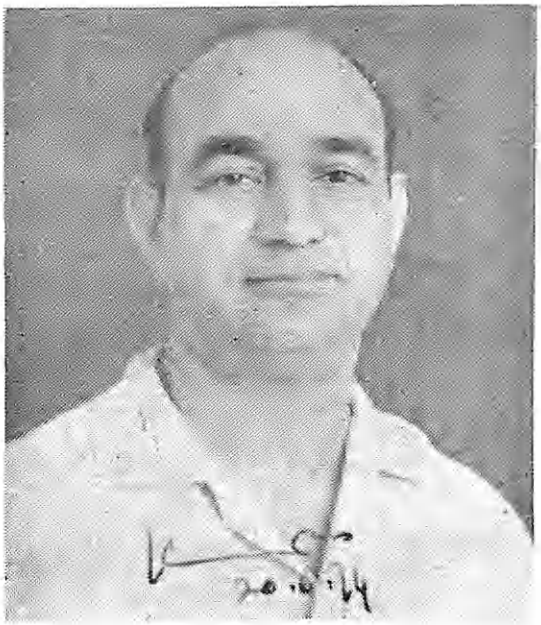
مدیرِ منتظم



قرۃ العین حیدر



جاں نثار اختر اور موسیقار نوشاد



کنہیالال پوسوال



کملیشور



خواجہ عبدالغفور



سنیل دت   نرگس



اندر کمار گجرال

فن اور شخصیت کے سرپرست



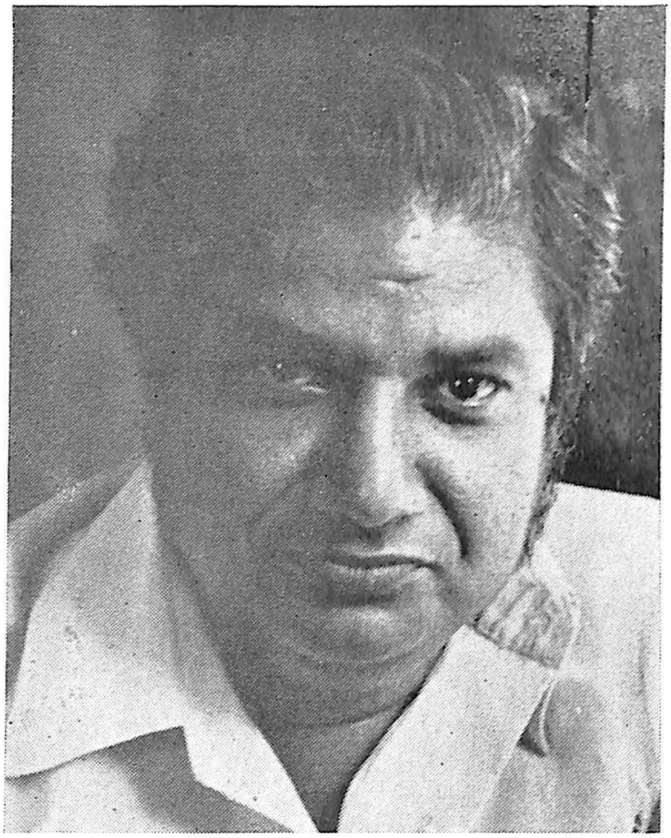
لال چند پرارتھی



رامانند ساگر



سکھ دیو پرشاد



نریندر سیم



سریندر ناتھ ورما

فن اور شخصیت کے مشیر



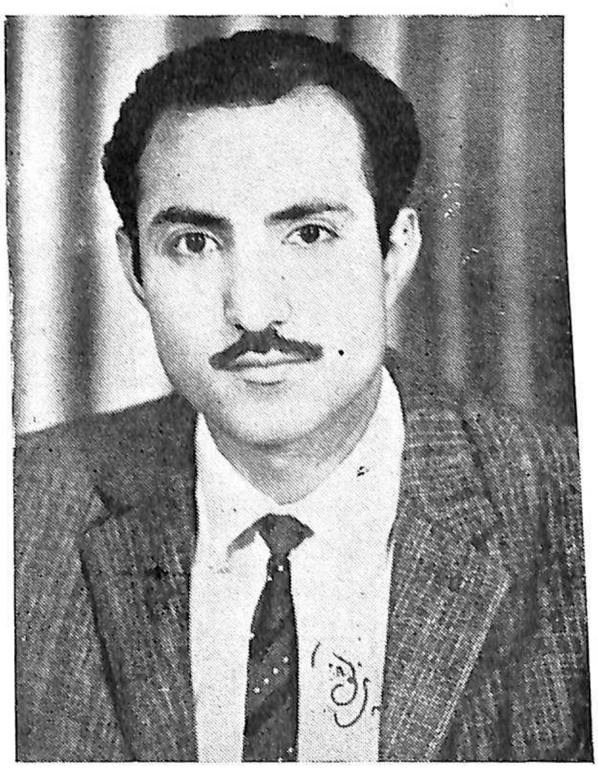
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



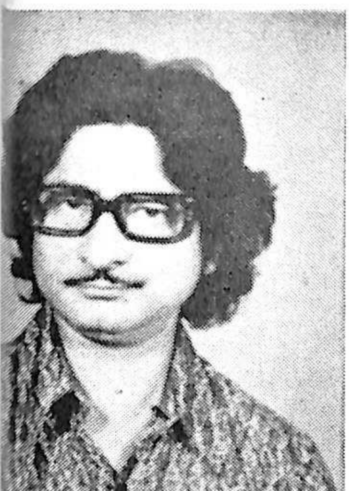
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ



فکر تونسوی



ڈاکٹر نریش



حسن کمال

صبح لو کا ستارہ

شام غم کا متوالا



جوزرواراوالا



تصویر: یوگ، جوئے

جاں نثار اختر
مدیر 'فن اور شخصیت' کے ساتھ

پروفیسر احتشام حسین (مرحوم)

تلاشِ فردا کا شاعر

(۱۹۵۰ء میں جاں نثار اختر کا ایک مجموعہ کلام "تلاشِ فردا" کے نام سے شائع ہونے والا تھا۔ یہ مضمون پروفیسر احتشام حسین نے دیباچہ کے طور پر لکھا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے مجموعہ شائع ہونے سے رہ گیا) (ادارہ)

آج کی زندگی میں شاعری کی کیا جگہ ہے؟ اس سوال کا جواب لوگوں کے سماجی اور طبقاتی تصورِ حیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ عام طور سے انسان کی مادی اور تخیلی زندگی میں کسی خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب انسان شعر و ادب کی طرف جھکتا ہے تو کسی چیز کی جستجو میں۔ وہ کسی خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے، کسی طرح کی تسکین چاہتا ہے۔ کسی سوال کا جواب چاہتا ہے۔ کس قسم کی ذہنی یا جذباتی آسودگی چاہتا ہے، شعر و ادب سے دلچسپی اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے چونکہ ہر دور میں انسانی جذبات اور خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے آج غلط یا صحیح شاعری میں بھی لوگ اپنے بدلے ہوئے رجحانات اور ذہنی کشمکش کا عکس چاہتے ہیں۔ یہ مطالبہ کچھ ایسا بے جا نہیں ہے۔ کم سے کم اُن شعراء سے تو اس کی اُمید کی ہی جا سکتی ہے جو صرف اپنے لئے ہی نہیں کہتے بلکہ شاعری میں زندگی کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کے مدعی ہیں۔ جہاں تک جاں نثار اختر کی شاعری کو میں نے سمجھا ہے میں یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ مسائلِ حیات کے سمجھنے، سلجھانے، ان پر قابو پانے اور ان سے لطف حاصل کرنے کی جو کوشش وہ کرتے ہیں یا جو صورتیں انہیں پیش آتی ہیں وہ انہیں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کوئی ایسی دنیا نہیں بنائی ہے جس پر دوسروں کے دل مسرور اور رنجیدہ نہ ہوں بس وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ ان مسائل اور واقعات کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھیں جو بہت سے دماغوں میں الجھنے اور بہت سے دلوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ اگر شاعر اپنے سازوں کی آواز کو سننے والوں کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ نہ کر سکے تو اس کی مقبولیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ آج دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ صرف .... شاعر کے نغمے قوموں کو بیدار نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے سیاسی، معاشی اور سماجی محرکات سے تقدیریں بنتی بگڑتی ہیں شاعر انہیں محرکات میں سے ان کا انتخاب کر لیتا ہے جو ذوقِ حیات پیدا کرتے ہیں۔ یا جو الجھ کر مسائلِ حیات بن جاتے ہیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج زندہ رہنا آسان نہیں رہ گیا ہے اگر یہ جبر یا رہی کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ایک خاص کیفیت ہوتی لیکن زندگی کی

مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

(زندگی)

نظر میں یہ توازن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ سماجی انقلاب کے بغیر محبت کی آزادی بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ شعور کی یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر عاشق بھی ان عام انسانوں کی جدوجہد میں شریک ہو جاتا ہے جو سماجی انقلاب پیدا کر کے زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔

معلوم نہ تھا اختر کی ایک مختصر مگر دلکش اور اہم نظم ہے۔ اس نظم کے یہ دو شعر پڑھیئے۔

شبنم برگِ گل تر کے خنک سینے میں — ایک شعلہ سا نہاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
وادیٔ نغمہ و مستی میں بھٹکتا ہوا وقت — عہدِ شمشیر و سناں ہے مجھے معلوم نہ تھا

(معلوم نہ تھا)

آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ شاعر محض شاعری نہیں کر رہا ہے یہ صرف تجاہل عارفانہ نہیں ہے بلکہ وہ حالات اور واقعات کو کسی نئی روشنی میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی زندگی کسی نئے موڑ پر آگئی ہے۔ اس کا احساس حقیقت کی چوٹ کھا کر تلملا اٹھا ہے اور وہ اعتراف کر رہا ہے کہ میں نے اب تک برگِ گل پر شبنم کی خنکی کا تصور کیا تھا۔ وادیٔ نغمہ و مستی میں وقت کو بھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب شعلے بھی دیکھ رہا ہوں اور شمشیر و سناں بھی۔ یہ چیزیں پہلے بھی وہیں چھپی اور دبی ہوئی پڑی تھیں۔ لیکن نگاہ وہاں تک جاتی ہی نہ تھی۔ لاعلمی کا یہ اعتراف نئے شعور کی ابتدا بن گیا۔ اور زندگی کے مثبت اور منفی دونوں رخ نظر آنے لگے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ زندگی پُرپیچ ہے تو اس میں سفر کرنے والے آنکھیں بند کر کے گام فرسا نہیں ہو سکتے۔ منزل کی طرف جانے میں جن دشواریوں کا سامنا ہوگا ان کا احساس اور علم ضروری ہے۔ یہ یقین ضروری ہے کہ ان دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ورنہ انسانیت اور ترقی کا کارواں بھٹک کر راستے ہی میں رہ جائے گا۔ اختر نے جدوجہد کرنے والے کو مسافر کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور شاعرانہ انداز میں ان دشواریوں کا ذکر کیا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوں گی۔ زندگی کی ان مشکلوں کی طرف ادب میں اشارے ملتے ہیں کیونکہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ آگے بڑھنے والوں کے راستے میں رکاوٹوں کے وہ خوشنما منظر آجاتے ہیں جو خود منزل ہونے کا دھوکا دینے لگتے ہیں۔ اختر نے انھیں ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

جوانی کی وادی کے خنداں نظارے
محبت کے گردوں کے رقصاں ستارے
تجھے راستے میں کریں گے اشارے
کہ آ ہم سکھائیں تجھے دل لگانا
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

اشارے سے تجھ کو بلائے نہ ساقی
تجھے میکدے میں بٹھائے نہ ساقی
ترے دل میں یہ بات ڈالے نہ ساقی

موجودہ دشواریاں بالکل دوسری ہی نوعیت رکھتی ہیں۔ آج انسان لا انتہا طاقت کا مالک ہونے کے بعد بھی کمزور ہے۔ دولت اور ذرائع پیداوار کی فراوانی کے باوجود بھوکا اور ننگا ہے۔ ہر طرف کے سامانِ آسائش رکھنے کے باوجود بے دل اور ناآسودہ ہے جمہوریت اور انسانیت کا دعویٰ کرنے کے بعد بھی دوسروں کو ڈراتا دھمکاتا اور لوٹتا ہے۔ آسائش اور ترقی کے سامانوں کو موت اور بربریت کے آلوں میں تبدیل کرتا ہے۔ مذہب کو سکونِ قلب کا ذریعہ بناتا ہے اور مذہب کے نام پر لوگوں کا خون بہاتا ہے۔ اس نے ایک ایسی دنیا بنائی ہے جہاں برائی اچھائی میں پیوست ہو گئی ہے اور جب کوئی ان دونوں کو الگ کرنا چاہتا ہے تو فلسفیانہ بحثیں اندھیرے کو اجالا ثابت کر دکھاتی ہیں۔ قوت صداقت پر غالب آجاتی ہے۔ متضاد خوابوں اور خیالوں کی اس دنیا میں شاعر کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ سماج کے ایک باشعور اور حساس فرد کی حیثیت سے اس کے خیالات پر بہت سے لوگوں کی نظریں ہوتی ہیں۔ اور کبھی کبھی تو خود اُس کے خیالات میں تضاد اور ابہام پایا جاتا ہے۔ لیکن دورِ جدید کے اکثر شعرا اپنی سمت معین کر کے آگے بڑھتے ہیں وہ جان بوجھ کر ترقی پسند یا رجعت پسند ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی لاعلمی یا سہل انگاری کی وجہ سے خیالات ضرور اُلجھ جاتے ہیں لیکن مجموعی طور پر شاعر کا ضمیر، اُس کے خیالات اور اس کے خواب اُس کی شاعری میں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

تلاشِ فردا کی نظموں میں اختر کے ان خوابوں اور خیالوں کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے جو تنہا اُن کی ذات سے متعلق نہیں ہیں۔ یہ اُن کی سیاسی، سماجی اور مفکرانہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ایک شاعر کے سیاسی اور سماجی خیالات کا آئینہ۔ اور یہ آئینہ ایسے وقت میں دکھایا جا رہا ہے جب دنیا بہت سے سیاسی اداروں میں بٹی ہوئی ہے۔ کئی سیاسی تصورات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور ایک صحیح اور صحت مند نظریۂ حیات کے انتخاب پر دنیا کی خوش حالی اور تباہی کا دار و مدار ہے۔ آج ایک عام انسان کی طرح شاعر سے بھی ہوش مند اور ذمہ دار رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں عام انسانوں کے مقابلے میں دوسروں کو متاثر کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے تو اختر کے یہاں اسی بات کو دیکھنا چاہئے کہ وہ حیاتِ انسانی کے متعلق کیا رویہ رکھتے ہیں۔ اسی جڑ سے دوسری شاخیں اور کونپلیں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیں گی۔

میں نے اختر کی رومانی اور غیر رومانی نظمیں کافی پڑھی ہیں اور گو اس وقت ان کی سیاسی اور مفکرانہ نظمیں ہی میرے سامنے ہیں لیکن میں یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان مجھے کوئی مخصوص قسم کا خط فاصل بنتا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ ابتدائی شاعری میں جو نظریاتی یکا پن تھا وہ ۱۹۳۸ء کے بعد سے دور ہونے لگا اور اب ان کی شاعری کا موضوع وہ انسان ہے جو سماج اور فطرت پر قابو پا کر ایک بہتر، متوازن اور بھرپور لطافتیں رکھنے والی زندگی کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ اس کی محبت اس کے سیاسی خیالات۔ اس کے سماجی اور معاشی تصورات بس اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ان کی رومانی اور عاشقانہ نظمیں شامل نہیں ہیں اس لئے یہاں ان کا تذکرہ بے محل ہوگا۔ لیکن اتنا کہنے میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا کہ محبت کے رومانی تصور میں آہستہ آہستہ رومانی انقلاب پسندی کی آمیزش ہوتی گئی اور جب سماجی حقیقت پسندی نے دل و دماغ میں جگہ کر لی تو زندگی کے ہر شعبے پر ایک حقیقت پسند کی طرح نگاہ پڑنے لگی۔ اور انقلاب کا تصور بھی اسی طرح محبوب بن گیا۔ جس طرح انجم کا تصور۔ ایک نوجوان کی زندگی میں عشق بھی حقیقت ہے اور زندگی بھی۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے اختر نے لکھا ہے۔

تمتماتے ہوئے عارض پہ یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے اس درجہ خفا، آپ سے اتنی بیزار
میں نے کب تیری محبت سے کیا ہے انکار

وہ دنیا کی اُن تمام آویزشوں میں آزادی، جمہوریت، انسانیت اور ترقی کی طرف رہے ہیں جن سے دنیا کش مکش میں مبتلا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب جنگ کی نوعیت واضح ہو گئی اور اگر سرخ فوج نے ہٹلر کے قدم کو روک نہ لیا ہوتا تو ساری دنیا اندھیرے کنوئیں میں گر جاتی۔ ایک جمہوریت نواز شاعر کے لئے اس سے بڑا موقع اظہار خیال کا اور کہیں نہیں آسکتا تھا۔ جب سرخ فوج انسانی آزادی کی علامت بن کر آگے بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ اختر کی رومانیت اور حقیقت پسندی دونوں نے مل کر اُن سے وہ مختصر مگر خوبصورت نظم لکھوائی جو سُرخ فوج کے نام سے اس مجموعہ میں شامل ہے۔

دوسری جنگ ایک عوامی جنگ بن گئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی رہنما جیلوں میں بند تھے لیکن عوامی جدوجہد کرنے والی جماعتیں یہاں کے عوام کو وہ راستہ بتا رہی تھیں جس پر چل کر جنگ جمہوریت کی طاقتوں کی فتح پر ختم ہو۔ فاشزم اور سرمایہ داری پر چوٹ پڑے اور دنیا کے عوام کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ اس کی صورت یہ تھی کہ ہندوستان کے عوام جمہوری صفوں میں شامل ہو کر مقاصد کی ہم آہنگی کا اعلان کریں اس سلسلے میں اختر نے اپنی دلکش نظم جلوس لکھی جس میں سپاہیوں، نوجوانوں، مزدوروں، کسانوں، وطن پرستوں، طالب علموں، عورتوں اور ادیبوں کو متحد ہو کر دنیا کے جمہوریت پسندوں کا ساتھ دینے پر اکسایا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان مخصوص گروہوں کی سیاسی حیثیت کو پیش نظر نہ رکھے گا تو وہ ان اشعار کو محض ایک طرح کی نعرہ زنی سمجھے گا۔ کیونکہ انقلابی جدوجہد میں وہ مقامات بھی آتے ہیں جہاں پُرجوش نعرہ ہی شاعر کی آواز بن جاتا ہے اور شاعر عوامی جدوجہد کی واضح آواز بن کر سامنے آتا ہے۔ اختر نے مندرجہ بالا گروہوں کے اجتماعی کردار کا اندازہ لگا کر ان کے ارادوں اور حوصلوں کا اظہار کیا ہے۔

جب ۱۹۳۶ء میں اسپین کی سرزمین جمہوریت پسندوں کے خون سے لالہ زار بن گئی تو دنیا کے بہت سے ادیبوں نے نہ صرف آنسوؤں اور نغموں کا خراج عقیدت حوصلہ مند لڑنے والوں کی خدمت میں پیش کیا بلکہ اپنے قول کو عمل کا اپنے خیال کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے اپنی جانیں بھی دے دیں کیونکہ ترقی اور رجعت کے معرکہ میں شاعر کا واضح عقیدہ ہی اسے سچی شاعری پر آمادہ کر سکتا ہے اسی طرح ہندوستان میں وہ مواقع برابر آتے رہے جب شعراء کی پرکھ ہوئی۔ جب یہ پتہ چلا کہ وہ کدھر ہیں۔ بنگال کا قحط بھی ایک ایسی کسوٹی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ جاں نثار اختر نے بھی بنگال کے قحط پر آنسو بہائے ہیں۔ لیکن یہ محض ایک نوحہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بنگال کی عظمت کا اظہار ہے۔ نظام زندگی بدل دینے کا عزم ہے۔ تاکہ دنیا کے کسی خطے میں پھر بنگال کا المیہ نہ دہرایا جا سکے۔

جب مہاتما گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح ہندوستانی سیاست کے لئے ملے تو وطن پرستوں کے غنچۂ دل کھل گئے۔ انگریزوں کے بخشے گئے سمجھوتے میں اور آپس کی مفاہمت میں جو فرق ہے اس نے ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر دی۔ ممکن ہے بہت سے لوگ اسے شاعری کا موضوع ہی قرار نہ دیں۔ لیکن جن کے دل میں خودداری کا جذبہ ہے۔ جنھیں اتحاد سے محبت ہے وہ اس ملاقات کی جذباتی حیثیت کو نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے واقعات کا جو ردعمل لوگوں پر ہوتا ہے اس سے اُن کی سماجی اور سیاسی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اختر نے جو مختصر سی نظم اس ملاقات پر لکھی ہے اس کا خلوص، اس کی بحر کی سنجیدہ عظمت، اس کا ترنم سب قابل مطالعہ ہیں۔ یہاں شاعر پھر ملک کے اجتماعی صحت مند احساس کا ترجمان بن جاتا ہے اور موضوع وقتی ہونے کے باوجود عظمت اختیار کر لیتا ہے۔

اس مختصر بحث سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اختر انسان دوستی کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ وہ ان قدروں کو عزیز رکھتے ہیں جن سے زندگی میں حسن، لطافت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ تمام چیزیں جو ان قدروں کی مخالف ہیں۔

کہ یہ زندگی کیا ہے پینا پلانا
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

پوری نظم دلکش ہے۔ راستہ روکنے والوں میں مناظر۔ تخیل۔ خانقاہیں غدار جھوٹے رہبر۔ اندھیری فضائیں سبھی ہیں۔ یہی وہ ٹھگ ہیں جو منزل تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اور آج کا جو انسان ان چیزوں سے واقف نہیں۔ اس کا شعور مشکوک ہے دشواریوں کا اندازہ نہ لگانا یا انھیں نظر انداز کر دینا خالص تصور پرستی اور رومانیت ہے۔ ہماری موجودہ دنیا شعلوں میں گھری ہوئی ہے عقل کہتی ہے آگ بجھ سکتی ہے۔ جی چاہتا ہے یہ آگ بجھ جائے لیکن عمل کی طاقت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ نظریہ کے بغیر عمل دیوانگی ہے۔ عمل کے بغیر خواہش خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے آج ہر شخص کا سماجی شعور جانچنے کے لئے یہی چیز کسوٹی کا کام دیتی ہے کہ ایک شخص کوئی قابل عمل نظریۂ زندگی رکھتا ہے یا نہیں۔ ایسا نظریہ محض خود پسندی یا انفرادیت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اور اختر اجتماعی جدوجہد کے ذریعے اپنے نظریہ کو عمل میں بدلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ کتنے خوبصورت بند اور کتنے پُر خلوص الفاظ ہیں ؎

هم اپنے وطن کی آنکھوں کو کب تک یونہی پُر نم رکھیں گے
بکھرے ہوئے اس شیرازے کو کیا آج بھی برہم رکھیں گے
کب مل کے بڑھیں گے میداں میں کب دوش پہ پرچم رکھیں گے
اے اہلِ وطن
اے اہلِ وطن
یہ دھوپ چمکتی تیغوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے اک آنچ میں گل سکتی ہے ابھی
ہم مل کے اٹھیں تو یہ دنیا اک پل میں بدل سکتی ہے ابھی
اے اہلِ وطن
اے اہلِ وطن

اس مجموعے میں سنہ ۱۹۳۸ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک کی نظمیں ہیں اور یہ زمانہ ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاست میں غیر معمولی اضطراب کا حامل رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم۔ ہندوستانی رہنماؤں کے اختلافات۔ عوام کی بدحالی۔ معاشی تباہی۔ قحط بنگال۔ جمہوری طاقتوں کی فتح۔ آزادی۔ فسادات۔ امریکی اور برطانوی سامراج کی سرکردگی میں جنگی اکھاڑوں کی تعمیر اور روس کی قیادت میں امن کے لئے عملی اقدام۔ چین کا انقلاب۔ ان پے در پے واقعات نے لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ بن کر حقیقتوں اور خواہشوں کو اس طرح اُلجھا دیا کہ مخلص انسان دوستوں کے پاس مستقبل کی اُمید کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔ کبھی حالات نے ذہن میں امید کی بجلی چمکا دی کبھی ایسی تاریکی میں ڈھکیل دیا جہاں عقل کا دم گھٹنے لگے۔ اُمید اور مایوسی کی اس آویزش کا مقابلہ اختر نے بھی کیا جیسا کہ ہر حساس ہندوستانی نے کیا ہے۔ لیکن اختر کبھی مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے۔ ان کی نظموں میں اس احساس کی نمود ہے کہ آج کی جدوجہد کل کی آسودگی کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے جدوجہد کو رکنا نہ چاہیے۔

ایک ایک نظم کو سامنے رکھ کر ان واقعات اور حالات کا جائزہ لینا اس مقدمہ میں ممکن نہیں جو دس بارہ سال کے عرصہ میں رونما ہوئے یا جنھوں نے اختر کو متاثر کیا۔ لیکن اگر ہم ذرا غور سے اُن کے کلام کو دیکھیں تو بہت جلد ہمیں اس کا اندازہ ہو جائیگا کہ

لیکن تمام انسانی شعور کی مادی نوعیت کو پیش کر کے بڑے شاعرانہ انداز میں انسانی مستقبل کی تصویر دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیاروں کو خود اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ انسان کے عروج کی منزلیں مادی حقائق پر قابو پانے کی وجہ سے آ گئی ہیں۔ نظم کے خاتمے پر ہم اس "سُرخ ستارے" اور اس آدم نو سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں کائنات کی رہبری ہے۔ اس نظم سے نہ صرف اختر کی واقفیت۔ علم اور حقیقت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس قدرت بیان کا پتہ بھی ملتا ہے جو ہر شاعر کو عطا نہیں ہوتی۔

مقدمہ طویل ہو گیا۔ اور اختر کی شاعری کے متعلق جو بہت سی باتیں کہنی تھیں وہ نہیں کہی جا سکیں۔ اس میں ان کے فنی شعور کا ذکر نہیں۔ ان کی رنگینیٔ بیان کا تذکرہ نہیں۔ کیف اور تغزل کی جانب اشارے نہیں کئے گئے ہیں۔ اختر اپنے موضوعات کے لئے کیسے الفاظ اور کیسی بحریں۔ کیسے ترکیب بند۔ اور کیسی مترنم ہیئت ترکیبی کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کی طرف بھی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ طرزِ اظہار اور حسنِ بیان پر نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ خوبیاں ایسی ہیں جن کے بغیر کوئی اچھی نظم وجود میں نہیں آ سکتی۔ صرف موضوع سے نظم کا ڈھانچہ نہیں بنتا۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ اچھی نظموں میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کے حسن کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اختر کی شاعری میں رنگینی اور موسیقیت عام طور سے ملتی ہے۔ اور گو کہیں کہیں شدتِ احساس کی کمی سے نظم ہلکی پھلکی چیز بن جاتی ہے لیکن اس کے انداز بیان سے بڑی حد تک اسکی تلافی ہو جاتی ہے۔

خاتمہ پر میں ایک نظم "آج کل" کے متعلق چند لفظ لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس نظم میں بڑی سادگی سے اختر کی شاعرانہ اور فکری جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اختر آج کے حقائق سے آنکھیں نہیں چراتے اگرچہ وہ تلخ ہیں لیکن وہ "کل" سے مایوس نہیں ہیں۔ "کل" جو اپنے بس میں ہے جس کی تشکیل اپنے ارادے اور خواہش سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس "کل" کی تشکیل آج ہی کے عمل سے ہو سکتی ہے قوانین فطرت کا بدلنا ہمارے امکان میں نہ ہو لیکن ان کو سمجھ کر ان سے بچنا یا ان سے کام لینا تو ممکن ہے اس لئے "کل" کا پروگرام آج ہی سے شروع ہونا چاہیئے۔ سماج انسانوں نے بنایا ہے۔ وہی اس کو بدل سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ آج ہر ترقی پسند کا ہے۔ اور یہی عقیدہ اختر کا بھی ہے، علوم اور سائنس کے تجربات اس عقیدے کے پشت پناہ ہیں۔ "کل" کیا کرنا ہے اس کا محض نقلی آمیز یا جذباتی اظہار بھی ہو سکتا ہے اور حکیمانہ بھی۔ اختر نے دوسری راہ اختیار کی ہے۔ اس نظم کے پڑھنے سے ان کے مطالعہ اور نقطۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چند شعر دیکھئے۔

کل کریں گے ہر طرح کے تجربے　　　حل کریں گے خیر و شر کے مسئلے
کل کریں گے کوششیں پرواز کی　　　چھو سکیں گے اہرتک آواز کی
کل مہ و خورشید پر پھینکیں گے دام　　　قبضۂ انساں میں ہوں گے صبح و شام
برق پاروں کا تراشیں گے جگر　　　تجربے پیہم کریں گے روح پر
جان لیں گے موت کا راز نہاں　　　زندگانی کو کریں گے جاوداں

اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انسان کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اگر اسے آزادی۔ امن اور سکون نصیب ہو تو وہ فطرت کے اسرار معلوم کرنے میں لگ جائے لیکن ابھی تو "چاک کرنا ہے گھٹاؤں کا نقاب" "تب روشنی صبح انقلاب" چمک کر ضمیر انسانیت کو منور کر دے گی اس وقت بہار آئے گی "سرخ بہار" جس کے سب منتظر ہیں۔ اگر ہماری امید عقیدے اور عمل کی طاقت پر مبنی ہے تو یہ انتظار رائیگاں نہیں جائے گا۔

انہیں اظہار نفرت پر مجبور کرتی ہیں، مذہبی منافرت، فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت کے مہیب واقعات نے ان کو کئی نظمیں لکھوائی ہیں۔ آزادی کے فریب نے ان کی تخیل کو مہمیز کیا ہے لیکن ان کا لہجہ غیر معتدل اور انداز بیان غیر سنجیدہ نہیں ہونے پایا ہے۔ بنگال اور بہار اور فریب بہار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان نظموں سے اشعار لے کر ان کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی فلسفیانہ پیچ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت کا شاعرانہ اظہار ہے۔ جن پر شاعر کے عقائد اور اس کی تمناؤں کا عکس پڑ رہا ہے۔

ابھی دوسری جنگ عظیم کا بہا ہوا خون زمین میں جذب بھی نہیں ہوا تھا کہ سامراجی اور سرمایہ دار قوتیں پھر جنگ کا کھیل کھیلنے پر تیار ہو گئیں۔ سیاہ اور مہیب بادل چھا گئے۔ لیکن امن دوست اور آزادی پسند آنکھیں اس تاریکی میں بھی امید کی کرن دیکھ رہی ہیں۔ عوام کی جد و جہد۔ امن پسندی اور ترقی کی خواہش سے پیدا ہونے والی کرن۔ اختر کی نگاہیں عوام کی کروڑوں آنکھوں کے ساتھ مل کر اس کرن کو اچھی طرح دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے انہوں نے شکست افسوں کی سی خوبصورت نظم لکھی ہے اور شمالی کوریا کے عزم آزادی کو سراہا ہے۔ "جنگ یا امن" ایک پر خلوص اور انسان دوست ترقی پسند کی وہ آواز ہے جو اس نے مصلحت یا وقت کے تقاضے کی بنا پر نہیں بلند کی ہے بلکہ جنگ سے نفرت اور امن سے محبت اس کا عقیدہ بھی ہے اور طریق کار بھی۔

تلاش فردا کے تین حصے ہیں۔ اس وقت تک انہیں نظموں کا ذکر تھا جو پہلے حصے "شمار حبتہ" میں شامل ہیں اور مختلف عنوانات پر مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ دوسرے حصے "شعلۂ آگہی" میں چار فلسفیانہ اور مفکرانہ نظمیں ہیں ان نظموں کے مطالعہ سے اختر کی شاعری کی وہ فکری بنیاد مل سکے گی جس پر ان کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ ریاست کیا ہے؟ ارتقا کیا ہے؟ انسان کے ارادہ اور عمل کی حقیقت کیا ہے؟ ان باتوں کو جاننا انسانی جد و جہد کی سمت پہچاننے کے لئے ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ موضوعات شاعری کے دائرے سے خارج دکھائی دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی موضوع جس نے سینے میں ہلچل مچائی ہے اور جذبات پیدا کئے ہیں ان کا اظہار شاعرانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ شاعرانہ انداز بیان میں کامیابی کی کسوٹی یہ ہے کہ ان میں کیف اور لذت شاعرانہ حسن اور رنگینی کا وجود ہے یا نہیں۔ گو اختر کو تمام نظموں میں یکساں کامیابی نہیں ہوئی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بعض نظموں کے لئے قافیہ کی سخت پابندی اپنے اوپر عائد کر لی ہے۔ لیکن جو شخص بھی دانائے راز اور تاریخ تصویریں کا مطالعہ کرے گا اسے آگہی کے ساتھ لذت اور شاعرانہ کیف کا بھی احساس ہوگا۔ کون ایسا ہے جو اپنی عظمت اور سربلندی کی پرشکوہ داستان سنے گا۔ اور اس کے سینے میں گرمی اور آنکھوں میں غرور کا انداز نہ پیدا ہوگا۔

تیسرا حصہ ایک طویل نظم ستاروں کی صدا پر مشتمل ہے۔ یہ نظم مثنوی کی چھوٹی بحر میں بڑی روانی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ سیاروں کی دنیا میں انسان کا مرتبہ زیر بحث ہے۔ قمر جو انسانی عظمت کا راز داں ہے اس مکالمے کو شروع کرتا ہے اور سیاروں کے سوالوں کا جواب دیتا ہے اور ان کے غلط دعووں کو جھٹلاتا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر بعض حضرات یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ آخر ارتقائے انسانی کے مسائل کو سمجھانے کے لئے سیاروں کی گفتگو کا سہارا کیوں لیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنے اظہار اور ابلاغ کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے مختلف طریق کار اختیار کرتا ہے۔ اور "سر دلبراں" کو "حدیث دیگراں" میں بیان کر کے اپنے اصل مقصد کو پہنچتا ہے۔ سیاروں کے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کے وہم کو بے اثر بنانے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ انہیں کے دلائل سے ان کو شکست دی جائے۔ انہیں کے مصطلحات میں گفتگو کر کے ان کو بہتر اور برتر حقیقت سے روشناس کیا جائے۔ اس لئے اگر اختر نے اس نظم کے ذریعے وہم کے اس طلسم کو چاک کیا ہے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انسان ارتقا کے جن مدارج سے گذرا ہے تہذیبی زندگی میں اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے سیارے اس کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے ہیں۔

کے اثرات جذب کر کے پچھلے پچاس سال میں جتنی دور تک میدان مار لینا چاہیے تھا اس نے مارا نہیں، پرانی فصیلیں توڑی نہیں، انہیں چند گز آگے سرکا کر انہی کے اندر اپنا ٹھور ٹھکانہ کر لیا اور یوں اردو کی رسیلی، جاندار شاعری کو معاصر عالمی زبانوں کے شاعرانہ معیار تک پہنچنے کے لئے اگلی کامیاب بغاوت کے انتظار میں رہنا پڑا۔

جاں نثار اختر نے گوالیار میں آنکھ کھولی (۱۴ ۱۹۱۴ء) ۱۴ برس کی عمر میں وہ اپنے سخنور اور ذی علم باپ مضطر خیرآبادی کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ باپ سٹی مجسٹریٹ اور سشن جج رہ چکے تھے۔ بچے کھچے اثاثے میں دو پرانی کاریں اور ایک بڑی حویلی رہ گئی تھی۔ ایک سگی ماں تھیں اور ایک سگی بہن، ماں کے یہی اکلوتے بیٹے تھے۔ آسائش سب طرح کی، رکاوٹ کسی طرح کی نہیں، چشم نمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ صورت شکل کے اچھے تھے۔ کتابی چہرہ، چوڑا ماتھا، گندمی رنگ، میانہ قد، لکھنے پڑھنے میں تیز، طبیعت کے بھولے بھالے اور وارفتہ، باتوں میں نرمی اور سلیقہ، زلفوں میں بل، اعلیٰ خاندانوں میں رسائی، غزل گوئی اور غزل خوانی کا جو سر و سامان، جو ماحول انہیں باپ اور بزرگوں سے ملا اس کی بدولت گوالیار کے دوران قیام میں (ہائی اسکول پاس کرنے تک) وہ غزل کے اساتذہ کا کلام ازبر کر چکے تھے۔ تغزل اپنے لچکیلے ناز پرور وجود میں بسا چکے تھے۔ اگر وہ خود نہ بتائیں تب بھی ان کی ابتدائی نظمیں، غزل چپکے سے بتا دیتی ہیں کہ اچھے گھر کے نوخیز پر جن درختوں کے دانے چھونے کی مناہی ہوتی ہے ان کی شاخوں میں وہ پہلے ہی جھولا ڈال چکے تھے۔ اور کچے پکے پھل چکھ چکے تھے۔ شبلی کا یہ شعر بلا وجہ ان کی زبان پر نہیں آتا ہے

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال
بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

علی گڑھ یونیورسٹی وہ ایسے وقت پہنچے جب وہاں نوجوان باغیوں اور منکروں کی ایک نسل آئن سٹائن کے سائنسی نظریات، مارکس کے فلسفے، انقلاب روس کی گونج، اقبال کے آہنگ، جوش کے طنطنے، آزادیٔ ہند کے ولولے، جواہر لال نہرو کی تقریریں، انگریزی کے آزاد پسند رومانوی شعرا کے کلام اور روسی ادب کی حقیقت پسندی کے ملے جلے منظر سے آنکھیں سینک رہی تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے دس برس انہوں نے یہیں گزارے اور یہیں سے زاد سفر لیا۔

یونیورسٹی کے آخری کورس کی کتابیں، سیاسی اور ادبی مسائل پر دانشورانہ بحثیں، مارکسی ایتھکس کا فلسفہ، خیرآباد (بزرگوں کا وطن) کی شاندار علمی روایات، ہڑتالیں، انجمنیں، اور پھر آخری امتحان کی تیاری اور تدبیریں بھی اس شامیانے کی طنابیں نہ کاٹ سکیں جس شامیانے میں انہوں نے یہ اندر سبھا سجا رکھی تھی۔ نوجوانی کے کلام میں نام تو صرف دو لڑکیوں کے ملتے ہیں لیکن جھلک اور بھی کئی چہروں کی ہے جو محض تخیلی نہیں تجرباتی شگفتگی لئے ہوئے ہیں۔

غزل اور رعنائی آب و رنگ کے شعر ان کی افتاد طبع کے عین مطابق تھے کہ اتنے میں ترقی پسند خیالات کی ادبی تحریک نے زور پکڑا۔ اخباروں، رسالوں، یہاں تک کہ مشاعروں میں بھی موضوعاتی نظمیں پسند کی جانے لگیں۔ دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے سے پہلے ہندوستان کا سیاسی پارہ کافی چڑھ گیا۔

جن لوگوں نے ۴۰—۱۹۳۰ء دہکتی دہائی کا ہنگامہ خیز دور نہیں دیکھا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس وقت کے بہترین طالب علم، ذہین وسیع النظر اور نمایاں نوجوان نصاب کی کتابوں کے باہر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں ڈگریوں اور کیریئر کے بجائے ملک کی آزادی اور انقلاب کی دھن رہتی تھی،

اسپین کی خانہ جنگی، یورپ میں بڑھتے ہوئے فاشزم کی تیاریوں سوشلزم کی کامیابیاں ان کے خون کو حرارت اور حوصلوں کو ایک سمت عطا کرتی تھیں۔ اسی ماحول میں جاں نثار اختر کا سیاسی سماجی اور فنی شعور ریلا بڑھا، مٹھاس میں ہلکی سی ترشی بھی

ڈاکٹر ظ - انصاری

جاں نثار اختر اور اُس کی شاعری

اگر ایک سانس میں کلاسیکی رومانٹک شاعری کہنا مناسب ہو تو ہماری زبان کے موجودہ دور میں وہ جاں نثار اختر کا کلام ہے کہ اسے کلاسیکی نوک پلک اور رچاؤ ورثے میں ملا ہے، رومانوی دور کی زبان، والہانہ انداز اور آزادانہ برتاؤ اُن کے مزاج نے بخشا اور مطالعے نے اُردو کے پُرانے دفینے کی کنجیاں حوالے کر دیں۔ وہ یوں تو کسی رنگ میں بند نہیں لیکن اصل رنگ غنائی ہے۔ ذاتی بھی، سماجی بھی۔

۱۹ ویں صدی کی رومانٹک شاعری نے کلاسیکی اصول پرستی، ضابطہ بندی کی حدود توڑ دینے اور جذبے کے تلاطم میں بہ جانے کا اعلان کیا تھا۔ جذباتی شدّت کے اس والہانہ اظہار کا تخیلی دنیا کے اِن پیکروں کا سایہ شعر کے لب و لہجہ پر پڑنا لازمی تھا، لیکن خود رومانٹک پوئٹری کے علم بردار اپنے قدیم ذخیرے کی قدر و قیمت سے اس کی گنجائشوں، نزاکتوں اور باریکیوں سے اس قدر باخبر اور مانوس تھے کہ وہ اپنے اپنے انداز میں منحرف تو ضرور ہوئے سراسر منکر نہ ہو سکے۔ جاں نثار اختر نے تو منکر ہونے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔

یورپ کے اس ادبی رجحان کا علم ہمارے زبان کے جدید اہلِ قلم کو ۱۹ ویں صدی ختم ہونے سے پہلے ہو چکا تھا لیکن اس نے رنگ پکڑا ۲۰ ویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں۔ انشائیے، نثر پارے، آزاد نظمیں، نیم تاریخی ناول اور افسانے، سیاسی نظمیں، یہاں تک کہ تنقیدی تحریریں بھی اسی لپیٹ میں آ گئیں۔ یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ نوجوانوں کی پوری قطار نے جب اس ڈگر پر قدم بڑھایا تو وہ قدیم سے بیزاری اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ سے بے نیازی کا نعرہ لگاتی ہوئی بڑھی تھی لیکن چھوٹے موٹے صنعتی تجربوں کے بعد اِن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مزاج، تربیت اور اپنی سکت کے مطابق پچھلے استادوں میں سے بعض کو پُرانے ماڈل کی طرح چُن لیا اور انہیں کا رنگ سخن اپنے خیالات کی پھلکری ڈال کر اوڑھ رکھا گیا۔ میرا اشارہ فراقؔ۔ فیضؔ، جذبیؔ، جاں نثار اختر۔ مجازؔ۔ مخدومؔ، سردار جعفری، مسعود اختر جمال، اختر انصاری، جمیل مظہری، احمد ندیم قاسمی اور علی جواد زیدی سے ہے۔ ساغرؔ نظامی، شاد عارفی، فارغ بخاری، مختار صدیقی، یوسف ظفرؔ، شمیم کرہانی، قتیلؔ شفائی، مجروحؔ اور کیفیؔ بعد میں اس طرف آئے۔

ان "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" میں ایسے لوگ تھے جنھیں خدا کی خدائی اور مذہب کی پارسائی سے انکار کا حوصلہ تھا لیکن قافیے، ردیف، بحر، زمین، استعارے، کنائے کے تمام حجام کو یکسر رد کر دینے کا حوصلہ او عذرِ اپنا سوانگ رچانے کے لئے خود اپنے کا سٹیوم تیار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ترقی پسند شعراء حاضر، ہجوم کی داد بیداد سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اردو شاعری کی زبان کو مغربی شعر

۱۹۴۷ء افراتفری اور خانہ خرابی کا زمانہ تھا۔ گو الیار کی حالت بگڑی تو جاں نثار اختر بھی سالہا سال کا جماؤ چھوڑ کر نزدیک کی محفوظ ریاست بھوپال چلے آئے۔ یہاں کے گورنمنٹ حمیدیہ کالج میں شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے۔ ہمدم و دمساز بیوی بھی چلی آئیں۔ انہیں بھی یہیں ملازمت مل گئی۔ پہلی بار انہیں صحیح معنوں میں خانہ داری یا گھر گرہستی کی راحتوں کا بھرپور لطف ملا۔ یہاں ان کے قدرداں بھی زیادہ تھے۔ ادب کی ترقی پسند تحریک کا بھی جھنڈا اونچا تھا۔ وہ اس جھنڈے پر چڑھے نہیں۔ اعلانیہ اُس کے سائے میں آ گئے۔ ؎

کیا جنتا کا، کیا جیون کا ایسے بیں اپمان کریں
آؤ کھلے بندوں اب جانبداری کا اعلان کریں

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے نام پیغام ۱۹۴۹ء)

مگر چونکہ ادبی حیثیت اوروں سے زیادہ نمایاں تھی، "زلف و لب و رخسار" کے استعاروں میں چھپ نہ سکی، ابھی تین سال آسائش کے نہ گزرے ہوں گے کہ جن جن پر گہری سُرخ دھاری ذرا زیادہ گہری نظر آئی تھی قید و بند کی راہ پر آگے پیچھے روانہ کئے جانے لگے ایک تو حکومت ہند اور کمیونسٹ تحریک کی براہ راست ٹکر، وہ بھی ایک دیسی ریاست میں۔ جاں نثار اختر گرفتاری کی صبح ہونے سے پہلے بھوپال چھوڑ کر نکل گئے۔ وہ بہتوں کی طرح پاکستان بھی جا سکتے تھے۔ لیکن اُدھر نہیں گئے، بمبئی چلے آئے، بمبئی جہاں کوئی کالج تو ان کا روادار نہ ہوتا البتہ ہم سخن دوستوں کے وسیع حلقے اور شہر کی غریب نوازی میں امن پسند شاعر کی پناہ گاہ بننے کا قرینہ موجود تھا۔

۱۹۵۰ء کے شروع میں وہ بمبئی آئے ہیں۔ سال بھر میں رنگ سنولا گیا، شیروانی کے کالر اُدھڑ گئے، کرتوں کی جیبیں نکل گئیں۔ صنعتی تہذیب کی غیر شاعرانہ، تیز حرکت اور ہمہ گیر بے نیازی کی برکتوں سے بھرا پُرا یہ شہر اُن کے لئے، اُن کی شاعری کے لئے سخت آزمائش ثابت ہوا۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب یہ خوش لباس اور خوش وضع، کم سخن شاعر جیکٹ ٹیکیوں اور کٹھل رنگیتی دیواروں کے درمیان استاد خلیل کے خانقاہی کمرے پر اس آسرے میں شب و روز گزارتا تھا کہ ایک نہ ایک دن کسی فلم اسٹوڈیو کا پھاٹک چرچرا کے کھلے گا۔ اور زندگی بھی پچھلی محبوباؤں کی طرح غزل کی ڈھلی ڈھلائی زبان کی طرح اُس کی ناز برداری میں لگ جائے گی۔ سب دلآزار دور ہو جائیں گے اور بال بچے آن ملیں گے۔ وہ دن کبھی نہ آیا۔ غمگسار صفیہ دلاسا دیتے دیتے دنیا سے سدھار گئیں۔

جسمانی قربت یوں بھی آدمی کے قول و عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ فاصلے پر رہ کر جن محنت کشوں کی اور سُرخ پرچم کی ہامی بھرنے لگے تھے اس کی لے تو ۴۸–۱۹۴۷ء میں تیز ہو چلی تھی البتہ ابھی اُس طبقے سے اُس کے حامیوں کے وسیع حلقے سے براہ راست جسمانی واسطہ نہ پڑا تھا۔ بمبئی میں وہ جس محلے میں اور جن لوگوں سے قریب رہے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ سماج کی جو برہنہ لوٹ کھسوٹ دیکھی، جس بے رحمانہ تضاد کی چکی تلے نزدیک کے لوگوں کو پستے دیکھا اور خود پسے، جس جستم کے ہجوم نے اُن سے شعر خوانی کی فرمائش کی۔ وہ اُن کی غنائی لہجے سے میل نہ کھا سکا۔ ضمیر میں کانٹے چبھے اور شاعری میں بھی۔ چنانچہ کھلے میدان اور کھردرے بیان کی طرف کسی قدر جھکے۔ کئی براہ راست نظمیں اسی پانچ سات برس کی کہی ہوئی ہیں۔ "یا نگ سی کی موجو"، "پیمانۂ سُرخ"، "سجاد ظہیر کے نام"، "روس کو سلام"، "امن نامہ"، "استالن"، "ستاروں کی صدا"، "استالن پر"، "روس پر"، "چین کے انقلاب پر"، "امن عالم اور سوشلزم کی فتح مندی پر" کسی ہمعصر کے یہاں ایسی دو لوک، بے تکلف، رواں دواں مختصر نظمیں نہیں ملیں گی جیسی اُن کے مجموعہ جاوداں میں محفوظ ہیں لیکن نہ زمانے نے اُن کی دیسی قدر کی، نہ زبانوں پر ویسی آباد ہوئیں جیسی فیضؔ، مخدومؔ، کیفیؔ اور نیاز حیدر کی نظمیں۔ زمانے کا پرانا شیوہ ہے کہ جو کہا گیا ہے صرف وہی نہیں دیکھتا بلکہ یہ بھی پوچھتا ہے کہ کس نے کہا۔ شعر سے ہی شخصیت نہیں اُبھرتی بلکہ شخصیت کے پس منظر میں بھی شعر کھلتا ہے۔

شامل ہو گئی۔

نئے خیالات اور برہمی کے موڈ کو موضوعاتی اور مسائلی، تاثراتی یا تبلیغی نظموں میں ہی کھلنے کا موقع مل سکتا تھا سو انہوں نے اپنے دور کے مزاج کے مطابق کئی ایسی نظمیں کہیں جن میں انقلاب کے رومانوی تصوّر اور رومان کے انقلابی آہنگ کی پٹ ملتی ہے۔

کچھ تو قدرت کی دین، کچھ ماحول کا عطیہ کہ الفاظ پر انہیں شروع سے ایسی قدرت، بیان کی ایسی بے ساختگی میسّر تھی جو اختر کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو مگر معاملہ صرف قدرتِ کلام پر تمام نہیں ہو جاتا۔ عالم النفس و آفاق کے مسائل، جتنی کچھ جانکاری ہمارے بس میں ہو، ایسی چیز نہیں کہ شاعر، فکر و نظر کی بھاری سلیں سینے پر رکھے بغیر، کراہے بغیر گہری خراشیں تن من پر لئے بغیر انہیں مخصوص ترنم کے سانچے میں اُتار دے، سہولت بنے بنائے سانچوں کے اندر خود اُتر آنے میں ہے۔ جاں نثار اختر نے سہولت کی راہ اختیار کی۔

۱۹۴۲ء میں یہ ناز پروردہ شاعر اردو ادب پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس ناتمام چھوڑ کر گوالیار واپس آیا اور وکٹوریہ کالج میں لیکچرر ہو گیا۔ زندگی ایک مقررہ بے خطر راہ پر اور شاعری پرانی یادوں اور نئی محبتوں اور رنگینیوں کے سہارے آہستہ خرام چل نکلتی ہے۔ دوستوں کے حلقے میں ہی (مجاز کی بہن) صفیہ سے اِن کی شادی ہو گئی۔ بیوی علی گڑھ یونیورسٹی میں مُلازم تھیں، یہ گوالیار کے کالج میں، اگر ہستی کی زندگی کا آب و نمک بھی میسّر آیا اور وقت ناوقت کی چاشنی بھی۔ بیوی بھی ملی تو ناز برداری کرنے والی۔ شاعری کی حیثیت سے اُن کی شہرت اور ادب کے استاد کی حیثیت سے طلبہ میں مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ پرانی چال کے شاعر اُن کی قدرتِ کلام اور شیریں بیانی کے مدّاح تھے تو نئی نسل کے ہنرمند انہیں اپنے قبیلے کا آدمی شمار کرتے تھے۔ مرنجاں مرنج طبیعت، سادگی، بے پروائی اور تن آسانی نے انہیں ہر ایک حلقے میں یکساں پذیرائی بخشی۔ وہ خود بھی اس صورتحال سے نباہ کر بیٹھے اور اپنے سماجی شعور کو انہوں نے سماجی غنائیت civic lyricism کے پیمانے میں اُنڈیل لیا۔

نئے رجحانات کی تیزی و تلخی نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ آتشِ سیّال کو دو آتشہ کر دیا اور وہ اس ذوق میں پختہ تر ہو گئے کہ مخالف یا ناگوار حالات میں لڑتے نہیں، مُڑ جاتے ہیں، ٹوٹتے نہیں لچک جاتے ہیں اور لمحۂ فرصت کے انتظار میں نہ منھ بناتے ہیں نہ اوروں کا منہ چڑاتے ہیں بلکہ اندر کا قرار و سکون برقرار رکھتے ہیں اور اپنی ڈگر پہ سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔

یہی اِن کے شعر کا مانوس خط ہے۔

شاعرانہ اپنی ذاتی زندگی کی چھوٹی موٹی مسرتوں پر معذرت طلب ہے نہ حسرتوں کا ماتمی، کسی بڑے نشیب و فراز کا، ترچھی یا کھڑی چڑھائی کا سینہ سپر رہرو، اگرچہ پاخفتہ کی اذیت کا شائبہ نہیں۔ اس کے کلام میں سوچ ریکھا ندی ہے کہ سنگین کگاروں کے نہیں بلکہ ہموار کناروں کے درمیان مزے میں یکسانی اور دھیمے ترنم کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہے۔

یہاں ایک غور طلب نکتہ ہمیں ملتا ہے۔

تاریخ اور ان کا کلام دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ کئی نظمیں، کئی شاعرانہ ترکیبیں، مصرعے اور قطعے ایسے ہیں جو اختر کے کلام سے ہو کر ہمعصر شعراء کی زبان تک پہنچے ہیں مثلاً مجاز کی نظم "آوارہ" جب مشہور ہوئی اُس سے کئی سال پہلے ۱۹۳۸ء اختر کی نظم "بیزاری" میں محفوظ تھی۔ فیض کی وہ غزل "تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے"، کم و بیش دس سال پیشتر "در بار گزری ہے" کی ردیف میں اختر کے ہاں موجود ہے۔ جذبی اور سردار جعفری کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ عزم، بیزاری، تلخ نوائی، اُداس شام، تجربہ، مراجعت، زندگی، مراحل، غزلوں اور قطعوں کے کئی مصرعے جوں کے توں یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہمیں اُن کے ہمعصروں کے ہاں مل جاتے ہیں اور کئی سال کے وقفے سے ملتے ہیں وہاں اُن کا انداز پھیکا اور جھکا ہوا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی شانِ بے کلاہی کی بدولت خود بھی پہچانے جاتے ہیں اور شاعری کی بھی پہچان بتا جاتے ہیں۔

کی بلڈنگوں کا دلربائی اور دلنوازی کا ذکر نہیں، اُس کے شہر کے افلاس، بے رونقی، محرومی اور اداسی کی پُرسوز گفتگو ہے اور یہاں شاعر نے اپنی بھٹکی ہوئی آواز کو، غنائی لہجے کو، شہری شعور کو بیک وقت پالیا ہے۔ یہ نظم بھی نہایت کامیاب رہی اور زندگی میں نظم وضبط کی تلاش بھی۔ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ خدیجہ بیاہ کر ان کے ساتھ بمبئی چلی آئیں۔

سوویت یونین کی ۲۰ ویں پارٹی کانگریس (مارچ ۱۹۵۶ء) نے جب ستالینی سیاست پر سے ایک جھٹکے کے ساتھ پردہ سرکایا تو ساری دنیا کی کمیونسٹ پارٹی کی تحریک عموماً اور کمیونسٹ خیال کے دانشور خصوصاً لرز گئے، زلزلہ آگیا۔ ستالن تو جاں نثار اختر کی کئی نظموں کا ہیرو تھا، جھٹکا انہیں بھی لگا لیکن وہ تب تک اس چھت کے نیچے سے سرک کر نئی گھر گرہستی کی تیاری میں لگ چکے تھے۔ اگلے پندرہ برس میں انہوں نے چند مختصر عاشقانہ نظمیں اور غزلیں کہیں جن میں پچھلے تجربوں سے بھی رس نچوڑا گیا ہے اور گرہست کی راحتوں کی بھی جھلک ہے۔

جاں نثار اختر نے فلمی گردش سے جو فرصت اور راحت کے لمحے بچائے وہ زندگی کے اس ہموار رومان کی تصدیق میں صرف کئے جو پچھلی ہنگامہ خیز رنگ رلیوں سے فی الحال کہیں زیادہ قیمتی اور پُرسکون تھا۔ گھریلو زندگی کی شعریت نے اُن سے رباعیاں کہلوائیں کہ مختصر بھی ہوتی ہیں، ذہنی کاوش کا ایک لمحہ ہوتی ہیں اور رنگ برنگی تصویروں کا البم بھی۔ "نذر بتاں" کا شاعر گھوم پھر کر زندگی کی کڑی دھوپ سے چل کر بالآخر "گھر آنگن" میں اتر آیا۔ رباعیات کے اس مجموعے "گھر آنگن" کی شانِ نزول میں کرشن چندر نے لکھا ہے:

"..... اختر کے دھیمے دھیمے لہجے، متوازن، معتدل مزاج اور گہرے دھارے کی طرح اندر ہی اندر بہنے والے جذبے نے اس مشکل موضوع سے مکمل انصاف کیا ہے اور اردو شاعری کو ایک نیا تجربہ، ایک الگ موضوع اور ایک نیا تصور عطا کیا ہے جو بیک وقت قدیم بھی ہے اور جدید بھی ..... اختر کی محبوبہ گھر کی بیوی ہے کام کرنے والی عورت ہے ...."

۱۶۴ رُباعیوں کے اس مجموعے کا شجرۂ نسب بھی اُن کی غنائی قطعات اور رومانوی نظموں سے مل جاتا ہے، بمبئی کی پیچ دار، بھرے تضادوں اور بڑی سچائیوں والی سرزمین نے انہیں کم کانٹوں میں نہیں گھسیٹا لیکن اس میں وہ شر بھی شامل تھا جس کے بطن سے خیر کی ولادت ہوتی ہے۔ آدمی بذات خود باتدبیر کبھی نہیں رہے لیکن وارفتگی کا وہ گُر جانتے ہیں جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

دیوانہ باش، تا غم تو دیگراں خورند

دوسروں پر اپنی فکر ڈال دینا اور وقت ضرورت دوسروں کے سایے میں دبے قدموں چلنا انہوں نے سیکھ لیا تھا، سو کام آیا۔ فلمی گیتوں کی سرگرمی میں وہ کسی کامیاب قافیے کی ردیف بن گئے اور یوں دشواریوں کے دس برس ایزی سے کم لمبا شاعر دوستوں کی ردیف بن کر کھینچ لے گئے۔ "گھر آنگن" مجموعے کی رباعیاں اپنے سے پہلے کی رباعیوں، رومانی قطعوں اور غزلوں کا ہی ترقی یافتہ اور نکھرا ہوا سلسلہ ہیں۔ رومانوی طبیعت نے کچھ تو عمر، کچھ تجربے اور مشاہدے کے دباؤ کے سبب فضائی پرواز کے بجائے زمین پر قدم ٹیک دیئے ہیں۔ فضا میں بکھری ہوئی جن لہروں کو وہ ایریل کی مدد سے لفظوں میں اسیر کرتے تھے۔ اب وہ لہریں زمینی تار (EARTH) کے ذریعہ لپٹی چلی آرہی ہیں۔ جسم و روح کی آسائش نے ارضی بنیاد اختیار کرلی ہے۔ زندگی کا یہ وہ رُخ ہے جو دنیا کی بڑی شاعری یا تو بہت کمیاب ہے یا کم آب ہے۔ شاید اس کا سبب بڑے فنکاروں کی پرائیویٹ زندگی کی ناہمواری ہو بہرحال نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ فراق گورکھپوری نے جو اپنی "روپ" کی رُباعیوں کو ایک اچھوتا شعری کارنامہ قرار دیتے ہیں، جاں نثار اختر کے اس مجموعے کے بارے میں لکھا ہے:

"...... ایسی شاعری ہمارے لوک گیتوں میں بھرپور انداز سے پیش کی گئی ہے۔ بلند اور شاندار ادب میں یہ موضوع

ورنہ فیض کے اس قسم کے شعروں میں تاثیر کہاں سے آتی ؂

وہ بات جس کا فسانے میں کوئی ذکر نہیں
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

۷ ارجنوری ۵۳ء کو صفیہ کا انتقال ہوا۔ "خاکِ دل" مرحومہ کے درد میں ڈوبی ہوئی نظم ہے اور "خاموش آواز" ایک سال بعد صفیہ کے مزار سے آتی ہوئی آواز کی صدا بندی ہے جو پہلی نظم سے زیادہ پُراثر اس لئے بھی ہے کہ شاعر یہاں محجوب نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں غزل، مثنوی اور مرثیے کا فرق درمیان سے اُٹھ گیا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھری جوانی میں جہاں سے اُٹھ گیا ہو۔ ایک اور مرثیہ نظم کے انداز میں اسی سال دو سوگوار نظموں کے درمیان کہا گیا۔ اور وہ ہے ستالن روس کے مردِ آہن کا مرثیہ۔ اس کو اپنی شاعرانہ خصوصیات کے باوجود پہلی دو نظموں سے کوئی نسبت نہیں ان تینوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے تاثیر اور تاثر کا ایک فرق کھلتا ہے۔ غالباً یہ رمز خود شاعر پر بھی اُنہی دنوں کھل گیا ہو۔ اسے اپنی افتادِ طبع، مشقِ سخن اور شاعری کے حدود کا احساس ہو گیا اور وہ خود کو اُبھارنے کی کوشش میں اپنے بعض معاصرین کی طرح اقبال، جوش یا فیض کی گت پر تال نہیں دینے لگا۔

اختر بچپن سے آج تک تنہا نہیں رہے تھے۔ ۱۹۵۵ء آتے آتے انہیں ہر قسم کی تنہائی اور اداسی نے گھیرنا شروع کر دیا۔ قدیم رنگِ سخن کے رسیا اُن کے براہِ راست سیاسی نظموں کو نمائندہ قرار دے کر پہلو تہی کرنے لگے۔ نقارخانے میں ان کی آواز نہ پہلے بلند تھی نہ اب بلند ہو سکی۔ فلموں میں ان کے گیتوں کی مانگ نہیں بڑھی، دونوں بچے نانیھال میں باپ کے دستِ نگر، مجبور اور دور۔ کمیونسٹ تحریک کا انقلابی کردار سرد پڑنے لگا۔ کچھ عمر کا، کچھ یوسفِ بے کارواں ہو جانے کا احساس کہ انہوں نے شعر سے ہاتھ روک لیا۔ بھوپال کے بار بار کے دوروں میں انہیں پھر سے خانہ آبادی کے مزے آنے لگے اور اس کی سبیل بھی پیدا ہونے لگی، ایک فن کار گھرانے کی سنجیدہ، باوقار بیٹی خدیجہ نے اس زخم کو رفو کرنے کی تدبیر کی جو صفیہ کے بعد سے برابر رستا رہا تھا۔

۱۹۵۵ء میں انہوں نے ایک ہی قابلِ قدر نظم کہی ہے، وہی جو خدیجہ سے خطاب ہے "تمہارے شہر میں" یہ نظم انجمن ترقی پسند اردو (ہند) علی گڑھ کے شائع کردہ مجموعۂ انتخاب "جاں نثار اختر" میں شامل ہے یہ نظم جو اس قابل ہے کہ پوری کی پوری نقل کی جائے۔ تین بندوں میں یوں سمٹ آتی ہے۔

تمہیں بتاؤ تمہارے حسین باغوں میں ؎ یہ بات کیا ہے جواں قہقہے بلند نہیں
یہ بات کیا ہے کہ کتنے ہی لوگ کہتے ہیں ؎ کہ اُن کو کوئی بھی تہوار رہ کو پسند نہیں

نظر اُٹھا کے تو دیکھو یہ جھلملاتی رات ؎ تمہارے گھر کے سیہ آنگنوں پہ ہنستی ہے
تمہارے صحن میں جلتے ہوئے چراغوں سے ؎ بجائے نور کے اک تیرگی برستی ہے

میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو ؎ تمہارے شہر کو کیوں ظلمتوں نے گھیرا ہے
میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو ؎ تمہارے شہر میں تم ہو تو کیوں اندھیرا ہے

یہ نظم اُن کے لکھنے، سوچنے اور پختہ تر مذاقِ سخن کی طرف واپس ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ محبوبہ (یا ہونے والی بیوی) سے محبت

تلخیوں، پرچھائیوں کے ذاتی تجربوں کے ساتھ لئے اُس محفل میں قدم رکھتا ہے جہاں "عہدِ حاضر کی حیثیت" ایک کوڈ ورڈ۔ (شناختی لفظ) ہے۔ اور خود وجودیت سے جدیدیت تک مختلف اصطلاحوں کی رنگارنگ جھنڈیاں ٹنگی ہوئی لہرا رہی ہیں۔ یہاں تک پہونچنے میں اسے کوئی طول طویل یا دشوار گزار سفر نہیں کرنا پڑا۔ "بس ایک نہیں کی نہیں ہی" اتنا ہی۔ اور وہ نہیں بھی اُس نے کوئی اونچی آواز میں نہیں کی، اب غزل کے لہجے سے ہم آہنگ ہوکر روزمرہ کے الفاظ اصطلاحوں اور استعاروں کو اپنا کر اپنی غزلوں کا تار باندھ دیا جو صورت و معنی کے اعتبار سے جدید تر بھی ہیں اور پُرانی شاعری کی روش کا ایک تسلسل بھی ہیں۔

صنعتی تہذیب کی بے دردی سے آزردہ، تلخ، ناتراش، برہم اور کف در دہن باتیں جو اپنے پچھلے برمابھی سے بے خبر کم سواد یا بدذوق شاعر کہنے پر آتے ہیں تو ان کے جبڑے سخت ہو جاتے ہیں اور دہن بگڑ جاتا ہے کم و بیش وہی باتیں جاں نثار اختر اپنی تازہ غزلوں میں تین چار سال سے کہہ رہے ہیں۔ مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ولی کی سادگی و سادہ بیانی کو قائم کی پختگی و پُرکاری کو میر کے سوز کو، آتش کی مرصع کاری کو، نظیر کے کھلنڈرے پن کو اور مشاہدۂ کائنات کو، جوش کے زمرے اور پُرگوئی کو ہمارا زمانہ یہ بلاکشی دور بل گیا ہے، شاید وہ کہیں ہمارے آس پاس جی رہے ہیں اور اس طرح اُن کی عمروں پر اُن کے لباس پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ پہلی بیوی کے دونوں بیٹے لکھ پڑھ کر بڑے ہوگئے اور ترقی کی راہ پر تیزی سے بڑھنے لگے۔ دوسری خانہ آبادی سے دو بچیاں ہوئیں، دونوں ہونہار نکلیں۔ ان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اختر کی پدرانہ شفقت بھی بڑھی موت و حیات کی کش مکش سے نکل کر جب انہوں نے گھر پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ شاعری کا اُثاثہ دوسروں کی بہو بیٹیوں سے ہی نہیں، اپنی بیٹی سے بھی ملتا ہے، کم عمر بیٹی کو خطاب کرکے ایسی پُرسوز، حقیقت پسندانہ نظم کہی جس کی مثال کثرتِ الفاظ کی ایک خامی کے باوجود ہمارے پورے ادب میں نہیں ملتی—

یوں اس نظم پر اُن کی شاعری کا دائرہ مکمل ہوگیا۔

اُدھر چار پانچ برس میں انہوں نے کیا خیالات، کیا واردات، کیا اپنے پیشے کی مصلحتیں، زندگی کی صعوبتیں، ان سب میں یک گونہ بے خودی، اور "آزادہ روی" کا شیوہ پھر سے اپنا لیا ہے اور اس کا اثر انتخابِ الفاظ پر بھی پڑا ہے، نظر، جادو، گیسو، خوشبو، نغمہ، سایہ، شاخِ چمن، بوئے گُل، گود، ہار، سنگھار، لوح، بجلی، گھلاوٹ، رسیلا، مہک، نگار، نیند، چراغ، لو، خاموشی، ترنم، مئے، مینا، جھانجھ، پازیب، ستار، بساط، حسین، جوانی، راگ، آگ، سُہاگ، رقص، ساز، مستی، بیخودی، لال فت، بے خواب اور اسی قبیل کا غنائی سر و سامان تو پہلے سے موجود تھا۔ اب اس محفل میں گلیوں اور بازاروں کے، رسالوں اور اخباروں کے وہ روزمرہ بھی آبیٹھے جنھیں غزل کی شائستہ محفل سے باہر رکھا جاتا تھا مثلاً:

کھل جانا، کھلنا، آنے پیسے، ناول، رومان، دوپٹہ، دھان، برکھا، فٹ پاتھ، ساڑی کی دوکان، گھر کے روشندان، پیتل کے گلدان، مدھر راگ، اوقات برباد، جاڑے کی دھوپ، ذہن کتابوں میں دھنس گیا، اخبار کا دفتر، یہ صدی، بیچ کے سوچنا، مصلحت کی منافی، چہرے پڑھنا، الگ سے سوچنا، حقائق کی چٹانیں، جسم کی شمعیں، پیڑوں کے درمیان، پیار سے ڈرنا، بے چہرہ لوگ، گیگ کی کتھا، اتہاس، رام کا بن باس، بدن کی تہذیب، آدمی کا وجود بکھر جانا، بھیک پر گزارا، پہچانا ہوا گاؤں، زندگی کا بد دعا سا لگنا، افواہ اڑا دی جائے، جاڑے کی گلابی راتیں، سینوں کی برف پگھلنا، درد چمک اُٹھنا، تاریک مکان، بیچ راستے میں لاش، رچھاوں کی طرح چند سکے، شوالوں کی طرح سینے، صنم سنگ بدن۔

یہ الفاظ و تراکیب اور ان کے تلازمے، شاعر اور شعر کے درمیان خلوص کے رشتے کا بھی پتہ دیتے ہیں اور یہ بھی جتلاتے ہیں کہ ہر ایک تاریخی دور کا نمائندہ اور بیش قیمت ادب زندگی کی ایسی نعمت ہے جو نہ اپنے ورثے سے بیزار ہے، نہ اگلے تجربے سے

اور اس کے ہزاروں پہلو سورداس کے پدوں میں دکھائے گئے ہیں۔ جاں نثار اختر نے یہی نعمت ہمیں اُن رُباعیوں میں
دے کر ہم سب پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔"
رباعیوں کے اس مجموعے کو شاعر نے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے ایک مرد کی طرف سے ایک عورت کی طرف سے۔ اظہارِ عشق۔
اظہارِ تمنا اور گرہست کی شادمانیاں، محرومیاں اور چھیڑ خانیوں کا عورت کی زبان سے شاعرانہ بیان تو ضرور ہمارے
لوک گیتوں اور بلند پایہ شاعری میں مل جاتا ہے۔ مرد کی زبان سے اس کا ذکر لطیف برائے نام ہی ہے، اردو میں عظمت اللہ
خاں، مقبول احمد، منظور حسین شور۔ مسعود علی ذوقی نے البتہ کچھ نمونے پیش کیے، مگر بس وہ نمونے ہی تھے۔ اردو شاعری پر
نہ گہرا نقش چھوڑ سکے نہ اُس کا رُخ موڑ سکے، رُخ موڑنا تو اختر کے بس کی بات بھی نہیں البتہ انہوں نے رباعیوں میں اور اس سلسلے
کی چند نظموں میں مشقِ سخن کا تجربہ نہیں کیا بلکہ زندگی کی جذبات کی ایک صداقت کا تجزیہ کر کے اسے شاعرانہ پیکر بخشا ہے اور
اس میں شاعرانہ صداقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کم و بیش آدھی رباعیاں شریک حیات کی زبانی ہیں۔ جن میں اختر حسب معمول
ایک محبوب نظر آتے ہیں جن کی ناز برداری کی جاتی ہے اس قبیل کی شاعری نے پھر اختر کے تازہ قدرداں پیدا کر دیے ہیں۔ انہیں
قدرداں میں ایک پُر اسرار چہرہ تاریخ ادب کا بھی ہے اردو ادب کی کوئی تاریخ ایسی نہیں لکھی جا سکتی جس میں عظمت اللہ خاں،
خوشی محمد ناظر، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور فراق کا ذکر تو ہو لیکن جاں نثار اختر کے "گھر آنگن" کا تذکرہ رہ جائے۔
ٹوٹتے ہوئے خاندانوں کی موجودہ تہذیب کے خلفشاروں میں ایک کنارے بیٹھ کر جو یہ موتیوں کی مالا انہوں نے پروئی ہے وہ خود
اُن کی شاعری کے گلے کا ہار بن گئی ہے۔

امن نامہ، سیاسی مثنوی کے ۴۶ مسلسل اشعار میں جب انہوں نے ہندوستانی سبھیتا کی نزاکتوں، قدامتوں،
اور نفاستوں کی سلامتی کی دعائیں لہک لہک کر مانگی تھیں (۱۹۵۲) تبھی غالباً "گھر آنگن" کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ دیواریں چُنی
گئیں اسی قصبہ بمبئی کے بے آنگن گھر میں انہوں نے گرہستی کے چٹکلوں، چٹکیوں، راحتوں اور رحمتوں کے نقشے سجا کر دیکھ لیے۔ سماجی
غنائی شاعری کا یہ کامیاب تجربہ انہیں یہیں تھمنے نہیں دیتا، وہ رفتہ رفتہ اور آگے لے جاتا ہے۔ وہ زندگی بھر کے گوارا اور ناگوار تجربو
کا نچوڑ ایک بے نیازی اور بے تکلفی کے ساتھ قطعوں اور غزلوں ٹپکانا شروع کرتے ہیں۔ بیس برس کے قریب انہوں نے فلم کی دُنیا
میں دست نگر بن کر، دربدر ہو کر، ایک پوری فلم "بہو بیگم" بنانے میں پیچ در پیچ مسائل میں الجھ کر گیت بیچ کر، بجوا کر جو ذہنی
اور جسمانی تجربے، ٹریننگ کے جو مشاہدے کیے ہوں گے وہ رائیگاں نہیں گئے۔ "گھر آنگن" اور بعد میں (۶۳ - ۱۹۷۰ء) کی غزلوں پر
لفظ و معنی کے رشتہ پر، تصویروں کے اُبھرنے اور دھندلانے پر ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا اثر صاف جھلکتا ہے مگر شاعری کی
زبان میں۔

شاعر بھی آخرا عصاب کے جال میں گرفتار رہے بلکہ اوروں سے کچھ زیادہ ہی گرفتار رہے۔ ہارٹ اٹیک (عارضۂ قلب) کے شدید
جھٹکے سے جو لوگ گزر چکے ہیں۔ وہی بتا سکتے ہیں کہ اس عالم میں ذات و صفات کا رشتہ کتنا نازک اور بدلا ہوا نظر آنے لگتا
ہے۔ اختر پر لگاتار دو بار دل کا سخت دورہ پڑا (۶۸-۱۹۶۷ء) اور وہ موت کے دروازے پر دستک دے کر لوٹے تو زندگی
کا خوف اور مصلحتوں کا وسوسہ دل سے نکل چکا تھا۔
شخصی تجربات کی شاعری کرنے والا۔ نرم دھاروں پر بہنے والا، قادر الکلام خوش گو شاعر جس طرح بیس بائیس
برس پہلے ترقی پسند خیالات کے تیز دھاروں پہ نکل چلا تھا، کلاسیکی مشقِ سخن کو جس طرح وہ رومانوی برتاؤ کے شعر میں صرف
کرتا رہا تھا۔ اب اس مقام سے بھی چند قدم آگے بڑھتا ہے ایک نظریاتی قوت کو، بنیادی عقیدے کی صلابت کو، نگاہ کی وسعتوں کو،

علی سردار جعفری

بنام جاں نثار

پیارے جاں نثار

تمہارے مجموعۂ کلام "خاکِ دل" کی اشاعت کی خبر بہت خوشگوار ہے۔ اس کتاب کا نام نیا ہے پھر بھی یگانہ کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

کیمیائے دل کیا ہے، خاک ہے مگر کیسی
لیجئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے

شاید اس شعر کے یاد آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اور خاص طور سے ہماری زبان میں شاعری کے خونِ جگر کی قیمت دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اب نہ معقول رسالے ہیں نہ معقول پبلشنگ ہاؤس، جو رسالے اپنے مدیروں کی ہمت اور استقلال کی وجہ سے چل رہے ہیں اُن کی داد اردو والوں سے زیادہ اُن سرپھرے دل والوں کو ملنی چاہیئے جنھوں نے نامساعد حالات میں جدوجہد جاری رکھی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ چالیس سال کے نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا صلہ صرف اتنا کہ تمہارا مجموعہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپ جائے گا اور دو تین سال میں بدقت تمام فروخت ہوگا۔ کوئی قابلِ قدر تبصرہ مشکل سے شائع ہوگا کیونکہ ہماری تنقید شاعر کے دل میں اتر کر اُس کے خون کے رنگ و حرارت کو محسوس نہیں کرتی۔ ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ صرف اس قسم کے تعمیم پر چلتی ہے کہ شاعر کا اندازِ نظر نیا ہے۔ اُس نے زندگی کے نئے مسائل کو سمو لیا ہے، نئے احساس کو شعر میں ڈھال لیا ہے۔ اب اس سے جیسا جی چاہے ویسا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔

تمہاری شاعری تمہارے ہم عصر شعرا کی طرح چالیس سالوں کے طوفان سے گزری ہے۔ اگر تمہاری آواز کی کھنک آج بھی باقی ہے تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ تمہاری شاعری سچی ہے۔ جیسے گنگا اپنی روانی میں ہر طرح کے ندی نالوں کا پانی سمیٹتی جاتی ہے لیکن اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھتی ہے اسی طرح تمہاری شاعری نے بھی ہر قسم کی نظریاتی اور غیر نظریاتی آلائشوں اور لطافتوں دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اس کے بعد بھی پاکیزہ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ وہ شاعر حق کے پیشِ نظر کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ وہ ان طوفانوں سے گزرنے پر مجبور ہیں۔

میں برسوں کے بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ شاعری کا کوئی ایسا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہے جو ہر طرح کی شاعری پر حاوی ہو اور ہر شاعر کے مزاج کی ترجمانی کر سکے۔ مثلاً کارل مارکس نے لکھا ہے کہ:

"ادیب اپنی تخلیق کو (کسی مقصد کا) ذریعہ ہرگز نہیں سمجھتا اس کی تخلیق بجائے خود (آخری) مقصد ہے"

ہاں ان دونوں میں پیوندکاری طلب کرتا ہے۔

لفظوں کا بہاؤ اور جدید ترنم جاں نثار اختر کے ہاں اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ الفاظ شاعر کے ارادے اور اس کے مشورے سے بے نیاز خود بخود ایک ترتیب اور سلیقے کے ساتھ جڑے ہوئے لگتے ہیں جیسے ندی کے نرم بہاؤ پر ہنسنے کی قطاریں یا پھولوں کی مالائیں جاں نثار اختر کی شاعری کا لباس ریشمی ہے۔ ریشمی تھیں۔ کہیں کہیں گوکھروکی گوٹ لگی ہے۔ کانٹے سے چبھتے ہیں لفظوں کی کثرت و تکرار نے جھالر اور پھندنے بھی ٹانک رکھے ہیں۔ سوز و ساز اگرچہ پرانے لفظ ہیں تاہم اگر ان کا پورا مفہوم نظر میں رکھیں تو اختر کی شاعری میں سوز کم ہے ساز زیادہ، عاشقی کم ہے، حسن پرستی زیادہ، تجربہ محدود ہے، پہلوداری زیادہ، پہلو داری زیادہ صاف نظر آتا ہے کہ اس رومانوی شاعر نے رومانوی غنائیت کو ہر مرحلے میں ہر پہلو سے برتا ہے۔ اپنی شخصیت کے باطنی پیکر سے نباہ کیا ہے اُس کی خلوت اپنی جلوت سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ شاعر زخمی ہوتا ہے، تارِ گریباں چٹختا ہے لیکن شاعرانہ صداقت کو زخمی ہونے سے بچا لیتا ہے۔ اُس نے اپنی شاعری کو صورت و معنی دونوں اعتبار سے مسلسل اور رنگین دائرے کی صورت دے کر یہ اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ شاعر کی صحیح قدر و قیمت آج کا زمانہ بھی دے گا۔ اور بعد کا زمانہ بھی جو درگزر نہیں کیا کرتا۔

ہماری قدر کرو، اے سخن کے متوالو!

ملیں گے کل نہ غزل کو مزاج داں ہم سے؛

اُردو شاعری نہ صرف سیاسی واقعات اور حالات کی تصویریں ہی ہمارے سامنے پیش نہیں کیں بلکہ ہر عہد کی سماجی اور سیاسی تحریکات کو بڑھاوا دینے میں اُس کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔"

"ہندوستاں ہمارا" ـــــ جاں نثار اختر

اس وقت جب یہ خط میں تمہیں لکھ رہا ہوں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ ۱۹۳۳ء میں جب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچا تو وہاں تم، مجاز، احمد عباس، سبطِ حسن، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری موجود تھے، کچھ عرصے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے سعادت حسن منٹو، شاہد لطیف، جذبی، اختر الایمان وغیرہ بھی آ گئے۔ ترقی پسند تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن ہمارے سینوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں شاعری کے آسمان و زمین اقبال اور جوش کی حکمرانی میں تھے۔ انہیں کے ساتھ ذرا نیچے آسمان پر حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کے نام جگمگا رہے تھے۔ کلاسیکی ورثے میں رومانیت نے اپنی جگہ بنا لی تھی ہم نے اس رومانیت میں حقیقت نگاری کی آمیزش کی اور اسطرح کلاسیکیت، رومانیت کے امتزاج سے نئی ترقی پسندی کی طلوع ہوئی۔ تمہاری اس زمانے کی ایک غزل کے دو شعروں اور ایک نظم کے ایک بند میں یہ تینوں کیفیتیں محفوظ ہیں۔ میرا حافظہ کہتا ہے کہ تمہارے یہی اشعار میں نے سب سے پہلے سنے تھے۔ غزل کے شعر یوں یاد ہیں ؎

دُور کوئی رات بھر گاتا رہا
تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

ہم نہ آئے چمن میں لوٹ کر
موسمِ گُل بار بار آتا رہا

اور نظم کا بند کچھ اس طرح ہے ؎

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند جیسے ایک بے اُمّت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اِن مصرعوں میں شاعری کے سارے لوازمات موجود ہیں پھر بھی اقبال اور جوش سے کتنے مختلف ہیں۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ تمہاری شاعری کے سفر میں اس نظم کے مزاج کو تمہاری عاشقانہ شاعری نے دبا لیا۔

رات کا پیچ و خم تیری زلفیں
چاندنی کا نکھار تیرا بدن
صبح کی نرم لو جبیں تیری
پگھلا پگھلا سا آنچ پر کندن

نشۂ مے سے کہیں پیاس بجھی ہر دل کی
تشنگی اور بڑھا لائے خرابات سے ہم
آج تو مل کے بھی جیسے نہ ملے ہوں تجھ سے
چونک اٹھتے تھے کبھی تیری ملاقات سے ہم

(یہ اقتباس انگریزی کتاب Radical Perspectives in Art Edited - Lee Baseandall سے لیا گیا ہے) اِس کے برعکس ماؤزے تنگ کا نظریۂ ادب کچھ اور ہے جس کو چینی سیاست دانوں اور دانشوروں نے اِن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ "ادب اور آرٹ (کے آسمان) پر ماؤزے تنگ کے خیالات کا پرچم اور زیادہ بلند ہونا چاہیئے"، (اد پر کی کتاب سے یہ اقتباس بھی لیا گیا ہے)، لیکن اس کے بعد بھی شاعر خود اپنے اوپر ایک ذمہ داری عاید کرتا ہے اور اپنے لئے ایک نظریۂ شعر بناتا ہے۔ ہر شاعر کی تخلیق تخلیقی اور نظریاتی اعتبار سے اس کا حرفِ آخر ہوتی ہے۔ یہ نظریہ اس کے مزاج اور شاعری سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے تم نے اور میں نے ترقی پسند تحریک کے نظریۂ ادب کو قبول کیا اور اپنی شاعری کو تحریکِ آزادی کے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔ اس کے بعد بھی داخلی طور سے میرے اور تمہارے نظریۂ شعر میں اختلاف مل جائے گا۔ یہ اختلاف اُس مزاج کی دین ہے جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کرتا ہے۔ تمہارے نظریۂ ادب میں عاشقانہ شاعری کا بھی ایک بلند مقام ہے اور نظریاتی شاعری کا بھی، جس نے تمہاری شاعری کو شعلوں کے آغوش میں کھلے ہوئے پھولوں کی طرح بنا دیا ہے اس میں لطافت بھی ہے اور حرارت بھی اور یہ امتزاج فن کو بلند تر سطح پر لے جاتا ہے۔

تم نے ظلم اور غلامی کے خلاف احتجاج کیا اور انسان کی عظمت کی سربلندی کے لئے قربانیاں دیں اس کی آنچ تمہارے شعر میں ہے لیکن ساتھ ہی تم نے بعض ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جو کسی دوسرے ترقی پسند نے نہیں کہیں۔ میری مُراد اُن نظریاتی مثنویوں سے ہے جو جدلی مادیت اور تاریخی مادیت کے بعض پہلو پیش کرتی ہیں۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ شعر کا موضوع نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر قدیم شعرا کے یہاں مابعد الطبیعیات اور ہمہ اوسط کے مسائل شعر کا موضوع بن سکتے ہیں تو جدید شاعر کے یہاں جدلی اور تاریخی مادیت شعر کا موضوع کیوں نہیں بن سکتی، انہوں نے کہا کہ مابعد الطبیعیات دل کا فلسفہ ہے اور جدلی اور تاریخی مادیت دماغ کا فلسفہ۔ یہ تفریق صحیح نہیں ہے کیونکہ وجدانِ شعری کے بغیر دونوں میں سے کسی پر ایک مصرعہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس گفتگو سے مجھے سوویت یونین کے نوبل انعام یافتہ ادیب شولوخوف کی ایک بات یاد آ گئی۔ ۱۹۵۴ء میں سوویٹ ادیبوں کی دوسری کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے شولوخوف نے کہا کہ ہمارا ادبی رہنما ہمارا دل ہے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ ہمارا دل پارٹی کے ساتھ ہے، لیکن اس بحث سے الگ مجھے تمہاری مثنویاں پسند ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور نظم ہے جو شعر کی حیثیت سے مجھے پسند ہے لیکن اس مجموعے میں شامل نہ ہوتی تو بہتر تھا لیکن تمہارا جواب بھی میرے سامنے ہے "اسٹالن کے بارے میں آج جو کچھ بھی کہا جائے اُس وقت اسٹالین اشتراکی نظام کی کامیابی اور اشتراکیت کا واحد سمبل یا علامت سمجھا جاتا تھا۔ اِس نظم میں جو خلوص ہے وہ اسٹالن کے نام سے نہیں ہے، اشتراکیت کے شدید اُنس کی بنا پر ہے" تمہارے بیان پر تبصرہ کرنے کے بجائے میں صرف اتنا کہوں گا کہ تمہاری اس نظم کے آخری دو مصرعے اسٹالین کے عہد سے آگے رہنمائی کرتے ہیں۔

ع

ظلمتِ آخرِ شب بھی نہ رہے گی باقی
اور دو چار قدم مشعلِ جاں لے کے چلو

اسی بات کو میں نے اپنی ایک نظم میں یوں کہا ہے ؎

پھینک پھر جذبۂ بیتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر!
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے۔

صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا!
جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دہشت دلا رہی ہیں چٹانیں تو کیا ہوا!
پتھر میں جو صنم ہے وہ کتنا حسین ہے
ہوں لاکھ کوہسار بھی حائل تو کیا ہوا
پل پل چمک رہا ہے جو تیشا حسین ہے
در بند ہے جو صحنِ گلستاں کا غم نہیں
خوشبو جو لے اڑا ہے وہ جھونکا حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو!
ہر جہد، ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

جب تک اُردو زبان باقی ہے، اِن شعروں کی تابناکی میں کمی نہ ہوگی۔

تمہارا
سردار جعفری

"ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں اُردو شاعری میں نعرے بازی زیادہ ہوئی لیکن رفتہ رفتہ طبقاتی محرکات اور اقتصادی حالات کے تجزیے پر توجہ دی جانے لگی۔"

——— جاں نثار اختر

نوٹ:— یہ خط جاں نثار اختر کے مجموعہ "خاک دِل" سے لیا گیا ہے۔

لیکن دلچسپ اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ تم نے کسی عہد میں اپنے عہدِ وفا کو فراموش نہیں کیا۔ تم نے اپنی شاعری کو جس مقصد کے لئے نذر کیا اس کی تپش تم سے ایسے اشعار بھی کہلواتی رہی جن میں زمانے کے دردِ غم کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس کی بڑی حسین مثال تمہاری نظم "ایک زخم تمنّا اور سہی" ہے۔ تمہاری ابتدائی نظموں اور غزلوں میں تمہارا اپنا لہجہ بہت نمایاں نہیں تھا۔ مروجہ لہجوں کی صدائے بازگشت میں ایک نئے لہجے کا ہلکا ہلکا سراغ مل رہا تھا لیکن جب تمہاری شاعری جوان ہوئی تو تمہارا آہنگ نمایاں طور پر ابھر آیا۔ اس کی بہترین مثالیں وہ نظمیں ہیں جو تم نے صفیہ مرحومہ کی وفات پر کہیں ہیں۔ ایک "خاکِ دل" جس سے اس مجموعے کا نام حاصل کیا گیا ہے اور دوسری "خاموش آواز"۔ اردو ادب میں شخصی مراثی پہلے بھی لکھے گئے ہیں، بیویوں کی موت پر بھی بعض شعراء نے نظمیں کہی ہیں لیکن تمہاری نظموں کی کیفیت کچھ اور ہی ہے جس نے ان کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ ان نظموں میں زندگی کا مثبت تصوّر ہے جو غم کو غم تو سمجھتا ہے لیکن دنیا کے مسائل سے چشم پوشی نہیں سکھاتا۔ اقبال کی "فلسفۂ غم" اور "والدۂ مرحومہ کی یاد" کو چھوڑ کر باقی کوئی شخصی مرثیہ ایسا نہیں ہے جس کا نام تمہاری ان نظموں کے ساتھ لیا جا سکے۔

تمہاری اپنی آواز، اپنے آہنگ کے سلسلے میں بعض ان نظموں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جن میں تم نے ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری روایات کو ابھارا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ شعر ہے ؎

وحدت کی اسی چنگاری سے دِل موم ہوا ہے پتّھر کا
اجمیر کی جامع مسجد میں خود عکس ہے جیتی مندر کا

میں تم سے تمہاری دو اور نظموں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے بہت پسند ہیں۔ ایک "آخری ملاقات" اور دوسری "آخری لمحہ"، دونوں نظمیں موت اور زندگی کے ابدی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ تم تو جانتے ہو یہ میرا بھی بڑا محبوب موضوع ہے۔ اپنی طویل نظم[1] "نئی دنیا کو سلام" اور "میرا سفر" میں میں نے موت کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور موت اور زندگی کا کیا رشتہ ہے۔ اسے ترقی پسند نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ تمہاری نظموں کا موضوع تو یہی ہے لیکن انداز بالکل الگ ہے۔ "آخری ملاقات" میں یادوں کا ایک ہجوم ہے۔ ایلیا اہرن برگ — کے ناول "طوفان" میں بعض مرتے ہوئے ......

سپاہی زندگی کے بہترین لمحوں کو یاد کرتے ہیں۔ اس نظم میں آنے والی چیزیں نقوش ہیں۔ جو ایک ایسے نفس سے ملنے کے لئے آ رہی ہیں" جس سے ان کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے کہ "یہ غیر نہیں سب اپنے ہیں"۔ اس میں جو چیزیں وہ بظاہر بہت معمولی ہیں۔ جیسے ہریالی پر بنے ہوئے دو پاؤں، کسی بڑھیا کا چہرہ، کچھ کھلونے، کچھ دستانے، ڈالی پر بیٹھی ہوئی ایک تتلی اور اسی طرح کی چیزیں جن کے انتخاب میں جاں نثار اختر کے نظریۂ شعر کی جھلک ہے۔ غالباً ہسپانوی شاعر لورکا نے کہیں لکھا ہے کہ درخت کی شاخ پر پک کر ہری گھاس کی گود میں ٹوٹ کر گرنے والے سیب کی تقدیر ایک طوفانی سمندر کی تقدیر سے کم نہیں ہے۔ زندگی انہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے عبارت ہے۔ اِن کو شاعری میں جگہ دینا ایک نئی ذہنی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔

"آخری لمحہ" ایک طرح کی وصیت ہے۔ جواہر لال نہرو کی وصیت کی طرح خوبصورت۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس نظم میں شاعر اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ اپنی زندگی بھر کے تجربے کو شاعرانہ زبان عطا کر کے اپنی پیاری بیٹی کے دِل و دماغ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ ایسی نظم ہے کہ جس پر کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔ اس نظم کا ایک بند ایسا ہے جسے بجا طور سے تمہاری شاعری کا پرچم کہا جا سکتا ہے ؎

جینے کی ہر طرح سے تمنّا حسین ہے
ہر شے کے باوجود یہ دنیا حسین ہے

میں پیش کیا ہے "ادب اور آرٹ کے آسمان پر ماؤزے تنگ کے خیالات کا پرچم اور زیادہ اونچا ہونا چاہیئے"۔ یہ اقتباسات سردار جعفری نے ایک انگریزی کتاب سے لئے ہیں جو میں نے نہیں پڑھی ہے اس لئے اس کتاب پر میں کوئی تنقید نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک بات میں جو اس سلسلے میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کارل مارکس کا جو اقتباس اس میں پیش کیا گیا ہے وہ ادیب کے ذریعۂ معاش سے متعلق ہے اور وہ دراصل مارکس اور اینگلز کی خط و کتابت (Marx Engel's Gesamtansgabe) سے لیا گیا ہے جس میں مارکس نے ادیب کے ذریعۂ معاش کے تعلق سے یوں لکھا ہے۔ "اہل قلم" یر قدرتی طور سے جینے اور لکھنے کی خاطر کمانا لازم ہے، لیکن کمانے کی خاطر جینا اور لکھنا نہیں چاہئے اور "کہاں وہ جملہ لکھا ہے جو سردار جعفری کے خط میں ادھورا رہ گیا۔ اس پورے جملے میں آگے چل کر یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مارکس کا اشارہ ادب کا ذریعۂ معاش کی طرح استعمال کرنے کی مخالفت میں ہے ادب کے کسی مقصد سے وابستگی کی مخالفت میں نہیں جیسا کہ سردار جعفری کہتے ہیں کیوں کہ اگر ———— ایسا ہوتا تو مارکس کی مقصدی (tendentious) ادب کی تائید کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آگے کے جملے اور زیادہ واضح طور پر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں خلاً یہ جملے "صحافت کی پہلی آزادی اس میں ہے کہ وہ کوئی تجارت نہ بنے وہ ادیب جو اس کا درجہ گھٹا کر اس کو مادی وسیلہ (Material means) بنا دیتا ہے وہ اس اندرونی آزادی کی کمی کی سزا کے طور پر بیرونی پابندی احتساب (censorship) کے قابل ہے بلکہ اس کا وجود خود اس کی سزا ہے۔" ماؤزے تنگ کا نظریۂ ادب اس کے برعکس کچھ اور نہیں ہے۔ یا کم از کم نہیں تھا۔ اور اس کا نظریہ لینن کے نظریۂ ادب سے کچھ مختلف نہیں ہے چنانچہ ماؤزے تنگ کے کتابچوں ... Talk at Yenan Forum on Art and Literature and "Problem of Art and Literature" میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے جس کا "چینی سیاست دانوں" نے جیسا کہ سردار جعفری کہتے ہیں، ذکر کیا اور چینی سیاست دانوں کی غلطی کو ماؤ کے سر تھوپنا کون سے انصاف کی بات ہے؟ اور پھر یہ اس قسم کی ایک غلطی ہے جس قسم کی غلطی سردار جعفری نے نظریۂ ادب کی تعریف پیش کرتے ہوئے کی ہے۔ نظریۂ ادب کے تعلق سے سردار جعفری آگے لکھتے ہیں:۔ "مجموعی طور پر تم نے (جاں نثار اختر نے) اور میں نے ترقی پسند تحریک کے نظریۂ ادب کو قبول کیا ..... اس کے بعد داخلی طور سے میرے اور تمہارے نظریۂ شعر میں اختلاف مل جائیگا" یہ بات قابلِ غور ہے کہ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کا نظریۂ ادب کہا، مارکسی نظریۂ ادب نہیں کہا اور دراصل یہ اختلاف اس لئے ہے کہ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے نظریۂ ادب کو "مجموعی طور پر" قبول کیا اور جاں نثار اختر نے مارکسی نظریۂ ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سردار ریا ریار عینیت کے شکار ہوئے ہیں مثلاً ان کا خیال ہے کہ نیکی بدی پر غالب آتی ہے۔ ظالم مظلوم بنتا ہے اور مظلوم ظالم ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ، ان خیالات کا مارکسزم سے دور کا تعلق نہیں ہے۔ دراصل ترقی پسند نظریۂ ادب کوئی ہمہ گیر اور مربوط نظریہ نہیں ہے کیونکہ اس میں مختلف فکریات (idiogus) سے متاثر افراد موجود تھے اور ہیں اس لئے یہ ایک ڈھیلا ڈھالا جامہ ہے جس کو کوئی بھی فرد جو اس میں سما سکے پہن سکتا ہے اور اپنی سہولت کے لحاظ سے اس کی شکل بدل سکتا ہے۔ لیکن اگر دو شاعر مارکسی فلسفے کے زیر اثر نظریۂ ادب سے متاثر ہیں تو ان کا نظریہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان دونوں کا نقطۂ نظر جدا ضرور ہوگا۔ اور یہ نقطۂ نظر کا اختلاف "اس مزاج کی دین ہے جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کرتا ہے۔" مارکسی نظریۂ ادب اتنا ہی ہمہ گیر ہے۔ جتنا مارکسی نظریۂ فطرت یا مارکسی نظریۂ تاریخ ہے۔ اور یہ نظریے دانشوروں کے مزاج کے لحاظ

راشد آذر

خاکِ دل کا شاعر

جاں نثار اختر ہمارے ان چند بزرگ شاعروں میں سے ایک ہیں جو اپنے نام کے سہارے نہیں، اپنے کلام کے سہارے زندہ ہیں، ان کی شاعری کی رنگینی کسی بھی دور میں پھیکی نہیں پڑی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں نے جو سماجی اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کے مناظر دیکھے ان کو ان کی شاعرانہ طبیعت نے شعری ڈھانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اسی لئے جہاں ہم کو ان کے یہاں رنگین بیانی، شوخی، محبت کی چاشنی اور حسن پرستی ملتی ہے وہیں ان کا سماجی شعور اور صاحب نظری ایسی صفات ہیں جو ہم کو خوابوں کی دنیا میں کھو جانے سے بچاتی اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری کے مطالعے سے کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے حالات سے اس طرح سمجھوتہ کر لیا ہے کہ درد سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ آج بھی زندگی کے کرب سے ان کا رشتہ اسی طرح استوار ہے جس طرح پہلے تھا۔ ان کی ۱۹۳۶ء کی شاعری میں ہر چند کہ ایک مارکسی شعور کارفرما نہیں ہے جس کی وجہ سے کہیں غربت سے رومانی لگاؤ اور کہیں قافلۂ غارت بردوشاں کے انقلاب کی امید وابستہ نظر آتی ہے، لیکن ایک بیدار مغز شاعر کا شعور ضرور کام کرتا نظر آتا ہے جو ۱۹۴۵ء میں پوری جدلیاتی مادیت کی آب و تاب لئے "دانائے راز" کی شکل میں ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے اور ۱۹۴۵ء کے بعد ان کی شاعری میں اس مارکسی شعور کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور کہیں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جہاں اس کا گمان ہو کہ شاعر نے جدلیاتی (Dialectical) اور تاریخی مادیت (Historical Materialism) کو بھول کر عینیت (Idealism) سے سمجھوتہ کر لیا ہے، حتیٰ کہ اس وقت بھی اس شاعر کا مارکسی شعور بیدار نظر آتا ہے جب زندگی اور موت کی تگ و دو میں بڑے بڑے سورماؤں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ مبارک ہے وہ نسل جس کے سر پر ایسے باوفا شاعر کا سایہ موجود ہے اور مبارک ہے وہ زبان جس کو "آخری لمحہ" جیسی نظم نصیب ہوئی۔

یہاں میں سردار جعفری کے اس خط پر تنقید کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو "خاکِ دل" کے پیش لفظ کی طرح شائع کیا گیا ہے۔ اس خط میں سردار جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے: "میں برسوں بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ شاعری کا کوئی ایسا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہے جو ہر طرح کی شاعری پر حاوی ہو اور ہر شاعر کے مزاج کی ترجمانی کر سکے مثلاً کارل مارکس نے لکھا ہے کہ ادیب اپنی تخلیق کو کسی مقصد کا ذریعہ ہرگز نہیں سمجھتا۔ اس کی تخلیق بجائے خود (آخری) مقصد ہے۔..."

اس کے برعکس ماؤزے تنگ کا نظریۂ ادب کچھ اور ہے جس کو چینی سیاست دانوں اور دانشوروں نے ان الفاظ

میں وہی کروں جو وہ کہیں وہ چاہیں
مجھ کو تو اسی بات میں چین آتا ہے
منوا بھی لوں اُن سے اپنی مرضی جو کبھی
ہفتوں کو مرا سکوں مرجاتا ہے

اب مرد کی زبانی رباعیاں دیکھئے ۔

کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے !
لپٹی ہوئی ہاتھ کی دُھلی ساری میں

ہر ایک گھڑی شاق گذرتی ہو گی
سو طرح کے وہم کرکے مرتی ہو گی
گھر جانے کی جلدی تو نہیں مجھ کو مگر
وہ چاۓ پہ انتظار کرتی ہو گی

کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اٹھی ہے مگر
ڈرتی ہے کہیں اُن کو نہ ہو جائے خبر
تھک کر ابھی سوئے ہیں کہیں جاگ نہ جائیں
دھیرے سے اُڑھا رہی ہے اُن کو چادر

سینے پہ پڑا ہوا یہ دوہرا آنچل
آنکھوں میں یہ لاج کا لہکتا کاجل
تہذیب کی تصویر، حیا کی دیوی
بستر پہ یہ کتنی شوخ، کتنی چنچل

وہ چند برا اُتر آتے ہیں اکثر اوقات
ہر چیز پہ وہ بحث کریں گے مرے ساتھ
ہرگز بھی نہ مانیں گے جو میں چاہوں گی
لیکن جو میں چاہوں گی کریں گے وہی بات

سے مختلف نہیں ہوں گے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دو دانشوروں کی فکر کے نتائج الگ ہوں جدلیاتی مادیت ایک ایسا ہمہ گیر فلسفہ ہے جس کو فطرت، تاریخ، مذہب، ادب وغیرہ کو سمجھنے کے لئے ایک آلے یا حربے کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور خود لفظ "جدلیاتی" اس کو اتنا لچکدار، ہمہ گیر مربوط اور بسیط بنا دیتا ہے کہ اس میں کسی قسم کے کٹرپن تنگ نظری، تعصب اور یک رنگی کی گنجائش نہیں ہوتی اس میں سب رنگ موجود ہیں جن کا جواز جدلیاتی اور تاریخی مادیت میں ملتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں ہم جاں نثار اختر کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ایک ہی شاعر کے مختلف اوقات میں مختلف موڈ ہمارے سامنے صاف طور پر آجاتے ہیں کیونکہ انسانی ذہن اور جسم کی ساخت کسی مجرد تصور کے تحت عمل میں نہیں آتی، اس کا ارتقا، جدلیاتی اصولوں کے تحت ہوتا ہے جس میں مقداری تبدیلی (quantitative change) ماہیتی تبدیلی (qualitative change) کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح جاں نثار اختر، عاشق، حسن پرست، مشفق باپ، بیوی سے محبت کرنے والے اور بیوی کو ہر روپ میں دیکھنے والے شوہر، اپنے آپ کو بحیثیت شوہر، بیوی کی نظروں سے جانچنے والے فرد، سماجی ارتقا پر گہری نظر رکھنے والے مفکر اور فن پر گرفت رکھنے والے شاعر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں، جس طرح ہم ایک ہی شخص کو ایک اچھا شوہر، ایک اچھا باپ اور ایک اچھے سماجی فرد کے روپ میں دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح مارکسی نظریۂ ادب ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم ایک اچھے حسن پرست، عاشق مزاج شاعر سے اس بات کی توقع رکھیں کہ وہ ایک سماجی ذمہ داری قبول کرنے والا شاعر بھی ہو یا ایک سیاسی موضوعات پر لکھنے والے شاعر سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ایک عاشق مزاج، حسن پرست، کنبہ پرور اور بیوی کو محبوبہ سمجھنے والا شاعر بھی ہو۔

ایک بات بڑی اہم ہے جس کو ہم عام طور پر کسی شاعر پر تنقید یا اس کے فن پر تبصرہ کرتے وقت نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ یہ کہ بعض اصنافِ سخن بعض شاعروں کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں اور بعض کے مزاج سے نہیں رکھتیں۔ مثلاً غزل کی صنف اختر الایمان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی، حالانکہ اختر الایمان ہمارے بڑے اچھے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ یا پھر جیسے آزاد یا خطابیہ نظم سردار جعفری کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے جس کی بہترین مثال ان کی نظم "اودھ کی خاکِ حسیں" ہے اور یہ ہیئت جاں نثار اختر کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے انہوں نے ایسی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاں نثار اختر نہ صرف اچھے غزل گو ہیں بلکہ بڑے اچھے نظم گو بھی ہیں اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے اردو زبان کو "گھر آنگن" کی شکل میں ایسی رباعیاں اور قطعے دیئے ہیں کہ اردو ہی نہیں۔ کوئی بھی زبان ناز کر سکتی ہے۔ "گھر آنگن" کے ایک حصے میں عورت کی زبانی کہلوائی ہوئی باتیں جو صرف بیوی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور چھوٹے چھوٹے کاموں کو پیار کی نظر سے دیکھنے والا شوہر ہی جان سکتا ہے اور ایک حصے میں مرد کی زبانی کہی ہوئی اس قدر رنگی باتیں ہیں کہ صرف حسن کو نظر بھر کر اور بیوی کو ہر پہلو سے دیکھنے والا شاعر یہ باتیں کہہ سکتا ہے۔ عورت کی زبانی رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

خود ہل کے وہ کیا مجال پانی پی لینا
ہر رات بندھا ہوا ہے یہ ہی دستور
سرہانے بھی بھر کے چاہے چھاگل رکھ دوں
سوتے سے مگر مجھے جگائیں گے ضرور

ڈاکٹر قمر رئیس

جاں نثار اختر کی طویل نظمیں

سوویت لیتھونیا کے ممتاز شاعر MARCENKEVICIUS نے (جس نے کئی گرانقدر طویل نظمیں لکھی ہیں) ایک بار طویل نظم کے امکانات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

"طویل نظم عصر حاضر کے انسان کے رزمیہ کردار کی حامل ہے جس میں دنیا کی تخلیق از سر نو عمل میں آتی ہے۔ بے شک آج دنیا بڑی پیچیدہ، بے ہنگم، طوفان بدوش اور تغیر پذیر ہے، انسان اپنے اور دنیا کے بارے میں علم و آگہی کا جتنا بڑا ذخیرہ رکھتا ہے اتنا ہی اس کے لئے دشوار ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایک نظم و ترتیب دے سکے۔"

اس لحاظ سے ــ "میرا خیال ہے کہ لٹریچر کے دوسرے فارموں کے مقابلہ میں طویل نظم پر ذمہ داری کا بوجھ کچھ زیادہ ہی ہے فلسفہ کو ایک زمانہ میں سائنسوں کی سائنس کہا جاتا تھا بالکل اسی طرح میں طویل نظم کو تمام فارموں کا فارم کہتا ہوں۔ سارے ادب کے ہمہ جہتی تجربات کا استعمال کرتے ہوئے طویل نظم سماجی زندگی اور فکر کے ایک خاص اسٹیج کو تعمیمی شکل دیتی ہے ..... دنیا اور انسان کو درپیش حالات کا جائزہ لیتے ہوئے طویل نظم اس جائزہ کے لئے ایک نئی میزان بھی وضع کرتی ہے اور اس طرح وہ فلسفہ سے سب سے قریب آجاتی ہے۔"

سوویت ادب نمبر ۳ سنہ ۱۹۶۷ء۔

یہاں طویل نظم کے جس اساسی پہلو پر زور دیا گیا ہے وہ ہے اس پیچیدہ اور پُر آشوب دنیا میں انسان کی جد و جہد اور اس کے رزمیہ کردار کا مطالعہ۔ اس کے لئے زندگی کے ہے حشر خیز تضادات اور ان کے پس پشت کارفرما حقیقتوں پر غور و فکر بھی ضروری ہے گویا طویل نظم کے شاعر کے لئے اجتماعی شعور اور تاریخی بصیرت لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کٹھن وہ مرحلہ یا عمل ہے جو فکر و شعور کے اس حاصل کو نظم کا تخلیقی فارم دیتا ہے ان گنت تجربات اور تصوّرات کو سیال بنا کر جذبہ و احساس کی زبان یعنی شاعری کے پیکر میں ڈھالتا ہے ظاہر ہے کہ اس کے لئے انسانی زندگی اور معاشرے سے گہری وابستگی اور دلچسپی ہی نہیں تخلیقی فکر کا ایک خاص استقرار اور نظم و ضبط بھی درکار ہوگا۔ جب کہ مختصر نظم میں اس تمام اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی بھی اچھوتی کیفیت، احساس، تاثر، خیال، ہیجان، موڈ، یا پھر کوئی بھی نیا ذہنی تلازمہ یا امیج نظم بن سکتا ہے اور نظم غزل کے ایک شعر کی طرح تاثر اور تجربہ کی وحدت اور شدت کی آئینہ دار ہو سکتی ہے۔ طویل نظم میں مختلف رنگوں کے ان نقوش سے ایک بڑا مرقع تیار کرنے کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پھر ان نقوش کی اپنی انفرادی کشش باقی نہ رہے وہ اس وسیع تر مرقع کو معنویت اور حسن دے کر اپنی علاحدہ حیثیت فنا کر دیں اگرچہ بہت کم طویل نظمیں تکمیل فن کے اس اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی ہیں۔

وہ آئیں گے چادر تو بچھا دوں کوری
پردوں کی ذرا اور بھی کس دوں ڈوری
اپنے کو سنوارنے کی سُدھ بُدھ بھولے
گھر بار سجانے میں لگی ہے گوری

پچھلے چند سال سے اردو غزل کے دو طرح کے نمونے قاری کی نظر سے گذر رہے ہیں ایک تو وہ ہیں جن میں کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا انداز ہے جو نیا ہو یا نہ ہو لیکن اپنے کھُردرے پن سے پہچانا جا سکتا ہے اور جس میں چونکانے یا جھنجھوڑنے کی بجائے جھٹکے دینے کی کیفیت ملتی ہے اور جس میں اکہری قسم کی باتیں سپاٹ انداز میں پیش کی جاتی ہیں دوسرے وہ نمونے ہیں جن میں جذبات کی مختلف سطحیں ذہن کے مختلف گوشوں سے تہیں کریدکر نکالی جاتی ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ پہلے نمونے وہ ہیں جن میں نہ غزل کا آہنگ ہے نہ نظم کا اور رچاؤ ہے نہ رس، ورثہ ہے نہ آنے والے کل کی دھڑکن، صرف حال کا ایک ہی رُخ ہے جس کو معلق کر دیا گیا ہے۔ دوسرے نمونے وہ ہیں جن میں ورثہ بھی ہے، مستقبل کی چاپ بھی، اور حال کے دل کی دھڑکن بھی، جن میں آج کے سبھی رخ ہیں۔ کھرا، کھوٹا، حسین، بدشکل، غمگین، مسرت انگیز درد سے چور اور خوشی سے سرشار۔ جاں نثار اختر کی تازہ غزلیں دوسری تعریف میں آتی ہیں۔ ان میں کلاسیکی ورثے کا زیرلب اظہار اور عصری زندگی کی بیباکی، دونوں کا بڑا حسین امتزاج ملتا ہے، مثلاً یہ اشعار دیکھئے؎

بے صرفہ زندگی کی تلافی نہیں ہے یہ　　　انساں سے تجھ کو پیار رہے، کافی نہیں ہے یہ

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو　　　کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اتارا ہی نہ ہو

انقلابوں کی گھڑی ہے　　　ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

سوچو تو بڑی بات ہے تہذیب بدن کی　　　ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں۔

ہم نے صدیوں انہیں ذروں سے محبت کی ہے　　　چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

اور تو مجھ کو ملا کیا میری محنت کا صلا　　　چند سکے ہیں مرے ہات میں چھالوں کی طرح

جاں نثار اختر کو عشقیہ نظم گو، غزل گو، یا سماجی موضوعات پر نظمیں لکھنے والے شاعر کے خانوں میں تقسیم کرنا ان کی رنگا رنگ طبیعت کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک غیر منقسم اکائی سمجھ کر دیکھیں تو ہم ان کی شاعری کو اچھی طرح سمجھ بھی سکیں گے اور اس سے لطف اندوز بھی ہو سکیں گے۔ اور ان کی پہلو دار شخصیت کی غلط تقسیم سے گریز ہم پر خود فن اور فن کار کے باہمی رشتے کے کئی جدلیاتی راز افشا کر دے گا، جو شاعر کو خانوں میں بانٹ کر اکہرے انداز سے سوچنے والے نقاد عام طور پر نہیں سمجھ پاتے اور یہ بات ان کے لئے ایک معمہ بن جاتی ہے کہ ایک حسن پرست شاعر انقلابی بھی ہو سکتا ہے۔ حقیقت متضاد کی اکائی ہوتی ہے۔ محض یک رنگی میں نہیں۔ اس طرح جاں نثار کی شخصیت کی اکائی متضاد کے اتحاد کو جانچ کر سمجھی جا سکتی ہے۔

جاں نثار کی طویل نظموں میں یہ سب سے پہلی اور سب سے مختصر ہے، اپنی دوسری نظم ،، ریاست ،، میں انہوں نے انسانی سماج میں ریاست یا ریاستی اقتدار کی بدلتی ہوئی شکلوں کی روداد بیان کی ہے۔ اس کی بحر زیادہ رواں اور شگفتہ ہے موضوع کی منطقی اور فلسفیانہ تاویل کے باوجود نظم کے بہت سے حصے شاعرانہ لطافت سے معمور ہیں۔ اِس عہد کی نثری تحریروں میں بھی مارکسی نظریات کی توضیح میں بڑی ژولیدگی نظر آتی ہے۔ جاں نثار کی نظم میں اس کے برعکس جو وضاحت ہے اور خیالات جس سادگی صفائی اور تخیلی حسن کے ساتھ سامنے آتے ہیں وہ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ یہ نظریات ان کے ذہنی اور تخیلی وجود کا ایک حصّہ بن چکے تھے اور وہ زندگی کے گوناگوں مظاہر کو اسی شفاف آئینہ میں دیکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ یہ اس حقیقت کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ بعض فلسفیانہ خیالات کا مکمل اور مؤثر اظہار شاعری کی زبان میں ہی ممکن ہے۔

ایسی طاقت وجود ہے جس کا
خود جماعت کے ضعف کا اظہار
زلزلوں کی رکھی ہوئی تعمیر
آندھیوں کی بچی ہوئی دیوار
اس کے انصاف و عدل کے تحفے
طوق و زنجیر و تازیانہ و دار !
اُس کی رنگین گلستانوں کی
خون مزدور سے زمیں گل کار
سبز و شاداب کشت زاروں پر
اس کا سایہ بھی ابرِ آتش بار
رسم و تہذیب و مذہب و اخلاق
اُس کے دربار میں عصا بردار

شاعر ماضی اور حال میں ریاستی اقتدار کے جبر و تشدّد اور عوام دشمن حملوں پر کہیں فلسفیانہ دلیلوں اور کہیں شاعرانہ تمثالوں کے ذریعہ روشنی ڈالتا ہے لیکن نظم کے آخری حصّہ میں جب وہ بتاتا ہے کہ آج دنیا کے محنت کش عوام اس اقتدار کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ اُن کے دستِ بازو زار کی طاقتِ حکومت کا طلسم توڑ کر ایسی حقیقی جمہوریت کی بنا ڈال چکے ہیں جس میں ریاست ایک اہم کردار ادا کرکے بتدریج اپنے آپ کو ختم کردے گی تو اس کے طرزِ بیان میں ایک اچھوتا حسن پیدا ہو جاتا ہے اور فلسفیانہ تاویل شاعرانہ تخیل کی رنگینی میں ڈوب جاتی ہے۔

یہ مٹانے پہ دشمنوں کے مُصر — خود بھی مٹنے کے واسطے تیار
اس کے گل آفریں دھندلکے ہیں — پھوٹتے آپ، صبح کے آثار
آپ اُڑتا ہوا سا رنگِ خزاں — آپ کھِلتا ہوا سا حسنِ بہار
خود بخود بند بند سا کھلتا — خود بخود ٹوٹتا ہوا سا خمار
خود طبیعت میں اک طرح کی اُمنگ — خود اُمنگوں میں اک طرح کا ابھار
خود سے مٹتی ہوئی تمام حدیں — خود سے گرتی ہوئی ہر اک دیوار

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کے ایک خاص دور میں کچھ طویل نظمیں بھی لکھی ہیں جو ان کے مجموعہ کلام "خاک دل" کے آخر میں اسی نام سے شامل ہیں۔ یہ پانچ نظمیں ہیں۔ مؤرخ سے۔ ریاست، دانائے راز۔ پانچ تصویریں۔ ستاروں کی صدا۔ یہ نظمیں سنہ ۱۹۴۴ء سے سنہ ۶۵ء تک لکھی گئیں۔ ان میں ۱۹۶۳ء کی ایک نظم امن نامہ کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ طوالت یا مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے، خاموش آواز اور آخری لمحہ، کو بھی دوسری نظموں کے مقابلہ میں طویل نظم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا محرک اور موضوع آخر کی طویل نظموں سے بہت مختلف ہے۔ ان میں شاعر کا رویہ شخصی اور داخلی ہے، یہ نظمیں کچھ عزیزوں کچھ قدروں کچھ خوابوں اور کچھ اندیشوں سے اُس کے گہرے روحانی رشتوں کی مدھم کہانیاں سناتی ہیں ان میں جو غنائیت جو نرمی اور سپردگی ہے اس کا مقابلہ سیاسی اور سماجی فکر کی آئینہ دار ان طویل نظموں سے نہیں کیا جا سکتا جن میں ایک رزمیہ شکوہ بیانیہ سادگی اور فکری بلند آہنگی ہے۔ لیکن یہ نظمیں بھی جاں نثار اختر کی شخصیت اور شعور فن کے ایک ایسے پہلو کو بے نقاب کرتی ہیں جو ان کی شاعری میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

جس دور میں یہ نظمیں لکھی گئیں وہ ایک طرف ملک کی تحریک آزادی کے عروج (اور انجام) اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک کی نظریاتی شیرازہ بندی کا دور تھا۔ جاں نثار اختر جو ہندوستانی ادب کی سب سے باغی تحریک کے سب سے باغی نوجوانوں یا معماروں میں سے ایک تھے آزادی کے ایک انقلابی تصور پر زور دے رہے تھے۔ ایک ایسا تصور جو فرقہ پرستی، احیا پسندی اور رجعت پسند عناصر سے پاک تھا جس کی اساس محض تاریخ کا مادی شعور اور جس کا نصب العین تھا طبقاتی ظلم و استحصال سے پاک ایک ایسے غیر طبقاتی معاشرے کا قیام جس میں انسان انسان کی حیثیت سے اپنے وقار اور اپنے قد تک پہنچ سکے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں انسان اسی آزادی کے خواب دیکھ رہا ہے اور اس کے لئے جد وجہد کر رہا ہے۔ اسی لئے وہ تاریخ کے اس تصور کو باطل قرار دیتے ہیں جو سلاطین سلف کی عظمت اور ان کی معرکہ آرائیوں کی روداد کو ہی انسانی سماج کے ارتقا میں سب سے اہم اور فیصلہ کن قرار دیتا ہے۔ وہ مؤرخ سے سوال کرتے ہیں اور جواب میں خود ہی ان مادی اور طبقاتی قوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انسانی سماج کی تشکیل اور تغیر کے پس پردہ کارفرما رہی ہیں۔

کیا فقط تاریخ ہے فہرست اسمائے رجال
کیا فقط تاریخ ہے تقویم پارینہ کا نام
اے کہ تو ناواقف راز درون انقلاب
آ بتاؤں میں تجھے تاریخ کا راز اہتمام
ایک واثق علم ہے فطرت کے اس آئین کا
حکم سے جس کے بدلتا ہے زمانے کا نظام
ہاں یہی تبدیلیاں ہیں فکر کو سامان نو
ہاں یہی تبدیلیاں ہیں ذہن کو تازہ پیام
مختلف طبقوں کی باہم کشمکش کی داستاں
ایک کو شوق تگ و دو ایک کو فکر قیام
نور و ظلمت کی بہم آویزشوں کا ماجرا
زندگی کے ہر دور اہے پہ جھگڑتی صبح و شام

نظم کے آخر میں وہ تاریخ کے اس مادی اور سائنسی تصور اور تجزیہ کی بنیاد پر انسان کو ایک زریں عہد استقبال کی بشارت دیتے ہیں

انسان کا جو معنی خیز تعلق تھا نظم میں اس کا بیان محاکاتی دلکشی کا حامل ہے۔ انسان کی قوت تسخیر اور فطرت کی سرکش طاقتوں سے اس کی پیکار کہیں کہیں رزمیہ شاعری کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے۔

وہ یکجا پناہیں بناتے ہوئے
ہم راگ محنت کے گاتے ہوئے
وہ دنیا کے خاکے میں وحشت کا رنگ
جنوں سے الجھتی سکوں کی امنگ
عقیدت سے انساں کے لیتا قدم
بیاباں کی راہوں کا ہر پیچ و خم
سر دشت وکہسار با صد حشم
وہ کھلتا ہوا زندگی کا علم
پہاڑوں کے دامن میں وہ مرغزار
وہ سبزے پہ اڑتا دھواں سا غبار
گڈریے وہ ریوڑ ہنکاتے ہوئے
کہیں دور مرلی بجاتے ہوئے
وہ میدان، ٹیلے، ندی، جھیل، ریت
وہ کھلیان، اوسر، چراگاہ، کھیت
کوئی پاس بستی کوئی دور گاؤں
وہ دکھ سکھ کی پڑتی ہوئی دھوپ چھاؤں
وہ کروٹ سی لیتی ہوئی بدلیاں
وہ بوجھل سی تاریک پرچھائیاں
وہ کھیتوں میں سائے اترتے ہوئے
زمیں سے اندھیرے ابھرتے ہوئے

اس اقتباس کو اور بھی طویل کیا جا سکتا ہے اور نظم کے دوسرے حصوں سے بھی اسی طرح کے تاثر آفریں اشعار نقل کئے جا سکتے ہیں۔ ان نظموں میں جوش کے طرز بیان کا اثر بھی جھلکتا ہے لیکن یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جاں نثار نے جوش کی خطابت اور بے جا تکرار سے دامن بچانے کی شعوری کوشش کی ہے اور ہر نظم میں ارتقائے خیال کے فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

ستاروں کی صدا، میں مکالماتی انداز ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل قمر سے ہم کلام ہیں۔ وہ ان احسانات کو گناتے ہیں جو انہوں نے انسان پر کئے ہیں، اور پھر اس کی سرکشی اور زوال کا شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن قمر جو اس کرہ سے اور خود انسان سے سب سے زیادہ قریب ہے ستاروں کو جواب دیتے ہوئے حق انصاف اور مساوات کے لئے انسان کی انقلابی جدوجہد کو

خود اُبھرتی کوئی حسین شفق :: سرخ ہوتا زمین کا رُخسار
نہ وہ طبقوں کی کش مکش کا وجود :: نہ ریاست کے دہر میں آثار

اس طرح کے اشعار میں اکثر خارجی اور داخلی شاعری کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ یہاں فکر محسوس اپنے مؤثر اظہار کیلئے خود ایک شاداب اور شگفتہ پیکر اختیار کر لیتی ہے۔

'دانائے راز' میں جاں نثار نے مکالماتی ٹکنیک اختیار کی ہے جس میں جویائے راز، دانائے راز سے فطرت۔ مادہ اور خیال۔ تحرک اور جمود، ارتقاء، تاریخ، رشتہ فکر و عمل اور دوسرے مسائل کے بارے میں سوالات کرتا ہے۔ اور دانائے راز اقبال کے خضر راہ کی طرح وثوق اور اعتماد سے ان سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ بظاہر اس نظم میں اقبال کی نظم خضر راہ یا پھر جاوید نامہ کے بعض حصّوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھئے تو اس میں اقبال کے بعض بنیادی تصوّرات سے گریز کے واضح نشانات ملتے ہیں۔

شاید اس نظم کا محرک بھی وہی سرکش جذبہ رہا ہو جو ابتدا سے ہی احیائیت اور انفرادیت پسندانہ تصوّرات سے بیزار ہے۔ نظم میں دانائے راز ہر سوال کا جواب جدلیاتی اور تاریخی مادیت کے نقطہ نگاہ سے دیتا ہے۔ اقبال مادہ اور خیال کی دوئی یا تضاد کو نہیں مانتے تھے لیکن "تاریخ کی مادی تعبیر" کو وہ قطعاً غلط قرار دیتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے تصوّرات اسلام کے واسطے سے ایک خاص طرح کی عینیت تک ہی پہنچتے ہیں۔ خودی اور مرد کامل کے تصوّرات میں بھی انفرادیت پسندی کا رجحان غالب ہے۔ جاں نثار کا دانائے راز ہر موقع پر ان خیالات کی تردید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مادے سے ہے ہر اک شے کا وجود :: اصل شاہد ہے یہی اصل شہود
مادے سے آب و آتش خاک و باد :: مادہ سے جلوۂ نسبت و کشاد
مادے سے لالہ ہائے گلستاں :: مادے سے شبنم گوہر فشاں
مادے سے رنگ و بو و نار و نور :: مادے سے فکر و احساس شعور

یا پھر رشتۂ فکر و عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔

زندگی کے مادی اسباب نو :: ذہن انسانی میں دے اٹھتے ہیں لو
پھوٹتی ہے فکرِ تازہ کی کرن :: منہ چھپاتے ہیں خیالاتِ کہن !
خون میں جب فکر نو ہوتی ہے حل :: تیز کر دیتی ہے رفتار عمل
اس طرح اذہان پر چھاتی ہے یہ :: مادی قوت میں ڈھل جاتی ہے یہ

اس سلسلہ کی سب سے دل کش اور مؤثر نظم جس میں اقبال کے ساقی نامہ سے اثر پذیری کے باوجود جاں نثار کی اپنی آواز اپنی شخصیت اور انفرادیت کے نقوش اُبھر کر سامنے آئے ہیں، پانچ تصویریں ہے، اس نظم میں ابتداء سے آخر تک ہمواری اور روانی ہی نہیں حسن تناسب اور حسن تعمیر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس کے بہاؤ اور زیر و بم میں نغمہ کی سی کیفیت ہے اس کا موضوع بھی انسانی سماج کا ارتقاء ہے۔ ابتدائی کمیونزم سے عصر حاضر کے اشتراکی سماج تک انسانی زندگی جن پانچ اہم ارتقائی مراحل سے گذری ہے نظم میں خیال انگیز اشاروں کے ساتھ ان کی الگ الگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح کہ یہ تصویریں جاندار اور متحرک محسوس ہوتی ہیں۔ اس ارتقائی عمل کے پیچھے جو بنیادی قوت کارفرما رہی ہے بلاشبہ وہ محنت کش انسانوں کی بازآور محنت ہے جو ان تصویروں میں رنگ بھرتی اور انہیں باہمی طور پر مربوط کرتی ہے۔ ابتدائی زرعی معاشرہ میں فطرت سے

مہکتے رہیں سبز آموں کے بور
بڑھاتی رہے پینگ جھولے ڈور
رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
رہیں شادیہ گیت گاتے ہجوم

الغرض ارض وطن کے ہر شیوہ و ادا سے شاعر کو والہانہ پیار ہے۔ لیکن یہ وطن پرستی اشتراکی انسان دوستی کے اس بلند نصب العین سے کہیں متصادم نہیں ہوتی جو ان نظموں کی روح کی طرح موجزن ہے اس میں شک نہیں کہ ان نظموں کو، طویل نظم، اس مفہوم میں کہنا مشکل ہے جس مفہوم میں اس کا اطلاق مغرب میں ہوتا ہے یعنی عصر حاضر کے معاشرہ میں انسانی وجود کے آشوب اور انسانی تہذیب کے بحران کا فلسفیانہ تعبیر اور صورت گری۔ ان نظموں میں حقیقت پسندی کا ایک خاص رویہ انسانی زندگی کے تاریک، ویران اور یاس انگیز پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس جاں نثار کی نظموں میں تاریخی شعور انسان کے حال اور مستقبل کے بارے میں یقین اور اعتماد بخشتا ہے۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ نظمیں آج سے تقریباً تیس سال قبل لکھی گئی تھیں۔ جب نہ صرف ہندوستان اور چین میں بلکہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی کروڑوں انسان آزادی اور سماجی انصاف کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان نظموں میں اس مقدس اور حوصلہ خیز جدوجہد کا عکس بھی صاف نظر آتا ہے۔

"**عوام** ہر اُس ادب کو رد کرتے ہیں جو سیاسی سوجھ بوجھ تو دے لیکن جمالیاتی جذبے کو تسکین نہ بخشے۔"

——— جاں نثار اختر

خراج تحسین پیش کرتا ہے اور مشرق و مغرب میں اس ہمہ گیر بیداری کو ایک آزاد اور خوشحال زندگی کی بشارت سمجھتا ہے۔ نظم میں اس عہد کے انقلابی انسان کا کردار پوری طرح ابھر نہیں سکا ہے اس کے برعکس اشتراکیت دوستی نے ایک مبالغہ آمیز جذباتی صورت اختیار کرلی ہے۔

امن نامہ، اگرچہ ان بے شمار نظموں میں سے ایک ہے جو اس دور میں امن تحریک کے زیر اثر اردو شعراء نے لکھیں لیکن یہ نظم اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ تحریک امن سے زیادہ ارض وطن سے شاعر کی محبت کا صحیفہ بن گئی ہے۔ امن اسے اس لئے عزیز ہے کہ یہ اس کے گرد و پیش پھیلے قدرت کے اور انسانی تہذیب کے لازوال حسن کے تحفظ و بقا کی ضمانت ہے۔ یہاں ان کے مشاہدہ و تخیل کی شادابی نے اکثر ایک رومانی رنگ اختیار کرلیا ہے جو بعد میں ان کے نظموں اور رباعیوں میں زیادہ طہارت اور فنی دلکشی کے ساتھ سامنے آیا۔ یہاں خارجی مناظر کے بیان میں بھی شاعر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
سلامت رہیں اپنے دشت و دمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
چمکتی خنک چاندنی نرم دھوپ
جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ
یہ گوکل کی گلیاں یہ کاشی کے گھاٹ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ
یہ صبحِ بنارس یہ شامِ اودھ
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں پہ جھکتے رہیں آسمان
فضائیں گھٹائیں گرجتی رہیں
جواں چھاگلیں تٹ پہ بجتی رہیں
اڑاتی رہے آنچلوں کو ہوا
ملہاروں کی، بوندوں میں گونجے صدا

فکر کی گہرائی اور نغمگی کے اوصاف پائے جاتے ہیں جو ان کی شاعری کو عمر دوام عطا کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ان کی انقلابی شاعری میں "میں اُن کے گیت گاتا ہوں" اور بگولا، اشتراکی نظریات کی حامل شاعری میں کارل مارکس، ریاست، شہنشاہیت، پانچ تصویریں اور اسٹالن بہت مشہور ہیں۔ سیاسی شاعری میں آزادی کا خیر مقدم، فریب بہار اور تاب سخن اہم درجہ رکھتی ہیں۔

رومانی نظموں میں "عزم، بیزاری، خاک دل، خاموش آواز، اور آخری ملاقات ایسی نظمیں ہیں جن کی وجہ سے اردو شاعری کی دنیا میں اختر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان نظموں میں جذبہ کی گہرائی، احساس کی نرم آنچ اور دل کے دھڑکنے کی وہ ادا پائی جاتی ہے جو روح میں سما جاتی ہے اور دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہے۔ قومی یک جہتی پر اُن کی نظم اتحاد اور امن کے موضوع پر امن نامہ اُن کی ایسی نظمیں ہیں جو اردو شاعری کی پیشانی پر افشاں بن کر چمکتی رہیں گی۔"

جاں نثار اختر کی سیاسی اور ادبی زندگی نے جہاں ان کی شاعری میں ایک طرف عمل کی حرارت پیدا کی ہے تو دوسری طرف حسن و عشق کی شبنمی ٹھنڈک بھی جو ایک طرف میدان جہد میں جانے کا حوصلہ عطا کرتی تو دوسری طرف دلوں کو سوز و ساز کی دولت بخشتی ہے۔ موجودہ دور میں وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ادب کے منصب کو پہچان کر وہ اپنی بعض تخلیقات کی افادیت کی طرف سے مشکوک نظر آتے ہیں۔ ان کارناموں کی وقتی اور ہیجانی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے بعد ایک ایماندار اور امن پسند شاعر کے ناطے انہوں نے اپنی بہت سی نظریاتی نظموں کو اپنے کلام سے خارج کر دیا ہے۔

جہاں تک جاں نثار اختر کی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر انسانی محبت سے معمور ہیں۔ وسیع معنوں میں ان کی یہ محبت سماجی شکل میں غم جاناں کے نام سے شروع ہو کر غم دوراں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ بڑے سلجھے انداز میں فرد اور سماج کے تعلق پر صحت مندانہ طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سماج اور فرد اپنے انفرادی پیکر میں اُن کے سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ فرد کی محبت کو سماج کی محبت پر قربان کر دیتے ہیں۔ "کون سا گیت سنوگی انجم" اور "زندگی" میں اسی قسم کی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ایسی کیفیات جاں نثار اختر کی شاعری کے علاوہ، فیض، مجاز، جذبی، سردار جعفری اور اکثر دوسرے ترقی پسند شعراء کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں جہاں وہ طبقاتی عدم مساوات کی وجہ سے پیدا شدہ سماجی بدحالی کا ذکر کرتے ہیں وہاں فرد کی محبت بھی اُن کے پیش نظر رہتی ہے گویا انہوں نے اپنے غم کو دنیا کے غم میں سمو دیا ہے "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" جاں نثار اختر کی ایسی نظمیں ہیں جن میں مجموعی تاثر انتہائی غمگین فضا کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ جیسے انہوں نے زندگی کی مسلسل جد و جہد سے غم کا عرفان پا لیا ہو۔ لیکن وہ غم کو اٹل اور دائمی نہیں مانتے۔ انہیں یہ یقین ہے کہ دکھوں کی یہ سیاہی چھٹ کر رہے گی۔ انہوں نے اُس غم سے عمل کی حرارت پائی ہے اور فرد کی محبت کو سماج کی محبت میں ڈھال دیا ہے۔ ان نظموں میں انسان اور زندگی کی ایسی بھرپور محبت کی ترجمانی کی گئی ہے کہ موت بھی زندگی کے اس عزم کو دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے۔

ہیئت کے سلسلے میں جاں نثار اختر نے کوئی خاص اجتہاد نہیں کیا اُن کی صرف چند نظمیں ایسی ہیں جو انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر کہی ہیں۔ وہ ہیں "روس کو سلام"، "اسٹالن"، اور "یا نگ سی کی موجو"، ان نظموں میں بھی چھوٹی بڑی بحریں وضع کر کے اور ان کو ضرورت کے مطابق تنگ اور کشادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح کہ ایک صوتی آہنگ اور ایک رنگا رنگ تسلسل پوری نظم میں برقرار رہتا ہے۔ اور غنائیت کی مربوط و مدہوش کن فضا دامن دل کو کھینچتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ وزن قافیہ اور ردیف کے حسن و ترنم کے قائل ہیں۔ غیر مرئی اشیاء کو مرئی متصور کر کے اُن کے لطیف و کثیف، نرم و سخت،

ڈاکٹر کشور سلطان *

جاں نثار اختر کا مقام

زندگی کی صورت گری کے لئے ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے کارناموں سے دوسروں کے لئے ذہنی انبساط کے سامان فراہم کئے ہیں۔ اچھے معاشرے کی تشکیل اور خوش حال زندگی کے خواب خود بھی دیکھے ہیں اور دوسروں کو بھی شامل کیا ہے۔ ان دلکش حسین خوابوں میں دوسروں کو بھی شامل کیا ہے۔ کبھی حسین تعمیروں کو حقیر مفادات کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ جن کے ہاتھوں سے حسن کی قدروں کو دوام حاصل ہے۔ ان کی خراشیں مٹانے کے لئے سینہ سپر رہے۔ انہوں نے جو دنیا سجائی ہے وہ بڑی طرحدار اور موتیوں جیسی دمک اور پھولوں جیسی مہک سے آباد ہے کبھی کسی مصور نے اپنے حسین نقوش کے ذریعے حسن کی تصویر کشی کی تو کسی صنم ساز نے حسن کو پتھر کے سانچے میں ڈھالا، کسی ادیب نے اپنے الفاظ کی معنی آفرینی اور رنگا رنگی سے حسن و جمال کو پیکر محسوس عطا کرنے کی کوشش کی تو کسی شاعر نے اپنے خون جگر سے غم کی داستان لکھ ڈالی۔

بلاشبہ قابل احترام ہیں وہ ہستیاں جن کے سینوں میں جذبات اور دماغوں میں خیالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کی مدد سے وہ معاشرے کو بچانے، بنانے اور سنوارنے کا جتن کریں۔ اور اپنی فنی صلاحیتوں کو دوسروں کی بہبودی کے لئے وقف کر دیں۔

اردو کی ترقی پسند تحریک میں بڑی حد تک اسی جذبے کی کارفرمائی شامل رہی ہے۔ جاں نثار اختر اسی تحریک کے سرگرم رکن اور ترقی پسند شاعری کے اختر تابندہ ہیں۔

انہوں نے علم و ادب کے ایسے گہوارہ میں آنکھیں کھولیں جہاں شعر و سخن کی آوازیں کانوں میں آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ رموز اُن کی سمجھ میں آئے اور پھر آگے چل کر خود کو بھی انہوں نے اسی دنیا سے وابستہ کر لیا۔ جس کی تعمیر میں ان کے بزرگ مصروف رہے تھے اور جس کی تزئین آج بھی اُن کا گھرانا کر رہا ہے۔ شعر و سخن کی اس آباد محفل میں آنے کے بعد ان کی شاعری کبھی وقت کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی رہی تو کبھی ماضی کی یادوں کی صدائے بازگشت کی صورت میں نمایاں ہوئی تو کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے پرکیف مشاہدات کی عکاس بنی۔ ہر دور میں انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں، غزلیں، قطعے، رباعیات، مثنویاں، شخصی نظمیں اور مرثیے کہے ہیں ان کی شاعری کے موضوعات کی فہرست طویل ہے۔ انہوں نے رومانی، سیاسی، انقلابی، سماجی ہر قسم کے موضوعات پر اپنے افکار نظم کئے ہیں۔ ہر موضوع پر (صرف چند انقلابی نظموں کو چھوڑ کر) اُن کی شاعری میں سادگی، فطری صداقت، شدت احساس

★ یہ اقتباس ڈاکٹر کشور سلطان کے اُس تحقیقی مقالہ کا ایک حصہ ہے جس پر ، جبلپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری انہیں دی ہے۔

دھیرے اس نے اپنے آپ کو اس سے آزاد کر لیا۔ رنگ و آہنگ کے حسین امتزاج سے نئے نقش بنائے۔ جوش کے بعد کی پیڑھی کے شاعروں میں اُس کا نام مجازؔ، فیضؔ، جذبیؔ، سردار جعفری، مخدومؔ، وغیرہ کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور یہ حقیقت اس کی تخلیقات کا خزانہ اپنے ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ ہے،،[1] سالک الہاشمی نے اختر کی شاعری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

،، ترجمانِ زندگی، مبصر، مناظر، ماہر نفسیات، رومان کا رسیا اور انقلاب کا نقیب جاں نثار اختر اپنی صلاحیتوں کو لے کر اٹھا ہے۔ وہ بہت زریں اور مستحکم ہیں۔ وہ متعدد راگنیوں کو ملا کر ایک ایسا نغمہ شیریں پیدا کرتا ہے جس سے طبیعت پہ وجد طاری ہو جائے۔ فن کار حقیقت میں وہی ہے جو دل و دماغ کو اپنے تصورات میں ڈھال لے اور عزائم کو بیدار کر دے۔ خود زندگی ہی سے کھیلے اور زندگی ہی کے مسائل پیش کرے ،،[2]

جاں نثار اختر کے ذیل میں یہ امر حیرتناک ہے کہ اردو کے ممتاز سخن شناس نا قدوں نے اُن کے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بہت کم کیا ہے۔ کسی نے بھی اُن کی شاعری پر تفصیل سے نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ جن دو چار نے لکھا بھی ہے تو اُسے سرسری تبصرہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن اب جا کے برف کچھ پگھلی ہے۔ اور لوگوں نے جاں نثار اختر کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ،، گھر آنگن ،، کا فیض سمجھئے جس نے لوگوں کو اُن کے فن کی حقیقت تک پہنچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حال ہی میں اُن کی تخلیقات کے دو مجموعے ،، خاکِ دل ،، اور ،، پچھلے پہر ،، بھی لوگوں کے سامنے آئے ہیں جس سے اُن کی فنی بالغ نظری کا ثبوت لوگوں کے سامنے آ گیا ہے۔

اختر کو جوشؔ نے ،، تابندہ ،، کہا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ دور اختر کے اُفق شعر و سخن پر پھر لوٹ تابندگی کا دور ہے

ہندوستانی معاشرہ کے باہمی اختلاط اور مشترکہ تہذیب کی ترجمانی اردو شاعری صدیوں سے کرتی آئی ہے

جاں نثار اختر

---

[1] - اجاں نثار اختر جیونی اور سنکلن (ہندی)، مرتبہ پرکاش پنڈت، صفحہ ۱۹ - ۲۰

[2] - ماہنامہ افکار بھوپال نومبر ۱۹۴۷ء صفحہ ۵۱

گرم و سرد پہلوؤں کو انہوں نے اس طرح نمایاں کیا ہے کہ محسوسات پوری طرح مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں اس سے ان نظموں میں پیکر نگاری کے ذریعہ انہوں نے ایمائیت اور معنوی وسعت پیدا کر دی ہے۔

جاں نثار اختر بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں۔ انہوں نے انقلاب کے گیت گائے ہیں تو اسی جذبہ کے ساتھ کہ امن و عافیت انسان کی تقدیر بن جائے تاکہ پُرامن فضا میں محبت کا پودا پروان چڑھ سکے۔ ۱۹۴۲ء میں جوش ملیح آبادی نے ان کی شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

" اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہیں جس طرح کوئی بناض موسیقی متعدد راگنیوں کو ملا کر ایک ایسا نغمہ تیرین پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے دوش بدوش اختر کی شاعری میں جو انقلابی عنصر ہے وہ اس قدر جاندار اور جاندار کے ساتھ ساتھ دل کش اور ہموار ہے کہ دلوں پر براہ راست اثر پڑتا ہے "

جاں نثار اختر کا تازہ ترین کارنامہ گھر آنگن ہے۔ ابھی تک اردو شاعری میں رومان یا تو محبوبہ سے وصال پر ختم ہوتا رہا تھا یا اُس کی جدائی پر۔ عورت کا تصور بحیثیت شریک حیات بہت نایاب ہے حالانکہ شادی شدہ زندگی کی اپنی ایک دنیا اور اپنی ایک تہذیب ہے۔

دراصل اردو شاعری کا عام رجحان عمومیت اور حقیقت پسندی کا نہیں رہا ہے اس لئے ہندوستان کی قدیم تہذیبی اور تمدنی روایات کو نظم کے روپ میں پیش کرنے میں جاں نثار اختر عام ڈگر سے ہٹ کر "گھر آنگن" کی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان قطعات و رباعیات کے ذریعہ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نیا تجربہ، ایک نیا موضوع سخن اور نیا تصور پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کا مزاج۔ اس کے ترکیبی نام ان کی امن پسندی، ان کے اپنے وطن کی ہر ہر چیز سے والہانہ محبت اُن کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایات، ان تمام عناصر نے مل کر ان کی گھر آنگن، کی شاعری میں روح پھونک دی ہے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستانی کلچر اور یہاں کی قدیم تہذیبی اور تمدنی روایات سے لگاؤ جاں نثار اختر کو ورثے میں ملا۔ جاں نثار اختر مضطر خیرآبادی کے بیٹے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں ہندی شاعری میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اور کون ہوگا جس نے اُن کے گیتوں کو نہ سنا ہو۔ اور انہیں پسند نہ کیا ہو۔

پنڈت پرکاش نے اختر کی شاعری سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

" وہ (جاں نثار اختر) کبھی مستقبل سے نا اُمید نہیں ہوا۔ اس کی شاعری اس احساس سے پیدا ہوئی ہے کہ آج کی زندگی کی جدوجہد کیونکہ آنے والے کل کی خبر دیتی ہے اس لئے زندگی کی جدوجہد کی تلخیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ آج اس کی شاعری میں سماجی حقیقتوں کا گہرا عکس ہے اور اس کا موضوع سخن وہ انسان ہے جو سماج اور قدرت پر فتح پالینے کے بعد حسین و دلفریب اور پُرسکون زندگی قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔

سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ اختر کا رومانی شعور بھی بہت پختہ ہے۔ اس معاملہ میں اُس سے بہت کم لغزشیں ہوئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاعری پر اُس کا عبور ہے اور دوسرے اس نے قدیم و جدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ ادب کی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری اہمیت دیتے ہوئے بھی وہ موضوع کی آنچ کو کم نہیں ہونے دیتا۔ حسن کی اصطلاحات کے نئے تجربوں میں بھی اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اچھا ثبوت دیا ہے۔

اپنے بیشتر ہم عصر شعراء کی طرح اختر کی ابتدائی شاعری پر بھی جوش ملیح آبادی کا کافی اثر تھا۔ لیکن دھیرے

"ریاست"، ہے جس میں انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر سے ریاست کے وجود کا تجزیہ کیا ہے۔ دوسری نظم "مؤرخ سے"، اُس میں تاریخ کا جدلیاتی تصوّر پیش کیا ہے۔ ایک نظم "دانائے راز اور جویائے راز"، ہے یہ بھی مارکسزم کے نظریات کی حامل ہے اور اس میں مارکسزم کا فلسفہ پورے طور پر پیش کیا ہے اور نیچر، تاریخ، سماج، محنت اور دوسرے سماجی امور کے بارے میں مارکسی نظریات واضح انداز سے نظم کئے ہیں اس نظم کا Pattern وہی ہے جو اقبال نے اپنی نظم "پیرِ رومی اور مریدِ ہندی" میں اختیار کیا ہے۔ بلاشبہ اختر صاحب اس فلسفہ سے بہت زیادہ متاثر رہے۔ لیکن انہوں نے رومانی شاعری کو خیرباد نہیں کہا۔ وہ رومانی نظمیں بھی لکھتے رہے جیسا کہ بہت سے دوسرے ترقی پسند شعرا کہتے رہے لیکن اُن کا انداز کئی ہم عصر شعرا سے زیادہ 'ادبی' رہا۔ ادبی ان معنوں میں کہ اس میں خشکی نہیں آئی۔ رنگینی قائم رہی اور رنگینی زیادہ ہی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُن کی نظموں کے تیور رومانی انقلاب پسندی سے جا ملے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو وہ اپنی شاعری کی شعریت کو موجودہ صورت میں نہ رکھ سکتے۔ جس پر بیشتر تغزل کا کیف رہتا ہے۔

جاں نثار اختر نظم گو شاعر ہیں۔ اُن کی بیشتر نظموں میں نظم کی نئی تکنیک ہے اور تاثراتی انداز ہے لیکن اُن کا اظہار بہت کم غزل کے اثر سے آزاد ہوتا ہے اور وہ کہیں کہیں ہی اپنے اندازِ بیان کو تغزل سے مبرا رکھ سکے ہیں۔ شاید اُن کا مزاج ہی غزل پسند ہو۔ اُن کے لہجے میں عموماً دھیما پن رہتا ہے۔ اور یہ دھیما پن نغمگی لئے رہتا ہے۔ جاں نثار اختر نے اپنی غزل کے متعلق کہا ہے۔ "اب کچھ عرصے سے میں نے غزل کی طرف توجہ دی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس طرف میں نے صحیح معنوں میں غزل کہی ہے۔ غزل کی کلاسکیت کو برقرار رکھتے ہوئے میں نے جدید خیالات کہ جن میں سیاسی شعور بھی شامل ہے۔ نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔" اُن کی غزلوں میں آج عصریت مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے بلکہ آنے والے زمانے کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے۔ جدید غزل کی خصوصیت جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے ایک نئے انداز سے حسن اور فن کا تقاضا کرتی ہے جس سے پچھلے دور رنگِ غزل نے نظر ملانے کو خلافِ شان سمجھا تھا اور جو غزل کے لئے قابلِ قبول ہونے کے واسطے کافی حسین اور دلکش معلوم نہیں ہوتا تھا وہ یہاں جاذبِ توجہ ہو کر غزل کے نئے پن کا حسن بنا اور جذبات اور احساسات کے ذرائع اظہار بدل گئے وہ پچھلے دور سے وسعت میں زیادہ پھیلی اور بلندی میں زیادہ بلند ہو گئی۔ اگرچہ یہ وسعت اور یہ بلندی فی الحال اجنبی سی معلوم ہوتی ہے لیکن ہے اسی کائنات کے حدود میں۔ تخیل سے زیادہ حقائق سے پیدا شدہ تاثرات پر مشتمل ہے۔

اختر صاحب شخصیت اور شاعری کے اعتبار سے ہر پہلو سے اردو شاعری کے اُس دور کے ممتاز فرد ہیں جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اگرچہ اب دوسرے لوگوں کا دور شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت اختر صاحب پرانے اور نئے دَور کے لوگوں میں محترم ہیں اور عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جوش صاحب کی رائے جو ایک بڑے شاعر کی رائے ہے اور جو انہوں نے ۱۹۴۲ء میں دی تھی اگرچہ ایک ناقد کی مکمل توقعات اُن سے رکھنا مناسب نہیں، پھر بھی بہت کچھ حقیقت پر مبنی کہی جا سکتی ہے۔

"اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں جس طرح کوئی ناہر موسیقی متعدد راگنیوں کو ملا کر ایسا نغمۂ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے دوش بدوش اختر کی شاعری میں جو انقلابی عنصر ہے وہ اس قدر جاندار اور جاندار کے ساتھ ساتھ اس قدر دلکش اور ہموار ہے کہ دلوں پر براہِ راست اثر کرتا ہے، یہ خوابیدہ امنگوں کو جگاتا ہے اور کشورِ کار کے ولولوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔ اور اُن کے ہر لفظ میں ایک حساس دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

ظفر ادیب

میٹھے لہجے کا شاعر

جاں نثار اختر کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے ہیں۔

"جاں نثار اختر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ اشعار بڑے مزے میں پڑھے گئے۔ نہ کلام میں تصنع تھا نہ لہجہ میں۔ ایک نظم پڑھی گئی اور دو تین غزلیں۔ فراق صاحب نے لگے ہاتھ اپنی رائے بھی دیدی کہ نہایت صاف کلام ہے اور قاعدے کے ساتھ کہا گیا ہے۔ مجنوں صاحب نے بھی کچھ اسی قسم کی تنقید کی۔ میں نے بھی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ایک انفرادیت بھی آپ کے طرز بیان میں ہے اور سب سے خاص بات جو مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ شعر کہنے کے لئے نہیں کہے گئے، بلکہ جذبات سے متاثر ہو کر اختر صاحب نے اشعار کہے ہیں۔ مجنوں نے کہا ادھر جتنے ہونہار نوجوان شعرا کا کلام میں نے دیکھا ہے سب میں ایک انفرادیت کی جھلک ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری جدید شاعری روایاتی نہیں ہے، اس کی مثالیں عہد قدیم کیا دور جدید کے پہلے حصے میں بھی کم ملتی ہیں۔" (ملک وادب کے شہزادے)

ایک ایسا دور بڑے بڑے فن کاروں کا امتحان ہوتا ہے جس میں بہت سے فن کار ابھرے ہوں اور ان میں بیشتر ایک نہ ایک پہلو سے انفرادیت بھی رکھتا ہو۔ ملک کے گوشے گوشے سے فن کاروں کی کھیپ اُٹھ رہی تھی، جن میں مخدوم، جذبی، مجاز، فیض، سردار جعفری نمایاں تھے۔ انہوں نے ایک نیا دوسرے انداز میں اپنے آپ کو اُبھار لیا تھا۔ اور عوام و خواص میں پسندیدہ ٹھہرے تھے۔ اُن میں ایک اہم نام جاں نثار اختر کا بھی تھا۔ قاضی عبیدالرحمان ہاشمی اپنے مضمون "نظم جدید۔ ایک جائزہ"، میں لکھتے ہیں: "جدید شعرا کا طبقہ اشتراکی نظریہ ادب سے متاثر ہو چلا ہے اور جنگ عظیم اوّل و دوم کے درمیانی عرصے میں خالص سیاسی، اشتراکی شاعری وجود میں آتی ہے یہ شاعری راست اندازی پر مقصدیت کی وجہ سے زیادہ زور دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں ابلاغ واضح اور براہ راست ہوتا ہے لیکن اس تحریک کے وہ بیش رو شعرا جو ابھی رومانیت کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ وہ انداز بیان کے تذبذب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فیض۔ مجاز، اور اختر الایمان کے یہاں رومان اور سیاست کی درمیانی کش مکش برابر رہتی ہے، جذبی اختر انصاری، جاں نثار اختر وغیرہ اس گومگو میں گرفتار نہیں ہوتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُس پر انہیں پوری قدرت رہتی ہے"

اس میں شبہ نہیں کہ اختر کا شمار اُن کے زمانہ طالب علمی ہی سے ہندوستان کے مستند ترقی پسند شعراء میں ہونے لگا تھا۔ اُن کی شاعری میں موجود ترقی پسند عناصر سے کسی شعور مند کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اُن کا خلوص جو ان میں اشتراکی فلسفہ کے تئیں پایا جاتا ہے۔ انہیں اشتراکیت سے وابستگی شروع ہی سے نہایت سنجیدگی سے رہی ہے۔ اُن لوگوں سے بھی زیادہ سنجیدگی جو اُن سے زیادہ اشتراکی شاعر مشہور ہیں۔ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں جاں نثار اختر اور سردار جعفری نے مارکسزم کے فلسفہ کا خلوص اور سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ جاں نثار اختر نے آگے چل کر ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان اس فلسفہ پر براہ راست نظمیں بھی کہی۔ اُن کی ایک نظم

سُننے والوں کو مسحور کر لیتا ہے بلکہ اُن کے اپنے چہرے کو بدل دیتا ہے۔

یہ خوبصورتی اُن کی شاعری کی ہئیت (Form) کی نہیں بلکہ اُس کے مواد (content) کی ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ شعر اُن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ :-

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

(پہلی بات جو جاں نثار کی شاعری میں ہے وہ یہ کہ جو بات بھی ہے وہ دل سے نکلتی ہے اور سننے والے یا پڑھنے والے کے دِل میں اُتر جاتی ہے خواہ وہ بات انقلابی ہو یا رومانی پُرخلوص اور بے لاگ ہوتی ہے۔

تضاد در اصل جاں نثار اختر کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا نہیں ہے۔ وہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک اُن کے دل کی آواز کی نمائندگی کرتا ہے دوسرا ان کے دماغ کی مثلاً نظم کا عنوان ایک داخلی تاثر ہے مگر خلوص کی کتنی شدتِ احساس ہے اُس میں۔

یہ آپس کی بڑھتی ہوئی بدگمانی!
بہت دن سے وقفِ آزار دونوں
محبت سے ہر لمحہ بیزار ہیں لیکن
محبت میں پھر بھی گرفتار دونوں

جوش کی طرح قطعے اور رباعیاں جاں نثار اختر کے فن کی خصوصیت ہیں۔ مگر دیکھئے انداز بیان کتنا مختلف ہے

دوست! تجھ سے اگر خفا ہوں تو کیا
آپ سے بھی تو خود خفا ہوں میں
آج تک یہ نہ کھل سکا مجھ پر
بے وفا ہوں کہ باوفا ہوں میں

جوش صاحب کے ہاں پُرشوکت (بلکہ پُرہیبت) الفاظ کی گھن گرج ہے۔ جاں نثار کے ہاں خلوص کی کارفرمائی اور بے ساختہ پن۔

اِس کے علاوہ ایک چیز اور ہے جو جاں نثار کی شاعری کو ممتاز کرتی ہے۔ وہ ہے گل و بلبل کی تشبیہوں کے بجائے آج کی زندگی سے لی ہوئی تشبیہیں اور استعارے۔

ہائے یہ انتظار کے لمحے
جیسے سگنل پہ رک گئی ہو ریل

ایک اور منفرد خصوصیت جو جاں نثار کی شاعری میں ملتی ہے وہ ہے اُس کا "ہندوستانی پن"، اُن کے یہاں عرب اور ایران نہیں ہندوستان ملتا ہے، ہندی کے نہ صرف الفاظ، محاورے اور تشبیہیں بلکہ اچھی ہندی شاعری کی روانی اور بھول پن۔ جیسے "آخری ملاقات" میں۔

خواجہ احمد عبّاس

شاعر کا چہرا

میں نے جب جاں نثار اختر کو پہلے دیکھا اور سنا تو میں نے سوچا یہ شاعر کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ آواز شاعر کی آواز ہو سکتی ہے۔

شاعر تو کرشن چندر کی طرح خوبصورت ہوتا ہے، مجاز کی طرح خوش گلو ہوتا ہے، فیض کی طرح خوش لباس ہوتا ہے۔ پشکن اور بائرن کی طرح اُس پر سینکڑوں لڑکیاں مرتی ہیں۔ اور وہ در جنوں پر جان دیتا ہے۔

اُس زمانے میں جاں نثار کی شادی صفیہ سے ہو چکی تھی۔ صفیہ مرحومہ جو میرے دوستوں مجاز۔ انصار کی بہن بھی اور جو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی جس کو میں نے ہمیشہ اپنی بہنوں کی طرح سمجھا۔ جس کے بچے سلمان اور جاوید ہمارے گھر آ کر گانا گاتے تھے "سینما جانا چاہئے اور وہیں چپک کر رہ جانا ہے"۔

پھر ایک مشاعرے میں میں نے جاں نثار اختر کو سنا اُن کی آواز اور پڑھنے کے انداز دونوں پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گئے تھے پہلے وہ آخر کے لفظ کو بہت کھینچ کر ادا کرتے تھے۔ اب اُن کا توازن ٹھیک ہو گیا ہے۔ مگر ترنم کی دل کشی نہیں ہے اُن کے ہاں نہ مجاز کا ترنم ہے نہ کیفی اور سردار کا سا تحت اللفظ ہی پڑھتے ہیں۔ گھن گرج اور رعب داب کے ساتھ۔

مگر جاں نثار اختر نے جب پڑھنا شروع کیا تو اُن کے چہرے میں میں نے ایک تبدیلی ہوتی دیکھی۔ اب اُن کے بال مٹیلا نہیں تھے۔ نہ اُن کے چہرے پر جھرّیاں تھیں۔ سفید کرتے اور پاجامے میں وہ ایک دم سے چمک اٹھے تھے۔

میں نے سوچا اس آدمی کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو میری طرح سے بدصورت ہوتا تھا۔ اب کیا ہوا ہے کہ دفعتاً جاذب نظر ہو گیا ہے بعد میں غور کیا کہ یہ اُس کی خوبصورتی نہیں ہے۔ اُس کی شاعری کا حُسن ہے جس نے اُس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں یہ چمک دمک پیدا کر دی ہے۔ یہ حیرتناک تغیّر ایک ہی اور شاعر میں میں نے دیکھا۔ وہ جاں نثار کا یار غار اور سالا اسرار الحق مجاز۔ جو جب پڑھتا تھا تو ایک دم بدل جاتا تھا۔ چہرے پر نور برستا تھا جو اُس کی شاعری کا نور تھا۔ اُس کے انداز میں جلال آجاتا تھا۔ جو اصل میں اُس کی شاعری کا انقلابی جلال ہوتا تھا۔ بس یہی حال جاں نثار اختر کا ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کے پڑھنے کے انداز میں (برخلاف مجاز کے) نہ دلکشی نہ دل رُبائی ہے سیدھے سادے پڑھتے ہیں۔ جیسے بات کر رہے ہوں یا نثر پڑھ رہے ہوں۔ مگر پھر بھی اُن کی شاعری کا جادو نہ صرف

انساں مگر بھٹکا کیا
کانٹا کوئی کھٹکا کیا
جو دیں ہیں نہ منزل کا سراغ
کس کام کے ایسے چراغ

مارکسی فلسفۂ اقتصادیات کو بہت سے شاعروں نے اپنایا ہے اور اپنی شاعری میں سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن شاید ہی سوائے جاں نثار اختر کے کوئی بھی اسے سمجھا سکا ہو۔

آدمی، آلات، محنت پیشگی
قوتِ مجموعِ پیداوار کی
جس کا ممنوں جس کا مرہونِ کمال
مادّی اقتدار و اشیا کا جمال

علم کے نشو و نما سے ہیں عیاں
آلہ و اوزار کی تبدیلیاں
ان کا مجموعی تغیر دورِ نو
ابتدا میں نرم خیز و نرم رو
رفتہ رفتہ گرم ہوتا آفتاب
دفعتہً پھر اک شعوری انقلاب
"جویائے راز"، سوال کرتا ہے
گلفشاں کیسی نوائے ساز ہے؟
آج یہ کس دور کا آغاز ہے
اور "دانائے راز" اُسے بتاتا ہے
رشتۂ افراد ہے بے آب و تاب
پیداآور قوتوں کے ہم رکاب
رنگِ پیداوار اب کچھ اور ہے
وقت کی رفتار اب کچھ اور ہے
کوہ و معدن، دشت، دریا، کہسار
آلہ و اوزار، کشت و رود بار
اجتماعی ملکیت ہے یہ زمیں
آج یہ تیری نہیں میری نہیں

انسائی ہوئی رُت ساون کی
کچھ سوندھی خوشبو آنگن کی
اک ٹوٹی رسی جھولے کی
اک چوٹ کسکتی کولھے کی

کچھ ہار مہکتی کلیوں کے
کچھ نام وطن کی گلیوں کے

کچھ بکھرے بکھرے سپنے ہیں
یہ غیر نہیں سب اپنے ہیں
مت روکو انہیں اپنے پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

یا "عنوان میرے افسانوں کے" میں یہ بند

سپنے وہ کنوارے ہل چل میں
بجلی کا چمکنا بادل میں
من دیپ جلائے رادھا ئیں
شاید کہ کنھائی لوٹ آئیں

جاں نثار کا دل شاعر کا، عاشق کا، دل ہے۔ مگر دماغ مارکسی ہے اور اُن کی داخلی نظمیں عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شلاً "ستاروں کی صدا" میں جب وہ انسان کی طرف سے "ستاروں" سے یعنی پُرانی قدروں سے کہتا ہے

انسان نہیں اب بے ضمیر
شب تاب افسوں میں اسیر
اب وہ اُمیدیں توڑ دو
صدیوں کی باتیں چھوڑ دو
سمجھا کئے اہلِ زمیں
جب تم کو قسمت کے نگیں
تم رہبری کرتے رہے
افسوں گری کرتے رہے

اس کا جواب ہے کہ استالن کے سُرخ پرچم میں اُن انسانوں (اور کمیونسٹوں کا) لہو ہے جو اُس کے دورِ استبداد میں شہید ہوئے۔ مارکس اور لینن کا نام لے کر! "خروشچوف رپورٹ پڑھنے کے بعد تو اس نظم کو حذف کردینا چاہیے تھا!

یہ چہرہ تو شاعر کا نہیں ہے ایک پارٹی پروپیگنڈسٹ کا ہے اور جاں نثار کا چہرہ تو شاعر کا چہرہ ہی ہے۔

ترقی پسند تحریک نے باوجود بہت کچھ دینے کے، آج تک کوئی "بڑا" شاعر پیدا نہیں کیا، یوں تو ہم آپ سبھی بڑے شاعر ہیں لیکن حقیقت میں دو دو چار چار نظموں کے سوا ہمارا سرمایہ ہے ہی کیا۔ ابھی ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کوئی ایسا عظیم شاعر پیدا کرے جسے ہم غالب اور اقبال کے مقابل رکھ سکیں۔

جاں نثار اختر

آدمی کا آدمی سے اتحاد
آدمی کا آدمی پر اعتماد
سازِ نو میں نغمۂ جمہور ہے
زندگی آزاد ہے مسرور ہے

دیکھا ایک ٹھوس اقتصادی اور انقلابی مسئلہ کو کتنی خوبصورتی اور شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے لیکن شاعرانہ احساس کا دامن نہیں چھوٹا ہے۔

داخلی شعور اور اندرونی کرب کے امتزاج کی بہترین مثال "تلخ نوائی" میں ملتا ہے۔

چھین سکتا نہیں مجھ میرے نغمے کوئی
ساز کا کیا ہے کہ بے ساز بھی گا سکتا ہوں
آج بھی ایک حسیں آگ لگا سکتا ہوں
کیا ہوا توڑ دیا تو نے اگر ساز میرا

"خاک دل" کی آخری نظم میں اختر کہتے ہیں۔

منزل نئی، انساں نیا
محفل نئی، ساماں نیا
کیا ریاست کا وجود
کیا آمریت کا وجود
یاں شہریاری ہے کہاں
سرمایہ داری ہے کہاں
باقی نہ طبقاتی نظام
باقی نہ آقا و غلام

یاں گیت ہے یاں پیار ہے
یاں زندگی سرشار ہے

اے آدم نو زندہ باد
تابندہ باد و پائندہ باد

اس مجموعے کی جو نظم کھٹکتی ہے وہ اسٹالن کا مرثیہ (بلکہ قصیدہ ہے) جس میں جاں نثار نے پوچھا ہے۔

تجھ میں اے پرچم گلرنگ ادا کس کی ہے
سرخ تارے ترے سینے میں ضیا کس کی ہے؟

منجھی ہیں اور لفظیات میں بڑی قوت ہے لفظ اُن کی نوکِ قلم سے جیسے ٹپک پڑتے ہیں جنھیں وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بڑی فنکاری سے استعمال کرتے ہیں اس کے علاوہ اُن کی ہر تخلیق پر ان کی انفرادیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ دراصل وہ الفاظ کی مدد سے زندگی اور اُس کی گوناگوں حقیقتوں کی ایسی واضح تصویر کشی کرتے ہیں جن میں معنی کی تہہ در تہہ سطحیں ہوتی ہیں۔ اشتراکی حقیقت نگاری اُن کا بنیادی طریقۂ کار رہا ہے۔ مارکس ازم میں اُن کا اعتقاد غیر متزلزل رہا۔ اور اسی لئے جب کہ اُن کے بہت سے ہم عصر ترقی پسند ادیب راستے سے دور جا پڑے اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، جاں نثار اختر بڑی استواری اور اعتماد کے ساتھ اپنی متعین راہ پر گامزن ہیں مارکس ازم میں جاں نثار اختر کا اعتقاد کورانہ تقلید نہیں۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم۔ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے مختلف محاذ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کمیونسٹ تحریک کی وقتاً فوقتاً شکست خوردگی نے بھی جاں نثار اختر کو مذبذب نہیں کیا۔ وہ تاریخ کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ اُس پر غور کرنے اور جدلیاتی طور پر اُس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اُن نظموں سے ملتا ہے جو ایسے موضوعات پر انہوں نے کہی ہیں۔ مثلاً "تاریخ کا جدلیاتی تصوّر" "ریاست کا مارکسی نکتہ نظر" یا "طبقاتی جدوجہد" اردو کے لئے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ ہم اختر کا اُن کے اٹل آدرش، انقلاب کے یقینی اعتماد، محنت کش عوام سے ذہنی ربط اور انسانیت سے محبت کے سبب دنیا کے اَن گنت کمیونسٹ شاعروں سے مثلاً مایکوفسکی (May kovesky) یوفتوشینکو (Yevtushenko) ناظم حکمت اور پبلو نرودا جیسی دیوقامت شخصیتوں سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ نرودا کی طرح اختر نے "اُس ذہنی انتشار" بکھراو، اکیلے پن، لاوجودیت، جس نے ایک ساری دنیا پر دھاوا بولا اور ہلا کے رکھ دیا۔" ان سب کو جھیلا اور خود کو زندہ رکھا، "اور دھرتی، جسم اور مادے سے پیوست رہے۔" ہاورڈ فاسٹ (Howard Fast) نے اپنی کتاب "حقیقت اور ادب" میں اشتراکی حقیقت نگاری پر زور دیا ہے اور نئی انسانیت کی بنیاد پر نئے اقدار اور نئے معیارات کی بات کی ہے۔ اُس نے میکزم گورکی (Maxim gorki) کے ان الفاظ کو دہرایا ہے۔!

"پرولتاری طبقے کی انسان دوستی براہ راست ہوتی ہے وہ انسانوں کی دوستی کے لئے پُر شکوہ اور میٹھے جملے نہیں تراشتی، اُس کا مقصد تمام دنیا کو سرمایہ داری کے شرمناک، خونی غیر انسانی جوئے سے آزاد کرانا ہے۔ اور آدمی کو یہ تعلیم دینا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی شے نہیں سمجھیں جسے خریدا اور بیچا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اُنہیں غیر مہذب اور عامیانہ افراد کی بیش قیمت عیش پرستی کے لئے خام مواد کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری دنیا کو اسی طرح بے حرمت کرتی ہے جس طرح بڈھا آدمی ایک جوان اور تندرست عورت کو جو صرف اسے اپنی نامرادی کے سبب کہن سالی کے موذی امراض کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا۔ پرولتاری انسانیت محبت کے غنائی اظہار کا مطالبہ نہیں کرتی۔ وہ کبھی محنت کش سے اُس کے تاریخی مشن کے شعور اُس کے اقتدار کے حق کا، شیطانوں، طفیلیوں، فاشسٹ، جلاد، اور محنت کش طبقے کو فریب دینے والوں سے نفرت کا مطالبہ کرتی ہے اُن تمام چیزوں سے نفرت جو انسانی زندگی میں اذیت پیدا کرتی ہے اور اُن تمام لوگوں کی مخالفت جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تکالیف و مصائب پر عیش کرتے ہیں۔" اور جاں نثار اختر کو شدید نفرت ہے۔ اُن سے جو انسانوں کو کچلتے، اُن سے جو اُن کے عزتِ نفس کو ٹھیس پہونچائے جو ان کی آزادی کا گلا گھونٹے اور انسانوں کو حیوان بنائے۔ جاں نثار اختر کی نظم "عنوان میرے افسانوں کے" زندگی کے مایوس کن حالات پر ایک حساس دل کی پکار ہے۔ اس نظم میں وہ عوام کی خوابوں، امیدوں، آہوں اور مسکراہٹوں اُن کے مصائب، اُن کی غربت، کھیتوں اور کارخانوں میں اُن کی بے معاوضہ محنت، ان کا استحصال، اور ان کی فاقہ کشی، بور ژوا شہروں میں جسم کی بیوپار کی تصویر کشی کرتے ہیں اور وہ بے شمار صعوبتیں جو نتیجہ ہیں لوٹ کھسوٹ والے سرمایہ دارانہ نظام کا۔ ان سب حقائق کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اِن سارے تکلیف دہ مظاہر سے اپنی نظموں کا مواد اور عنوانات حاصل کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آنے والے طوفان کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ وہ مستقبل کا ایک واضح تصوّر رکھتے ہیں۔ ایک ایسا

مدھوسودن بلگرامی

مارکسی شاعر

یہ ضروری ہے کہ مضمون کی ابتدا ہی میں آرٹ کے مارکسی نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی جائے۔ اس امر کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ آرٹ سماجی شعور اور انسانی جد و جہد کا مظہر ہے۔ انسانی محنت ہی نے آرٹ کو جنم دیا ہے پلاخانوف (Plekhanov) کے الفاظ میں، "ہم قدیم آرٹ کا کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ اگر ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ انسانی محنت آرٹ سے قدیم تر ہے، اور آدمی ہر چیز کو پہلے افادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور بعد میں اُن سے اپنا جمالیاتی رشتہ پیدا کرتا ہے۔" چنانچہ انسانی کاوشوں کے آگے آرٹ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ آرٹ حقیقت کو فنی نقوش بنا کر پیش کرتا ہے اور ذریعہ بنتا ہے زندگی کے جمالیاتی تصور کا۔ مارکسی ازم، لینن ازم کا سائنسی نظریہ جو تاریخی اور جدلیاتی مادیت پر مبنی ہے آرٹ کی مثالی توضیح کو رد کرتا ہے، جو آرٹ کو واجب الوجود روح، ادراک کلی، روحانی احکام یا صرف لاشعور احساس اور تخیلات کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دور میں کہ جب سائنسی تکنیکی اور فنی ترقیات، انقلابی اقدامات اور دنیا کے بڑے حصے میں سائنسی سوشلزم کا عروج تیزی سے ہو رہا ہے، اگر کوئی اب بھی اپنی تعصبات کو اپنائے ہوئے ہے تو وہ خارجی سچائی کو جھٹلاتا ہے جو فن کار سیاسی و سماجی طور سے بیدار ذہن رکھتا ہے وہ فطری طور پر یہ بات قبول کرے گا کہ آرٹ و ادب کا رول نئی اقدار کی تخلیق میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اقدار جن کی بنیاد حقیقی آزادی، انصاف، مساوات اور بھائی چارے پر ہے جہاں تک ہیئت اور مواد کا تعلق ہے۔ ہیئت پرستی، ہیئت کو مواد سے جدا کرتی ہے۔ جبکہ مارکسی جمالیات ہیئت اور مواد کا اتحاد اور ان کے باہمی توازن کو فن کا لازمی جزو سمجھتی ہے۔ آرٹ، ادب، مذہب، قانونی اور اخلاقی ادارے پورے سماجی ڈھانچے کا ایک حصہ ہیں کسی بھی سوسائٹی کی بنیاد اُس پورے ڈھانچے کی تشکیل کرتی ہے۔ اقتصادیات ہی دراصل اُس کی بنیاد ہوتی ہے۔ باقی تمام شعبے مل کر اُس کا مکمل فروعی ڈھانچہ بناتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ سوسائٹی کا بنیادی ڈھانچہ اور فروعی ڈھانچہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اصل امر یہ ہے کہ بنیادی چیز کی اہمیت بدستور قائم رہتی ہے۔ ایک طبقاتی سوسائٹی میں آرٹ و ادب بھی طبقاتی انداز رکھتے ہیں صرف پرولتاری اور ترقی پسند ادیب ہی ایک طبقاتی سوسائٹی میں موجود نظریات و تخیلات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لینن نے کہا ہے کہ آرٹ اور ادب کو لاکھوں کروڑوں محنت کشوں کی خدمت کرنی چاہیئے۔ دراصل یہ ایک آزاد ادب ہوگا جو موقع پرستی و خود غرضی سے بالاتر اور اشتراکیت کے نظریہ اور محنت کش طبقہ کے احساسات کو سمو کر نئی تقویت اپنے میں پیدا کرے گا۔ شاعروں کے جم غفیر میں جو شخصیت نمایاں نظر آتی ہے وہ جاں نثار اختر کی ہے۔ وہ ایک زمانے سے شاعری کر رہے ہیں مگر آج بھی اُن کی شاعری نسیم سحر گاہی کے جھونکے کی طرح تر و تازہ ہے اُن کا مطمح نظر مثالی ہے۔ ان کی تشبیہ و تمثیل با موقع اور پر اثر ہے۔ اُن کی محاکات

سوچو گی کہ دنیا طبقوں میں تقسیم ہے کیوں یہ پھیر ہے کیا
انسان کا انسان بیری ہے یہ ظلم ہے کیا اندھیر ہے کیا!
یہ نسل ہے کیا یہ ذات ہے کیا یہ نفرت کی تعلیم ہے کیوں
دولت تو بہت ہے ملکوں میں دولت کی غلط تقسیم ہے کیوں
تاریخ بتائے گی تم کو انساں سے کہاں پر بھول ہوئی
سرمایے کے ہاتھوں لوگوں کی کس طرح سے محنت دھول ہوئی
صدیوں سے برابر محنت کش حالات سے لڑتے آئے ہیں
چھائی ہے جو اتنک دھرتی پر اس رات سے لڑتے آئے ہیں
لیکن یہ لڑائی ختم نہیں یہ جنگ نہ ہوگی بند کبھی
سو زخم بھی کھا کر میداں سے ہٹتے نہیں جراُت مند کبھی
یہ خواب ہی میری دولت ہیں یہ خواب تمہیں دے جاؤں گا
اس دہر میں جینے مرنے کے آداب تمہیں دے جاؤں گا

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شر کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو
ہر جہد ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

اپنی نظم "امن نامے" میں جاں نثار امن کی خواہش کرتے ہیں اور پرزور طریقے سے اس کی حمایت کرتے ہیں رومانی انداز میں نہیں بلکہ عملی اور حقیقی طریقے پر موضوع سے مطابقت رکھتے ہوئے اس نظم میں پرتاثیر محاکات اور دلوں کو ابھارنے والی نغمگی موجود ہے۔ یہاں بھی شاعر اپنے نصب العین کی صداقت سے نہیں ہٹتا اور سرمایہ داری ساری تباہی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ایٹم بم، ہیروشیما کی تباہی، نوآبادیات کی ہوس، نئی منڈیوں اور منافع خوری کی لالچ اور ان کے نتیجے میں جنگ بازی ــــ یہ تمام امور جاں نثار اختر نے اس نظم میں بیان کئے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی سخت ترین مذمت کی ہے۔ ان کی تمام توقعات امن اور ترقی کی قوتوں پر مرکوز ہیں اور واضح طور سے اور پوری امید پروری کے ساتھ اس پریشان حال دنیا میں امن کی بحالی کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ ہر پڑھنے والا اور سننے والا جو انسان کی عقلیت پسندی پر ایمان رکھتا ہے وہ شاعر کی اثباتی اور رجائی نکتۂ نظر کو سراہے گا ع

جہاں میں غلامی کا عنوان ہے جنگ :: سراسر ہلاکت کا عنوان ہے جنگ
یہ سرمایہ داروں کی پالی ہوئی :: سدا شہر یاروں کی پالی ہوئی
نہ ہو میرے ساقی نہ ہو مضمحل :: کہ ہے امن کا آج پرچم بلند
سلام محبت، پیام قرار :: ضمیر گلستاں سفیر بہار
یہ مظلوم انسانیت کی نجات :: یہ اڑتی ہوئی موج آب حیات

مستقبل جو امن، مسرت، خوشحالی کا نمونہ ہو، اُن لوگوں کے لیے جو ہر انسانی خصوصیت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ع

بستے ہوئے انسان شہروں میں ۛ ڈوبے ہوئے خنجر زہروں میں
خاموش زبانیں فاقوں میں ۛ بجھتی ہوئی شمعیں طاقوں میں
منہ اُترے ہوئے گلدانوں کے
عنوان میرے افسانوں کے
بازار وہ کالے دھندوں کے ۛ وہ ہاتھ گلے میں پھندوں کے
کچلا ہوا تن تہذیبوں کا ۛ کھلتا ہوا دل تخریبوں کا
آثار دبے طوفانوں کے
عنوان میرے افسانوں کے

اختر کی حالیہ نظم "آخری لمحہ"، جو انہوں نے اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہی ہے۔ ایک شاہکار نظم ہے اُس میں ذاتی عنصر کم سے کم ہے۔ یہ نظم ایک خزانہ ہے اُن کے باریک مشاہدات اور بیش بہا تجربات کا اِس نظم میں ایک واضح تاریخی نظریہ ملتا ہے اس نظم کو شاعر بڑی محبت اور معنی خیز کے ساتھ اپنی بیٹی تک پہونچاتا ہے صرف اپنی بیٹی تک ہی نہیں بلکہ ہر اُس بچے تک، جو ذات پات کے تقسیم شدہ اور طبقات کے مارے ہوئے سماج میں پیدا ہوا ہے اور پرورش پا رہا ہے اور جو اس امر سے ناواقف ہے کہ پیداواری قوتوں کی نشو و نما تمام سماجی تعلقات کو متعین کرتی ہے۔ جو اس سے بھی ناآشنا ہوتا ہے کہ اقتصادی ڈھانچہ ہی سماجی ڈھانچے کو جنم دیتا ہے اور مجموعی طور پر تشکیل پاتا ہے، پیداواری رشتوں سے۔ کارل مارکس کے الفاظ میں یہ وہ اصلی بنیاد ہے جس پر سیاسی، قانونی، مذہبی، اور دوسرے ڈھانچے تعمیر ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جو نہ صرف درسگاہوں میں پڑھائی جائے۔ بلکہ ہمارے مصیبت زدہ ملک کے خطوں میں گائی جائے۔ یہ ایک اہم اور روشنی دینے والا پیغام ہے جو غیر معمولی فن کاری کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ نظم زندگی کے ضروری مضمون کا احاطہ کرتی ہے۔ موت کا یقینی اسرار ساتھ ہی زندگی کی خوبصورتی اور اہمیت، سماج کی نسلی، مذہبی، اور طبقاتی تقسیم، عوام کی اکثریت کا استحصال، دولت کی غیر مساوی بانٹ، دولت جو انسان کی سماجی محنت کا حاصل ہے۔ اختر نے اس نظم کے ذریعہ تاریخ کے آگے بڑھتی ہوئی رفتار کے یقین کو ظاہر کیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے چاروں طرف مصائب، مشکلات اور محرومی کو دیکھتے ہیں لیکن وہ موجودہ دور کے اس عارضی پہلو کو سمجھتے ہیں وہ ڈیوڈ ہوروویٹز (David Horowitz) کے اس خیال سے قطعاً متفق نظر آتے ہیں کہ "سرمایہ داری کے تحت جینا ایک مستعار وقت کے تحت جینا ہے" وہ جانتے ہیں کہ محنت کش عوام کی لڑائی کبھی کی شروع ہو چکی ہے۔ اور جاری ہے اور برابر چلتی رہے گی۔ اُس وقت جب تک وہ جیت نہ جائے۔ شاعر اگرچہ جانتا ہے کہ اس ملک میں سرخ صبح آنے سے پہلے ممکن ہے وہ نہ رہے۔ لیکن وہ مایوس نہیں۔ وہ اپنے خوابوں پر مسرور و مغرور ہے۔ وہ خواب جو سائنسی صداقت، تاریخی معروضیت اور انسانیت کی بلند قدروں پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ وہ خواب ہیں جو اُس کی دولت ہیں اور یہ وہ دولت ہے جو وہ اپنی بیٹی اور اپنے وطن کے تمام لوگوں کے لئے چھوڑ جائے گا۔ ع

کل تم جو بڑی ہو جاؤ گی جب تم کو شعور آ جائے گا
کتنے ہی سوالوں کا دھارا احساس سے ٹکرا جائے گا

رفتہ رفتہ دماغ انساں میں
ملکیت کا جنوں ہوا بیدار
چل گئی قلب پر جماعت کے
اقتصادی مفاد کی تلوار
ایک طاقت ضرورتاً ابھری
بن کے امن و اماں کی ذمہ دار
ایسی طاقت وجود ہے جس کا
خود جماعت کے ضعف کا اظہار
یہ بدلتی ہوئی سیاست کا
ایک وقتی مگر اہم کردار

کچھ ترقی پسند ذہن رکھنے والے اصحاب ایسے بھی ہوں گے جو ان کے مجموعہ "خاکِ دل" میں "اسٹالین" کو دیکھ کر چونکیں گے۔ یہ نظم اسٹالین کی موت پر کہی گئی تھی۔ لیکن اختر کی بات دوسری ہے، وہ ایک صاحب نظر شاعر ہیں۔ انہوں نے اسٹالین کی یاد کو فراموش نہیں کیا۔ اور نہ اُس کی خدمات سے منکر ہوئے۔ انہوں نے لینن ازم کے اصولوں کی اُس تعبیر کو رد نہیں کیا جو اسٹالین نے اپنی کتاب میں کی ہے سوشلسٹ دنیا کے اَن گنت رہنماؤں، محنت کشوں اور دانشوروں کی طرح اُن کی نظر میں بھی اسٹالین سوویت یونین کے معماروں میں ہے جس نے سوویت فوجوں کی قیادت کی اور نازی حملے کو پسپا کیا، وہ انقلابی جس نے جنگ سے تہس نہس ہو جانے والے اپنے ملک کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور سوشلزم کے ایک مضبوط قلعے میں تبدیل کر دیا۔ اُس کو اور اُس کے کارناموں کو آج بھی چین اور کوریا میں بڑی عزت اور عظمت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ یہ بڑی موزوں اور مناسب بات ہے کہ یہ نظم "خاکِ دل" کے اوراق پر موجود ہے اس طرح سے اختر ایک شاعر اور سچے مارکسسٹ ہونے کے ناطے اپنے ہم عصروں سے آگے رہے اور دنیا کے اس خطے سے ایک عظیم شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں پیش پیش رہے ع

ایک لمحے کے لئے چھا سی گئی دہر پہ رات
روشنی چیخ اٹھی کون؟ میرا اسٹالن
ایک لمحے کے لئے رک سی گئی نبضِ حیات
زندگی چیخ اٹھی کون میرا اسٹالین
ساتھیو! جادۂ منزل پہ ہمارا رہبر
زندگی بھر کی مشقت سے تھکا سوتا ہے
اسٹالین تری صاحب نظری باقی ہے
دیدہ ور دیکھ تری دیدہ وری باقی ہے

یہ پرچم خوشا جس کے سائے تلے ⁂ ملیں آج قوموں سے قومیں گلے
یہ پرچم جسے آج باحترام ⁂ اُٹھائے ہیں دنیا کے لاکھوں عوام

رہے امن ہر انجمن کے لئے
رہے امن تہذیب و فن کے لئے
رہے امن علم و ہنر کے لئے
رہے امن قلب و نظر کے لئے
رہے امن ہر رنگ و بو کے لئے
رہے امن جام و سبو کے لئے
رہے امن جہد و بقا کے لئے
رہے امن ہر ارتقا کے لئے
رہے امن سارے جہاں کے لئے
رہے امن ہندوستاں کے لئے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جاں نثار اختر اُن چند اردو شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے مارکس ازم کی حقیقی بنیادوں کو سمجھا ہے۔ جب تک مارکس ازم کی بنیادوں کو واضح طور پر نہ سمجھ لیا جائے اس سیاسی فلسفے کی باریکیوں پر عبور ممکن نہیں۔

"مؤرخ سے" اور "دانا کے راز" (جدلیاتی مادیت پر) اُن کی بڑی اہم نظمیں ہیں ایسے مشکل اور پیچیدہ مگر اہم تصورات جن میں اس نظریہ کے تمام سماجی، فلسفیانہ اور سیاسی پہلو بھی شامل ہوں نظم کرنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے نظم مؤرخ سے، مارکس اینگلس کے "کمیونسٹ مینیفسٹو" کا ایک اقتباس ذہن میں ابھار دیتی ہے۔ جو میں اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ پڑھنے والوں کو اُس مواد کا اندازہ ہو سکے جسے جاں نثار اختر نے اس نظم میں برتا ہے۔

اب تک کی موجودہ سوسائٹی کی تمام تاریخ طبقاتی جد و جہد کی تاریخ ہے، آزاد انسان اور غلام، اعلیٰ و ادنیٰ حاکم و محکوم، کارخانہ دار کاریگر مختصراً ظالم اور مظلوم مستقلاً ایک دوسرے کے سامنے مخالف صف میں کھڑے ہوئے اس جنگ کو کبھی چھپے کبھی کھلے طور پر لڑتے رہے ہیں۔ اس جنگ کو جو کبھی سوسائٹی کی انقلابی تعمیر یا مقابلہ کرنے والے طبقوں کی مکمل تباہی پر ختم ہوتی ہے" وہ لوگ مندرجہ بالا اقتباس کی سیاسی اور تاریخی معنویت سے باخبر ہیں داد دیں گے اُن کی سلامت اور روانی کی جس کے ذریعہ اختر نے ایک اہم تاریخی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ اُن کی دوسری بیش بہا نظم "ریاست" ہے یہاں شاعر نے خالص مارکسی نکتۂ نظر سے ریاست کی ابتدا اور اس کے استحکام کے (جو ایک استحصالی ادارہ ہے) بارے میں بتایا ہے۔ انھوں نے پُرتشدد سیاسی نظام کو بڑی کامیابی اور وضاحت سے بیان کیا ہے — کس طرح اس نظام نے تاریخ کے ایک مخصوص موڑ پر لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کا ایک ادارہ بن کر جنم لیا ہے اور کس طرح یہ نظام جیسا کہ لینن نے کہا ہے کہ ایک خود کار اجتماعی نظام کو جنم دے کر اپنی موت آپ مر جائے گا۔ ع

ا اشتراکیت سے بھر دیا ہے۔ ذیل کی مثالیں میرے دعویٰ کی وکالت کرتی ہیں ۔۔ "

ہر ایک سمت سے اک آفتاب اُبھرے گا
چراغِ دیر و حرم تو بجھا کے دیکھ ذرا

کل یہی خواب حقیقت میں بدل جائیں گے
آج جو خواب فقط خواب نظر آتے ہیں

مسکراتے ہوئے فردا کے افق پر اختر
ایک کیا سینکڑوں مہتاب نظر آتے ہیں

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

روح کی پیاس کے آگے
جسم کی پیاس بڑی ہے

رات رستے سے ہٹی ہے
صبح آنے کو کھڑی ہے

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں

جاں نثار اختر کی شاعری چار اہم خصوصیات کی حامل ہے۔ انسان سے محبت اشتراکی حقیقت نگاری ترقی پسندانہ رجحان اور حسن پسندی۔ میخیل شولوخوف (mikail Sholokhov) کے الفاظ میں "آرٹ میں انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی قوت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فن کار کہلانے کا حق صرف ان ادیبوں کو پہونچتا ہے جو اس قوت کو انسانیت کی فلاح کے لئے صرف کرتے ہیں اور ان کی روحوں میں ایک حسن کی دنیا بساتے ہیں۔"

اور میں بغیر جھجک کے کہہ سکتا ہوں کہ فنکار کہلانے کا حق منصفانہ طور پر جاں نثار اختر کو پہونچتا ہے۔

راہبر اب بھی تری راہ بڑی باقی ہے
ظلمتِ آخرِ شب بھی نہ رہے گی باقی
اور دو چار قدم مشعلِ جاں لے کے چلو
ساتھیو حوصلۂ شوق کو مہمیز کرو
ہاں قدم تیز کرو تیز کرو تیز کرو
ارتقا وقت کا فرمان سُناتا ہی چلو
ایستالن ہمیں منزل پہ بلاتا ہے چلو

اختر کی نظم ستاروں کی صدا، بڑا پھیلاؤ رکھتی ہے۔ اُس کی ہیئت خوبصورت ہے اور مواد بھی دل کو متاثر کرنے والا ہے۔ بغیر کسی شبہ کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ستاروں کی صدا ایک مخترع ذہن کا کارنامہ ہے۔ یہ نظم ایسی ہے کہ جی چاہتا تھا کہ پوری کی پوری نقل کردی جائے لیکن جگہ کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

نظم کا کینوس بہت وسیع ہے۔ نظم کا مرکزی خیال انسان اور اس کے مقدر کے متعلق ہے جو چاند اور تاروں کے زیر بحث ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد، زحل۔ پانچوں تارے اپنے اثرات کو اہمیت دیتے ہیں اور انسان کے مقدر کو اپنے زیر اثر بتاتے ہیں۔ لیکن چاند جو زمین سے قریب تر سیارہ ہے۔ اور جو انسان کی عظمت کا معترف ہے اُن تمام تاروں کو الزام دیتا ہے کہ انہوں نے صدیوں تک انسان کو گمراہ کیا ہے اور توہمات پھیلا کر انسانی زندگی کو ناآسودہ بنایا ہے۔ آخر کار چاند اُنکی منفی دلیلوں کو رد کرتا ہے اور جوشیلے انداز میں انسان اور انسانی سوسائٹی کی انقلابی تبدیلی کے بارے میں بتاتا ہے جو ایک نئے تارے کے زیر اثر جسے کمیونزم کا سُرخ ستارہ کہا جاتا ہے آگے بڑھ رہی ہے وہ سُرخ ستارہ جو علامت ہے نئی تہذیب کا۔ ایسی نئی تہذیب کا۔ جہاں جور و جبر، استحصال اور مصائب کا نام نہ ہو۔ وہ ستارہ جس کے سائے تلے عوام نئے اقدار اور نئی زندگی کے لئے جدوجہد کررہے ہیں۔ سوویت یونین میں، چین میں، ویت نام میں، کوریا میں، کیوبا میں اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مختلف حصّوں میں، وہ لڑائی جو کروڑوں محنت کش کسان، ہنرمند اور دانشور لڑ رہے ہیں۔ چاند یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے ایک یقینی علامت سمجھتا ہے اُس عظیم الشان مستقبل کی جو انسانوں کو نہ صرف اس زمین کا بلکہ ساری کائنات کا مالک بناتی ہے۔ نظم ختم ہوتی ہے جہاں ستارے مادرِ گیتی کو سلام کرتے ہیں۔ ع

گونجی ستاروں کی صدا ⁘ کل ماہ پاروں کی صدا
گلگوں نظارے کو سلام ⁘ رہبر ستارے کو سلام
اس سُرخ پرچم کو سلام ⁘ اِس سُرخ عالم کو سلام
اے آدمِ نو زندہ باد
تابندہ و پائندہ باد

غزل جو اردو ادب کا ایک پرانا اور دلکش فارم ہے جو آج بھی ذاتی رنج و محن، ناکامیوں، محرومیوں اور آہ و فغاں کا اظہار کرتی ہے — اسے بھی جاں نثار اختر نے ایک نیا روپ دیا ہے۔ ایک معنی خیز حقیقت اور فلسفیانہ

فائدہ اُٹھایا، وہاں جاں نثار اختر خاموش تماشائی بنے رہے دوسرے ان کی کوتاہ دستی نے کبھی اُن میں یہ جسارت نہ پیدا ہونے دی، کہ مینائے شہرت کو بڑھ کر اُٹھا لیتے ویسے بھی دور جدید میں فن کی پرکھ فن سے نہیں شاعر کی شخصیت سے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گروپ بندی کا سب سے بڑا شکار جاں نثار اختر کی شخصیت بنی۔

"خاک دل"، جاں نثار اختر کے شعری سرمایہ کا حسین اور قابل قدر انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ شاعر کے فکر و فن نے جو نشیب و فراز دیکھے، اس کی زندگی میں جو زیر و بم آئے، اس کی شخصیت جن انقلاب و حوادث سے دوچار ہوئی اس کی شاعرانہ زندگی میں جو موڑ آئے "خاک دل" میں اُس داستان کی ابتداء، ارتقاء، کلائمکس اور انتہا کے نمایاں نقوش ملتے ہیں۔ اُن کے شعری سرمایہ کی داستان "صبح بنارس" سے شروع ہوتی ہے "خاک دل"، اُن کی منزل نہیں پڑاؤ ہے جہاں سے وہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھتے ہیں اور آخر کار "گھر آنگن" سے گزرتے ہوئے آخری ملاقات تک پہنچ جاتے ہیں۔

"گرلس کالج کی لاری" اور "بنارس کا سفر" اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں جب زندگی سرشار اور شادکام تھی۔ جوانی کے دن تھے۔ عشق کی ابتدا تھی، جوش تھا، ولولہ تھا، یہ وہ دور تھا جب زہرہ جبینوں بھلی، عذرا اور ناہید کے ذکر سے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی اور شاعر تصور کی آنکھ سے لاری کے اندر کبھی رخِ محبوب کے جمالِ جہاں سوز تک پہونچ جاتا تھا۔ دونوں نظمیں "پری وش"، "کا ذکر" اور "پھر بیاں اپنا"، کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

لیکن شاعر زیادہ دلنواز تک کوچہ جاناں کا طواف نہ کر سکا۔ بہت جلد وہ اس صحرا نوردی سے بیزار ہو گیا اور وہ بہت جلد ہی سب کچھ بھول جانے کا متمنّی ہو گیا۔ ایسے میں وہ بیزاری جیسی حسین نظم کی تخلیق کرتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

دل تو دل ہستی مٹا بیٹھا ہوں میں
گھر تو گھر دنیا لٹا بیٹھا ہوں میں
اب تو اُن کو بھی بھلا بیٹھا ہوں میں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

شاید جاں نثار اختر کی اس بیزاری سے متاثر ہو کر مجاز نے اپنی بے مثال نظم "آوارہ" کہی ہو۔ شاعر کی یہ بیزاری اُسے چین نہیں لینے دیتی اور وہ ایک عزم کرتا ہے ؎

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا
جب مرے اشک ترے پیار کے قابل ہی نہیں
جب مرا پیار ترے پیار کے قابل ہی نہیں
میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا۔

اور وہ واقعی اپنی شریکِ حیات، اپنی محبوبہ سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ اُس کی شریکِ زندگی اُس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ تارِ حیات جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ اُس کے لئے دنیا تاریک ہو جاتی ہے لیکن اُس کا عزم اُسے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ یہاں اُس کا لب و لہجہ اونچا ہو جاتا ہے۔ اُس کا فن نکھر اُٹھتا ہے۔ اور وہ "خاکِ دل" جیسی حسین نظم لکھتا ہے۔ اپنی محبوبہ دلنواز کی صدا "خاموش آواز" میں سنتا ہے۔ وہ "استالین" کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ تینوں نظمیں شخصی مراثی ہیں جہاں جاں نثار اختر کی شخصیت، اُن کا لب و لہجہ، اُن کی انفرادیت اور اُن کا آہنگ پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ سردار جعفری "خاکِ دل" میں نظم "استالین" کی شمولیت پر معترض ہیں حالانکہ فنی اعتبار سے وہ نظم انہیں بھی پسند ہے۔ اُن کے جواب میں

اے۔ آر۔ کاردار

نظریہ سے نظر تک

جاں نثار اختر بنیادی طور پر فن کار ہیں۔ انہیں شعر و سخن کا شوق ورثے میں ملا، جسے اُن کی ہم دم و ہمساز شریکِ حیات صفیہ نے اپنی رفاقت سے جلا بخشی۔ جس وقت جاں نثار اختر افقِ شاعری پر طلوع ہوئے اُس وقت اقبال جہانِ نو اور مردِ مومن کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جوشؔ شاعری کے ذریعے انقلاب لانے کی فکر میں تھے۔ چکبست ہندِ قدیم کی قصیدہ گوئی کو حاصلِ حیات سمجھ رہے تھے۔ حفیظ شاہنامے کے ذریعہ قوم میں بیداری کی روح پھونک رہے تھے، اور اختر شیرانی زلیخائے رومانیت کے یوسف بنے ہوئے تھے۔

ایک طرف کلاسیکی شاعری تھی تو دوسری طرف رومانیت۔ کلاسیکیت اور رومانیت کے حسین امتزاج کی زادِ راہ لے کر جاں نثار اختر میدانِ شاعری میں عازمِ سفر ہوئے پہلی مسافت پر ترقی پسندوں کا ایک قافلہ ملا جس نے انہیں اپنے ہمراہ چلنے کی دعوت دی اور انہوں نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی کیونکہ وہ خود بھی ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کے حامی تھے اور شاعری کے لیے کلاسیکیت، رومانیت اور حقیقت نگاری کے امتزاج کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جاں نثار اختر بھی اس قافلے کے ساتھ چل پڑے۔ مگر اُن کی آواز کا لب و لہجہ قافلہ والوں کے آہنگ میں اُبھر نہ سکا۔ اور بہت جلد انہیں یہ احساس ہوگیا کہ میں اپنی منزل سے بھٹک گیا ہوں۔ لیکن وقت نے کس کا ساتھ دیا ہے؟ پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن کی شریکِ حیات بھی سفر کی صعوبتوں سے تنگ آکر دم توڑ بیٹھی ہے۔ شاعر کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھے، اور وہ تھک کر راہ میں بیٹھ گیا۔ جب ذرا راحت ملی تو جمالیاتی حس نے احساس دلایا کہ تمہاری منزل کہاں ہے؟

جاں نثار اختر کی شاعری نظریہ سے نظر تک کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکیت، رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج، مشرق پرستی اور مغرب پسندی کا سنگم عاشقانہ اور نظریاتی شاعری کا گلدستہ ہے جس میں لطافت بھی ہے اور حرارت بھی۔ اس حسین امتزاج نے اُن کی شاعری کو ماہِ چہار دہم بنا دیا ہے، اگر ایک طرف وہ اشتراکیت کے حامی، انسانیت کے پجاری، جہانِ نو کے متمنی، انقلابِ نو کے طالب زمانے سے بیزار، طبقاتی کش مکش سے پریشان، فرقہ واریت سے متنفر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف "گھر آنگن" کی رباعیوں، "گرلس کالج کی لاری"، "بنارس کا سفر"، اور "آج کی رات" وغیرہ میں رومانیت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ اُنہیں اگر مجازؔ کی طرح "انقلابی ڈھنڈورچی" کے بجائے "انقلاب کا مطرب" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اُن کی نظریاتی شاعری میں گھن گرج، نعرہ بازی، پیغمبرانہ خود اعتمادی اور پروپیگنڈے کے بجائے ایک خاموش احتجاج ملتا ہے اس لئے اُن کا لب و لہجہ ابھرنے نہیں پاتا اور یہی وجہ ہے کہ جہاں دوسرے ترقی پسند شعراء نے اس "گروپ بندی" سے خاطر خواہ

فنی نقطہ نگاہ سے اس نظم کا شمار بھی جاں نثار اختر کی نمائندہ نظموں میں بلند مقام رکھتا ہے۔

نظم "آخری ملاقات" گویا شاعر کی داستان شعری کا کلائمکس ہے۔ یادوں کے دھندلے نقوش، تصورات کی پرچھائیں، ہریالی پر بنے پاؤں کے دو نشان، ڈالی پر بیٹھی تتلی، آنچل کی نازک شکنیں، کاجل کی نرم لکیریں، دل کی صورت کا لاکٹ، بکھرے بکھرے سپنے زندگی انہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے عبارت ہے۔ موت کی دہلیز پر کھڑا شاعر ان چیزوں اور ان یادوں کو اپنے سینے میں ہمیشہ کے لئے سمو لینا چاہتا ہے۔ بچپن کی حسین یادیں، جوانی کی رنگین داستانیں اور پیری کے تجربات سے نظم کے تانے بانے بُنے جاتے ہیں۔ نظم بتدریج ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اختتام پر پہنچتی ہے۔ نظم ابتدا سے انتہا تک اُن حسین یادوں کی ایک خوب صورت مالا ہے جس کے ہر موتی میں شاعر کے خلوص اور فکر و نظر کی آب و تاب نظر آتی ہے فنی اور فکری اعتبار سے جاں نثار اختر کی یہ نظم اُن کی بہترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

"آخری لمحہ"، ایک باپ کی بیٹی کے لئے وصیت ہے جو نظم کے حسین پیکر میں ڈھل کر جاوداں بن گئی ہے۔ شاعر اپنے تجربات و حوادث کا نچوڑ اپنی پیاری بیٹی کو وصیت کے روپ میں دے دینا چاہتا ہے۔ وہ حوادث دوراں سے، سماج کے مکرو فریب، طبقاتی کش مکش کے زہر ہلاہل سے، دنیا کے جور و ستم سے، دولت کی نامساوی تقسیم سے اور اپنے جہد مسلسل کی داستان سے بیٹی کو روشناس کراتا ہے۔ وہ دنیا پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ماضی کو کریدتا ہے۔ نظم کا ایک بند انتہائی حسین فن پارہ ہے بقول سردار جعفری "جاں نثار اختر کی شاعری کا پرچم"، کہیں تو لے جانا ہو گا طوالت کے خوف سے چند مصرعوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ع

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شر کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دہشت دلا رہی ہیں چٹانیں تو کیا ہوا
پتھر میں جو صنم ہے وہ کتنا حسین ہے
دربند ہو چہ صحن گلستاں کا غم نہیں
خوشبو جو لے اڑا ہے وہ جھونکا حسین ہے

ملک میں بڑھتا ہوا انتشار، پھیلی ہوئی بدامنی، فرقہ واریت کا ننگا ناچ، انسانیت کا قتل، غریبوں کا استحصال، مفلسی و ناداری کے اثرات شاعر پر منفی نہیں پڑتے بلکہ وہ مثبت انداز میں سوچتا ہے۔ وہ ملک میں "اتحاد" اور سالمیت چاہتا ہے۔ وہ سیکولر اور جمہوری روایات و اقدار کو اُبھارنا چاہتا ہے وہ تہذیب کے دو دھاروں کو یکجا کرنے کا متمنی ہے۔ یہاں اُس کا فن کچھ اور نکھر اٹھتا ہے اور وہ اہل وطن کو محبت و اخوت کا درس دیتا ہے۔ "اتحاد" اور اسی قبیل کی دوسری نظموں میں جاں نثار اختر نے ایک اچھوتا انداز بیان اختیار کیا ہے لیکن لب و لہجہ کا دھیما پن یہاں بھی برقرار رہتا ہے۔

بھی کہا جاسکتا ہے کہ انتخاب نام ہے ہر دور کی نمائندہ تخلیقات کا۔ آج اگر جوش مذہب سے بیگانہ ہیں، وہ مذہب سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں تو کیا اُن کے شعری سرمایہ سے وہ تمام اشعار نکال دیئے جائیں جو انہوں نے حیدر آباد میں نعت اور منقبت کی شکل میں کہے تھے۔ شاعر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے ہر دور کی نمائندہ نظمیں اور غزلیں انتخاب میں شامل کی جائیں۔ ویسے بھی "استالین" اختر کی نظموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

"خاک دل" میں شاعر اپنی شریک سفر کی موت پر آنسو بہاتا ہے، اُسے سپرد خاک کرتا ہے اُس کی دنیا تیرہ و تار ہو جاتی ہے لیکن غم محبوب کی گہرائی میں ڈوبنے کے باوجود بھی اُسے احساس رہتا ہے کہ زندگی اُسے آواز دے رہی ہے جہد مسلسل اُسے پکار رہا ہے اور وہ محبوبہ سے معذرت خواہ ہو کر ان الفاظ میں رخصت ہوتا ہے ؎

پھر بھی اس عرصہ گہ جہد مسلسل سے مجھے
کوئی آواز یہ آواز دیئے جاتا ہے
آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غم دوراں کا اٹھانا ہوگا

زندگی دیکھ مجھے حکم سفر دیتی ہے
اک دلِ شعلہ بجاں ساتھ لئے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزم جواں بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لئے جاتا ہوں

شاعر اپنے پیار کے مدفن کو پیچھے چھوڑ کر غم دوراں کے سفر میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اُس کا پیار امر ہے اُس کی محبت لافانی ہے۔ گو اُس کے اور اس کی محبوبہ کے درمیان موت کی خلیج حائل ہو چکی ہے لیکن موت کے بے رحم ہاتھ بھی جذبۂ محبت کو فنا نہ کر سکے اگرچہ جسمانی طور سے وہ دونوں جُدا ہو گئے ہیں۔ لیکن روحانی رابطہ اب بھی قائم ہے۔ "خاموش آواز" میں اُس کی محبت گورِ غریباں سے اُسے پکارتی ہے شہر خموشاں کی ویرانی سے اُس کی محبوبہ کی آواز آتی ہے۔ یہاں شاعر فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ محبوبہ کا بعد از مرگ پکارنا اپنے محبوب کا انتظار کرنا، اس سے شکایات کرنا، اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا اُسے ستانا غرض اس نظم میں جاں نثار اختر کی محبوبہ موت کے اُس پار سے اپنے محبوب کو پکارتی ہے شخصی مراثی میں یہ انداز نیا، یہ اسلوب اچھوتا اور یہ ڈگر نئی ہے جسے سب سے پہلے جاں نثار اختر کے قدموں نے چھوا ہے۔ اس نظم کو مراثی میں ایک نیا تجربہ، ایک نیا اُفق کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

"استالین" شاعر کی زندگی کے اُس موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب وہ نظریاتی شاعری کا حامی اور موضوعاتی شاعری کا علمبردار تھا۔ نظم میں شاعر "استالین" کی موت پر آنسو بہانے کے بجائے ستاروں سے آگے جہانِ نو کی تلاش میں نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ ایک جہانِ نو کی تعمیر چاہتا ہے وہ ظلمت شب کی سیاہی کو تار تار کر دینا چاہتا ہے۔ اُس کی منزل استالین کے تصور سے بھی پرے اُفق کے اُس پار نظر آتی ہے۔ جبھی وہ ان الفاظ میں اس طرف اشارہ کرتا ہے ع

ظلمتِ آخر شب بھی نہ رہے گی باقی
اور دو چار قدم مشعل جاں لے کے چلو

کیا یونہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

مزا ملا ہے کبھی خار کی کہانی میں
کبھی گلوں کی حکایت بھی بار گزری ہے

جاں نثار اختر کی غزلیات میں ولی کی سادگی میر کا سوز آتش کی مرصع سازی، نظیر کا کھلنڈراپن، جوش کا زمزمہ اور پُرگوئی ملتی ہے جس نے اُن کی غزلیات کو شرابِ دو آتشہ بنا دیا ہے۔

اصنافِ شعری میں رباعی کا فن مشکل ترین فن ہے۔ بہت کم شعرا اس وادیٔ پُرخار سے سلامت گزرے ہیں ورنہ بیشتر نے وادی کے خاروں سے اپنے فن کو لہولہان کیا ہے۔ جاں نثار اختر نے اس وادی کا نہ صرف سلامت روی سے طے کیا ہے۔ بلکہ رباعی کے فن کو ایک نیا افق بھی دیا ہے۔

جاں نثار اختر کی رباعیوں کا خاص موضوع محبوبہ ہے ایک ایسی محبوبہ جو بیوی کے روپ میں "گھر آنگن" میں اُتر آئی ہے۔ جو شاعر کی شریکِ زندگی ہے جس شاعر کی ایک ایک ادا سے پیار ہے جو شاعر کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ شاعر اُس کے حسن و جمال کو گھر کی چہار دیواری میں دیکھتا ہے۔ جاں نثار اختر نے اس مشکل موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ اختر کی محبوبہ گھر کی بیوی ایک خدمت شعار عورت ہے جسے کام کی لگن ہے اور جس میں خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ...."گھر آنگن" میں جاں نثار اختر نے رباعی کے میدان میں ایک نیا تجربہ کیا ہے ایک ایسا تجربہ جو اچھوتا نیا اور بہت ہی کامیاب ہے۔ جس طرح "خاموش آواز" میں محبوبہ شاعر کو پکارتی ہے اسی طرح تقریباً آدھی رباعیوں میں محبوبہ کی طرف سے اظہارِ عشق ہوتا ہے۔ یہاں عاشق محبوب بن جاتا ہے اور محبوبہ عاشق بن جاتی ہے جو یقیناً اردو شاعری میں ایک نئی منزل کی طرف پہلا قدم ہے....

انتظار کے لمحات کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں؟ یہ تو وہی جانے جس نے کبھی انتظار کیا ہو؟ انتظار کی اس کیفیت کو جاں نثار اختر نے کس حسین انداز سے پیش کیا ہے۔

اُف یہ امید و بیم کا عالم
کون سے دن منڈھے چڑھے گی بیل
ہائے یہ انتظار کے لمحے !
جیسے سگنل پہ رک گئی ریل

جہاں تک جاں نثار اختر کی لفظیاتِ شعری کا تعلق ہے۔ انہوں نے اپنی لفظیات شعری خود بنائی ہے۔ لکھنؤ کی غزل کا لوچ، اور لچک کے ساتھ، جدیدیت کی حرارت نے جاں نثار اختر کی لفظیات شعری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اگر ایک طرف انہوں نے کلاسیکی تراکیب کو اپنی لفظیاتِ شعری میں جگہ دی ہے تو دوسری طرف گلی بازار رسائل اور اخبار کے روزمرہ کو بھی اپنی لفظیات شعری میں خوب ڈھنگ سے سمویا ہے ساتھ ہی ہندی کی بہت سی تراکیب اور الفاظ استعمال کر کے شاعری میں غنائیت اور ترنم پیدا کیا ہے۔ لیکن جاں نثار اختر جس شہرت اور جس مقام کے مستحق تھے وہ انہیں ابھی نہیں ملا اس کا فیصلہ تو وقت کی عدالت میں ہوگا۔ اُن کی منتخب نظمیں چند شخصی مراثی اور متعدد غزلوں کے پچاسوں اشعار لطیف ایسے ہی نقادوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہو سکتے ہیں جو اپنی تنقیدی نگاہ کی بے وقعتی پہلے تسلیم کر چکا ہے۔

وحدت کی اسی چنگاری سے دل موم ہوا ہے پتھر کا
اجمیر کی جامع مسجد میں خود عکس ہے جینی مندر کا

وہ وطن کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں بلکہ اُسے پورا یقین ہے کہ ایک دن وطن سے رنگ و نسل کے یہ تمام امتیازات مٹ جائیں گے اور "مانوتا" کی بنیادوں پر وحدت کی نئی تعمیر کی جائے گی ؎

اے ارضِ وطن مغموم نہ ہو پھر پیار کے چشمے پھوٹیں گے
یہ نسل و نسب کے پیمانے، یہ ذات کے درپن ٹوٹیں گے

تعمیر نئی وحدت ہوگی مانوتا کی بنیادوں پر !
اے ارضِ وطن وشواس تو کر اک بار ہمارے وعدوں پر
اس وحدت اس یک جہتی کی تعمیر کا دن ہم لائیں گے
صدیوں کے سنہرے خوابوں کی تعبیر کا دن ہم لائیں گے

شاعر کے افسانوں کے عنوان "عنوان میرے افسانوں کے" بھی اپنے اندر خاطر خواہ جاذبیت رکھتے ہیں۔ عنوان وہی نظریاتی اور موضوعاتی ہیں لیکن انداز جداگانہ ہے شراب وہی ہے لیکن پیمانے بدل گئے ہیں۔

"تنہائی" کا احساس دورِ جدید کے ہر شاعر کے یہاں بہت شدت سے ملتا ہے۔ تنہائی کا احساس اور اس کا اظہار ہر شاعر نے کیا ہے لیکن جس ڈھنگ سے اس موضوع کو جاں نثار اختر نے نظم کیا ہے یہ انہیں کا خاصہ ہے ؎

موت جس طرح مجھ سے زندگی کا بدلہ لے
میں بہت اکیلا ہوں کوئی مجھ کو اپنا لے

"آج کی رات" شاعر کی داستانِ شعری کا خاتمہ ہے جہاں شاعر فن کی معراج پالیتا ہے جہاں اُسے منزلِ مقصود مل جاتی ہے۔ یہاں اُس کے سامنے نہ نظریاتی شاعری ہے، نہ رومانیت کی تحریک ہے، نہ ترقی پسندی کی چھاپ ہے، نہ کلاسکیت کا پرتو ہے، بلکہ جذبۂ دل ہے، خلوصِ فن ہے اور خونِ جگر ہے جس کے سہارے شاعر نے اپنے جذبات اپنے احساسات کو نظم کے حسین پیکر میں ڈھال کر بارگاہ محبوب میں پیش کیا ہے۔

جاں نثار اختر کی غزلیات قدیم اور جدید کا مرکب ہیں۔ اس میں کلاسکیت کا لوچ بھی ہے اور دورِ جدید کی حرارت بھی ہے اور تاثر بھی۔ ترنم بھی ہے اور تاثر بھی ہے۔ حُسن پرستی بھی ہے اور رومانی غنائیت بھی —— کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی جذبِ دل بھی اور خلوصِ فن بھی۔ جدید اور قدیم کا حسین امتزاج اُن کی غزلیات میں جھلکتا ہے ؎

وہی محفل وہی رونقِ محفل لیکن
کتنے بدلے ہوئے آداب نظر آتے ہیں

عشق میں کیا کیا سود و زیاں ہے ہم کو کیا سمجھاتے ہو
ہم نے ساری عمر ہی یارو دل کا کاروبار کیا

اختر کی شاعرانہ شخصیت کی نشوونما کا زمانہ جدید رجحانات کا زمانہ تھا۔ اس دور کے تمام قرائن نظم کی موافقت میں تھے۔ فکر و نظر کے تانے بانے جس پس منظر سے تیار ہو رہے تھے۔ اس میں علی گڑھ کی تعلیم اور بیسویں صدی کی ابھرتی ہوئی دنیا شامل تھی۔ ساتھیوں میں مجاز۔ اختر حسین رائے پوری۔ سبط حسن۔ عصمت اور حیات اللہ انصاری جیسے ہونہار اور ذہین ادیب اور شاعر تھے۔ یہ وہ دور تھا جہاں ایک طرف آزادی کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ تو دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں اشتراکی تحریکیں اپنا مقام بنا رہی تھیں اور ادبی دنیا میں جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے علمبردار ترقی پسند ادیب ہی تھے۔ یہ شاعر بنیادی طور سے نظم نگار شاعر تھے۔ ان کی شاعری ارادے۔ ہیجان اور توانائی کی شاعری تھی۔ جو زراعتی زندگی سے نکل کر صنعتی میدان میں قدم رکھ رہی تھی۔ یہ زمانہ ملوکیت پسندی۔ استعماریت اور طبقہ واری نظام کے خلاف نفرت کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کی جہالت۔ غلامی اور غربت کے پیش نظر ایسا ہونا۔ ایک فطری بات تھی۔ در اصل ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء کا زمانہ ایک عالمگیر بے چینی کا دور تھا۔ ایک جنگ ختم ہوئی تھی اور دوسری کی تیاری ہو رہی تھی۔ دنیا کا مزدور طبقہ دھیرے دھیرے قوت پکڑ رہا تھا۔ اکتوبر انقلاب کے پیدا کردہ نتائج ایک عوامی اور سماجی انقلاب کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ان تمام حالات نے ان ادیبوں اور شاعروں میں ایک باغیانہ آن بان پیدا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اقبال اور جوش کی شاعری ہندوستان میں ایک نئی آواز اور ایک نئے آہنگ کے ساتھ ادبی راہیں وا کر رہی تھی۔ انہوں نے پوری نسل کو متاثر کیا اور علی گڑھ سے نکلے ہوئے ان جوشیلے نوجوان شعراء اور ادیبوں کا ان سے متاثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ ادھر ہمارے ملک میں غزل اپنے وقت کی انحطاط پذیری سے اپنی ندرت اور دلکشی کھو بیٹھی تھی۔ اس میں شکست خوردگی اور فرسودگی آ گئی تھی اور اس کے فارم میں جو ٹھہراؤ آ گیا تھا وہ نئے خیالات اور ان کے ارتقاء کے لئے موزوں نہیں تھا اس کے علاوہ مغربی شاعری کے تجربے ان نوجوان ادیبوں کے سامنے موجود تھے۔ اور یہ سب لوگ ہیئت کی تبدیلی کو ضروری خیال کرتے تھے خصوصاً اس لئے بھی کہ اب خود زندگی اپنی تمام پیچیدگیوں اور ژولیدگیوں کے ساتھ موضوع سخن بنتی جا رہی تھی۔ اور ہمارے یہاں تو تصور ہی اردو کی غزل کی جان سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ نفس تصور کے پھیلاؤ کے لئے مغربی شاعری کے انداز کی بیانیہ سادگی کی ضرورت تھی۔

اختر کی شاعری کی بنیاد اسی سادگی پر قائم ہے۔ اس کی شاعری میں مسائل حیات کی تشریح کے لئے انداز بیان کی سادگی بڑی انفرادیت رکھتی ہے اس کی شاعری کی آواز ایک سنجیدہ شخص کی آواز ہے، اختر تصورات اور نظریات پر بڑی آہستگی سے گفتگو کرتا ہے۔ لیکن اس کا اعتماد ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اختر کی یہ سنجیدگی اور سادگی اس کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں بڑے ہی رچے ہوئے انداز میں ملتی ہے۔ اختر کی مشہور غزل "دیر ہوئی" اس کی اچھی مثال ہے؎

خامشی بزم کا دستور ہوئی جاتی ہے ⁂ پھر سے لب کھول کہ ہنگامہ اٹھے دیر ہوئی
اور دو چار مراحل سے گذرنا ہے تو کیا ⁂ اپنی منزل کی طرف ہم کو بڑھے دیر ہوئی
ساقیا اب تو نئے دور کا وقت آ پہنچا ⁂ جام گلرنگ اٹھا رات ڈھلے دیر ہوئی

اختر کی انقلابی نظموں میں نہ مجاز کی رومانیت ہے اور نہ ہی کسی گل پیرہن کے آنچل کا سہارا تلاش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے یہاں انقلاب اور رومان ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں نہیں ہیں۔ اسی طرح انقلاب کی باتیں کرتے وقت وہ چیختا چلاتا نہیں۔ نہ ہی مارنے والے نعرے بلند کرتا ہے۔ وہ تو نیند کے متوالوں کو صرف ہلکے ہلکے ٹھوکے

حفظ الکبیر قریشی

محبت اور امن کا شاعر

جاں نثار اختر فطرۃً متین، خاموش، اور سنجیدہ طبیعت کا شاعر ہے اپنے رکھ رکھاؤ اور قرینے ہی سے وہ شاعر نظر آتا ہے۔ اس کے انداز گفتگو سے تو اس پر فلسفی کا دھوکا ہونے لگتا ہے لیکن بہت جلد ہی اس کی باتیں شاعرانہ انداز اختیار کر لیتی ہیں اس کے علاوہ بھی چہرے مہرے اور چال ڈھال سے وہ شاعر ہی نظر آتا ہے۔ دراصل اس کے ظاہر اور باطن دونوں پر شعریت چھائی رہتی ہے۔ اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ دور خلا میں سوچتی ہوئی ادھ کھلی آنکھیں اور بڑے بڑے پریشان بال جن پر اکثر اس کے ہاتھ اُٹھتے رہتے ہیں۔ اور جنھیں ان کی انگلیاں سنوارنے کی فکر میں ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں کبھی شرمندہ پذیر شانہ نہیں دیکھا گیا۔ اختر ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں درویشوں کی سی روایتی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہی کم آمیزی، وہی دیر آشنائی اور ہلکی ہلکی ہنسی۔ اختر مجلسی زندگی میں بڑا ہی کم سخن ہے۔ لیکن شاعری میں اس کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ یا اس وقت جبکہ وہ مئے مرد افگن سے اچھی طرح حوصلہ آزما ہو چکا ہو ایسے وقت اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ باتوں میں بلا کا تسلسل آجاتا ہے خیالات بڑی روانی سے ہر موضوع پر خود بخود ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پہ جوش کی شبنمی شاعری پر وہ بڑے سعزدوں میں گفتگو کرتا ہے۔ اور اس الفاظ کے بادشاہ کو جی بھر کے داد بھی دیتا ہے۔ عام حالت میں وہ ایک سیدھا سادا سعادت مند قسم کا انسان بن جاتا ہے۔ اور عموماً اپنے ہی پیدا کردہ ماحول میں گرفتار بھی رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اپنے ارد گرد جو ماحول پیدا کر لیتی ہے اس میں اس کی طبیعت کا استغناء اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک فن کار کا متعلقات زندگی کے لئے جس تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے، بس اتنی ہی اختر سے ممکن ہے۔ اختر کو جب بھی اس سے اطمینان ہو جائے وہ اپنی ذہنی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ اپنے ارد گرد ایک خول بنا لیتا ہے اور پھر اپنی سوچ میں گم ہو جاتا ہے جانے وہ اپنے دل میں کیا راز کی باتیں کرتا ہے۔ کس کی سنتا ہے اور کس سے کہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہجوم میں تنہا ہی رہتا ہے اور اس طرح غیر شاعرانہ ماحول پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

اختر کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ مضطر خیرآبادی اختر کے والد تھے۔ اردو غزل کے اس استاد اور بزرگ شاعر کے ہاں زبان و بیان کی جو سنجیدگی اور حلاوت ملتی ہے اس کا اثر اختر کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ مضطر خیرآبادی کا ماحول غزل کا ماحول تھا۔ اور اختر نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ لیکن وہ غزل پر توجہ نہ دے سکا۔ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مضطر سے اختر تک زمانے نے جو ترقی کی۔ اور اس میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے پیش نظر اختر کے لئے نظم گوئی ناگزیر تھی۔

عصر کی متعدد تحریکوں اور نظریوں سے انہیں موضوع سخن کے طور پر منتخب کر لیتا ہے۔ جو اس کے نزدیک عالم انسانیت کے لئے ضروری اور مفید ہوتی ہیں۔ ترقی پسندوں پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی وفاداریاں اشتراکی ملکوں سے وابستہ ہوتی ہیں ان کی نظریں عموماً دوسرے ملکوں پر پڑتی ہیں اور انہیں اپنے ملک کی ترقی و تعمیر نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

اختر نے اپنے ملک کا ذکر بھی بڑے خلوص اور پیار سے کیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی پہ اس نے بھی بڑے سہانے خواب دیکھے تھے اور وہ اس خواب کی تعبیر ایک خوبصورت اور امن و مساوات پہ حامل سماج کی تعمیر دیکھنا چاہتا تھا۔ آزادی کے موقع پر اُس نے ہندوستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے ؂

اے مرے ہندوستاں میرے نگارِ جواں
تیرے لئے مدّتوں۔ میں نے اُٹھائے ستم
تیرے لئے مدّتوں۔ میں نے سہیں سختیاں
میرے نگارِ جواں
میں نے تجھے پالیا۔ تو نے مجھے پالیا
ہو نہیں سکتی کبھی۔ سعیِ وفا رائیگاں
میرے نگارِ جواں
آکہ سجاؤں تجھے۔ آکہ سنواروں تجھے
آکہ بناؤں تجھے۔ دلبرِ صد دلبراں
میرے نگارِ جواں

آزادی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اختر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے ؂

اے رودِ گنگا گیت گا لہرا کے چل موجِ چمن
ہاں اے ہمالہ جھوم جا رقصاں ہو لئے کوہ و دمن
ہاں اے اجنتا کے بتو نغمہ سرا ہو نغمہ زن
آزاد ہے۔ آزاد ہے۔ آزاد ہے ہندوستاں

ترنگا ہماری قومی آزادی اور اس کے وقار کی علامت ہے اختر نے اس ترنگے سے نہ صرف یہ کہ اپنی وفاداری کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کی شان میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؂

زردی سے تیری دو نالے لوٹ خدمت کی لگن
تیری سپیدی سے عیاں انسانیت پاکیزہ پن
سبزی سے تیری جلوہ گر ہمت جوانی بانکپن
اے پرچم سہ رنگ تو
اپنے وطن کی آبرو

دیتا ہے، اس کی آواز ایک دوست کی آواز ہوتی ہے۔ اس کے رویے سے مصلح یا واعظ کی فطرت کا اظہار نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ نہ ڈانٹتا ہے نہ ڈپٹتا ہے۔ وہ تو آپ کی بے حسی کی وجہ سے آپ سے کبھی نفرت نہیں کرتا۔ اس کے مزاج میں شدت کہیں راہ نہیں پاتی۔ اس کے لہجہ میں سپاٹ پن اور لجاجت کو کہیں دخل نہیں۔ لیکن اس کے لہجہ میں اس کا اپنا وقار ہے اس کی اپنی شان ہے "زندگی" اور "مراحل" ایسی ہی نظمیں ہیں جس میں اختر کا لہجہ اس کا اپنا ہے ؎

اِن دھواں دھار اندھیروں سے گزرنے کے لئے
خونِ دِل سے کوئی مشعل تو جلانی ہو گی
عشق کے رفتہ و سرگشتہ جنوں کو اے دوست
زندگانی کی ادا آج سکھانی ہو گی

اس لہجہ میں ہمیں ایسا عزم ملتا ہے۔ جو مستقبل کے لئے اُمید افزا ہے۔ ایک ایسا درد ہے جو خود مداوے کی تلاش کرتا ہے۔ ایک ایسی تمنا ہے جو خوش آئند ہے۔

اختر کی سیاسی اور انقلابی شاعری اس کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ خود اس کے لئے موزوں شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں جو سیاسی شعور ملتا ہے وہ سیاسی مفکر یا کارکن کا شعور نہیں ہے وہ تو ایک حساس اور انسان دوست دل کا شعور ہے۔ اس شعور میں جذبہ ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔ یہ جذبہ محض انسانیت دوستی کا جذبہ ہے اختر انقلاب کا خواہاں تو محض اس لئے ہے کہ انسانیت ایک بڑا طبقہ مٹھی بھر افراد کے سیاسی۔ سماجی اور معاشی استحصال سے بچا ہے اور زندگی کی راحتوں اور برکتوں سے عالمِ انسانیت یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔ اختر کی ان سیاسی نظموں میں جذبی ہیں جن میں کچھ نظریاتی عقائد ملتے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعر کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا ان نظموں کے متعلق اختر نے اپنے نقطۂ نظر کی خود وضاحت کی ہے کہ شاعر کے نزدیک جغرافیائی حدود کوئی اہمیت نہیں رکھتے یہ نظمیں اس عظیم الشان انسانی ترقیوں کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ جس نے عالمِ انسانیت کو نہ صرف یہ کہ سماجی آزادی کے جاندار تصور سے آشنا کرایا بلکہ عملی اعتبار سے ایک ایسا سماج بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔ جس کے خالق صدیوں کے پسماندہ عوام تھے۔ اس سماج کی تعمیر مزدوروں کے ہاتھوں ایک نئے انداز سے ہو رہی تھی محنت کشوں کو پہلی مرتبہ انسانی حقوق مل رہے تھے ساتھ ہی ساتھ ان نظریات و تصورات کو بڑے ہی حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ دنیا بھر کے تمام ذہین اور حساس ذہنوں نے اس کا استقبال کیا اور ویسے ہی سماج کی تعمیر کا جذبہ لے کر اس معیارِ زندگی کو اپنے سماج کے لئے ایک زندہ حقیقت بنا لینے کی خواہش ان میں بھی پیدا ہوئی چنانچہ اختر کا پیغام اسی طرف ایک اشارہ ہے ؎

ساتھیو حوصلۂ شوق کو مہمیز کرو
ہاں قدم تیز کرو تیز کرو تیز کرو
ارتقاءِ وقت کا فرمان سناتا ہے چلو
استالین ہمیں منزل پہ بلاتا ہے چلو

یہاں روس اور استالین محض علامتوں کے طور پر آئے ہیں۔ یہ نظمیں ہمیں دراصل عملی جدوجہد کے لئے تیار کرتی ہیں یہاں اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر ادیب مفکر نہیں ہوتا اس لئے عموماً وہ اپنے

اختر کی شاعرانہ شخصیت کی نشوونما کا زمانہ جدید رجحانات کا زمانہ تھا۔ اس دور کے تمام قرائن نظم کی موافقت میں تھے۔ فکر و نظر کے تانے بانے جس پس منظر سے تیار ہو رہے تھے۔ اس میں علی گڑھ کی تعلیم اور بیسویں صدی کی ابھرتی ہوئی دنیا شامل تھی۔ ساتھیوں میں مجاز۔ اختر حسین رائے پوری۔ سبط حسن۔ عصمت اور حیات اللہ انصاری جیسے ہونہار اور ذہین ادیب اور شاعر تھے۔ یہ وہ دور تھا جہاں ایک طرف آزادی کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ تو دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں اشتراکی تحریکیں اپنا مقام بنا رہی تھیں اور ادبی دنیا میں جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے علمبردار ترقی پسند ادیب ہی تھے۔ یہ شاعر بنیادی طور سے نظم نگار شاعر تھے۔ ان کی شاعری ارادے۔ ہیجان اور توانائی کی شاعری تھی۔ جو زراعتی زندگی سے نکل کر صنعتی میدان میں قدم رکھ رہی تھی۔ یہ زمانہ ملوکیت پسندی۔ استعماریت اور طبقہ واری نظام کے خلاف نفرت کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کی جہالت۔ غلامی اور غربت کے پیش نظر ایسا ہونا۔ ایک فطری بات تھی۔ در اصل ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء کا زمانہ ایک عالمگیر بے چینی کا دور تھا۔ ایک جنگ ختم ہوئی تھی اور دوسری کی تیاری ہو رہی تھی۔ دنیا کا مزدور طبقہ دھیرے دھیرے قوت پکڑ رہا تھا۔ اکتوبر انقلاب کے پیدا کردہ نتائج ایک عوامی اور سماجی انقلاب کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ان تمام حالات نے ان ادیبوں اور شاعروں میں ایک باغیانہ آن بان پیدا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اقبال اور جوش کی شاعری ہندوستان میں ایک نئی آواز اور ایک نئے آہنگ کے ساتھ ادبی راہیں وا کر رہی تھی۔ انہوں نے پوری نسل کو متاثر کیا اور علی گڑھ سے نکلے ہوئے ان جوشیلے نوجوان شعراء اور ادیبوں کا ان سے متاثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ ادھر ہمارے ملک میں غزل اپنے وقت کی انحطاط پذیری سے اپنی ندرت اور دلکشی کھو بیٹھی تھی۔ اس میں شکست خوردگی اور افسردگی آ گئی تھی اور اس کے فارم میں جو ٹھہراؤ آ گیا تھا وہ نئے خیالات اور ان کے ارتقا کے لئے موزوں نہیں تھا اس کے علاوہ مغربی شاعری کے تجربے ان نوجوان ادیبوں کے سامنے موجود تھے۔ اور یہ سب لوگ ہیئت کی تبدیلی کو ضروری خیال کرتے تھے خصوصاً اس لئے بھی کہ اب خود زندگی اپنی تمام پیچیدگیوں اور ژولیدگیوں کے ساتھ موضوع سخن بنتی جا رہی تھی۔ اور ہمارے یہاں تو تصور ہی اردو کی غزل کی جان سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ نفس تصور کے پھیلاؤ کے لئے مغربی شاعری کے انداز کی بیانیہ سادگی کی ضرورت تھی۔

اختر کی شاعری کی بنیاد اسی سادگی پر قائم ہے۔ اس کی شاعری میں مسائل حیات کی تشریح کے لئے انداز بیان کی سادگی بڑی انفرادیت رکھتی ہے اس کی شاعری کی آواز ایک سنجیدہ شخص کی آواز ہے، اختر تصورات اور نظریات پر بڑی آہستگی سے گفتگو کرتا ہے۔ لیکن اس کا اعتماد ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اختر کی یہ سنجیدگی اور سادگی اس کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں بڑے ہی رچے ہوئے انداز میں ملتی ہے۔ اختر کی مشہور غزل "دیر ہوئی" اس کی اچھی مثال ہے ؎

خامشی بزم کا دستور ہوئی جاتی ہے ؛؛ پھر سے لب کھول کہ ہنگامہ اٹھے دیر ہوئی
اور دو چار مراحل سے گذرنا ہے تو کیا ؛؛ اپنی منزل کی طرف ہم کو بڑھے دیر ہوئی
ساقیا اب تو نئے دور کا وقت آ پہنچا ؛؛ جام گلرنگ اٹھا رات ڈھلے دیر ہوئی

اختر کی انقلابی نظموں میں نہ مجاز کی رومانیت ہے اور نہ ہی کسی گل پیرہن کے آنچل کا سہارا تلاش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے یہاں انقلاب اور رومان ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں نہیں ہیں۔ اسی طرح انقلاب کی باتیں کرتے وقت وہ چیختا چلاتا نہیں۔ نہ ہی ہائے واے سے نعرے بلند کرتا ہے۔ وہ تو نیند کے متوالوں کو صرف ہلکے ہلکے ٹھوکے

حفظ الکبیر قریشی

محبت اور امن کا شاعر

جاں نثار اختر فطرۃً متین، خاموش، اور سنجیدہ طبیعت کا شاعر ہے اپنے رکھ رکھاؤ اور قرینے ہی سے وہ شاعر نظر آتا ہے۔ اس کے انداز گفتگو سے تو اس پر فلسفی کا دھوکا ہونے لگتا ہے لیکن بہت جلد ہی اس کی باتیں شاعرانہ انداز اختیار کر لیتی ہیں اس کے علاوہ بھی چہرے مہرے اور چال ڈھال سے وہ شاعر ہی نظر آتا ہے۔ دراصل اس کے ظاہر اور باطن دونوں پر شعریت چھائی رہتی ہے۔ اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ دور خلاء میں سوچتی ہوئی ادھ کھلی آنکھیں اور بڑے بڑے پریشان بال جن پر اکثر اس کے ہاتھ اُٹھتے رہتے ہیں۔ اور جنھیں ان کی انگلیاں سنوارنے کی فکر میں ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں کبھی شرمندہ پذیر شانہ نہیں دیکھا گیا۔ اختر ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں درویشوں کی سی روایتی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہی کم آمیزی، وہی دیر آشنائی اور ہلکی ہلکی ہنسی۔ اختر مجلسی زندگی میں بڑا ہی کم سخن ہے۔ لیکن شاعری میں اس کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ یا اس وقت جبکہ وہ مئے مرد افگن سے اچھی طرح حوصلہ آزما ہو چکا ہو ایسے وقت اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ باتوں میں بلا کا تسلسل آجاتا ہے خیالات بڑی روانی سے ہر موضوع پر خود بخود ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پہ جوش کی شبنمی شاعری پر وہ بڑے سعزوں میں گفتگو کرتا ہے۔ اور اس الفاظ کے بادشاہ کو جی بھر کے داد بھی دیتا ہے۔ عام حالت میں وہ ایک سیدھا سادا سعادت مند قسم کا انسان بن جاتا ہے۔ اور عموماً اپنے ہی پیدا کردہ ماحول میں گرفتار بھی رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اپنے اردگرد جو ماحول پیدا کر لیتی ہے اس میں اس کی طبیعت کا استغناء اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک فن کار کا متعلقات زندگی کے لئے جس تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے، بس اتنی ہی اختر سے ممکن ہے۔ اختر کو جب بھی اس سے اطمینان ہو جائے وہ اپنی ذہنی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ اپنے اردگرد ایک خول بنا لیتا ہے اور پھر اپنی سوچ میں گم ہو جاتا ہے جانے وہ اپنے دل میں کیا راز کی باتیں کرتا ہے۔ کس کی سنتا ہے اور کس سے کہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہجوم میں تنہا ہی رہتا ہے اور اس طرح غیر شاعرانہ ماحول پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

اختر کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ مضطر خیرآبادی اختر کے والد تھے۔ اردو غزل کے اس استاد اور پرگو شاعر کے ہاں زبان و بیان کی جو سنجیدگی اور حلاوت ملتی ہے اس کا اثر اختر کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ مضطر خیرآبادی کا ماحول غزل کا ماحول تھا۔ اور اختر نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ لیکن وہ غزل پر توجہ نہ دے سکا۔ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مضطر سے اختر تک زمانے نے جو ترقی کی۔ اور اس میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے پیش نظر اختر کے لئے نظم گوئی ناگزیر تھی۔

عصر کی متعدد تحریکوں اور نظریوں سے انہیں موضوع سخن کے طور پر منتخب کرلیا ہے۔ جو اس کے نزدیک عالم انسانیت کے لئے ضروری اور مفید ہوتی ہیں۔ ترقی پسندوں پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی وفاداریاں اشتراکی ملکوں سے وابستہ ہوتی ہیں ان کی نظریں عموماً دوسرے ملکوں پر پڑتی ہیں اور انہیں اپنے ملک کی ترقی و تعمیر نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

اختر نے اپنے ملک کا ذکر بھی بڑے خلوص اور پیار سے کیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی پر اس نے بھی بڑے سہانے خواب دیکھے تھے اور وہ اس خواب کی تعبیر ایک خوبصورت اور امن و مساوات پر حامل سماج کی تعمیر دیکھنا چاہتا تھا۔ آزادی کے موقع پر اُس نے ہندوستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

اے مرے ہندوستاں میرے نگارِ جواں
تیرے لئے مدّتوں۔ میں نے اُٹھائے ستم
تیرے لئے مدّتوں۔ میں نے سہیں سختیاں
میرے نگارِ جواں
میں نے تجھے پالیا۔ تو نے مجھے پالیا
ہو نہیں سکتی کبھی۔ سعیِ وفا رائیگاں
میرے نگارِ جواں
آکر سجاؤں تجھے۔ آکر سنواروں تجھے
آکر بناؤں تجھے۔ دلبر صد دلبراں
میرے نگارِ جواں

آزادی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اختر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے ؎

اے رودِ گنگا گیت گا لہرا کے چل موجِ چمن
ہاں اے ہمالہ جھوم جا رقصاں ہو لئے کوہ و دمن
ہاں اے اجنتا کے بتو نغمہ سرا ہو نغمہ زن
آزاد ہے۔ آزاد ہے۔ آزاد ہے ہندوستاں

ترنگا ہماری قومی آزادی اور اس کے وقار کی علامت ہے اختر نے اس ترنگے سے نہ صرف یہ کہ اپنی وفاداری کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کی شان میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

زردی سے تیری رو نما ہے لوث خدمت کی لگن
تیری سپیدی سے عیاں انسانیت پاکیزہ پن
سبزی سے تیری جلوہ گر ہمت جوانی بانکپن
اے پرچم سہ رنگ تو
اپنے وطن کی آبرو

دیتا ہے، اس کی آواز ایک دوست کی آواز ہوتی ہے۔ اس کے رویئے سے مصلح یا واعظ کی فطرت کا اظہار نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ نہ ڈانٹتا ہے نہ ڈپٹتا ہے۔ وہ تو آپ کی بے حسی کی وجہ سے آپ سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ اس کے مزاج میں شدت کہیں راہ نہیں پاتی۔ اس کے لہجہ میں سپاٹ پن کو کہیں دخل نہیں۔ لیکن اس کے لہجہ میں اس کا اپنا وقار ہے اُس کی اپنی شان ہے "زندگی"، اور "مراحل" ایسی ہی نظمیں ہیں جس میں اختر کا لہجہ اس کا اپنا ہے ؎

اِن دھواں دھار اندھیروں سے گزر نے کے لئے
خونِ دل سے کوئی مشعل تو جلانی ہو گی
عشق کے رفتہ و سرگشتہ جنوں کو اے دوست
زندگانی کی ادا آج سکھانی ہو گی

اس لہجہ میں ہمیں ایسا عزم ملتا ہے۔ جو مستقبل کے لئے اُمید افزا ہے۔ ایک ایسا درد ہے جو خود مداوئے غم تلاش کرتا ہے۔ ایک ایسی تمنا ہے جو خوش آئند ہے۔

اختر کی سیاسی اور انقلابی شاعری اس کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ خود اس کے لئے موزوں شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں جو سیاسی شعور ملتا ہے وہ سیاسی مفکر یا کارکن کا شعور نہیں ہے وہ تو ایک حساس اور انسان دوست دل کا شعور ہے۔ اس شعور میں جذبہ ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔ یہ جذبہ محض انسانیت دوستی کا جذبہ ہے اختر انقلاب کا خواہاں تو محض اس لئے ہے کہ انسانیت ایک بڑا طبقہ مٹھی بھر افراد کے سیاسی۔ سماجی اور معاشی استحصال سے بچا رہے اور زندگی کی راحتوں اور برکتوں سے عالم انسانیت یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔ اختر کے اِن سیاسی نظمیں جذبی ہیں جن میں کچھ نظریاتی عقائد ملتے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعر کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا ان نظموں کے متعلق اختر نے اپنے نقطۂ نظر کی خود وضاحت کی ہے کہ شاعر کے نزدیک جغرافیائی حدود کوئی اہمیت نہیں رکھتے یہ نظمیں اس عظیم الشان انسانی ترقیوں کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ جس نے عالم انسانیت کو نہ صرف یہ کہ سماجی آزادی کے جاندار تصور سے آشنا کرایا بلکہ عملی اعتبار سے ایک ایسا سماج بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔ جس کے خالق صدیوں کے پسماندہ عوام تھے۔ اس سماج کی تعمیر مزدوروں کے ہاتھوں ایک نئے انداز سے ہو رہی تھی محنت کشوں کو پہلی مرتبہ انسانی حقوق مل رہے تھے ساتھ ہی ساتھ ان نظریات و تصورات کو بڑے ہی حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ دنیا بھر کے تمام ذہین اور حساس ذہنوں نے اس کا استقبال کیا اور ویسے ہی سماج کی تعمیر کا جذبہ لے کر اس معیارِ زندگی کو اپنے سماج کے لئے ایک زندہ حقیقت بنا لینے کی خواہش ان میں بھی پیدا ہوئی چنانچہ اختر کا پیغام اسی طرف ایک اشارہ ہے ؎

ساتھیو حوصلۂ شوق کو مہمیز کرو
ہاں قدم تیز کرو تیز کرو تیز کرو
ارتقاءِ وقت کا فرمان سناتا ہے چلو
استالین ہمیں منزل پہ بلاتا ہے چلو

یہاں روس اور استالین محض علامتوں کے طور پر آئے ہیں۔ یہ نظمیں ہمیں در اصل عملی جدوجہد کے لئے تیار کرتی ہیں یہاں اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر ادیب مفکر نہیں ہوتا اس لئے عموماً وہ اپنے

یہ مقولہ اختر کی رومانی شاعری پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ تصوّر اور ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء ایسے ہی خوبصورت یادوں کا مترنم ارتعاش ہے جو الفاظ کا جامہ پہن کر اپنی رو پہلی جوت سے جگمگا رہا ہے اور امن اختر کا محبوب ہے، پسند ہے کہ امن ہی کی فضا میں محبت پروان چڑھ سکتی ہے۔ جنگ کی خوں آشام فضائیں اس کے لئے مناسب نہیں۔ جنگ در اصل انسانی عجز کی دلیل ہے۔ اور اس جہالت کا خمیازہ معصوم انسانوں کو اٹھانا پڑتا ہے، جنگ کی ستیزہ کاریاں جوان امنگوں کو بربریت سے بدل دیتی ہیں۔ امن کی تعریف میں اختر نے بہترین ترکیبیں وضع کی ہیں۔ اس کے نزدیک امن ظلِ کرم اور سایۂ عاطفت ہے۔ اس لئے امن کو نگارِ فضا۔ دلبرِ کائنات۔ ضمیرِ گلستاں اور سفیرِ بہار کے سے حسین نام دیئے ہیں۔ امن عوام کی آبرو بھی ہے۔ اور حسنِ تہذیب کا پاسباں بھی۔ اختر نے امن کی توجیہہ اور اس کی ضرورت پر بڑے ہی حسین اور خوبصورت انداز میں لکھا ہے ؎

ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے برگاؤں سے ؎
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں

چنانچہ وہ امن کا اس لئے خواہاں ہے تاکہ ملک کی ہر چیز سلامت رہے۔

سلامت رہیں اپنے دشت و دمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن ؎
رہے پاک گنگو تری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن
لٹاتی رہیں اپنے ملیوں کا مدھ
یہ صبحِ بنارس یہ شامِ اودھ
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج
رہیں مسکراتی حسیں وادیاں
رہیں شاد جنگل کی شہزادیاں
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں ؎
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
رہے لڑکیوں میں یہ گڑیوں کا کھیل
رہے چھک چھکاتی یہ بچوں کی ریل
سلامت رہے کاجلوں کی لکیر
سلامت رہیں نرم نظروں کے تیر

تو ہے ہمارا نام و ننگ
ہم تجھ کو کرتے ہیں سلام

لیکن آزادی کے فوراً بعد ہندوستان میں انسانیت کی جو ناگفتہ بہ حالت ہوئی اس نے ہر حساس دل کو بڑی طرح تکلیف پہنچائی ہے۔ ہر حساس دماغ عام انسان کی خون آشام ذہنیت سے لرزہ براندام ہو گیا اور جنھوں نے آزادی سے ایک نئے سویرے اور ایک نئے بہار کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ بُری طرح مایوس ہوئے۔ لیکن اختر بالکل مایوس نہیں ہوا اپنے تاریخی شعور اور اپنی رجائیت پسندی کی بنا پر اسے اپنے مستقبل پر یقین ہی رہا ہے

کچھ ہو، اُمید کی سینے میں جھلک آج بھی ہے
دل میں بجھتے ہوئے شعلے کی چمک آج بھی ہے
پردۂ ابر میں ہلکی سی دھنک آج بھی ہے
پھول کھلنے کی ہوا دُس میں مہک آج بھی ہے

سینے میں ہے اک تارک غم پیوستہ
تاریک ہے منزل کا ہر اک تنگ رستہ
بہتا ہے جو انساں کا لہو بہنے دو
ہر خوں کی بوند ہے شرار رستہ

سماجی استحصال اور اندھیر نگری نے اس کے خون کی ہر بوند کو ایک شرار جستہ بنا دیا۔ اور وہ اپنی قوت تعمیر کو ایسے خس و خاشاک کے آزمانے پر تیار ہو گیا۔ جو آندھیوں کی زد میں رہتا ہے۔ آندھیاں چلیں یا طوفان اٹھے۔ آشیانہ تو بہر حال بنانا ہی ہے۔ آزادی کے لئے عمل۔ ایثار اور قربانی درکار ہے۔ آزادی محض پروانہ آزادی حاصل کر لینے کا نام نہیں بلکہ وہ درحقیقت مادی وسائل کی ان تبدیلیوں کا نام ہے جہاں جمہوری قدریں عوامی سانچوں میں ڈھل کر امن و مساوات کو نظام حیات میں جاری و ساری رکھ سکیں۔ آزادی تو زندگی کی اجتماعی آزادی کا نام ہے اور اختر کسی ایسے ہی نظام زندگی کا خواہاں ہے۔

اختر بنیادی طور سے محبت کا شاعر ہے اور امن و محبت اس کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ اختر کی شخصیت رومان پرور ہے اور وہ اپنے رومانوں میں کامیاب بھی رہا ہے۔ اس کی شاعری میں ناہید اور انجم کے نام اکثر ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ نام فرضی ہوں۔ لیکن ان کی شخصیتیں اس عالم رنگ و بو کی تمام جلوہ سامانیاں لئے ہوئے ہیں۔ ان کی حسین یادوں سے شاعر کے ذہن میں حسن تخلیق کی کلیاں چٹکتی رہی ہیں ایسے حسین اور باطنی تجربے شعری جذبوں میں شدت اور تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اختر کی رومانی تخلیقات میں جو خلوص۔ درد۔ ترنم اور کیف ملتا ہے وہ اپنی یادوں کا مرہون منت ہے۔ ورڈسورتھ نے شاعری کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے۔ Poetry is thoughts recollected in tranquility.

عورت کی وفاشعاری اس کا سوز دروں۔ اس کی نسائی فطرت اور شوہر پرستی کا جذبہ مشرقی عورت کے روایتی کردار کو بڑی ہی خوبصورت انداز میں واضح کرتا ہے۔ نظم کے المناک پس منظر نے اس میں سوز و گداز کی ایسی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ جس سے کوئی دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فنی اعتبار سے بھی محاکات کی اتنی اچھی تصویر اور فطرت و انسان کے امتزاج کی اتنی دل آویزی اختر کے شاعرانہ کمال پر دلالت کرتی ہے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے ؎

تم بن سارے موسم بیتے۔ آئے جھونکے سرد ہوا کے
نرم گلابی جاڑے گذرے۔ مرے دل میں آگ لگا کے
چاند سے جب بھی بادل گذرا۔ دل سے گزرا عکس تمہارا
پھول جو چٹکے میں نے جانا۔ تم نے شاید مجھ کو پکارا

Imagery and Pathos کو اختر نے دل کی گہرائیوں میں سمیٹ کر پیش کیا ہے یہاں اس کا اپنا ذاتی غم عام انسانی غموں کا بڑا ہی سچا مرقع ہو گیا ہے۔ ہر ہر لفظ سے پیار ملن کا پیارا امڈتا ہے۔ ہجر و فراق کے طویل لمحوں کے بعد محبوب کا دوبارہ ملنا عورت کے پیار کو مغرور بنا دیتا ہے۔ اس کا اپنے محبوب کو خوش آمدید کہنا اس کے دلی جذبات کا کچھ ایسا پرخلوص مظاہرہ کرتا ہے کہ ایسے موقعوں پر قدرت کے تمام عناصر اس کے ہمنوا ہو جاتے ہیں ؎

جھل مل جھل مل کرنیں آئیں۔ مجھ کو چندن ہار پہنانے
جگ مگ جگ مگ تارے آئے۔ پھر سے میری مانگ سجانے

آئیں ہوائیں جھانجھ بجاتی۔ گیتوں میرا انگنا جاگا۔!
مورے ماتھے جھومر دمکا۔ میرے ہاتھوں کنگنا جاگا

جاگ اٹھا ہے سارا عالم۔ جاگ اٹھی ہے رات ملن کی
آؤ زمیں کی گود میں ساجن۔ سیج سجی ہے آج دلہن کی

اختر نے اپنے دل کی خستگی کو اتنے انوکھے اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ انسانی المناکیوں میں بھی رومانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی رومانیت جو ہمیں دور خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ جہاں بقول کرشن چندر کے جدائی کے آخری کربناک ثانیوں میں بھی وصال کا شبہ ہوتا ہے۔ جہاں غم پر بھی فتح حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ایک ایسی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی مردانگی کے سامنے کوئی مشکل نہیں رہ پاتی اور کوئی رکاوٹ۔ رکاوٹ نظر نہیں آتی۔

اختر کی شاعری کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے۔ تو ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ اس کے مزاج میں بڑی ہی سلاست اور نرمی ہے۔ شدت کو اس کے یہاں دخل ہی نہیں وہ محبت اور امن کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری اپنے موضوعات گھریلو زندگی سے اخذ کرتی ہے۔ اس کے انقلاب کی دعوت میں بھی ہمارے گھروں کی چہکتی بولتی فضا کا ہی پس منظر ہوتا ہے اور وہ انقلاب بھی محض اس لئے چاہتا ہے کہ گھریلو فضا کی زندگی

سدا از ندگانی غزل خواں رہے

زمانے میں غالب کا دیواں ہے

اختر کا قلم اس موضوع پہ اپنی پوری روانی سے چلتا ہے۔ وہ ہر چیز کا ذکر بڑے احترام اور خلوص سے کرتا ہے یہاں اس کے قلم میں وہ دلکشی اور خوبصورتی آجاتی ہے جو اس کے فن اور خلوص پر دلالت کرتی ہے۔ زندگی کا ہر پہلو جینے کا ہر ڈھنگ طرزِ معاشرت کی ہر ادا فنونِ لطیفہ کا ہر رنگ اور ہماری روزمرّہ کی گھریلو زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشی سے وہ اپنی فہرست مکمل کرتا ہے۔ اس بات سے ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں امن کی کیا اہمیت ہے اور جنگ کا روپ کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ اختر کی یہ نظمیں اپنے ترنم اور آہنگ سے بھرپور اثر چھوڑتی ہیں۔ رقص الفاظ ہمارے ذہن میں جو تخیل پیدا کرتا ہے۔ اس کا اثر کچھ ایسا ہی مرتسم ہوتا ہے جیسے ہم شفق کے حسین رنگوں کے امتزاج سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ یا موسیقی کے زیر و بم سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم ایک عجیب رومانی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں اور اپنے احساسات میں ایک نئی زندگی محسوس کرتے ہیں۔

جاں نثار علمی اور عملی اعتبار سے ایک ترقی پسند شاعر ہے۔ فیض نے شاعر کے لئے محض مشاہدہ کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لئے مجاہدہ بھی ضروری قرار دیا۔ اس کے نزدیک فن زندگی کا ایک جزو اور فنی جد و جہد اس جد و جہد کا ایک پہلو ہے اختر عملی جد و جہد میں حصّہ لے چکا ہے۔ اس جد و جہد کے لئے اسے گھر اور گھر کی آسائشوں کو خیر آباد کہنا پڑا ہے۔ ہجر و فراق کی تلخیاں سہنی پڑی ہیں اور آخر میں اس المیہ سے دوچار ہونا پڑا جس نے اختر سے بقول کرشن چندر "اس کے بازوؤں کی زینت۔ اس کی قوت۔ اور توانائی چھین لی"۔ صفیہ کی موت نے اردو ادب کو دو بڑی پیاری نظمیں دی ہیں۔ ان پر کرشن چندر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :" اس نظم پر تمہارے ذاتی داغ کی چلمن تو پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس چلمن کے پیچھے ایک پورا ہندوستانی گھر آباد ہے۔ مجھے اس نظم میں ایک ایسے سماج کی بنیاد نظر آتی ہے جو ہے نہیں۔ لیکن جیسے ہونا ہے۔ اس نظم میں انسان اور زندگی سے ایک ایسی بھرپور محبت پائی جاتی ہے کہ موت اپنے کامیاب ترین لمحوں میں بھی زندگی سے ہراساں نظر آتی ہے۔ اور جدائی کے آخری کربناک تانیوں میں بھی وصال کا شبہ ہوتا ہے۔"

کرشن چندر کا یہ تبصرہ "خاکِ دل" اور خاموش آواز سے متعلق ہے۔ ان نظموں میں اختر فن کی بلندیوں کو چھو گیا ہے اس کے لہجہ میں انسانی نرمی اور گھلاوٹ ہے اس کے دل گداختہ نے اس غم جانگسل سے ایک ایسا درد پایا ہے جو عالمِ انسانیت کے دکھوں اور غموں کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔ اس سے اختر نے عمل کی حرارت پائی ہے۔ اختر کا اس حصّے سے محض جسمانی اور روایتی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ بقول کرشن چندر ذہنی بلوغت شدید قربت۔ اور گہری رفاقت کی اندرونی کشمکش کی پیدا کردہ دوستی کا معاملہ تھا۔ خاکِ دل میں اختر نے اس تصوّر کو خود ہی پھیلا کر پیش کیا ہے ؎

دفن ہے دیکھ مری روح گلستاں تجھ میں ؛ میری گلپوش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنّا کے مہکتے ہوئے خواب ؛ میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملاحت مری صبحوں کا جمال ؛ میرے مرنے کا سلیقہ میرے جینے کا شعور
میری نبضوں کا ترنم ۔ میرے نغموں کی پکار ؛ میرے شعروں کی سجاوٹ میرے گیتوں کا نکھار

اختر کی ان نظموں میں (PATHOS) اُمڈ آیا ہے۔ خاموش آواز میں نسائی قلب کی رقت وہ درد پیدا کرتی ہے جو کسی بھی عظیم شاعری کا طرّہ امتیاز ہو سکتا ہے۔ صفیہ کی زبان سے جو جذبات ادا کئے گئے ہیں اس میں ایشیائی

اقبال مجید

جاں نثار کا ذہنی سفر

مجھے حیرت ہے کہ اپنے پسندیدہ شاعروں کی فہرست میں ایک طویل عرصے تک میں جاں نثار اختر کے نام کو شامل نہ کر سکا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ رہا ہو کہ میں ذاتی طور پر ہم عصر شعرا کو کاغذ پر تلاش کر کے پڑھنے کی عادت نہیں ڈال سکا تھا لیکن جس حلقے میں رہ کر میں مختلف ناموں سے واقف ہوا وہ حلقہ شاید اس قدر اونچی آواز میں جاں نثار کا نام نہ لے سکا کہ مجھ جیسا کم علم آدمی اُسے قبول کر لیتا۔ یہ زمانہ سن پچاس کے آس پاس کا تھا۔ آج جب جاں نثار اختر کا خاکِ دل، الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں اور سن بیالیس سے بچپن کی دلہائیں ان کے کلام کو تلاش کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا کیونکہ اس کے علاوہ اگر کچھ ہوتا تو یہی ہوتا۔ اپنے دل سے مجبور اپنے جذبات کا پابند اور اپنے لہجے کا گرفتار یہ شاعر جیسا بھی تھا اپنی ذات سے علیحدہ نہیں تھا۔ اسی لئے یہ فن کار مصلحتوں، سوچے، سمجھے منصوبوں اور حساب کتاب لگا کر نہ تو سن سینتالیس شعر کہہ رہا تھا نہ سن ستاون میں اور نہ سن تریسٹھ میں۔ یہ ضرور ہے کہ آج جب جاں نثار اپنی ذہنی عمر کا ایک طویل سفر کر چکے ہیں۔ آپ کو انہیں سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ رومانی تصوّرات، جذبات کے مرقعے، زندگی سے پیار، سبک روی کا ایک سیدھا راستہ جو تصنع اور بناوٹ سے یک سر پاک رہا۔ اور جو جاں نثار اختر کی شخصیت کی اساس بھی ہے اُن کے فن کی قوت بن گیا۔ مجھے شدت سے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر نے کہیں بھی جلدی نہیں کی، نہ تو شعر کہنے میں اور نہ شعر کہہ کر ان کو منوانے میں۔ اس کے مفید اور مضرت رساں دونوں ہی پہلو آج ہمارے سامنے ہیں۔ مضرت رساں ان معنوں میں کہ جاں نثار اختر آندھی طوفان کی طرح نہیں اُٹھے جس قافلے کے وہ راہ رو تھے اُس کی بھگدڑ میں اپنی جگہ لینے کے لئے دھینگا مشتی میں، صرف کی گئی محنت اور جوڑ توڑ کے مشاغل میں صفر رہ گئے۔ نہ کہیں گئے اور نہ کسی سے ملے اور نہ کسی مضمون میں انہیں یہ لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی کہ فرانس کا فلاں شاعر ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ یا اٹلی کا فلاں ادیب جب ان کے ساتھ فلاں ہوائی اڈے پر شراب پی رہا تھا اُس نے اُن کی فلاں نظم کا حوالہ دیا تھا۔

مفید پہلو یہ ہے کہ انہیں ایک قوت بخش سناٹا ملا۔ ایک ایسی خاموشی جو ان کے مزاج شعر سے میل کھاتی ہوئی تھی جو نہ تو خود کبھی حلقے سے باہر ہوئی اور نہ ان کو باہر ہونے دیا۔ اپنے مزاج اپنے ماحول اپنے شعری مطالعہ اور ذوق غرض کہ کسی بھی طرف سے جاں نثار کمزور نہیں تھے۔ اردو کے کلاسیکی ادب پر گہری نظر کے ساتھ ایک رچے ہوئے شعری ذوق کی پاسبانی میں انہوں نے روایت سے بغاوت تک کے سفر میں ٹھہر ٹھہر کر فیصلے کرنے کے رجحان کی نشاندہی کی ہے۔

اس کا امن اور تقدّس قائم رہے۔ اختر کے یہاں کسی قسم کی نظریاتی افراط و تفریط راہ نہیں پا سکتی۔ وہ صرف محبت کے گیت گاتا ہے اور اس بات کی شدّت سے خواہش کرتا ہے کہ امن و عافیت انسان کی تقدیر بن جائے۔ اختر کی شاعری ہمارے ادب کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔

وہ لوگ جو اُردو کو لسانی طور پر ہندی الاصل اور ہندی النسل ماننے کے باوجود اس کے "ایک مخصوص تمدّنی مزاج" کی بات کرتے ہیں اُن سے ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے کہ بے شک زبان کا ایک تمدنی مزاج ہوتا ہے لیکن ہمیں تاریخی حقائق کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب مسلمان حکمراں کی حیثیت سے موجود تھے اور فارسی سرکاری زبان تھی تو اردو پر فارسی کے اثرات پڑے، ایک وقت میں فارسیت کا غلبہ بھی ہوا، لیکن کیا انگریزوں کے دورِ حکومت میں اردو زبان اور اردو شاعری پر انگریزی ادبیات کے اثرات نہیں پڑے۔ یہ بھی تاریخی طور پر ہونا لازمی تھا اور آج جب ہمارے تاریخی حالات بدل چکے ہیں، نئی صورتِ حال میں کیا اردو زبان اپنے قدیم تمدنی اثرات سے باہر نکل کر جدید تمدنی اثرات نہ اپنائے گی۔

حباب نثار اختر

جن کے عرفان کے لئے نہ تو ہوائی جہاز کے سفر کی ضرورت ہے اور نہ Continental Literature کے مطالعہ کی شرط! یہ بڑی اچھی بات ہے کہ لوگ اب ہندوستان کے شاعر کے بارے میں یہ جاننے کے لئے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں کہ اس کی شناسائی غیر ملکی شاعروں سے کتنی ہے لیکن یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ چند لوگوں کو اس بات میں بھی دلچسپی ہے کہ ایک ہندوستانی شاعر میں ہندوستانیت کتنی ہے۔ "گھر آنگن" کا جاں نثار اس لئے سچا نہیں کہ وہ سورداس جی یا اس قبیل کے ہندوستانی شاعروں کی کی گئی شاعری پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے یا ایسا جہاں جو فراق کے روپ جیسا ہے۔ "گھر آنگن" کا شاعر اس لئے ایماندار ہے کہ یہ سارے کے سارے تجربات اور احساسات اس کی شخصیت کا ایک حصہ ہیں جنہوں نے فطری ڈھنگ سے ایک غنائی اور شعری لباس میں جگہ پائی ہے۔ ہندوستان کی اسی فیصدی آبادی ابھی تک اپنی زمین سے جڑی ہوئی ہے اب بھی اسی فیصد گھروں کی دیواریں درختوں سے چھوٹی ہیں۔ خاندان اور گھر اب بھی تہذیب کا سرچشمہ ہیں۔ اختر کو سورداس پر نہ تو رشک ہے نہ فراق سے لُغض اس نے "گھر آنگن" میں ڈرائنگ روم نہیں سجایا ہے کہ دو چار گھروں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا، کسی کا قالین پسند کیا، اور کہیں کا صوفہ، کہیں کا ٹیبل لیمپ اچھا لگا۔ اور کسی کا کیلنڈر، اور سب ملا کر اپنا ڈرائنگ روم سجا لیا یہ تو اس کی شاعری کا آنگن ہے، بے باک، بے تکلف، اس آنگن میں وہ سب کچھ ہے جو شاعر کے خون میں ہے اور یہ آنگن جاں نثار کی آنچ کی غزلوں کی طرح تر و تازہ ہے۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ ذات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

انسان کی حیثیت ایک فرد کی بھی ضرور ہے لیکن اُسے

سوسائٹی سے علٰحدہ کر کے دیکھنے کا طریقہ صحیح نہیں۔"

جاں نثار اختر

عشق میں آج بھی ہے نیم نگاہی کا چلن
پیار کرتے ہیں اُسی حُسن روایات سے ہم

جس عشق اور جس پیار کو جاں نثار نے جوانی کے کھیل کھیل میں یونہی اٹھا لیا تھا جو کبھی "یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات"، کبھی "محبت"، اور کبھی "عزم" کے عنوانات سے چھوٹی چھوٹی نظموں میں ابھرا، "تگرا کے کنارے" میں ڈھلا اور "گزرے ہوئے لمحات" میں سسکیاں لیتا رہا وہ عشق دراصل شاعر کی ذہنی تربیت کے لیے ایک وسیلہ تھا اور یہ بات بہت پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ دراصل سوال یہ تھا کہ اس عشق کا کیا کیا جائے؟ آگے راستہ کیا ہے؟ کیا اس عشق سے ایک پرچم بنایا جائے؟ کیا اسے غلاموں، کنیزوں، مزدوروں، اور غریبوں کے نام معنون کر دیا جائے؟ کیا اسے نزدیک اڈگ جاں رکھ کر بھول جایا جائے، کوریلے کے سپاہیوں کو پارسل کر دیا جائے۔ ایک راستہ یہ بھی تھا کہ اُس عشق کو ایس ڈی برمن یا کسی دوسرے فلمی موسیقار کی بلی کے حوالے کر دیا جائے اور ہمیشہ کے لئے اس روگ سے چھٹکارا پا لیا جائے۔

یہاں میرا مقصد قطعی یہ نہیں ہے کہ میں ان مقتول شعراء کی فہرست گنواؤں جو ان جان لیوا حادثوں کا شکار ہو کر اردو ادب سے فیڈ آؤٹ ہو گئے یا جنھوں نے ان حادثوں کے درمیان سے گزر کر اپنے عشق کو لائق گھرانے میں بیاہ دیا جہاں وہ آج پھل پھول رہا ہے یا عزت سے دو روٹیاں کھا رہا ہے۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ جاں نثار اختر بڑے شاعر نہیں ہیں کیونکہ بہت بڑا شاعر انہیں ہونا بھی نہیں چاہئے ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے لے کر اب تک ہندوستان کی کسی زبان میں بہت بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔

کیونکہ چھوٹا منجھلا یا بڑا شاعر اور اُس کی ناپ کے لئے ایک عہد درکار ہوتا ہے۔ جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ بڑے شاعر نہیں صرف "پہچانے گئے"، شاعر ہیں کسی کو رنگ سے پہچانا گیا اور کسی کو روپ سے، کسی کا ماضی اس کے ساتھ ہے کسی کا حال۔ بنیادی مسئلہ جاں نثار کے سامنے بڑے شاعری کا مسئلہ نہیں تھا، بنیادی مسئلہ تھا صرف اپنی شناخت کا، کوئی اشتہار دیئے بغیر ایک طرف اپنے باپ دادا کی میراث، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تو دوسری طرف نئے علوم، انقلابی نعرے، جدید ادبی میلانات، نئے ذہن غرضکہ ہر طرف سیلاب اور طغیانی، ایسے عالم میں سر پہ رکھا ہوا عشق کا پٹارہ "رہا نگ سی کی موجیہ"، "سجاد ظہیر کے نام" "استالن" یہ سب کہنے کو تو کہہ لیا لیکن جاں نثار کو بار بار کوئی یاد دلا رہا تھا۔

میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اور پھر ہوا یہ کہ بات بنی اور بات بنی اسی خاک دل سے کیونکہ محبت کا اس کے علاوہ اور کوئی مقدر ہی نہیں۔ خاک دل میں عزم جہاں کے دورے پکارنے والی بات کو کہنے کے لیے شاعر نے گرچہ کافی اُتاولے پن سے کام لیا ہے لیکن وہ اس لئے لائق درگذر ہے کہ وہی شاعر ایک روز چوالیس بند کی طویل نظم "خاموش آواز" بھی کہتا ہے۔ ممکن ہے لوگ مجھ سے اتفاق نہ کریں "خاموش آواز" سے بہتر نظم جس میں شاعر کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ کرافٹ مین بھی موجود ہے۔ جاں نثار اختر نے ابھی تک نہیں کہی "آخری لمحہ" بھی نہیں جس میں شاعر کے دل دماغ دونوں موجود ہیں، یہاں اپنی بات کے ساتھ ساتھ زمانے کی بات کرنے کے لیے شاعر کو زیادہ بہتر موقع میسر ہو گیا ہے اور جس میں تاثر کی بھی کمی نہیں "خاموش آواز" میں لہجہ کا اچھوتا پن، لفظوں پر قدرت شاعرانہ اظہار میں بے پناہ سادگی اور ایک انفرادی تجربہ کو اجتماعی ہم آہنگی دینے کا مشکل کام ایک خوبصورت امتزاج کے ساتھ موجود ہے۔ جاں نثار اختر نے ہمیشہ سے شاعری میں ایسی زبان کو ترجیح دی ہے جس کے سمجھنے کے لیے شمس الرحمان فاروقی کے تبصروں کی ضرورت نہ پڑے۔ جاں نثار کے دل کو وہ جذبات و احساسات خیالات و مضامین چھوتے رہے ہیں

دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کا ذہن اگر بیمار ہے تو آپ مریضانہ نظریہ اپنا لیں لیکن میں کسی بھی نظریئے کو جامد نہیں سمجھتا۔ اُس میں تبدیلی اور تغیر کا ہر وقت امکان ہے۔ یہ تبدیلی اور تغیر کہاں سے آتا ہے؟ وہ بھی پوری زندگی سے آتا ہے جس میں سیاست، معاشیات، اخلاقی قدریں اور بدلتے ہوئے حسن کے معیار وغیرہ سبھی شامل ہیں۔"

"اختر صاحب اقبال کی شاعری کمٹ منٹ کی شاعری تھی، اور اُن کے یہاں ایک حد تک ماضی پرستی بھی پائی جاتی ہے اور نظریاتی جمود بھی اس کے باوجود اُن کا خلوص اور جذباتی شدّت اُن کی شاعرانہ عظمت کی ضمانت ہیں۔"

"اصغر صاحب! مجھے اقبال کے نظریئے سے صرف یہی شکایت ہے کہ بعض پہلوؤں میں جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ اُن کے جوش، ولولے اور ایمانداری میں کوئی شبہ نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اُس پر وہ ایمان کی حد تک یقین رکھتے تھے۔ غالباً اسی چیز نے اُن کی شاعری کو عظمت دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑی شاعری کے لئے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ جن خیالات کا اظہار شاعر نے کیا ہے وہ ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) کی زبان میں Felt thoughts (محسوس خیالات) ہوں۔"

اقبال کی شاعرانہ عظمت کا راز، میں جہاں تک سمجھتا ہوں، اسی بات میں پوشیدہ ہے، اُن کے یہاں جذبے کی گہرائیوں سے لے کر فکر کی بلندیوں تک یہی صداقت اور خلوص کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ انہوں نے انسانیت کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل اعلیٰ آدرشوں میں تلاش کیا اور اسلامی مذہبی تفکر کی تجدید یا تشکیل نو کی کوشش اُن کے لئے اطمینان بخش ثابت ہوئی ہے۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادب میں کمٹ منٹ کے معنی بہت محدود رہے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے تقریباً اپنے آپ کو کمیونسٹ پارٹی اور اُس کی سیاسی حکمت عملیوں کا پابند بنا لیا اور اسے کمٹ منٹ کا صحیح تصوّر سمجھا۔ کمیونسٹ پارٹی اور سوویت روس کی صحیح یا غلط پالیسیاں ہی اُن کے لئے ہندوستانی عوام کی راہ نجات بن گئیں۔ حالانکہ جنگِ آزادی سے لے کر آج تک کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی قلابازیوں نے ہندوستان میں انقلابی تحریک کو زبردست نقصان پہونچایا ہے۔ اور سیاسی اور تہذیبی انقلاب کی راہ مسدود ہوئی ہے۔ کوئی ادیب، اگر وہ آزادیٔ فکر کے ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا ہے، تو کسی ایک پارٹی کے سیاسی فریم ورک تک اپنے آپ کو محدود نہیں کر سکتا ہے۔ ان سیاسی پالیسیوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا کمٹ منٹ کا غلط تصوّر ہے۔ ادیب یا شاعر کو اپنی تنہائی اور انفرادیت اتنی ہی عزیز ہوتی ہے جتنی سماج کی اونچ نیچ، نابرابریوں اور غیر انسانی جبر و استحصال دور کرنے کا احساس۔ ادیب کو بیباک اور ایماندارانہ ذہنیت کا مالک ہونا چاہیئے۔ اُس کی شاعری میں سماجی گندگیوں کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے نفسیاتی بحران اور داخلی کشمکش کا بھی بھرپور احساس ہونا چاہیئے۔ جی۔ دی پلیخانوف اپنی مشہور کتاب "Art and Social Life" میں لکھتا ہے، "اگر ایک خاص ملک اور خاص حالات میں فن کار کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں چل رہے احتجاج یا جنگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ دوسری طرف کسی اور وقت وہ ان احتجاجوں یا جنگوں میں شرکت کے لئے بیقرار ہو اٹھتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے کوئی اس بات پر مجبور کر رہا ہے یا بدلتے وقت کے ساتھ اُس پر مختلف فتوے دائر کئے جا رہے ہیں بلکہ اس لئے کہ مختلف سماجی حالات میں وہ مختلف جذبات سے متاثر ہوتا ہے" میں سمجھتا ہوں کہ ادیب یا شاعر کی تخلیقی آزادی اور جذباتی تاثر کا یہ بڑا صحیح Assessment ہے۔ فرانسیسی کمیونسٹ ادیب روجر گارودی نے چیکوسلواکیہ پر روسی حملے کی مذمت کی کیونکہ اُس کا کمٹ منٹ اشتراکی اصولوں اور قدروں سے تھا روس کی سیاسی پالیسیوں سے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جاں نثار اختر کمٹ منٹ کے اس صحیح تصوّر سے بخوبی واقف ہیں اور اسے اپنے کلام میں نبھایا بھی ہے۔ ان کی نظم "آخری لمحہ" ان کے پوری زندگی اور اس کی اعلیٰ قدروں سے کمٹ منٹ کا بہترین ثبوت ہے۔

اصغر علی انجینئر

اختر کا نظریۂ شاعری

البرٹ مالٹز اپنے ایک خوبصورت مضمون " ادیب عوام کا ضمیر" میں لکھتا ہے کہ " ادب کی تاریخ پر وہ ادیب یا رائٹرز چھائے ہوئے ہیں جن کی زندگی اور ادبی تخلیقات عوام سے ہمدردی اور محبت کی امتیازی خصوصیات کی حامل ہیں، کلبیت (cynicism) کی نہیں، یہ ادیب اپنے زمانے کی ترقی پسند (حالانکہ یہ لفظ آج کل اردو ادب میں ایک خاص مفہوم میں استعمال ہو کر کافی بدنام ہو چکا ہے) اور انقلابی تحریکوں کے جانبدار رہے ہیں - ادب کی یہ مکمل تاریخ تو نہیں ہے مگر اس کا مقتدر اور با اثر رجحان یہی رہا ہے ۔" بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا جھنڈا لہرایا تو جاں نثار نے اپنی جانب داری کا اعلان کیا :

کیا جنتا کا ، کیا جیون کا ایسے میں ایمان کریں
آؤ کھلے بندوں اب جانب داری کا اعلان کریں

ہر وہ باشعور ادیب یا شاعر، جو حساس دل کا مالک ہو اور اردگرد کے حالات سے بھرپور آگاہی رکھتا ہو، زندگی کی صحت مند قدروں کا جانب دار ہوتا ہے۔ اور ان قدروں کے حصول کی جدوجہد کو داخلی احساسات کی آنچ میں پگھلا کر اور اپنے تجرباتی سانچوں میں ڈھال کر تخلیقی روپ دیتا ہے۔ تجربات کے یہ سانچے صاف ستھرے اور ہموار بھی ہو سکتے ہیں اور ناہموار اور کھردرے بھی۔ تخلیقات میں یہ ہمواری یا کھردرا پن جھلکے گا۔ بہر حال ہیئت اور مواد ایک طرف، اور داخلی تجربہ اور خارجی حالات، دوسری طرف، ایک دوسرے سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں، عصری تقاضوں اور خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی تجربات، ہیئت اور مواد میں تبدیلی پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ مگر ان تبدیلیوں کے پس منظر میں ایک ناقابل تغیر حقیقت ہے۔ یہ ہے ادیب یا شاعر کا زندگی کی صحت مند قدروں سے اٹوٹ رشتہ، اُس کا ان اقدار سے کمٹ منٹ۔ اسی کمٹ منٹ کا اعلان اپنے اٹھان کے زمانے سے ہی ترقی پسند تحریک سے ناتہ جوڑ کر جاں نثار نے کر دیا تھا۔

" اختر صاحب"، میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے دریافت کیا، " آپ کے نزدیک شاعری میں کمٹ منٹ کی کیا اہمیت ہے۔ کیا شاعرانہ عظمت کے لئے کمٹ منٹ ضروری ہے ؟"

اپنے دھیمے اور نپے تلے انداز میں کہنے لگے" بھائی میرے خیال سے شاعری کے لئے کمٹ منٹ ضروری ہے ۔ لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ کمٹ منٹ کسی سیاسی ادارے سے ہو۔ شاعر کا کمٹ منٹ پوری زندگی سے ہونا چاہیئے۔ میرے نزدیک زندگی خود ایک نظریہ

یعنی کہ نئے دور کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی ردّ و قبول کے عمل سے دوچار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ پرانی اور نئی نسل کے دوران ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کے ہم عصروں نے اُن کے اشعار پر پیچیدہ اور گنجلک ہونے اور ناقابلِ فہم ہونے کے اعتراضات کئے۔ بعض لوگوں نے تو ان کی باتوں کو مہمل اور بے معنی قرار دے دیا لیکن غالب کی دوربیں نگاہیں زمانے کے مزاج میں تبدیلی کی زیریں لہر کو دیکھ رہی تھیں۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

یہ بات ہمیں ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ کسی بھی شعر کو سمجھنے کے لئے شاعر اور قاری میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے ورنہ ابلاغ کے مسائل پیش آتے ہیں۔ آج کے جدید ادب میں یہ مسئلہ اسی لئے درپیش ہے کہ صنعت اور ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی نے ہمارے سماج میں بھی زبردست تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اتنی بنیادی ہیں کہ اس سے انسانی حیاتیاتی موزونیت (Biological rhythm) بھی متاثر ہوئی ہے۔ اس سماج نے یکطرف اجنبیت alienation کا مسئلہ پیدا کیا ہے اور دوسری طرف تنظیمی انسان (organisation man) کا۔ اس سماج نے انسان کے لئے بھرپور زندگی جینا ناممکن بنا دیا ہے اور ہماری اخلاقی قدروں کو تہس نہس کر دیا ہے۔ ظاہر کہ اس کا اثر آج کے شاعر و ادیب کی حسیت پر پڑا ہے اور اس افراتفری کے عالم میں وہ اپنی ذات کے خول میں پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے اس عصری حسیت نے زبان اور محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ جدید شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے وہ قاری کی سمجھ میں آسانی نہیں آتی اور کچھ شاعر اس بات سے تنگ آ کر ابلاغ کی اہمیت سے ہی انکار کر بیٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابلاغ اور ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب ہمیں زندگی اور سماج کا گہرا عرفان بخشتا ہے۔ کچھ ہی عرصے پہلے ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کے شمارے جو cross current کے نام سے نکلے تھے، انگلستان اور یورپ کے اکثر ادیبوں نے ادب کے اس پہلو پر خاص زور دیا تھا اور یہ بات تسلیم کی تھی کہ ادب سے جس طرح زندگی اور انسانیت کی بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی اپنی اہمیت ہے۔

ادب اور شاعری کے اس پہلو پر جاں نثار کے بھی اپنے خیال ہیں۔ ایک دن گفتگو اسی موضوع پر ہونے لگی اور میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا، "ترسیل و ابلاغ کے لئے شاعری ہوتی ہے یا خود اظہاری (self expression) کے لئے؟ جدید ادیبوں کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ادب میں (self expression) بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ابلاغ محض اتفاقی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" اختر صاحب کچھ دیر تک نیم وا آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتے رہے جیسے کہ گہری سوچ میں کھوئے ہوئے ہوں۔ دھیمے لہجے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں دونوں چیزوں کو ضروری سمجھتا ہوں — self expression کو اگر ہم ترسیل یا ابلاغ سے نہ جوڑیں تو پھر self expression کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ میرے خیال سے کسی بھی آرٹسٹ کے لئے ابلاغ (communication) بہت اہم چیز ہے دونوں پر برابر زور ہونا چاہیئے کوئی شاعر یا ادیب یا کوئی دوسرا فنکار اگر اپنی کہی ہوئی بات دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا یا پہنچانے میں ناکام ہے تو میں اُسے شاعر یا ادیب یا فنکار کا نقص سمجھتا ہوں۔ دوسرے معنوں میں اُسے قوتِ اظہار یا قوتِ بیان پر وہ قدرت نہیں جو ایک بڑے فن کار میں ہونی چاہیئے۔

بورس پاسترناک اپنے ناول ڈاکٹر ژیواگو میں ایک جگہ کہتا ہے، "...... جنگیں اور انقلاب، بادشاہ اور روبسپیر

"فضا میں مئے رنگ و بو ڈھل رہی ہے
زمیں رقص کرتی ہوئی چل رہی ہے
دماغِ چمن میں ہے رنگیں فسانہ
ہے کلیوں کے کھلنے کا نازک زمانہ

یہ اور ایسے کئی اشعار پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں اور ان کا کلام پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی ایک خاموش، پرسکون اور گہری ندیا ہے جو دو ہموار کناروں کے بیچ ہلکے ہلکے ترنم کے ساتھ بہتی جا رہی ہو اور اس پر خالص جمالیاتی تصور طاری ہو، خالص جمالیاتی تصور اور ادب برائے زندگی میں بنیادی تضاد ہے۔ جاں نثار تو کمیٹیڈ مارکسسٹ ہیں یہ کلام تضاد کیسا؟ شاید اختر صاحب خود ہی اس کا جواب دے سکیں۔

باتوں ہی باتوں میں یہ بات بھی چل پڑی۔ "اختر صاحب کیا آپ خالص جمالیاتی شاعری کے قائل ہیں؟ آپ کی شاعری خالص جمالیاتی تصورات سے کس حد تک متاثر رہی ہے؟ "میرے خیال میں" اختر صاحب نے لب کشائی کی، "خالص جمالیاتی شاعری ہم جسے کہیں، وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے تو شیلی، کیٹس، وغیرہ جن کو رومانی شاعر کہا جاتا ہے ان کی شاعری میں بھی خالص جمالیاتی احساس یا عنصر نہیں ملتا۔ میں شعر میں جمالی عنصر کا ضرور قائل ہوں لیکن اگر وہ شعر عورت کے حسن و جمال کے بارے میں ہیں تو اس میں آپ کا عشق و محبت یا آپ کا نفسیاتی رجحان Psychological Make-up شامل ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دور کی معاشرت اور تمدن کی بھی جھلک اس میں موجود ہوتی ہے۔ میں اپنے اس قسم کے اشعار کو بھی اسی میزان میں رکھتا ہوں"

جاں نثار نے فیوڈل ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی کلچر میں پروان چڑھے۔ زندگی کی راحتوں اور اس کلچر کی قدروں اور حسن و عشق کے معیاروں نے مزاج میں رومان رچا دیا۔ عورت کے حسن و جمال کا تصور بھی اسی ماحول نے بخشا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اختر صاحب کے یہاں بہت کئی ایسی نظمیں ملتی ہیں مثلاً گرلز کالج کی لاری، "نذرِ انجم" "حسرت"، "قرب و بعد" وغیرہ۔ ان نظموں میں عورت، محبوبہ یا حسینہ کا تصور فیوڈل کلچر کا تصور معلوم ہوتا ہے جن میں "رخسار کے پھول"، "لبِ گل رنگ" "نوزِ ساماں"، "شمع فروزاں"، "چھلکتے ساغر" "مئے گلگوں"، وغیرہ جیسی ترکیبیں اور تشبیہیں ملتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہمیں خالص جمالیاتی شاعری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ظ۔ انصاری تو انہیں ایک ہی سانس میں کلاسیکی رومانٹک شاعر کہنے کے لئے تیار ہیں۔

آج کل جدید ادب کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ شاعری خاص طور سے اور ادب عموماً بنیادی طور پر خود اظہاری' (Self-expression) کا ہی ابلاغ یا ترسیل محض اتفاقی ہے یا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید غالب اپنے اس شعر میں۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یہی کیفیت بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ابلاغ کا مسئلہ آج جدید ادب میں بڑے تنازع کا سبب بنا ہوا ہے۔ میرے خیال میں ایک طویل عرصے کی یکسانیت اور زوال پذیری کے بعد زمانہ جب نئی کروٹ بدلتا ہے تو ادب میں بھی ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ ادب کی یہ نئی لہر زمانے کی ضرورتوں اور مزاج کے تحت نئی اصطلاحیں، نئی تراکیب اور نئے استعارات وضع کرتی ہے۔

"کچھ مقرروں نے یہ تاثر پیدا کیا کہ سوشلسٹ ریلزم صرف حقیقت کا بیان ہے لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ سوشلسٹ ناول بھی ناول ہیں یعنی کہ تخلیقی عمل کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہی مسئلہ اُلٹی جانب سے پیدا ہوتا ہے آپ ہمیں آدرشں وادی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہم ایک ایسی سچّائی اور حقیقت کی تلاش میں ہیں کہ جو پہلے سے موجود نہیں، لیکن ہمیں بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ آپ بھی افسانوی ادب کی تخلیق کر رہے ہیں اور یہ کہ آپ بھی اگر سچ پوچھا جائے تو ہماری طرح جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہر ادیب اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سچ کہہ سکے۔

افسانوی اور تخلیقی عنصر کے بغیر کوئی ادب بڑا ادب نہیں بن سکتا۔

ترقی پسند ادب پر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اختر صاحب سے پوچھا گیا یہ سچ ہے کہ ترقی پسندوں کی شاعری حصار کے اندر کی شاعری ہے؟ یہ کھلی فضا میں سانس نہیں لیتی؟

"اصغر صاحب، بات یہ ہے کہ کسی مخصوص نظریئے سے چپک کر چلنا آپ کو محدود تو کر دے گا اور کر رہا ہے۔ شاعر جب کسی مخصوص نظریئے کا پابند نہیں ہوتا بلکہ پوری زندگی اور کائنات کو مصنفانہ طور پر دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے تو مختلف تضادات کے باوجود بڑا شاعر بن جاتا ہے مثال کے طور پر آپ غالبؔ کی شاعری کو لے سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایم۔ اے کے ۱۹۷۵ء – ۷۶ء میں یہ سوال مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ غالبؔ کو بڑا شاعر سمجھتے ہیں یا اقبال کو اور میں نے کہا تھا غالب کو میں بڑا شاعر سمجھتا ہوں حالانکہ میں بھی ترقی پسند نظریئے کا شدت سے حامی تھا اور آج بھی جب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی افادیت سے انکار نہیں کرتا، یہی کہوں گا کہ غالب اقبال سے بڑے ہیں۔ اقبال کی شاعری حصار کے اندر کی شاعری ہے جب کہ غالب نے مختلف نظریوں سے مشاہدہ کیا اور پیش کر دیا۔ غالب نے کوئی نظریہ اپنے پڑھنے والوں پر نہیں لادا جبکہ اقبال کے نظریئے سے یا آپ اتفاق کر سکتے ہیں یا اختلاف۔"

ترقی پسند ادب کے آدرشوں اور اس کی تخلیقی قدروں سے وہی انکار کر سکتا ہے جو ایک ایسے بیمار معاشرے کا قائل ہے جہاں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو اور معاشی غلامی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ ترقی پسند ادب ایسے ہی بیمار معاشرے کے خلاف احتجاج ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہم اس احتجاج کو بار بار دہرایا جانے والا گراموفون ریکارڈ نہیں بنا سکتے۔ تخلیقی ادب ایک ایسا بہتا ہوا چشمہ ہے، جو زمین کی ناہمواریوں کو کاٹ کر اپنا راستہ آپ بنا لیتا ہے۔ اس چشمے کے پانی کو کسی مقررہ شکل یا ناپ کے کنوئیں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ادیب، فنکار اور شاعر پر مختلف اثرات مرتب ہوئے ہیں اور وہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب سے مستفید ہوتا ہے۔ غالب نے کبھی یوروپی ادب کا مطالعہ نہیں کیا مگر پھر بھی اقبال نے اُن کی شاعری میں جرمن زبان کے عظیم شاعر گیٹے کا عکس دیکھا۔ اقبال خود بھی یوروپ کے فلسفے اور ادب کا اچھا مطالعہ کر چکے تھے۔ اور ان پر اس کا گہرا اثر بھی تھا۔ در اصل بیسویں صدی کے آغاز میں ہماری زبان کے ادب میں انقلابی لہریں خاص کر انگریزی ادب کے زیر اثر اٹھیں اور ترقی پسند شاعروں نے روسی ادب سے بھی خاصا استفادہ کیا۔ اُنیسویں صدی کی رومانٹک شاعری نے بھی اردو شاعروں کو خاصا متاثر کیا تھا اور بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک ہمارے صف اوّل کے کئی شعراء اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ جاں نثار بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔

"اختر صاحب آپ انگریزی ادب میں کن شاعروں سے زیادہ متاثر ہیں، ویسے آپ کے کلام کے مطالعے سے کسی انگریزی یا روسی شاعروں کا تاثر محسوس نہیں ہوتا"

(Robespierre) تاریخ کے ایجنٹ ہیں، اُس کا خمیر ہیں۔ لیکن انقلاب وہی دیوانے یا سودائی لاتے ہیں جن کا ذہن قطعاً یکطرفہ (one track) ہوتا ہے اور جو جینئس (نابغہ) ہونے کی حد تک تنگ نظر ہوتے ہیں وہ پرانے نظام کو چند گھنٹوں یا دنوں میں درہم برہم کر دیتے ہیں۔ یہ اُتھل پتھل چند ہفتوں یا سالوں میں ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد کئی برسوں بلکہ صدیوں تک انہی "تنگ نظروں" کو جن کی مدد سے انقلاب برپا ہوا مقدس سمجھ کر پوجا جاتا ہے"۔ پاسترناک کے یہ الفاظ انسانی تاریخ اور سماجی یا سیاسی انقلابوں سے گہری بصیرت کا ثبوت ہیں۔ اردو ادب میں بھی کم و بیش یہی ہوا۔ انقلاب روس جو انسانی تاریخ کا بہت زبردست کارنامہ ہے کے بعد روس کی سیاست کو جو اکثر انقلاب سے زیادہ اُس کے اپنے مفاد میں ہوتی تھی، تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا اور ساری دنیا کے ترقی پسند ادیب روسی سیاست کو بے کم و کاست بڑی عقیدتمندی اور نیازمندی سے بے چوں و چرا تسلیم کرنے لگے۔ روس کی ہر سیاسی پالیسی اُن کے نزدیک ہر عیب اور بُرائی سے پاک اور منزّہ ہوتی تھی۔ یہی حال اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کا بھی رہا۔ اُنہوں نے انقلاب سے زیادہ روسی لیڈروں کو اپنا آدرش بنایا۔ اُن کی ہر پالیسی کو انقلابی دستاویز کی مقدس تحریر سمجھا اور اپنی شاعری یا تخلیقی ادب میں تحریک کا کرشمہ۔ جاں نثار بھی اس تحریک میں جو ترقی پسند تحریک کہی جاتی ہے، دل و جان سے شریک تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے سرگرم رُکن بھی رہے اور اس سلسلے میں روپوش ہونے کی نوبت بھی آئی۔ مارکسزم سے لگاؤ نے ان سے چھوٹی موٹی نظموں کے علاوہ کچھ طویل نظمیں بھی لکھوائیں جن میں مادی اور تاریخی جدلیات کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ "دانائے راز" "پانچ تصویریں" وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔ شاعری کے خلوص کے ساتھ ساتھ یہ نظمیں ان کے مارکسزم پر ایمان وایقان کا ٹھوس ثبوت ہیں۔ ترقی پسند تحریک پر جاں نثار سے گفتگو ہونا ناگزیر تھا۔ کیا وہ بھی ایک خاص سیاسی نظریئے کے تنگ دائرے میں محصور رہیں؟ میں نے اپنا سوال ان کی طرف داغا "ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دراصل پارٹی کے آلۂ کار تھے۔ اُن میں سے کئی ادیب و شاعر یا تو پارٹی کے بھانڈ یا اُس کے سیاسی فارمولوں کے پرچارک، یہ ادب کم اور پمفلیٹرنگ زیادہ ہے؟ آپ کہاں تک اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟ فیض پر یہ الزام کس حد تک عائد ہوتا ہے؟"

"ترقی پسند ادب کی تحریک میں مانتا ہوں کہ بڑی حد تک ایک مخصوص سیاسی نظریئے کا پرچار رہی ہے لیکن اس تحریک نے زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی متاثر کیا جن میں ہماری معاشرتی برائیاں اور اخلاقی کوتاہیاں اور مذہبی منافرت وغیرہ شامل تھیں اس تحریک نے کچھ اچھے ادیب و شاعر بھی پیدا کئے جنھوں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھا، پرکھا۔ اور اُس کے حسن و قبح کو سمجھا۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس تحریک کے زیر اثر اچھے ادب کا بہت بڑا سرمایہ پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اُس دور کی منتخب نظمیں ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں یوں تو ہر ترقی پسند شاعر کے یہاں آپ کو اچھی بُری نظمیں مل جائیں گی مگر فیض کے بارے میں جو خاص طور سے آپ نے مجھ سے پوچھا ہے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فیض بنیادی طور سے رومانیت اور غزل کے شاعر ہیں۔ غزل جو علامات میں بات کرتی ہے اس لئے اُن کی وہ نظمیں بھی جن میں سیاسی نظریات ہیں لطیف و دلکش نظر آتی ہیں۔"

ترقی پسند ادب کی تحریک نے سوشلسٹ ریلزم کا بھی بہت پرچار کیا ہے۔ بعض ادیبوں نے اسے محض میکانکی معنی میں سمجھا اور ادب کو پارٹی پروپیگنڈہ بنا دیا۔ ادب میں حقیقت نگاری کی اپنی اہمیت ہے خاص کر اُس حقیقت نگاری کی جو ہماری اخلاقی قدروں اور آدرشوں کو فوکس میں لاتی ہو لیکن حقیقت نگاری کو محض photographic realism نہیں بنایا جا سکتا۔ ادیب کیمرے کی آنکھ سے نہیں تخلیقی بصارت سے کام لیتا ہے۔ کیمرہ میکانکی عمل کی تصویرکشی کرتا ہے اور ادیب اپنے موضوع یا جذبات کی عکاسی کر کے اُس میں ایک نئی جان ڈال دیتا ہے۔ سارتر نے ۱۹۶۲ء میں ناول پر لینن گراڈ کے ایک سیمینار میں کہا تھا!

حسن کی ناز برداری کرنے والی بیوی، لجائی سی شرمائی سی جو شاید گھر آنگن سے باہر قدم نہیں رکھتی۔ اس تضاد کا جواب شاید اختر صاحب ہی دیں جن کی ذہنی ایمانداری سے میں منکر ہوں نہ اُن کے تجربات کی صداقت سے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا۔

"آپ کی رُباعیاں، جن کا مجموعہ چند سال پہلے چھپا ہے، فیوڈل کلچر کی عکاسی کرتی ہیں ۔ اس میں عورت کا تصوّر بھی بالکل فیوڈل دور کا تصوّر رہا ہے ۔ آپ نے تو مارکسزم کو شعوری طور پر قبول کیا ہے ۔ یہ فیوڈلزم اور مارکسزم میں سمجھوتا کیسا؟

"آپ کا یہ سوال مجھے پسند آیا۔ بات یہ ہے کہ مارکسزم یا ہمارا آدرشی دور جسے آپ سوشلزم یا کمیونزم کا نام دے سکتے ہیں، ابھی ہمارے دیش میں آ نہیں سکا۔ ہم اگر یہ بات کریں کہ عورت کو یہ حقوق ملنا چاہئیں، عورت کا یہ درجہ سماج میں ہونا چاہیئے تو وہ خود اس وقت ایک آدرش کی بات ہوگی۔ میں نے گھر آنگن میں جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہے جو ہے ۔ ہندوستان میں آج بھی عورت گھر کی زینت ہے۔ گھر آنگن میں زیادہ تر رباعیاں صرف گھریلو زندگی تک ضرور محدود ہیں لیکن ایک رُباعی بھی آپ کو اُس میں ایسی نہیں ملے گی جو عورت کی غلامی یا ادنیٰ مقام کو ثابت کرتی ہو۔ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں وہ عبوری دور ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کبھی جھجک نہیں کہ جہاں میں نے بہت سی سامنتی قدروں کی نفی کی ہے وہاں چند فیوڈل عناصر سے اپنے آپ کو ابھی تک نہ چھڑا سکا ہوں۔ فیوڈل اتہاس نے بھی ہمیں چند قدریں ایسی دی ہیں جسے ہم ہندوستان میں رہنے والے دل کش سمجھتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں۔"

بہرحال ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان رباعیوں میں بھی، اور جو کچھ بھی ہو، اختر صاحب اپنے سماجی کمٹ منٹ کو نہیں بھولتے۔ وہ اپنے گھر کی راحتوں کو ہر گھر کی راحت بنا دینا چاہتے ہیں۔

بس اپنے ہی گھر کا سُکھ تو کچھ بھی نہ ہوا
ہر گھر کو ملے گی گھر کی راحت کس دِن؟
کس روز ہر اک صحن میں لہکیں گے گلاب
آنگن آنگن بسے گی جنّت کس دن

انسان اپنی آرزؤں اور آدرشوں کو مجسّم دیکھنا چاہتا ہے اور کسی گوشت پوست کے زندہ انسان میں ان کی عملی شکل دیکھنے کی تمنّا رکھتا ہے۔ یہ شخصیت مذہبی بھی ہو سکتی ہے اور سیکولر یا سیاسی بھی۔ آج چین کے ادیبوں کو ماؤزے تنگ میں جو عظمت جھلکتی نظر آتی ہے وہ ۱۹۵۲ تک روس کے ادیبوں یا دنیا کے ادیبوں یا دنیا کے دوسرے ترقی پسند ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کو اسٹالن میں جھلکتی نظر آتی تھی ۔ جاں نثار اختر بھی ترقی پسند تحریک سے جذباتی اور ذہنی طور پر گہری وابستگی رکھتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ اسٹالن اُن کی آرزوں اور آدرشوں کا مرکز تھا۔ بڑی ایمان داری کے ساتھ وہ اسے سوشلسٹ روس کی اہم ترین بلکہ ساری دنیا کی کمیونسٹ تحریک کا اہم ترین رہنما تصوّر کرتے تھے ۔ اسٹالن پر ان کی نظم اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نظم میں بڑا پرخلوص جذبہ ہے جس کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے اسی لئے نظم کی حیثیت سے میں اسے ان کی اچھی نظموں میں شمار کروں گا۔

"انگریزی ادب کے جن شاعروں نے مجھے زیادہ اپیل کیا ہے اُن میں شیلی، بائرن، کولرج، کیٹس، ورڈزورتھ کی مختلف نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے کئی امریکی یا یورپی زبانوں کے شاعروں کو انگریزی کے ذریعے پڑھا ہے۔ جن میں پابلو نرودا، والٹ وہٹ مین، لارکا، بودلیر وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ایک انگریزی شاعر Auden بھی تھا جو مجھے بہت پسند ہے۔ یہاں تک تاثر کا سوال ہے میں نے شیلی کی ایک نظم "Philosophy of Love" کے انداز پر اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک نظم کہی تھی جو میرے مجموعے "تارگریباں" میں شامل ہے۔ نظم کا عنوان ہے "پچھلی پریت"۔"

جاں نثار خود بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے انہوں نے انگریزی ادب کے ۱۹ویں صدی کے رومانٹک شاعروں کا مطالعہ زیادہ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ ترقی پسند شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ روسی شاعروں جیسے یا سینسن، مایاکوفسکی، پوشکن وغیرہ کا ذکر نہیں کرتے۔

ادھر چند سال پہلے جاں نثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ "گھر آنگن" شائع ہوا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے جس میں محبوبہ کو کنارِ آبِ جو، بن اور رتوں کے بجائے گھر آنگن میں نت نئے رومانی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بڑا خوبصورت تجربہ ہے اور اردو کے شعری ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کرشن چندر نے گھر آنگن کے پیش لفظ میں اسے ہیرے کا ایک تراشا ہوا نگینہ کہا ہے جو سہاگن کے جھومر کی طرح عورت کے ماتھے پر دمک رہا ہے۔ جاں نثار کی ان رباعیوں کو پڑھ کر اُن کی قوت مشاہدہ اور عشق کی نفسیات پر گہری گرفت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان رباعیوں اور قطعات میں بیوی کو محبوبہ بنا کر جاں نثار نے ادب میں ایک نئی روایت قائم کی ہے جس کے ڈانڈے ہندوستان کی خوبصورت تہذیبی روایتوں سے ملے ہوئے ہیں۔

ہر صبح اُٹھے اُٹھ کے اندھیرے سے نہائے
آنکھیں جو اُٹھائے بھی تو نظریں نہ ملائے
راتوں کا مگر بھید چھپائے نہ چھپے
بھیگے ہوئے بالوں سے مہک سی آجائے

آہٹ مرے قدموں کی جو سُن پائی ہے
اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سُدھ بسرا کے
روٹی جلتی ، توے پر چھوڑ آئی ہے

گھر آنگن کی یہ رسیلی شاعری ہمارے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ذہن میں ایک سوال بھی پیدا کرتی ہے جو بڑا بے چین کر دینے والا ہے۔ جاں نثار ایک ترقی پسند شاعر ہیں اور مارکسزم کی طرف اُن کا ذہنی اور جذباتی جھکاؤ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ کمیونزم میں عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا گیا ہے جبکہ اُن رباعیوں اور قطعات کو پڑھ کر عورت کی ایسی تصویر ابھرتی ہے جو سامنتی کلچر کی نمائندہ ہے۔ ان رباعیوں میں عورت محض گھر آنگن تک محدود ہے اور مرد

بلکہ ایک ڈراؤنا خواب ہے اور ترقی پسند ادب ان آدرشوں کو مصنوعی زندگی دینا چاہتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ ادب میں اب بھی تعمیری پہلو کے قائل ہیں؟

"یہ بات تو غلط ہے کہ ترقی پسند ادب مر چکا۔ ترقی پسند ادب کی تنظیم ضرور کمزور پڑ چکی ہے لیکن ترقی پسند ادب کمزور نہیں ہوا۔ میں آپ سے الٹا پوچھتا ہوں کہ آج کے دور میں تو آپ کو بڑا انتشار اور پراگندگی نظر آ رہی ہے۔ کون سا ایسا دور گذرا ہے جو پراگندہ اور منتشر نہیں رہا؟ آپ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے ہر دور میں آپ کو آج ہی جیسا کرب اور آج ہی جیسا فرسٹریشن عام طور پر ملے گا۔ اب کرب اور بے چینی کو آپ صرف آج کے دور سے منسوب نہیں کر سکتے۔ تھوڑی بہت شکلیں ہر دور میں بدلی ہیں اور بدلتی رہنا چاہیئے۔ ہر دور کا وہی ادب جو زندگی کا حوصلہ دیتا رہا اور ہر دور کے کرب اور انتشار سے لڑنے کی ہمت بڑھاتا رہا ترقی پسند رہا ہے؛ اور آج کی وہی جدید نظمیں اور غزلیں اہم اور باوزن ہیں جو ہمیں شکست خوردگی سکھانے کی بجائے ہمیں آج کی الجھنوں اور مایوسیوں سے دست و گریباں ہونے کی تاب و طاقت بخشتی ہیں اور دراصل وہی کل کے ترقی پسند ادب کا تسلسل ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آج کے مصائب اور مسائل پر نظر نہیں ڈالئے، ضرور ڈالئے، لیکن ہمیں ان مشکلات سے آنکھیں چار کر کے گذرنا ہے اور ایک نئے سماج کی تعمیر کرنا ہے اسے نہ بھولئے۔"

"آپ کی نئی غزلیں جدید شاعروں میں بھی کافی مقبول ہوئی ہیں؟ آپ کے مزاج میں یہ تبدیلی یا یہ داخلی انقلاب کیسے آیا؟"

میں اس انقلاب کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان غزلوں میں زندگی کو کسی سکہ بند طریقے سے نہیں دیکھا ہے۔ اور شاید میرے اس عمل سے زندگی اپنے عیوب و محاسن کے ساتھ ان اشعار میں ڈھلی ہے یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ میرے کچھ اشعار پر میرے ہمعصر شعرا مجھ سے خفا ہیں اور میرے کچھ اشعار پر جدید شاعر خفا سے ہیں۔ اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ میرے بہت سے شعروں پر پرانے نقاد سر دھنتے ہیں اور میرے بہت سے شعروں کو جدید نقاد پسند کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے حساب سے شعر چن لیتا ہے زندگی کے حساب سے چنئے تو مجھے یقین ہے سب کو سب شعر پسند آئیں گے۔

"گفتگو جدید شاعری پر ہو رہی ہے تو کچھ اور سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں جن کا جواب آپکے شعری نظریئے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ویسے تو ہر دور کی شاعری میں فرد کی تنہائی اور اس کے بے یار و مددگار ہونے کا احساس کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا ہے لیکن جدید شاعری اپنے آپ کو فرد کے گھیرے میں ہی محدود کر دینا چاہتی ہے۔ یہ اجتماعی رشتوں اور فرد کی اجتماعیات سے کشاں کشاں رہنا چاہتی ہے۔ کیا عظیم شاعری ان باتوں سے اپنا دامن بچا سکتی ہے؟

"بڑی شاعری کیا اچھی شاعری میں بھی فرد اور سماج کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ شاعر یا ادیب پہلے شاعر اور ادیب کیسے۔ پہلے وہ سماج کا ایک فرد ہے وہ فرد جو اپنی پیدائش میں، اپنی تعلیم میں، اپنی تربیت میں، اپنی غذا کے لئے، اپنے لباس کے لئے اور اگر عینک لگاتا ہے تو اپنی عینک کے لئے سماج کا محتاج ہو وہ صرف

دوستو! بارگہِ عظمتِ آدم ہے یہی
پائے رفتار کو آداب سکھادو، ٹھہرو
دل ہمارے ہیں اُسی کے تو کھلائے ہوئے پھول
اُس کے قدموں میں یہی پھول چڑھادو ٹھہرو

"استالن والی نظم آپ کے خلوص اور فن کا پڑھنے والوں پر اثر ڈالتی ہے۔ اسے آپ نے اپنے مجموعے 'خاکِ دل' میں بھی شامل کیا ہے۔ کیا یہ نظم آج آپ کو اسٹالن مخالف تحریک کے مدِّنظر embarrasing نہیں لگتی،،؟

"میں نے یہ نظم جس وقت کہی اُس وقت صرف میرے ہی نہیں پوری کیمونسٹ دنیا کے ذہن میں اسٹالن کیمونزم کی ایک علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس نظم کو اپنے مجموعے میں شامل کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میرا مجموعہ خاکِ دل چھپنے جا رہا تھا تو سجاد ظہیر نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں اس نظم کو اس میں شامل نہ کروں۔ میں نے کہا کیا میرے اس نظم کو شامل نہ کرنے سے وہ ختم ہو جائے گی؟ جب میں نے کہی ہے تو میں ضرور شامل کروں گا۔ مجھے یہ بات کبھی نہیں جچی کہ کل جو آپ کا آئیڈیل رہا ہو اگر اس کا سیاسی زوال آجائے تو آپ اپنی نظم سے اُس کا نام کاٹ کر برسرِ اقتدار شخص کا نام ڈال دیں اسٹالن کا لفظ آج بھی میرے لئے کیمونزم کے ہم معنی ہے اور کیمونزم ایک ایسا آدرش ہے جو مجھے کتنا ہی پیارا ہو دنیا کے لئے اُس کا حصول مجھے ممکن نظر نہیں آتا۔ سوشلزم کی منزل البتہ ممکن اور قابلِ حصول نظر آتی ہے۔

جی ہاں سیاسی زوال کے بعد اگر آپ اُس شخص کا نام اپنی نظموں سے حرفِ غلط کی طرح مٹادیں کل تک جس کی پرستش کرتے اور اپنے آدرشوں کی علامت سمجھتے تھے تو اسے محض موقع پرستی کہا جائیگا موقع پرستی سیاسی بساط پر کچھ اہمیت رکھتی ہو لیکن یہ شاعر یا فن کار کی تخلیق میں یا کردار میں جگہ نہیں پاسکتی۔ اس سے اس کے جذبات کی صداقت پر حرف آتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد مشرق و مغرب کے ملکوں میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کئی نظریے جو مقدس سمجھے جاتے تھے کھوکھلے ثابت ہوئے۔ ہمیں جن باتوں پر ایمان کی حد تک بھروسہ تھا بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ سماجی زندگی کی پیچیدگیاں اتنی بڑھیں کہ انسان بدحواس نظر آنے لگا۔ اور تو اور ہمارے سماج کی غلط روش نے انسان کو مفاد پرستوں کا محض آلۂ کار سمجھ لیا اور ہماری قدریں تہس نہس ہوگئیں۔ جنگوں میں جس بڑے پیمانوں پر قتلِ عام ہوا اس سے انسانی زندگی کی عظمت ہی خاک میں مل گئی۔ ان بدلے ہوئے حالات نے انسان کو بے پناہ کرب اور تنہائی اور علیحدگی کا احساس دیا اور احساس بھی شدید۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس کے غلط استعمال نے مذہبی اور روحانی قدروں سے بھی مایوس کرادیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یوروپ کی نئی نسل میں پراگندگی اور طوائف الملوکی کا احساس عام ہوگیا۔ جدید ادب پر ان عوامل کا اثر پڑا اور شاعری یا دوسری اصنافِ ادب محض آدرشوں یا قدروں کا اظہار نہیں رہی بلکہ اس میں انسان کے داخلی کرب، اُس کی مایوسیوں، اُس کے disillusionment اور کھردرے پن کا کھردرا اظہار ہونے لگا۔ چند انتہاپسندوں نے تو زندگی سے اپنی وحشتوں کا اظہار اس طرح کیا کہ ادب سے ہی وحشت ہونے لگی۔

"جدیدیوں کا کہنا ہے کہ ادب میں فرد کی پراگندگی، اُس کے داخلی کرب یا فرسٹیشن کا ہی اظہار ہونا چاہیئے کسی بھی قسم کے حسن کی چاہے وہ زبان کا ہو یا اپنے محبوب کا، زندگی کا ہو یا سپنوں کا، ادب میں گنجائش نہیں ہے۔ زندگی خود کوئی حسین سپنا نہیں۔



نظمیں

اپنی ذات کی بات کرے۔ مجھے ڈاکٹر اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے

"موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں"۔

مجھے اپنا بھی ایک شعر یاد آتا ہے۔

حدودِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر نہ کوئی رقیب لگتا ہے"

اختر صاحب ساتھ ساتھ ہم یہ بھی جان لیں کہ آپ کی نظر میں جدید شاعری کا ہمارے ادب میں کیا contribution ہے"؟

جدید ادب کی سب سے بڑی دین میرے خیال میں اُس کا اندازِ بیان ہے جو نئی علامات اور استعارے جدید ادب کے ذریعے ہمارے یہاں آئے ہیں اور بیان میں جو کھلاپن پیدا ہوا ہے وہ بہت اہم ہے اور یہ دین بڑی حد تک صرف نئی غزل سے آئی ہے۔ نئی نظم منتخب نظموں کو چھوڑ کر نہ اپنے میں یہ شگفتگی پیدا کر سکی ہے نہ فکر کی گفتگو اچھوتی معراج۔

شاعری اور ادب میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ خوابوں کی حسین دلفریبیاں ہوتی ہیں جیسے سارتر نے سچ بولنے کی خاطر جھوٹ بولنا کہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جدید شاعری کا کم سے کم ایک حصہ ان دونوں عناصر سے محروم رہا ہے۔ ایسی شاعری کو ہم بڑی شاعری کیسے کہدیں"؟

حقیقت نگاری یا خواب دونوں میں سے کوئی چیز بڑی نہیں کہی جا سکتی۔ بڑی چیز بنتی ہے جب حقیقت نگاری اور خواب ملتے ہیں۔ یہ ملاپ نہ صرف اچھی شاعری بلکہ بڑی شاعری کے لئے بھی اہم ہے۔ ابھی تک جدید شاعری اس ملاپ سے محروم ہے اور اسی لئے وہ عظیم نہیں بن سکی"۔

فرد کائناتی عمل کو مخصوص عمل بنا کر ہی اپنے تجربے کے دائرے میں لا سکتا ہے لیکن یہ مخصوص عمل کا دائرہ بڑھ کر کائناتی دائرے کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکتا، اُس کا مرکز دائرہ بن کر اندر ہی رہ سکتا ہے۔ یہی بڑی شاعری کی عظمت کی ضمانت ہے۔

تجزیہ

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

پھر بھی جب پاس تو نہیں ہوتی
خود کو کتنا اُداس پاتا ہوں
گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دُھن سمائی رہتی ہے
اک خموشی سی چھائی رہتی ہے
دل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

پھر بھی رہ رہ کے میرے کانوں میں
گونجتی ہے تری حسیں آواز
جیسے نادیدہ کوئی بجتا ساز
ہر صدا ناگوار ہوتی ہے
دل کی دھڑکن بھی بار ہوتی ہے
ان سکوت آشنا ترانوں میں

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات سوچتا ہوں میں
تیری ہر بات سوچتا ہوں میں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھو سا جاتا ہوں تیری جنت میں

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

'خاکِ دل' پر جاں نثار اختر کو
۷۶ء میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ
دیا گیا۔ یہ تمام نظمیں اُسی کتاب
سے لی گئی ہیں جو نظم گوئی کا
اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی
ہیں۔

(مدیر)

بے زاری

رات اور یہ چاند تاروں کے نشاں
تیرگی اور ٹمٹماتا آسماں
اٹھ رہا ہے دل سے رہ رہ کر دھواں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

موت کا مضبوط لیکن سرد ہات
چھو رہا ہے دیکھ نبض کائنات
آہ، مت دہرا گزشتہ واقعات
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہو سکی دنیا نہ مجھ سے مستفید
آج ہر احساس ہے کوسوں بعید
مجھ سے وابستہ تھی کس کس کی امید
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دل تو دل ہستی مٹا بیٹھا ہوں میں
گھر تو گھر دنیا لٹا بیٹھا ہوں میں
اب تو ان کو بھی بھلا بیٹھا ہوں میں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

جز صحت عقل سب کچھ کھو چکا
چھوڑ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا
جس قدر رونا تھا مجھ کو رو چکا
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

لذتوں جھوٹی مسرت کے لئے
میں نے دل کو سیکڑوں دھوکے دیئے
جی ٹھہر سکتا نہیں اب بے پیئے
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دیکھ تاروں کی نظر پتھرا گئی
رات کی چوٹی کمر تک آ گئی

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
جس کو اس درجہ چاہتا ہوں میں
اس میں تیری سی کوئی بات نہیں

میں تجھے چاہتا نہیں، لیکن

۱۹۴۳ء

○

آنکھوں میں جو ہو جائے وہی بات بہت ہے
دستورِ محبت کا یہی کم سخنی ہے
ہر سایۂ مژگاں ہے گزرگاہِ تمنا
ہر بار کہا دل نے یہیں چھاؤں گھنی ہے

○

زندگی

تمتمائے ہوئے عارض پہ یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے اس درجہ خفا آپ سے اتنی بے زار
میں نے کب تیری محبت سے کیا ہے انکار

مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبّت تو نہیں ہے انجم

سوچ دنیا سے الگ بھاگ کے جائیں گے کہاں
اپنی جنّت بھی بسائیں تو بسائیں گے کہاں
امن اس عالمِ افکار میں پائیں گے کہاں

پھر زمانے سے نگاہوں کا چرانا کیسا
عشق کی ضد میں فرائض کو بھلانا کیسا
زندگی صرف محبّت تو نہیں ہے انجم

نیر افلاس سے کتنوں کے کلیجے ہیں فگار
کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا غبار
کتنے چہرے نظر آتے ہیں تبسّم کا مزار

اک نظر بھول کے اس سمت بھی دیکھا ہوتا
کچھ محبّت کے سوا اور بھی سوچا ہوتا
زندگی صرف محبّت تو نہیں ہے انجم

روح پچھلی یاد سے گھبرا گئی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ ستارے، یہ کفن کے سرو پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک ہے اُمت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

زندگی ہے رسم میں جکڑی ہوئی
قید ہے یاں فلسفے میں عشق بھی
اس جگہ جینا ہے گویا خودکشی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

عشق کیا ہے ایک ذہنی اضطراب
حسن کیا ہے جاگتی آنکھوں کا خواب
علم کیا ہے اک سوال بے جواب
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

سلطنت اک ظلم، مذہب اک بلا
مفلسی اک جرم، محنت اک سزا
آپ کیا قہار سے کم ہے خدا
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہر طرف بغض و عداوت قتل و جنگ
کھا چکی انصاف کی میزان زنگ
لٹ چکا انسانیت کا نام و ننگ
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ زمیں و آسماں یہ صبح و شام
یہ قفس، یہ قید، یہ زنداں یہ دام
ہے گراں یہ حلقۂ وقت و مقام
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

چاند کا چہرہ ہے بے حد مضمحل
صبح ہوتی ہے بجھا جاتا ہے دل
لا پلا اک اور جام مشتعل
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

مراحل

ایک لمحے کو کبھی وقت کی گردش نہ تھمی
حسبِ دستور مہ و سال بدلتے ہی رہے
ایک کو، ایک لگن، ایک لپک دل میں لیے
ہم محبت کی کٹھن راہ پہ چلتے ہی رہے

کیسے پُر پیچ مراحل کو کیا طے ہم نے
وادیاں کتنی ملیں راہ میں دشوار گزار
سیکڑوں سنگِ گراں راہ میں حائل تھے مگر
ایک لمحے کو بھی ٹوٹی نہ جنوں کی رفتار

آج چھائے ہیں وہ گھنگھور اندھیرے لیکن
جن میں ڈھونڈے سے بھی ملتے نہیں راہوں کے سراغ
وہ اندھیرے کہ نکلتے ہوئے ڈرتی ہے نگاہ
سامنے ہو تو نظر آئے نہ منزل کا سراغ

مجھ سے بدظن نہ ہو اے دوست کہ میری نظریں
کیا ہوا پیچ و خمِ راہ میں الجھی ہیں اگر
رودِ کہسار کی ہر لمحہ بھٹکتی موجیں
اپنی منزل کی طرف ہی تو رہیں گرمِ سفر

رنجِ غربت کے سوا جب کے پہلو بھی تو ہیں
جو ٹپک سکتے نہیں آنکھوں سے وہ آنسو بھی تو ہیں
زخم کھائے ہوئے مزدور کے بازو بھی تو ہیں

خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے
قلبِ انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے
زندگی صرف محبّت تو نہیں ہے انجم

عرصۂ دہر پہ سرمایہ و محنت کی یہ جنگ
امن و تہذیب کے رخسار سے اڑتا ہوا رنگ
یہ حکومت، یہ غلامی، یہ بغاوت کی اُمنگ

قلبِ آدم کے یہ رِستے ہوئے کہنہ ناسُور
اپنے احساس سے ہے فطرتِ انساں مجبور
زندگی صرف محبّت تو نہیں ہے انجم

آپ کو بندِ غلامی سے چھڑانا ہے ہمیں
خود محبّت کو بھی آزاد بنانا ہے ہمیں
اک نئی طرز پہ دنیا کو سجانا ہے ہمیں

تو بھی اُس وقت کے سینے میں شرارا بن جا
تو بھی اب عرشِ بغاوت کا ستارا بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

۱۹۴۲ء

امن نامہ

پلا ساقیا بادۂ خانہ ساز — کہ ہندوستاں پہ رہے ہم کو ناز
محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں — محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار — ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
ہمیں پیارا ہے ہر اک گاؤں سے — گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
ہمیں پیار اپنی عمارات سے — ہمیں پیار اپنی روایات سے
ہمیں پیار ہے اپنی شمشیر سے — ہمیں پیار اپنی ہر اک چیز سے
اٹھائے جو کوئی نظر کیا مجال — ترے رند لیں بڑھ کے آنکھیں نکال
سلامت رہیں اپنے دشت و دمن — رہے گنگناتا ہمارا گگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں — سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے پاک گنگوتری کی پھبن — مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ — چمکتی خنک چاندنی، نرم دھوپ
جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ — یہ گوکل کی گلیاں، یہ کاشی کے گھاٹ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ — یہ صبحِ بنارس، یہ شام اودھ
رہے یہ دھواں دھار کی آب و تاب — یہ مرمر، یہ پگھلا ہوا ماہتاب
رہیں سرخ روسیکری کے محل — یہ نینی کی جھیلوں میں کھلتے کنول
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج — رہے تا قیامت محبت کی لاج
ایلورا کے بت رقص کرتے رہیں — حسیں غار تاروں سے بھرتے رہیں
رہیں مسکراتی حسیں وادیاں — رہیں شاد جنگل کی شہزادیاں
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں — جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان — زمینوں پہ جھکتے رہیں آسماں
فضا میں گھٹائیں گرجتی رہیں — جواں چھاگلیں تٹ پہ بجتی رہیں
اڑاتی رہے آنچلوں کو ہوا — ملہاروں کی بوندوں میں گونجے صدا
مہکتے رہیں سبز آموں کے بور — بڑھاتی رہے پینگ جھولے کی ڈور
پپیہے کی پی پی تو کوئل کی کوک — اٹھاتی رہے نرم سینوں میں ہوک

مجھ سے برگشتہ نہ ہو تو کہ مرا دل ہے وہی
کیا ہوا فکر کے چھائے ہیں جو گھرے بادل
چشم ظاہر سے جو چھپ جائے تو چھپ جانے دے
ابر میں بجھ نہیں جاتی ہے قمر کی مشعل

میرے چہرے پہ جو ہے وقت کا شبگوں پرتو
ہے اسی عکس سے دھندلا ترا آئینۂ دل
آ کہ یہ لمحۂ حاضر نہیں حاصل اپنا
ہے پرے آج کی ظلمات سے اپنی منزل

اِن دھواں دھار اندھیروں سے گزرنے کے لئے
خونِ دل سے کوئی مشعل تو جلانی ہوگی
عشق کے رفتہ و برگشتہ جنوں کو اے دوست
زندگانی کی ادا آج سکھانی ہوگی

رہے نام اپنے ادب کا بلند — دلوں میں سمایا رہے پریم چند
سدا زندگانی غزل خواں رہے — زمانے میں غالب کا دیواں رہے

فضاؤں میں چھڑتے رہیں یہ ستار — سدا جھنجھناتے رہیں دل کے تار
مچلتی رہے مست مینا کی لے — برستی رہے سات رنگوں کی مئے
لہکتی رہے بھیرویں کی الاپ — رہے خود ہواؤں کی پھولوں پہ تھاپ
دہکتا رہے اپنے دیپک کا راگ — کلیجوں میں لگتی رہے نرم آگ
رہے گونجتی گھنگھروؤں کی کھنک — دفوں کی صدا، ڈھولکوں کی گمک
یہ گھونگھٹ یہ کتھک کے توڑے رہیں — جواں ناچ دل کو جھنجھوڑے رہیں
رہے ساقیا بادہ خواروں کی خیر — رہے ساقیا تیرے پیاروں کی خیر
رہے خیر ساقی ترے ہات کی — رہے خیر ساقی ہر اک بات کی
ابھرتا رہے زندگانی کا جوش — رہے تیرے رندوں کو دنیا کا ہوش
خوشا میکدے کی بہاریں رہیں — مچلتی یہ مے کی پھواریں رہیں
صراحی سے ساغر ہے متصل — نہ ٹوٹے کبھی تیرے شیشوں کا دل
سلامت ترا جام و مینا رہے — بڑے لطف کے ساتھ پینا رہے

اٹھا جام، ہاں دورِ ساقی رہے
جہاں میں سدا امن باقی رہے

○

کوئی گھٹا نہ چھو سکے ہمارے آسمان کو
کہ ہم کو اپنی دھوپ اپنی چاندنی سے پیار ہے

○

دہکتی رہے پاک ہولی کی آگ
سدا گائے رادھا کنھیّا کے گن
رہے یہ دیوالی کی جگ مگ بہار
فضا روشنی میں نہاتی رہے
رہے آسماں پر دمکتا ہلال
گلے سے گلے لوگ ملتے رہیں
رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
حسینوں کے مہکیں بسنتی لباس
حسیں راکھیاں جھل جھلاتی رہیں
رہے اپنے بھائی پہ بہنوں کو ناز
گھروں کا تقدس رہے برقرار
رہے شاد و آباد صحنوں کی دھوم
رہیں لڑکیوں میں یہ گڑیوں کے کھیل
سلامت رہے دلہنوں کی پھبن
سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت دوپٹوں کی رنگیں بہار
سلامت رہے پاک افشاں کا نور
سلامت رہے کاجلوں کی لکیر
سلامت رہے چوڑیوں کی کھنک
سلامت حسینوں کے سولہ سنگھار
سلامت جواں شوخ مہندی کا رنگ
سلامت رہیں مرگ نینوں کے بان
سلامت وفاؤں کے ارماں رہیں
سلامت رہیں ہیر رانجھے کے گیت
لجانا رہے، مسکرانا رہے
محبت کے چشمے اُبلتے رہیں
رہے جوش کی شبنمی شاعری
رہے دھوم ٹیگور و اقبال کی
رہیں کھیلتی ناریاں پی سے پھاگ
مچلتی رہے بن میں مُرلی کی دُھن
منڈیروں پہ جلتے دیوں کی قطار
ہماری زمیں جگمگاتی رہے
رہے عید کا مسکراتا جمال
دلوں کے جواں پھول کھلتے رہیں
رہیں شادیہ گیت گاتے ہجوم
رہے نرم چہروں پہ ہلکی مٹھاس
جھما جھم ستارے لٹاتی رہیں
یہ معصوم نرمی یہ میٹھا گداز
یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار
رہیں آنگنوں میں "چہکتے نجوم"
رہے چھک چھکاتی یہ بچوں کی ریل
سلامت رہیں دل میں کھلتے چمن
سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا
سلامت جواں آنچلوں کا وقار
سلامت رہے بیندیوں کا غرور
سلامت رہیں نرم نظروں کے تیر
سلامت رہے کنگنوں کی چمک
یہ جوڑے پہ لپٹے چنبیلی کے ہار
مہکتا مہکتا رہے انگ انگ
سلامت رہے مرنے والوں کی شان
سلامت محبت کے پیماں رہیں
رہے ہار میں بھی محبت کی جیت
منانا رہے روٹھ جانا رہے
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں
میٔ ونگ کی موزوں حسیں ساحری
رہے شان پنجاب و بنگال کی

کتنے لمحے کہ حسین، نرم، سبک آنچل سے
تو نے بڑھ کر مرے ماتھے کا پسینہ پونچھا
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے

کتنے لمحے کہ غم زیست کے طوفانوں میں
زندگانی کے جلائے ہوئے باغی مشعل
تو مرا عزم جواں بن کے مرے ساتھ رہی

کتنے لمحے کہ غم دل سے ابھر کر ہم نے
اک نئی صبح محبّت کی لگن اپنائی
ساری دنیا کے لئے، سارے زمانے کے لئے

انہی لمحوں کے گل آویز شراروں کا تجھے
گوندھ کر آج کوئی ہار پنھا دوں آجا
چوم کر مانگ تری تجھ کو سجا دوں آجا

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات

مہکتی ہوئی رات

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے ترے دل کی دھڑکن
آج پھر تیری ادا سے مرے پاس آئی ہے

اپنی آنکھوں میں تری زلف کا ڈالے کاجل
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے ارمانوں کے خواب
اپنے آنچل پہ تمنا کے ستارے ٹانکے

گنگناتی ہوئی یادوں کی لویں جاگ اُٹھیں
کتنے گزرے ہوئے لمحوں کے چمکتے جگنو
دل کو ہالے میں لئے ناچ رہے ہیں کب سے

کتنے لمحے جو تری زلف کے سائے کے تلے
غرق ہو کر تری آنکھوں کے حسیں ساغر میں
غم دوراں سے بہت دور گزارے میں نے

کتنے لمحے کہ تری پیار بھری نظروں نے
کس سلیقے سے سجائی مرے دل کی محفل
کس قرینے سے سکھایا مجھے جینے کا شعور

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دفن ہیں اس میں محبت کے خزانے کتنے
ایک عنوان میں مضمر ہیں فسانے کتنے
اک بہن اپنی رفاقت کی قسم کھائے ہوئے
ایک ماں مر کے بھی سینے میں لئے ماں کا گداز
اپنے بچوں کے لڑکپن کو کلیجے سے لگائے
اپنے کھلتے ہوئے معصوم شگوفوں کے لئے
بند آنکھوں میں بہاروں کے جوالے خواب بسائے

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
ایک ساتھی بھی تہِ خاک یہاں سوتی ہے
عرصۂ دہر کی بے رحم کشاکش کا شکار
جان دے کر بھی زمانے سے نہ مانے ہوئے ہار
اپنے تیور میں وہی عزم جواں سال لئے
یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دیکھ! اک شمع سرِ راہ گزر جلتی ہے
جگمگاتا ہے اگر کوئی نشانِ منزل
زندگی اور بھی کچھ تیز قدم چلتی ہے

لکھنؤ! میرے وطن، میرے چمن زار وطن!
دیکھ اس خواب گہِ ناز پہ کل موجِ صبا
لے کے نوروزِ بہاراں کی خبر آئے گی
سرخ پھولوں کا بڑے ناز سے گوندھے ہوئے ہار
کل اسی خاک پہ گلرنگ سحر آئے گی
کل اسی خاک کے ذروں میں سما جائے گا رنگ
کل مرے پیار کی تصویر ابھر آئے گی
اے مری روحِ چمن خاکِ لحد سے تیری
آج بھی مجھ کو ترے پیار کی بو آتی ہے
زخم سینے کے مہکتے ہیں تری خوشبو سے
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے
مجھ سے کیا بات بنائے گی زمانے کی دنا

خاکِ دل

(صفیہ کے انتقال پر لکھنؤ سے جاتے ہوئے)

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن!

تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں

دفن ہے دیکھ مرا عہدِ بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روحِ گلستاں تجھ میں
میری گل پوش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب

میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملاحت مری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ، مری خلوت کا فسوں
میری دیوانگیٔ شوق، مرا نازِ جنوں
میرے مرنے کا سلیقہ مرے جینے کا شعور
میرا ناموسِ وفا، میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم، مرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ، مرے گیتوں کا نکھار
لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خوابِ جواں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایۂ جاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن!

اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھنو میرے وطن میرے چمن زارِ وطن !

۱۹۵۳ء

○

جیون کی یہ چھائی ہوئی اندھیاری رات
کیا جانیے کس موڑ پہ چھوٹا ترا ساتھ
پھرتا ہوں ڈگر ڈگر اکیلا لیکن
شانے پہ مرے آج تلک ہے ترا ہات

○

موت خود آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے

میں اور ان آنکھوں سے دیکھوں تجھے پیوندِ زمیں
اس قدر ظلم، نہیں، ہائے نہیں، ہائے نہیں
کوئی اے کاش بجھا دے مری آنکھوں کے دیئے
چھین لے مجھ سے کوئی کاش نگاہیں میری
اے مری شمعِ وفا، اے مری منزل کے چراغ
آج تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری
تجھ کو رو دوں بھی تو کیا روؤں کہ ان آنکھوں میں
اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے
زندگی عرصہ گہہِ جہدِ مسلسل ہی سہی
ایک لمحے کو قدم تھم سے گئے ہیں میرے

پھر بھی اس عرصہ گہہِ جہدِ مسلسل سے مجھے
کوئی آواز یہ آواز دیئے جاتا ہے
آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہو گا
ناز یہ بھی غمِ دوراں کا اٹھانا ہو گا

زندگی دیکھ مجھے حکمِ سفر دیتی ہے
اک دلِ شعلہ بجاں ساتھ لئے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزمِ جواں بخشا تھا
میں وہی عزمِ جواں ساتھ لئے جاتا ہوں

چوم کر آج تری خاکِ لحد کے ذرّے
ان گنت پھول محبّت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں

لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زارِ وطن!
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا!

مجھ میں کچھ بھی جان نہیں ہے
آؤ مجھے ہاتھوں پہ اُٹھا لو

تم کو میرا غم ہے ساتھی
کیسے اب اس غم کو بھلاؤں
اپنا کھویا جیون بولو
آج کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں

یہ نہ سمجھنا میرے ساجن
دے نہ سکی میں ساتھ تمہارا
یہ نہ سمجھنا میرے دل کو
آج تمہارا دُکھ ہے گوارا

یہ نہ سمجھنا میں نے تم سے
جان کے یوں منہ موڑ لیا ہے
یہ نہ سمجھنا میں نے تم سے
دل کا ناتا توڑ لیا ہے

یہ نہ سمجھنا تم سے میں نے
آج کیا ہے کوئی بہانا
دنیا مجھ سے روٹھ چکی ہے
ساتھی تم بھی روٹھ نہ جانا

آج بھی ساجن میں ہوں تمہاری
آج بھی تم ہو میرے اپنے
آج بھی ان آنکھوں میں بسے ہیں
پیار کے امنٹ گہرے سپنے

دل کی دھڑکن ڈوب بھی جائے
دل کی صدائیں تھک نہ سکیں گی

خاموش آواز

جنوری کی چاندنی رات میں صفیہ کے مزار پر

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم یہ نہ جانے

دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
آؤ تمہارے واسطے ساتھی
اب بھی مری آغوش کھلی ہے

چپ ہو کیوں؟ کیا سوچ رہے ہو؟
آؤ سب کچھ آج بھلا دو
آؤ اپنے پیارے ساتھی
پھر سے مجھے اک بار جلا دو

بولو ساتھی! کچھ تو بولو!
کب تک آخر آہ بھروں گی
تم نے مجھ پر ناز کئے ہیں
آج میں تم سے ناز کروں گی

آؤ میں تم سے روٹھ سی جاؤں
آؤ مجھے تم ہنس کے منا لو

پھول جو چٹکے میں نے جانا
تم نے شاید مجھکو پکارا

آئیں بہاریں مجھ کو منانے
تم بن میں تو منہ سے نہ بولی
لاکھ فضا میں گیت سے گونجے
لیکن میں نے آنکھ نہ کھولی

کتنی نکھری صبحیں گزریں
کتنی مہکی شامیں چھائیں
میرے دل کو دور سے تکنے
جانے کتنی یادیں آئیں

اتنی مدّت بعد تو پریتم
آج کلی ہردے کی کھلی ہے
کتنی راتیں جاگ کے ساجن
آج مجھے یہ رات ملی ہے

بولو ساتھی! کچھ تو بولو!
کچھ تو دل کی بات بتاؤ
آج بھی مجھ سے دُور رہو گے
آؤ مرے نزدیک تو آؤ

آؤ میں تم کو بہلا لوں گی
بیٹھ تو جاؤ میرے سہارے
آج تمھیں کیوں غم ہے بولو
آج تو میں ہوں پاس تمہارے

اچھا میرا غم نہ بھلاؤ
میرا غم ہر غم میں سمو لو

مٹ بھی جاؤں پھر بھی تم سے
میری وفائیں تھک نہ سکیں گی

یہ تو پوچھو مجھ سے چھٹ کر
تیرے دل پر کیا کیا گزری
تم بن میری ناؤ تو ساجن
ایسی ڈوبی پھر نہ اُبھری

ایک تمہارا پیار بچا ہے
ورنہ سب کچھ لُٹ سا گیا ہے
ایک مسلسل رات کہ جس میں
آج مرا دم گھٹ سا گیا ہے

آج تمہارا رستہ تکتے
میں نے پورا سال بتایا
کتنے طوفانوں کی زد پر
میں نے اپنا دیپ جلایا

تم بن سارے موسم بیتے
آئے جھونکے سرد ہوا کے
نرم گلابی جاڑے گزرے
میرے دل میں آگ لگا کے

ساون آیا دھوم مچاتا
گھر گھر کالے بادل چھائے
میرے دل پر جسم سے گزرے ہیں
جانے کتنے گہرے سائے

چاند سے جب بھی بادل گزرا
دل سے گزرا عکس تمہارا

دیکھو دیکھو میری جانب
دوڑ پڑے ہیں چاند ستارے

جھل مل جھل مل کرنیں آئیں
مجھ کو چندن ہار پہنانے
جگ مگ جگ مگ تارے آئے
پھر سے میری مانگ سجانے

آئیں ہوائیں جھانجھ بجاتی
گیتوں مورا انگنا جاگا
مورے ماتھے جھومر دمکا
مورے ہاتھوں کنگنا جاگا

جاگ اٹھا ہے سارا عالم
جاگ اٹھی ہے رات ملن کی
آؤ زمیں کی گود میں ساجن
سیج سجی ہے آج دولہن کی

آؤ جاتی رات ہے ساتھی
پیار تمہارا دل میں بھرلوں
آؤ تمہاری گود میں ساجن
تھک کر آنکھیں بند سی کرلوں

اٹھو ساتھی دور افق کا
نرم کنارا کانپ اٹھا ہے
میرے دل کی دھڑکن بن کر
صبح کا تارا کانپ اٹھا ہے

دل کی دھڑکن ڈوب کے رہ جا
جاگی جگنو، تھم سی جاؤ

اس سے اچھی بات نہ ہو گی
یہ تو تمھیں منظور ہے بولو

میرے غم کو میرے شاعر!
اپنے جوان گیتوں میں رچا لو
میرے غم کو میرے شاعر!
سارے جگ کی آگ بنا لو!

میرے غم کی آنچ سے ساتھی
چونک اُٹھے گا عزم تمہارا
بات تو جب ہے لاکھوں دل کو
چھو لے اپنے پیار کا دھارا

میں جو تمہارے ساتھ نہیں ہوں
دل کو مت مایوس کرو تم
تم ہو تنہا، تم ہو اکیلے
ایسا کیوں محسوس کرو تم

آج تمہارے لاکھوں ساتھی
ساتھی ہمت ہار نہ جاؤ
آج کروڑوں ہاتھ بڑھیں گے
ایک ذرا تم ہاتھ بڑھاؤ

اچھا اب تو ہنس دو ساتھی
ورنہ دیکھو روٹھ پڑوں گی
بولو ساتھی کچھ تو بولو
آج میں سچ مچ تم سے لڑوں گی

جاگ اُٹھی لو دنیا میری
آئی ہنسی وہ لب پہ تمھارے

پیاسی آنکھیں راہ تکیں گی!
ساجن جلدی لوٹ کے آنا

لیکن ٹھہرو، ٹھہرو ساتھی!
دل کو ذرا تیار تو کر لوں
آؤ، مرے پردیسی ساجن!
آؤ، میں تم کو پیار تو کر لوں

○

ہزار پردۂ محمل اُٹھے ہوئے ہیں تو کیا
وہ میری لیلیٔ آشفتہ سر کہاں سے ملے
نظر میں حسینوں کی سو تقاضے ہیں
جو مجھ سے کچھ نہ کہے وہ نظر کہاں سے ملے
میں لے کے جاؤں کہاں اپنے دل کے ٹکڑوں کو
مجھے ملے تو مرا شیشہ گر کہاں سے ملے

○

پھر سے میری بے نم آنکھو!
پتھر بن کر جم سی جاؤ

میرے غم کا غم نہ کرو تم
اچھا اب سے غم نہ کروں گی
میرے ارادوں والے ساتھی
جاؤ میں ہمت کم نہ کروں گی

تم کو ہنس کر رخصت کر دوں
سب کچھ میں ہنس کے سہا ہے
تم بن مجھ میں کچھ نہ رہے گا
یوں بھی اب کیا خاک رہا ہے

دیکھو! کتنے کام پڑے ہیں
اچھا اب مت دیر کرو تم
کیسے جم کر رہ سے گئے ہو
اتنا مت اندھیر کرو تم

بولو، تم کو کیسے روکوں
دنیا سو الزام دھرے گی
ایسے پاگل پیار کو ساتھی
ساری خلقت نام دھرے گی

آؤ، میں الجھے بال سنواروں
مجھ سے کوئی کام تو لے لو
پھر سے گلے اک بار لگا کے
پیار سے میرا نام تو لے لو

اچھا ساتھی! جاؤ سدھارو
اب کی اتنے دن نہ لگانا

کچھ نازک شکنیں آنچل کی — کچھ نرم لکیریں کاجل کی
اک کھوئی کڑی افسانوں کی — دو آنکھیں روشن دانوں کی
اک سرخ دُلائی گوٹ لگی — کیا جانے کب کی چوٹ لگی
اک چھلّا پھیکی رنگت کا — اک لاکٹ دل کی صورت کا
رومال کئی ریشم سے کڑھے — وہ خط جو کبھی میں نے نہ پڑھے

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

اُجڑی ہوئی مانگیں شاموں کی — آواز شکستہ جاموں کی
کچھ ٹکڑے خالی بوتل کے — کچھ گھنگھرو ٹوٹی پائل کے
کچھ بکھرے تنکے چلمن کے — کچھ پرزے اپنے دامن کے
کچھ تارے سے یہ تھرّائے ہوئے — کچھ گیت کبھی کے گائے ہوئے
کچھ شعر پرانی غزلوں کے — عنوان ادھوری نظموں کے
ٹوٹی ہوئی اک اشکوں کی لڑی — اک خشک قلم، اک بند گھڑی

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

کچھ ساتھی چھوٹے چھوٹے سے — کچھ رشتے ٹوٹے ٹوٹے سے
کچھ بگڑی بگڑی تصویریں — کچھ دھندلی دھندلی تحریریں
کچھ آنسو چھلکے چھلکے سے — کچھ موتی ڈھلکے ڈھلکے سے
کچھ نقش یہ حیراں حیراں سے — کچھ عکس یہ لرزاں لرزاں سے
کچھ اجڑی اجڑی دنیائیں — کچھ بھٹکی بھٹکی آشائیں
کچھ بکھرے بکھرے سپنے ہیں — یہ غیر نہیں سب اپنے ہیں

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

آخری ملاقات

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

دو پانوؤں بنے ہریالی پر   اک تتلی بیٹھی ڈالی پر!
کچھ جگمگ جگنو جنگل سے   کچھ جھومتے ہاتھی بادل سے
یہ ایک کہانی نیند بھری   اک تخت پہ بیٹھی ایک پری
کچھ گُن گُن کرتے پروانے   دو ننھے ننھے دستانے
کچھ اُڑتے رنگین غبارے   ببو کے دوپٹے کے تارے
یہ چہرا بنّو بوڑھی کا   یہ ٹکڑا ماں کی چوڑی کا

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

السائی ہوئی رت ساون کی   کچھ سوندھی خوشبو آنگن کی
اک ٹوٹی رسّی جھولے کی   اک چوٹ کسکتی کوٹھے کی
سلگی سی انگیٹھی جاڑوں میں   اک چہرا کتنی آڑوں میں
کچھ چاندنی راتیں گرمی کی   اک لب پر باتیں نرمی کی
کچھ روپ حسیں کاشانوں کا   کچھ رنگ ہرے میدانوں کا
کچھ ہار مہکتی کلیوں کے   کچھ نام وطن کی گلیوں کے

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

کچھ چاند چمکتے گالوں کے   کچھ بھنورے کالے بالوں کے

مانا کہ بہاریں آئیں گی، کاغذ کے ابھی گل بوٹے ہیں
خود اپنے رہبر ساتھی بھی کچھ اصلی باقی جھوٹے ہیں
ہر موڑ پہ اپنے تلووں میں کچھ اور بھی کانٹے ٹوٹے ہیں
جو ہے وہ حقیقت کیوں نہ کہیں، یہ زہر بھی ہم پی جائیں گے
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا!

جو زخم ملے ان آنکھوں کو، نظروں کی جِلا کہلائے ہیں
جو زخم ملے ان ہاتھوں کو محنت کا صِلا کہلائے ہیں
جو زخم ملے اس سینے کو انعامِ وفا کہلائے ہیں
کیا خوب حسیں تاویلیں ہیں، پر جان کے دھوکا کھائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پہ شرمائیں کیا

ان جلتے تپتے زخموں کو سینے سے لگا کر پالا ہے
ہر شعلۂ خونِ دل اپنا، اشعار میں ہم نے ڈھالا ہے
لَو دیتے ہوئے ان لفظوں کو پر کون پرکھنے والا ہے
جب ناقدِ سوزِ دل ہی نہ ہوں ہم دادِ سخن کی پائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں ان زخموں پر شرمائیں کیا

دنیا سے تو کتنے شکوے ہیں اک تم سے شکوا اور سہی
سو درد بسے ہیں اس دل میں اک داغ تمہارا اور سہی
اک زخمِ محبت اور سہی، اک زخمِ تمنّا اور سہی
تم سچ ہے ہمیں اپنا نہ کیا، ہم سچ ہے تمہیں اپنائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پہ شرمائیں کیا

(1962)

اک زخمِ تمنّا اور سہی

یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا
کیوں کہتے ہوئے شرمائیں ہم، دنیا نے ہمیں ٹھکرایا ہے
ہر سانس میں ایسا لگتا ہے، شعلہ سا کوئی لہرایا ہے
یہ سُرخ جو رہتی ہیں آنکھیں، زخموں نے لہو چھلکایا ہے
وہ گھاؤ ہوں جیسے چہرے پر خود دیکھ لو ہم دکھلائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا

بے کار رہے اک عمر تلک، چاہا تھا ہمیں کچھ کام ملے
کچھ آگ سے دہکے پیمانے، کچھ زہر کے چھلکے جام ملے
تھوڑی سی جو پی لی گھبرا کر، کیا کیا نہ ہمیں الزام ملے
ہم رندِ بلاکش کہلائے، اب لوگوں کو سمجھائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا

جھیلی ہے سزا خودداری کی، پر ہاتھ نہیں پھیلائے ہیں
اوروں کے لئے ہر درد سہا، اس پر بھی بُرے کہلائے ہیں
تیروں کا جنھیں فن سکھلایا، خود تیر اُنھیں سے کھائے ہیں
جو زخم ملے ہیں اپنوں سے، ان زخموں کو گنوائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا

آتی تھیں صدائیں جن کی کبھی، خلوت میں بھی دل کے تاروں سے
ہم جان چھڑکتے تھے جن پر یاری نہ نبھی اُن یاروں سے
یہ زخم جو دل نے کھائے ہیں گہرے ہیں کہیں تلواروں سے
معلوم نہ ہو جب اپنی خطا، ہم عذر بھی لے کر جائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصّہ ہیں، ان زخموں پر شرمائیں کیا

بس اور چند نفس کو تمہارے پاس ہوں میں
تمہیں جو پا کے خوشی ہے تم اس خوشی پہ نہ جاؤ
تمھیں یہ علم نہیں کس قدر اُداس ہوں میں

کیا تم کو خبر اس دنیا کی، کیا تم کو پتہ اِس دنیا کا
معصوم دلوں کو دُکھ دینا، شیوہ ہے اس دنیا کا
غم اپنا نہیں غم اس کا ہے، کل جانے تمہارا کیا ہو گا
پروان چڑھو گی تم کیسے؟ جینے کا سہارا کیا ہو گا
آؤ کہ ترستی باہوں میں اک بار تو تم کو بھر لوں میں
دو چار نفس کی فرصت ہے کچھ تم سے باتیں کر لوں میں
کل تم جو بڑی ہو جاؤ گی، جب تم کو شعور آ جائے گا
کتنے ہی سوالوں کا دھارا احساس سے ٹکرا جائے گا
سوچو گی کہ دنیا طبقوں میں تقسیم ہے کیوں یہ پھیر ہے کیا
انسان کا انساں بیری ہے، یہ ظلم ہے کیا اندھیر ہے کیا
یہ نسل ہے کیا؟ یہ ذات ہے کیا؟ یہ نفرت کی تعلیم ہے کیوں
دولت تو بہت ہے ملکوں میں، دولت کی مگر تقسیم ہے کیوں
تاریخ بتائے گی تم کو، انساں سے کہاں پر بھول ہوئی
سرمائے کے ہاتھوں لوگوں کی کس طرح محبت دھول ہوئی
صدیوں سے برابر محنت کش حالات سے لڑتے آئے ہیں
چھائی ہے جو اب تک دھرتی پر، اس رات سے لڑتے آئے ہیں
دنیا سے ابھی تک مٹ نہ سکا، یہ راج اجارہ داری کا
غربت ہے وہی، افلاس وہی، رونا ہے وہی بے کاری کا
محنت کی ابھی تک قدر نہیں، محنت کا ابھی تک مول نہیں
ڈھونڈے نہیں ملتیں وہ آنکھیں، جو آنکھیں ہو کشکول نہیں
سوچا تھا کہ کل اس دھرتی پر اک رنگ نیا چھا جائے گا!
انسان ہزار برسوں کی محنت کا ثمر پا جائے گا
جینے کا برابر حق سب کو جب ملتا، وہ پل آ نہ سکا
جس کل کی خاطر جیتے جی مرتے رہے وہ کل آ نہ سکا
لیکن یہ لڑائی ختم نہیں، یہ جنگ نہ ہو گی بند کبھی
سو زخم بھی کھا کر میداں سے ہٹتے نہیں جرأت مند کبھی

آخری لمحہ

(اپنی بیٹی عنبرہ کے نام)

تم مری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے
دل کی دھڑکن ہے ڈوبنے کے قریب
سانس ہر لحظہ پیچ و تاب میں ہے
ٹوٹتے بے خروش تاروں کی
آخری کپکپی رباب میں ہے
کوئی منزل نہ جادۂ منزل
راستہ گم کسی سراب میں ہے
تم کو چاہا کیا خیالوں میں
تم کو پایا بھی جیسے خواب میں ہے
تم مری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے

میں سوچتا تھا کہ تم آؤ گی تمھیں پا کر
میں اس جہان کے دُکھ درد بھول جاؤں گا
گلے میں ڈال کے باہیں جو جھول جاؤ گی
میں آسمان کے تارے بھی توڑ لاؤں گا

تم ایک بیل کی مانند بڑھتی جاؤ گی
نہ چھو سکیں گی حوادث کی آندھیاں تم کو
میں اپنی جان پہ سو آفتیں اٹھا لوں گا
چھپا کے رکھوں گا باہوں کے درمیاں تم کو

مگر میں آج بہت دور جانے والا ہوں

صبحوں کا جھانکتا ہوا چہرہ حسین ہے
ہوں لاکھ کوہسار بھی حائل تو کیا ہوا
پل پل چمک رہا ہے جو تیشہ حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو
ہر جہد، ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

حسن سے چند ہی کانٹے ہیں چن سکا لیکن
بڑی ہے بات جو تم رنگِ گل نکھار سکو
یہ دورِ دورِ جہاں کاش تم کو راس آئے
تم اس زمین کو کچھ اور بھی سنوار سکو
عمل تمہارا یہ توفیق دے سکے تم کو
کہ زندگی کا ہر اک قرض تم اُتار سکو

سفرِ حیات کا آسان ہو ہی جاتا ہے
اگر ہو دل کو سہارا کسی کی چاہت کا
وہ پیار جس میں نہ ہو عقل و دل کی یک جہتی
کسی طریق سے جذبہ نہیں محبت کا
ہزاروں سال میں تہذیب جسم نکھری ہے
بجا کہ جنس تقاضا ہے ایک فطرت کا

تمہیں کل اپنے شریکِ سفر کو چننا ہے
وہ جس سے تم کو محبت ملے رفاقت بھی
ہزار ایک ہوں دو ذہن مختلف ہوں گے
یہ بات تلخ ہے لیکن ہے عین فطرت بھی
بہت حسین ہے ذہنی مفاہمت لیکن
بڑی عظیم ہے آدرش کی حفاظت بھی

کبھی یہ گل کو بھی نظر کو فریب دیتے ہیں
ہر ایک پھول میں تمیزِ رنگ و بو رکھنا
خیال جس کا گزرگاہِ صد بہاراں ہے

وہ وقت کبھی تو آئے گا، جب دل کے چمن لہرائیں گے
مر جاؤں تو کیا مرنے سے مرے، یہ خواب نہیں مر جائیں گے
یہ خواب ہی میری دولت ہیں، یہ خواب تمہیں دے جاؤں گا
اس دہر میں جینے مرنے کے آداب تمہیں دے جاؤں گا
ممکن ہے کہ یہ دنیا کی روش پل بھر تمہارا ساتھ نہ دے
کانٹوں ہی کا تحفہ نذر کرے، پھولوں کی کوئی سوغات نہ دے
ممکن ہے تمہارے رستے میں، ہر ظلم و ستم دیوار بنے
سینے میں دہکتے شعلے ہوں، ہر سانس کوئی آزار بنے
ایسے میں نہ گھل کر رہ جانا، اشکوں سے نہ آنچل بھر لینا
غم آپ بڑی اک طاقت ہے۔ یہ طاقت بس میں کر لینا
ہو عزم تو لو دے اٹھتا ہے، ہر زخم سلگتے سینے کا
جو اپنا حق خود چھین سکے، ملتا ہے اسے حق جینے کا
لیکن یہ ہمیشہ یاد رہے اک فرد کی طاقت کچھ بھی نہیں
جو بھی ہو اکیلے انساں سے دنیا کی بغاوت کچھ بھی نہیں
تنہا جو کسی کو پائیں گے طاقت کے شکنجے جکڑیں گے
سو ہاتھ اٹھیں گے جب مل کر دنیا کا گریباں پکڑیں گے
انسان وہی ہے، تابندہ اس راز سے جس کا سینا ہے
اوروں کے لئے تو جینا ہی، خود اپنے لئے بھی جینا ہے

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شر کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دل کو ہلائے لاکھ گھٹاؤں کی گھن گرج
مٹی پہ جو گرا ہے وہ قطرا حسین ہے
دہشت دلا رہی ہیں چٹانیں تو کیا ہوا
پتھر میں جو صنم ہے وہ کتنا حسین ہے
راتوں کی تیرگی ہے جو پر ہول، غم نہیں

کس کو معلوم کیا حجاب میں ہے

جسم و جاں کا یہ عارضی رشتہ
کتنا ملتا ہوا حباب میں ہے
آج جو ہے وہ کل نہیں ہو گا
آدمی کون سے حساب میں ہے
خود زمانے بدلتے رہتے ہیں
زندگی صرف انقلاب میں ہے

آؤ آنکھوں میں ڈال دو آنکھیں
روح اب نزع کے عذاب میں ہے
تھرتھراتا ہوا تمہارا عکس
کب سے اس دیدۂ پُرآب میں ہے

روشنی دیر سے آنکھوں کی بجھی جاتی ہے
ٹھیک سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا مجھ کو
ایک چہرا مرے چہرے پہ جھکا آتا ہے
کون ہے یہ بھی سجھائی نہیں دیتا مجھ کو

صرف سناٹے کی آواز چلی آتی ہے
اور تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا مجھ کو

آؤ اس چاند سے ماتھے کو ذرا چوم تو لوں
پھر نہ ہو گا تمہیں یہ پیار نصیب آ جاؤ
آخری لمحہ ہے سینے پہ مرے سر رکھ دو
دل کی حالت ہوئی جاتی ہے عجیب آ جاؤ
نہ اعزّا، نہ احبّا، نہ خدا ہے نہ رسول
کوئی اس وقت نہیں میرے قریب آ جاؤ
تم تو قریب آ جاؤ!

ہر اک قدم اسی منزل کی آرزو رکھنا
کوئی بھی فرض ہو خواہش سے پھر بھی برتر ہے
تمام عمر فرائض کی آبرو رکھنا!

تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دور کو تہذیب و آگہی دی ہے
تمام منطق و حکمت، تمام علم و ادب
چراغ بن کے زمانے کو روشنی دی ہے
جلا وطن ہوئے آزادی وطن کے لئے
مرے تو ایسے کہ اوروں کو زندگی دی ہے

غم حیات سے لڑتے گزار دی میں نے
مگر یہ غم ہے تمہیں کچھ خوشی نہ دے پایا
وہ پیار جس سے لڑکپن کے دن مہک اٹھیں
وہ پیار بھی میں تمہیں دو گھڑی نہ دے پایا
میں جانتا ہوں کہ حالات سازگار نہ تھے
مگر میں خود کو تسلی کبھی نہ دے پایا

یہ میری نظم مرا پیار ہے تمہارے لئے
یہ شعر تم کو مری روح کا پتا دیں گے
یہی تمہیں مرے عزم و عمل کی دیں گے خبر
یہی تمہیں مری مجبوریاں بتا دیں گے
کبھی جو غم کے اندھیرے میں ڈگمگاؤ گی
تمہاری راہ میں کتنے دیئے جلا دیں گے

اب مرے پاس اور وقت نہیں
سانس ہر لحظہ اضطراب میں ہے
لرزاں لرزاں کوئی دھندلکا سا
ڈوبتے زرد آفتاب میں ہے
موت کو کس لئے حجاب کہیں



غزل کا مزاج داں

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

سحر کار آواز

جاں نثار اختر سے میرے ۳۲ برس کے مراسم ہیں۔ میں نے ان کو گوالیار میں دیکھا ہے جب وہ وکٹوریہ کالج میں اردو کے لیکچرار تھے اور گرلز کالج کی لاری ،، " بگولے ،، اور کون سا گیت سنو گی انجم ،، کی وجہ سے مشہور تھے۔ میں نے ان کو بمبئی میں بھی دیکھا ہے جب امن نامہ، خاک دل، خاموش آواز اور آخری ملاقات کی بدولت ان کی شہرت بوئے گل کی طرح عام ہو چکی تھی۔ اور کوئی پڑھا لکھا گھرانا ایسا نہیں تھا جہاں اُن کی ان خوبصورت نظموں یا صفیہ کے خون چکاں خطوں کا بار بار ذکر نہ ہوتا ہو۔ میں نے ان کو " گھر آنگن ،، کے اُس شاعر کے روپ میں بھی دیکھا جس کی بدولت انہوں نے اردو شاعری کی تخلیقی لَے کو موڑ دیا اور اس میں ہندی کی سپردگی، نرمی اور شیرینی بھر دی اور آخر میں اُن کو غزل گو کی حیثیت سے دیکھا جہاں انہوں نے غزل ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں بخشا بلکہ اپنی شہرت کو بھی نئی عظمتوں سے روشناس کیا اس ربع صدی میں بہت سے شاعر ابھرے اور ختم ہو گئے۔ بہت سے شاعر کچھ دیر کے لئے چمکے اور غائب ہو گئے۔ لیکن جاں نثار اختر کی شاعری کا گراف برابر مائل بہ ترقی رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو اثاثاً جو شاعری ملی ہے وہ نک سک سے درست ہے (وہ حضرت مضطر خیر آبادی کے بیٹے ہیں) بعد میں علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے اُس پر اور جلا ہو گئی۔ قدیم کی احتیاط اور جدید کی پذیرائی جیسی اُن کے یہاں ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے ماحول بھی ان کو گوالیار اور بھوپال کا ملا جہاں کی تہذیب اور شائستگی ہندوستان کی دولت ہے اور آخر میں بمبئی میں رہے جو شاہد و شعر و شباب اور مے و رامش و رنگ ہی کا گہوارہ نہیں، نئے صنعتی تمدن کا مرکز اور نئے خیالات کا سرچشمہ بھی ہے اس لئے اگر اختر کے کلام میں ہمیں قدیم شاعری کی صحت اور مہارتِ شعری، جدید کی حسنیت اور پیکر تراشی ملتی ہے تو حیرت کی بات نہیں ہے۔

جاں نثار اختر نے غزل کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب اُس کی " گردن مارے جانے کا ،، اعلان ہو چکا تھا اور وہ بورژوا زندگی کے ابتذال، انتشار اور پراگندہ مزاجی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی۔

اختر نے نئی غزل کے ذریعے نہ صرف اس کا رشتہ ادبی تاریخ سے جوڑا بلکہ اس کو ایک نئی کشش جہت، نئی معنویت، نئی حسیّت، نئی لفظیات اور نئی دل کشی عطا کی۔ اس اعتبار سے غزل کی عصری تاریخ میں اُن کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے۔ ان کی غزلیں صاف عصر حاضر کی چیز معلوم ہوتی ہیں اور ان کی شخصیت اس مینائے غزل سے چھلکتی جاتی ہے اور اُن کی آواز میں بہت سی پچھلی آوازیں شامل ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ اُن کے خاندانی ورثے اور گردوپیش کی ماحول سے مل جاتی ہے تو یہ سحر کار آواز قیامت بن جاتی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور

سچّا شاعر

جاں نثار اختر اس دور کے اُن ممتاز شاعروں میں سے ہیں جن پر ہماری شاعری اور ادب بلاشبہ فخر کر سکتا ہے۔ اُن کے باپ مضطر خیر آبادی نے ہمارے کلاسیکل رنگ کے حُسن، رچاؤ، پختگی اور شگفتگی کو جس البیلے انداز میں اپنے اشعار میں سمو لیا تھا اُس سے اربابِ نظر اچھی طرح واقف ہیں۔ جاں نثار اختر کے یہاں روایت کے صالح عناصر کی پاسداری اور عرفان کے ساتھ اس دور کے درد و داغ اور سوز و گداز کی جس طرح آئینہ داری کی گئی ہے وہ بڑے بڑوں کے بس کی بات نہیں۔ جاں نثار نے نئے کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی۔ مگر ان کا نیاپن نہ فیشن کے لئے ہے، نہ فارمولے کی خاطر اور نہ یہ صرف مختلف ہونے پر نازاں ہے یہ مختلف بھی اور منفرد بھی اور اُس کے ساتھ اپنی پناہ میں میر و غالب اور حسرت و اقبال سبھی کو جذب کئے ہوئے ہے۔ ہاں اس کے ساتھ اس میں روح کا بحران ہے، حال کے ذہنی سفر کی داستان ہے۔ زندگی کے موجودہ موڑ پر انسانیت کے کرب کی کہانی ہے دورِ حاضر کا علم ہے۔ اس لمحے کا عرفان ہے اور زندگی کی لامعنویت کے ساتھ اُس کی عظمت کا رجز ہے

جاں نثار سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ میں مجاز نے کرائی، اُس وقت وہ اپنے باپ کے رنگ میں بڑی شوخ اور چنچل غزلیں کہتے تھے، پھر اُنہیں ماحول کا احساس ہوا اور گرد و پیش کے مسائل پر ان کی نظریں پڑنے لگیں۔ باپ سے انہیں رنگین تخیل اور رومانی فکر کی ایک دل کش روایت ملی تھی۔ پھر ترقی پسند تحریک نے "میکشوں کی برہمی" اور خانہ بدوشوں کی کائنات کے اسرار سے آشنا کیا۔ انہوں نے زندگی کے حسن کے بھی گیت گائے اور اُس کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس زمانے میں انہوں نے نظمیں زیادہ لکھیں، غزلیں کم، نظم پر یہ توجہ قدرتی تھی۔ اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی وجہ سے اقبال اور جوش کے بعد، مری نسل کے شعرا کا سرمایہ بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اُس دور کا جوش و خروش و ایمان و ایقان آج کچھ عجیب سا لگتا ہے مگر وہ اُس وقت برحق تھا اور آج اُن قدروں سے بے اطمینانی بھی برحق ہے۔ وقت کا ساتھ دینا معمولی کام نہیں۔ اس میں ہر قدم پر جو زادِ راہ جمع کیا گیا تھا اُسے پھینک کر نئی بصیرت اور نیا زادِ راہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

جاں نثار اختر میرے نہایت عزیز دوست رہے ہیں۔ اُن کی بیوی مرحومہ صفیہ بھی مجھے بہت عزیز تھیں۔ اُن کی یاد میں انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ فکر و فن کے ایسے مرقعے ہیں جن کی رعنائی اور لالہ کاری کبھی ماند نہیں ہو سکتی۔ اُن کے یہاں ایک شاعرانہ مزاج اور قلندرانہ انداز ہے جو اُن کی شخصیت کے کھرے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے کالج میں اردو کی تعلیم بھی دی ہے، فلمیں بھی بنائی ہیں، ہر طرف لپکے ہیں اور ہر شعلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے، اس کے ساتھ ہاتھ اور دامن جلائے بھی ہیں۔ ہر ہوا کی موج، ہر روشنی کی کرن، ہر خوشبو کے جھونکے کے لئے دیدۂ دل کھلے رکھے ہیں مگر انہوں نے

جاں نثار اختر نے بڑی مُصیبتیں اٹھائی ہیں، بڑی کڑیاں جھیلی ہیں، زمانے کے گرم و سرد کو چکھا ہے لیکن میں نے اُن کو کبھی روتے اور بسورتے ہوئے نہیں دیکھا، ہر حال میں اختر صاحب ہی پایا۔ وہی پاسِ وضع، وہی نگاہِ شرم، وہی خوش طبعی، وہی عاشق مزاجی۔ انہوں نے دار و رسن کی منزلوں کو مُسکراتے ہوئے طے کیا اور خوشی کے عارضی لمحوں سے پوری خوشی حاصل کی نہ اُن کو جاوداں بنایا اور نہ اُن کو حقیر سمجھا۔ وہ حُسن کی اداؤں کو پہچانتے ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ ارمان بھی ہے کہ محبوب کی زُلفیں اُن ہی کے بازوؤں پر پریشان ہوں اور وہ سچے عاشق کی طرح ان ہی پر ساری مہربانیاں صرف کردے اتنی کہ - زغارتِ چمنت بر بہار منت ہاست - لیکن یہ کہنا کفرانِ نعمت ہوگا کہ اختر کی زندگی سراسر محرومی یا مایوسی کی زندگی رہی ہے، انہوں نے دل دیا بھی ہے اور لیا بھی ہے۔ وہ عمر بھر شرابی سے رہے ہیں۔ سرشار و سرمست۔ اس سرخوشی کا سرچشمہ، دل کی گلابی ہی نہیں، فن کی سرشاری بھی ہے۔

اختر کی غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی عموماً پانچ چھے یا سات شعر ہوتے ہیں لیکن سب منتخب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلابی جاڑے ہیں۔ رات ہوگئی ہے اور ایک ایک کرکے چراغ روشن کردیئے ہیں یا عماری شب میں قمر کا جلوس ہے جو نکل رہا ہے۔ اس اُجالے سے ہمارے گرد و پیش ہی میں نہیں۔ دل میں بھی اُجالا ہو جاتا ہے اس آرٹ کے ذریعے جس میں لفظ و معنی کی دوئی مٹ گئی ہے، ہم دنیا کی ظلمتوں کو بھول جاتے ہیں اور اسی آرٹ کے ذریعے ہمارا رشتہ دُنیا سے پھر استوار ہوتا ہے ؎

نہ لفظ ہے نہ کنایہ، نہ صوت ہے، نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھے کوئی زباں ہم سے

جاں نثار اختر کو لیقن اور کیٹس (Keats) کی طرح ادبی مصوّری میں بڑا ملکہ ہے وہ ایسی ایمائی قوت کے حامل ہیں جو ایک مصوّری کی طرح کشش کے ہلکے ہلکے خطوط سے جہانِ معنی پیدا کرسکتی ہے۔ وہ ذہنی اور تجریدی تصوّرات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کرسکتے ہیں۔ محسوسات اور کیفیات کی تتلیوں کو گرفت میں لانا آسان نہیں۔ ہاتھ آدیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے۔ لیکن جاں نثار اختر نے بدن کی خوشبو، بہتی ہوئی ندیا اور سوتی ہوئی کرن کو محسوس اور جاندار استعاروں کے قالب میں ڈھال دیا ہے اور اسی لئے وہ شعر، پیکرِ تصویر بن گئے ہیں ان میں الفاظ کا رقص ہے، حیات کا نغمہ ہے اور کلا کی سنگت ہے اختر کی غزلیں فطرت اور زندگی کی نگہتوں سے معمور ہیں۔ ان میں لطیف رومانیت ہے۔ جنسیاتی تحلیل ہے، شاعرانہ مصوّری ہے لیکن کوئی بے کراں جذبہ، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے ان کی شناعت میں فرانس کی ایلوئی (Heloise) کے وہ لافانی الفاظ پیش کیے جاسکتے ہیں جو اس نے اپنے حبیب ابی لار (Abelard) کو خونِ دل سے لکھے تھے۔

"میں ایسا خط نہیں چاہتی جس سے تمہاری علمیت یا فضیلت ظاہر ہو میں تو اُن بولوں کے سننے کی مشتاق ہوں جو بے ساختہ تمہارے دل سے نکلے ہوں۔"

یہی شاعرانہ خلوص، یہی حسّی تجربہ ان غزلوں کی اصلی قدر و قیمت ہے۔

کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے
بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے
اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیئے
ابھی تلک تو وہی فاصلا لگے ہے مجھے

مجھے خوشی ہے کہ جاں نثار کی شاعری آج بھی جوان ہے اور آج کی حسیت کی اپنے طور پر عکاسی کر رہی ہے۔ سچا اور اچھا شاعر اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتا ہے اور ہم اس سے زیادہ اور کس چیز کی توقع کر سکتے ہیں۔

(ماخوذ)

اختر صاحب اپنی حالیہ غزلوں کے ذریعہ ذہن و دل کے جتنے قریب آئے ہیں یہ حقیقت ہے کہ پہلے نہ تھے...... اُن کی آنے والی غزلوں کی روشنی میں اُن کی ساری شخصیت ایک عجیب سے Glowing mist کے دائرے سے نکل کر ہمارے ذہنوں میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔

(پرکاش فکری)

اپنے آپ کو کبھی کسی چوکھٹے میں اسیر نہیں کیا۔ اُن کی نگاہ منزل پر ضرور رہی ہے مگر اُس کے لئے راستہ انہوں نے خود بنایا ہے۔ انہوں نے کبھی کبھار نعرے بھی لگائے ہیں۔ مگر اُن کی شاعری نعروں کی شاعری نہیں ہے، اُن کے دل کی آواز ہے۔ آپ اُن سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

چند سال سے میں دیکھ رہا ہوں کہ جاں نثار غزلوں کی طرف پھر متوجہ ہوئے ہیں۔ اُن کی حال کی غزلوں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ ہو گیا ہے جو شائع ہونے والا ہے۔ جب جاں نثار فلموں کی دنیا کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ اس دور کے تازہ ترین میلانات سے اور نئی فکر اور نئی حسیت سے لازماً دور ہو گئے ہوں گے مگر اس شاعر کا عجوبہ یہ ہے کہ ایسی کاروباری دنیا میں بھی اُس کی نگاہیں دل کے داغوں پر رہیں اور دل نئی نسل کے احساس کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ یہ غزلیں "شعور" کی اس حکایت اور اس کی بلاغت، اشارات اور ادا کا صحیفہ ہیں۔

حالیؔ و اقبالؔ نے غزل کو حدیثِ دلبراں سے صحیفۂ کائنات بنایا۔ غزل کی بساط بہت چھوٹی ہے مگر اس کی لطیف چاندنی میں معنی خیز اشاروں کی ایک کائنات آباد کی جا سکتی ہے۔ حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور یگانہؔ سب نے غزل کو اپنے خون جگر کی دولت دی اور اِدھر دس پندرہ سال سے جو غزل لکھی جا رہی ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گو غزل ساری شاعری نہیں ہے۔ اور نہ ہمیں اسے اردو شاعری کی آبرو کہتے رہنا چاہیئے مگر یہ ہر دور کے سوز و ساز کو اپنے نشتروں کے ذریعے ظاہر کر سکتی ہے اور ہر سمندر اُس کا تلاطم اس کے کوزے میں آ سکتا ہے۔

میرا کام جاں نثار کی غزلوں کے منتخب اشعار پیش کرنا نہیں ہے۔ ہر شخص کو اس گلدستے میں سے اپنی پسند کے پھول چننے چاہئیں۔ ہاں میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کی یہ غزل اس مجموعے کے رنگ و آہنگ کی جس طرح عکاسی کرتی ہے اور اس سے غزل کے نئے میلان کی جس طرح نمائندگی ہوتی ہے اُس میں غزل کے نئے رشتہ اور اردو شاعری کے جلوۂ صد رنگ کی ایک بڑی خوب صورت اور تابناک کرن سمجھتا ہوں۔

ہر ایک روح میں ایک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے
پسندِ خاطرِ اہلِ وفا ہے مدت سے
یہ دل کا داغ جو خود بھی بھلا لگے ہے مجھے
جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے
میں سو بھی جاؤں تو کیا، میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے
میں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے
دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے
نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے

راستے بدلتی، اور تجربات کو بے روح کرتی چلی آئی ہے۔ جاں نثار اختر کی ندرت کا راز کیا ہے؟ اسے پہچان لینا آسان ہے بیان کرنا دشوار ہے۔ بے شبہ اس غزل میں نئے دور کی کھنک ہے۔ اس دور نے اس حقیقت کو بڑے درد اور کرب کے ساتھ سیکھا ہے کہ دنیا کا سلجھانا آسان نہیں۔ اور مختلف سادہ سے حل مان لینے سے کام نہیں چلتا، اس افراتفری اور بے اماں زندگی میں اگر کچھ کام کا ہے تو صرف احساس کا کھرا پن[1]، اپنے آپ پر بھروسہ کرنے اور اپنی چال چلنے کی لگن[2] اور بڑی مشکل ہے ہاتھ آنے والی بے خبری[3] شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص احساس کے سکہ بند راستوں سے بچ نکلنا بڑی جوکھم کا سودا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب جنوں اور رجائیت کی حکمرانی تھی، ہر موضوع پر نہیں ہر رویے پر بھی مہریں لگی تھیں اب ایسا زمانہ آیا کہ لوگ ذات اور محرومی کے فلسفیانہ خول میں ایسے ڈوبے کہ سکہ بند رویے تک جا پہنچے ہیں۔ جاں اختر کی غزل کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی ہنرمندی سے دونوں سکہ بند رویوں سے دامن بچا گئے اور اپنی شخصیت کے کندن کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے انہیں اس کا اعتراف ہے کہ پرانے حل اور کل کے عقیدے آج انسانوں کے پاؤں تلے سے کھسک رہے ہیں:

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرا دکھائی دیتا ہے

لیکن جاں نثار اختر اس صورت حال پر قانع اور مطمئن نہیں۔ ان غزلوں میں ایک مقدس کرب ہے جو خوابوں کو خواب سمجھنے پر بھی انہی خوابوں کو پلکوں پر سجانے کے لئے بے چین ہے کیونکہ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے وہ ان خوابوں کو نشہ آور دوا کے طور پر استعمال نہیں کرتے لیکن وہ مانتے ہیں کہ انسان کی زندگی ساری رنگینی اور جنوں کی ساری سرمستی جو انہی خوابوں کے دم سے ہے، جب تک ان خوابوں کی حیات آفرینی شامل نہ ہو حیات ادھوری اور ناتمام ہے:

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو، پلکوں کے خواب جتنے ہیں

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

---

[1] پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا، اور اب۔ ایک آدھ بات فرض بھی کرنی لگا ہوں، [2] سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو۔ بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا [3] آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں۔ بڑی مشکل سے میاں، بے خبری آوے ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

جگمگاتی جاگتی نئی آواز

جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا لب و لہجہ پچھلے چند سال کا سب سے اہم اور خوش گوار ادبی حادثہ ہے جاں نثار اختر اُن قدما میں سے ہیں جو قدیم ہونے سے انکار کرتے ہیں جن کی خاموشیاں بھی تھکن کے بجائے فکر کی بلاغت سے معمور ہیں، عین اُس وقت جب اردو شاعری کے مورخ انہیں فیض، مجاز، مخدوم، اور جذبی کے صف میں سجا بنا کر طاقِ نسیاں کی زینت کرنے کی تیاری میں مصروف تھے۔ نقاد اپنی درجہ بندیوں سے مطمئن اور جاں نثار لوازاُن کی خاموشیوں پر قانع ہو چکے تھے بڑے غیر متوقع انداز میں جاں نثار نے پھر نغمہ سرائی شروع کر دی اور تعجب یہ ہے کہ یہ نغمہ سرائی ماضی کا تسلسل یا پرانی دھنوں کی تکرار نہ تھی، ایسے نرالے اور شگفتہ نغموں سے عبارت تھی کہ بس — ! جیسے اپنے نغموں کے مقدس آتش خانوں کی آگ روشن کر کے جل جانے والے مرغ آتش نوا نے دوسرا جنم لے لیا ہو۔ ایسا نیا جنم کہ پرانے جاننے والوں کے لئے بھی یہ یقین کرنا مشکل ٹھہرا کہ کلام کے یہ دونوں رنگ ایک ہی شاعر کی تراوشِ فکر ہیں۔

بات یہ ہے کہ جاں نثار اختر اُن معدودے چند شاعروں میں ہیں جو زندگی کے بارے میں شاعری نہیں کرتے، شاعری کو زندگی بنا کر گزارتے ہیں، وہی اجنبیت، وہی نرمی، وہی معصومانہ حیرت جیسے وہ سر پہ وقت کی تیز دھوپ برساتے ہوئے سورج کے نیچے سے نہ گزر رہے ہوں بلکہ کسی دیوان کے اوراق میں زندہ ہوں، اسی لئے اُن کی زندگی کی نامرادیاں اور کامرانیاں ہیں ایسی کہ جنھیں ایک زاویے سے دیکھئے تو ان پر بڑا پیار آتا ہے اور دوسرے زاویے سے دیکھئے تو غصہ۔ وہ نہ اپنی ذہانت کو نیلام کرنے پر راضی ہوئے، نہ علم کو بوجھ بنانے پر آمادہ ہو سکے اور احساس کے ایک چبھتے رہنے والے نشتر کو زندگی بھر گلے لگائے رہنے کے سبب وہ سوائے اپنے اس بے نام درد کے دنیا کی کسی اور متاع کو خاطر میں نہ لائے

جاں نثار کے نئے لب و لہجہ کا راز یہی بے پایاں گداز ہے جس میں نرمی اور بانکپن تو ہے مایوسی اور محرومی کا ماتم بہت کم ہے۔ جاں نثار زندگی کو عمر کی اُس منزل سے دیکھ رہے ہیں جب اُسے ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے اور بھر پور انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سہ پہر کی دھوپ کی طرح اُس میں اُداسی بھی ہے اور حُسن بھی۔ جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو ایک بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے سکہ بند ردِ عمل (Stock Responses) سے دور ہٹ کر دیکھا ہے اور اس مشاہدے بلکہ تجربے کو بے اختیارانہ بیان کرنے کے لئے ایک نیا شگفتہ اور جاندار پیرایۂ بیان ایجاد کیا ہے۔ یہ "ایجاد" انہیں معنوں میں ہے جن معنوں میں میرؔ نے اپنے شیوۂ گفتار کو اور غالبؔ نے اپنے مکتوب نگاری کے اسلوب کو خاص اپنی ایجاد بتایا تھا۔

غزل میں اس قسم کی "ایجاد" عجائبات میں سے ہے کہ یہ صنف صدیوں سے سرد و گرم جھیلتی اپنے مزاج کے مطابق

غزل کو نئی امیجری دینے کی متعدد کوششیں بے کار ہو چکی ہیں لیکن اس امیجری میں آورد نہیں آمد ہے۔ تجربے کی چاندنی اور احساس کا کندن ہے اسی وجہ سے ماڈرن زندگی کی یہ تصویریں غزل میں نئی بھی لگتی ہیں اور بھلی بھی۔ یہاں ندرت احساس اور جدت ادا لفظ گوئی بن گئی ہے۔

دوسرے شعر میں بات کو سیدھے سادے تشبیہ و استعارے کے پیرائے میں ادا کرنے کے بجائے کسی قدر بالواسطہ انداز میں کہا گیا ہے، یہی نہیں کہ شعر کے جلو میں کھلے آسمان اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی ہریالی آ گئی ہے عشق اور حسن کا ایک نیا تصور بھی جاں نثار اختر کے اسی اسلوب میں سمٹ آیا ہے۔ وہی نیا تصورِ عشق ہے جسے وہ گھر آنگن کی رباعیوں میں جاوداں کر چکے ہیں یعنی ماڈرن زندگی کے پس منظر کا "رکھ رکھاؤ" عشق جسے غم دوراں کے کشمکش نے اور بھی تیکھا بنا دیا ہے۔ عشق و عاشقی کے ان مناظر میں دل موہ لینے والی بے ساختگی اور معصومیت ہے جس کا انداز کچھ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رُک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

لڑکی کی باریک چھری سے کون یہ مجھ تک آ جائے
جسم چرائے نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

حُسن کی ایسی موہنی جھلکیاں خاص طور پر تین چار غزلوں میں بہت اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔ جاں نثار اختر یہاں اپنے لب و لہجہ کی تازگی نئی عشقیہ فضا سے پیدا کرتے ہیں انہوں نے حُسن کے بھولے پن اور عشق کی وارفتگی کو ماڈرن زندگی کے پس منظر میں رکھ کر اجاگر کیا ہے۔

تیسرے شعر کا اسلوب تشبیہ و استعارے سے آزاد ہے اور براہ راست بھی۔ دوسرے مصرعے میں جو زیر دست طنز ہے وہ اس کی چوٹ کو اور گہرا اور اس کے پیرایۂ بیان کو اور دل نشیں بناتا ہے۔ پہلا مصرعہ قاری کو جس قسم کے ردِ عمل کے لئے تیار کرتا ہے دوسرا مصرعہ اس کے بالکل برعکس تاثر پیدا کرتا ہے اور اس تضاد اور تخالف سے شاعر براہ راست بات میں لطیف رمز کا پہلو نکال لیتا ہے۔ یہ ادا بندی کا نیا انداز ہے جسے میری دانست میں جاں نثار اختر نے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

چوتھے شعر کا پیرایۂ بیان اس پیچ سے بھی خالی ہے۔ بالکل سیدھا سادا براہِ راست مگر اس براہِ راست انداز میں جو خوبی پیدا ہوتی ہے اس شعر کے پیچھے تڑپنے والے تجربے سے ہوئی ہے۔ خوابوں کو عزیز رکھنے والے شاعر کے لئے یہ عرفان کی زندگی بھر جیسے متاع بے بہا جانا وہی دراصل زندگی کی ناکامی کا سبب ہے جس کھرے پن پر ساری مسرتیں وار دیں وہی کھوٹا نکلا۔ اس عظیم المیئے نے شعر میں جو خونِ جگر کا رنگ بھرا ہے اُس نے اسے ہر آرائش اور زیبائش سے بے نیاز کر دیا ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری صرف نئے زاویوں سے عبارت ہے نہ محض نئے پیرایۂ بیان سے۔ اس کے پیچھے ایک نئی فضا جگمگاتی ہے، یہاں دلہن کی متلاشی لاشیں بھی ہیں۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں تیز قدموں سے چلنے والے راہی بھی، ہاتھوں پر چھالوں کی طرح چمکتے ہوئے سکے "بھی راتیں گئے" دل کی اُبھرتی ہوئی یادیں بھی ہیں، اخبار و دفتر کی خبریں بھی۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر ساڑیوں کی دکانوں پر رو کنے والی محبوبائیں بھی، غرض ایک عجیب و غریب دنیا ہے جس میں آوازیں ہیں چیخیں، سرگوشیاں اور ارمانوں کے نہ جانے کتنے روپ انگر آباد ہیں۔ یہ دنیا غزل کے دو مشاہیر کی دنیا سے الگ تھلگ اور انوکھی ہے۔ اور اس دنیا کی تعمیر سے اردو غزل کو نئی امیجری نئے لفظیات۔ بغیر ارزانی ہوئی ہیں۔ نئی بحریں بھی ملی ہیں

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں

ایک بھی خواب نہ ہو جن میں وہ آنکھیں کیا ہیں ⁂ اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بسا ڈیار دو
بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی چیخ سہی
ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

دُنیا کی کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں جو خواب سحر ہم

ایسے ہی جانے کتنے اشعار ہیں جن میں زندگی کا حوصلہ، بے اماں حوصلہ موجزن ہے دراصل زندگی کی مسکراہٹوں کو چُن کر خوش ہو لینا اور صبحِ فردا کی اُمید سے آسودہ ہو لینا آسان ہے۔ اور تیرہ بختی اور نامرادی پر خون کے آنسو رو کر مایوس ہو جانا بھی۔ ان دونوں کے آمیزے کو زہر اور امرت کا مرکب سمجھ کر قبول کر لینا بہت مشکل ہے جیاتی سطح کا تجربہ جان لیوا ہے کہ زندگی کا کوئی سکھ دُکھ کے کانٹے سے خالی نہیں اور کوئی دُکھ نشاط کی لطیف سی رنگینی سے معریٰ نہیں اس کا عرفان آسان نہیں ہے اس کا بھوگنا بھگتنا بہت دشوار ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا لب و لہجہ اسی عرفان اور اسی بھگتان کا پیدا کردہ ہے۔

جاں نثار اختر کی کامرانی نئے موضوعات کی تلاش میں مضمر نہیں۔ نئے رویئے اور سچے اور کھرے احساس اور پیرائیہ بیان میں مضمر ہے۔ جاں نثار نے اردو غزل کو نیا پیرایۂ بیان عطا کیا ہے جو پرانے ڈھنگ سے بالکل جُداگانہ ہے۔ اس پیرایۂ بیان کی تین چار رخ ہیں جن کی مثالیں یہاں دی جاتی ہیں۔

۱- پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

۲- برکھا کی تو بات ہی چھوڑو، چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر

۳- ہم نے انسانوں کے دُکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

۴- اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

پہلے شعر کے انداز کے کئی اور اشعار اس مجموعے میں ملیں گے جن میں صرف تشبیہ اور استعارے ہی عام روزمرہ کی ماڈرن زندگی سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ تجربات بھی اسی قسم کے ہیں جن پر شہروں کی نئی زندگی کی پرچھائیاں موجود ہیں۔

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

اختر اور نیا استعارہ

محمد حسین آزاد نے ذوق کے بیان میں لکھا ہے کہ جب وہ اپنا مشہور قصیدہ ع

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر

نظم کر رہے تھے تو ان کا طریقہ یہ تھا کہ شعر کہہ کہہ کر کسی کو لکھواتے جاتے تھے جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ ۔ کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

تمام سننے والوں نے بے ساختہ داد دی۔ ذوق آب دیدہ ہو کر بولے، ہاں میاں میرا بڑھاپا ہے اور اس کی جوانی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برساتی ہوا میں تیزی سے اڑنے والے بادلوں کے لئے فیل مست بے زنجیر سے بہتر تشبیہ یا پیکر مشکل سے دستیاب ہوگا۔ اسی وجہ سے جواں سال اقبال نے بھی یہی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے اڑا لیا ؎

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر   فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

حالانکہ مشاقی اور نومشقی کا فرق واضح ہے اگر ابر جھومتا جا رہا ہے تو فیل بے زنجیر کی صورت اڑ نہیں سکتا۔ جھومنے کی رفتار اور ہے، بے زنجیر دوڑنے کی رفتار اور۔ پھر ہائے کا لفظ یہاں فضول اور محض برائے بیت ہے۔ ان باتوں کا تذکرہ میں یوں ہی نہیں کر رہا ہوں مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ شاعر کی مشاقی میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے اس کے داخلی ارتقا کی بھی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔ اب یہ شاعر کی تقدیر یا اس کی صلاحیت اور قوت پر منحصر ہے کہ اس کا ارتقا عرصہ تک قائم رہے، دیر میں شروع ہو، یا کچھ برسوں ہی میں تمام ہو جائے۔ غالب کو دیکھئے کہ وہ بیس اکیس برس کی عمر میں ہی اپنا بہترین اسلوب دریافت کر چکے تھے۔ اور ان کا بقیہ پچاس سال اسی کو مزید سنوارنے سجانے میں گذرے۔ ان کی صلاحیت اس قدر غیر معمولی تھی کہ دماغی، ذہنی اور تخلیقی ترقی کے وہ مدارج جو دوسرے شعرا سے برسوں میں طے نہیں ہوتے انہوں نے ایک مختصر عرصے میں تمام کر لئے اور اس کے باوجود ان کے یہاں آخر عمر تک کسی انحطاط کا احساس نہیں ہوتا اس کے برخلاف مجاز نے اپنی چھوٹی موٹی شخصیت کے پورے امکانات بہت جلد ظاہر کر دیئے اور اس کے بعد ان کی شاعری کا سرچشمہ ہی خشک ہو گیا۔ راشد آخر عمر تک ترقی کرتے رہے اور اگرچہ ان کی شروع کی نظموں میں بھی حیرت انگیز فن کارانہ بلوغت ملتی ہے لیکن آخر کی نظموں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ "خودکشی" اور "انتقام" جیسی نظموں کا شاعر ہی "اے غزال شب" اور "آرزو راہبہ ہے" جیسی شاہ کار نظموں کا شاعر بن سکتا تھا۔

ترقی پسند شعرا کے ارتقا کی داستان بیشتر الم ناک ہے۔ ان کے سامنے کوئی واضح فن کارانہ معیار نہ تھا۔ بلکہ وہ سماجی اور سیاسی تقاضوں کو فن کارانہ معیاروں کا بدل سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں جو تبدیلیاں

نئی تشبیہیں اور استعارے بھی۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد بھی جاں نثار اختر کی شاعری اور اس کے نئے لب و لہجہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ شاعری کا اگر کوئی اس طرح احاطہ کر پاتا تو شاعری اس قدر مشکل ترین فن نہ ٹھہرتی۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ جاں نثار اختر اپنے نئے زاویوں، نئے پیرایۂ اظہار، نئی امیجری، نئی تہذیبی فضا، نئی پیکر تراشی سے پڑھنے والے میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کر پائے ہیں۔ یا نہیں جو اس کے نزدیک زندگی کی معنویت میں رد و بدل کر سکی۔ کیا ان غزلوں کو پڑھنے، اور ان سے لطف لینے کے بعد عام قاری زندگی کو نئی نظر سے دیکھنے کے قابل ہوگا، کیا اس کی بصیرت اور اندازِ احساس میں کوئی نیا عنصر داخل ہوگا، کیا وہ پرانی چیزوں کا نیا رُخ دیکھ پائے گا، کیا وہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے کو بدلتا ہوا محسوس کرے گا، ایسی تبدیلی جس میں آتشِ رفتہ کا سُراغ بھی ہو اور آنے والی صبح کا نور بھی لیکن ان سوالوں کا جواب کاغذوں اور کتابوں پر نہیں دلوں کے نہاں خانوں اور تنہائی میں گنگنائے جانے والے اشعار میں دیا جاتا ہے کہ یہی ہر کامیاب شعری مجموعے کا پیش لفظ بھی ہوتے ہیں۔ اور اختتامیہ بھی

مجھے یقین ہے کہ یہ جگمگاتی جاگتی نئی آواز جلد ہی اُردو والوں کے اجتماعی لاشعور کا حصّہ بن جائے گی، یہ اشعار زبانوں پر رواں ہوں گے، دلوں میں اتریں گے، خوابوں میں بسیں گے، سینوں میں جلیں گے اور تنہائیوں کو گرمائیں گے اور جھلکائیں گے

فلمی مصروفیتوں کے باوجود آپ کی شاعری

فراق کی ہم پلّہ ہوگئی ہے۔

(کاوش بدری)

کوئی بری چیز نہیں، جب انفرادی سچائیوں کو فروغ ہوگا تو تھوڑی بہت افراتفری بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ افراتفری نظم و ضبط کے منافی ہے۔ سیاسی اعتبار سے تو نظم و ضبط بڑی عمدہ چیز ہے لیکن ادب کا میدان سیاسی اکھاڑا تو ہے نہیں، یہاں تو طرح طرح کی بولیاں رائج ہونا لازمی ہے مشکل یہ ہے کہ سکہ بند ترقی پسندی کا عقیدہ یہ ہے کہ انفرادی سچائیاں ادب سے گزر کر سیاست میں بھی در آتی ہیں حالانکہ یہ خیال درست نہیں، کم سے کم اس حد تک کہ ادب سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی مخصوص عقیدے پر کاربند ہونا ضروری نہیں اگر میں صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی رومی کو، ہندو نہ ہوتے ہوئے بھی گیت گووند کو روسی کیتھولک نہ ہوتے ہوئے بھی دستئفسکی کو پڑھ اور پسند کر سکتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری انفرادی سچائیاں کچھ بھی ہوں وہ دوسروں کی سچائیوں سے اس طرح متحارب نہیں ہوئیں کہ ایک سچائی دوسری کو منسوخ یا مجروح کر دے۔ جاں نثار اختر کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ذاتی طور پر وہ مارکسی ہیں اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سیاست کی سطح پر میرے کیا عقائد ہیں تو میں بلا تکلف دائیں پر بائیں بازو کو ترجیح دوں گا۔ میں خود کو برٹرنڈ رسل کی طرح لبرل سوشلسٹ سمجھتا ہوں۔ (یہ اور بات ہے کہ بائیں سیاسی نقطۂ نظر والے برٹرنڈ رسل کے نام سے بھی اسی طرح بدکیں گے جس طرح سارتر پر لاحول پڑھتے ہیں) لیکن اس بات کی پروا کئے بغیر کہ بعض لوگوں کی نظر میں اظہار ذات یا خودی کی فردیت کا احساس ایک Disruptive رجحان ہے، میں اپنے اس حق کا اعلان کروں گا کہ اظہار ذات اور احساس فردیت پر تمام چیزوں کو مقدم کر دوں۔ میں جاں نثار اختر سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ ساٹھ سال کی عمر میں Generation gap کو پار کر لیں گے اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے سیاسی عقائد ترک کر دیں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنی فردیت کا اظہار اپنے عقائد کے ساتھ ساتھ کریں۔ تاکہ ان کی کوشش اور گراں خواب نقادوں کی بے خبری کم ہو۔

نئی غزلوں کے جاں نثار اختر "گھر آنگن" کے جاں نثار اختر کو اس خیال سے ایک نہ سمجھا جانا چاہئے کہ دونوں میں روایتی جذبے کی جگہ ذاتی جذبے کا اظہار ہے۔ "گھر آنگن" کی شاعری اپنی تمام سادگی اور معصومیت اور بالغ گو پہلوؤں کے باوجود محدود دائرہ کی شاعری ہے اس میں مقامی استعارے کے سوا کوئی وسیع استعارہ یا زندگی کا کوئی پیچیدہ تجربہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف غزلوں میں مقامی استعارہ بہت کم ہے اس کی جگہ وسیع تر استعارہ تلاش کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہے وسیع تر استعارے کی ایک شکل یہ ہے کہ وہ پورے شعر پر محیط ہوتا ہے یعنی پورا شعر ہی استعارہ بن جاتا ہے۔ ایسے شعر میں جو واردات بیان کی جاتی ہے وہ مقامی مفہوم کے ساتھ ایک نسبتاً غیر قطعی مبہم لیکن معنی خیز مفہوم بھی رکھتی ہے۔ اس کی انتہائی صورت (یہ بات ذرا دلچسپ بھی ہے) کافکا کے افسانوی ادب میں نظر آتی ہے۔ انتہائی اسلئے کہ کافکا کے یہاں ابہام کی کثرت اور معنویت کی شدت کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے لیکن مقامی مفہوم تقریباً عنقا ہونے کی وجہ سے وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کو ایک ہیلر "شفاف ابہام" کہتا ہے۔ جاں نثار اختر کے یہاں مقامی مفہوم سے ہی وسیع تر مفہوم بھی حاصل ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل غزل میں مرد کی تنہائی یا اس کی افسردگی (جس میں شکست خوردگی کا شائبہ نہیں بلکہ جو ایک فطری احساس کا حکم رکھتی ہے) مقامی مفہوم ہے ؎

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دکانوں پر

آئیں وہ اکثر خارجی ضرورتوں کے تحت آئیں، فن کارانہ ارتقا کا عالم ان میں نہ تھا۔ شروع شروع میں ترقی پسند شعرا کو سستی رومانی نظمیں لکھنے سے عار نہ تھا۔ مجاز، ساحر، سردار، مخدوم، کیفی، جاں نثار اختر اور خود فیض جوان تمام شعرا کے مقابلے میں جذبات کا بے محابا اظہار بہت کم کرتے ہیں، کوئی اس عیب سے یکسر خالی نہیں، عشق میں انقلاب کی آمیزش ذہنی رویئے میں کسی تبدیلی کی بنا پر نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہوئی کہ خالی خولی عشقیہ شاعری سے کوئی سیاسی کام نہیں لیا جا سکتا۔ غزل سے ترقی پسندوں کا احتراز بلکہ اس کی تحقیر اس بنا پر نہیں تھی کہ اس میں عشقیہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے؛ بلکہ اس بنا پر کہ اختر حسین رائے پوری وغیرہ نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ غزل کا مزاج جاگیردارانہ ہے اس لئے اس کے ساتھ میل جول اچھا نہیں ہے، اسی طرح سردار جعفری نے آزاد نظم کو اردو شاعری کے چہرے پر بدنما داغ اس لئے نہیں کہا کہ اس میں فن کارانہ اظہار کی قوت نہیں بلکہ اس لئے کہ ایلیٹ وغیرہ رجعت پرست آزاد نظم کے داعی اور مبلغ تھے۔ ترقی پسند بالطبع آزاد نظم اور غزل کو قبول کرنے پر بڑی شکل سے راضی ہوئے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ جب آزاد نظم بڑے سے بڑے مغربی ترقی پسند شاعروں نے کھلے بندوں برتنا شروع کر دی اور جب غزل کی کثیر الجہت شاعری کے ذریعہ سیاسی مفاہیم کے اظہار کی آسانیاں نظر آئیں تو ترقی پسند بالطبع کے پاس کوئی چارہ نہ رہا۔ ورنہ اس بات کی کہ ترقی پسند نظریۂ شعر کسی واضح فن کارانہ معیار سے علاقہ نہیں رکھتا، تازہ ترین دلیل اختر حسن کا کیفی اعظمی کی کتاب "آوارہ سجدے" پر تبصرہ ہے جو گفتگو میں شائع ہوا ہے۔ اختر حسن نے کیفی کی خالص سیاسی اور ہنگامی نظموں کے بارے میں دبی زبان سے کہا کہ ان کے جوش اور خلوص میں کوئی شک نہیں لیکن مستقل شعری قدر نہ رکھنے اور محدود حیثیت کی وجہ سے ان کی شاعرانہ قیمت مشتبہ ہے تو اس پر سردار جعفری نے یہ مختصر لیکن تحکمانہ نوٹ دیا ہے کہ ادارہ اس رائے سے متفق نہیں ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ ہر زمانے کی شاعری کی طرح ترقی پسند شاعری کا بھی بڑا حصہ بے جان اور شاعری کے دائرے سے خارج ہے اور ہر زمانے کی شاعری کی طرح ترقی پسند شاعری کا بھی ایک مختصر حصہ نہایت خوبصورت اور اچھی شاعری کے زمرے میں داخل ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ترقی پسند شعرا کی اچھی شاعری ان کے نظریئے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے باوجود ہے، ورنہ نظریاتی حیثیت سے تو اختر حسین رائے پوری کا خیال بالکل درست تھا کہ غزل کا مزاج جاگیردارانہ اور اس کی فکر مائل انحطاط ہے۔ (یعنی ترقی پسند نظریئے کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے) یہ ترقی پسند شعرا کی سلامت طبع تھی جو انہیں کھینچ کھانچ کر کسی طرح غزل کی طرف لے آئی۔ آئے وہ جس راستے سے ہوں لیکن پہنچے ٹھیک جگہ پر۔ کیونکہ غزل نے ان کی شعری کائنات کو اپنی مخصوص وسعت و وقار سے روشناس کرایا۔

کہنا مجھے یہ تھا کہ ترقی پسند شاعروں کے یہاں شعری ارتقا یا انحطاط کی ان منزلوں کو تلاش نہیں کیا جا سکتا جو عام طور پر شعرا کے یہاں نظر آتی ہے ان کے یہاں خارجی دباؤ داخلی ایچ پر اکثر حاوی رہا ہے۔ لہٰذا ان کا میلان کبھی کسی طرف رہا ہے تو کبھی کسی اور طرف۔ ایسی صورت حال میں ان کے بہترین شعرا کے یہاں اچانک شگفتگی کے منظر اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ (شگفتگی یہاں افسردگی کی ضد نہیں بلکہ کھل اٹھنے کے معنی میں ہے) جاں نثار اختر کی تازہ غزلیں اسی کی بیّن مثال ہیں۔

جاں نثار اختر کے بارے میں ایک حالیہ انگریزی مضمون میں کہا گیا ہے کہ وہ مارکسی نظریۂ ادب کے پابند ضرور رہیں لیکن اس پابندی کے باوجود وہ سکہ بند اور مشروط طرز احساس و اظہار کے قائل نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر یہ مضمون اردو میں لکھا گیا ہوتا تو اس میں یہ بات کس طرح کہی جاتی۔ کیونکہ ہماری زبان میں ترقی پسند نظریہ شعر کی جس صورت کو سرکاری ترقی پسندوں نے قبول اور رائج کیا ہے اس کی رو سے انفرادیت بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ انفرادیت Disruption اور انفرادی سچائیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے سردار جعفری کا خیال ہے کہ Conformity یعنی یکسانیت

بوڑھے برگد گاؤں کی سادگی اور قوت کے علاوہ اس کی عارفانہ عقل مندی کی بھی علامت ہیں۔ برگد کا درخت صرف دھوپ سے اماں نہیں دیتا بلکہ اپنی تنومندی مضبوطی اور طویل العمری کی بنا پر ایک طرح کا بلند پایہ Father image بھی ہے اور شہر کی تپتی سڑکوں پر صرف پاؤں ہی نہیں جلتے بلکہ شہری آب و ہوا کی بے مہری اور خود غرضی سارے جسم کو جلا ڈالتی ہے۔ آخری شعر میں پہلے شعر کی لڑکی پھر نظر آتی ہے لیکن اب شاعر کی شخصیت تھوڑی بہت شوخ معلوم ہوتی ہے وہ اسے محبت کا تجربہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ لڑکی ملتفت بھی ہے لیکن معصومیت یا شوخی کی بنا پر وہ ہر بار کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے جو بھی ہو لیکن شاعر تبادلۂ خیال میں ناکام رہتا ہے۔

اس طرح غزل کا مرکزی تاثر جسے تنہائی اور افسردگی کا نام دے سکتے ہیں تجزیئے کی روشنی میں کئی اور طرح کے تاثرات میں بکھر کر غزل کی معنویت میں اضافہ اور خود مرکزی تاثر کی پشت پناہی کرتا ہے۔ غزل کے لئے مرکزی تاثر کوئی ضروری نہیں ہے لیکن اس کا ہونا کوئی عیب بھی نہیں اور اگر مرکزی تاثر مختلف تجربات سے مل کر بنا ہو یا مختلف استعاروں کے ذریعہ ظاہر ہو (جیسا کہ غالب کی غزل مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے میں ہے) تو یہ اس کا بہت بڑا حسن ہے۔ غزل میں جذبے کا اظہار کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ جذبہ سطحی نہ ہو۔ سطحی سے مراد یہ ہے کہ جذبہ ایسا نہ ہو جس تک دست رس بیش پا افتادہ یا عامیانہ الفاظ کے ذریعہ ہی ہو جائے۔ اپنی اوائلی شکل میں اکثر جذبات سطحی ہوتے ہیں لیکن اچھا شاعر ان میں جاں نثار اختر کی طرح مختلف تجربات شامل کر کے اور ان کے لئے طرح طرح کے استعارے تراش یا تلاش کر کے انہیں گہرائی بخشتا ہے۔ نام نہاد اخلاقی یا انقلابی شاعری کا عیب یہ نہیں کہ اس کا جذبہ سطحی ہوتا ہے بلکہ یہ کہ اس میں بیان کردہ جذبہ مختلف النوع تجربات کے ساتھ گھل مل نہیں سکتا۔ وجودی ادب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ وہ اخلاق کا پرچار نہیں کرتا لیکن چونکہ وہ انسان کے ذاتی تجربات و احساسات اور اس کے داخلی مسائل کی گہری چھان بین کرتا ہے۔ اس لئے اس میں بنیادی اخلاق اور انقلابی اقدار نام نہاد اخلاقی یا انقلابی ادب سے زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ ایوتوشنکو Evtushenko کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ لوگ نہیں مرتے بلکہ ان کے ساتھ دنیائیں مر جاتی ہیں۔ ہر ایک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ غالب بہت پہلے کہہ گئے ہیں۔ کارل یاپر مادی دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک تو ذات، دوسرا طبیعی دنیا (شہر درخت پہاڑ دریا وغیرہ) اور تیسرا حصہ وہ تمام ادارے اور سماجی ماحول جو انسان کے ہی خلق کردہ ہیں لیکن جو اپنے خالق کے تابع نہیں ہیں (حکومت، سماجی، تہذیبی اور تمدنی تحریکات وغیرہ) شاعر ذات کا اظہار کرتا ہے لیکن باقی دو دنیاؤں سے غیر متعلق نہیں رہتا۔ نکتہ صرف یہ ہے کہ باقی دونوں دنیائیں شاعر سے اپنا وجود زبردستی نہیں منوا سکتیں بلکہ وہ ان کو برتنے میں آزاد ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ صرف ظواہر اور سطحیات کا غلام ہو کر رہ جائے۔ جاں نثار اختر اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ انسان کی بے چارگی اور قوت دونوں کا احساس رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت حال سے بے خبر نہیں ہیں کہ روحانی سطح پر شکست کھانے کے بعد انسان اپنی تمام تر قوت کے باوجود نطشے کے اس قول کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بدنصیب انسان، تمہارا خدا حافظ پارہ پارہ ہو کر خاک میں لتھڑا پڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف، سانپوں نے گھر بنا لیا ہے۔ اور تم اس کی خاطر ان سانپوں سے بھی محبت کرنے پر مجبور ہو۔ وہ لوگ جو تمام دنیا کی عظیم الشان پیچیدگی کو انقلاب اور رجعت پسندی کے سفید و سیاہ آئینوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں، نطشہ یا یہ بلند لیری سی کربناک روحانیت کو کیا پہنچیں گے۔ ان کے لئے سودا اور مومن کا رد اپنی اظہار بھی بند کتاب کے مانند ہے ؎

سودا:- دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گل دانوں پر

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر

اس کلا کیا من بھید بتائیں اس کا کیا انداز کہیں
بات بھی مری سننا چاہے ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

اب ان اشعار پر فرداً فرداً غور کیجئے۔ جن دالانوں پر نظر پڑتی ہے وہ کسی گھر کے ہیں، ایسے گھر کے جن میں شاعر کسی کے ساتھ رہتا تھا۔ منظر بچپن کا معلوم ہوتا ہے لیکن روشن دالانوں پر کاغذ چپکانے کا کھیل واضح نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ گڑیا گھر کے روشندان ہوں۔ ممکن ہے ذکر بچپن کا نہ ہو بلکہ جوانی کا ہو اور روشندانوں کے شکستہ شیشوں پر کاغذ چپکانا محبت اور مفلسی کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ ممکن ہے روشن دالانوں سے چھنتی ہوئی روشنی کو روکنے سے گھریلو اور مانوس فضا میں نیم روشن خلوت اور دوستی سے بھری ہوئی تنہائی کا احساس مزید کرنا مقصود ہو۔ بہرحال، ان یادوں میں کسی محبوب شخصیت کے کھو جانے کا تاثر ظاہر ہے اور محبوب شخصیت میں معصومیت اور اپنائیت کی بھی ایک ادا ہے جس کی کمی شاعر کو عصر حاضر میں محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں ایسا لگتا ہے کہ وہی معصوم اور محبوب ہستی بچپن یا لڑکپن یا نوجوانی کی منزل سے گذر کر وسط عمر کی بھرپور اپنائیت تک پہنچ کر الگ ہو گئی۔ ساری کی دکانوں پر ٹھٹک کر رک جانا اور یہ محسوس ہونا کہ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گمشدہ ہستی کو حسین ساریوں میں ملبوس دیکھنے کی تمنا تھی جو شاید کبھی پوری نہ ہو سکی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خوبصورت نازک ساریوں کو شوکیس میں سجی ہوئی دیکھ کر شاعر کی چشم تخیل حرکت میں آجاتی ہے اور وہ گمشدہ ہستی کو ان میں ملبوس دیکھ لیتا ہے۔ اب شانے پر رکھا ہوا ہاتھ ایک اور مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ شوکیس میں لگی ہوئی ساری پہلے محبوب ہستی کے بدن پر سجتی ہے، پھر وہ ہستی دوکان سے چل کر خود بخود شاعر کے پہلو میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ گڑیا گھر کے روشندانوں سے جھانکتی ہوئی گڑیاں زندہ ہو جاتی ہیں۔ اور سچ مچ کی لڑکی بن کر آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ تیسرے شعر میں پیتل کے گل دانوں پر کھدا ہوا گم نام نام اسی گم شدہ ہستی کی علامت بن جاتا ہے۔ جس طرح اپنے مالک سے الگ ہو کر گل دان گلی گلی آوارہ ہیں اور ہر اس خریدار کے رحم و کرم پر ہیں جو چند پیسوں کے عوض انہیں خریدنا چاہے لیکن پھر بھی ان پر مالک کا نام منقش ہے اس طرح محبوب ہستی سے جدا ہو کر شاعر کی شخصیت ادھوری اور کم قیمت ہو گئی ہے۔ بقول قائم چاندپوری ؎

ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خاک
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ممکن ہے گل دانوں پر اسی گم شدہ ہستی کا نام منقش ہو اور گل دانوں کا بازار میں آنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ ان کی مالکہ کا سارا اثاثہ تتر بتر ہو گیا اور خود اس کا نام صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے گل دان کسی نے کسی کو تحفۃً دیئے ہوں اور اب تحفہ پانے والی یا والے کے اجڑ جانے یا تقلیب حال کی بنا پر وہ کباڑی کی دوکان پر آگئے ہوں۔ بہرحال، سستے داموں ملنے والے یہ گل دان ہر صورت میں گم شدگی، علیحدگی اور تبدیلی حال کی علامت ہیں۔ اور گم شدگی یا تبدیلیٔ حال شاعر کی تنہائی اور محرومی کا ایک حصہ ہے یا اس میں اضافہ کرتی ہے۔ چوتھے شعر میں جدید تہذیب کے اس بحران کا ذکر ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ دیہات سے شہر کی طرف کشاں کشاں کا مزن ہے

باقر مہدی

نئی غزل

جاں نثار اختر نے غزل کو اپنایا انہیں ورثہ میں یہی غزل ملی تھی مگر وہ ترقی پسندی کے کارواں میں شامل ہو گئے تھے اور اپنی "جڑیں" بھول چکے تھے۔ غزل ہی میں، انہیں اپنی شخصیت کو اُبھارنے کا پہلی بار موقع ملا اور انہوں نے اعتراف کیا ہے

کیا پتہ ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

اور یہیں سے جاں نثار اختر کی نئی غزل کی ابتدا ہوتی ہے۔ نئی میں ان کی نظموں کے مقابلے میں کہہ رہا ہوں بوڑھے اور بچے میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ نیاپن اس میں شامل ہے۔ میری رائے میں شاید ہی کسی اردو شاعر نے اپنی "شاہراہ" کو چھوڑ کر ایک پرانی پگڈنڈی کو اتنے والہانہ پن سے اپنایا ہوگا۔

تو کیا جاں نثار اختر نے "ترقی پسندی" کو ترک کر دیا؟ نہیں[1] ہرگز نہیں ان میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ جسارت کر سکیں وہ تو ترکِ تعلقات کے بعد بھی رسم و راہ رکھنے والے وفادار عاشقوں میں شامل ہیں اس لئے یہیں سے ان کی شخصیت دو نیم ہو گئی ایک ترقی پسندی کی طرف اور دوسری اس کی مخالف سمت یعنی جدیدیت اور اسی کشمکش نے پچھلے پہر کو ترقی پسندی میں جدیدیت اور جدیدیت میں ترقی پسندی کی آمیزش اور آویزش کی نئی داستان بنا دیا ہے۔ پچھلے پہر، میں تین دیباچے شامل ہیں اور تینوں یہ اعتراف نہیں کرتے کہ جاں نثار اختر ایک ڈیلما سے گذرے ہیں۔ مجھے اُمید تھی کہ سرور صاحب دیباچے میں اس کشمکش کا راز بیان کریں گے لیکن انہوں نے صرف ایک اشارہ کیا وہ بھی ادھورا۔

"جب جاں نثار فلموں کی دنیا کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ اِس دور کے تازہ ترین میلانات سے اور نئی فکر اور نئی حسیت سے لازماً دور رہ گئے ہوں گے مگر اس شاعر کا تجربہ یہ ہے کہ ایسی کاروباری دنیا میں بھی اس کی نگاہیں دل کے داغوں پر رہیں اور دل نئی نسل کے احساس کے ساتھ دھڑکتا رہا..."

جاں نثار اختر فلمی دنیا میں، کھونے کی کوشش پیہم کے باوجود بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ انہوں نے فلم بنا کر بھی

---

[1] گیا میں ترقی پسندوں کی کانفرنس مئی ۵۷ میں ہوئی تھی اُس کے منشور پر جاں نثار اختر نے دستخط کئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور عزیز قیسی نے انکار کر دیا۔ قیسی کی تو برسوں کی دوستی کیفی اعظمی سے اس مسئلہ پر ختم ہو گئی — باقر مہدی۔

مومن : درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

جاں نثار اختر اس کرب سے بھی واقف ہیں اور اس دہشت آمیز مسرت سے بھی جو مختلف لمحوں میں انسان کا حصہ ہوتی ہے انسانی وجود اگر کرکگار کے الفاظ میں بیماریِ مرگ Sick ness unto death میں گرفتار ہے تو اس میں شاعر کا قصور کیا ہے۔ اپنے کئے کی ذمہ داری اپنے ہی اوپر ہے اور اندرون ذات کی کرید میں جو بھی ہاتھ آئے اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

کیا ہوئے رات کے راہی　　　　راہ سنسان پڑی ہے

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں　　　　جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں
ہم کو گذری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی　　　　آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے
میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں　　　　تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے !
گذر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح　　　　ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا
ہم سب سے پہلے قتل ہوئے تم گواہ ہو　　　　مرنے پہ دوسروں کو ابھار آئے یہ نہیں

ان اشعار میں جو شخصیت جھلکتی ہے وہ نہ مریضانہ ہے نہ صحت مند، بلکہ شخصیت اس قسم کی لایعنی تفریقات کی سلبیت اور لغویت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ صحت مند ہونا لیکن شاعر نہ ہونا اتنا ہی برا ہے جتنا مریض ہونا لیکن شاعر نہ ہونا۔ شاعر کو شاعر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ زندگی سے واقف ہوتا ہے۔ اپنی شخصیت کے حوالے سے۔ وہ اسی شخصیت کے حوالے سے دوسروں کو بھی ان کی اصلیت سے متعارف کراتا ہے۔ وہ شاعری کیا جسے پڑھ کر ہم اس کے بارے میں تو کچھ سیکھ لیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہ جان سکیں۔ ان معنوں میں جاں نثار اختر کی غزل اردو کی بہترین غزل کی روایات سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ ان کی غزل میں مندرجہ بالا اشعار کی حیثیت استثنائی نہیں، عمومی ہے۔ یہ عمومیت اس بات کی خوشگوار دلیل ہے کہ ان کی شاعری آج بھی روز روشن کی طرح چمک رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ہمارے عہد کی شاعری میں جاں نثار اختر کی غزل اپنی مضبوط انفرادیت، شائستگی اور دروں بینی اور سکہ بند تصورات سے بے خوف ہو کر شاعرانہ اظہار پر اصرار کی وجہ سے نمایاں ہے۔

ایک سفاکانہ کوشش ہوتی ہے تاکہ حقیقتیں ویسی بن جائیں جیسے خواب ہیں یعنی یوٹوپیا کو رد کردو اسی وجہ سے زندگی عذاب بن گئی ہے ایک اور شعر میں خواب کو جاں نثار اختر نے یوں استعمال کیا ہے ؎

نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

——— یہ ایک کھوکھلے آدمی کے بارے میں ہے یعنی لحاظ سے جاں نثار اختر نے تین لفظ استعمال کئے ہیں اور تینوں رخ، سے شروع ہوتے ہیں یہاں خواب مستقبل کے معنی میں ہے۔ خلش حال اور خمار ماضی کی یاد ——— ایک اور شعر میں خواب اور ہی معنی اختیار کرلیتا ہے ؎

آنکھوں میں جو بھرلو گے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں!

یعنی خوابوں کو آنکھوں کی بینائی نہ بناؤ ان سے صرف کاجل کا کام لو۔ اب تک ترقی پسند خوابوں کے ذریعہ سے دیکھتے تھے اور اسی لئے ان کا مشاہدہ سوویت مارکسزم کی رومانی نقل ہوا کرتا تھا اور رہے۔ مگر وہی بات ——— کشمکش، ترقی پسندی اور جدیدیت کی جان لیوا کشمکش اور جاں نثار اختر کا پرانا ترقی پسند لب ولہجہ جاگ اٹھتا ہے

دنیا میں کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں جو خواب و سحر ہم

جب کہ انہیں معلوم ہے کہ ؎

کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

رات ہی رات ہے باہر کوئی جھانکے تو سہی
یوں تو آنکھوں میں سبھی خواب سحر رکھتے ہیں

——— جاں نثار اختر سے پہلے کسی ترقی پسند شاعر نے اتنی بے باکی سے عقائد کی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا فیض نے کہا تھا ؎ بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے ——— اور میں اسی لئے جاں نثار اختر کی غزلوں کو شعری تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت دیتا ہوں تاکہ کل کا مورخ جدیدیت پر عقائد سے بیزاری کے ساتھ سارے پہلو دیکھ لے اور یہ جان لے کہ

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے

——— لیکن محمد حسن نے جرأت سے کام نہیں لیا ورنہ وہ دیباچہ میں اس کشمکش کا ضرور ذکر کرتے اور اس طرح خود ان کے تنقیدی سانچے پر آنچ آجاتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے کئی سیمینار پچھلے دو ایک برس میں ہوئے ہیں لیکن ان میں کہیں بھی جاں نثار اختر کا برائے نام بھی ذکر نہیں ہے۔ عصری ادب کے نئے شمارے ۲۱/۲۲ میں کئی مضامین ترقی پسند نثر و نظم کے بارے میں ہیں مگر جاں نثار اختر کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے نئی علامت نگاری (ڈاکٹر محمد عقیل کی تصنیف) پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں مخدوم، سردار جعفری، کیفی اعظمی، سجاد ظہیر اور ساحر کی نظموں میں علامت نگاری کا ذکر نہیں ہے سجاد ظہیر کا بحیثیت شاعر ذکر پر اصرار ہے۔ مگر جاں نثار اختر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ

نقصان اٹھایا اور انہیں مجروح اور ساحر کی طرح نہ شہرت ملی نہ ثروت اسی لئے انہوں نے اپنی ان کوششوں کی ناکامی کا نہایت خوبصورت انداز میں یوں اعتراف کیا ہے ؎

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

البتہ سرور صاحب نے جاں نثار اختر کی غزلوں کے ایک اہم پہلو کی بابت صاف انداز میں لکھا ہے ۔

———— آزاد ذہن کے لئے حریت فکر کے لئے نئے نئے دام ہیں۔ لفظوں کے معنی بدل دیئے گئے ہیں جمہوریت کے ہم جو معنی سمجھتے تھے اب اس سے بالکل مختلف معنی پر کچھ ارباب اختیار اصرار کرتے ہیں۔ افکار و اقدار کا ایک طلسم ہوش ربا بنا دیا گیا ہے جس کی روح گم ہو گئی ہے ۔ اب جاں نثار اختر کا یہ شعر دیکھئے ؎

ترانے کچھ دیئے لفظوں میں خود کو قید کرلیں گے
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے

(دیباچہ پچھلے پہر ص ۷)

جاں نثار اختر کا یہ شعر خاصا پہلو دار ہے اس کی کئی سطحیں ہیں ایک تو سیاسی جس کی طرف سرور صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ دوسری نفسیاتی یعنی آدمی کو کیپسول میں بند کرنا اور رنگ برنگے لیبل لگا کر اس کی شناخت کرنے کی اشتہاری کامیاب کوششیں اس کے علاوہ " ترانے[1] " کے لغوی معنی سے انحراف ہے اور اس انحراف نے اس کے طنز کو گہرا اور تاثر کو پائیدار بنایا ہے۔ اس سے پہلے جاں نثار اختر کے کلام میں الفاظ اپنے لغوی معنوں سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے مگر جب سے انہیں احساس ہو چلا ہے کہ ؎

پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا اور اب
ایک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں

اور ایسا کیوں ہوا ہے اسی غزل میں ان کا جواز ایک اور شعر میں مل جاتا ہے ؎

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

———— مگر " پچھلے پہر " کے ایک اور دیباچہ نگار، ترقی پسند ناقد (اور میرے دوست) ڈاکٹر محمد حسن نے خواب کے سلسلے کے شعر تو نقل کر دیئے مگر جاں نثار اختر کے یہاں عقیدوں کے ٹوٹنے والے خواب اور شاعرانہ خواب میں جو نمایاں فرق ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے خواب کے سلسلے کے شعر ملاحظہ ہوں ۔

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

یہ خواب Night mares ہیں اسی لئے شاعر ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے یہ آئیڈیل کی شکست کے خواب ہیں اور اس میں ایک پہلو اور بھی نہاں ہے خوابوں کو حقیقت بنانے کی سعی لاحاصل ہی حقیقت کو مسخ کرنے کی

---

[1] سلیمان حیم نے اپنی فارسی اردو اور انگریزی لغت میں ترانہ کے تین معنی دیئے ہیں، نغمہ، سمفنی اور ایک خوبصورت نوجوان (ص ۲۳۳)

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا　　یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

جاں نثار اختر نے یہ کہہ کر ہر رنگ کے سیاست والوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور جدیدیت کی ایک اہم خصوصیت کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ممالک میں آرٹ اشیاء کی طرح رسوا ہوا اور اشتراکی ممالک میں کمیونسٹ بیوروکریسی کا پروپیگنڈہ کرنے میں بدنام ہوا۔ غرض کہ آرٹسٹ جہاں بھی سچائی سے اپنے فن کی حفاظت کرتا ہے رسوا ہوتا ہے۔ کوئی ترقی پسند کبھی خواب میں بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا لیکن جاں نثار اختر نے پہلی بار دنیا کو کسی عینک کے بغیر دیکھا ہے۔ اسی لئے وہ بغیر جھجک کے کہتے چلے جاتے ہیں ؎

جل گیا اپنا نشیمن تو کوئی بات نہیں　　دیکھنا یہ ہے کہ اب آگ کدھر لگتی ہے
ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے　　ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

"پچھلے پہر" میں جاں نثار اختر نئے بانکپن سے ابھرے ہیں۔ اُن کا عشق بھی "خاکِ دل" کی نظموں سے بہت مختلف ہے۔ ان کے اشعار میں جنسی تلذذ، حسن کی ادائیں اور عشق کی سرشاری کا ایک نیا سنگم ملتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاص قسم کا PATHOS جس کے بغیر اتنی تاثیر نہ ہوتی۔

"پچھلے پہر" میں جاں نثار اختر نے اپنے عشق کی کہانی نئے انداز سے دہرائی ہے اور اس والہانہ پن سے معرکۂ حسن و عشق کا بیان کیا ہے کہ جو ان پھڑک اٹھیں اور پیر کروٹ بدل کر پھر جاگتے رہیں ؎

اک جاں گداز نشہ رگ رگ پہ بس گیا
سارے بدن سے رات کوئی مجھ کو ڈس گیا
آنکھیں اٹھیں تو درد کے چشمے ابل پڑے　　پلکیں جھکیں تو پیار کا بادل برس گیا
دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے　　بانہوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

یہ بھرپور عشق ان کی نظموں میں نہیں آیا تھا گو کہ "گھر آنگن" میں ایک گھریلو قسم کا عشق ملتا ہے اور ایسا خوبصورت صرف لمساتی تجربے کی سچائی تخلیق کر سکتی تھی ؎

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں　　تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

اور حسن کا یہ دیدنی منظر ؎

شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اس کمال سے تو نے بدن چرایا ہے

یہ شعر ایک تجربہ کار عاشق ہی کہہ سکتا تھا۔ اس لئے کہ جاں نثار اختر جنس کی اہمیت سے واقف ہیں ؎

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی　　ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں۔

اور اس عشق کی داستان پچھلی کہانیوں سے مختلف ہے ؎

لہ اس کی تفصیل مارکسی مفکر آرٹسٹ فشر کی مشہور کتاب "آرٹ بمقابل آئیڈیولوجی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

پچھلے پہر، سے ترقی پسند ناقدوں کو خاصا صدمہ پہنچا ہے اور وہ اب جاں نثار اختر کی غزلوں کے ذکر سے کترانے لگے ہیں مگر جاں نثار اختر کو اب معلوم ہو چکا ہے ؎

یہ دوستی یہ مراسم یہ چاہتیں یہ خلوص — کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے۔

اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے — سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار — سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

بہار آئے چلی جائے پھر چلی آئے — مگر یہ درد کا موسم نہیں بدلنے کا

سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا ہم کو — بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

اور جاں نثار اختر کا یہ شعر سردار جعفری[1] کے شعر سے کتنا مختلف اور پُراسرار ہے ؎

سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو — سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

اسی طرح جعفری نے کہا تھا وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقے کا غرور ـــــ مگر جاں اختر نے اسی کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے ؎

ہائے اس وقت کو کوسوں کہ دعا دوں یارو
جس نے ہر درد مرا چھین لیا ہے مجھ سے

جاں نثار اختر کی غزلوں میں الفاظ کی پرکھ کا بھی خاصا چرچا ہے انہوں نے اپنے دو شعروں میں یوں بحث چھیڑ دی ہے : ؎

ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے
برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

سو بار کے دہرے ہوئے لفظ نہ دہرا — الفاظ ہوں بے جان تو کچھ بات بنے نا

میں نے شروع ہی میں ذکر کیا تھا کہ الفاظ کے لغوی معنی سے انحراف اسی وقت شروع ہوتا ہے جبکہ شاعر ایک تجربے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے اور اُسے جزو شاعری بنانے کی تخلیقی عمل سے گذارتا ہے۔ جذبات اور احساسات کے لمسی تجربوں کو نئے تراشیدہ الفاظ میں سمونا بازی گری نہیں ہے اس سے پہلے جاں نثار اختر کی شاعری میں یہ یہ احتیاط و ضبط، یہ کفایت اور کیفیت نہیں تھی اور اس جوہر کے اظہار کے لئے انہیں غزل کا سہارا لینا پڑا۔ انہوں نے پہلی بار اپنی نظم گوئی کی شہرت کی پروا نہیں کی اور غزل کے تقاضوں کی ترتیب بدل دی یعنی اپنے دور کا مرثیہ لکھا مگر اسے لازم نہیں بننے دیا اور سینہ کوبی کرکے رحم طلبی کے خواہاں ہوئے ؎

---

[1] جعفری کا شعر: دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال — اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

روایتی آہنگ کی گونج بھی ہے، پھر بھی پچھلے پہر، میں جاں نثار اختر نے خودشناسی کے فرض کو انجام دیا ہے اور میری رائے میں وہ خاصے کامیاب ہیں مستقبل میں ان کا مقابلہ فراق کی غزلوں سے کیا جائے گا۔ اور کہیں کہیں فراق کا اثر بھی عیاں اور پنہاں ہے۔ میری رائے میں یہ خود "پچھلے پہر" کی کامیابی کی دلیل ہوگا۔!

(ماخوذ)

عام ہندوستانی زندگی مروّجہ بلکہ عام کلاسیکی زبان اور لہجہ کے مقابلہ میں اپنی ایک الگ زبان اور ایک الگ انداز بیان چاہتی ہے جو اس کی انفرادی حیثیت کو نمایاں کرسکے اور وہ بھی اس نرمی اور لوچ کے ساتھ جو اس کی تبدیلی کے مختلف پہلوؤں کو اسی کے انداز میں ظاہر کردے یعنی اس طرح کہ اوپر کی ملائمت اور خنکی اندر کی فولادیت اور تپش کا احساس دلادے۔ میں سمجھتا ہوں جاں نثار اختر کی نئی غزلوں میں ہماری زندگی کو اپنی دل پسند زبان اور من چاہا انداز بیان مل گیا ہے۔

(پروفیسر عالی جعفری)

راس اب آئے گی اشکوں کی نہ آہوں کی فضا
آج کا پیار نئی آب و ہوا مانگے ہے

اور جنسی تلذذ کو فن کاری کا درجہ دینا خاصا دشوار مرحلہ ہے ۔ یہ اشعار اس مرحلے سے گذرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ؎

چبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بند قبا رات گئے
آؤ ہم جسم کے شمعوں سے اجالا کر لیں
چاند نکلے گا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے

مگر یہ تو جوانی کی یادیں ہیں اب تو صرف قدموں کی آہٹ آتی ہے ؎

تو نہ اب آئے تو کیا آج تلک آتی ہے
سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے

جاں نثار اختر اپنے عشقیہ لمحات کی بازیافت بار بار کرتے ہیں اور کس شوق کے ساتھ ؎

تمام نشۂ ہستی تمام کیف وجود
وہ ایک لمحہ ترے جسم کے پگھلنے کا
اب تو ہر جنبش مژگاں کو سمجھ لیتے ہیں
پہلے واقف تھے کہاں رمز و کنایات سے ہم

اور یہ شعر کتنی تازگی رکھتے ہیں ؎

میں تم سے دور رہتا ہوں تو میرے ساتھ رہتی ہو
تمہارے پاس آتا ہوں تو تنہا ہوسا جاتا ہوں
میں چاہے سچ ہی بولوں ہر طرح سے اپنی باتیں
مگر تم مسکراتی ہو تو جھوٹا ہوسا جاتا ہوں

یہ عشق کی نفسیاتی پیکر کشی ایک مدت تک اپنا نشہ رکھے گی اور نہیں معلوم ہے کہ یہ نشہ کیوں اتنا پُرکیف گہرا اور دیرپا ہے ؎

ہر لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے
یہ طرز یہ انداز سخن ہم سے چلا ہے

"پچھلے پہر" کی غزلوں میں ردیف کی خوبیاں بھی قابل توجہ ہیں "کے دیکھ ذرا" "سا لگے" "ہو سا جاتا ہوں" "ہے بہت دن ہم نے" "دنا" "ہم نہ کہتے تھے" "ہم نہیں کہتے" "اس قدر" "یہ مت کہنا" "آئے یہ نہیں" وغیرہ — میرا خیال ہے ان غزلوں کے حسن کو دوبالا کرنے میں ان نئی ردیفوں کا بھی بڑا دخل ہے ۔ مگر سب سے اہم بات وہی فن کاری ہے اور جاں نثار اختر کی یہ غزلیں ۔ فیض، جذبی اور مجروح سے بہت مختلف ہیں ان غزلوں کا جدید غزل سے مقابلہ نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ جاں نثار اختر اپنی آزاد خیالی کے باوجود ایک ترقی پسند روایت کا پاس رکھنے والے نظم گو شاعر ہیں ۔ ان غزلوں کی زبان میں تازگی ضرور رہے مگر

"نظارگی" کے نہیں پس نظارہ کے شاعر بن گئے ہیں۔ اس طرح کی کاوشیں خاص کر غزل میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ادب عالیہ کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں

انقلاب فرانس سے لے کر تقسیم ہندوستان کے مناظر تک نظروں میں گھوم جاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد سیاسی اور تہذیبی زندگی میں اتنی زبردست تبدیلیاں آئیں کہ ان کو تاریخی پس منظر میں سمجھنا یا پیش کرنا ہر ادیب و شاعر کے بس کی بات نہیں رہی۔ برسوں بعد کچھ ایسے ناول لکھے گئے جن سے صورت حال کی قدرے وضاحت ہوئی۔ بے شمار مسلّمات اور مفروضات آن کی آن میں یکسر نقوش باطل ہو گئے۔ نئے تصادم و پیکار نے یوں سر اٹھایا اور نئے سماجی حالات کچھ یوں معرض وجود میں آئے کہ برسوں نالوں و فریاد کا شور سنائی دیا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ ادباء اور شعراء نے اس بدلی ہوئی اور پیچیدہ صورت کو شعوری طور پر جزو فکر بنانے کی کوشش کی۔ کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ ناکام ہی رہے۔ خاص گروہ جو سطحی واقفیت پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

اسی افراتفری کے باعث فراق جیسے عالم غزل نگار بھی بس تلملا کر رہ گئے۔ ہندوستان میں اتنی بڑی تبدیلی آئی تھی نئے اقدار دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ لیکن جیسے کہ فراق کا ارتقائی سفر ختم ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک تو انہوں نے زیادہ لکھا نہیں اور لکھا تو ان کی واقعاتی فضا تقریباً وہی رہی جو اس عظیم واقعے سے قبل تھی۔ اُن کے یہاں کوئی بھی امیجری ایسی نہیں ملتی جسے ہم اُن کی بات کی ذہنی کیفیت سے [illegible] کر سکیں۔ اُن کی نثری تحریریں البتہ نئی صورت حال کی عکاس رہیں۔

یگانہ پہلے ہی گوشہ نشیں ہو چکے تھے اور جو کچھ غزل کی اندرونی ساخت اور تیور کو انہیں متاثر کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ اس عہد کے نامور شعرا میں جگر سب سے کم پڑھے لکھے تھے۔ وہ نہ صرف حسن و عشق کے مسائل میں اسیر تھے بلکہ اُن میں اُپج اور تجربے کی صلاحیت بھی برائے نام ہی تھی، پھر بھی اپنے محبوب دائرۂ فکر میں رہ کر انہوں نے نئے ماحول کی جھلکیاں دکھائیں۔

"آتش گل" کی غزلیں حسرت و فانی کی غزلوں سے زیادہ تر و تازہ ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جن شعراء نے غزل کے ذریعہ اپنے دکھ درد کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ان میں جذبی اور مجروح اہم ہیں۔ مجاز نے بھی کوشش کی لیکن وہ اپنا توازن اُس وقت تک کھو چکے تھے۔

بات یہ ہے کہ بقول مجنوں گورکھپوری تخلیقی فن ایک مرکب اور پیچیدہ جدلیاتی عمل کے ذریعہ حقیقت کو جنم دیتا ہے۔ اس کی صلاحیت جن شاعروں میں ہوتی ہے ہم انہیں فراموش نہیں کر سکتے۔ خواہ انہوں نے بہت کم لکھا ہو یا اس کا بیشتر حصہ ادبی معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ جذبی میں فکر کا عنصر نہایت لائق قدر تھا لیکن آخر کار وہ بھی

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں،

کہہ کر نیم خاموشی کے عالم میں پہونچ گئے۔ مجروح نے زیادہ نہیں لکھا ہے لیکن ہماری غزل کو ایک ایسا بانکپن اور ایسی فکر انگیز تازگی دی ہے جس کے خم و پیچ دراصل ابھی تک داد طلب ہیں۔ ایسی ہی منفرد شعراء میں ناصر کاظمی بھی ہیں۔ تقسیم ملک کا المیہ اور اس کے فوراً بعد کی ذہنی کیفیات کے نقوش ایک ملائم لہجہ اور نئی جمالیاتی حیثیت کے

حسن نعیم

پچھلے پہر کی غزلیں

زندگی بھر مصائب سے نبرد آزما رہنے اور "لطفِ زندگی" حاصل کرنے کے بعد جاں نثار اختر گویا "معرفت کی اسی منزل پر پہنچے جو ان کے لئے دراصل اعتراف کی ایک صورت ہے۔

تمام عمر کی نظارگی کا حاصل ہے،
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے یہاں

جاں نثار جیسے قادر الکلام شاعر سے تو میں توقع نہیں کرتا کہ انہوں نے بے خیالی یا عجز بیان کے سبب اپنے مطلب کی ادائیگی کے لئے "نظارگی" کے لفظ کو چنا ہوگا۔ کیونکہ شاعر کی نگاہ کو پس نظارہ بھی دیکھنا چاہیئے تھا۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ دراصل یہ ایک قسم کا اعتراف ہے۔ جو ممکن ہے غیر شعوری ہو، بہر حال "وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے۔" میاں کا ٹکڑا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ پس نظارے کے کوائف و حقائق سے آشنا ہو چکے ہیں اور ان کی حالیہ شاعری سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور اب اپنے ذاتی تجربوں کے واسطے سے اپنے عہد کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اُن کا یہ شعر بھی ان کی گذشتہ شاعری کے پس منظر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

چند لفظوں میں آگ چھپانے کا فن بڑی ریاضت کے بعد آتا ہے، جاں نثار اختر نے بھی بے شمار آزمائشوں سے گذرنے کے بعد اس فن کو قابو میں کیا ہے۔ عمر کی اس منزل تک پہنچنے کے بعد کم لوگوں کو فکر رہتی ہے کہ جہانِ تازہ کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ "پچھلے پہر کی غزلیں" ان کی فنی ارتقا کی محض چند جھلکیاں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی کچھ اور دیں گے۔ جو کچھ نظر کے سامنے ہے وہی تحسین و مرحبا کے لئے کم نہیں۔ لیکن مجھ جیسے رجائیوں کے لئے ابھی یہ اسٹیج ہے کہ

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ اُمید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

الفاظ کو اس کے وسیع معنوں میں برتنے اور ان کی تاریخی شخصیت کو پرکھنے پر انہیں پہلے ہی قدرت تھی۔ اب وہ اپنے ذاتی تجربوں کے معانی کو سمیٹنے اور اپنی فن کارانہ شخصیت کو اُجاگر کرنے پر بھی قادر ہو گئے ہیں۔ یعنی اب

بھاری بھرکم خیالات کشور آقت نے بھی غزل کا روپ دیا ہے۔ لیکن پھیکے انداز میں، ان میں فنکارانہ دروبست یا
نازک قطعیت نہیں اسی لئے وہ محض موزوں اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ جاں نثار اختر نے جلبنی تلذذ اور بدن پرستی کو
بھی غزل کا آرٹ بنا کر پیش کیا ہے۔ یوں تو جدید تر غزل میں بھی بدن، خوشبو، نین اور آنچل وغیرہ کی بہتات ہے لیکن وہاں
حسن بیاں کا دامن چھوٹ جاتا ہے اس موقعہ پر میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ گو مجھے
جاں نثار اختر کے جمالیاتی حسن سرور و محفوظ کرتی ہے لیکن وہ دانشوری کی روایت کو اپنی غزلوں میں وہ مقام و مرتبہ
ابتک نہیں دے رہے ہیں۔ جس کی توقع (خاص کر ان کی ترقی پسندی کے پس منظر میں) کم از کم مجھے ان سے ہے۔

ان غزلوں میں تنوع کی بھی کمی نہیں اور یہ صفت آج کے بہت کم غزل نگاروں میں ہے۔ وہ ابھی تک
لیکن یہ طے نہیں کر پائے ہیں کہ۔ ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے۔ یا دل میں کچھ درد چمکتے ہیں۔ اُجالوں کی طرح۔ ہر غزل نگار
کو اس بات کی تھوڑی بہت چھوٹ ہے لیکن لطف اس میں ہے کہ پڑھنے یا سننے والوں کو یہ احساس نہ ہو کہ شاعر ہر قماش کے
قارئین کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ محسوس یہ ہونا چاہیئے کہ جس وقت جو بات بھی زبان سے نکلی ہے وہ بے ساختہ ہے
بہرحال آپ ان کے چند اشعار پڑھئے جو مختلف وجوہ کی بنا پر مجھے پسند آئے ہیں۔

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

کس عقیدے کی دوہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

کوئے قاتل کی بڑی دھوم ہے۔ چل کر دیکھیں
کیا خبر، کوچۂ دلدار سے پیارا ہی نہ ہو

ہم سے مایوس نہ ہو اے شب دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اُجالوں کی طرح

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

سستے داموں لے تو آتے، لیکن دل تھا بھر آیا

جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

جو لوگ جاں نثار اختر کی زندگی اور ان کی جدوجہد سے واقف ہیں انہیں

ساتھ اُن کی غزلوں میں اُبھرے۔ ان کے اشعار میں گو کہ عام طور سے اتنی بھی نہیں جتنی کہ یگانہ۔ فراق۔ جذبی اور مجروح کے نمائندہ اشعار میں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی حزن میں ڈوبی ہوئی آواز سنہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس کی سچی آواز ہے۔

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرس گل اُداس کر کے مجھے
میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے سحر کے قافلے مجھے

ناصر کاظمی نے لیکن ان توقعات کو پورا نہیں کیا جو ان سے وابستہ ہو گئی تھیں ان کی عام فکری سطح وہی رہی جو اوپر کے اشعار میں ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں سے پوری ایک نسل کو متاثر کیا لیکن بعد میں جدید ذہن رکھنے والے شعراء اُن کی طرف دیکھ دیکھ کر اُداس ہوتے رہے۔

آج کی غزل کو نئی فکری جہتوں اور نئے استعاروں سے روشناس کرانے میں درجنوں چھوٹے بڑے شعراء نے حصہ لیا ہے۔ جن کے تفصیلی ذکر کا یہ موقع نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۵۲ء تک غزل کی مجموعی فضا بدل چکی تھی۔ اور تعطل ٹوٹ چکا تھا۔ مشہور ترقی پسند شاعروں میں جنھوں نے بطور نظم نگار معروف ہونے کے بعد غزل کی طرف توجہ کی۔ اُن میں فیضؔ اور ندیمؔ بطور خاص مشہور رہیں۔

فیضؔ نے لیکن زیادہ مقبولیت اور شہرت پائی۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں جب ان کا مجموعہ "دستِ صبا" بازار میں آیا تو وہ اُس وقت اسیر زنداں تھے۔ اس لئے بھی یہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسی لئے ہمارے بیشتر نقاد جن کا مطالعہ ناقص اور جن کی نظر کوتاہ ہے وہ نئے غزل کے ارتقا میں جذبی۔ مجروح۔ کاظمی۔ عزیز حامد مدنی اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کی کاوشوں کو نظر انداز کر کے یا تو ان کا رشتہ فیض سے جوڑتے ہیں یا بہت بعد کے ذہین شاعر ظفر اقبال سے، اور کم سے کم دو درجن شعراء ایسے ہیں جنھیں یقین ہے کہ یہ طرزِ سخن انہیں کی ایجاد ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب غزل سر پر چڑھ کر بولنے لگی تو ۱۹۵۷ء کے لگ بھگ مخدوم محی الدین اور پرویز شاہدی نے بھی اس چیلنج کو قبول کیا۔ مخدوم نے لیکن فیض ہی کے رنگ میں ساری غزلیں کہی ہیں، البتہ پرویز شاہدی نے، جنھوں نے غزل ہی سے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ اپنا ایک دانشورانہ رنگ ایجاد کر لیا تھا۔

اسی ترقی پسند قافلے کے ایک اہم شاعر جاں نثار اختر ہیں۔ جنھوں نے گذشتہ چار پانچ برسوں میں وہ غزلیں کہی ہیں جو پچھلے پہر میں شامل ہیں۔ یہ غزلیں باقی تمام ترقی پسند شاعروں کی غزلوں سے باعتبار مزاج و مواد مختلف ہیں بلکہ فکری اور موضوعی اعتبار سے جدید تر نسل کی غزلوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اس سلسلے میں سب اہم اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جاں نثار اختر پہلی بار اپنی انفرادیت کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور ان کی حسن بین نگاہوں نے ایک دلکش رنگ تغزل کا جلوہ دکھایا ہے۔ ایسے خیالات و احساسات جن کے بھرپور اظہار پر نمائندہ نئے شعراء کو قدرت نہیں۔ جاں نثار اختر اپنے اسلوب سخن میں انہیں یوں ڈھالتے ہیں کہ اُن پر سہل ممتنع کا گمان گذرتا ہے۔ ہر خیال یا تجربے کو پڑھنے کے لائق شعر بنا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ کس پھول سے کیا لے کر عطر کشی کرنا چاہئے اس کا سلیقہ بڑے بڑے استادوں کو نہیں آتا تھا۔ غالب بھی اس کے بعد دو دو ایک کام کے شعر کہہ سکتے تھے۔

فضیل جعفری

صحرا میں لفظ

ادھر چند برسوں سے اردو شاعری کے قارئین اور ناقدین میں جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے جو ایک خاص طرح کا تحیر آمیز احساس انبساط اور جوش نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کی نئی غزلیں ان غزلوں کے موضوعات اور ان کا بدلا ہوا لب و لہجہ ہے۔ اگرچہ ان غزلوں کا مجموعہ پچھلے یہی مئی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس مجموعے میں شامل غزلیں، یہ غزلیں پچھلے چار، پانچ برسوں میں مختلف رسائل میں شائع ہوتی اور لوگوں کو متوجہ کرتی رہی ہیں، خود جاں نثار اختر کی نیز ان کے ہم عمر و ہم عقیدہ شعراء کی شاعری کے پس منظر میں ایک نئی قسم کی ذہنی تازگی اور نفسیاتی بصیرت کا احساس دلاتی ہیں۔ ان غزلوں میں وہ اپنی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں اور گوشوں کو از سر نو دریافت کرتے۔ اور نہایت ہی آسودہ خاطری کے ساتھ ان کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے بہت سے ساتھی شاعروں کے برخلاف اپنی شاعری کو ماند (STALE) ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

جاں نثار کی شاعری کا آغاز اب سے کوئی چالیس سال پہلے سنہ ۱۹۳۵ء کے آس پاس ہوا۔ یہ زمانہ شعری اور فنی اعتبار سے ہمہ جہتی اسالیب کا زمانہ تھا۔ ایک طرف اقبال اور جوش کی اونچی آواز والی شاعری دوسری طرف اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی مخصوص لہجہ والی عشقیہ شاعری اور تیسری طرف ترقی پسند شاعری کی گھن گرج۔ جاں نثار کے نوجوان ذہن نے ابتداء ہی میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے جوش کے اور لہجے کی رومانیت کے اعتبار سے اختر شیرانی کے اثرات قبول کئے۔ ان کی ابتدائی شاعری کے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

یہ زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے خانہ بدوش
کچھ نہیں تو کم سے کم رکھتے ہیں آزادی کا جوش
خاک کے سینے میں پنہاں ہیں دبی چنگاریاں
جاگ جائیں گی کبھی سوئی ہوئی خودداریاں

کانپ جائے گا کبھی قصرِ تمدن کا چراغ
موم کی مانند پگھلے گا امارت کا دماغ
یہ زمیں ہل جائے گی، یہ آسماں ہل جائے گا

محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے بیشتر اشعار auto - biographical ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تاثیر ہے۔ جمال تخصیص میں حسن تعمیم کے جتنے بھی پہلو نکلیں، غزل کی فضا کو راس آتے ہیں۔

صبح کی آس کسی لمحہ جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

خدا کرے یہ کیفیت ان کے یہاں اور بڑھے۔

جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ذہن کے دریچوں کو نئی ہواؤں کی تازگی کے لئے کھلا رکھا ہے مگر اس کے مسموم اثرات کو داخل نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے کلاسیکی روایات کو سینہ سے اس طرح لگا رکھا ہے جیسے کوئی اجداد کی صالح قدروں اور روایات کو حرزِ جاں خیال کرتا ہے۔

(ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی)

جاں نثار کی کامیاب ترین نظموں کے بارے میں استفسار کیا جائے۔ تو وہ اسٹالین اور روس کو سلام کے نہیں بلکہ خاک دل اور خاموش آواز کے نام لے گا۔ یہ نظمیں جیسا کہ سردار جعفری تک نے اعتراف کیا ہے۔ اردو شاعری میں نئے اور مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خاک دل سے دو بند ملاحظہ ہوں۔

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن۔

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دفن ہیں اس میں محبت کے خزانے کتنے
ایک عنوان میں مضمر ہیں فسانے کتنے۔
اک بہن اپنی رفاقت کی قسم کھائے ہوئے
اک ماں مر کے بھی سینے میں لئے ماں کا گداز
اپنے بچوں کے لڑکپن کو کلیجے سے لگائے
بند آنکھوں میں بہاروں کے جواں خواب بسائے

یا آگے چل کر صفیہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

اے مری روح چمن خاک لحد سے تیری
آج بھی مجھکو ترے پیار کی بو آتی ہے۔
زخم سینے کے مہکتے ہیں تری خوشبو سے
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے

خاک دل اور خاموش آواز میں جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ جاں نثار نے اپنی ڈرامائی غم اور صفیہ کی محبوب شخصیت کو موضوع بنایا ہے۔ یہی وہ نظمیں ہیں، جن میں جاں نثار نے پہلے پہل اپنے آپ کو دریافت کیا۔ اور پایا۔ یہ نظمیں الفاظ اور معنی کی ہم آہنگی اور ارتباط نیز شعری اتمام کا اعلیٰ مرقع ہیں۔ ان دونوں نظموں اور چند دوسری نظموں مثلاً آج کی رات اور ملاقات وغیرہ کا اسلوب، لفظیات، تکنیک، وسیلۂ خیال پیش کشی کا انداز سب کچھ جاں نثار کا اپنا ہے اور اس پر کسی دوسرے شاعر کی چھاپ نہیں۔ ان نظموں نے انھیں اس حصار سے آزاد کیا جس میں انھوں نے اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کی شاعری کا یہ رنگ نکھرتا گیا۔ خود آگہی بڑھی اور اشیا کا ایک نیا عرفان حاصل ہوا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے۔ اور انھیں یہ کہنا پڑا کہ :-

محلے کی سیاست پہ نظر رکھتے ہیں۔
ہم سے دیوانے بھی دنیا کی خبر رکھتے ہیں۔

یہی وہ خصوصیت ہے جو جاں نثار کو ان کے ترقی پسند رفیقوں سے بالکل الگ کرتی ہے۔ جب انھیں سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کے بکھر جانے کا احساس ہوا۔ اور پتھر جیسے مضبوط عقیدے ریت کی دیوار ثابت ہوئے انھیں نئے اور جان لیوا حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تو جاں نثار کا شعری ذہن خیالات کے قدیم خطوط کی آہنی گرفت سے آزاد ہوتا گیا۔ ان حالات میں انھوں نے اپنے دوسرے ساتھی شاعروں کی طرح مسلسل جھوٹ بولنے اور اپنے آپ کو نیز دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں بلکہ ایک ایماندار اور باہوش فنکار کی طرح عقائد کی شکست، انسانی زندگی کی

اک نیا پرچم ہوا کے دوش پر لہرائے گا

(خانہ بدوش)

سینوں میں لرزنے لگی ایمان کی بنیاد
آنے لگا فرسودہ عقائد کو خدا یاد
اب مذہب و ملّا کا ہے اللہ نگہبان
بیدار ہے انسان

(بیدار ہے انسان)

اگر پہلے بند میں "پنہاں ہیں دبی چنگاریاں" کی ترکیب کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو یہ دونوں بند براہ راست تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی اسلوب بیان لفظوں کے انتخاب اور تراکیب کے لحاظ سے جوشؔ کی انقلابی شاعری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ اثر دوسری کئی نظموں مثلاً بگولا، جہاں میں ہوں، آج اور کل وغیرہ پر بھی بہت نمایاں ہے۔ اسی طرح پچھلی پریت ایک وادی سے گزرتے ہوئے۔ "یاد ہے اب تک" "جمنا کے کنارے" بھولا ہوا افسانہ "ان کی ہم شکل سے اور دوسری کئی رومانی جذبات والی نظموں پر جوشؔ اور اختر شیرانی کے ملے جلے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں بعض ایسی غزلیں اور نظمیں مل جاتی ہیں۔ جو ان کے بنیادی شعری مزاج کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا پہلا اور آخری شعر نقل کرتا ہوں۔

دور کوئی رات بھر گاتا رہا۔ تیرا ملنا مجھکو یاد آتا رہا۔ ہم نہ آئے پھر چمن میں لوٹ کر مدتوں گل یار یار آتا رہا۔ یا پھر ان کی مشہور نظم گرلس کالج کی لاری۔ یہ نظم حسینوں سے جاں نثار اختر کے شغف کو ہی نہیں ظاہر کرتی بلکہ اس زمانے کے کلچر اور معاشرہ کے ایک اہم اور حقیقی پہلو کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اس نظم کی تازگی اور تاثر میں کمی نہیں آئی اور یہ بیشتر قارئین کے ذہنوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ اسی بیچ جب ترقی پسند تحریک کے اچھے برے اثرات پھیلے اور تحریک کے جاہ و جلال نے بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دئے۔ تو جاں نثار بھی اپنے اندر کی شاعری سے نظر بچا کر بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ ایک عرصہ تک وہ اسی راستے پر چلتے رہے۔ جس پر فیضؔ، مخدومؔ، سردار جعفری، مجروحؔ، مجازؔ، احمد ندیم اور کیفی اعظمی وغیرہ کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی کے ساتھ گامزن تھے۔ ہمیں جاں نثار یا کسی اور ترقی پسند شاعر سے بھی یہ شکایت نہیں رہی کہ انھوں نے ایک خاص قسم کی شاعری کیوں کی۔ اس زمانے کا شعری محاورہ وقت اور حالات کے لحاظ سے یقیناً ایک مناسب اور فطری ردعمل تھا۔ ہمیں اعتراض ان حضرات پر ہے جو پچھلے چالیس سال سے ایک ہی ڈھرے کی شاعری کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ دوسروں سے اسی قسم کی شاعری کا تقاضا کرتے ہیں انقلابی یا کسی اور طرح کی شاعری کمبل کی طرح اوڑھی نہیں جا سکتی۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آدمی اپنے معاشی، سیاسی، سماجی یا اخلاقی عقائد کو پابندی کے ساتھ نظم بھی کرے۔ لیکن ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ہمارے ادبی رہنما شاعری کو عقائد کی انگلی پکڑا کر نہ صرف چلاتے رہے بلکہ اسی کو سب کچھ سمجھتے رہے۔ چنانچہ جاں نثار نے بھی یانگ سی کی موجوں سے، بیانہ سرخ، روس کو سلام ستاروں کی صدا، اسٹالین اور ایسی بہت سی دوسری نظمیں لکھیں۔ لیکن اس میدان میں انھیں کوئی نمایاں کامیابی نہیں ملی۔ ان نظموں کو زیادہ سے زیادہ ان کی قادرالکلامی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ دراصل ان کا شعری مزاج کبھی بھی اس قسم کی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ جو ان کی داخلی نہیں بلکہ سماجی ضرورت تھی۔ آج اگر کسی عام قاری سے

اشارہ کرتے ہیں۔ وہ موجودہ انسان کی ناآسودگی، سیاست کی بازی گری اور درندگی اور شب و روز کے اجاڑپن کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ان تمام دکھی انسانوں، واقعات، حادثات سے اپنے آپ کو شناخت (IDENTIFY) بھی کرتے ہیں یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

لاکھ آوارہ سہی شہروں کے فٹ پاتھوں پہ ہم
لاش یہ کس کی لیے پھرتے ہیں ان ہاتھوں پہ ہم
کوئی آتا نہ ہوگا لاش بھی لے جاکے دفنا دے
انھیں سڑکوں پہ مرجائے گا انساں ہم نہ کہتے تھے

زندگی تنہا سفر کی رات ہے ؛ اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے
نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی دیتا ہے
رات کے پیچھے رات چلے ؛ خواب ہوا ہر خواب سحر

یہ تمام اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ جاں نثار حقائق پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ انھیں اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی ان کی روشن ضمیری اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ لیکن جاں نثار کی تمام کی تمام غزلیں اسی ایک پہلو سے عبارت نہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اس قسم کے لمحات کو بہت زیادہ طول نہیں دیتے۔ بلکہ جلد ہی اپنی شاعری کا رخ خالص داخلی اور تخلیقی تجربوں کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

اس خالص داخلی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ مگر ان میں ایک خوبصورت اور بھرے پرے بدن والے محبوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نسوانی حسن اور اس سے متعلق ایک حسین جسم کے لیے جاں نثار ایک خاص نگاہ رکھتے ہیں۔ ادب پچھلی دو خصوصیتوں کی طرح یہ خصوصیت بھی انھیں اپنے ساتھی شعراء سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کا یہ شعر جسم کی ہر بات ہے آوارگی یہ مت کہو۔ ان کے ساتھیوں کے غیر فطری رویہ پر بھرپور طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں جاں نثار کا اپنا رویہ وہی ہے جو ذہنی اور جسمانی طور پر ایک صحت مند انسان کا ہو سکتا ہے۔ یہ رویہ ہے جنسی اضطراب کی تکمیل کے لیے اپنی ذات سے باہر کسی اور ذات کی تلاش کا یہ اضطراب اپنے نکتہ عروج کو اس وقت پہنچتا ہے۔ جب یہ تخیل کی حدود سے نکل کر جسمانی اطمینان کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ اور کبھی کبھی احساس جرم میں بدل جاتا ہے۔ لیکن ہر حال میں وہ محبوب کی ذات سے مکمل طور پر اپنی شناخت کر کے ان تجربوں کو بالیدگی اور پاکیزگی عطا کر دیتے ہیں۔ اس پورے تخلیقی عمل کی کہانی پڑھنی ہو تو مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے۔

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

ہر ایک رات نشہ میں ترے بدن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کے صراحیاں ہم سے

کی ارزانی اور بے حرمتی، بے پایاں افلاس (جس کی ذمہ داری صرف سرمایہ دار پر نہیں بلکہ پورے سماج پر ہے) اور صنعتی شہروں کی ہولناکیوں کو بنیاد بنا کر کچھ ایسے ردِ عمل کا اظہار کیا جس کی مثال کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ ملاحظہ ہو۔

اب انھیں باتوں کو سنتے ہیں تو آتی ہے ہنسی
بے طرح ایمان لے آئے تھے جن باتوں پہ ہم
وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

ترانے، کچھ دئے لفظوں میں خود کو قید کر لیں گے
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے۔

وہ تندروقت کی رو ہے کہ پاؤں رک نہ سکیں
ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے
شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

ٹھوس اور خوفزدہ کر دینے کی حد تک تلخ حقائق کے مظہر یہ شعر جاں نثار کی ذہنی خود مختاری کا پتہ نہیں دیتے۔ بلکہ ہر قسم کی سیاسی حدود سے نکل کر عالمی انسانی آگہی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ اشعار اپنی سیاسی اور سماجی ماہیت کے باوجود کتابی نہیں۔ بلکہ معروضی، شخصی، بیانات ہیں۔ اور بنیادی طور پر یہ وہی شعری رویہ ہے۔ جس کے لئے نئے شاعر بدنام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جاں نثار اپنے ادبی کیریئر کے کسی بھی اسٹیج پر کٹر قسم کے عقیدہ پرست نہیں رہے۔ انھوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ ہر زمانے اور ہر کلچر میں محض ایک ہی طرح کی قوت انسانی فلاح و بہبود کا سہارا بن سکتی ہے۔ تبھی تو وہ ہر طرح کے ذہنی تحفظ کو بالائے طاق رکھکر اس طرح کے شعر کہہ سکتے ہیں۔

ایک ہے زمیں تو سمت کیا حدود کیا
روشنی جہاں بھی ہو روشنی کا ساتھ دو
جہاں بھی تھک کے کوئی کارواں ٹھہرتا ہے
وہیں سے ایک نیا کارواں چلا ہے میاں!

جاں نثار اختر کی شاعری کا جو مجموعی پیٹرن ہے۔ اس پیٹرن میں انسانی روح کی محرومیوں اور درد مندی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ فرد جہاں کسی ایک فرد یا کسی ایک سسٹم سے تعلق نہیں رکھتیں۔ بلکہ عام انسانی زندگی میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ محض ذاتی محرومیوں کا احساس اور ذکر شاعری میں خود ترحمی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں حقیقی شاعر آفاقی حقیقتوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور اس طرح خود ترحمی، نیز دماغی الجھن اور ہیجان سے خود کو بچا لیتا ہے۔ شعری کردار کی تعریف اسی میں ہے کہ شاعر اپنے ذاتی دکھ درد میں ساری دنیا کے غموں کو اس طرح نہ ڈبو دے کہ حقیقت سے دور ہو جائے۔ جاں نثار اختر شعر کی شخصی اور غیر شخصی تحریک (MOTIVATION) میں ہم آہنگی اور امتزاج کی تلاش کرتے ہیں ان کے کئی اشعار آج کی انسان دشمن دنیا میں عام انسانوں میں پائی جانے والی ذہنی برگشتگی اور پراگندگی کی طرف

عزیز قیسی

جاں نثار اختر اور غزل

جاں نثار اختر اور غزل دونوں ہزار شیوہ ہیں۔ دونوں ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے ہیں اور ریشہ ریشہ منضبط ہیں۔ دونوں میں غم و نشاط بیم و رجا غرض مندی و بے پروائی قلندری اور دنیاداری بڑے سلیقے سے موجود ہیں

میں اُن کی شاعری سے ۱۹۴۷ء سے واقف ہوں۔ اُن سے ۱۹۵۷ء کے بعد قربت ہوئی۔ میں اُن کی غزل کا قائل تھا لیکن "پچھلے پہر" کی اشاعت کے بعد اُن کی غزل کا عاشق ہوا ہوں۔

۱۹۴۸ء میں جب فرسٹ ایر کا طالب علم تھا اُن کا مجموعہ کلام "سلاسل" جن کا ذکر بہت کم ہوتا ہے میری نظر سے گذرا تھا۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں غالباً خاکِ دل میں شامل ہیں۔ سلاسل میں ایک نظم تھی۔ کون سا گیت سنوگی انجم۔ میں نے وہ نظم انجم کی جگہ اپنی محبوبہ "جاں نواز" کا نام لکھ کر ایک محبت نامہ میں بھیجی تھی۔ اس طرح میں جاں نثار اختر (حقیقی میں اختر بھائی کہتا ہوں) کا شاگرد ہوں (اگرچہ شاگردِ رشید نہیں)

ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو میں ہائی اسکول کے زمانے سے پڑھتا رہا ہوں لیکن اختر بھائی کو اس وجہ سے زیادہ توجہ سے پڑھتا رہا کہ میرے "عشقِ نوخیز" پر ان کا احسان رہا ہے۔ دوسرے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی طرح، ایک عقیدے، ایک ایمان اور ایک آدرش کی تبلیغ و تکمیل کے لئے اپنے فن اور اپنی زندگی کو وقف کر دینے کی شہرت نے اوروں کے ساتھ ساتھ اختر بھائی کو بھی میری نظروں میں محترم بنا دیا تھا۔ اور یہ احترام اور بڑھتا گیا یہاں تک کہ میں نے انہیں ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ دیکھا، اُن سے ملا۔ یہ وہ دن تھے جب اختر بھائی "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" کے وسیلے سے نوجوانوں میں خاص طور پر لڑکیوں میں بے حد مقبول تھے۔ اور ترقی پسند تحریک سے متاثر لوگوں کے ذہن میں ان کا (Image) زیرِ لب میں مذکور اس شاعر کا تھا جو ایک آدرش کے لئے بھوپال جیسے پُرسکون شہر کو، کالج کی پروفیسری جیسی باوقار ملازمت کو اور صفیہ جیسی وفاکیش بیوی کو ـــــ بمبئی کی پُرعذاب زندگی کھنگتنے کے لئے چھوڑ آیا تھا۔

میں اس وقت تک بہ حیثیت شاعر (مقامی طور پر) مشاعروں کا مقبول شاعر بن چکا تھا اور مشاعروں کو ہی ادب میں وسیلۂ نجات و ذریعہ شفاعت سمجھتا تھا (اب تک ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی یہی سمجھتے ہیں) حیدرآباد کے اس مشاعرے میں اختر بھائی کی (Per formance) اچھی نہیں رہی یا اُن کے تعلق سے سامعین کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ اختر بھائی نے متاثر نہیں کیا۔ شاید میری پسند بالغ ہو چکی تھی یا شاید اس وقت ترقی پسند تحریک کے اترنے نکل

جاں نثار اختر

پھیھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بند قبا رات گئے

تمام نشۂ ہستی، تمام کیف وجود
وہ ایک لمحہ ترے جسم سے پگھلنے کا

اک جاں گداز نشہ رگ و پے میں بس گیا
سارے بدن سے رات کوئی مجھکو ڈس گیا

دل کا یہ حال کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی جرم ہوا مجھ سے

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے

جاں نثار اختر کی خالص 'داخلی شاعری کے اور بھی کئی مناظر ہیں۔ یہاں ان پر تفصیلی تبصرہ ممکن نہیں۔ اگر ان پہلوؤں کو ایک فقرہ میں ادا کرنا ہو تو یوں کہوں گا کہ ان کی حالیہ شاعری جدید داخلی حسیت سے عبارت ہے۔ وہ روایت سے بھرپور واقفیت رکھتے کے ساتھ ساتھ حال میں اور حال کے ساتھ جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی آواز ان کے اپنے تجربوں کی آواز ہے۔ جو انھیں نہ تو دوسرے ہم عصر شعرا سے مقابلے کے لیے اکساتی ہے۔ اور نہ ہی دوسروں کو ان کے مقابل آنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ آواز انھیں یہ کہنے کا حق بھی دیتی ہے۔

شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں کچھ نوجوانوں کے بیچ

اس شعر کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی محفل میں جاں نثار پیر مغاں بنے بیٹھے ہیں۔ بلکہ یہ شعر اس ذہنی اور فنی تبدیلی کا آئینہ دار ہے جس سے جاں نثار اختر کی شاعری پچھلے چار پانچ برسوں میں دوچار ہوئی ہے اور یہی وہ شاعری ہے جو انھیں اپنے ترقی پسند شاعروں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔

کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کے بدلے میں آخرت بیچ دی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں انھیں آپ جانتے ہیں۔ جاں نثار ان میں سے ہرگز نہیں ہیں، اگر ہوتے تو یہ ہرگز نہ کہتے۔

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
جانتے ہوں یا نہ ہو پہچاننا مشکل نہیں
ملتی جلتی ہے ہر اک قاتل کی صورت اس قدر
انعام ہو خطاب ہو، ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے
اور کیا ہے سیاست کے بازار میں
کچھ کھلونے سجے ہیں دوکانوں کے بیچ

کہنے اور کرنے کا تضاد اور ضمیر اور اظہار کا یہ تصادم، صاحبانِ اقتدار سے تحائف اور تعلق ناگزیر ہے۔ آدمی جب غزل کہنا چاہے اور فلمی گانا لکھنا پڑے یا کسی پارٹی کے نعرے نظم کرنے پڑیں۔ (یہ اور بات ہے کہ گانا لکھنے کو اور کسی پارٹی کے لئے نعرہ نظم کرنے کو بعض شاعر شاعری کی معراج سمجھتے ہیں اور کسی اخبار کی خبر یا کانفرنس کے منشور پر شعر کہنا ایمان کی صلابت کا ثبوت سمجھتے ہیں) اُس اذیت کے احساس کی زہرناکی جاں نثار کے اس شعر میں موجود ہے ؂

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

اس تصادم کے جاں نثار بھی شکار ہیں جو اہلِ دل کا مقدر رہے۔ جاں نثار کو احساس ہے کہ زندہ رہنا کس دردناک مسلسل موت کا پیغام ہے۔

پچھلے پہر کی غزلوں کے آئینے میں جاں نثار کو ترقی پسند ثابت کرنے والے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہہ کے اُنھیں ترقی پسند ثابت کر سکتے ہیں اور جدیدیت کے علم بردار اس مجموعے کو دستاویز بنا کے انہیں جدید بنا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آل احمد سرور کی طرح فرمائیں گے کہ:۔

> جاں نثار نے نئے کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی ...... مگر اُن کا نیا پن نہ فیشن کے لئے ہے، نہ فارمولے کی خاطر۔ اور نہ یہ مختلف ہونے پر نازاں ہے۔ یہ مختلف بھی ہے اور منفرد بھی اور ان کے ساتھ اپنی پناہ میں غالب، حسرت، اقبال کو جذب کئے ہوئے ہے ..... ہاں اس کے ساتھ اس میں روح کا ماجرا ہے، حال کے ذہنی سفر کی داستان ہے، زندگی کی موجودہ موڑ پر انسانیت کے کرب کی کہانی ہے۔ دورِ حاضر کا علم ہے، اس لمحے کا عرفان ہے اور زندگی کی لامعنویت کے ساتھ اس کی عظمت کا رجز ہے۔

آل احمد سرور کی یہ رائے صد فیصد فیشن اور فارمولے کی رائے ہے ایسی diplomatic

رہا تھا اور یہ بت شکنی کی لہر رہ رہ کے دل میں اُٹھتی تھی۔ اختر بھائی کے لئے جو جذبۂ احترام میرے دل میں تھا کم ہوگیا
سنہ ۵۶ء کی اس ملاقات کا اثر تھا کہ جب میں بمبئی آیا تو جی نہیں چاہا کہ اختر بھائی سے ملوں۔ یوں کسی ادبی
نشست، کسی مشاعرے، کسی محفل میں یہاں وہاں اختر بھائی نظر آتے رہتے۔ سلام و دعا سے آگے بات نہ بڑھی وہ تعلق
جو احسان مندی اور احترام سے شروع ہوا تھا محض رسمی جان پہچان تک رہ گیا۔

سنہ ۵۸ء سے سنہ ۷۰ء تک بارہ برس کا زمانہ ادب میں بھی طوفانی رہا ہے۔ اور میری زندگی میں بھی
یہ عجیب زمانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے یہ مدت ایک بگولے میں گذاری ہے۔ اس مدت میں اختر بھائی سے
بے تعلق نہیں تھا، یوں بھی نہیں تھا میں انہیں ناپسند کرتا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں انہیں کم تر درجے کا شاعر سمجھتا تھا
میری دوری کا سبب ایک تو خود اپنی کم آمیزی تھا۔ دوسرے اختر بھائی کے تعلق سے ایک احساس تھا کہ اختر بھائی
شخصی طور پر Independent آدمی نہیں ہیں۔ وہ اپنے سے کم تر درجے کے شاعروں کی تعریف و توصیف
میں لگے رہتے ہیں انہیں قطعی اس بات کا بھی احساس نہیں کہ وہ ایک دن گذارنے کے لیے اور ایک شام کاٹنے کے لئے
بڑے گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔

سنہ [illegible]ء میں اُن کے قریب آنے کے بعد اُن کے تساہل کو سمجھنے کا اُن کی بے پروائی کو دیکھنے اور ان کی غرض مندی
کو جاننے کا موقع ملا۔ تب یہ نکتہ کھلا کہ وہ کیا ہیں؟ اور یہ غریب غزل کے وسیلے سے ہوا جو اُن کی شاعری میں ایک نئے اور
خوبصورت موڑ کی طرح آرہی تھی۔

سنہ [illegible]ء کے بعد پتہ نہیں کب اور کیسے مجھے یہ عرفان ہوا کہ ایک دن اور ایک رات کیا ہے اور اُن کی قیمت کون
کتنی ادا کرتا ہے اور کیوں ادا کرتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات کے بدلے میں کیسے کیسے خسارے برداشت کرنے پڑتے ہیں، اس
کے بعد میں جاں نثار سے قریب تر ہوتا گیا اور خود جاں نثار بھی اُن حالات سے دور ہوتے گئے۔ جن کے سبب میں اُن کے
قریب جانے سے ہچکچاتا تھا۔

دن اور رات گزارنے کا جبر ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی کے اختیار میں
نہیں ہے لیکن اس بات کا احساس کہ یہ جبر ہے اور ہم اپنے ضمیر کے خلاف یہ جبر سہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ایک فنکار کی
پہچان ہے۔ غالب مدح ابن جناب و قصیدۂ آں جناب کو اتنی اہمیت دیتا تھا کہ ایک ہی قصیدہ کا ممدوح امجد علی شاہ
سے بدل کر واجد علی شاہ کر دیتا تھا۔ یہی خسرو نے کیا۔ خسرو کو یہ احساس تھا کہ

"میں اپنے سرکش نفس کی وجہ سے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں اور
جب تک سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہ بھیگ جاؤں میرا ہاتھ کسی کے پانی سے تر نہیں ہوتا ......

میری حالت اُس گدھے جیسی ہے جو اتنی مشقت اور رنج سے چارہ لادکر لاتا ہے اور تھوڑا سا جو اُسے دیا جاتا ہے وہ
بھی ذلت کے ساتھ۔ جو کے چند دانوں کا حصول کتنا پر نازک ہے۔ اس کڑوے گھونٹ کی تلخی، محسوس کرنے والے
فن کار کے فن میں آتی ہے جن کو کسی نہ کسی شکل میں Establishment سے ہاتھ ملانا پڑتا ہے

لیکن وہ لوگ جو قصیدہ کہنے کو بادشاہوں کی مصاحبت کو، انعام و خلعت کو خطاب و لقب کو اپنی معراج
سمجھتے ہیں، صاحبان اقتدار کی مدح سرائی کو ایمان کا درجہ دیتے ہیں وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو سیاندار یا بعیت
تو ہو سکتے ہیں، فن کار نہیں۔ وہ غالب اور خسرو نہیں، شیخ ابراہیم ذوق اور انشاء اللہ خاں انشاء ہیں اور رہیں

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہونگا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

اگر ان اشعار میں زبان گھٹی ہوئی نہ ہو اور احساس کی شدت نہ ہو (جو فیشن کی ضد ہے) تو ان اشعار کے سپاٹ ہونے میں اور غزل کو اسمٰعیل میرٹھی ہونے میں بس پلک جھپکنے کی دیر تھی۔

جاں نثار کی غزلوں میں جہاں زبان کی شیرینی، کلاسیکی دروبست اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو پورے خلوص و صداقت سے ظاہر کرنے کا انداز ملتا ہے۔ وہیں ان کے بعض اشعار دل نشیں ہوتے ہوئے بھی ہلکے ہیں۔ جاں نثار کہیں عشق میں "بالغ" نظر آتے ہیں تو کہیں ان کی عمر بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لئے ہیں

سانس ویسے ہی زمانے کی گھٹی جاتی ہے
وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہے

زلفیں، سینہ، ناف، کمر،
ایک ندی میں کتنے بھنور

ویسے عموماً ان کے اشعار میں ایسی فنکاری اور بے اختیاری کے نمونے ملتے ہیں۔

لچک رہی ہیں شعاعوں کی سیڑھیاں پیہم
فلک سے کوئی اترتا دکھائی دیتا ہے

پھرے ہیں راتوں کو آوارہ ہم، تو دیکھا ہے
گلی گلی میں سماں چاند کے نکلنے کا

کیا غم اگر تلی ہیں سنانیں تلی رہیں
ہر موڑ پر کفن کی دو کانیں کھلی رہیں

میں نے جاں نثار کی شاعری میں "اضداد" کا ذکر کیا ہے۔ یہ ذکر غزل کا ہے۔ جاں نثار کی غزل میں بیانیہ اشعار زیادہ ہیں لیکن شدت احساس، تجربے اور مشاہدے کی زہرناکی کے سبب ان غزلوں میں بعض اشعار بڑے پہلو دار ہیں۔ لاش کا لفظ دیکھئے کتنے پہلو سے استعمال ہوا ہے۔

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

فن اور شخصیت

رائے کسی بھی شاعر کے بارے میں دی جا سکتی ہے۔

جاں نثار کی شاعری پر دوسری رائے ایک اور موقر نقاد کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

" جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے سکہ بند ردعمل stock Responses سے دور ہٹ کر دیکھا ہے اور اس مشاہدے اور تجربے کو بے اختیارانہ بیان کرنے کے لئے نیا شگفتہ اور جاندار پیرایہ بیان ایجاد کیا ہے۔ یہ ایجاد انہیں معنوں میں ہے جن معنوں میں میر نے اپنے شیوۂ گفتار کو اور غالب نے اپنی مکتوب نگاری کے اسلوب کو اپنی خاص ایجاد بتایا تھا"

(ڈاکٹر محمد حسن)

اچھا ہوا کہ جاں نثار نے اپنی غزل کی شاعری کو اپنا اسلوب خاص نہیں کہا جو انہوں نے ایجاد کیا ہے۔

جاں نثار تو یہ کہتے ہیں کہ

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاس روایات کرے ہے

جاں نثار نے کسی پیرایۂ بیان کو، غالب کی مکتوب نگاری کی طرح ایجاد نہیں کیا۔ غزل جتنی روایتی صنف سخن ہے اُن کا پیرایۂ بیان بھی اتنا روایتی ہے۔ انہوں نے صرف غالب، اقبال اور حسرت کو جذب نہیں کیا ہے، اردو فارسی کے ہر بڑے شاعر سے لے کر اختر شیرانی، جوش اور فراق تک کو جذب کیا ہے اور خود اپنے آپ کو اپنے تجربے اپنے مشاہدے زبان کے علم اور بیان کی قدرت کو، اپنے حافظے کی پہنائی اور ادراک و احساس کی تلخی اور شیرینی کو اپنی غزل میں جذب کیا ہے، جہاں وہ کہتے ہیں۔

اے دہر! ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں
چپ ہے ہر زخم گلو، چپ ہے شہیدوں کا لہو
دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صلا مانگے ہے
جب لگے زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اُٹھا دی جائے

جاں نثار کے لہجے میں غزل کی روایت چھپائے نہیں چھپتی وہ کیسا ہی غیر روایتی مضمون ہو ان کا انداز بیان روایت سے لگا کھاتا ہے اس لئے جاں نثار کی غزل میں نیا لہجہ فیشن کے طور پر نہیں آ سکتا، یہاں تک جب وہ ایسی لفظیات کو برتتے ہیں جنھیں غزل کی روایت برداشت نہیں کر سکتی تب بھی تغزل ہاتھ سے نہیں جاتا۔

پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

ماچس اور بوتل غزل کی "برادری باہر" قسم کے لفظ ہیں۔

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

عمیق حنفی

ہر قول معتبر سا لگے

تیئس چوبیس برس پہلے رتلام میں ایک کل ہند مشاعرہ تھا۔ جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ کی شرکت متوقع تھی۔ اتنے ڈھیر سارے مشاہیر کو ایک ہی مشاعرے میں سننے کا موقع ان زمانے کے مالوے میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ میں چھاؤنی میں رہتا تھا اور روزانہ کالج اٹینڈ کرنے کے لئے ٹرین سے اپ اینڈ ڈاؤن کیا کرتا تھا چودہ میل آنا اور چودہ میل جانا۔ "سفر ارادہ نہیں تھا سفر مقدر تھا"۔ اس وقت جو افتاد مجھ پر پڑی وہ اکہری تھی دہری نہیں تھی، یعنی شعر سنتا اور پڑھتا تھا، کہتا نہیں تھا۔ ردیف کی چمک اور قافیے کی کھنک پیدا دیتے دیتے جی اوب سا گیا تھا۔ فیض، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، مجاز، راشد وغیرہ کا کلام ایک دل کش نئے پن کا احساس ضرور دلاتا تھا اور عمر کے تقاضوں کے عین مطابق بھی تھا۔ خیر۔ چند ہمدرسوں اور دوستوں نے طے کر لیا کہ چار پانچ گھنٹے کا سفر کر کے گئے اور رتلام میں مشاعرہ سنیں گے۔ گئے۔ مشاعرہ سنا۔ اس تہذیبی ادارے کو تفریحی وسیلہ بننے کی طرف مائل بہ زوال ہونے میں ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس مشاعرے میں جاتا ہوا اور آتا ہوا زمانہ گلے ملتا نظر آ رہا تھا۔ اس مشاعرے میں پہلی بار ایک شاعر کو دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا جس کی سینچی ہوئی آواز، دہکتی ہوئی آنکھیں، بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال اور سر تا پا چھائی ہوئی سرمستی نے پہلے ہی دل کو اپنا طرف دار بنا لیا۔ جیسے ہی اس نے ایک نظم کا عنوان پڑھا سارا مشاعرہ کورس بن گیا اور ہر طرف سے ایک ہی فرمائش بلند ہوئی "گرلس کالج کی لاری"۔ شاعر نے اپنا ارادہ ترک کیا اور حاضرین کے ارشاد کی تعمیل میں گردن جھکا دی۔ اس کی شاداب آواز دو سُروں کے درمیان اتار چڑھاؤ دکھاتی اور "گرلس کالج کی لاری" میں نوجوانوں کے جذبوں، خواہشوں، تمناؤں اور خوابوں کو رومان پرور فضاؤں کی سیر کراتی رہی۔

مشاعرے سے لوٹتے ہوئے ٹرین میں میرے ایک دوست نے جاں نثار اختر کی مشہور اور اثر انگیز نظم "فریب بہار" ترنم سے چھیڑ دی۔ یہ نظم ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند شاعروں کے اجتماعی شعور اور مجموعی ردِ عمل کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور اس وقت تو بالخصوص بھلی لگ رہی تھی۔

پھر تین چار برس بعد تلاش معاش نے مجھے بھوپال پہنچا دیا۔ یہاں پہلی بار جاں نثار اختر سے ملاقات ہوئی۔ ان کی محفل نیم شب میں شریک تو نہیں شامل ہونے کے مواقع بھی ملے۔ اختر سعید، اظہر سعید، محمد علی تاج، منظر بابو، آصف شاہ میری، مقصود عمرانی، کیفی کوثر، آفاق احمد اور کئی اور بزرگوں اور دوستوں سے جاں نثار اختر کی باتیں سنیں۔ عام ضابطے رشتہ استوار کرنے کی شرط ان کے پیہم اصرار اور دھمکیوں کے باوجود مان سکا مگر پھر بھی ان کی دیئے اشعار

کتنی لاشوں پہ ابھی تک
ایک چادر سی پڑی ہے
لاکھ آوارہ سہی، شہروں کے فٹ پاتھوں پہ ہم
لاش یہ کس کی لیے پھرتے ہیں ان ہاتھوں پہ ہم
میرے بھی ہاتھ قلع ہیں تیرے بھی ہاتھ شل
اس لاش کو اُٹھا کے رکھے کون چھاؤں میں

ان اشعار میں ایک عجیب سی دردمندی، ایک عجیب سی دردگزیدگی ہے، جو لفظ کو زخم بناتی ہے۔ جاں نثار زخم خوردہ ہیں، جاں نثار زخم آشنا ہیں، جاں نثار لفظوں کو دل کے زخم اور محبوب کے گال کی طرح چھوتے ہیں۔ پھر بھی مجھے کہتے ہیں کوئی عار نہیں کہ

جاں نثار۔ ترقی پسند نہیں ہیں۔

جاں نثار۔ جدید نہیں ہیں۔

جاں نثار۔ شاعر ہیں اور اس دور میں شاعر ہونا ہی عظمت کی دلیل ہے۔

جاں نثار۔ غزل کہتے ہیں۔

غزل ہزار شیوہ ہے اور جاں نثار بھی ہزار شیوہ ہیں۔

جیسی غزلیں آج کل وہ کہہ رہے ہیں انہی کا حصہ ہے۔ غزل گوئی میں اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کرنا بڑا مشکل ہے مگر جاں نثار اختر نے یہ کر دکھایا ہے جو بہت بڑی بات ہے۔

محافظ حیدر

پرست کلام کو عاق کر دیا تھا۔ میں اس نظم کی تعریف نہیں کر رہا ہوں اور ایسی نظمیں جن میں تکرار اور نعروں کی جھنکار کا تانا بانا ہو مجھ سے صرف قادر الکلامی کی داد ہی پا سکتی ہیں۔ میں یہاں اس جرأت کی داد دے رہا ہوں جو جاں نثار اختر نے اس نظم کو اپنے مجموعے میں شامل کر کے دکھائی ہے۔ یہ ان کی بنیادی سچائی اور کردار کی پاکیزگی کا ایک اور ثبوت ہے۔

جاں نثار اختر اپنے بہت سے ترقی پسند ہمنواؤں کی طرح جاگیردارانہ اور زمیندارانہ ماحول میں پلے اور بڑھے اور اس ماحول کی وضعداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ان کی زبان اور لب ولہجے کی شائستگی، نرمی، ملائمت اور تراش خراش ان کی شاعری کو ایک خاص آہنگ دیتی ہے۔ اتنا عرصہ انہیں بمبئی جیسے آفاق شہر میں ہو گیا ہے لیکن ان کی شاعری دیہات اور قصبوں کی امیجری اور زبان پر جان دیتی ہے۔ لگے ہے مجھے، مانتے ہے، آوے ہے۔ گیا ہے میاں جیسی ردیفوں کو اس زمانے میں برتنا پرانی ٹیکسالی زبان اور اردو شاعری کے جانے پہچانے محاورے کی طرف ان کی مراجعت کی جہت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ان کی غزل کا باہر کی دیوار تو اردو شاعری کے روایتی رکھ رکھاؤ نے اٹھائی ہے اور اندرونی دیواریں ان کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں نے۔ تجربے سے زیادہ مشاہدے کا عمل ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی اپنے گھر کی بالکونی یا کھڑکی سے تماشۂ شب و روز کو دیکھ رہا ہے اور بدلتے ہوئے مناظر کو محسوس کر رہا ہے۔ آج کل ان کے یہاں "محسوس سوچ" کا اظہار غزلوں میں ہو رہا ہے۔

لمحے لمحے کی سیاست پہ نظر رکھتے ہیں
ہم سے دیوانے بھی دنیا کی خبر رکھتے ہیں

مجھے معلوم ہے میں ساری دنیا کی امانت ہوں
مگر وہ لمحہ جب میں صرف اپنا ہو سا جاتا ہوں

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے

جاں نثار اختر کی شاعری میں پچھلے چند برسوں سے سیاست اور عقائد سے مایوسی اور بیزاری کا جذبہ بیش بیش نظر آ رہا ہے۔ ان کا یہ احساس انہیں ان نوجوانوں کی حسیت سے قریب کر دیتا ہے۔ جن کے درمیان بیٹھ کر وہ دلی اور روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں کچھ نوجوانوں کے بیچ

یہ ایک احساس کہ سیاست نظریئے اور عقیدے نے انسان کا ساتھ بہت دور تک نہیں دیا جدید یا کم از کم ہمعصر حسیت کا شاعر قرار دیئے جانے کے لئے کافی ہے ہمارے ہی عہد میں دو زمانے ایک ساتھ چل رہے ہیں۔

نے میری آب خوری۔ چائے خوری اور ہوا خوری ہی کو اپنا ہم مشرب کے لئے کافی سمجھ کر مجھے اپنے حلقۂ احباب میں جگہ دی اور تب سے اب تک ایک لاسلکی اور لاسلکی رشتہ سے ہم دونوں کے درمیان قائم ہے۔ بھوپال ہو یا دلی الیا کم ہی ہوا ہے کہ وہ آئے ہوں اور مجھے ملاقات سے نوازا نہ ہو۔

لیکن اصل رشتہ شاعری کا ہے۔ اور یہ ہمہ گیر رشتہ ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی میری نظر میں یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کی شخصیت اور کردار کا ہو بہو عکس ہے۔ یہ بہت سیدھی اور سچی شاعری ہے۔ ہر قسم کے داؤں پیچ اور مکروفریب سے پاک۔ حسیت کی سطح پر یہ شاعری میر تقی میر سے اپنا نسب ملا سکتی ہے۔ یہاں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میر کے "رنگ" کو جو بالعموم ان کی پسندیدہ بحر اور ان کے ایک مخصوص لہجے سے عبارت ہے۔ جاں نثار اختر میں تلاش اور نہ پایا جانے پر میری بات غلط قرار دی جائے۔ "حسیت" کی بات ہے۔ میر ہی کی طرح جاں نثار اختر کے یہاں زندگی کا تجربہ جذبے کے وسیلے سے شعری تجربے میں تبدیل ہوتا ہے، نظریہ، عقیدہ، فکر اور دانشوری کا پوز انہیں حرام و حلال کی تمیز پر مجبور نہیں کرتا۔

مغربی علم شعر کا جتنا حصّہ اردو شاعری کی زندہ اور صحت مند روایت میں جذب ہو کر ہندوستانی بن گیا بس اتنا ان کی شاعری میں بھی غیر ارادی طور پر داخل ہو گیا باقی سارا رویہ سارے عوامل سارا انداز مشرقی ہے اور اردو کے تہذیبی دائرے کے اندر کی چیز ہے

جاں نثار اختر کی دوسری بڑی خوبی جس نے مجھے خاص طور پر اپنا گرویدہ بنا لیا ہے ان کی انفرادیت ہے۔ اس انفرادیت نے انہیں اب تک پرانا نہیں پڑنے دیا۔ ایک عجیب و غریب اور بے نام سی تازگی ان کے کلام میں ہوتی ہے جو بس اچھی لگتی ہے۔ اور اس اچھے لگنے کے اسباب کی تلاش غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اندر کی سچائی اور جذبے کا کھرا پن روایت اور زندگی کے تجربے اور موجودہ فضا کو ایسی زبان، ایسا لہجہ، ایسی موزونیت اور ایسی امیجری دیدیتا ہے جو ایک خاص خیال، تاثر، تصور، احساس یا کیفیت کو بہت ہی مناسب اور فطری لباس رنگ آہنگ اور شکل میں پیش کر دیتی ہے۔ ان کی ادھر کی غزلوں میں ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کی طرف بین اشارے اشعار میں بھی ملتے ہیں۔

پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا، اور اب
ایک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں

یا

یہ کیا ہے کہ بڑھتے چلو بڑھتے چلو آگے
جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی

ایک آدھ بات فرض کرنا اور بڑھتے چلو بڑھتے چلو کے نعروں کے جادو کے اثر سے نکل کر بیٹھ کر سوچنے کی بات کرنا ان کے مزاج کی آزادہ روی کی طرف واضح اشارے ہیں۔ اسی جرأت کا ثبوت انہوں نے "خاک دل" میں اشتالن کو شامل کرکے دیا۔ ان کے بہت سے ساتھیوں نے "استالن" کے دور کے بعد روس میں استالن کے معتوب اور مذموم ہونے اور استالن کے خلاف ہوا چلنے کے باعث استالن کے قصیدوں اور مرثیوں کو رد کر دیا تھا اور استالن

چاشنی، لمس ان کی شاعری کو اس کا پیرہن ہی نہیں جسم بھی عطا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری مزے دار شاعری ہے۔

دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے

بانہوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے ابرو، تیرے لب

اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

اور بھی سینہ کسنے لگتا ہے اور کمر بل کھا جاتی

جب بھی اس کے پاؤں پھسلنے لگتے تھے ڈھلوانوں پر

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی

ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہے

یہ ہم سے نہ ہوگا کہ کسی ایک کو چاہیں

اے عشق ہماری نہ ترے ساتھ بنے گی

زلفیں سینہ ناف کمر		ایک ندی میں کتنے بھنور

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے

جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

سانس ویسے ہی زمانے کی رکی جاتی ہے

وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہے

دم سادھ لیا کرتے ہیں تاروں کے مدھر راگ

جب رات گئے تیرا بدن بات کرے ہے

آؤ ہم جسم کی شمعوں سے اجالا کر لیں

چاند نکلا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے

اس کا احساس بھی انہیں ہے۔

زندگانی کی قدریں بدلنے لگیں
لوگ، بٹنے لگے دو زمانوں کے بیچ

سیاست اور عقیدے کی ناکامی سے متاثر ہو کر انہوں نے کئی شعر کہے ہیں :-

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

زمیں ہوگی کسی قاتل کا داماں ہم نہ کہتے تھے
اکارت جائے گی خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے

کس عقیدے کی دہائی دیجیے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

دنیائے سیاست ہو کہ دنیائے ادب ہو
دیوانے تو ہر حال میں نایاب رہے ہیں

اس قسم کے بیانات انہیں ترقی پسندی کی شناخت سے اوپر اٹھالے جاتے ہیں۔ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت جب "مسلک" یا "مذہب" بن جاتی ہے اور انسان کے ضمیر اور ذہن کو محصور و مقید کر دیتی ہے تب شاعری تکرار بن جاتی ہے اور شگی ندی کو کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے۔ جدید ذہن وہ ہے کہ جو آپ اپنی تعریف اور تحدید سے بھی چھلانگ لگا کر گذر جانے کی جرأت کر سکتا ہو۔

جاں نثار اختر کا مزاج ہمارے بہت سے شعراء کے مزاج کی طرح کلاسیکی روایت اور نئی رومانیت کے امتزاج سے تشکیل پایا ہے، محبوبہ اس کا جسم، اس کی قربت، اس کی خوش لباسی اور بے لباسی ان کے شعری محرکات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مناظرِ فطرت اور شہری زندگی کی چہل پہل اور رونق ذائقہ، لذت، رنگینی،

اسی نظم میں بوڑھی کا چہرہ، ماں کی بوڑھی کا ٹکڑا، پھیکی رنگت کا اک چھلا، دل کی صورت کا اک لاکٹ ٹوٹے ٹوٹے سے رشتے اور اُجڑی اجڑی سی دنیائیں صاحب فراش شاعر سے ملنے آتی ہیں تو پڑھنے والے کا دل بھی ایک ایسے نام سے درد سے بھر جاتا ہے۔

جاں نثار اختر جہاں بھی اپنے ذاتی تجربے اور نجی زندگی کے حوالے سے بات کرتے ہیں وہیں ان کی شاعری ایک تازہ و دل گداز تاثر سے جڑ جاتی ہے۔ ان کی وہ نظمیں جو صفیہ اختر اور خدیجہ اختر سے منسوب ہیں رومانی نغمائیت کے نہایت کامیاب نمونے بن گئی ہیں اس کے علاوہ جب وہ اپنے بعد اشعار میر کو نذر کرتے ہوئے آخری شعر میں کہتے ہیں

دیس سے جب پردیس سدھارے ہم پر یہ بھی وقت پڑا
نظمیں چھوڑیں غزلیں چھوڑیں گیتوں کا بیوپار کیا

تو پڑھنے والا ان کے دل کی اس کسک کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے جو تلاش معاش میں انہیں دانشکدوں سے کھینچ کر سیلولائڈ کی مایانگری میں لے آئی۔ اس طلسم خانۂ نِزدولوا میں بھی انہوں نے چند لازوال نغموں کی جیوت جلائی اور ہماری فلموں کو شعریت اور ادبیت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی۔

جاں نثار اختر کے مجموعے "خاکِ دل" میں ظ۔ انصاری کا ایک مضمون شامل ہے۔ مضمون نگار کے بعض مقدمات سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے "جاں نثار اختر کی شاعری کلاسیکی رومانٹک شاعری ہے"۔ اور یہ کہ "سوز و ساز اگرچہ پرانے لفظ ہیں تاہم اگر ان کا پورا مفہوم نظر میں رکھیں تو اختر کی شاعری میں سوز کم ہے ساز زیادہ، عاشقی کم ہے، حسن پرستی زیادہ، تاثیر کم ہے۔ تاثر زیادہ"

بہرحال جاں نثار اختر ہمارے عہد کے اردو شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، ان کی شاعری سچے احساس اور کھرے جذبے کی شاعری ہے، کلاسیکی، رومانوی، ترقی پسند اور جدید اجزا کے باوصف ایک انفرادی رنگ و آہنگ رکھتی ہے جو بڑا مزا دیتا ہے۔ یہ شاعری اور عمل کی سرحد پر مشاہدے کی سطح پر جنم لیتی ہے اس کا بیشتر حصہ "خالص شاعری" (Pure Poetry) کے زمرے میں شامل ہے اور کیوں نہ ہو کہ

ابھی زندگی ہے صرف زندگی آرزو

اور زندگی کی یہ آرزو جسے آج زندگی کہا جا رہا ہے ایک عجیب گورکھ دھندا ہے۔

سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو

سوال اتنے نہیں ہیں، جواب جتنے ہیں

چمکتی ریت پہ یہ غسلِ آفتاب ترا
بدن تمام سنہرا دکھائی دیتا ہے

ہر لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے
یہ طرز یہ اندازِ سخن ہم سے چلا ہے

جاں نثار اختر نے ابتک پابند اور متناسب الاعضا فارمولا ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ غزل، قطعہ اور رباعی کے علاوہ پابند نظمیں ان کے ذہن و دل اور جذبہ و احساس کی ترجمان بن سکی ہیں۔ نظموں میں ہموزن مصرعوں اور ردیف یا کم از کم قافیے کی پابندی اور مصرعوں کا economic شکل M التزام پایا جاتا ہے۔ رویہ غنائی ہوتا ہے اور ایک قسم کی جذباتی اور شاعرانہ منطق کارفرما رہتی ہے۔ جدید تلازماتی اور استعاراتی منطق کی ان سے توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ وہ شاعری ہے جو قاری، سامع اور شاعر کی فہم و فراست کی مشترک سطح پر ایک ایسی زبان میں کی جاتی ہے جسے دونوں یکساں سمجھتے ہیں۔

ترسیل کی ناکامی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور تجزیاتی تنقید اپنے ذوق کی تسکین سے محروم رہ جاتی ہے۔
امن نامہ، تنہائی، آخری لمحہ، خاکِ دل، اور "آخری ملاقات" ان کی بہت ہی موثر نظمیں ہیں بالخصوص آخری ملاقات، میں پیکروں کا بہاؤ اور شدید بہاؤ بے حد اثر انگیز ہے۔ لاشعور کے تل گھر سے ایک کے بعد ایک یاد، خواب، حسرت، خواہش تیز گھومتی ہوئی فلم کی مانند کھلتی چلی جاتی ہے۔

اُجڑی ہوئی مانگیں شاموں کی — آواز شکستہ جاموں کی
کچھ ٹکڑے خالی بوتل کے — کچھ گھنگھرو ٹوٹی پایل کی
کچھ بکھرے تنکے چلمن کے — کچھ پرزے اپنے دامن کے
کچھ تارے یہ تھرائے ہوئے — کچھ گیت کبھی کے گائے ہوئے
کچھ شعر پرانی غزلوں کے — عنوان ادھوری نظموں کے
ٹوٹی ہوئی اک اشکوں کی لڑی — اک خشک قلم اک بند گھڑی

مت روکو انہیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیئے نے انہیں پچھتاوے میں ضرور مبتلا کیا۔ میں اس پچھتاوے کی داستانِ تلخ کی تفصیل میں نہیں جاؤنگا کیونکہ یہ المیہ ترقی پسند تحریک کے زوال کا المیہ ہے، چند شعر جاں نثار اختر کی زبانی سنئے جہاں شاعر اعتراف شکست کرتا ہے لیکن یہ شکست شاعر کے حق میں ماتم بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ اُس کے دوبارہ جنم کی بشارت بن جاتی ہے ؎

سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

زمیں ہوگی کسی قاتل کا داماں ہم نہ کہتے تھے
اکارت جائے گا خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے

ہزاروں سال بیتے ہیں ہزاروں سال بیتیں گے
بدل جائے گی کل تقدیرِ انساں ہم نہیں کہتے

یہ اشعار ایک باشعور شاعر ہی کے ذہن کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔ ان اشعار میں نہ کسی ایسی صبح نو کی بشارت ہے جو کل طلوع ہوگی اور نہ یہ شعر کسی قنوطیت کے مظہر ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کا انسانیت سے ایمان اٹھ گیا ہے یہ اشعار باشعور اور تلخ مرثیئے ہیں جو پچھلے بیس پچیس برس کے سیاسی اور سماجی واقعات پر مبنی ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے جاں نثار اختر نے اپنا نیا ذہنی سفر شروع کیا ہے جس میں ایک لگن ایک تڑپ اور کچھ کرنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔ اب شاعر کے سامنے انسانی اقدار کی شکست و ریخت کے مناظر پوری سچائیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

گاؤں میں آکر شہر بسے
گاؤں بچارے جائیں کدھر

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

شفا نعمکنت

نیا جنم

"ہماری قدر کرو دلبرے سخن کے متوالو — غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے"

"پچھلے پہر" جاں نثار اختر کے دوسری شعری جنم کی خوبصورت مثال ہے۔ دسا پسل سے پچھلے پہر تک شاعر نے کئی پیچ و خم طے کئے ہیں جہاں مرغزار بھی ملتے ہیں۔ بالخصوص حسن نسوانی کے ہر پہلو پر جیسی نظر اس شاعر نے پائی ہے وہ اُس کے معاصرین کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں جاں نثار اختر کا رشتہ مصحفی، حسرت اور فراق سے جوڑتا ہوں لیکن ان تینوں شاعروں سے جو وصف جاں نثار اختر کو الگ کرتا ہے اور ان کی پہچان بن جاتا ہے وہ لمیات کی کیفیت کے ساتھ ساتھ عصری حسیت ہے جس نے اُن کے شعر کو عجب طرح کی تازگی، شگفتگی اور رعنائی عطا کی ہے۔

جاں نثار اختر نے اپنی چھان پھٹک کرنے میں ایک عمر گنوائی ہے، ترقی پسند تحریک اور اُس کے کارناموں سے انکار چراغ سے چراغ جلنے کی رسم سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس تحریک کی انتہا پسند روش نے کئی شاعروں کو بھی نقصان پہونچایا ہے۔ وہ شاعر جنھیں پادر ہوا باتوں میں تسکین ملتی تھی وہ آج بجھ کر رہ گئے ہیں لیکن سچا شاعر اگر کچھ مدت کے لئے بھٹک بھی جائے تو اس کی مثال صبح کے بھولے کی سی ہوتی ہے جو شام کو بہر حال لوٹ آتا ہے۔

جاں نثار اختر نے اپنی سیاحت کے بعد اب اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے اور یہ توفیق بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے جب تک شاعر کے دل و دماغ کے دریچے کھلے نہ ہوں وہ تازہ ہوا کے استقبال سے قاصر ہے اب جاں نثار اختر اس منزل میں ہیں ؎

ہر مصلحت سے فن کو چھڑاتے چلے ہیں ہم
وہ ہچکچائیں گے کہ وہ پیش و پس گیا

فن کو مصلحتوں سے چھڑانے میں شاعر نے کم و بیش پندرہ بیس برس گنوا دیئے۔

؎ زندگی تجھ کو بھلایا ہے بہت دن ہم نے
وقت خوابوں میں گنوایا ہے بہت دن ہم نے
کیا پتہ ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

ایک سچے اور حقیقی شاعر کی طرح جاں نثار اختر نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے شعری ذہن کا

لاکھ آوارہ سہی شہروں کے فٹ پاتھوں پہ ہم
لاش یہ کس کی لئے پھرتے ہیں ان ہاتھوں پہ ہم

شاعر کے تحت الشعور میں یہ لاش بار بار اُبھرتی ہے۔ یہ لاش نہ فانی کے شعر کی طرف ذہن منتقل کرتی ہے اور نہ اہل لکھنؤ کا وطیرہ نظر آتی ہے۔ یہ آرزوؤں کی ناتمامی، تمناؤں کی تشنہ کامی اور ادھورے خوابوں کا اظہار تو نہیں ہے یہ لاش چلتا پھرتا انسان تو نہیں جو اپنے کاندھوں پر اپنا جنازہ اٹھائے ہوئے ہے؟

پچھلے پہر، کے مطالعہ سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر نے ترقی پسند ادب و شعر اور جدیدیت دونوں کی بہترین روایتوں سے فائدہ اُٹھایا ہے اور نہ ذات کے خول میں بند ہو کر تنہائی کا بین کرتے ہیں۔ ان کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہے۔ ان کے اشعار میں ایک ایسی سوچ ملتی ہے جو قطعی انفرادی خلوص کا نتیجہ ہے۔ جہاں فیضؔ کا گذر ہے اور نہ کسی نقاد کی خوشنودی مقصود ہے۔ جاں نثار اختر کے سماجی شعور کی تہیں اب اُن کی رگِ جاں سے پیوست نظر آتی ہیں ورنہ یہ لب و لہجہ انہیں ہرگز میسّر نہ آتا جو ذاتی مشاہدہ کی سان پر چڑھ چڑھ کر آب دار ہو گیا ہے۔

شرم آتی ہے کہ اُس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکّے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو
سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے یہاں

جاں نثار اختر دلّی اور لکھنؤ کی تہذیب کے یوں ماتم گسار ہیں کہ معیشت کے وسیلے آدمی پر تنگ ہیں اس لئے نہیں کہ شاہوں، رئیسوں اور نوابوں کا دور دورہ نہیں رہا۔ شاعر اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ صنعتی ترقی کی اس بھاگ دوڑ میں ان تاریخی شہروں کے لوگ کیوں نئی تہذیب کے ہم قدم نہیں ہوتے ؎

اے مرے شہر نگاراں ترا کیا حال ترا
چپّے چپّے پہ مری آنکھ بھری آوے ہے

دلّی کہاں گئیں ترے کوچوں کی رونقیں
گلیوں سے سر جھکا کے گزرنے لگا ہوں میں

اب جیسا بھی چاہیں جسے حالات بنا دیں
ہے یوں کہ کوئی شخص برا ہے نہ بھلا ہے

میری رائے میں اس ذہنی سفر کے موڑ پر پہنچ کر جاں نثار اختر جدید غزل کے سرخیل بن جاتے ہیں، اس طرح کہ پاس روایت بھی ہے اور احترام امروز بھی۔

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دِل پاسِ روایات کرے ہے

جاں نثار اختر نے نئی غزل کے امکانات کو آج کے مروجہ سکہ بند الفاظ سے نہیں چمکایا ہے۔ مثلاً سورج، سمندر، ہوا، ریت، جسم، سایہ، تنہائی، ذات کے اندر، ذات کے باہر، پیاس، پیڑ، پتے، گھاس اور نہ جانے کتنے ہی لفظ آج کی پچھتر فیصدی ناکام غزلوں میں ملتے ہیں ان تمام لفظوں سے جاں نثار اختر نے اس لئے شعوری اور غیر شعوری طور پر پرہیز کیا ہے کہ اُن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ جہاں شاعر کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو لفظیات کا در خود بخود کھل جاتا ہے، ہمارے اکثر و بیشتر نئی غزل کے شاعر اس نکتہ کو فراموش کر جاتے ہیں کہ حسن معنی کو مشاطگی کی ضرورت نہیں پڑتی، ہمیشہ فطرت الفاظ کی حنا بندی خود کرتی ہے۔ اگر جذبہ شدید ہو اور دل کی گہرائی سے نکلا ہو تو سامنے کے لفظ بھی جادو بن کر بولنے لگتے ہیں نئی غزل کے مروجہ نئے ڈکشن کے ساتھ وہی خطرہ لاحق ہو چلا ہے جو ترقی پسند شاعری کی یکسانیت کا سبب بنا تھا۔ ظلمت، اندھیرا، صبح، سحر، دار و رسن، مقتل، زنداں وغیرہ جیسے الفاظ کس قدر جلد کھوکھلے ہو گئے۔ یہ آپ کے اور ہمارے سامنے کا حادثہ ہے۔

جاں نثار اختر کی غزل میں لفظوں کی جھنکار ملتی ہے۔ نہ فارسی تراکیب کا حسن نظر آتا ہے۔ ان کے پاس چند الفاظ کی تکرار ضرور ملتی ہے۔ جو علامت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ "لاش" ہے نہ جانے شاعر نے کس کس طرح باندھا ہے۔

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستہ میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

دِل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک
ایک چادر سی پڑی ہے

مرے خوابوں میں کوئی لاش ابھر آتی ہے
بند آنکھوں میں کئی تاج محل جلتے ہیں

یوں تو احسان حسینوں کے اٹھائے ہیں بہت
پیار لیکن جو کیا ہے تو تمہیں سے ہم نے

ان حسینانِ جہاں سے اور تو کیا مل سکا
ہاں مگر اتنا کہ اپنی خوش دلی بڑھتی گئی

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ جاں نثار اختر بندھے رہنے کے قائل نہیں ہیں۔ اور غالباً یہی اُن کے نشاطیہ لب و لہجہ کا راز ہے۔ انہیں بقول میر "ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا" والا انداز بہت مرغوب ہے۔

اب میں خاص طور پر جاں نثار اختر کی دو غزلوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا لہجہ یکسر اچھوتا ہے، ان غزلوں میں وہ موضوعات سمٹ کر آگئے ہیں جو عام طور پر نظموں کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ذیل کی غزل کے قوافی خاص طور پر توجہ طلب ہیں جن میں ایک بھی قافیہ روایتی اور گھٹا ہوا نہیں ہے ورنہ یہاں قافیوں کی کیا کمی ہے۔

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی اُن دالانوں پر
اُس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام لکھا تھا پیتل کے گلدانوں پر

شعر تو اُن پر لکھے لیکن اوروں سے منسوب کئے
اُن کو کیا کیا غصہ آیا نظموں کے عنوانوں پر

دوسری غزل کے چند شعر درج کرتا ہوں تاکہ میرے دعوےٰ کی تصدیق ہو سکے۔

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پہ ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں

پیارے پیارے نیناں اُس کے جانے بیکل چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جا دیکھے، سوچے، دریا بھر لوں چھاگل میں

صبح نہانے جوڑا کھولے ناگ بدن سے آ لپٹیں
اُس کی رنگت اُس کی خوشبو کتنی ملتی صندل میں

چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل ٹک جائے
ایسے اُس کا گرتا آنچل اٹکے آدھی ہیکل میں

جاں نثار اختر نمبر

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ جاں نثار اختر بنیادی طور پر حسن و جمال کے شاعر ہیں۔ خطِ بدن کے مصور ہیں، جنسیات کا موضوع، لمسیات و حسیات کی روایتیں، رجائی اور نشاطیہ لب و لہجہ کی چاشنی انہوں نے ورثہ میں پائی ہے مصحفی۔ ریاض۔ مضطر۔ حسرت اور فراق کا ان پر اثر نہ ہوتے ہوئے بھی حسن کے پرکھنے، برتنے میں انہوں نے غیر شعوری طور پر ان شاعروں سے فائدہ اٹھایا ہے ان کے نشاطیہ لب و لہجہ میں اتنی تیزی نہیں جسے ہم مکمل طور پر شوخی سے تعبیر کر سکیں بلکہ یہ لب و لہجہ زندگی کے لمحے لمحے سے رس نچوڑنے کی بے پناہ خواہش سے عبارت ہے انہیں "غم" بجز از یک نفس "نہیں ہوتا اُن کی نظر حسن اور قربت پر رہتی ہے، یہ محبوب سے مل کر دکھ سمیٹ نہیں لیتے بلکہ انہیں اس دولت بیدار کو نشاط کے نگار خانے میں سجا لینا خوب آتا ہے۔ جاں نثار اختر جسم اور لسانی پیکر کے خطوط کی شاعری کو ایک تہذیب کا درجہ دیتے ہیں ؎

جسم کی ہر بات ہے آوارگی یہ مت کہو
ہم بھی کر سکتے ہیں ایسی شاعری پر مت کہو

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی ؛ ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں
سانس ویسے بھی زمانے کی رُکی جاتی ہے ؛ وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہیں
شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے ؛ کچھ اس کمال سے اُس نے بدن چرایا تھا
ہر ایک رات نشہ میں ترے بدن کا خیال ؛ نہ جانے ٹوٹ گئیں کے صراحیاں ہم سے

حسرت کا پرچھاواں دیکھئے ؎

مانا کہ رنگ رنگ ترا پیرہن بھی ہے
پر اس میں کچھ کرشمۂ عکسِ بدن بھی ہے

فراق کے لب لہجہ کی ایک مثال ؎

یہی چاہے بیچ ہی بولوں ہر طرح سے اپنے بارے میں
مگر تم مسکراتی ہو تو جھوٹا ہو سا جاتا ہوں ؛

غیر شعوری طور پر جاں نثار اختر کا ایک شعر فانی کے ایک شعر سے قریب ہو گیا ہے ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات
فقط اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے (فانی)

فرق کچھ بھی نظر آتا نہیں زندانوں میں
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے (جاں نثار اختر)

جاں نثار اختر کے پاس "وفا" وہ روایتی تصور نہیں ہے جہاں شرط استواری، اصل "ایمان" بن جاتی ہے۔ وہ کسی "حسین" کے عاشق نہیں ہیں بلکہ "عشق" کے عاشق ہیں ؎

یہ ہم سے نہ ہو گا کہ کسی ایک کو چاہیں
اے عشق ہماری نہ ترے ساتھ بنے گی

جس پر مجھے آرزو کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کالی گھٹا میں کوندا لپکا رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی لمبی سانس کھینچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

اب میں اس نوع کے چند شعر سناتا ہوں، سنیئے۔

ہمارے خواب بھی بہلا سکے نہ آج ہمیں
جو رو لیئے ہیں تو کچھ جی بہل گیا ہے میاں

چپ ہے ہر زخم گلو چپ ہے شہیدوں کا لہو ∴ دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صلہ مانگے ہے
تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے ∴ سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے

اور تہذیبِ غمِ عشق نبھا دیں کچھ دن
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں

جینے کا ہمیں خود نہ ملا وقت تو کیا ہے
لوگوں کو سکھاتے رہے جینے کا ہنر ہم

ہم سب سے پہلے قتل ہوئے تم گواہ ہو
مرنے پہ دوسروں کو ابھار آئے، یہ نہیں

میں آخر میں "پچھلے پہر" جیسے صحیفۂ نشاط رقم کرنے والے شاعر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جس نے شعر تر کے قحط میں ایسی بے دریغ خلاقانہ فیاضی سے دلدادگانِ غزل کی ضیافتِ روحانی کا اہتمام کیا ہے۔

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں
پیار کی یوں ہر لو بند جلادی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

اِن دونوں غزلوں میں ٹھیٹھ اُردو کا سنگیت، دوہوں کا رس اور تخیل کا کنوار اپن اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان میں ایک انوکھی کشش کا احساس ہوتا ہے۔ سہل ممتنع اور سامنے کی مگر ان دیکھی باتوں کو نظم کرنے میں ایک خطرہ بھی در پیش رہتا ہے کہ شاعر اگر کچھ اور سہل ہو جائے تو شائد وہ سطح باقی نہ رہے جس سے ثقاہت عبارت ہے، ذرا سی چوک فلمی شاعری کے گڑھے میں ڈھکیل دے سکتی ہے مثلاً ایک غزل کا مطلع سنئے جس کی ردیف و قوافی نے مجھ میں یہ اندیشہ پیدا کیا ہے :-

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

لیکن اس غزل کو بھی جاں نثار اختر اپنی غیر معمولی شگفتہ خیالی کے سبب سے بچا لے گئے ہیں اور اس میں ایک معصوم اور سیدھی سادی رومانوی فضا شروع سے آخر تک جاری و ساری ملتی ہے۔ جاں نثار اختر اظہار کے باب میں اس قدر منجھ گئے ہیں کہ مصرعوں کی کاٹ اور تیور میں غیر ارادی طور پر بانکپن آگیا ہے۔ مضطر خیر آبادی کے گھر کا چشم و چراغ ہی ایسے شعر کہہ سکتا ہے۔

یہ شعر دیکھئے :- دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لئے ہے

پہلے مصرعہ میں "ہاتھ" کی تکرار کس قدر خوب صورت ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جگر کا ایک شعر یاد آگیا جہاں انہوں نے بھی ایسی ہی نزاکت سے لفظ "رونق" کو دوہرایا ہے۔

جسے دے کر ترے قدموں نے رونق چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

ذیل کے شعر میں لفظ "بالیں" کے ساتھ اساتذہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اور کچھ دیر تمہیں دیکھ کے جی لوں ٹھہرو
مری بالیں سے ابھی اُٹھ کے نہ جاؤ یارو

جاں نثار اختر امنگ اور ترنگ کے شاعر ہیں۔ اُن کی لہک انشا ۔ جرأت ۔ داغ ۔ ریاض، حسرت ۔ جگر ۔ اور جوش سب سے یوں مختلف ہے کہ اس نشاطیہ رنگ میں ایک ہلکی سی ٹیس بھی شامل ہے۔ ایک ایسا دکھ بھی ملتا ہے جو موج تند و تیز کی زیریں کیفیت سے مشابہ ہے جو صرف محسوس کرنے کی بات ہے، یہاں جاں نثار اختر ماضی اور حال کے شعراء سے بڑی حد تک علیحدہ ہو کر اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں ایک ایسی ہوک ملتی ہے

غنائی ہے رومانی ہے اس کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں، فیض، ساحر، مخدوم، اختر اردو شاعری کے وہ ستون ہیں جنہیں اردو غزل کے روائتوں سے علیحدہ کر کے نہیں جانچا جا سکتا یہ شعرا ترقی پسند ضرور تھے۔ دیا ہیں) لیکن یہ بھی لوگ روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس سے کنارہ کشی نہیں کرتے افسانہ کی بھی یہی صورت ہے۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی ہمارے دو بہترین کہانی کار ہیں۔ دونوں میں سے رومانی لہجہ نفی کر دیجئے تو باقی کچھ بچے گا ہی نہیں۔

کچھ سالوں سے ترقی پسند ادب پر الزامات تراشے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ تخلیقی ادب کو ادب کا درجہ دے رہے ہیں یہ لوگ ادب نہیں بلکہ سیاسی ادب تخلیق کر رہے ہیں ان لوگوں کے یہاں فرد کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نگاہ ہندوستان کی موجودہ فضا پر نہیں ہے ان کے احساس پر بیرونی چھاپ ہے۔ انہیں موجودہ تہذیب یافتہ ادب کے مسئلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ انسان کی تنہائی، اس کی بے بہرگی، اس کے اجنبی پن سے ناواقف ہیں اور جدید اردو ادب ترقی پسند ادب کے برعکس ان تمام قدروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی لئے جدید شاعری ترقی پسند شاعری کے خلاف ردِ عمل ہے۔

تیسرے اسکول کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی حالانکہ جب تک کوئی زبان زندہ رہتی ہے یہ اسکول زندہ رہتا ہے یہ اسکول اُن لوگوں پر محدود ہوتا ہے جو خود کو روایت سے جوڑ لیتے ہیں ان لوگوں کے لئے خیال کی انفرادیت بے معنی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے اچھے شاعر پہلے سوچ گئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ذوق اور داغ کو غالب پر ہمیشہ فوقیت دیتے ہیں۔ وجہ غالباً یہ ہوتی ہے کہ جہاں غالب کے لب و لہجہ کی نقالی تقریباً ناممکن ہوتی ہے ذوق اور داغ کو، بقول اُن کے، آسانی سے نقل کیا جا سکتا ہے داغ اردو شاعری کا وہ موڑ ہیں جہاں روایتی ڈھنگ سے سوچنے کا عمل اپنے اختتام کو پہونچتا ہے اور تیسرا اسکول اس اختتام کو اپنے لئے شروع سمجھتا ہے کیونکہ خود سوچنے کا عمل بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے تمام توجہ زبان پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ زبان کی صحت مندی خود ہی ایک مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ سکول زبان کو کتابی درجہ دیتا ہے۔ اس اسکول کے بہتر شعراء مشاعرہ سے پہلے اور مشاعرہ کے بعد اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں اردو ان کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ گھسے پٹے خیالات کو صحیح اردو میں بیان کرنے کا نہ کوئی گنجائش نئی اصطلاحوں کی رہ جاتی ہے نہ نئے استعاروں کی۔ یہ شاعری تقریر تو نہیں ہوتی، اس کا سیاست سے تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس میں انفرادیت نہ دیکھ کے مسائل، فرد کی اہمیت سے وہ بے تعلق ہوتی ہے کہ اس قسم کی شاعری کے خلاف ردِ عمل ایک فطرتی عمل ہوتا ہے۔ اگر شاعر کوئی نئی بات کہنا چاہے تو یہ سکول اُسے جلاوطن کرنے پر تُل جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص بلا وجہ جلاوطن کیا جا رہا ہو اُس کا ردِ عمل صاف ہوتا ہے اور اس ردِ عمل کو بیان کرنے کی ضرورت میں نہیں سمجھتا۔ وضاحت کے اپنے اصول ہوتے ہیں اور اُن سے ہر سوچنے والا شخص واقف ہوتا ہی ہے۔

اس صدی کی چھٹی دہائی کے شروع میں جدید شاعر اُبھرنا شروع ہوئے ہیں اُن میں کوئی قدر مشترک تھی ہی نہیں اور یہی اُن کا خاصہ تھا۔ اُن کو اشتراک میں باندھنا غیر ضروری تھا۔ اُنہیں اُن کی انفرادیت تک محدود رہنے دیا جا سکتا تھا، لیکن ایسا ہوا نہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایسا ہونے نہیں دیا گیا۔ جدید شاعری ترقی پسند شاعری سے کافی مختلف تھی اور جدید شاعری روایتی شاعری سے بہت حد تک مختلف تھی۔ جدید شعراء کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وجہ صاف تھی۔ تقسیم کے بعد کچھ لوگ ہجرت کر گئے تھے۔ انہیں نئے ماحول کو سمجھنا تھا اور ان کے لئے معاملات سیاست سے زیادہ ضروری تھے۔ انہیں یہ علم تک نہیں تھا کہ تقسیم اتنی مشکلیں لے کر

بمل کرشن اشک

تخلیقی منزل

مجھے صابر دت نے کہا ہے کہ میں جاں نثار اختر پر ایک مضمون لکھوں۔ تجویز صابر دت کی ہے لیکن عنوان میرا ہے اور اختر ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ وہ روس کا چکر لگا آئے ہیں اُن کا کمیونزم سے نزدیک کا رشتہ ہے اور میں پھر بھی اُنہیں ایک جدید غزل گو ثابت کرنے پر مصر ہوں حالانکہ میں نے خود ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔

میں بزعم خود ہندوستان میں جدید غزل کا بانی مبانی ہوں — بقول میرے ہندوستان میں جدید غزل پاکستان کی وساطت سے شروع ہوئی اور جب میری غزلیں تھوڑی دیر کے لئے یہ خطرہ برداشت کر لیجئے کہ مضمون اختر پر ہونے کی بجائے اشک پر ہے) "سویرا" لاہور میں شائع ہو رہی تھیں بشیر بدر، جامی، بانی وغیرہ کو ابھی دریافت کیا جانا تھا، اور مخمور سعیدی وغیرہ روایتی ڈھنگ سے غزل سرا ہو رہے تھے۔

تقسیم کے دس بارہ سال بعد تک اردو شاعری کو تین خانوں میں بانٹا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جن کا لہجہ نہ سیاست سے متاثر تھا نہ کسی خاص ادبی لہجہ کی نقالی سے۔ وہ لوگ خود میں ایک اسکول تھے اور بیشتر ایسے ہی لوگ زندہ جاوید ہوئے ہیں۔ فراق ایسے عظیم شاعر کے لئے کوئی ادبی خطاب تلاش کرنا بے معنی ہے۔ اُن کی ہر غزل پر اُن کی اپنی چھاپ ہے، ایک انفراد بیت ہے۔ جسے کسی اسکول سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ غالب اور فراق ایسی شخصیتیں تو صدیاں گذرنے پر پیدا ہوتی ہیں۔

دوسری جنگ کے بعد ہی ترقی پسند گروپ اُبھرنا شروع ہوا تھا۔ اور ترقی پسند تحریک ہندوستان تک محدود نہ تھی لیکن ہندوستان میں اگر یہ تحریک ایک طرف کمیونزم کی پیدا کردہ تھی تو دوسری طرف اس تحریک نے اردو شاعری کے رومانی لہجہ کو بھی اپنایا تھا۔ فیض کی غزلوں میں جہاں ایک پیغام ہے وہاں ایک ایسا رومانی لہجہ کو بھی ہے جس پر اردو کی صحت مند روایتوں کی چھاپ ہے۔ فیض کا یہ مطلع:۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

قبول ہوں گے۔

قبلہ آل احمد سرور صاحب نے اختر صاحب کی شاعری سے متعلق فرمایا ہے، اُن کی شاعری نعروں کی شاعری نہیں ہے اور ترقی پسند شاعری پر سب سے بڑا الزام جو عائد کیا جاتا ہے یہی ہے کہ یہ شاعری کھوکھلے نعروں کی شاعری ہے۔ نعروں میں استعاروں اور تشبیہوں کے لئے بہت کم جگہ ہوتی ہے۔ جدید شاعری نے الفاظ کو نئے معنی دیئے ہیں۔ اور اس کے لئے دو طریق خاص طور پر استعمال کئے ہیں۔ ایک تو ایسی ردیفیں وضع کی ہیں جو غزل کو علامتی رنگ دے سکیں دروازے، ماچس، قمیض اور اسی قسم کے الفاظ جب ردیف میں مستعمل ہوں گے تو لازمی طور پر ایک علامتی روپ دھار لیں گے۔ یہ علامتیں روایتی شاعری کی علامتوں سے ازحد مختلف ہیں۔ ان کا نزدیکی رشتہ شعوری اور لاشعوری سائیکولوجی سے ہے۔ موج شعور سے متعلق تکنیکی ناولوں میں علامت مختلف کرداروں اور مختلف اوقات میں مختلف رنگ دھارتی رہتی ہے۔ یوں بھی غزل شعور کی بے ربطگی کی امین ہے۔ ضروری نہیں کہ غزل کے مختلف اشعار ایک دوسرے سے متعلق ہوں انہیں اگر کوئی چیز ایک دوسرے سے منسلک کرتی ہے تو ردیف، قافیہ اور بحر۔ اسی لئے اگر غزل کو نعرہ بازی کا ذریعہ بنانے کی سعی کی بھی جائے تو سوائے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ دوسرا طریق جو جدید شاعری نے تشبیہوں کو تازہ بنانے کے لئے وضع کیا ہے وہ ایک خاص قسم کی ردیف ہے جو شاعر کو تشبیہوں کی تلاش میں سرگرداں کر سکتی ہے، جیسے لگے ہے مجھے، لگے، لگتی ہے، کی طرح، دکھائی پڑتا ہے، لگتا ہے، سا لگے ——

(یہ مثالیں میں "پچھلے پہر" سے لے رہا ہوں) "پچھلے پہر" میں ساٹھ سے کچھ زیادہ غزلیں ہیں جن میں سے سات غزلوں میں تشبیہ تلاش کرنے کی یا تشبیہ کے وسیلے سے جذبہ کے اظہار کی سعی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان غزلوں میں ہر شعر ایک تشبیہ لئے ہوئے ہے مگر ایسی زمینیں وضع کرنا جن میں تشبیہ کا استعمال آزادانہ طور پر ہو سکے جدید شاعری کا حصہ ہے "لگے"، ایک ایسا لفظ ہے جو حقیقت اور ظاہر کے درمیانی فاصلہ کو اظہار بخش سکتا ہے، جو تشکیک کا مادہ آج کی زندگی میں زور پکڑ رہا ہے اُسے الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے اور جاں نثار اختر اس پہلو پر احساساتی نظر رکھتے ہیں۔

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا!
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

افق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

نہ جانے کب کوئی طوفان آئے گا یارو
بلند موج سے ساحل قریب لگتا ہے

آئے گی، اور تقسیم سیاست کے کھیل کا نتیجہ تھی۔ ایک اجنبی ماحول سامنے تھا جس سے صلح کرنا آسان کام نہیں تھا۔ میرے شہر انبالہ کو لے لیجئے۔ مسلمان دوست ہجرت کر چکے تھے، جو نئے شہری آئے تھے نہ میں اُن کی زبان سے واقف تھا نہ اُن کے رسم و رواج سے۔ ایسا ہی ناصر کاظمی کے ساتھ ہوا ہوگا۔ ان حالات میں سیاست کی طرف سے چشم پوشی کر لینا ضروری بھی تھا اور بامعنی بھی، ضروری اس لئے کہ اپنی تہذیب پر ہر جانب سے حملے ہو رہے تھے بامعنی اس لئے کہ سب سیاست کا کیا دھرا تھا ——— اور ترقی پسند شاعری سیاست سے منسلک ہے، اسی لئے جدید شاعری کی ضد ہے۔ کیونکہ روایتی شاعری سیاست سے چشم پوشی کرتی ہے۔ اسی لئے جدید شاعری اور روایتی شاعری میں یہ قدر مشترک ہے۔ یہ سطریں آپ لطیفہ کے طور پر پڑھیں تو بہتر رہے گا۔

لیجئے ایک میدان تیار ہوگیا ہے۔ اب آپ جدید شعراء کی ایک قطار باندھ لیجئے۔ انہیں سمجھائیے۔ آپ ترقی پسند گروپ کی ضد ہیں کیونکہ آپ سیاست کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ پھر آپ ایک فرد ہیں، آپ خود کو تنہا گردانتے ہیں، ترقی پسند شعراء سماج کو ایک خاص وقعت دیتے ہیں اس لئے تنہائی کا احساس انہیں نہیں چھوتا۔ سیاست کا یہ اصول کمیونزم نے وضع کیا ہے اس لئے آپ کمیونزم کے خلاف ہیں۔ امریکہ فرد کو اہمیت دیتا ہے۔ وہاں کے ادیبوں کو تنہائی کا احساس ابھرتا ہے۔ اس لئے آپ امریکہ کے زیادہ نزدیک ہیں لیجئے ایک پلیٹ فارم تیار ہوگیا ہے کمربستہ ہو جائیے اور ترقی پسند ادیبوں کو بے معنی قرار دیجئے۔ انہیں اپنا دشمن گردانئے۔

رہی بات تیسرے سکول کی اُسے بھلا دیجئے۔ وہ اس قابل نہیں، اتنے اہم نہیں کہ آپ خود میں اور اُن میں جتنے اختلافات ہیں انہیں منظر عام پر لائیں آپ کا لب و لہجہ اپنا ہے، آپ کا احساس نجی ہے۔ آپ زبان کو خیال کے اظہار کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں، آپ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی رسموں سے اصطلاحیں وضع کی ہیں آپ کے استعاروں پر آپ کے ماحول کی چھاپ ہے۔ سب کچھ فراموش کر دیجئے۔

فیض ایک خراب شاعر ہیں کیونکہ وہ کمیونسٹ ہیں اُن کے یہاں بے تحاشا فنی خامیاں ہیں۔ آپ میں بھی ہیں لیکن پھر بھی فیض کمیونسٹ ہیں آپ نہیں ہیں۔ اس لئے آپ فیض سے بہتر ہیں۔

ساحر ایک ادنیٰ قسم کے شاعر ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر اشتراکی ہے۔

جاں نثار اختر شاعر ہو ہی نہیں سکتے، کمیونسٹ جو ٹھہرے۔

روس میں جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے وہ سراسر بکواس ہے۔ اگر وہاں کچھ تخلیق کیا گیا ہے تو صرف ڈاکٹر ژواگو، کیونکہ یہی وہ ناول ہے جسے کمیونسٹ پارٹی تخریبی قرار دیتی ہے۔

جو کچھ روسی ہے وہ لغو ہے، جو کچھ امریکی ہے وہ پُرمعنی۔

اسی لئے چاہیے آپ کے ہر لفظ سے ڈالر کی بو آتی رہے۔ یہ دھیان رکھئے کہ ڈالر کی بو کو ووڈکا کی خوشبو میں مدغم کیجئے اور جدید شاعری پر اپنی روس ہونے کا ٹھپہ لگا دیجئے، کم از کم پرچہ تو چلے گا۔ امریکہ کے خزانے میں روپے کی (ڈالر کی) کمی تو ہے نہیں۔

جدید شاعری ترقی پسند شاعری کی ضد ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ جاں نثار اختر ایک ترقی پسند شاعر ہو کے بھی جدید ہو۔ میں بھی عجیب شخص ہوں، ثبوت کے طور پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ گردن زدنی قرار دیا جا سکتا ہوں لیکن سچ بولنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اگر میری سچائی کی کوئی قیمت لگائی جا سکتی ہے تو پتھروں کے مکے ہی سہی مجھے

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص بھی مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے
نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

اجنبیت صرف فرد کا ہی خاصہ نہیں، وہ شہر بھی اجنبی ہو گئے ہیں جن سے اختر کا گہرا تعلق رہا ہے یہ میرا گاؤں تو پہچانا لگتا ہے، لکھنؤ کی ہر گلی خاک بسر لگتی ہے۔ شہر نگاراں لکھنؤ کا یہ حال ہو لیا ہے کہ جسے دیکھ کر شاعر کی آنکھ بھر آتی ہے۔ گاؤں شہر میں مدغم ہوئے جا رہے ہیں اور ماضی تقریباً بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، فسادات میں وہ گھر بھی جل گیا ہے جہاں شاعر پڑے رہنا چاہتا تھا۔ ماضی کا کرب جدید شاعری کی گھٹی میں ہے کیونکہ اکثر جدید شعراء ماضی پیچھے چھوڑ کر نئے شہروں میں آ بسے ہیں۔ ہجرت ناصر کاظمی کو جتنا دکھی کرتی ہے اتنا ہی اُس کا کرب جاں نثار اختر محسوس کرتے ہیں۔

یہ الزام کہ ترقی پسند شاعروں کے احساس پر بیرونی چھاپ ہے بے معنی ہے جو خود کو جدید شاعر گردانتے ہیں اور خاص طور پر جنھیں زعم ہے کہ انھوں نے جدید شعر کے لئے پلیٹ فارم تعمیر کیا ہے اکثر امریکہ کے گن گاتے دکھائی دیتے ہیں اُن کے ذہنوں پر امریکہ کی اتنی چھاپ ہے ماسوائے روس کی بیخ کنی کرنے کے انہیں اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بسا اوقات تو ڈالروں کی چمک دمک میں ہندوستان کا سیاسی اور سماجی مفاد بھی تاریک ہو جاتا ہے۔ ایک ہندوستانی شاعر کے مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے غالباً عبدالمُغنی (غالباً عتیق اللہ) کا قلمی نام) نے تحریر کیا تھا کہ گو وہ شاعر ہندو تھے۔ مگر اُن کے کلام میں ہندوپن کی کوئی جھلک نہیں، مطلب یہ کہ ہندوستان کی روایات سے اُن کی شاعری کا دور کا بھی رشتہ نہیں۔ کچھ جدید شعرا کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندی کے الفاظ کو بے وجہ استعمال کرنے سے وہ ہندوستانیت کے امین ہو گئے ہیں چاہے ان کا ماحول ہندوستان کی روایات سے مکمل طور پر بیگانہ ہو۔ ہندوستان کی روایات کو سطحی طور پر سمجھنے کی سعی تو ایک دو کے یہاں ضرور ملتی ہے لیکن جس طور کمار پاشی کی ولاس یاترا میں اُس کا مطالعہ کیا گیا ہے وہ مشکل سے ہی کسی اور جدید شاعر کے حصے میں آیا ہے لیکن غزل میں کمار پاشی بھی مکمل طور پر روایت پسند ہو گئے ہیں۔ اختر نے ہندوستانی روایت کو اپنے شعر میں بڑی خوبصورتی سے رچایا ہے۔

اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے
ایک اک لہر کسی یگ کی کتھا
مجھ کو گنگا کوئی اتہاس لگے

اس دور میں مذہبی کتابیں چاہے وہ ہندوؤں کی ہوں مسلمانوں کی ہوں کہ عیسائیوں کی کسی ایک فرقہ کی جائداد نہیں ہیں۔ گیئٹے سے لے کر ایلیٹ تک سبھی نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں دو تہذیبیں ساتھ ساتھ پلی ہیں وہاں ایک سے مکمل طور پر کنارہ کشی کر لینا کسی ادب کے لئے صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی بات ہندی اور اردو کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہندی سے میری مراد وہ زبان نہیں جسے عوام

جاں نثار اختر نمبر

کسی ادب کو سیاسی ادب قرار دینے کے لئے ایک خاص قسم کے نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ ساحر صرف سیاسی ادب تخلیق کر رہے ہیں پھر آپ کے لئے ان کے ہر شعر پر سیاسی ادب کا ٹھپہ لگانا آسان ہو جائے گا۔ تاج محل اور جاگیردار ایسی نظموں پر تو یہ مہر لگانا ازحد آسان ہے ہی۔ اُن کا قطعہ جس کے آخری دو مصرعے ہیں۔

تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

بھی سیاسی گردانا جا سکتا ہے۔ غالباً ساحر کسی حاکم دوست کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور اگر آپ اس حد تک نہیں جانا چاہیئے اور ساحر کو یک قلم شاعر ماننے سے انکار کرنا چاہتے ہیں تو قطعہ میں جو تضاد کا پہلو ہے اُس کا مسخر اڑانا شروع کر دیجئے۔ اسی طرح فیضؔ اور جاں نثار اختر سیاسی شاعر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اختر کا شعر ہے:

فاصلہ چند قدم کا ہے منا لیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

اس صبح کو سرخ سویرا مان لیجئے اور شعر سیاسی ہو گیا۔ اگر آپ اس صبح کو صبح اُمید تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تو اسے ادبی قرار دیدیجئے یعنی کسی شاعر کو وقتی طور پر سیاسی طور پر شاعر یا صرف شاعر بنانا ہمارے نقادوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی خود سیاست کے ہاتھ بکا ہوا ہو وہ بے چارہ تو مخالف گروپ کے لتاڑے گا ہی۔

اختر غمِ دوراں کو سیاسی نظر سے دیکھتے ہیں، یہ اُن کی اشتراکیت اُن کے لئے ضروری بنا دیتی ہے لیکن وہ کسی صورت استعارے کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

فیضؔ کے کلام میں بھی یہی شعری فضا ملتی ہے۔ کیونکہ دونوں اشتراکی عقیدے کے پیروکار ہیں ایسا ہونا لازمی ہے۔ اُن کے سیاسی عقیدے کی بنا پر انہیں شعریت کے زمرے سے خارج کر دینا سراسر غیر مناسب ہوگا۔

اشتراکیت کی وقعت کے ساتھ ساتھ اختر فرد کی وقعت کا خاطر خواہ خیال رکھتے ہیں۔ دورِ کے فرد کا بکھراؤ اور اُس بے چہرگی اُن کے اشعار میں ابھر کر آئی ہے۔ بعض اوقات تو ایک غزل میں تین تین اشعار اس موضوع سے عبارت ہیں:۔

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

اشکؔ :- لفظوں کو کہاں تلک گھمائیں
سو بار کہیں کہی ہوئی کیا!

اخترؔ :- ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے
برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

اشکؔ :- مرے الفاظ پتھر ہو گئے ہیں
میں اپنے ہاتھ زخمی ہو گیا ہوں

اخترؔ :- تو بھی اک دولت نایاب ہے، پر کیا کہئے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے

اشکؔ :- ایسا ہوا کہ گھر سے نہ نکلا تمام دن
شاید کہ آج خود سے کوئی کام تھا مجھے

اخترؔ :- ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے

اشکؔ :- لاکھ بدلنا چاہو لیکن ماں کو ماں کہتے ہنستی ہے
مٹی وہی، وہی ہے دھرتی، بدل گئیں پچھلی دیواریں

جاں نثار اختر کے یہاں جدیدیت کی ہر وہ خوبی موجود ہے جس کی جدید شعراء سے اُمید کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ جدیدیت کسی کی جائداد نہیں ہے۔ غالبؔ اپنے زمانے میں جدید تھے اور میں اور جاں نثار اختر اپنے زمانے میں جدید ہیں۔ ہم میں جو تفریق پیدا کی گئی ہے اس کے پسِ پشت یا ادبی سیاست ہے یا ذاتی عنادِ۔

میں سعی کر رہا تھا کہ اس مضمون میں نام نہ در آئیں لیکن ایسا کرنا مری بے دیانتی ہو گی۔ ہندوستان میں جس وقت جدید شعراء ابھرنا شروع ہوئے اُن کے لئے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جن لوگوں نے ایک پلیٹ فارم تیار کیا اُن میں سرِ فہرست جناب گوپال متل صاحب کا نام ہے۔ تحریک جو ایک نیم ادبی نیم سیاسی پرچہ ہے اُس میں جدید شعراء نے لکھنا شروع کیا تو اُس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جدید شعراء پر اینٹی کمیونسٹ ہونے کا الزام شروع ہی میں لگا دیا گیا تھا اور تحریک ہر طرح امریکہ کا پراپیگنڈہ کرنا شاید ذاتی مفاد کی خاطر ضروری سمجھتا تھا

کے لئے بھی سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے ، میرا مقصد اُن الفاظ سے ہے جن کا استعمال ہر گھر آنگن میں ہوتا ہے ، وہ الفاظ جو ہم بولتے ہیں ، وہ الفاظ جو گھریلو فضا کا احساس دلاتے ہیں ہندی کی سپردگی ، نرمی اور شیرینی ، کو صحیح طور پر استعمال میں کھپانا ہر شاعر کے بس میں نہیں اُن کا استعمال یوں ہونا چاہیئے کہ نہ موسیقیت ہاتھ سے جاتی رہے نہ اجنبیت کا احساس ہو۔ اختر کے یہاں کچھ غزلیں ایسی ہیں جن میں عطف و اضافت کو سرے سے چھوڑ دیا گیا ہے اور ہندی کے الفاظ سے ایک ایسی فضا بنا دی گئی ہے جسے ہندوستان کا ہر شخص پہچانتا ہے ۔ مثال کے طور پر وہ غزل جس کا مطلع ہے ۔

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی اُن دالانوں پر
اُس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

شروع تا آخر بغیر عطف و اضافت کے کہی گئی ہے جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے اس غزل نے گھر کے اندر جھانک کر دیکھا ۔ ساڑی کی دکانیں اور پیتل کے گلدان ایک ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس سے اردو کی جدید شاعری عبارت رہی ہے ۔ جدید شعرا نے زبان کو سہل بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کیونکہ ہر جدید شاعر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سہل زبان ہی اردو کو لقا بخش سکتی ہے اور اختر ایسے شعرا اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔

میں ہر صورت اختر کو غزل کا جدید شاعر سمجھتا ہوں اور اُس کا ایک ذاتی ثبوت پیش کرنا ضروری گردانتا ہوں اگر میں جدید شاعر ہوں اور میرا ایک ڈھنگ سوچنے کا ہے اور اگر وہ طور اختر کے یہاں موجود ہے تو یقینی طور پر اختر بھی جدید غزل گو ہیں مندرجہ ذیل اشعار اس کلیہ کو مکمل طور پر ثابت کر سکیں گے ۔

اختر :- وہ کونسی آہٹ تھی جو خوابوں میں در آئی
کیا جانئے کیوں چونک پڑے پچھلے پہر ہم

اشک :- کل رات یوں ہوا کہ پہر دو پہر گئے
کوئی کچھ ایسے چونک پڑا لوگ ڈر گئے

اختر :- میں تیری ذات میں گم ہو سکا تو مجھ میں
بہت قریب تھے ہم پھر بھی فاصلہ تو رہا

اشک :- بہت قریب کھڑے ہیں اٹے ہوئے ہیں بدن
ہمیں کو اب بھی گماں ہے کہ فاصلہ سا ہے

اختر :- سو بار کے دہرائے ہوئے لفظ نہ دہرا
الفاظ ہوں بے جان تو کچھ بات بنے گا

ڈاکٹر ذکیہ انجم

لمس کی خوشبو

کسی خوبصورت چیز سے متاثر ہونے کے بعد جو پہلی خواہش انسان میں جاگتی ہے وہ نفسیاتی طور پر لمس کی ہوتی ہے ۔ انسان اُسے چھونے کی خواہش کرتا ہے ۔ لمس کا تلذذ بہت اہمیت رکھتا ہے ، خاص کر جب یہ خواہش کوئی بھی روپ اختیار کرکے شعر میں ڈھلتی ہے تو سننے والے کے دل و دماغ میں نشہ گھول دیتی ہے ۔ میں نے موجودہ شاعروں میں یہ لمسیاتی عنصر کسی کی شاعری میں پایا ہے تو فراق کو چھوڑ کر جاں نثار اختر کی شاعری میں ۔ کوئی تخیل یا تجربہ جب شاعر کے قلب و ذہن پر چھا جاتا ہے اور اُس کے خون کی گردش میں ڈھل جاتا ہے اور اُس خون کی گرمی اور حدت میں حل ہو کر بے ساختہ زبان یا قلم سے ٹپک پڑتا ہے تو شعر ، شعر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے ۔ کچے اور نیم پختہ جذبات شاعری کو راس نہیں آتے لیکن اس عمل کے لئے شاعر کا حد درجہ حساس ہونا ضروری ہے یہ حسیاتی شاعری ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے ۔ اس آزمائش میں جاں نثار اختر کامیاب اور نمایاں نظر آتے ہیں اس مضمون میں میں صرف اُن کے لمسیاتی اشعار سے بحث کروں گی ۔

لمسیاتی شاعری ایک رچی ہوئی تہذیب اور محبّت کے بھرپور آداب کا بھی تقاضہ کرتی ہے ۔ ہماری شاعری میں جو لمسیاتی عنصر رہا ہے اُس کو خصوصاً لکھنؤ اسکول کے خارجی انداز نے ذلیل اور رکیک بنا دیا تھا ۔ اخلاقی اور تہذیبی طور سے گری ہوئی شاعری محض رکاکت اور ذلالت بن جاتی ہے ۔ آسکر وائلڈ نے ایک جگہ کہا ہے کہ "بھچلاپن گناہ عظیم ہے" ۔ فراق نے "اردو کی عشقیہ شاعری" میں عشق و محبّت پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ " دنیا کو نکموں سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا محبت سے معرا افراد کے عمل سے پہنچا ہے"۔ چنانچہ لمسیاتی شاعری کی بنیادی شرط محبت کا مہذب جذبہ ہی کہا جا سکتا ہے ۔

ہماری پُرانی شاعری میں محاکات ہم کو ملتی ہیں لیکن وہ زیادہ تر سطحی قسم کی ہیں یہ محاکات خارجی قسم کی ہیں البتہ کہیں کہیں داخلی محاکات نہایت حسین اور دل کش انداز میں موجود ہیں ۔ مثلاً غالب کا یہ شعر :

نیند اُس کی ہے ، دماغ اُس کا ہے ، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اور سمجھتا ہے یہ پراپیگنڈا لازمی طور پر روس کی مخالفت کا آئینہ ہے۔ پرچند کھولتے ہی دو چار مضامین اس قسم کے نظر آتے ہیں جن میں روس کی سیاسی اور سماجی مخالفت کی جاتی ہے۔ یہ مجھے علم نہیں کہ سیاسی حالاتِ حال کے پیشِ نظر یہ کہاں تک حب الوطنی کی دلیل ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ جہاں اردو کا ہر ادبی پرچہ بُرے حالات سے گزر رہا ہے۔ تحریک کی اشاعت میں آج تک کبھی رخنہ نہیں پڑا۔ اسی کارن شاید کچھ لوگوں کو مالی مفاد کے پیشِ نظر زبردستی شاعر بنایا جا رہا ہے۔ ادبی صورت میں جتنا نقصان پہنچایا گیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ شاعروں کے درمیان اتنی گہری خلیج پیدا کر دی گئی ہے کہ ایک ترقی پسند شاعر کا ایک جدید شاعر سے تعلق ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ اس وقت ادبی ضرورت یہ ہے کہ دونوں شانہ بشانہ تخلیقی منزل سر کریں۔

ایک مجموعہ کو آخر تک پڑھنے کے بعد جب یہ احساس ہو کہ آپ ایک پُرخلوص اور دیانت دار دوست کو الوداع کہہ رہے ہیں تبھی آپ اسے دوبارہ پڑھ سکیں گے۔ اور "پچھلے پہر" جو ایک جدید غزل گو شاعر کا مجموعہ ہے کو مکمل طور پر مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہی احساس ہوا۔

فن کی آنچ میں جب تخیل تپ کر نکلتا ہے اور الفاظ کے قالب میں والہانہ ڈھلتا ہے تو معنی آفرین بھی ہوتا ہے اور فکر انگیز بھی۔ ادبِ عالیہ کا یہ بھی ایک تسلیم شدہ معیار ہے۔ خیال، فکر، تصور، مضمون، زبان، اسلوب اور زندگی جب ہم آہنگ ہو جائیں تو ادب قاری اور سامع کے مشامِ جاں کو معطر کر دیتا ہے۔ ان جملہ ارکان و عناصر کے شاعر برسوں بعد ابھرتے ہیں۔ ہمارے قدیم و جدید، کلاسیکل اور ترقی پسند ادب کے درمیان ایک ایسی ہی محبوب شخصیت کا نام ہے جاں نثار اختر، ادریس۔

(گلزار دہلوی)

یا پھر قیمت شمامہ کو لیجئے۔ اختر کی شاعری میں خوشبو کا احساس بھی حد درجہ ہے یہ خوشبو، عطر، صندل، عود اور عبیر کی بھی ہے لیکن اصل بات جسم کی خوشبو کی ہے۔

چبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بند قبا رات گئے

ہر لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے
یہ طرز، یہ انداز سخن ہم سے چلا ہے

اُنہوں نے صرف نشاطیہ طرز ہی میں یہ خوشبو کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ حزنیہ اشعار میں بھی اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً مجھے اُن کی مشہور نظم "خاک دل" کا ایک شعر اس وقت یاد آ رہا ہے۔

زخم سینے کے جھکتے ہیں تری خوشبو سے
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے

پھر اُن کے وہ اشعار جن میں احساس اور ادراک وسیع بلکہ وسیع ترین صورت اختیار کر لیتا ہے اور ساری حیات و کائنات کا محاصرہ کر لیتا ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری میں مناظر فطرت کا حسن بھی ہے جس کی طرف اس دور میں بہت کم شعراء نے توجہ دی ہے۔ یہ منظر نگاری اُن کے لمساتی انداز کی وجہ سے لذت اندوزی کا ذخیرہ بن گئی ہے۔ اُن کا قطعہ سنیئے۔

رات بھیگی، نرم دریا تھم گیا
دور پیڑوں میں ہوا گم ہو گئی
سیم گوں تاروں کی چادر اوڑھ کر
موج ساحل سے لپٹ کر سو گئی

اب اُن کے لمساتی اشعار پر نظر ڈالئے۔ لمس کی کیفیت دیکھئے۔

ہر ایک رات نشہ میں ترے بدن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کے صراحیاں ہم سے

یہ داخلی محاکات حسیاتی شاعری کا ہی جزو کہی جا سکتی ہیں۔ حسیاتی شاعری کو اگر ہم محدود معنوں میں استعمال کریں تو بھی تمام حواس کی پاکیزہ لذتوں تک یہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں رنگوں کا احساس، آواز یا ترنم کا احساس، قوت شامہ، ذائقہ، اور لمس سبھی حواس آجاتے ہیں۔ پھر وہ حس جسے ہم چھٹی حس (Intuition) کہتے ہیں اور جسے ہم "وجدان" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ساری حیات و کائنات سمٹ کر حسیاتی شاعری کے دائرے میں آجاتی ہے۔ یوں تو جاں نثار اختر کے اشعار میں آپ کو تمام حسوں کی نزاکتیں اور لطافتیں مل جائیں گی مثلاً رنگ کا احساس دیکھئے۔

مانا کہ رنگ رنگ ترا پیرہن بھی ہے
پر اس میں کچھ کرشمۂ حسنِ بدن بھی ہے

دل جلائے ڈالتی ہے باغ میں لالے کی سیر
اتنا نازک پھول اور لپٹا ہوا شعلے میں ہے

یا سننے کی حس ملاحظہ ہو:-

وہ چپ بھی اگر ہے تو کچھ گا رہی ہے
نگاہوں سے آواز سی آرہی ہے

اقرار نگاہوں سے کیا تو نے وفا کا
جو کچھ مری آنکھوں نے سنا یاد ہے اب تک

نہ لفظ ہے نہ کنایہ، نہ صوت ہو نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھے کوئی زباں ہم سے

ذائقہ کے بارے میں یہ شعر دیکھئے ؎

یہ چہرا دھندلا دھندلا سا، یہ نظریں نیچی نیچی سی
اِن میٹھے میٹھے ہونٹوں میں کیوں آج گھلی ہی تلخی سی

اِک آنچ سی تن بدن میں لہراتی ہے
گوری اوڑھے ہے اُن کی اوڑھی ہوئی شال

کہتی ہے تمہاری مدھ بھری آنکھوں کی
مستی ہی تو سرشار بناتی ہے مجھے

جس دن نہ پیو عجیب سا لگتا ہے مجھے
کھلتے ہوئے تم سے شرم آتی ہے مجھے

عورت کی زبانی یہ رباعی ملاحظہ ہو :-

وہ بڑھ کے جو باہوں میں اُٹھا لیتے ہیں
ہو جاتا ہے معلوم نہیں، کیا مجھ کو
ایسے میں نہ جانے کیوں "سکھی" لگتا ہے
خود میرا بدن پھول سے ہلکا مجھ کو

کہیں کہیں پچھلے پہر کی غزلوں میں جاں نثار اختر زیادہ کھُل کھِلے ہیں، لیکن یہاں بھی اُن کی شاعری کا تہذیبی رچاؤ قائم رہتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار :-

زلفیں، سینہ، ناف، کمر،
ایک ندی میں کتنے بھنور
دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے
باہوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

بہرحال، وہ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں جاتے۔ مجھے اُن کا یہ شعر یاد آرہا ہے ؎

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں

میری دعا ہے کہ اُن کی شاعری اس "تہذیب بدن" کے حسن سے اپنا ناتا کبھی نہ توڑے اور اُن کی تراوشِ فکر اور زیادہ لطیف، دلکش اور دل آویز ہوتی جائے۔

تو نے چھُوا جو مجھ کو تو اُس دن کھلا یہ راز
تو صرف رنگ و بو ہی نہیں ہے، بدن بھی ہے

" پچھلے پہر " کی غزلوں کو ہم سرسری طور پر بھی دیکھیں تو جاں نثار اختر کی یہ خصوصیت ہماری توجہ کو کھینچے بغیر نہیں رہتی - اُن کی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی یہی طرز احساس جھلکتا ہے - جسمانیت میں حسن کی مکمل تلاش اور حسن کو اپنا دین قرار دینے کا جذبہ آسکر وائلڈ کی طرح جاں نثار اختر کی شاعری کا لازمی جزو نظر آتا ہے - اُن کا یہ شعر اسی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے -

یہ ہم سے نہ ہوگا کہ فقط ایک کو چاہیں
اے عشق ہماری نہ ترے ساتھ بنے گی

وصال محبوب کی ساعتوں کا تذکرہ کبھی اُن کی لمسیاتی شاعری میں بڑے حسین انداز میں ملتا ہے اُن کی کتاب " گھر آنگن " میں بھی یہ موضوع پوری خوبصورتی اور رچاؤ کے ساتھ موجود ہے گھر آنگن کی یہ چند رباعیاں سُنیے اور اُن کی لذت اندوزی کو متصوّر کیجیے ؛

ہر آن وہ ہوتی ہوئی پلکیں بھاری
اک نشّا سا خود بدن پہ ہوتا طاری
وہ تیری سپردگی کا عالم، تو بہ
کولھوں سے وہ خود بخود سرکتی ساری

کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اُٹھی ہے مگر
ڈرتی ہے کہیں اُن کو نہ ہو جائے خبر
تھک کر ابھی سوئے ہیں کہیں جاگ نہ جائیں
دھیرے سے اُڑھا رہی اُن کو چادر

پرواہ نہ سردی کی، نہ جاڑے کا خیال
کیا غم جو ہوا سے تمتماتے رہے ہیں گال :-

اس طرح کچھ اس نے چھیڑا سازِ دل
دیر تک ہر تار تھرّاتا رہا

یہ ایک طرح کی آسودہ حال اور خوش فکر شاعری تھی جس کے آئینہ میں شخصیت کا صرف ظاہری روپ ہی اپنا عکس دکھاتا تھا۔ درونِ خانہ کے ہنگاموں کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ شخصیت کا یہ ادبی تحول پہلی بار ایک نظم "خاموش آواز" میں اترتا دکھائی دیتا ہے۔ "خاموش آواز" سے پہلے کی شاعری ذات سے انحراف اور خود تردیدی کی شاعری تھی۔ اس نظم کے بعد جاں نثار اختر کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ زندگی میں بھی اور فن میں بھی ایک بے سہارا سفر جس میں عقیدہ اور روایت بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح تنہا ہو جانے کے بعد شاعر کو اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ عرفانِ ذات کی منزل پر پہونچ کر جب وہ مراقبے سے بیدار ہوتا ہے تو دوبارہ عقیدوں اور روایتوں سے آئی ہوئی دنیا کی طرف لوٹتا ہے۔ پچھلے پہر کی شاعری اسی سفرِ ذات اور بازگشت کی روداد پیش کرتی ہے۔

بڑے اور منفرد شاعری کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ تنقید کو فن کا نیا ادراک بخشتی ہے۔ پچھلے پہر کی شاعری میں جاں نثار اختر نے اسی بلندی کو چھو لیا ہے اس کا ثبوت وہ تنقیدی آراء ہیں جو اس مجموعہ پر ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے لکھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے قول کے مطابق جاں نثار اختر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جو دوسرے مشاہیر کی دنیا سے الگ تھلگ اور انوکھی ہے۔ اور اس دنیا کی تعمیر سے اُردو غزل کو نئی امیجری، نئی لفظیات بھی عطا ہوئی ہیں۔ نئی بحریں بھی ملی ہیں۔ نئی تشبیہیں اور استعارے بھی اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ ایک معنی خیز اور معنی آفریں دنیا ہے جس کی سیر ہم کو زندگی کی نئی بصیرت عطا کرتی ہے۔ ہم کو زیادہ شائستہ اور اچھا انسان بناتی ہے۔ غزل کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ یہ ایسی شاعری ہے جس کی تاثیر ہی اس کی بہترین تنقید ہوتی ہے۔

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اتارا ہی نہ ہو

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

آہٹیں کون سی خوابوں میں بسی ہیں جانے
آج بھی رات گئے نیند اچٹ جاتی ہے

چپ ہے ہر زخمِ گلو، چپ ہے شہیدوں کا لہو
دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صلہ مانگے ہے

• ڈاکٹر مغنی تبسم

جدید غزل کا منفرد شاعر

پچھلے پہر میں جاں نثار اختر کی وہ غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے شعر گوئی کی تجدید کے بعد گزشتہ چند برسوں میں کہیں۔ یوں کہنے کو یہ ایک ایسے پختہ مشق شاعر کا کلام ہے جس کی شاعری کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ چند مستثنیات کے سوا بالعموم دیکھا گیا ہے کہ شاعر کے وسط الحیات کا سرمایہ ہی گنج گراں مایہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد استادانہ شان تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن تجربوں میں وہ تازگی اور جذبات میں وہ شدت باقی نہیں رہتی جاں نثار اختر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ربع صدی تک شعر کہتے رہنے کے بعد اپنی نسل کے بعض دوسرے شاعروں کی طرح انھوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لگتا تھا اردو شاعری کو جو کچھ وہ دے سکتے تھے دے چکے ہیں۔ لیکن ادھر ان کی تازہ تخلیقات نے اس خیال کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ ان کو پڑھ کر لوگ چونک سے گئے۔ کیوں کہ یہ سنی ہوئی آشنا آواز نہیں تھی۔ ان غزلوں میں جاں نثار اختر اتنے کچھ بدل گئے ہیں کہ ان پر کسی دوسری ہی شخصیت کا گمان ہوتا ہے۔ اس شاعری میں جو نیا طرز احساس ہے وہ یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ فن کار کی حیثیت سے جاں نثار اختر نے دوسرا جنم لیا ہے۔

"پچھلے پہر" کا شاعر ایک منفرد اور جدید تر غزل گو ہے۔ غزل ہماری شاعری کی نہایت سخت جاں صنف رہی ہے۔ بڑی بڑی افتادیں اس پر پڑیں لیکن وہ ہر طوفان اور سیلاب سے صحیح سلامت نکل آئی۔ غزل کی درازی کا راز یہ ہے کہ جب کبھی اس کے قویٰ میں اضمحلال آیا۔ شاعروں نے تازہ خون دے کر اسے توانا اور چاق و چوبند بنا دیا۔ غزل وہ آتش کدہ ہے جس کی تحصیل ہمیشہ داغِ جگر سے جاری رہی اوائل بیسویں صدی میں حسرت، فانی، اقبال، اصغر، یگانہ اور پھر جگر اور فراق نے اسے حیات نو بخشی۔ اظہار کی جو نئی توانائی غزل میں پیدا ہوئی تھی، ترقی پسند شعرا نے اس سے بھر پور استفادہ کرتے ہوئے اپنی نوائے شوق کی تاثیر کو دوبالا کیا۔ مجروح، فیض، ساحر، مخدوم، شاہد صدیقی وغیرہ اس جدید دبستان غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ غزل نے اس دور کے افکار اور جذبات کی ترجمانی ہر رنگ سے کی یہاں تک کہ اس کی قوت اظہار جواب دینے لگی۔ ڈوبتا ہوا نغمہ سکوت کی طرف مائل ہو رہا تھا کہ دم توڑتے ہوئے ساز کے تار اچانک ایک نئی دھن پر مرتعش ہو اٹھے۔ اس بار جن شعرا نے غزل کو تاب سخن بخشی ان میں ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال اور احمد فراز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے جدید نسل ہی کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ بعض قدیم شاعروں نے بھی ان سے تحریک حاصل کی جن میں خورشید احمد جامی اور جاں نثار اختر شامل ہیں۔ گزشتہ دور میں جاں نثار اختر نے ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی تھی۔ اور اس صنف کو پروان چڑھانے میں خاص حصہ لیا تھا۔ انھوں نے چند ہلکی پھلکی اور شگفتہ غزلیں بھی کہی تھیں۔ اس وقت ان کی غزل سرائی کا انداز کچھ اس طرح کا تھا ؎

درد کوئی رات بھر جگاتا رہا
تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

لگتا ہے اک سزا ہے معافی نہیں ہے یہ

تو اس قدر سے مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے

لٹنے کو اٹھ تو جائیں تری انجمن سے ہم
پر تری انجمن کو بھی سونا کیا نہ جائے

بازو چھوا جو تو نے تو اُس دن کھلا یہ راز
تو صرف رنگ و بو ہی نہیں ہے بدن بھی ہے

میں چاہتا ہوں سچ ہی بولوں ہر طرح سے اپنے بارے میں
مگر تم مسکراتی ہو تو جھوٹا ہو سا جاتا ہوں

جاں نثار اختر داخلی دنیا کے عناصر کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں سمیٹ لیتے ہیں، جس سے ان کی شاعری کی کائنات وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے

(چیشلا دیپ)

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

کیسے غمِ حیات میں سب عمر کاٹ دی
تھوڑا سا وقت واں بھی گذارا کرے یہ نہیں

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

نہ لفظ ہے نہ کنایہ نہ صوت ہے نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھئے کوئی زباں ہم سے

یہ بات ادھوری رہ جائے گی اگر جاں نثار اختر کی غزل کے ایک خاص وصف کی نشاندہی نہ کی جائے۔ جو ان کے عشقیہ اشعار میں جھلکتا ہے۔ بنیادی رویہ تو وہی ہے جو ناصر کاظمی، احمد فراز کی غزلوں میں ملتا ہے۔ لیکن ان اشعار میں ایک ایسی تہذیبِ عشق ملتی ہے جسے خود شاعری کی شخصیت نے پروان چڑھایا ہے۔ اس طرح کہ یہ اشعار جاں نثار اختر ہی کہہ سکتے تھے۔ کوئی اور نہیں۔ ان کے مشاہدۂ حسن میں تازگی کے ساتھ خاص حسیاتی کیفیات ملتی ہیں۔ جو فراق کے ایسے ہی اشعار سے مماثلت رکھنے کے باوجود ان سے اتنے ہی مختلف ہیں۔ جتنی کہ فراق اور جاں نثار اختر کی شخصیتیں عشقیہ جذبات اور معاملات کے اظہار میں حقیقت نگاری، گھریلوپن اور محبوب سے اپنائیت کا احساس جاں نثار اختر کے علاوہ بعض اور شاعروں کے ہاں بھی مل جائیگا۔ لیکن ان غزلوں میں عاشق اور محبوب کی جو سیرتیں ابھرتی ہیں۔ وہ اوروں سے مختلف اور منفرد ہیں۔

اشعار ذیل میں ان خصوصیات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے ؎

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سماں
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

آئے کیا کیا یاد، نظر جب پڑتی ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

اس طرح میرے جرم سے نظریں چرا نہ لے

کی وقعت کم کی ہے ۔ مگر خود جاں نثار بھی کسی سے کم اپنے دشمن نہیں ہیں ۔ اُن کا انتساب ہے اندر کمار گجرال کے نام ۔ اور ان لفظوں میں ہے ۔

بہت ہیں تجھ کو سیاست سے چاہنے والے
ہماری طرح کوئی تیرا جاں نثار تو ہو

اس شعر کے اوپر " اندر کمار گجرال کے نام " لکھ دینے سے اس شعر کی داخلی صورت بدل گئی یہ کتاب آلِ احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، شوقی بہرائچی (مرحوم) یا ماچس لکھنوی (مرحوم) کی ہوتی تو انتساب پر مجھے حیرت نہ ہوتی مگر جاں نثار اختر تو صورت شکل سے ایک مرد قلندر نظر آتے ہیں ۔ اس لئے مصلحتوں کا یہ تاج اُن کے سر پر اچھا نہیں لگتا ۔ ویسے اس شعر میں " تو ہو " کی جگہ " نہیں ہوتا " تو اچھا ہوتا ۔ ہماری طرح ترا کوئی جاں نثار نہیں ۔ مگر ردیف کی طرح جاں نثار اختر شاید زیادہ دھیان نہیں دیتے ۔ مثال کے طور پر یہ غزل لیجئے ۔

اب شہر میں جینے کے کبھی اسباب رہے نا
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے سے بجھے نا

اس پوری غزل میں نا، کو " نہ " کی جگہ استعمال کیا گیا ہے ۔ صرف آخری شعر میں نا، بالکل کھٹکا ہوا ہے ۔

سوچا تھا چلو پیاس بجھے، زہر ہی پی لیں
پر زہر ملے تب تو کوئی زہر پیے " نا " !

یہ بات تو یوں ہی نکل آئی ۔ میں زبان و بیان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ۔ اس طرح کی لغزشیں تو میر انیس تک سے ہو چکی ہیں ۔ ان باتوں سے شاعر بڑا چھوٹا یا منجھلا نہیں ہوتا ۔ ویسے زبان و بیان کی طرف سے جاں نثار اختر نے لاپرواہی برتی ہے ۔ مثال کے طور پر جاں نثار کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ " ہر کسی فٹ پاتھ پر چپ چاپ مر سکتے ہیں ہم " ۔ " دکھائی دینا " کی جگہ " دکھائی پڑنا " بھی اچھا نہیں لگتا ۔ مگر میں کسی مولوی کی طرح ان باتوں کی بنیاد پر جاں نثار اختر کو جہنمی قرار دینے پر تیار نہیں ہوں ۔ کیونکہ انہوں نے اردو غزل کو جو مزا دیا ہے اُس کی سفارش پر ان کی بے شمار خطائیں معاف کی جا سکتی ہیں اس " نئے مزے " پر ایمان لایا ہوں پر میں جاں نثار اختر کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا کہ انہوں نے اردو غزل کو نیا ذہن دیا ہے ۔

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے

یہ نیا ذہن جاں نثار کی دین نہیں ۔ یہ مارکسی نظریئے اور کمیونسٹ تحریک کی دین ہے ۔ مطلب یہ کہ جاں نثار کو یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ " بے اوقات خواب دیکھ کر انہوں نے اپنی نیند اور اپنی آنکھوں کی توہین کی ہے ۔ اس احساسِ زیاں کی پرچھائیوں سے پچھلے " پہر " کی غزلیں بھری ہوئی ہیں ۔

وہ خیال و خواب کی رعنائیاں جاتی رہیں　　جن کو چھو لیتے تھے وہ پرچھائیاں جاتی رہیں

خود ملے ہے ۔ ایک علم نواز دوست کی حیثیت سے یہ کتاب گجرال صاحب کے نام منسوب کی گئی ہے ۔ راہی صاحب کو یا دو ان کے وزیر ہونے پر اعتراض ہے یا نہیں اس قابل نہیں سمجھتے ۔
(مدیر)

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

پچھلے پہر کی غزلیں

جاں نثار اختر پر مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور مجاز کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ ؎

پھر اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

یہ شعر جاں نثار اختر کا بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جاں نثار واقعی شامِ غریباں کے آخری شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں سورج نہیں نکلتا مگر سورج کا انتظار ضرور ملتا ہے۔ ان کے شعروں میں ہزاروں شمعیں فروزاں ہیں اور ان ہزاروں شمعوں کے گرد صد ہزار پرچھائیاں رقص کر رہی ہیں۔ جاں نثار انہیں پرچھائیوں کے شاعر ہیں۔ ایک اور شعر یاد آیا۔ اتفاق سے یہ شعر بھی جاں نثار کا نہیں۔ مگر یہ جاں نثار کا بھی ہو سکتا تھا۔

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ بات بری لگے کہ بات تو کر رہا ہوں جاں نثار اختر کی اور شعر سنا رہا ہوں مجاز اور غالب کے ـــ لیکن ذرا تو سوچئے کہ اپنے شعر نہیں سنا رہا ہوں اور اپنے شعر اس لئے نہیں سنا سکتا کہ اس مضمون میں میرے شعر کھپ نہیں سکتے ـــ میں ان کا ہم عصر نہیں ہوں۔ میں اُن کے بعد کی بات ہوں۔

زمانے کی بات میں نے جان بوجھ کر چھیڑی ہے۔ زمانے کا تعین شاعر کی تفہیم کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ شعر کو زمانہ ہی تو بامعنی بناتا ہے اور سچ پوچھئے تو وہی شعر زندہ رہتا ہے جو اپنے عہد کی معنویت کا حامل ہو۔ میں زندگی کو "لامعنی" نہیں مانتا۔ اس لئے میں آل احمد سرور کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ جاں نثار کی شاعری میں زندگی لامعنویت کے ساتھ اُس کی عظمت کا رجز ہے۔" آل احمد سرور نے اپنی شاعری، اپنے تنقیدی مضامین اور "پچھلے پہر" کے مقدمہ میں "زندگی کی لامعنویت" کو برتا ہے۔ اور نتیجہ میں بے معنی شاعری کی ہے اور نقصان دہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں "پچھلے پہر" کی جھلملاتی پیشانی پر سرور صاحب کا مقدمہ کلنک کا داغ ہے۔ یہ نہ ہوتا تو "پچھلے پہر" زیادہ بامعنی کتاب بن جاتی۔ خواجہ احمد فاروقی بھی سرور ہی کے سلسلے کے فرد ہیں اس لئے ۲۲ برس کے پرانے مراسم کے باوجود نہ وہ جاں نثار کی شخصیت سے تعارف کرا سکے اور نہ اُن کے شعروں کی تہیں کھول سکے۔ خواجہ احمد فاروقی کے دیباچۂ ثالث نے بھی "پچھلے پہر"

ہر ایک غم کو خوشی کی طرح برتنا ہے
یہ دور وہ ہے کہ جینا بھی اک ہنر سا لگے
میں سوچتا تھا وطن جاکے بڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا بیٹے میاں

یہ مشاہدات مُنفد کا مزا بگاڑ دیتے ہیں اور جاں نثار کی آواز میں کڑواہٹ آجاتی ہے۔

کوئی ثبوت ملیگا تو کیوں نہ مانیں گے
سُنا تو ہے کہ بُرا وقت ٹل بھی جاتا ہے
اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلا
چند سکے ہیں مرے ہاتھ پہ چھالوں کی طرح
صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اُس وعدہ شکن کو بھولیں
جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم، تو یہ رسم اُٹھا دی جائے
ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ رہتے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

یہ مشاہدات انہیں پھر حوصلہ بھی دیتے ہیں اور وہ پھر اپنا جھکا ہوا سر اٹھاتے ہیں اور دیکھتے ہیں سے

لچک رہی ہیں شعاعوں کی سیڑھیاں پیہم
فلک سے کوئی اترتا دکھائی پڑتا ہے

جب میں جاں نثار اختر کی غزلوں کو پڑھتا ہوں تو آج بھی "یاس روایت" والی بات غلط معلوم ہوتی ہے روایتیں ان کے اسلوب کا دامن ضرور پکڑے ہوئے ہیں پر ان کی منزلِ چاک گریباں تک تو ان کی پرچھائیں نہیں جاتی۔

میں جاں نثار کو تجربات سے زیادہ مشاہدات کا شاعر مانتا ہوں۔ وہ مشاہدوں کو گنگناتے ہیں۔ وہ ــــ آنکھوں کے شاعر ہیں۔

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پروائی بھی!
جانے کس کا سبز ڈوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر
سستے داموں لے تو آتا، لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

یہ آنکھوں سے دل میں اترنے کی منزل ہے۔ جاں نثار آنکھوں سے جیتے ہیں اور پرچھائیوں میں جان ڈالتے رہتے ہیں۔

عمر بھر قتل ہوا ہوں میں تمہاری خاطر
آخری وقت تو سولی نہ چڑھاؤ یارو

تمہارے دل میں جواب بھی ہے کوئی بات آہ ہو
ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے یہاں

اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے
سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے

اب انہیں باتوں کو سنتے ہیں تو آتی ہے ہنسی
بے طرح ایمان لے آتے ہیں جن باتوں پہ ہم

اب انہیں پہچاننے میں شرم آتی ہے ہمیں
فخر کرتے تھے کبھی جن کی ملاقاتوں پہ ہم

ان اشعار میں ایک کرب ہے .... دردِ احساسِ زیاں ہے۔ اور یہ کیفیت جس منطقی منزل پر لے جاتی ہے وہ یہ ہے کہ

رات ہی رات ہے باہر کوئی جھانکے تو سہی
یوں تو آنکھوں میں سبھی خواب سحر رکھتے ہیں

اس شعر کو قنوطیت کی علامت مان کر جاں نثار اختر کو گراں زندگی قرار دینا درست نہیں۔ عقیدوں کے ٹوٹنے کی منزل میں یہ مقام آتے ہی ہیں۔ مگر جب جاں نثار کو خود یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کہاں آگئے تو وہ اپنے آپ سے بغاوت کرتے ہیں۔

ایک بھی خواب نہ ہو جس میں وہ آنکھیں کیا ہیں
اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بساؤ یارو

اور یہ کہتے ہی جیسے ان کی ویران آنکھوں میں کوئی خواب آن بستا ہے اور وہ خود ہی اس خیال کو رد کر دیتے ہیں کہ اندھیرا باہر ہے کیونکہ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ اندھیرا باہر نہیں اندر ہے۔

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے در پہ کھڑی ہے یارو

اور پھر جاں نثار زندگی کے ہاتھوں سے شمع لے کر راستوں پر آجاتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں:

اپنے تابندہ خیالوں کو چھپا مت رکھو!
روشنی کم نہیں ہوتی ہے جو بٹ جاتی ہے

اور پھر وہ اپنی ہی روشنی میں زندگی کا چہرہ دیکھتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

جتنے وعدے کل تھے اتنے آج بھی موجود ہیں
ان کے وعدوں میں ہوئی ہے کچھ کمی یہ مت کہو

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

ٹیسو کا رنگ دیکھئے!

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں

کبیر کی آواز سنئے!

سو بار کے دہرائے ہوئے لفظ نہ دہرا

اور رنگِ مومن ملاحظہ ہو!

مانا کہ انگ انگ ترا پیرہن بھی ہے
پر اس میں کچھ کرشمۂ عکسِ بدن بھی ہے

اس مجموعہ کلام میں اتنی بھیڑ ہے، اتنی پرچھائیاں ہیں کہ کبھی کبھی جاں نثار اختر کے خد و خال کو ان پرچھائیوں سے الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ خود ایک پرچھائیں بن کر پرچھائیوں کی اس بھیڑ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو یوں گم کر دینا کسی معمولی شاعر کا کام نہیں۔

میں نے سب سے پہلے ۴۲-۱۹۴۱ء میں جاں نثار اختر کا نام سنا تھا۔ میرے بڑے بھائی کی بیاض میں ان کی ایک نظم کے چند بند لکھے ہوئے تھے۔

دیکھ تاروں کی نظر بھر آگئی
رات کی چوٹی کمر تک آگئی
روح پچھلی بار سے گھبرا گئی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور آج میں جس مجموعہ کلام پر تبصرہ کر رہا ہوں، اس کا نام "پچھلے پہر" ہے یعنی وقت گزر رہا ہے اور آدھی رات سے پچھلے پہر تک تو آگئے۔ اس کے بعد تو صبح ہی کی منزل ہو سکتی ہے۔

جاں نثار اختر نے نہ صرف اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیا ہے بلکہ اردو کے مزاج کو بھی متاثر کیا ہے۔

سید حیدر عباس رضوی

کھڑکی کی باریک چِھری سے کون یہ مجھ تک آ جائے
جسم چرائے نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

یہ جو آنچل میں خوشبو باندھنے والی ہے، کسی بڑے یا چھوٹے شہر کی نہیں، یہ کسی گاؤں کی ہے اور کسی زمیندار گھرانے کی نہیں ہے۔ اس لئے اس شعر کے ساتھ وہ شعر پڑھیے۔

میں سوچتا تھا وطن ہی کے بڑر ہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے جہاں

ان دونوں شعروں کے بیچ میں آزادی کا پورا المیہ ہے۔

لیکن جاں نثار اختر کی یادوں کی بستی میں صرف یہی آنچل میں خوشبو باندھنے والی نہیں۔ کوئی اور بھی ہے۔ بلکہ کئی اور بھی ہیں۔

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

یہ محبوبہ نہیں بیوی ہے۔ مگر محبوبہ اور بیوی دونوں ہی سے بچھڑنے کا درد کتنا یکساں ہے اور درد کی اس یکسانیت سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ جدائی جاں نثار اختر کی نرم شاعری کی ایک قدر ہے اور ان کی شاعری کی تفہیم کے لئے اس جدائی کی سمجھ ضروری ہے کیونکہ اسی جدائی سے ان کی سیاسی شعور کے ڈانڈے بھی ملے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جو دلیانہ آداب وفا تھے
اس دور میں تو ان کی کہاں بات کرے ہے

یہ جو قدیم کی شعری زبان کی طرف پلٹنے کی کوشش ہے یہ بھی اپنی تنہائی دور کرنے کا ایک بہانہ ہے — تنہائی جو جدائی کا لازمی نتیجہ ہے! اور اسی لیے!

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

کا مدائی کی چادر اوڑھنے والی یہ عورت نہ محبوبہ ہے نہ بیوی۔ لگتا ہے کہ جاں نثار نے اسے ایک ذرا فاصلے سے چاہا ہے۔ پر انجام وہی جدائی!

آیئے آپ کو ایک چوتھی سے ملاؤں۔

زلفیں، سینہ، ناف، کمر
اک ندی میں کتنے بھنور

یہ ان تینوں سے مختلف ہے، نہ بیوی، نہ محبوبہ، نہ کوئی خواہش ——— یہ ایک پائی ہوئی چیز ہے ممکن ہے یہ کوئی ایسی آزاد خیال لڑکی ہو جسے جاں نثار کی شاعری پسند آ گئی ہو اور جس نے جاں نثار کو اک ندی کے اتنے بھنوروں میں غرق کر دیا ہو!

لیکن اس ناف کر، والی پر فراق گورکھپوری کا نمایاں اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو پچھلے پہر کے شاعر پہ کئی شاعروں کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً ناکافی کو دیکھئے!

عوامل بھی حصہ لیتے ہیں صدیوں پرانی روایتیں، بھولی بسری وارداتیں، کچھ ایسی پُراسرار قوتیں جنھیں ہم پوری طرح سمجھ بھی نہ پائیں، یہ سب غیر محسوس طور پر شخصیت کے اُس جزو کو بنانے بگاڑنے کا کام انجام دیتی رہتی ہیں جس سے اس کی انفرادیت کا تعین کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ماحول اور ایک ہی جیسے حالات میں پلنے بڑھنے والے لوگ بھی ایک دوسرے سے الگ مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ آسانی کے لئے ہم اس جزو کو بنیادی شخصیت قرار دے لیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جاں نثار اختر کی بنیادی شخصیت رومانوی ہے۔ ان کے مزاج کی نرمی جذباتیت اور والہانہ پن فنی رکھ رکھاؤ سے میل کھا کر انہیں انقلاب کا مغنّی تو بنا سکتا تھا انقلاب کا ہرکارہ نہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ ایک زمانے میں انقلاب کو مغنیوں سے زیادہ نقیبوں اور ہرکاروں کی ضرورت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جاں نثار اختر نے بڑے خلوص کے ساتھ یہ خدمات بھی انجام دینی چاہیں لیکن وہ اس کام کے آدمی تھے ہی نہیں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا انہیں قدم قدم پر خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس عرصہ میں نظمیں بھی لکھی جاتی رہیں غزلیں بھی اور نقاد لوگ ان نظموں غزلوں میں کسی نہ کسی معاصر کی پرچھائیاں تلاش کرتے رہے۔

جاں نثار اختر کی شخصیت بھی اُس سمندر کی طرح ہے۔ جس کی سطح ہمیشہ پرسکون رہتی ہے۔ خواہ نیچے نیچے ہزار تلاطم بپا ہو۔ اس سمندر میں کئی دھارے آ کے شامل تو ہو سکتے ہیں اُسے متلاطم نہیں کر سکتے۔ جاں نثار نے زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کو ہر دور میں اپنے اندر جذب بھی کیا۔ اور جہاں وہ اپنے طور پر اظہار میں کامیاب ہوئے ہیں وہیں ان کے خدوخال بھی واضح ہوئے لیکن جہاں ایسا نہ ہو سکا وہاں ان کے چہرے پر کسی دوسرے کے چہرے کا گمان ہونے لگا شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو جاں نثار اختر کی شناخت میں دقّت محسوس ہوتی رہی۔

جاں نثار اختر نے یہ اچھا ہی کیا۔ کہ محض اسلوب وضع کرنے ہی کو اپنی منزل نہیں سمجھا بلکہ اپنے ایماندارانہ اور فنکارانہ اظہار کی طرف متوجہ رہے۔ ویسے بھی مضطر خیرآبادی کے بیٹے اور پوری اردو فارسی شاعری کی روایات کے وارث کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے چکر میں اپنے ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھتا چنانچہ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی اپنی تعمیر میں اُس تمام اثاثے کو شامل کر لیا جو ضروری تھا۔ اصطلاحات کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ انتخابیت جاں نثار اختر کی پہچان ہے۔ مصحفی، حسرت اور موجودہ دور میں فراق کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اختر کی نئی غزلوں میں باقر مہدی کو جو فراق سے قربت نظر آئی اُس کا سبب بھی یہی ہے۔

کچھ اسی قسم کی بات "گھر آنگن" اور "روپ" کے رباعیوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جاں نثار کی شاعری میں شروع شروع ہی سے رومانوی فضا کے ساتھ ساتھ اپنی مٹی کی مہک شامل رہی ہے بہت دن پہلے وہ ہندوستانی عورت پر ایک طویل نظم کہنا چاہتے تھے پتہ نہیں وہ نظم مکمل ہوئی کہ نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ گھر آنگن کی رباعیوں کا خمیر وہیں سے لیا گیا ہے۔ فراق بھی ہندوستانی فضا اور ہندی سنسکرت شاعری کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اُسے غیر معمولی اہمیت بھی دیتے ہیں۔ مزاج اور فنی رویئے کے اعتبار سے بھی فراق اور جاں نثار اختر میں بہت کچھ مشترک ہے اس لئے اُن کی آرزوؤں کا بھی ایک دوسرے سے قریب ہونا فطری معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جاں نثار نے شعوری طور پر فراق کی آرزو کو اپنانے کی کوشش کی ہے

بشر نواز

جاگتی آنکھوں کا شاعر

جن لوگوں کی نگاہیں جاں نثار اختر کی شاعری کے اتار چڑھاؤ پر رہی ہیں، جو لوگ اُن کی شخصیت سے واقف ہیں اُن کے لئے اختر کی نئی غزل باعثِ مسرت تو ہو سکتی ہے تعجب خیز نہیں۔

دور کوئی رات بھر گاتا رہا ∴ تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا
حسن پر تاثیرِ غم ہوتی رہی ∴ اک شگفتہ پھول کمہلاتا رہا

جیسی غزلوں اور

دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یا

میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا

جیسی نظموں سے شروع ہونے والا شاعر جذبہ گرمیلن کے بلند منار جا سکتے ہیں یہیں پر ختم ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ اردو شاعری کا المیہ ہو یا نہ ہو جاں نثار اختر کا المیہ ضرور ہوتا۔ یہاں میں فن اور نظریئے کی بحث نہیں چھیڑ رہا ہوں، فنی رویئے اور فنی نظریئے کی بات پر زور دینا چاہتا ہوں۔ نظریہ یقیناً فن کی طاقت ہے لیکن اس طاقت کا غلط استعمال فن کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اگر عامل کچا ہو یا غفلت برت جائے تو جن کا اس پر سوار ہو جانا محض قیاس نہیں۔

میں اپنی بات کا ثبوت بھی جاں نثار اختر ہی کی دو نظموں سے پیش کروں گا۔ ایک نظم ہے ”امن نامہ“ اور دوسری روس کو سلام۔

دونوں نظموں کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اول الذکر نظم میں شاعر موضوع پر پوری طرح حاوی ہے جبکہ ثانی الذکر میں موضوع کمبل سے ریچھ بن گیا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محض نظریہ تخلیق فن کا ضامن نہیں ہوتا فن وجود میں آتا ہے نظریئے، شخصیت، مزاج اور فن کارانہ بصیرت کے متناسب امتزاج سے شخصیت قریبی، خارجی عوامل کی رہین منت تو یقیناً ہوتی ہے لیکن اس کا ایک حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کی تعمیر میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کسی اَن دیکھے اور بظاہر غیر موجود

ڈوبتے سفینوں کی حقیقت کو تسلیم کر لینا معمولی دل گردے کی بات نہیں ہے۔ سچ کی تاب جاں نثار اختر کے کتنے ہم عصر لا سکے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر تو سچ اور جھوٹ کے درمیانی حد فاصل سے واقف ہی نہیں اور جو واقف ہیں وہ اپنے ایسچ کی شکست سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ آنکھیں میچ لینے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں لیکن جاں نثار اختر کے اندر کا فنکار جب آنکھیں مل کر جاگتا ہے تو اسے کچھ اس قسم کے مناظر سے سابقہ پڑتا ہے۔

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں!

جنونِ شہر نوردی نے کیا دیا ہے مجھے ؟
بس اپنی آنکھ سے سب کچھ دکھا دیا ہے مجھے

کیا زندگی کے حقائق سے آنکھ ملانے کی یہی جرأت جاں نثار اختر کے ایک سچے فن کار ہونے کی دلیل نہیں؟

جاں نثار اختر نے ہماری شاعری کی روایت کے محیط پر کھڑے ہو کر اپنا
آغوشِ فکر پھیلایا ہے اور اس میں ہماری نئی حسیت۔ نئے شعور کی وہ
پہنائیاں سمیٹ لی ہیں جن میں آج تک نجانے کتنے سفینے غرق ہو چکے ہیں۔

(ڈاکٹر سید حامد حسین)

کیونکہ اتنا کچھ مشترک ہونے کے بعد بھی دونوں شعراء میں بڑا فرق ہے جس کی وضاحت کی فی الحال ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ جاں نثار کا نئی غزل تک آنا تعجب خیز نہیں ہے اور یوں مسرت انگیز ہے کہ انہوں نے اتنی شہرت اور مشقِ سخن کے بعد بھی محض وضع داری بنھانے کی بجائے اپنے آپ کی تلاش جاری رکھی اور تمام تحدیدات کو توڑتے ہوئے خود تک پہونچ گئے۔ یہ عمل آسان ہو یا نہ ہو سچے فنکار کی نشانی ضرور ہے۔ شاید ۵۸ء میں ایک بار جاں نثار اختر نے کہا تھا، "بھئی ہم تو دل اور عورت کے شاعر ہیں"۔

پھر کرامین کے منارے اور یا نکسی کے کنارے کیسے آ گئے، میں نے سوال کیا تھا جس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ کبھی کبھی زندگی کا مطالبہ فن کے مطالبوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے، وقت اور اس کے تقاضوں کا شعوری جوہر اچھے اور سچے فن کار کے لئے ضروری ہے، جاں نثار اختر کی نئی غزل کا محرک یہ ہے۔ یہ غزلیں کہہ کر جاں نثار نے کوئی ایسی انہونی بات نہیں کر دی کہ سب انگشت بدنداں رہ جائیں میرے خیال میں ان کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کے ان حصاروں کو توڑ دیا جو انہیں خود ان تک پہونچنے سے روکتے رہے اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کے لئے خود نگری کے بجائے بے جگری اور اپنے امیج کی پرستش کے بجائے فن اور زندگی سے والہانہ عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقتی شہرت اور جھوٹے اعزازات کی نظر فریب کرسیوں کو ٹھکرا کر زندگی کے خارزار میں برہنہ پا چلنا پڑتا ہے۔

تب ہی شاعر

کبھی ایسا بھی لگتا ہے　　　　زندگی بند گھڑی ہے

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

شکستہ میز پہ رکھی ہوئی یہ بند گھڑی
نہ جانے کیوں مری ہر بات کا جواب لگے

جیسے شعر کہنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر جو بھی ہے ٹھیک ہے۔
جو نہیں وہ بھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کہہ کر مطمئن ہو جائے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ جاں نثار اختر کی جاگتی آنکھوں نے انہیں مطمئن نہیں ہونے دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے دوسرے ہم عصروں کے برخلاف ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔

اس سفر کی روداد جاں نثار جیسا سچا فنکار ہی بیان کر سکتا تھا اور جب یہ روداد بیان ہونے لگی تو کئی نادیدہ طوفان بھی سامنے آئے اور کئی ڈوبتے سفینوں کے منظر بھی۔

طوفان کی آواز تو آتی نہیں لیکن
لگتا ہے سفینے سے کہیں ڈوب رہے ہیں

ہائے وہ راتوں کی دوہری چاندنی وہ جمالِ دوست وہ ماہِ تمام
دو دلوں کا وہ تصادم ہائے ہائے جیسے میخانے میں ٹکراتے ہوں جام

پوری غزل حسن و عشق کے جذبات، کیفیات، حالات اور اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے، بتکدے کی صبح، بیوفائی کی شام، شرمایا ہوا سلام، دوہری چاندنی جمالِ دوست، ماہِ تمام، ٹکرائے ہوئے جام قصہ تمام وغیرہ نے غزل کی تکمیل اور اس کی فضا کی تعمیر کی ہے، بیس سال کے نوجوان کی شاعری میں کسی اور بات کی تلاش کیا معنی، یہ غزل اپنی پوری روایت، مزاج، رنگارنگی اور طربناکی، ہر اعتبار سے مکمل ہے، پُرکشش ہے، پُرتاثیر ہے، مرصع اور پاکیزہ ہے۔ اس میں میر کا غم نہیں، مصحفی کا سوز و گداز نہیں، جرأت کی معاملہ بندی نہیں، انشا کی شوخی نہیں، مومن کی لذت پرستی نہیں، غالب کا فلسفہ نہیں، داغ کی عیش پسندی نہیں، فانی کی قنوطیت نہیں، لیکن پھر بھی یہ غزل اپنی پہچان رکھتی ہے اور بہت خوب ہے، یہ جاں نثار اختر کے پختہ شعور کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لئے اپنی طرف کھینچتی ہے اور نور و نکہت، کیف و مستی کی فضا ہی چھوٹی ہے ان کے بعد دو غزلیں، ایک ۱۹۳۵ء کی ہے

دور کوئی رات بھر گاتا رہا تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

اور دوسری ۱۹۳۹ء کی ہے

مئے کشی اب میری عادت کے سوا کچھ بھی نہیں یہ بھی اک تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

ملتی ہیں۔

پہلی غزل چھ شعروں پر مشتمل ہے، چھوٹی بحر میں ہے اور رواں دواں ہے یہ اپنے وقت میں مقبول رہی ہے، اس میں سیدھے سادے الفاظ میں وہی حسن و عشق کی بیتابیاں اور بیقراریاں پائی جاتی ہیں، غم اور ضبطِ غم کا اظہار ملتا ہے، دوسری غزل میں صرف چار اشعار ہیں، لیکن ۱۹۳۵ء کی غزل کی بات نہیں ہے، اس قدر رواں دواں بھی نہیں ہے، اس میں ترقی پسند شاعری کے اثرات بھی نمایاں نہیں ہیں۔ حالانکہ اس غزل میں اس بات کی امید کی جاسکتی تھی، وہی قدیم غزل کا انداز البتہ اس غزل میں شاعر پہلی بار اپنے بارے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ

میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ صرف شاعرانہ خیال نہیں ہے بلکہ حقیقت بھی ہے،

یہ بات حیرت کی ہے کہ ۱۹۴۴ء کی غزل کہ

ہائے وہ اک رات، ساحل، راگنی، مہتاب تم بن گئے میرے لئے کیسا سہانا خواب تم

اس دور کے سیاسی اثرات سے پاک ہے اور اس وقت کا ہندوستان جس کرب، اضطراب اور کشمکش میں مبتلا تھا، اس میں اس کا کسی قسم کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا، حالانکہ اس وقت تک اردو غزل، سیاسی شعور اور معاشرتی تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی، بلکہ اس کے برخلاف وہی حسن و عشق، اس کی بے تابیاں، بے قراریاں، رات، ساحل، راگنی، سہانا خواب، مہتاب، شبِ مہتاب ستاروں کے چراغ، ویران آنکھیں، زرد چہرہ، خشک ہونٹ، وفا کی بستی، جنوں کے دلیں، وغیرہ کے گرد پوری غزل رقص کرتی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس غزل نے انھیں نئی فضا میں داخل کیا ہے۔ اب ان کے اشعار میں زبان، بیان، انداز اور لہجے میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے اثرات معلوم نہیں کیوں اب بھی کچھ دبے دبے سے ہیں اور وہی عاشقانہ مزاج اپنے اندر دلکشی، دلفریبی اور بیقراری چھپائے ہوئے ہے۔

اس کے بعد پہلی غزل جو انھوں نے آزاد ہندوستان میں ۱۹۴۸ء میں کہی ہے۔ اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیے

سازِ بے مطرب و مضراب نظر آتے ہیں
پھر بھی نغمے ہیں کہ بیتاب نظر آتے ہیں

عبدالقوی دسنوی

جاں نثار اختر کی غزلیں

جاں نثار اختر ترقی پسند شاعروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مجاز، مخدوم، جذبی، فیض، سردار وغیرہ شامل تھے لیکن اُن کی آواز ان شعراء سے بہت کچھ مختلف رہی ہے، اُن کے یہاں لہجے میں نرمی اور شگفتگی رہی ہے تیزی اور پژمردگی نہیں رہی ہے، وہ عام فہم، نکھرے، صاف ستھرے اور دلنشیں الفاظ، تشبیہات، تمثیلات، ترکیبات استعمال کرتے ہیں، اُن کے بیان میں جلال نہیں ہے۔ جمال کارفرما ہے ان کی شاعری کی عام فضا دل کی دنیا ہے۔ آب و گل کی دنیا نہیں یعنی غم جاناں کا اثر اُن کے یہاں غالب ہے، غم دوراں کا کم کم، البتہ یہ ضرور ہوا ہے کبھی دل کی دنیا سے فرصت ملی اور دنیائے آب و گل کی سیر کرلی، تب ان کی شاعری کبھی پرچم بنتی ہے، کبھی تلوار کی باڑھ کا کام کرنا چاہتی ہے اور وہ غلامی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، ظلم اور جبر کو دھتکارتے ہیں، مظلوم کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں، مفلس اور مزدور کے درد کو اپنا درد بنالیتے ہیں اور اُن کے لئے فکرمند اور بے چین نظر آتے ہیں۔

انھوں نے شاعری اُس وقت شروع کی جب جوانی سے طفلی گلے ملتی ہے، چنانچہ اُن کی اُس دور کی شاعری جوانی دیوانی کی شاعری ہے حسن و عشق کی شاعری ہے شراب و شباب کی شاعری ہے سرمستی و بدمستی کی شاعری ہے۔ احساس و جذبات کی شاعری ہے خلوص اور سچائی کی شاعری ہے ہشیاری اور دیوانگی کی شاعری ہے۔ اسی شاعری کی وجہ سے وہ مقبولیت اور شہرت کے قلمرو میں داخل ہوئے ہیں۔ اور دوستوں میں، اہم جماعتوں میں، یونیورسٹی میں، یونیورسٹی کے باہر کی دنیا میں، اور سارے ہندوستان کے نوجوانوں تک اُن کی شہرت پہنچی اور اُن کی شاعری نے اُن سے جاں نثار اختر کے لئے خراج عقیدت اور لازوال محبت حاصل کی۔ لیکن یہ سب کچھ اُن کی عشقیہ نظموں کی وجہ سے ہوا، غزلوں کی وجہ سے نہیں، حالانکہ انھوں نے شاعری کی ابتدا غالباً غزل گوئی ہی سے کی۔

باپ مضطر خیرآبادی، غزل کی دنیا، غزل کا ماحول، غزل کا مزاج، ایسی فضا اور گرد و پیش میں انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی، کان کھول کر سننے کی کوشش کی اور دل کھول کر اس میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ماحول، مزاج اور غزل سے ابتدا کے باوجود، وہ غزل کو اتنا کچھ نہ دے سکے جتنے کی اُن سے توقع کی جا سکتی تھی، اور غزل کے سرمائے میں ویسا اضافہ نہ کر سکے جیسے کی اُن سے امیدیں وابستہ ہوئی تھیں۔

انھوں نے پہلی غزل ۱۹۳۴ء میں کہی، اور آخری غزل جو مطبوعہ صورت میں ملتی ہے ۱۹۷۰ء کی ہے۔ اس طویل عرصہ میں یعنی تقریباً ۳۷ سال کی مدت میں انھوں نے کل بیس غزلیں کہی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بیس غزلیں اس عرصہ میں ان کی نظموں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ممکن ہے اور بھی غزلیں کہی ہوں لیکن وہ کسی وجہ سے منظر عام پر نہیں آسکی ہیں یا ایسے رسائل میں شائع ہوئی ہیں جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

پہلی غزل جو انھوں نے تقریباً بیس سال کی عمر میں کہی ہے مطالعہ کیجئے اور اس کی قدر و قیمت اور رنگ و آہنگ کا اندازہ لگائیے ؎

ہائے اُن کی عمر کا رنگیں نظام
بتکدے کی صبح، میخانے کی شام
اے وہ تسلیم محبت کی ادا
اے وہ شرمایا ہوا اُن کا سلام

نوائے ساز، اوراقِ گل، بوئے گل، گل، زخم، شبنم، آنسو، ذوقِ تجسس، نگاہِ شوق، یاد، انجم، آفتاب، جام ساقی، سازِ مطرب، شراب، شورشِ بحر، چراغ، غمِ گیتی، میکدہ، بادہ خوار، ستارے، شفق، چاند، چاندنی، سرو، پھول، بہار و خزاں، کشتی، مستول، دھول، ذرہ ہائے چمن، صبحِ نو، وغیرہ الفاظ نئے معنوں اور اشاروں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اور شاعر ہجر و وصل کی الجھنوں سے نکل کر زندگی کے روز و شب اور ان کے مسائل سے دوچار نظر آتا ہے۔ اور اس طرح وہ دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح غزل کے دامن کو وسیع کرنے اور اسے نئی سمتوں کی طرف موڑنے میں کوشاں اور کامیاب نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کی آٹھ غزلیں انتخاب انجمن ترقی اردو اور "خاکِ دل" میں شائع ہوئی ہیں۔ اس دوران میں ان کی غزل گوئی نے ایک بار پھر کروٹ لی، غمِ دوراں کے اثرات گھٹنے اور غمِ جاناں کا زور بڑھنے لگا۔ البتہ آخری تین غزلوں میں غمِ دوراں پھر جھلکیاں لینے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ذیل کے اشعار ان کے دونوں قسم کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ؎

دل کو ہر لمحہ بچاتے رہے جذبات سے ہم — اتنے مجبور رہے ہیں، کبھی حالات سے ہم
نشۂ مے سے کہیں پیاس بجھی ہے دل کی — تشنگی اور بڑھا لائے خرابات سے ہم

جب بھی ہنگامِ دار و رسن آ گیا — ہم میں کچھ اور بھی بانکپن آ گیا
دیس سے جب پردیس سدھارے ہم پر یہ بھی وقت پڑا — نظمیں چھوڑیں، غزلیں چھوڑیں، گیتوں کا بیوپار کیا۔

آراستہ بزم یہ ہیں زخموں کے پیرہن — شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں
کیا یونہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے — لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

غمِ بہار و غمِ یار ہی نہیں سب کچھ — غمِ جہاں سے بھی دل کو لگا کے دیکھ ذرا

جاں نثار اختر کی ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ان کی شاعری کی زندگی اگرچہ بہت طویل ہے لیکن نظموں کے مقابلہ میں انھوں نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ حالانکہ اچھی غزلیں کہنے کی ان میں پوری صلاحیت تھی اور ہے اور وہ نئے نئے تجربے سے اسے چمکانے اور آراستہ پیراستہ کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو سمجھا اور برتا اور اپنے تجربوں سے اسے باوقار بنایا۔ موضوعات، مضامین اور فکر و خیال میں ندرت اور جدت پیدا کی اور اس طرح اس کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کی کوشش کی۔ اسلئے عام روش کو چھوڑ کر اور کمیت کے باوجود کیفیت کے پیشِ نظر جہاں ہم ان کی نظموں کو پرکھ کر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کے پیشرووں اور ہمعصروں کے درمیان ان کی غزلوں کی قدر و قیمت اور انفرادیت کی تلاش جاری رکھنی چاہیئے۔

اس مضمون کے پہلے حصے میں ۱۹۷۰ء تک کی غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں ان کے نئے مجموعے "پچھلے پہر" کی غزلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس مجموعہ کے مطالعہ کے دوران اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ بہت مختصر مدت یعنی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک کو محیط کرتا ہے۔ (ممکن ہے کہ ۱۹۷۵ء کی غزلیں بھی اس میں شامل ہوں)

ان غزلوں میں سنجیدگی، وزن اور وقار ہے۔ اچھی زبان ہے پاکیزہ خیالات ہیں۔ فکر میں گہرائی ہے لہجے میں بانکپن ہے

اس غزل کے مطالعے سے پہلی بار شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غزل کا مزاج نمایاں طور سے بدل چکا ہے۔ اب وہ اپنی غزل میں نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

وہی محفل ہے وہی رونق محفل لیکن
کتنے بدلے ہوئے آداب نظر آتے ہیں

کیا تماشا ہے کہ غنچے تو ہیں پژمردہ و زرد
خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں

قافلہ آج یہ کس موڑ پہ آ پہونچا ہے
اب قدم اور بھی بیتاب نظر آتے ہیں

کل کریں گے یہی طغیانِ گل تر پیدا
آج جو آگ کے سیلاب نظر آتے ہیں

مسکراتے ہوئے فردا کے افق پر اختر
ایک کیا سیکڑوں مہتاب نظر آتے ہیں۔

اس غزل کے علاوہ جاوداں میں سات غزلیں ہیں جن میں یہی رنگ اور مزاج ملتا ہے اور احساس کی یہی شدت اور کیفیت پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان میں غم جاناں کے اثرات کم کم ہیں۔ اور غم دوراں کا دور دورہ نظر آتا ہے

سمندر کو یقین آئے گا کس دن
کہ ساحل سے بھی اٹھ سکتے ہیں طوفاں

یہ عالم ہے ابھی تمہید عالم
یہ انساں ہے ابھی امید انساں۔

یہ گل بھی زخم، یہ شبنم بھی آنسو
تجھے دھوکہ نہ دے فصل بہاراں

ساز مطرب کچھ نہیں ہے جام ساقی کچھ نہیں
زندگی ہے آپ نغمہ زندگی ہے خود شراب

آج ذرے دکھا رہے ہیں چراغ
کل دکھائی تھی راہ تاروں نے

ایک عہد طرب کی دی ہے نوید
غم گیتی کے رازداروں نے

ستارے، شفق، چاندنی، سرو، پھول
نظر تجھ پہ ٹھہری ہزاروں کے بعد

گیا دور دورِ بہار و خزاں
بہاریں ہیں اب تو بہاروں کے بعد

فرصت عشق بھی نہیں حاصل
آج انسان ہے بہت مشغول

ہجر کی داستاں رہنے دے
کون لے اب ذرا سی بات کو طول

مرحبا انقلاب آ پہنچا
وہ جواں سال عصر نو کا رسول

ذرہ ہائے چمن کو یکجا کر
پھینک اوراق گل کا شیرازہ

صبح نو کی برات آتی ہے
کون روکے گا آج دروازہ

"جاوداں" کی یہ تمام غزلیں جو ۱۹۴۶ء اور اس کے قریب کے زمانے کی، نئے رجحانات، نئے حالات، نئے مسائل، نئے موضوعات، نئے جذبات، نئے احساسات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اور ساز، مضراب، نغمہ، محفل رونق۔ غنچہ، خار، قافلہ، خواب، مہر درخشاں، مہتاب، سازِ دوراں، ماہ تاباں، اہل جنوں، گریباں، ساحل، سمندر،

مانا کہ رنگ رنگ ترا پیرہن بھی ہے　　پر اس میں کچھ کرشمۂ عکسِ بدن بھی ہے

مندرجہ ذیل غزل مسلسل ہے جس میں محبوب کے حسن و جمال اور نور و نکہت کی دلنواز تصویریں تراشی گئی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو　　سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں　　شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
صندل سے مہکتی ہوئی پرکیف ہوا کا　　جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جاں نثار اختر آج مشہور و مقبول شعراء میں ہیں۔ ان کی نظمیں خاص طور سے عشقیہ جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری خصوصاً نوجوانوں میں مقبول رہی ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی عام مقبولیت ہے۔ ان کے یہاں سادگی اور صداقت ہے، خیالات میں ندرت ہے۔ انداز میں جدت ہے۔ اور احساس میں شدت پائی جاتی ہے۔ لیکن "پچھلے پہر" کی غزلوں میں پختہ عمر پختہ شعور اور پختہ تجربات کا احساس ملتا ہے۔ چنانچہ عشق اس کے کیفیات اور حسن اور اس کی بے پناہ دلربائیوں کے باوجود، اظہار میں ٹھہراؤ، سنجیدگی، شائستگی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان سے ہٹ کر بھی ان میں کیا کیا نہیں ہے۔ ان میں اس جہانِ آب و گل کی حقیقتیں ہیں، معاشرے کی جھلکیاں ہیں۔ زندگی کی کامرانیاں ہیں۔ ناکامیاں ہیں بے کسیاں ہیں۔ اور شاعر کے تجربات، تصورات اور تاثرات کی ایک دنیا آباد ہے۔

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو　　کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اتارا ہی نہ ہو
یا　ہر ایک روح میں ایک غم چھپا لگے ہے مجھے　　یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے
یا　اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے　　زندگی رام کا بن باس لگے

اور آخر وہ تجربے کی اس منزل پر پہنچ کر بڑی جرأت مندی سے کچھ انمول باتیں کہہ جاتے ہیں۔

یا　زندگی جس کو ترا پیار ملا وہ جانے　　ہم تو ناکام رہے چاہنے والوں کی طرح
یا　ہاں خبردار! کہ اک لغزشِ پا سے بھی کبھی　　ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

صفحہ ۸۱ پر چھوٹی مگر دلنشین بحر میں پوری غزل حسن و عشق کی باتیں کم کرتی ہے۔ لیکن زندگی اور اس کے متعلق نئے مسائل، تجربات تاثرات اور حقائق کو اپنے دامن میں پوری طرح سمیٹے ہوئے ہے۔ انداز بیاں، دلچسپ، سادہ، رواں دواں اور دلکش ہے۔

صدیوں صدیوں میرا سفر　　منزل منزل راہ گزر!
کتنا مشکل کتنا کٹھن　　جینے سے جینے کا ہنر
رات کے پیچھے رات چلے　　خواب ہوا ہر خوابِ سحر

یہ بات بھی کتنی سچی ہے کہ آج ہم "سکون" پیل سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے پیل کے بغیر چین نہیں۔

ہم بھی کیا ہیں کل تک ہم کو فکرِ سکوں کی رہتی تھی　　آج سکوں سے گھبراتے ہیں چین ملے ہے پیل میں

یہ اشعار بھی اپنے اندر بڑی سچائیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ دنیا، دنیا کے لوگ ان کی فکر کے تانے بانے۔ بے رنگ عزائم، بے مقصد شب و روز، ادھوری زندگی، تہہ بہ تہہ بے راہ رویاں کہ آدمی کا وجود بے حقیقت اور اس کا ہونا نہ ہونا معلوم ہونے لگے۔

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار　　سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں　　کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

شگفتگی ہے اور اثر و تاثیر ہے۔ ان میں ان کی ان کے زمانے کی ان کے معاشرے کی زندگی مسکراتی ہوئی، مچلتی ہوئی مہکتی ہوئی دمکتی ہوئی۔ تڑپتی ہوئی ملتی ہے۔ حسن و عشق اور اس کے کیفیات و جذبات کا اظہار نہایت بانکپن کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جاں نثار اختر کے تجربہ، شعور، احساس اور ذوقِ جمال نے ان اشعار کے پردے میں بات پیدا کی ہے۔ اور کہیں صداقت کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ ان اشعار میں سرمستی، بدمستی، سوز و گداز، عشق کی باتیں، حسن کی گھاتیں بڑی دلنواز انداز میں ملتی ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

کم نہیں نشے میں جاڑے کی گلابی راتیں
اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

دل کو چھو جاتی ہے یوں رات کی آواز بھی
چونک اٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

یہ اشعار نئے انداز، نئے جذبات، نئے تجربات اور حسن و عشق کی ایسی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں جو دلوں کو چھو جاتی ہیں۔ اور اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ اختر کی یہ بھی انفرادیت اور خوبی ہے کہ اردو غزل جس میں عام طور سے محبوب کو تذکیر کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے یہاں اس طرح کے شعر بھی ملتے ہیں۔ جن میں نہ صرف محبوب صنفِ نازک کے سوا کوئی اور نہیں ہے بلکہ ہمارے معاشرے کی ہی کوئی زہرہ جبیں یا حسنِ مجسم ہے۔

دبا کے آئی ہے سینہ میں کونسی آہیں
کچھ آج ترا رنگ سانولا لگے ہے مجھے

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں احساس، جذبات اور حسن و جمال کے اچھوتے پیکر تراشے گئے ہیں۔ اور پھر جوانی کی سرشاریوں نے، شباب کی رنگینیوں نے اور حسن کی اٹھکھیلیوں نے، کبھی شرما کر، کبھی لجا کر کبھی جوانی کی ترنگ میں ڈوب کر اٹھتے بیٹھتے، چلتے، پھرتے آمنے سامنے چھپتے چھپاتے کیا کیا نہ ستم ڈھائے ہیں۔ اور شاعر کو اضطراب کی دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ کہ کبھی وہ اس چوٹ کو محسوس کرتے بیقرار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس کی یادوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اس کمال سے تو نے بدن چرایا تھا

ہمیں کو فرصتِ نظارگی نہیں ورنہ
اشارے آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے

آج تک چوٹ دبائے نہیں دبتی دل کی
کس طرح اس صنم سنگ بدن کو بھولیں

اور تہذیبِ غمِ عشق بتا دیں کچھ دل
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں۔

آنکھیں اٹھیں تو درد کے چشمے ابل پڑے
پلکیں جھکیں تو پیار کا بادل برس گیا۔

دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے
باہنوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

تیری زلفیں، تیری آنکھیں ترے ابرو ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

حال کہنا ہے کسی سے تو مخاطب ہے کوئی
کتنی دلچسپ ہوا کرتی ہیں باتیں اکثر

زلفیں، سینہ، ناف، کمر
ایک ندی میں کتنے بھنور

لاکھ طرح سے نام تیرا
بیٹھا لکھوں کاغذ پر

تو کبھی راگ، کبھی رنگ، کبھی خوشبو ہے
کیسی کیسی نہ تجھے عشوہ گری آوے ہے

حوصلہ کھو نہ دیا تیری نہیں سے ہم نے
کتنی شکنوں کو چنا ہے تری جبیں سے ہم نے

لہجے کا کرشمہ ہے کہ آواز کا جادو
وہ بات بھی کہہ جاتے میرا دل بھی دکھے تا

شاعری میں چند نئے لفظوں گنگا، دالان، ساڑی، فٹ پاتھ، پیتل، برکھا، بادل، مندر، ماچس، فساد، پنڈلیوں، دیوتاؤں سنگھار وغیرہ کو برجستہ اور برمحل استعمال کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ہندی الفاظ یگ کتھا، اتہاس، دیپ، من بھید، مدھر راگ، لاؤں، گھپاؤں، ڈھلواں وغیرہ کو جاں نثار اختر نے اپنی غزلوں میں بڑی فنکاری سے استعمال کئے ہیں۔ اور انھیں بے لطف بھی ہونے نہیں دیا ہے۔ صفحہ (۴۳) پر درج غزل میں ہندی زبان اور مزاج کا اثر غالب ہے لیکن غزل کا کیف و سرور بھی قائم ہے۔ اس کی بدمستی اور سرمستی کا بھی وہی عالم ہے۔ حالانکہ ہندی الفاظ کے کثرت استعمال کی وجہ ڈر تھا کہ غزل کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ لیکن جاں نثار اختر کی فنکارانہ غزل گوئی اور ہندی الفاظ اور اسکی مزاج سے آشنائی نے اس خطرہ سے بچا لیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔ اور اس تجربہ کی داد دیجئے۔

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پہ ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں
آج ذرا للچائی نظر سے اس کو بس کیا دیکھ لیا
پگ پگ اس کے دل کی دھڑکن اتری آئے پایل میں
پیاسے پیاسے نیناں اس کے جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے سوچے ندیا بھرلوں چھاگل میں
کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

اسی لئے انھیں اپنی غزل گوئی پر ناز ہے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح منفرد ڈھنگ کیا ہے:

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا ہے
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو
غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے
ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاس روایات کہے ہے

بات سچ ہے جاں نثار اختر غزل کے مزاج داں ہیں۔ اس کے رنگ، آہنگ، اور سوز و گداز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ غزل جو رویہ اختیار کرنا چاہتی ہے۔ جیسی طبیعت چاہتی ہے جس قسم کی صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہاں نثار اختر اس پر پورے اترتے ہیں۔ اسی لئے وہ نظموں سے ہٹ کر غزلوں کی دنیا میں بھی اپنے افکار اپنے خیالات اپنے جذبات اپنے احساسات اپنے موضوعات اپنے اسلوب اور رنگ و آہنگ کی وجہ سے نہ صرف جانے پہچانے جاتے رہیں گے۔ بلکہ اپنا ایک منفرد مقام رکھیں گے۔ اسلئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی غزلوں کا مجموعہ "پچھلے پہر" اردو غزل کے سرمایہ میں خوبصورت اضافہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جاں نثار اختر آئندہ بھی اسی طرح کا خوبصورت اضافہ کرتے رہیں گے۔

نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار — یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

ذرا ان اشعار کی تلخیاں بھی گوارہ کیجئے اللہ اللہ کیسی بلندی اور کیسی پستی نظر آتی ہے۔ اور اس کے پیچھے شاعر کی جھنجھلاہٹ اپنا کام کرتی ہوئی ملتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہم — مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا
پاؤں تحت الثریٰ میں اترتے گئے — ذہن اڑتا رہا آسمانوں کے بیچ

تجربہ کی منزل کہاں جا پہنچی ہے۔ حقیقت تلخ ہے، تلخ ہی ہونا چاہیئے۔ زمانہ بڑا ستم شعار ہے۔

سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا ہم کو — بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

اور شاعر کی یہ بات بھی غور طلب کہی جا سکتی ہے۔

مزاج رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں — زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں
جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے — بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں

یہاں ان اشعار کی باتیں بھی سنئے، جاں نثار اختر زندگی کی پیچیدگیوں سے بڑی حد تک آگاہ نظر آتے ہیں۔ اور اسے برتنے کا سلیقہ جان چکے ہیں۔

جیسے جیسے زندگی پیچیدہ تر ہوتی گئی — آدمی کی اور بھی بے چارگی بڑھتی گئی
زندگی یوں تو نہ باہوں میں چلی آئے گی — غم دوراں کے ذرا ناز اٹھاؤ یارو

اور اس بات کا بھی ان کے یہاں شدت کے ساتھ احساس ملتا ہے۔

کوئے غم حیات میں سب عمر کاٹ دی — تھوڑا سا وقت وہاں بھی گزار آئے یہ نہیں

کشادہ دلی اور وسیع النظری کے نعرے لگانا الگ بات ہے اس پر عمل پیرا ہونا اور بات ہے جاں نثار اختر کے یہ اشعار انکی اس خصوصیت کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے شعرا انسان دوستی کے اس جذبے کی اشاعت کریں۔ تو یہاں کے رہنے والے بہت سی پریشانیوں اور دشواریوں سے نجات پا جائیں۔

ایک ہے زمیں تو سمت کیا حدود کیا — روشنی جہاں بھی ہو روشنی کا ساتھ دو
کیا جنوں کا واسطہ کیا خدا کا واسطہ — آدمی کے واسطے آدمی کا ساتھ دو
ہر ایک سمت سے اک آفتاب ابھرے گا — چراغ دیر و حرم تو بجھا کے دیکھ ذرا

آج شہر کی زندگی میں عجیب کشمکش سی ہے جیسی، اضطراب اور کاروباری انداز آگیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عام طور سے لوگوں کی زندگی بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ اکثر شہری گاؤں کی زندگی پسند کرنے لگے ہیں۔ جہاں انھیں سکون اور اطمینان نظر آتا ہے۔ اور بے کیف زندگی، باکیف بنی نظر آتی ہے۔ جاں نثار اختر بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔

آسودگی کی جان اگر ہے تو گاؤں میں — شہروں کا زہر گھول نہ دینا ہواؤں میں
ہر ایک شخص پریشان و دربدر سا لگے — یہ شہر مجھکو تو یارو کوئی بھنور سا لگے

ان غزلوں میں نیا لہجہ، نئی آواز، نئی سمتیں، نئے گوشے، نئی آرزوئیں اور نئی منزلوں کے ساتھ نئے نئے تجربے بھی ہیں۔ جاں نثار اختر نے بعض پرانے الفاظ کو نئے لب و لہجہ کے ساتھ استعمال کر کے ایک عجیب کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یارو، لوگو، صاحبو، میاں وغیرہ، وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں۔ بعض متروک الفاظ، دلنشیں انداز میں بھی انھوں نے پیش کئے ہیں۔ ان کی

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ تبسم 'سانولا' لگے ہے مجھے'

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں 'بے خبری' آوے ہے'

چپ ہے ہر زخم گلو، چپ ہے شہیدوں کا لہو
دست قاتل ہے کہ محنت کا 'صلہ' مانگے ہے'

شعر کا لباس میری نظر میں ایک غرغل ہے جس میں بدن کے خطوط پوری طرح نظر نہیں آتے اور اسی وجہ سے تحیر اور جستجو کے جذبے پیدا کرتے ہیں۔ تشکیک اور ابہام کے رنگ لئے ہونے کی وجہ سے ہر چیز دھندلی اور غیر واضح رہتی ہے، ٹھوس، مدافعت پیدا کرنے والی کوئی چیز ہی نہیں۔ ہر چیز میں گھلاوٹ ہے، ہر شے پگھلی ہوئی ہے، جس سے روشنی بھی ہوتی ہے اور رات بھی کٹتی ہے۔ بقول مخدوم ؏

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

رات کاٹنی ہی پڑے گی کہ اس سے مفر ہی نہیں۔ بلکہ 'رات راستے سے ہٹے تو سحر آئے'۔۔۔ اسی لطیف اور غیر مدافعتی جذبے کی وجہ سے ہے کہ اشاریت مسبیقی ہوتی جو کہ عین فن ہے۔ اگر سب کچھ ہی وثوق سے کہہ دیا، واضح خط لگا کہ اقلیدسی شکلیں پیدا کردیں۔ تو فن کہاں رہا؟ ہماری انگشت نیچر ہے اور اسکا خم آرٹ۔ مجروح سلطانپوری کے الفاظ میں 'راہِ شوق سیدھی ہے، لیکن کہیں کہیں وہ گیسوئے دلدار کی طرح سے خم ہو جاتی ہے'! غزل کے شاعر کی تکنیک، انگشت ہے اور موضوع محبوب کی زلفیں۔

ان وجوہ کی بنا پر جاں نثار اختر اول اور آخر فنکار ہیں۔ وہ کبھی 'تم ہو' نہیں کہتے، بلکہ ہمیشہ — 'لگتا ہے کہ تم ہو' ؏

ہر ایک روح میں ایک غم چھپا 'لگے ہے مجھے'

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس 'لگے'

موج گل، موج صبا، موج سحر لگتی ہے

دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اجالوں کی طرح

یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

بلند موج سے ساحل قریب لگتا ہے

ہر ایک شخص پریشان و در بدر سا 'لگے'

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو'

راجندر سنگھ بیدی

ایک خوبصورت توازن

جان نثار اختر کو دیکھ کر اردو شاعر کی ہیئت (کذائی) کے بارے میں ہمارا روایتی تصور جاگ اٹھتا ہے۔ وہی ڈھیلا ڈھالا لباس۔ منہ میں پان اور اس کی پیک میں سے چھنتی ہوئی 'سبحان اللہ'، شراب سے رعشہ، لرزہ، آپ اِدھر جا رہے ہیں، اعضا اُدھر لے جا رہے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھنے کے لئے اٹھتے ہیں، تو یوں جیسے نجد میں ناقہ اپنی شہرۂ آفاق سواری کو لے کے اُٹھے۔ یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ تاکید بدن کی کثافت پر نہیں، جسم و ذہن کی لطافت پر ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر "تتلیوں کی تلاش میں کہیں بہت ہی دور نکل جاتے ہیں"۔ جھنجھوڑے جانے پر نہ صرف خود چونک اٹھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی چونکا دیتے ہیں۔ اور پھر اسی نیم خوابی میں لوٹ جاتے ہیں، جہاں بنات النعش دن کو بھی عریاں ہوتی ہیں اور مصرعے موزوں کئے جاتی ہیں۔

اپنی مرحوم بیوی صفیہ کے زمانے میں جان نثار اختر ضرور طرحدار آدمی ہوں گے۔ ورنہ مرحومہ نے اپنے خطوں میں جھوٹ تھوڑے بولا ہے۔ لیکن جب میں اپنے تصور میں جاں نثار کو پھر سے جوان کر کے دیکھتا ہوں تو نتیجہ بہتر نہیں پیدا ہوتا۔ وہ خوب صورت ہوں گے بھی تو 'کون سا گیت سنو گی انجم'، یا 'گرلز کالج کی لاری' کی وجہ سے، جیسے جگر مرادآبادی اپنے 'شعلۂ طور' کی وجہ سے مجھے خوبصورت لگتے تھے۔ پھر بھی خیر گزری ہے ورنہ اختر صاحب نظیر اکبرآبادی کے سے 'خوش پوش' ہو جاتے تو ہم ان کا کیا کر لیتے؟..... زیب النسا مخفی نے تو کچھ اپنے مستور ہونے کی وجہ سے ہی کہا تھا ع

ہر کہ میلِ دید دارد در سخن بیند مرا

لیکن جان نثار اختر علی الاعلانیہ یہ مصرعہ دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

Genes والدین سے اولاد تک بلا تکلف منتقل ہوتے ہیں۔ اس لئے شعری دل و دماغ جاں نثار اختر نے ورثہ میں پایا۔ حضرت مضطر خیرآبادی، ان کے والد کی وجہ سے گھر میں شعری ماحول تو تھا ہی، اس لئے ان کے کان شعر کے بنیادی ترنم سے اُسی وقت آشنا تھے جبکہ مکتب میں مولوی صاحب نے اُن کے کانوں کو کھینچنا بھی شروع نہ کیا تھا۔ پھر اُن پہ آئے وہ داخلی اور خارجی زندگی کے تصادم کے دن، جن میں اُن کی شعری زندگی نے ایسی شکل پائی کہ قدیم کے لئے احترام بھی رہا اور جدید کے لئے دیدہ و در کھلے..... 'کرے ہے'، 'مانگے ہے'، 'آوے ہے'، 'لگے ہے مجھے' کی ردیفوں کے باوجود انھوں نے گزرے ہوئے کل، آج اور آنے والے کل کے بیچ ایک خوبصورت توازن برقرار رکھا ہے۔ قدیم و جدید کا رشتہ استوار کیا ہے۔ ع

جب رات گئے تیرا بدن بات 'کرے ہے'

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

"پابستگیٔ رسم و رہِ عام" سے آگے

اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے
سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے
کیا پتا ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

غزل کے اشعار کی مدد سے شاعر کے ذہنی رویے کے بارے میں رائے قائم کرنا خاصا دقت طلب کام ہے۔ یوں تو کسی بھی صنفِ سخن میں شاعر کی اپنی آواز کو پہچاننے کا عمل آسان نہیں لیکن غزل میں یہ عمل اس لئے بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اچھی غزل میں وہ سب کچھ تو ہونا ہی چاہیئے جو شاعر کہنا چاہتا ہے، لیکن بہت کچھ وہ بھی شامل ہو جاتا ہے جو غزل کی شعریات شاعر سے کہلوا لیتی ہے۔ ادھر جاں نثار اختر کی غزلوں میں جدید حسیت سے نکھر تھراتی ہوئی جو بھرپور غنائی آواز سامنے آئی ہے وہ ان کے شعری لہجہ کا ارتقائی روپ تو ہے ہی لیکن اس میں فرسودہ راہوں سے باغیانہ انحراف کا احساس بھی ملتا ہے، اور ذہنی رویے کی ایک مختلف کشادگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اوپر جو اشعار پیش کیے گئے ان کا متکلم شاعری کو گنوانے کا گہرا احساس رکھتا ہے اور اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے اسے اس بات کا بھی دکھ ہے کہ وہ شاعری کو اتنی طویل مدت تک گنوا چکا ہے کہ اب شاید اس کی تلافی ممکن نہیں۔ شعری سفر کے نقطۂ نظر سے یہ اچھا خاصہ انقلابی رویہ ہے اور شاعر کی ذہنی جرأت اور انقلابی نظر کا پتہ دیتا ہے۔ یہ باغیانہ لے "پچھلے پہر" کی بہت سی غزلوں میں ملتی ہے۔ غزل میں کسی جذبے یا خیال کی تکرار یا تعمیم پائی جائے تو اس کے بارے میں حکم لگانے میں چنداں تردد نہ ہونا چاہیئے۔ جاں نثار اختر کی نئی غزلوں کی تازگی کا ہر شخص نے اعتراف کیا ہے۔ آواز کی غنائیت اور احساس کا رچاؤ ان کے یہاں پہلے بھی تھا، لیکن ان کے لہجے کی بھرپور کیفیت اور فکر کی انفرادی شان ادھر کھل کر سامنے آئی ہے۔ ان کے شعری تجربے اور شعری اظہار میں ادھر کچھ تبدیلی تو ایسی یقیناً ہوئی ہے جس کی وجہ سے سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگی ہیں۔ وہ تبدیلی ہے؟ اس کا جواب ان کی پچھلی شاعری میں موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شروع ہی سے ایک کامیاب شاعر رہے ہیں۔ اچھے ہوئے غزلیہ ذوق کی روایت انہوں نے ورثے میں پائی۔ اظہار پر انہیں ہمیشہ قدرت رہی ہے۔ غزل ہو یا نظم وہ اپنے دل کی بات ہمیشہ بڑی نرمی، سہولت اور روانی سے کہہ لیتے ہیں۔ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں سب میں نرم آہنگی، گھلاوٹ اور شیرینی کی کیفیت ہے۔ وہ شروع ہی سے ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں اور

جاں نثار اختر کے شعر کہنے کا عمل وجی کا ہے۔ ڈوبنے اور اُبھرنے کا عمل ہے جو طاری، جاری اور ساری ہے۔ اُن کا کلام پڑھنے پر مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں ایک CATHODE ہوں جو کسی کے سر پر لگا کسی دماغی کسمساہٹ 'CEREBRAL ACTIVITY' کا گراف بنا رہا ہے۔ ہیجان زیادہ ہے تو خطوط ایک دم اوپر یا یک سر نیچے ہو جاتے ہیں، اور غور سے دیکھوں تو ان خطوں میں الفاظ بھی دکھائی دینے لگیں گے، اور شعر مجسم ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ شعر بہت عمدہ ہیں، لیکن اُن کے سلسلے میں میں جاں نثار اختر کو کوئی وقعت دینے کو تیار نہیں، کیونکہ اچھے شعر کہنا ان کی عادتِ ثانیہ ہو چکی ہے۔ وہ اچھے شعر نہ کہیں گے تو پھر کیا کریں گے؟

جاں نثار اختر کے حوالے سے مجھے اس شعری صنفِ ادب، غزل کے تحفظ کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ جس نے اسے وحشی یا نیم وحشی صنفِ ادب کہا، اب اس کے بارے میں میں کیا کہوں؟ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ یہ آج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ آج کے تقاضے اگر سیاست اور خباثت ہیں تو سب اس لئے کہ اپنے لئے جگہ بنائیں، آرام کی روٹی کھائیں اور پھر حجت کریں جس میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو۔ مغرب میں FLOWER CHILDREN کا وجود کس بات کا ثبوت ہے۔ "ہرے رام، ہرے کرشن تحریک کیا ہے۔؟"

میں نے دنیا بھر کی شاعری براہِ راست یا تراجم میں پڑھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی کیفیاتی اعتبار سے کوئی شاعری غزل کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ اس لئے بھی کہ یہ سانسوں سے بنی ہے، رگ جاں کے قریب ہے۔ کلمے سے قریب تر۔ یہ اُس امن کی ضامن ہے جس کو ہر کوئی اپنے ہی معنی پہناتا ہے۔ یہ اپنی دور رسی اور ڈسپلن سے اُس پرولتاری آمریت کی نفی کرتی ہے جنہیں انہی دنوں فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے جھٹک دیا ہے۔ اس میں فیوڈل اقدار کی کوئی بات ہی نہیں، کیونکہ فیض اسے آج کے معنوں میں استعمال کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور راشد اسے فوق پایا ہے۔ غزل صوتِ ازل ہے اور ابد تک رہے گی۔ شعر تو شعر میں نے افسانے میں حافظ کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے اور بُری طرح ناکام رہا ہوں۔ ✱

اختر صاحب کے شعر جب بھی پڑھتی ہوں دھنک کے رنگ سے بکھر جاتے ہیں۔
"پچھلے پہر" میں ان کے ذہنی سفر کے کتنے رنگ ہیں مختلف اور منفرد رنگ۔ لب و لہجے کے نئے زاویئے۔ محسوسات، اور کیفیات کے ایسے نازک لمحے ان میں دھڑکتے ہیں جنھیں صرف پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

بجمہ سمیع (حیدر آباد دکن)

بدولت اپنے اندر ایک آفاقی آن رکھتی ہے۔ ذیل کا ہر شعر توجہ کا حق چاہتا ہے۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو، یہ رسم اٹھا دی جائے

ذرا سی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا
دلِ تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا

ہر مصلحت سے فن کو چھڑاتے چلے ہیں ہم
وہ ہچکچاہٹیں گئیں، وہ پیش و پس گیا

اے دردِ عشق تجھ سے مکرنے لگا ہوں میں
مجھ کو سنبھال حد سے گزرنے لگا ہوں میں
ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں
یہ مہر و ماہ ارض و سما مجھ میں کھو گئے
اک کائنات بن کے ابھرنے لگا ہوں میں

حیران ہیں کائنات کی بے تھاہ وسعتیں
انساں کا ذہن چند کتابوں میں دھنس گیا

یہ کیا ہے کہ بڑھتے چلو بڑھتے چلو آگے
جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی

ان کا بیشتر کلام ان کے خیالات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس سارے سرمایے میں ان کی اپنی آواز ان کے قافلے کے ساتھیوں سے الگ پہچانی نہیں جاتی۔ اس شاعری کا عام رنگ تقلیدی ہے۔ اس دور کی شاعری کی کامیابی میں کلام نہیں لیکن یہ کامیابی زبان و بیان پر قدرت، پرتاثیر اظہار، ہلکے رومانی راگ، اور ذہن کے ایک پٹری پر چلنے سے عبارت ہے۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو کسی امتیاز کی حامل ہو۔ اس طرح کی شاعری سے پہلا وقتی گریز گھر آنگن کی رباعیوں میں ملتا ہے۔ جاں نثار اختر کی آواز میں جو خاص غنائی کیفیت، نرمی، اپنائیت اور رس ہے اس کا صحیح استعمال "امن نامہ"، "خاکِ دل"، اور چند نظموں کو چھوڑ کر پہلی بار بھرپور طریقے پر ان کی رباعیوں میں ہوا۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں جاں نثار اختر کو اپنی آواز کی نرم انفرادیت پر اعتماد سا ہونے لگتا ہے —— جاں نثار اختر کی طبیعت کسی صنف پر بند نہیں —— ان میں اخذ و جذب کا مادہ حیرت انگیز حد تک موجود ہے۔ ان کا ذہن طرح طرح کے اثرات کو قبول کرتا رہتا ہے۔ —— یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طرح طرح کے رنگوں کو برت کر دیکھا اور ہر صنف اور ہر رنگ میں شعر کہے۔ "گھر آنگن" کی رباعیوں کے بعد جاں نثار اختر کی نئی غزل ان کے شاعرانہ گریز کا دوسرا پڑاؤ ہے

پچھلے بیس پچیس برسوں میں ادبی رویوں میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے اور غزل بھی اس سے محفوظ نہیں۔ لیکن غزل کی نئی آواز زیادہ تر نوجوان شاعروں کے ہاں ملتی ہے —— ایک ایسے شاعر کے ہاں جس کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہو اور جو اپنی شعری پختگی کی منزلوں سے گزر چکا ہو، کسی بنیادی تبدیلی کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے۔ جاں نثار اختر اس عمر کے شاید واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنی نئی غزل میں ایک واضح شعوری انحراف کا پتہ دیا ہے۔ یہ بات عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ شاعر کا ذہنی ارتقاء مقبولیت حاصل کرنے یا ایک خاص منزل تک پہنچنے کے بعد رک سا جاتا ہے۔ جاں نثار اختر اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ خاصی کامیاب نظم نگاری کر چکنے کے بعد ان کا نئی غزل کو اس والہانہ کیفیت سے سینے لگانا اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کا نرم، رسیلا اور حسیاتی اسلوب ہم عصر آگہی اور جدیدیت کا بڑی خوبی سے ساتھ دیتا ہے۔ ذہنی رویّے کی جس تبدیلی کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ کسی نظریے یا عقیدے کے تحت نہیں۔ کسی بھی فنکار کا سب سے بڑا عقیدہ انسان کی بہتری، زندگی سے محبت اور خود اپنے سوچنے کی قوت کا اصرار ہے۔ اچھی شاعری زمانے کے عام رنگ کے سہارے نہیں چلتی۔ وہ مصلحتوں کی بیساکھی بھی نہیں چاہتی۔ وہ جرأتِ اظہار، للکار، اور پکار سے پیدا ہوتی ہے۔ اس پکار سے مراد للکار یا وہ جنگ نہیں جس کے لئے تلوار اٹھانے کی ضرورت پڑے بلکہ شاعر کی پکار، "پابستگی رسم و رہِ عام" سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر ایسا نہیں کر سکتا تو وہ اپنے لئے امتیازی مقام بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ جاں نثار اختر کی نئی غزل میں یہ لَے بار بار سنائی دیتی ہے۔ وہ فن کو ہر مصلحت سے آزاد کرنا چاہتے ہیں انہیں اس بات میں بھی شک ہے کہ حقیقت کو جس طرح سے دوسرے بیان کرتے ہیں وہ حقیقت کا سچا عکس ہے بھی کہ نہیں۔ جاں نثار اختر انسان کے بکھرنے کا بھی ذکر کرتے ہیں، اور اس پر طنز بھی کرتے ہیں کہ اس کے ذہن کو چند کتابوں میں دھنس کر نہیں —— رہنا چاہیئے۔ اور انسان کے دکھ درد کا مستقل مداوا پیش کرنے والے نظریوں کو وہ افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ذیل کے اشعار سے تین باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ شاعر ایک نئے اعتماد اور نئی ذہنی جرأت سے دل کی بات کہہ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ذہنی ارتقا جاری ہے اور تیسری یہ کہ پابستگی رسم و رہ عام" سے گریز نے ان اشعار میں ایک باغیانہ شان پیدا کر دی ہے جو غزل کی رمزیت کی

سمجھ سکے تو سمجھ، زندگی کی الجھن کو

سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

دل کو ہر لمحہ بچاتے رہے جذبات سے ہم

اتنے مجبور رہے ہیں کبھی حالات سے ہم

اتنے سادہ بھی نہیں ہم کہ بھٹک کر رہ جائیں

کوئی منزل نہ سہی راہ گزر رکھتے ہیں

رات ہی رات ہے باہر کوئی جھانکے تو سہی

یوں تو آنکھوں میں سبھی خوابِ سحر رکھتے ہیں

ذیل کی غزل کا ہر شعر بھی گہرے غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے:

انقلابوں کی گھڑی ہے

ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

کیا ہوئے رات کے راہی

راہ سنسان پڑی ہے

اب کہاں آنکھ میں آنسو

دھول پلکوں سے جھڑی ہے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک

ایک چادر سی پڑی ہے

رات رستے سے ہٹے بھی

صبح آنے کو کھڑی ہے

چھوٹے چھوٹے ذہنوں کے لوگ
ہم سے، اُن کی بات نہ کر

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں بے خبری آوے ہے

کچھ سمجھ کر ہی خدا تجھ کو کہا ہے ورنہ
کون سی بات کہی اتنے یقیں سے ہم نے

بے مرفہ زندگی کی تلافی نہیں ہے یہ
انساں سے تجھ کو پیار ہی کافی نہیں ہے یہ
تو اور مجھ کو بزم میں اِذنِ کلام دے
کیا تیری مصلحت کے منافی نہیں ہے یہ

راس اب آئیگی اشکوں کی نہ آہوں کی فضا
آج کا پیار نئی آپ و ہوا مانگے ہے
بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی، چیخ سہی
ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں
وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

گزر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح
ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

صبح کی آس کسی لمحے جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

ہائے اس وقت کو کوسوں کہ دعا دوں یارو
جس نے ہر درد مرا چھین لیا ہے مجھ سے
دل کا یہ حال کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی جرم ہوا ہے مجھ سے

سانس ویسے ہی زمانے کی رُکی جاتی ہے
وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا مانگے ہے

زمانہ آج نہیں ڈگمگا کے چلنے کا
سنبھل بھی جا کہ ابھی وقت ہے سنبھلنے کا

بہار آئے چلی جائے پھر چلی آئے
مگر یہ درد کا موسم نہیں بدلنے کا

ہزاروں سال بیتے ہیں، ہزاروں سال بیتیں گے
بدل جائے گی تقدیر انساں ہم نہیں کہتے

ان اشعار سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ذہنی رویے کی تبدیلی کا گہرا اثر حقیقت کی ترجمانی پر پڑتا ہے۔ شاعر صبح کا مژدہ دینا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے "ظلمات راستے سے ہٹے بھی" کہہ کر وہ عصری تضادات اور تقاضوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیتا ہے۔ اس نے حقیقت کے ایک پہلو کو پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اسے کلی طور پر پیش کیا ہے۔ شاعر زندگی کو اب صرف رجائیت یا قنوطیت کی فرسودہ اصطلاحوں کے آئینے میں نہیں دیکھتا۔ زندگی میں دھوپ اور چھاؤں، بلندی اور پستی، سیاہی اور سفیدی اور چوٹیاں اور وادیاں ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ زندگی سکھ کی بشارت بھی ہے اور دکھ کی زنجیر بھی۔ اس میں آگے بڑھنے کے امکانات بھی ہیں اور ایسی پر اسرار کھائیاں بھی جن کی تہہ کے راز پانے کیلئے انسان صدیوں سر کو شاں رہا۔ حقیقت کی جامعیت سے آنکھیں چرالی جائیں تو اس کی صحیح ترجمانی ناممکن ہے۔ حق و صداقت کی فتح کے لئے کوشاں ہونا ایک بات ہے۔ اور حق و صداقت کا نام لینے کو فن کی عظمت کی دلیل جاننا دوسری چیز۔ باطل سے نظریں چرا لینے سے باطل کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ جاں نثار اختر کی نئی غزلیں ان کی پچھلی شاعری سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ انہوں نے پہلی بار حقیقت کو پوری ذمہ داری کے ساتھ دیکھا ہے اور ذہنی جرأت سے کام لیتے ہوئے صداقت کو جیسی وہ ہم عصر تجربے میں انہیں ملی ہے پیش کیا ہے۔

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے

کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

کیا پتا پہونچیں گے کب منزل تلک
گھٹتے بڑھتے فاصلوں کا ساتھ ہے

پاؤں اتنے تیز ہیں اٹھتے نظر آتے نہیں
آج تھک کر رہ گیا ہے آدمی یہ مت کہو

جتنے وعدے کل تھے اتنے آج بھی موجود ہیں
ان کے وعدوں میں ہوئی ہے کچھ کمی یہ مت کہو

شاید ہمارا نام ونسب یاد ہوا نہیں
صدیاں جو سو رہی ہیں اندھیری گپھائیں

خود بخود مے ہے کہ شیشے میں بھری آوے ہے
کس بلا کی تمہیں جادو نظری آوے ہے

کھوئی کھوئی یہ نگاہیں، یہ خمیدہ پلکیں
ہاتھ اٹھائے کوئی جس طرح دعا مانگے ہے

اس طرح کے اشعار کو ذیل کے اشعار سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے:

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اس وعدہ شکن کو بھولیں

ارماں ہمیں ایک رہا ہو تو کہیں بھی
کیا جانئے یہ دل کتنی چتاؤں میں جلا ہے

اب دل کے کہاں گرد وہ مہتاب سے ہے ہیں
پلکوں پہ سلگتے ہوئے کچھ خواب سے ہیں

ان اشعار کو پہلے پیش کیئے گئے عشقیہ اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے جو ارتباطی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس کے شعور میں درد قطرہ قطرہ جمع ہوتا رہا ہے اور رفتہ رفتہ درد کی گہری تہہ جم چکی ہے ایسی حالت میں یک گونہ بے نیازی پیدا ہو جانا فطری ہے۔ روایت خواہ ادبی ہو یا سماجی، اس ذہنی کیفیت کے شاعر کے لیئے زنجیر پا نہیں بن سکتی وہ داستان زیست میں اپنے تجربے اور بصیرت سے اضافہ کر سکتا ہے۔ پنچایتی رویوں اور فارمولا نتیجوں کی گرفت سے ہٹ کر سوچنے کی جرأت اس میں پیدا ہو چکی ہے، نیز زندگی کی مسرت، کامرانی اور کامیابی کے ساتھ وہ اس کے دکھ درد اور چرکوں کو بھی وجود کا حصہ سمجھ کر قبول کر چکا ہے۔ دکھ کے وجود کا اعتراف کرنا اور دکھ سے سمجھوتا کرنے میں خاصا فرق ہے۔ عرفان کی راہ انحراف کے بغیر نکل ہی نہیں سکتی۔ جاں نثار اختر کی نئی غزل کے مطالعے سے ایک ایسے مرنجاں مرنج شخص کا تصور پیدا ہوتا ہے جو مسرت اور غم، دکھ اور سکھ دونوں کو یکساں بے نیازی سے جھیل سکتا ہے جو زندگی کے بلند و پست سے گزر چکا ہے اور ہر کیفیت کو گزراں سمجھتا ہے۔ اس شاعری میں ایسی بے نیازی کا احساس ہوتا ہے جس کی حدیں غنودگی سے مل گئی ہوں۔ گویا شعور جاگ رہا ہے لیکن اس کے پپوٹے نیند سے بھاری ہو رہے ہوں یا بیداری خواب کی ایک پراسرار کیفیت کے ساتھ گھل مل گئی ہو جیسے حیاتی پیکر ذہنی سطح پر بلبلوں کی طرح ابھرتے اور ٹوٹتے ہیں

جلنے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں
اک دھواں سا ہے اب تک مکانوں کے بیچ

زندگانی کی قدریں بدلنے لگیں
لوگ بٹنے لگے دو زمانوں کے بیچ

ان اشعار کو پیش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جاں نثار اختر کی نئی غزل میں روایتی شعر ہیں ہی نہیں۔ جب غزل کا معاملہ ہو تو روایتی اشعار تو ہوں گے ہی لیکن پچھلے پہر کی غزلوں میں روایتی شعر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے بعض چاہنے والے انہیں عشق و محبت کے ہلکے پھلکے رومانی رنگ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ایسا کہنا ان کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔ محبت کے کئی روپ، کئی چہرے، کئی سطحیں اور کئی رنگ ہیں اول تو ان کی نئی غزل میں عشقیہ اشعار محدود ہیں، اور جو ہیں عشق کی جذب و کشش کے نہیں، لمس و احساس کے ہیں۔ ان اشعار میں جذباتی کیفیت کم اور حسیاتی کیفیت زیادہ ہے۔ ان دونوں میں خاصا فرق ہے۔ جاں نثار اختر محبت کی جسمانیت کے شاعر ہیں ان کے عشقیہ اشعار کی تاثیر، بدن کی لطافت، خوشبو اور لمس کے احساس سے پیدا ہوتی ہے ان کے اس قبیل کے اشعار میں اگرچہ زیادہ تر حال کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ تاہم ان کی پوری غزل کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ صیغہ حال کا نہیں ماضی کا ہے۔ بدن کی لطافت کا یہ احساس بھی ایک ایسا گھاؤ ہے جو رس رس کر ختم ہو چکا ہے۔

اک جاں گداز نشہ رگ و پے میں بس گیا
سارے بدن سے رات کوئی مجھ کو ڈس گیا

موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

سو چاند بھی چمکیں گے تو کیا بات بنے گی
تم آئے تو اس رات کی اوقات بنے گی

اسی سے ملتی جلتی ردیف میں ایک اور بے پناہ غزل میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ ہم سے آج بھی دامن کشاں چلے ہے میاں
کسی پہ زور ہمارا کہاں چلے ہے میاں

جو ایک سمت گماں ہے تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یوں ہی درمیاں چلے ہے میاں

بدلتے رہتے ہیں بس نام اور، تو کیا ہے
ہزاروں سال سے اک داستاں چلے ہے میاں

ہر اک قدم ہے نئی آزمائشوں کا ہجوم
تمام عمر کوئی امتحاں چلے ہے میاں

ردیف "میاں" سے غزل کی فضا بندی میں مدد ضرور ملی ہے لیکن اگر غزل کی پوری معنوی کیفیت کو نظر میں رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ معنی کے امکانات ردیف کی تجرید سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک خاص ذہنی کیفیت نے از خود اپنے اظہار کے لیے اس نوع کی ردیفوں کو اختیار کیا ہے۔ "میاں" رہی پر بس نہیں اس مجموعے کی کئی اور غزلیں بھی اس خطابیہ لہجے کی حامل ہیں اور ان میں معنوی کیفیت ملتی ہے۔ پہلی غزل ہے۔

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے، منا لیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے
صرف کہنے کے لیے بات بڑی ہے یارو

ایک اور غزل کا مطلع ہے:

اور شعور کچھ ہلکے ہلکے خواب کی دھند میں انسانی رشتوں، بدن کی لطافتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کے بارے میں سوچتا چلا جاتا ہے۔ ایسے میں نہ غمزہ و ادا کی اہمیت ہے۔ نہ توجہ و تغافل کی۔ یوں لگتا ہے کہ دل ایک خاص طرح کی بیگانگی سے مانوس ہو چلا ہے۔

دل ہر اک حال سے بے گانہ ہوا جاتا ہے
اب توجہ، نہ تغافل، نہ ادا مانگے ہے

تم بھی اس دل کو دکھا لو تو کوئی بات نہیں
اپنا دل آپ دکھایا ہے بہت دن ہم نے

ظاہر ہے کہ ایسا شخص بات کر رہا ہے جو عمر بھر کی نظارگی اور زمانے کے سرد و گرم کو جھیلنے کے بعد ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں عمر کا دن ڈھل رہا ہے یا شب کی تاریکی بوجھل ہو چکی ہے، اور آنے والی یا جانے والی نیند نے دل و دماغ میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے اور سب کا دکھ درد بانٹنے والی نیلر اکبر آبادی کی سی آزاد منش آواز زندگی بھر کے تجربات کا رس پیش کر رہی ہے، جیسے کوئی گزرا چلا جائے اور اپنی بات کہتا جائے۔ خواہ کوئی سنے یا نہ سنے۔ یہ کیفیت نئی غزلوں میں مسلسل ملتی ہے:

مزاج رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں
"زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں"
تمام عمر کی نظارگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں
کوئی جنوں نہ رہا جب تو زندگی کیا ہے
وہ مر گیا ہے جو کچھ بھی سنبھل گیا ہے میاں
ہمارے خواب بھی بہلا نہ پائے آج ہمیں
جو رولئے ہیں تو کچھ دل بدل گیا ہے میاں
تمہارے دل میں جو اب بھی ہے کوئی بات تو ہو
ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے میاں

یہ بے حسی یا تھکن کی منزل نہیں بلکہ تجاہلِ عارفانہ سے ملتی جلتی کیفیت ہے جہاں انسان سب جانتا اور سب سمجھتا ہے لیکن سب جانتے ہوئے انجان اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دراصل بہت کم جانتے ہیں۔ یہ غنودگی آلود کیفیت اس کی ذہنی رویے کا حصہ ہے جس کا ذکر شروع میں کیا گیا تھا، یہ مستی یا سرشاری نہیں بلکہ آگہی کے اس احساس سے عبارت ہے جو ماورائی آن رکھتا ہے اس کا تار و پود خواب آلود عناصر سے تیار ہوتا ہے، کہیں ہلکا کہیں شوخ، کہیں اجلا کہیں دھندلا، کہیں صاف کہیں مبہم۔ خواب میں کوئی چیز اختیاری نہیں ہوتی۔ کسی چیز کو محسوس کیا نہیں جاتا وہ محسوس ہو جاتی ہے۔ عمل کا سلسلہ از خود جاری رہتا ہے۔ یہ اصطلاحی مجہولیت یا انفعالیت نہیں بلکہ فعل کی اثر پذیری سے عبارت ہے۔ زندگی گزر رہی ہے اس کو روک لینا کسی کے بس میں نہیں۔ اس سفر میں کئی حقائق خود بخود سامنے آتے ہیں اور کئی انکشافات خود بخود ہوتے ہیں:

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آواز پا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

"لگے ہے مجھے" کی تکرار سے صاف ظاہر ہے کہ ذہن مبصر کی ایسی آنکھ بن چکا ہے جو اگرچہ غنودگی سے بھری ہوئی ہے لیکن حقائق کے پردے خود بخود اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ نیند، رات، خمار اور خواب کے احساسات اور انکشافات کا ساتھ دینے کے لئے اردو لغات میں "لگنا" اور "دکھائی پڑنا" سے بہتر فعل نہیں ہیں جاں نثار اختر کی غزلوں کی ردیفوں میں "دکھائی پڑنا اور لگنا" کی متعدد تعریفی صورتوں کا جس کثرت سے استعمال ہوا ہے اس سے اس ذہنی کیفیت کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں "دکھائی پڑنا" اور "لگنا" میں عمل کے از خود واقع ہونے کی کیفیت غور طلب ہے:

افق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

تم پہ کیا بیت گئی، کچھ تو بتاؤ یارو
میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

ان تمام غزلوں کا لہجہ عاشقانہ سے زیادہ مفکرانہ ہے، جیسے کوئی اپنے رازوں میں دوسروں کو شریک کررہا ہو اور بتانا چاہتا ہو کہ سچ کا راستہ سنی سنائی پر یقین کرنے سے طے نہیں ہوتا ان کو خود کھوجنا پڑتا ہے نیز یہ کہ عام طور پر جو مسائل جتنے اہم سمجھے جاتے ہیں، وہ اتنے اہم نہیں ہیں اور جو جواب جتنے سہل تاکئے جاتے ہیں وہ اتنے سہل نہیں ہیں۔ یہ تاثرات حزنگی آلود فضا میں بیان ہوتے ہیں۔ ان میں رات کی دھندلی دھندلی کیفیت ہے اور ان کے معنوی اور حسیاتی پیکرات، خواب، نیند اور ماضی کی یادوں کے تلازموں سے تیار ہوتے ہیں۔

چونک چونک اٹھتی ہے محلوں کی فضا رات گئے
کون دیتا ہے یہ گلیوں میں صدا رات گئے

یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا
اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی ردا رات گئے

پچھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بند قبا رات گئے

اب بھی آتی ہے تری یاد مگر کچھ کو ایسے
ٹمٹمائے کسی جنگل میں دیا رات گئے

پھیل جاتا ہے افق تا بہ افق میرا وجود
مجھ سے بھر جاتے ہیں یہ ارض و سما رات گئے

کیا سوچتے ہیں رات میں کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے جو مجھ سے سوالات کرے ہے

کچھ جس کی شکایت ہے نہ کچھ جس کی خوشی ہے
یہ کون سا برتاؤ مرے ساتھ کرے ہے

وہ تند وقت کی رو ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکیں
ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے

جہانِ نو کے مکمل سنگھار کی خاطر
صدی صدی کا زمانہ بھی مختصر سا لگے

اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

جاں نثار اختر کی نئی غزلیں خمار آلود لہجے کی غزلیں ہیں ان کی غنائیت اور لوچ جاں نثار اختر کو اپنی شعری روایت سے ورثے میں ملا جسے انہوں نے اپنی آگہی اور بصیرت اور لہجے کی نرمی اور اس کے اثر سے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے وہ گنگناتی ہوئی ردیفوں کا سہارا لیتے ہیں۔ پچھلے بہر کی ستّر اسّی غزلوں میں صرف دو غزلیں ایسی ہیں جو قافیے کے سہارے کہی گئی ہیں باقی سب کی سب مردّف ہیں اور ردیفیں بھی ایک یا دو لفظی نہیں بلکہ آدھے آدھے مصرعے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ دکھڑی ہے یار و، بڑی ہے یار و / دعا دی جائے، اٹھا دی جائے / سنوارا ہی نہ ہو، اتارا ہی نہ ہو / آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو / لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو / فروزاں ہم نہ کہتے تھے / چراغاں ہم نہیں کہتے ایسی ردیفوں سے سماں باندھنے اور خاص طرح کی جیاتی یا ذہنی فضا پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

جاں نثار اختر کی نئی غزلیں آزادی کے بعد غزل کے نئے سرمائے میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں جدید غزل نے بہت سے بت توڑے ہیں۔ اور فکر و اظہار اور لہجے کے تنوع کے حدود کو بہت کچھ وسیع کیا ہے۔ نئی غزل کے فکری اور شعری اجتہادات مقبول و مطبوع بھی ہوئے ہیں اور متہم و مردود بھی قرار پائے ہیں۔ لیکن موجوں میں جب بھی طغیانی آئی ہے تو جہاں نئی زرخیز زمینیں ملتی آتی ہیں، وہاں کئی کھیتیاں ڈوب بھی جاتی ہیں۔ جدید غزل کے لیے یہ کم فخر کی بات نہیں کہ اردو کے ایک برگزیدہ شاعر نے غزل کے پیرائے میں اپنی آواز اور کھوئی ہوئی شخصیت کو از سرِ نو دریافت کیا اور ذہنی جرأت سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے گنگناتے ہوئے خمار آلود لہجے سے ایک ایسی شعری جہت کا اضافہ کیا ہے جو اس کے بعد انہیں سے منسوب کی جائے گی۔

ہمارے شہر میں بے چہرا لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے
جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص تک مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے
لچک رہی ہیں شعاعوں کی سیڑھیاں پیہم
فلک سے کوئی اترتا دکھائی پڑتا ہے

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے
حدودِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر نہ کوئی رقیب لگتا ہے
یہ دوستی، یہ مراسم، یہ چاہتیں یہ خلوص
کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے

ہر ایک شخص پریشان و "دربدر" سا لگے
یہ شہر مجھ کو تو یارو! کوئی بھنور سا لگے
کسے پتا ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہو گا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے
نشاطِ صحبتِ رنداں بہت غنیمت ہے
کہ لمحہ لمحہ پُر آشوب و پر خطر سا لگے

غزلیں

نذرِ خلوص

اُردو ادب کے مقبول شاعر

جاں نثار اختر

کے نام

راما نند ساگر

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

پسندِ خاطرِ اہلِ وفا ہے مدت سے،
یہ دل کا داغ جو خود بھی بھلا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں.
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھئے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایا کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے، لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

صندل سی مہکتی ہوئی پُر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

"ترقی پسند شاعروں میں جذبیؔ، فیضؔ اور
مجروحؔ کے بعد مخدومؔ نے آخری زمانے میں
غزل کی طرف توجہ دی۔ اور آج جاں نثار
اخترؔ نے غزل کو جس نئی حیثیت اور نئے
رنگ و آہنگ سے روشناس کیا ہے،
اُس کا جواب اگر کہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔
تو ایک حد تک فراقؔ کی غزلوں میں۔"
یہ مختصر انتخاب "پچھلے پہر" کی غزلوں
کا ہے جو کہ مئی ۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔

(مدیر)

موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے
ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر، راہ گزر لگتی ہے
لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح
اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں
دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح
گنگناتے ہوئے در آ کبھی اُن سینوں میں
تیری خاطر جو مہکتے ہیں شوالوں کی طرح
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح
ہم سے مایوس نہ ہو اے شبِ دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اُجالوں کی طرح
مجھ سے نظریں تو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے
میری آنکھوں میں سلگتے ہیں سوالوں کی طرح
اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلا
چند سکے ہیں مرے ہاتھوں میں چھالوں کی طرح

○

ہم نے کاٹی ہیں تری یاد میں راتیں اکثر
دل سے گزری ہیں ستاروں کی براتیں اکثر
اور تو کون ہے جو مجھ کو تسلی دیتا
ہاتھ رکھ دیتی ہیں دل پر تری باتیں اکثر
حسن شائستۂ تہذیبِ الم ہے شاید
غم زدہ لگتی ہیں کیوں چاندنی راتیں اکثر
حال کہنا ہے کسی سے تو مخاطب ہے کوئی
کتنی دلچسپ ہوا کرتی ہیں باتیں اکثر

○

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے در پہ کھڑی ہے یارو
ہم نے صدیوں انھیں ذروں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو
فاصلہ چند قدم کا ہے منا لیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو
کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو
ان کے بِن جی کے دکھا دیں گے انھیں یوں ہی سہی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو

○

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم، تو یہ رسم اُٹھا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

○

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سُنانے کے لئے ہیں

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لئے ہیں

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بُجھانے کے لئے ہیں

○

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں

اے دہر! ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

ایسے میں زلفِ یار نہ ہم سے گریز کر
ہم آج تیرے پاس پریشاں سے آئے ہیں

○

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں
آج ذرا للچائی نظر سے اُس کو بس کیا دیکھ لیا
پگ پگ اُس کے دل کی دھڑکن اُتری آئے پایل میں
چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل ٹک جائے
ایسے اُس کا گرتا آنچل اٹکے آڑی ہیکل میں
گوری اس سنسار میں مجھ کو ایسا تیرا روپ لگے
جیسے کوئی دیپ جلا ہو گھور اندھیرے جنگل میں
پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

○

ذرا سی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا
دلِ تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا
گزر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح
ابھی تو میں اُسے پہچان بھی نہ پایا تھا
معاف کر نہ سکی میری زندگی مجھ کو
وہ ایک لمحہ کہ میں تجھ سے تنگ آیا تھا
شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اس کمال سے تو نے بدن چرایا تھا
پتا نہیں کہ مرے بعد ان پہ کیا گزری
میں چند خواب زمانے میں چھوڑ آیا تھا

○

زمانہ آج نہیں ڈگمگا کے چلنے کا
سنبھل بھی جا کہ ابھی وقت ہے سنبھلنے کا
بہار آئے چلی جائے پھر چلی آئے
مگر یہ درد کا موسم نہیں بدلنے کا
یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہیں
مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا
پھرے ہیں راتوں کو آوارہ ہم، تو دیکھا ہے
گلی گلی میں سماں چاند کے نکلنے کا
تمام نشّۂ ہستی، تمام کیفِ وجود
وہ ایک لمحہ ترے جسم کے پگھلنے کا
سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا
ہمیں تو اتنا پتا ہے کہ جب تلک ہم ہیں
رواجِ چاکِ گریباں نہیں بدلنے کا

○

تمام عمر کی نظّارگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں
جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجا دہل گیا ہے میاں
سجے ہوئے ہیں کھلونے سبھی دکانوں پر
نہ جانے کس پہ ترا دل مچل گیا ہے میاں
کوئی ثبوت ملے گا تو کیوں نہ مانیں گے
سنا تو ہے کہ برا وقت ٹل گیا ہے میاں
میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

○

رہی ہیں داد طلب اُن کی شوخیاں ہم سے
ادا شناس بہت ہیں، مگر کہاں ہم سے

سُنا دیئے تھے کبھی کچھ غلط سلط قصے
وہ آج تک ہیں اسی طرح بدگماں ہم سے

ہمیں کو فرصتِ نظارگی نہیں ورنہ
اشارے آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے

ہر ایک رات نشے میں ترے بدن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کتنی صراحیاں ہم سے

نہ لفظ ہے نہ کنایہ نہ صوت ہے نہ صدا
سکوتِ شب کی نہ پوچھے کوئی زباں ہم سے

○

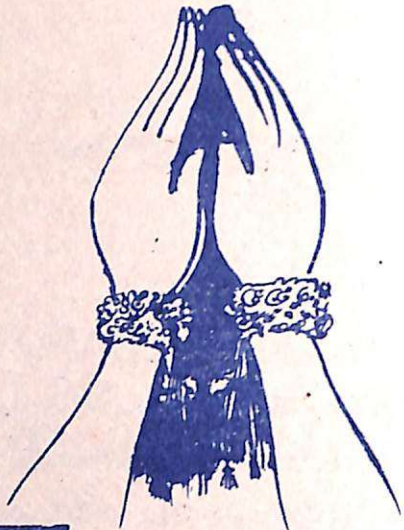
زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اُتارا ہی نہ ہو

کوئے قاتل کی بڑی دھوم ہے چل کر دیکھیں
کیا خبر، کوچۂ دلدار سے پیارا ہی نہ ہو

دل کو چھو جاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اُٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

کبھی پلکوں پہ چمکتی ہے جو اشکوں کی لکیر
سوچتا ہوں ترے آنچل کا کنارا ہی نہ ہو

شرم آتی ہے کہ اُس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو



گھرآنگن

کاسوائی

○

چونک چونک اٹھتی ہیں محلوں کی فضا رات گئے
کون دیتا ہے یہ گلیوں میں صدا رات گئے
یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا
اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی ردا رات گئے
چبھ کے رہ جاتی ہے سینے میں بدن کی خوشبو
کھول دیتا ہے کوئی بندِ قبا رات گئے
آؤ ہم جسم کی شمعوں سے اجالا کر لیں
چاند نکلا بھی تو نکلے گا ذرا رات گئے
تو نہ اب آئے تو کیا آج تلک آتی ہے
سیڑھیوں سے ترے قدموں کی صدا رات گئے
دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس
دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتا رات گئے
گھر میں پی لیں بھی تو کیا آج بھی یاد آتی ہے
فرشِ مے خانہ پہ وہ لغزشِ پا رات گئے

○

وہ لوگ جو دیوانۂ آدابِ وفا تھے
اس دور میں تو ان کی کہاں بات کرے ہے
کیا سوچ ہے، میں رات میں کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے، جو مجھ سے سوالات کرے ہے
کچھ جس کی شکایت ہے نہ کچھ جس کی خوشی ہے
یہ کون سا برتاؤ مرے سات کرے ہے
ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے
برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

یہ رُباعیاں

میں نے جاں نثار اختر کی حسین و جمیل رباعیوں کا گلدستہ جو "گھر آنگن" کے نام سے شائع ہوا ہے، نہایت لطف اندوز ہو کر کئی بار پڑھا۔ اِن رباعیوں میں ہندوستان کے اندازاً پندرہ کروڑ گھروں اور گھریلو زندگی کی نرم و نازک جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ اِن رباعیوں میں ادھ کھلی کلیوں اور اُن کی بھینی بھینی خوشبوؤں کی صفت رچی اور بسی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے تمام زبانوں کے لوک گیتوں کی گونجیں اور جھنکاریں رہ رہ کر سنائی دے جاتی ہیں۔ اِن رباعیوں میں ایک کنوارہ پن ہے۔ جسے ہم کسی موہنی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کنوارے پن کی یہ تازگی ان رباعیوں کو سدا بہار اور سدا سہاگ بنا دیتی ہے۔ "گھر اور آنگن" ہندوستانی تہذیب کے ہنڈولے ہیں۔ انہی پالنوں میں یہ رباعیاں ہلکے ہلکے جھکولے لے رہی ہیں۔ ایسی شاعری ہمارے لوک گیتوں میں بھرپور انداز سے پیش کی گئی ہے۔ بلند و درخشاں دار ادب میں یہ موضوع اور اس کے ہزاروں پہلو سورداس کے پدوں میں دکھائے گئے ہیں۔ جاں نثار اختر نے یہی نعمت ہمیں ان رباعیوں میں دے کر ہم سب پر بڑا احسان کیا ہے۔!

رکھنے والی سندری کا سراپا ملتا ہے ۔ بے حد نازک نقوش ہیں ۔ آبی لہریئے ہیں ۔ نتھرے پانیوں میں خوابیدہ رنگوں کو کھلا دینے کی کاوش ہے ۔ گھر گھر آنگن کا موضوع تشنہ رہ جاتا ہے ۔ فراق اس کے لئے قصور دار نہیں ہیں ۔ اُن کی گھریلو زندگی اس کی ذمہ دار ہے جس کا اعتراف انھوں نے بارہا کیا ہے ۔

جدید شاعروں میں ندا فاضلی نے اس طرف توجہ کی ہے ۔ مگر موضوع کی شش جہتی کی بجائے یہاں خواب کی سی پرچھائیاں ملتی ہیں اور موضوع بھی دوسرا ہے ۔ شاعر اپنے کھوئے ہوئے گھر کی تلاش میں ہے وہ کنکریٹ کے کڑے حصاروں میں اپنے آنگن کی سوندھی مٹی کو ڈھونڈتا ہے اور شہر کی سڑکوں پر اپنے گاؤں کی گلیوں کے موڑ یاد کرتا ہے ۔ ایک ایسی تلاش کی ثنویت کا المیہ ہے جو اداسی میں ڈوب کر لکھا گیا ہے ۔

آج کل شاعری خارج سے باطن اور عمومیت سے تخصیص کی طرف آ رہی ہے ۔ یہ ایک عالمگیر رجحان ہے اور رجحان بنتے بگڑتے بدلتے سنورتے رہتے ہیں ۔ یہ ایک آزمودہ کلیہ ہے ۔ میں نے اس کی طرف اس لئے اشارہ کیا کہ مجھے امید تھی کہ خارج سے باطن اور عمومیت سے تخصیص کی طرف آتے ہوئے کسی شاعر کا ذہن اپنے گھر آنگن کی جانب لوٹ آئے گا ۔ اور اردو شاعری کے اس نئے موڑ کے ڈانڈے ہماری قدیم ہندوستانی روایت سے ملا دے گا ۔ گھر آنگن میں جاں نثار اختر نے اپنی انتہائی نازک ، حساس اور خلاقانہ اُپج سے یہی کام لیا ہے ۔ گھر آنگن کی شش جہتی کو ، اس کی کنول ایسی رنگی کیفیتوں کے ساتھ اس طرح آشکار کیا ہے کہ اس کی آواز ہیرے کا ایک تراشا ہوا نگینہ بن گئی ہے جو سہاگ کے جھوم کی طرح عورت کے ماتھے پر دمک رہا ہے ۔

جانے کب سے میں جاں نثار اختر کو اس موڑ کی طرف آتا ہوا دیکھ رہا تھا ۔ کچھ تو اس کا مزاج اُس کی شاعری کے ترکیبی عناصر جس میں وادی گنگ وجمن کا حسن ، جہاں انسان نے اپنے اولین گھر بنائے ۔ اپنی بہترین خصوصیات اور اپنے کلچر کی ، اعلیٰ ترین روایات کے ساتھ نمایاں ہے ۔ پھر جاں نثار اختر کو گھر کا سکھ بھی وافر ملا ۔ جہاں صفیہ نے اسے چھوڑا وہاں سے خدیجہ نے اس کا دامن تھام لیا اور اسے وہ کمی محسوس نہ ہونے دی جہاں انسان کھوئی ہوئی جنت کی طرح کسی کھوئے ہوئے گھر کی تلاش کرتا ہے ۔ پھر اس کی شاعری کی اندرونی لے بھی اس موضوع سے کامل طور پر ہم آہنگ تھی ۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا لہجہ کبھی بلند آہنگ اور گھن گرج والا نہیں رہا ۔ اسے چیختے ہوئے رنگ پسند نہیں ۔ اس کی شاعری دھیمی دھیمی آنچ پر پکتی ہے گھر کے سالن کی طرح اور اس کی تشبیہوں ، علامتوں اور استعاروں سے آنگن میں کھڑے ہوئے پیڑوں کی جھولتی شاخوں کی صدا آتی ہے کبھی تو اُس کی لے کپڑے دھوتی ہوئی بیوی کی چھپا چھپ ہے ۔ تو کبھی مسکراتی آنکھوں کے ساتھ زیر لب گنگناہٹ ، تو کبھی ایک ایسا شیریں گیت جس کی آواز صاف اور غیر مبہم ہونے کے باوجود گھر کے آنگن سے باہر نہیں جاتی ۔

اختر کے دھیمے دھیمے لہجے ، متوازن معتدل مزاج اور گہرے دھارے کی طرح اندر ہی اندر بہنے والے جذبے نے اس مشکل موضوع سے مکمل انصاف کیا ہے ۔ اور اردو شاعری کو ایک نیا تجربہ ، ایک الگ موضوع ، اور ایک نیا تصور عطا کیا ہے ۔ جو بیک وقت قدیم بھی ہے اور جدید بھی ۔

عام طور پر شاعروں اور ادیبوں نے بیوی اور محبوبہ کو الگ الگ انفرادی حیثیت دی ہے ۔ شاعروں نے بیوی کو تو ایک سرے سے ہی نہیں گردانا ۔ ناول نگار بھی اپنا ناول وہاں ختم کر دیتے ہیں جہاں پر محبوبہ بیوی بن جاتی ہے ۔ مطلب یہ کہ اب قصے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ختم شد ۔

اختر نے "گھر آنگن" میں اس بات کو وہاں سے شروع کیا ہے جہاں اکثر ناول نگار اور افسانہ نگار اُسے ختم کرتے ہیں ، وہی اختر کے لئے ابتدا ہے ۔ ازدواجی زندگی کے سکھ دکھ ، باہمی رفاقت ، پیار اور محبت کا گھر اگداز ، جس سے اس دنیا کے کروڑوں گھر ایک خوبصورت زندگی سے جگمگاتے ہیں اور جنھیں اکثر و بیشتر شاعر و ادیب خاطر میں نہیں لاتے ۔ نہ اُسے اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں ۔ یہی اصل میں "گھر آنگن" کا موضوع ہے ۔ جہاں میاں بیوی سُکھ دُکھ بانٹ کر جیتے ہیں ۔

کرشن چندر

سُہاگ کا جھُومر

اُردو میں گھر آنگن کی شاعری بہت کم رہی ہے، مگر یہ کلیہ اردو تک ہی محدود نہیں ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کی شاعری گھر سے باہر کی شاعری رہی ہے۔ "کنارِ آب جو۔ میں اور تو" شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ شاعری کے حسین ملبوسات عورت کو پہنائے گئے ہیں، مگر گھر سے باہر، جہاں وہ خوبصورت فطرت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اُس کی ایک علامت۔ عجیب بات ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کو جنگل جنگل، صحرا صحرا تلاش کرتا ہے مگر کبھی وہاں تلاش نہیں کرتا جہاں وہ پائی جاتی ہے، یعنی اپنے گھر میں۔

مزاحیہ یا طنزیہ شاعری میں گھر کی عورت کا ذکر آتا ہے مگر اس تذکرے میں عورت ہدفِ ملامت بن کر ابھرتی ہے۔ رزمیہ شاعری میں عورت ایک نرس ہے یا روتی پیٹتی بیوہ۔ بے بس اور مجبور۔ ماحول حشر کا ہے، گھر کا نہیں۔ فلسفیانہ شاعری میں بالعموم عرش کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی فلسفی شاعر عورت کا ذکر کر دیتے ہیں تو اکثر اوقات اس کی متلون مزاجی کا گلہ کرتے ہیں کیونکہ عظیم فلسفیانہ شاعری صرف مردوں نے کی ہے، اس لئے انھیں یہ حق پہنچتا ہے، جو چاہیں کہہ دیں۔ گھر کی عورت تک اس فلسفی شاعر کے افکار نہیں پہنچتے کیونکہ وہ اس کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوتی ہے۔

چینی شاعری میں کہیں کہیں گھر کی عورت کے خوبصورت خدوخال ابھارے گئے ہیں، لیکن اس کا کیف و کم اپنے حسین ترین انداز میں سنسکرت شاعری اور اس سے متاثر ہونے والی ہندوستانی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں گھر، گھر کی عورت اور اس کے ارد گرد کے رچے بسے ماحول کی عکاسی نازک ترین جذبات کے ساتھ کی گئی ہے۔ ویسے یہ انصاف سے گریز کرنا ہوگا، اگر میں یہ کہہ دوں کہ دنیا بھر کے لوک گیتوں میں گھر کی عورت کو۔ اس کے ماحول کو۔ اس کے جذبات کو۔ اس کے مصائب اور اس کی مسرتوں کو ہمیشہ سے صحیح طریقے سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بیشتر لوک گیت عورتوں نے کہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ مردوں کی زندگی اکثر و بیشتر گھر سے باہر کی زندگی رہی ہے۔ گھر میں وہ کھانا کھانے، آرام کرنے یا بچے پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں گھر کی حیثیت ان کے نزدیک ایک ریلوے پلیٹ فارم سے زیادہ نہیں رہی۔ جہاں سے وہ دوسری گاڑی پکڑتے ہیں اور گھر، غاروں کے زمانے سے لے کر آج تک عورت اور اس کی ذات کا مرکز و مرجع رہا ہے۔

کچھ بھی ہو، اردو شاعری میں اس موضوع سے بے رخی برتنے کی عادت سی رہی ہے۔ ریختی کو میں صحیح معنوں میں گھر آنگن کی شاعری نہیں کہوں گا۔ اس میں زیادہ زور عورت کی زبان کے چٹخارے پر ہے۔ نظر جنسی مسائل پر ہے جنھیں بالعموم نچلی سطح سے دیکھا گیا ہے اس لئے مجھے ریختی میں عظمت کے بجائے رکاکت کا احساس ہوتا ہے۔

فراق کہہ سکتے تھے اور انھوں نے کہا بھی ہے۔ اور سنسکرت کے بھرپور اور بیش بہا خزانوں سے استفادہ بھی کیا ہے مگر اپنے منفرد خلاقانہ انداز کے ساتھ، لیکن چند رباعیوں کو چھوڑ کر ان کے ہاں بھی گھر آنگن کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ایک خوبصورت ہندوستانی عورت، ہندوستانی مزاج

نظروں سے مری خود کو بچالے کیسے
کھلتے ہوئے سینے کو چھپالے کیسے
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی تو ہاتھ
آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

O

ہر صبح اُٹھے اٹھ کے اندھیرے سے نہائے
آنکھیں جو اٹھائے بھی تو نظریں نہ ملائے
راتوں کا مگر بھید چھپائے نہ چھپے
بھیگے ہوئے بالوں سے جھلک سی آجائے

O

گھریلو جیون کی ہر آن بدلتی ہوئی ایسی سینکڑوں تصویریں ہیں جو آپ کو اختر کی شاعری کے درپن میں جھلملاتی ہوئی نظر آئیں گی جی چاہتا ہے کہ آپ کو کچھ اور رباعیات اور قطعات بھی سناؤں، مگر پھر سوچتا ہوں کہ آپ کے لئے پھر بچے گا کیا؟ آپ خود دیکھئے، اور پڑھئے، زبان و بیان کی سلاست کا اندازہ کیجئے، جس میں ہمارے دیش کے کلچر کی سوندھی خوشبو رچی ہے۔

اختر کی وسیع النظر شاعری گھریلو جیون کی ساری خوشیاں، اپنی مانگ میں بھرتے ہوئے بھی یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے

بس اپنے ہی گھر کا سکھ تو کچھ بھی نہ ہوا
ہر گھر کو ملے گی گھر کی راحت کس دن
کس روز ہر اک صحن میں مہکیں گے گلاب
آنگن آنگن بسے گی جنّت کس دن

O

"گھر آنگن" کی شاعری کل یا آج کے مخصوص فارمولوں کی شاعری نہیں ھے بلکہ شاعر کے تلوّن، ندرت طبع اور تنوع کی آئینہ دار ھے۔ قابلِ قدر بات یہ ھے کہ شاعر نے وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ تجربات کی دھوپ سے صرف سر کے بال ہی نہیں چمکائے ھیں بلکہ اپنے ذھن کے اُن گوشوں کو بھی منور کرنے کی کوشش کی ھے جو ORTHODOX قسم کی ترقی پسندی کے غبار سے اَٹے ھوئے تھے SOCIAL COMMITMENTS کا صحیح مطلب غالباً یہی ھے کہ WAR AND PEACE لکھنے والا ٹالسٹائی ANNAKERNIN بھی لکھے۔ جاں نثار اختر کے ھاں "مِرا استالن" سے لے کر گھر آنگن تک شاعری نہ صرف اُن کے ذھنی سفر کی روداد ھے بلکہ یہ COMMITMENTS کے وہ نئے افق ھیں جو ایک بالغ نظر فنکار کی طرح اُن کے ھاں وسیع سے وسیع تر ھوتے ھوئے نظر آتے ھیں۔"

ڈاکٹر اسلم پرویز

کہتے ہیں کہ تو غم کو بھی دیتی ہے روپ
گھر تک نہیں محدود ترا روپ انوپ
جیون کی سلگتی ہوئی راہوں میں بھی تو
جب ساتھ چلے تو نرم پڑ جاتی ہے دھوپ

○

میں اُن کا سکھی بات بتا سکتی ہوں
حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اٹھائیں گے اکیلے کب تک
میں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

○

فکروں سے اتر گئی ہے صورت اُن کی
الجھی ہوئی رہتی ہے طبیعت اُن کی
آئے گی سکھی کہاں سے ہمت اُن میں
میں ہی نہ بندھاؤں گی جو ہمت اُن کی

○

اختر کی عورت ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی گڑیا نہیں ہے، جس نے اپنی زندگی کا سارا بار اپنے شوہر کے کندھوں پر گرا دیا ہے اور خود سب مسائل سے الگ تھلگ میک اپ کئے اپنے آپ میں مگن بیٹھی ہے۔ اختر کی محبوبہ گھر کی بیوی ہے۔ کام کرنے والی عورت ہے۔

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین
قطروں سے پسینے کے سرا بور جبین
مصروف کسی کام میں دیکھوں جو تجھے
تو اور بھی مجھ کو نظر آتی ہے حسین

○

وہ اون کے ڈالے ہوئے پھندے گن کر
طے کر چکی سوئٹر کی رکھے کیا چوڑائی
اب جانے وہ کیا سوچ رہی ہے من میں
ہونٹوں میں دبائے ہوئے بننے کی سلائی

○

سوتے سے اٹھی کہ گرم کھانا کر دے
لوکا جو لگا جھلس گئی سب کایا
آیا ہے جو ہوش پوچھتی ہے اُن سے
بتلائیے سچ۔ آپ نے کھانا کھایا

○

اِس کام کرنے والی عورت کا پیار بھی انوکھا ہے۔ کروڑوں گھروں کے لئے انوکھا نہیں ہے۔ یہ سعادت اختر کی شاعری کو نصیب ہوئی کہ اُس نے اس کام کرنے والی ہندوستانی عورت کے پیار کی مختلف جھلکیاں دھنک کے مختلف رنگوں کی طرح اپنی شاعری کی محراب میں سجا کر رکھ لیں۔

آہٹ مرے قدموں کی جو سُن پائی ہے
اِک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کے
روٹی جلتی توے پہ چھوڑ آئی ہے

○

آہٹ مرے قدموں کی سُنی تو اُس پل
سوتی ہوئی بن کے پڑ گئی ہے چنچل
تلووں میں جو جا کے گُدگدایا میں نے
چہرے سے الٹ دیا ہے ہنس کر آنچل

○

اُس کی وہ چیخ "زیرلب" کے آخر میں اُس نظم میں ڈھل گئی۔ جس میں اُس کے آنسوؤں میں گھلا ہوا خون چمک رہا تھا۔

"زیرلب" بلاشبہ اردو ادب کا ایک قیمتی نثری سرمایہ ہے۔ اور ایک ہندوستانی عورت کا اپنے مجازی خدا کے لئے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہے۔ ایک ہندوستانی عورت اپنے خاوند اپنے بچوں اور ایک اچھے مستقبل کے حصول کے لئے کس لگن سے کوشاں رہتی ہے اُس کا جو دل فروز نقشہ "زیرلب" میں ملتا ہے وہ اردو ادب میں کہیں نہیں ملتا۔ میں "زیرلب" کے بارے میں اتنا کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ جاں نثار اختر کی زندگی کے یہ وہ لمحے تھے جو "گھر آنگن" کی رباعیوں میں بھی کہیں کہیں عکس ریز ہیں۔ "زیرلب" اور "گھر آنگن" کی حدیں اس مقام سے ایک دوسرے میں مدغم ہوئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں "گھر آنگن" کے بارے میں کچھ کہہ سکنے کے لئے "زیرلب" کا تفصیلی ذکر کرنا بے حد ضروری ہے۔

جن حالات میں صفیہ، اختر سے جدا ہوئی اور بچوں کو ماں کی محبت سے محروم کر گئی، وہ حالات جوں کے توں تھے۔ اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ سماج ویسا ہی بے رحم تھا۔ حالات ویسے ہی ناسازگار تھے اور اختر بے بسی سے یہ سب دیکھتا رہا تھا۔ اور اس کے انسان دوستی کے نظریئے اور سماج کو بدل ڈالنے کے منصوبے اُس کے کام نہ آسکے تھے۔ کیونکہ وہ خود ایک عام انسان تھا جس کے پاس وہ ذرائع نہیں تھے جن سے سماج کے پورے ڈھانچے کو بدلا جا سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کا ایک پورا دستہ بوسیدہ قدروں کی فوج پر حملے کے لئے تیار تھا لیکن دشمن، فنکاروں کی بہ نسبت زیادہ ہوشیار تھا اور ہر بار ہر حملے سے بچ نکلتا تھا۔ اختر جیسے حسّاس شاعر کے دل و دماغ کے لئے صفیہ کی موت کا صدمہ بڑا جانکاہ تھا۔

اگر اختر معمولی قسم کا انسان ہوتا تو اس ردّعمل کے تحت دنیا کو ترک کر دینے کی سوچتا اور ہر ایک سے کنارہ کشی کر کے مزار کا مجاور بن جاتا لیکن ذہنی لحاظ سے اختر معمولی انسان نہیں، وہ ایک شاعر ہے جس نے ہمیشہ انسانوں کو ایک روشن مستقبل کا پیغام دیا ہے۔ وہ رجائی ہے قنوطی نہیں۔ یہی رجائیت اختر کے کام آئی۔ کچھ عرصہ وہ ذہنی اور قلبی لحاظ سے مفلوج رہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ زندگی کی حرارت نے اُس کے ذہن کو گرمانا شروع کیا۔ اور اسے محسوس ہو گیا کہ وہ سماج کا ایک ضروری حصہ ہے اور اس سے کٹ کر الگ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک بہت بڑے ملک کا شہری ہے، اور ایک بہت، ذہین فنکار ہے۔ اُسے اپنی زندگی بیکار نہیں سمجھنی چاہیئے۔ اور جب یہ احساس پوری طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ تو اُسے محسوس ہوا کہ اسے پھر ایک بار کسی کو چاہنا چاہیئے کسی سے پیار کرنا چاہیئے اور پیار اور خلوص کی اس روشنی سے اپنا تاریک گھر منور کرنا چاہیئے۔ اور جب اختر نے اپنے اس احساس کو زندگی دینے کا فیصلہ کر لیا تو خدیجہ نے اختر کی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھا۔

یہ لمحہ کتنا نازک ہوگا اس کا میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ یہ لمحہ کتنا نازک ہو سکتا ہے اس کا مجھے بھی احساس ہوا تھا۔ میرے ذہن کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ جب میں نے اپنی بیوی شیلا کی موت کے بعد صرف تین روز میں "سیندور کی راکھ" ناول لکھا تھا۔ اس دہلیز پر میرے بھی کچھ قدم ڈگمگا گئے تھے لیکن میں نے کسی بھی ڈگمگائے قدم کو سہارا نہیں دیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے میں نے اپنے آنگن میں کھلنے والے کواڑ بند کر دیئے تھے۔ کواڑ بند کرنا مشکل ہے یا انھیں کھلا رکھنا۔ اس میں کئی ذاتی معاملات کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن اختر نے دروازہ بند نہ کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب، کچھ ہفتے پہلے مجھے خدیجہ بھابی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ پہلی بار ملی تھیں۔ لیکن لگتا تھا جیسے برسوں سے جانتی ہیں۔

میں نے تین روز بمبئی میں گزارے۔ ان کا ایک حصہ جاں نثار اختر اور خدیجہ بھابی کے ساتھ گزرا۔ میں نے باندرہ کے اس مختصر فلیٹ میں بسی ہوئی جس جنت کا نظارہ دیکھا، وہ بہت دلفریب تھی۔ صفیہ کو جس بھرے پُرے گھر کی حسرت رہی وہ خدیجہ بھابی نے پوری کر دی تھی۔ جو کام صفیہ نے شروع کیا تھا۔ خدیجہ نے اس کی تکمیل کر دی تھی۔ جس تصویر کی روپ ریکھا صفیہ نے بنائی تھی۔ خدیجہ نے اس میں رنگ بھر کے مکمل کر دیا تھا۔ جہاں اختر کے فن اور زندگی نے کچھ منزلیں طے کیں۔ وہاں اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اسے اپنے بچوں کی تعلیم اور ان کے

فن اور شخصیت

کشمیری لال ذاکر

زیرِ لب سے گھر آنگن تک

جاں نثار اختر سے میرے ذاتی تعلقات کی عمر بہت کم ہے، یوں کہہ لیجیے کہ تعلقات ابھی لڑکپن کی منزل پر ہیں۔ لیکن اُس سے میرا ذہنی اور قلبی تعلق بہت پرانا ہے۔ اور وہ اب سنِ بلوغت سے بھی آگے نکل چکا ہے۔ میرا اور اختر کا تعارف ''زیرِ لب'' سے ہوا تھا۔ ان خطوط کے اس مجموعے سے میں اس کی زندگی کے پس منظر سے روشناس ہوا تھا۔ صفیہ اختر نے جو خطوط اختر کو اپنی مختصر سی زندگی میں لکھے اُس نے ان خطوں کو صفیہ کے انتقال کے بعد تاریخ وار ترتیب دے کر کتابی شکل دیدی تھی اور یوں جو کچھ صفیہ ایک بیوی، ایک شریکِ حیات، ایک ساتھی اور ایک محبوب کی حیثیت سے اختر کے بارے میں سوچتی رہی وہ پڑھنے والوں کے سامنے آیا۔ اُس کی وہ تمام کوششیں، امنگیں، خاکے، نقوش جن سے وہ اپنے گھر کو ایک خوشحال اور پرسکون گھر بنانا چاہتی تھی۔ دنیا والوں کی نگاہوں کے سامنے آئے۔ ایک نثر نگار کے ناطے میں نے بھی وہ خط پڑھے، ایک بار نہیں کئی بار۔ میں نے محسوس کیا کہ صفیہ، اختر کو کس بے دردی سے پیار کرتی تھی۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اختر کے لئے وقف تھا۔ لیکن اختر کے سامنے سماج کا تمام ڈھانچہ تھا جس میں ذاتی غم بھی تھے۔ اس لئے بھی کہ سماجی قدروں کا ماحول ایک عام انسان کی زندگی کے لئے سازگار نہیں تھا۔ اس استحصالی دور میں انسان دوست اختر صرف اپنے لئے نہیں بلکہ ہر ایسے نوجوان کے لئے جو وقار سے جینا چاہتا تھا۔ ایک محور اور مرکز کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس جستجو میں مصروف وہ کبھی ایک راستے پر اور کبھی دوسرے راستے پر چل نکلا۔ حسرت یہ تھی کہ وہ منزل کا تعین کر سکے اور صفیہ اس کی صحرانوردی کو آسان بنانے کے لئے ہر راستے پر اپنے جذبات کے پھول بچھاتی جا رہی تھی۔ اور یہ تمام پھول بے دردی سے کچلے جا رہے تھے۔ اور اس کی ذمہ داری سماجی قدروں کی ان چٹانوں پر تھی جو ہر لمحہ زندگی کی خوبصورتی، رعنائی اور دلکشی کو اپنے بوجھ تلے کچلنے پر آمادہ تھیں۔ صفیہ کے احساسات اور جذبات کے پھول بھی بادِ مخالف کے اُن تند تھپیڑوں کی تاب نہ لا سکے اور ایک ایسا لمحہ آگیا کہ اس کی زندگی کی تمام بہار راستوں کی گرد میں رُل کر رہ گئی۔ اس کے پاس صرف کانٹوں کی چبھن اور مسلسل چبھن سے بنے زخم رہ گئے۔ اور وہ زخم دھیرے دھیرے اس کے سینے میں دہکنے لگے۔ اور وہ زخموں کی اس آگ میں آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور اس طرح سلگ سلگ کر آخر بجھ گئی۔ ایک شمع جھکّڑ کے ریلوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گئی اور اندھیرے کی گہری تہوں پر اپنی کمزور لو کو سہارا دے کر آخر سو گئی۔

ناسازگار حالات اور راستوں کے پیچ و خم سے الجھتے رہنے والا اختر ایک دشوار گذار راستے کے ایک بڑے ہی خطرناک موڑ پر کھڑا تھا۔ اس موڑ پر کھڑے ہو کر اس نے نیچے پھیلی ہوئی فنا کی بھیانک کھائی کو دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ سماج کے بے رحم ہاتھ ننگی تلواروں کی طرح اس کی طرف لپک رہے تھے اور یہ وہی ہاتھ تھے جنہوں نے نہایت بے رحمی سے صفیہ کو اسی خطرناک موڑ سے فنا کی کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے صفیہ کی ساڑی کا پلّو ابھی ابھی اس کے ہاتھ سے کھسکا تھا۔ اُس کے گیسو ابھی ابھی اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی سانسیں کچھ ہی دیر پہلے اس کی سانسوں سے ٹکرائی تھیں۔ اور جذباتی اور حسّاس اختر چیخ اٹھا اور

پڑھتی ہوں جو خط تو کڑھ کے رہ جاتی ہوں
آتا ہے انہیں مجھ کو ستانے میں مزا
یہ تک نہیں لکھیں گے کہ وہ کیسے ہیں
کچھ ہوگا نہ بس پیار کی باتوں کے سوا

○

آتی ہے جھجک سی ان کے آگے جاتے
وہ دیکھتے ہیں کبھی کبھی تو ایسے
گھبرا کے میں باہوں میں سمٹ جاتی ہوں
لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں پہنے جیسے

○

ادھو یہ سب ایسے لمحے ہیں جو ایک شاعر کی زندگی میں بھرپور دلکشی اور تاثر کے ساتھ آئے ہیں۔ اور گزرتے ہوئے اس کے ذہن پر اپنی خوبصورت چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ ماضی اور حال کا یہ سنگم، گنگا اور جمنا کا سنگم ہے، جی چاہتا ہے اس مقام پر کھڑے ہو کر انہی لمحوں کی ہلکی ہلکی پھوار سے شرابور ہوتے رہیئے۔

یہ رباعیاں ایک پُرسکون ہندوستانی گھر کی عمارت ہیں۔ لگے سنگِ مرمر کے مختلف رنگوں کے پتھر ہیں جن سے یہ سادہ لیکن پُروقار عمارت تشکیل پائی ہے۔ یہ رباعیاں رنگ و بو کے چھوٹے چھوٹے قافلے ہیں۔ جن سے منزلوں کی روپ ریکھا بن رہی ہے۔ یہ وہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت شمعیں ہیں جن سے دل کی محفلیں روشن ہوتی ہیں، یہ وہ ہلکی ہلکی لہریں ہیں جو گنگا اور جمنا کی روانی بن کر انسانی سماج کے سرسبز کھیتوں کی آبیاری کرتی ہیں۔ جن کے اندر جذبات و احساسات کی کلیاں کھل کر ماحول کو معطر کر رہی ہیں۔ جاں نثار اختر اس شعری کارنامے کے لئے یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔

○

"گھر آنگن" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کو فارسی رسم خط کی بجائے دیوناگری رسم خط میں تبدیل کیا جائے تو نہ صرف کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی بلکہ اس کے حسن میں اضافہ ہی ہوگا۔ اردو کو ہندی سے قریب کرنے کے لیے ایسی تصانیف کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔"

(ضیاث صدیقی)

مستقبل کا دھیان ہے ۔ اسے خدیجہ کے احساسات اور جذبات کی قدر ہے ۔

بات چیت کے دوران اختر نے ذکر کیا کہ وہ ان دنوں "گھر آنگن" کے عنوان سے رباعیات کا ایک مجموعہ ترتیب دے رہا ہے ۔ رباعیات کا مجموعہ ترتیب دینا میرے لئے کوئی بڑی چیز نہیں تھی ۔ لیکن جب اختر نے مجھے کچھ رباعیاں سنائیں تو مجھے وہ چیز واقعی بہت بڑی لگی ۔ "زیرِ لب" سے "گھر آنگن" تک کا فاصلہ اختر کی جذباتی اور احساساتی زندگی کا ایک سفر ہے ۔ اس طویل سفر کی داستان فقط ایک نقطہ پر سمٹ گئی ہے اور وہ نقطہ ہے اختر کی موجودہ زندگی کا سنگِ میل ۔ "گھر آنگن" کی رباعیاں ۔ جہاں اس کے ماضی اور مستقبل ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں اور اختر کے فن کو نکھرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ۔ ہلکے اور گہرے رنگوں کی کچھ تصویریں ہیں جن میں محبت کے وہ لمحے قید ہیں جن لمحوں سے ایک پُر امن اور خوشحال گھرانے کی مکمل عمارت تشکیل پاتی ہے ۔ وہ ساڑی کا الجھنا ۔ وہ آٹے میں ہاتھوں کا سنا ہونا ۔ وہ بکھرے بالوں کی مہک وہ چوڑیوں کا چھنا کا ۔ وہ انتظار کا دکھ ۔ وہ وصال کا رنگ ۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے لمحے بند ہیں "گھر آنگن" میں ۔ ذرا آپ بھی سنئے ایسے کچھ خوبصورت لمحوں کی کھنک ۔

یہ تیرا سبھاؤ ۔ یہ سلیقہ یہ سروپ
لہجے کی یہ چھاؤں ۔ گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی ، شکنتلا بھی ۔ رادھا بھی تو ہی
یگ یگ سے بدلتی چلی آئی ہے تو روپ

○

ہر صبح کو غنچے میں بدل جاتی ہے
ہر شام کو شمع بن کے جل جاتی ہے
اور رات کو جب بند ہوں کمرے کے کواڑ
چھٹکی ہوئی چاندنی میں ڈھل جاتی ہے

○

نظروں سے مری ۔ خود کو بچا لے کیسے
کھلتے ہوئے سینے کو چھپا لے کیسے
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی ہاتھ
آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

○

وہ جان کے بھی مجھ کو ستاتے ہیں کبھی
نکلوں جو نہا کے تو ڈراتے ہیں کبھی
آئینے کے سامنے نہ بدلنا کپڑے
آئینے میں عکس رہ بھی جاتے ہیں کبھی

○

کہتی ہے تمہاری مدھ بھری آنکھوں کی
مستی ہی تو مدہوش بناتی ہے مجھے
جس دن نہ پیو ، عجب سا لگتا ہے مجھے
کھلتے ہوئے تم سے شرم آتی ہے مجھے

○

ہر ایک گھڑی شاق گزرتی ہوگی
سو طرح کے وہم کرکے مرتی ہوگی
گھر جانے کی جلدی تو نہیں مجھ کو مگر
وہ چائے پہ انتظار کرتی ہوگی

○

اک بار گلے سے اُن کے لگ کر رولے
جانے کو کھڑے ہیں ۔ اُن سے اب کیا بولے
جذبات سے گھٹ کے رہ گئی ہے آواز
کس طرح سے آنسوؤں کے پھندے کھولے

○

ہر چاندنی رات اُس کے دل کو دھڑکائے
بھولے سے بھی کھڑکیوں کے پردے نہ ہٹائے
ڈرتی ہے کسی وقت کوئی شوخ کرن
چپکے سے نہ اُن کے پاس آکر سو جائے

○

گھریلو عورت کو جس کے ہاتھ گوندھے آٹے میں سنے ہوئے ہیں، جس کی آنکھوں میں کاجل نہیں بلکہ باورچی خانے کے دھوئیں کا سرمہ لگا ہے پہلی بار شاعری کا لباس پہنایا گیا ہے۔

کرشن چندر نے اپنے پیش لفظ میں کیا خوب کہا ہے "عجیب بات یہ ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کو جنگل جنگل صحرا صحرا تلاش کرتا ہے مگر کبھی وہاں نہیں ڈھونڈتا جہاں وہ پائی جاتی ہے یعنی اپنے گھر میں۔

میں اس کتاب کو ــــــ شاعری کے اس رجحان کو۔ بہت اہمیت دیتا ہوں اور اسے حقیقت پسندی کی اس تحریک کا ایک جزو سمجھتا ہوں جو اس صدی میں عالم گیر ہے۔ جس کی جھلک کبھی ستیہ جیت رائے کی فلموں میں دکھائی دیتی ہے، کبھی جیمنی رائے اور امرتا شیر گل اور چندر پرشاد کی مصوری میں۔ کبھی کبھی عصمت چغتائی اور چندر کرن سورن یک کی کہانیوں میں....

مگر پہلی بار اردو شاعری میں، شاید کسی ہندوستانی زبان کی شاعری میں یہ بات قابل غور ہے، اور شاید علامتی بھی ہے کہ آج جب دنیا کے عوام کسان اور مزدور، معمولی آدمی اور کام کرنے والی معمولی عورتیں دنیا کی سیاست پر حکومت پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ آرٹ اور لٹریچر پر بھی ان کی خوشگوار چھاپ پڑنے لگی ہے۔

اس کی خوب صورت اور معنی خیز علامت یہ کتاب ہے۔ جو کہ ایک معمولی ہندوستانی عورت کو آرٹ اور ادب کی بلندی پر پہنچا دیتی ہے۔

گھر آنگن..... جہاں میاں بیوی سکھ دکھ کو بانٹ کے جیتے ہیں۔ دنیا کی مشکلات کا مہنگائی کا، آمدنی کی کمی کا، اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی کمیابی کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر بھی محبت کو برقرار رکھتے ہیں۔ *

یہ رباعیاں تخئیل کا جال نہیں بلکہ تجربات کے تانے بانے میں کچھ رباعیاں مرد کے مشاہدات پر مبنی ہیں اور کچھ رباعیاں عورت کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اور دونوں طرح کی رباعیوں میں ایک داخلی کیفیت SUBJECTiViSM موجود ہے۔ لیکن اس داخلی کیفیت کا دائرہ شاعر کی انفرادیت تک محدود نہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز

خواجہ احمد عباس

ایک خوبصورت اور معنی خیز علامت

بمبئی کے تمام بڑھیا علاقوں میں مہاتما گاندھی روڈ پر، فلورا فاؤنٹن یا اپولو بندر کے چوراہوں پر انگریزی اور صرف انگریزی بھاشا کی بڑی بڑی، عالی شان دوکانیں دکھائی دیں گی۔ یا فٹ پاتھ کے کنارے آپ کو امریکن اور انگریزی سستے، ننگی تصویروں والے ناول بکتے ہوئے ملیں گے۔

لگتا ہے اونچے طبقے نے صرف انگریزی کو گلے لگا لیا ہے۔ انگریزی فلموں کو، انگریزی کتابوں کو، انگریزی رہن سہن کو، انگریزی بول چال کو۔ ایک بڑی اونچی بلڈنگ میں (جہاں میں اپنے دوستوں سے ملنے روز جاتا ہوں) لفٹ میں چڑھتے اترتے اسکول کے کتنے ہی بچوں بچیوں کو میں دیکھتا ہوں، بلکہ سنتا ہوں۔ یہ بچے اتر بھارتی بھی ہیں، دکھنی بھارتی بھی۔ پنجابی، کشمیری اور بنگالی ماں باپ کے بچے۔ تبتی، مگر وہ انگریزی اور صرف انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں۔

جب ہی تو لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں زیادہ انگریزی پڑھی جاتی ہے، زیادہ انگریزی بولی جاتی ہے۔ سب ہے نا تعجب کی بات ؟

کالبا دیوی کی گلیوں میں آپ کو اِکا دُکا ہندی کی کتابوں کی کوئی چھوٹی سی دوکان ملے گی یا گرگام کی گلیوں میں مرہٹی کی کتابیں نظر آئیں گی، یا محمد علی روڈ اور بھنڈی بازار کی گلیوں میں آپ کو اردو کی کتابیں بکتی دکھائی دیں گی۔

اِن چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں آپ کو کرشن چندر کے ناول ملیں گے، یہاں آپ کو راجندر سنگھ بیدی کے ناول ملیں گے عصمت چغتائی کی کہانیوں کی کتابیں ملیں گی۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر رگھوپتی سہائے فراق کی "نغمۂ گل" ملے گی۔ ساحر کی "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" ملے گی۔ سردار کی "ایک خواب اور" ملے گی۔ اور شاعری ہی کی ایک اور کتاب "گھر آنگن" نام کی ملے گی۔ جو جاں نثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں جتنی رباعیاں ہیں وہ سب ایک فرضی یا قلمی یا فلمی معشوق کی تعریف میں نہیں ہیں بلکہ اس سیدھی سادی ہندوستانی عورت کی شان میں ہیں جو کسی بازار میں نہیں بکتی، کسی "لالہ رخ کے کاشانہ" میں بصد ناز و انداز کھڑی نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہر گھر میں ہر آنگن میں ہر وقت گھریلو کاموں میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔

یہ کتاب جو دیکھنے میں اتنی ہی دبلی پتلی ہے جیسا کہ اس کا مصنف ہے۔ حقیقت میں اُردو شاعری میں بلکہ ہندوستانی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

بینٹ پاؤڈر لگی۔ ریشمی ساڑی میں ملبوس۔ ماتھے پر ٹیکا یا بندی لگائے۔ ہاتھوں میں مہندی رچائے ... ہندوستانی کوی کی پریمیکا۔ ہندوستانی شاعر کی محبوبہ تو سینکڑوں برسوں سے ہندی اردو اور دوسری زبانوں کے ادب میں جھانکتی رہی ہے لیکن سیدھی سادی

بیٹیوں کی عزت کی دہائی دی۔ اور ارباب مشاعرہ سے درخواست کی کہ اس نظم کو جس کے سننے سے طالب علموں کے اخلاق پر برا اثر پڑنے والا ہے رکوادیں ...... لڑکوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ نظم پڑھی گئی۔ جوش و خروش سے سنی گئی۔ وہ خاتون لکچرار واک آؤٹ کر گئیں۔ اُن کی رخصت پر لڑکیوں نے سکون کا سانس لیا۔ اور لڑکوں نے تالیاں بجائیں۔

اور یوں مشاعرے کی اس شام کو میں نے جاں نثار اختر کو پہلی بار دیکھا اور پہلی بار سنا۔

وقت اپنی عادت کے مطابق گزرتا رہا۔ اور جاں نثار اختر کی شاعری یونیورسٹی کی چار دیواری سے نکل کر شمالی ہندوستان میں خصوصاً پھولنے پھلنے لگی۔ اردو شعر و ادب کی زندگی میں وہ بہت خوبصورت دور تھا۔ اس زمانے کی نوجوان نسل اپنے شاعروں اور ادیبوں پہ اسی طرح پروانہ وار نثار تھی جیسے آج کل کی نئی پیڑھی فلم اسٹاروں پر جان چھڑکتی ہے۔

یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد جاں نثار اختر بھی روزی روزگار کے چکر میں گرفتار رہے۔ پھر انہیں صفیہ اختر جیسی شریک زندگی مل گئی۔ جس نے اختر کی زندگی کی دشوار راہوں کو نہ صرف یہ کہ آسان بنا دیا بلکہ اس میں اپنے پیار اور اپنی غیر معمولی خدمت اور ذہانت کے رنگ برنگے پھول بھی سجا دیے۔

جاں نثار اختر کی زندگی اور شاعری میں یہی موڑ آتا ہے جو ان کو گھر آنگن کی دیواروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مرد کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے۔ اس کے آگے کائنات اور کار کردگی کی وسعتیں پھیلی ہوتی ہیں۔ عورت کی جسمانی زندگی کی دنیا بہت محدود ہوتی ہے۔ مگر اس کے دل کی دنیا لامحدود اور بے کنار ہوتی ہے۔

عورت رہتی تو "گھر آنگن" میں ہے۔ لیکن اُس کی وفا۔ تیاگ اور خدمت کا نور کائنات کا ہالہ کئے رہتا ہے۔ ایسا کرنے میں عورت کے کسی شعوری جذبے یا سوچے سمجھے پلان کو دخل نہیں ہوتا ہے۔ کسی مصلحت اور مجبوری کے سبب بھی وہ "گھر آنگن" میں مقید نہیں رہتی ہے بلکہ وہ تو گھر آنگن کی باسی ہوتی ہے۔ اس کا گھر اس کا وطن ہوتا ہے۔ اس کا مرد اس کا عقیدہ ہوتا ہے۔ اس کے بچے اس کا کارنامہ ہوتے ہیں۔ اور اس طرح عورت کی چھوٹی سی زندگی اپنے محدود دائرے میں ایسی بے پناہ خوشیاں محفوظ رکھتی ہے۔ جس کا مرد اعتراف نہیں کرتا ہے مگر جس کے بغیر مرد کی زندگی بے نور ہوتی ہے۔ گھر آنگن کا سکھ صرف گھر آنگن ہی میں میسر ہوتا ہے۔ شراب، شباب اور دولتِ بے حساب کسی طرح اس گھر آنگن کی کمی پوری نہیں کر سکتے ہیں۔ جو ایک خدمت گزار، وفا شعار اور غم کھانے والی عورت اپنے چھوٹے سے گھر کی چار دیواری میں اپنی ایک مانوس مسکراہٹ سے مہیا کر دیتی ہے۔ ایسے ہی گھر آنگن کی جھلکیاں جاں نثار اختر کی تصنیف "گھر آنگن" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک چیز اور جو اس گھر آنگن میں دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ بھی ہے کہ اس میں عورت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ایسی عورت کی تصویر جس کے سینکڑوں روپ ہیں۔ گھر آنگن میں پائی جاتی ہے۔ گھریلو عورت وہ مذہبی مجسمہ نہیں ہوتی جس کی پرستش کی جائے۔ وہ کوئی الوہی کردار بھی نہیں ہے جسے پوجا جائے۔ وہ عام طور سے اتنی حسین و جمیل بھی نہیں ہوتی ہے کہ کسی خوب صورتی کے مقابلے میں بھیجی جا سکے۔ اس کا جسم فیتے یا وزن کی مشین پر پورا اترتا ہو یا نہیں۔ وہ میامی بیچ پر اپنے عریاں جسم کی نمائش بھی ممکن ہے نہ کر سکتی ہو۔ لیکن وہ اپنے گھر آنگن کی دنیا میں ایک مکمل بھرپور گرہستن ہوتی ہے اور کسی بھی حسینۂ عالم سے کم نہیں ہوتی ہے۔ گھر کی عورت آدرش اور معیاری بھی نہیں ہوتی ہے۔ نہ عورت کے لئے معیاری ہونا ضروری ہے۔ وہ سوسائٹی گرل کی طرح صرف نرم مصنوعی مسکراہٹ ہی نہیں بکھیرتی ہے وہ تو ہنستے ہنستے جھگڑنے لگتی ہے روتے روتے ہنسنے لگتی ہے۔ غصے میں بپھر جاتی ہے پیار میں مٹ جاتی ہے۔ دو دو پیسے کے لئے کبھی سارے گھر کو سر پہ اٹھا لیتی ہے اور کبھی بڑی سے بڑی رقم کو خاطر میں نہیں لاتی ہے۔ ایسی عورت کا پیار حاصل کرنے کے لئے مرد کو کسی ہوٹل میں کمرہ بک نہیں کرانا پڑتا ہے کسی کلب میں میز ریزرو کروانا نہیں پڑتی ہے۔ کسی تفریح گاہ میں شام نہیں محفوظ یا مخصوص کروانا ہوتی ہے۔ جاں نثار اختر کے گھر آنگن کی عورت تو منہ اندھیرے کپڑے سمیٹتی اور آنکھیں ملتی اٹھتی ہے۔ اسے میک اپ سے پہلے چولہا جلانا ہوتا ہے اور شوہر کے کپڑوں پر

سلمیٰ صدیقی

ایک خوبصورت قدم

بہت پرانی بات ہے۔

میں علی گڑھ میں اسکول کی ابتدائی جماعت میں تھی۔ صبح صبح اسکول جانا اور روز روز جانا بہت کھلتا تھا۔ ایک صبح معمول کے مطابق اسکول کی بس میں سوار ہوئی تو کالج میں پڑھنے والی نوجوان لڑکیوں میں بڑی ہلچل پائی۔ سیکنڈ ایئر کی ایک طالبہ کے ہاتھ میں اردو کا ایک رسالہ (غالباً 'ساقی') تھا اور دوسری لڑکیاں اس کو گھیرے ہوئے تھیں اور چلتی ہوئی بس میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ بس یونیورسٹی کی سڑکوں سے ہوتی ہوئی میرس روڈ کی سمت رواں تھی۔ ایک لڑکی نے ترنم سے پڑھا ؎

فضاؤں میں ہے صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلز کالج کی لاری

اشعار تو اس کے بعد بھی بہت سارے تھے۔ لیکن مجھے تو صرف یہی ابتدائی الفاظ جانے کیسے یاد رہ گئے۔ لڑکیوں کی آپس کی بات چیت سے پتہ چلا کہ یہ نظم یونیورسٹی کے ایک نوجوان شاعر جاں نثار اختر نے "گرلز کالج کی لاری" کے عنوان سے کہی ہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے اطراف و جوانب میں اس نظم کا بڑا چرچا تھا۔ لڑکیاں بالیاں اس نظم کو گنگناتی تھیں اور جانے کیوں آپ ہی آپ شرما جاتی تھیں۔

اسی زمانے کی بات ہے۔ یونیورسٹی یونین میں ایک مشاعرہ تھا۔ طلبا، سیاہ اچکنوں میں اور طالبات سیاہ برقعوں میں ملبوس تھیں۔ اور یونین کی عمارت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بڑے سلیقے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ لڑکیاں اوپر کی بالکنی میں چلمنوں سے لگی بیٹھی تھیں اور نیچے جھانک رہی تھیں۔ لڑکے اوپر عالم بالا۔ بلکہ "عالم بالکنی" کے نظارے میں مشغول تھے۔ اسی وقت صدر مشاعرہ نے جاں نثار اختر کے نام کا اعلان کیا۔ جاں نثار اختر اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے بلکہ اور زیادہ بگاڑتے ہوئے سامنے گئے۔ لڑکوں نے باآواز بلند فرمائش کی۔ گرلز کالج کی لاری۔ گرلز کالج کی لاری۔

جاں نثار اختر نے نظم شروع کی۔ محض چند اشعار ہی سنا پائے تھے کہ اچانک طالبات کے ساتھ آئی ہوئی فارسی کی ایک لکچرر نے جو تقریباً نصف صدی اس عالم فانی میں گزار لینے کے باوجود غیر شادی شدہ تھیں اور مردوں سے بجا طور پر بیزار رہتی تھیں۔ ایک بڑی کرخت آواز میں چلا کے کہا۔

"چپ کیجئے۔ بند کیجئے اس شاعری کو"
تھوڑی دیر کے لئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ان خاتون نے عورت کی عزت، پارسائی اور پاکیزگی پر ایک لکچر دیا۔ اور ماں بہنوں

اور میرا کی زبان سے کہتی ہے۔

اری میں تو پریم دِوانی میرو درد نہ جانے کوئے

ہندی ادب میں بِرہن کا کردار گھر آنگن کی عورت کی صحیح تصویر پیش کرتا رہا ہے۔ اردو میں گھر آنگن کی یہ جھلک ایک خوبصورت اور خوش آئند قدم ہے۔ جس کے لئے جاں نثار اختر یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شاعر نے اردھانگنی کو نیلے، اودے اور گلنار رنگوں میں دیکھا ہے۔ عورت کے ان گنت روپ پر نظر جمی ہے۔ مثلاً دُھرا آنچل، عالم فراق میں انتشارِ ذہنی کے باعث ہاتھ سے برتن گر کر ٹوٹنا، بیداری کی تمنّا پر اُلجھن، سِنگر مشین چلاتے وقت حُسن کی مانوسیت، سوئٹر بُننے میں سلائی اور سوچ کا لمحہ نئی چیزوں کی خریداری پر خوشی کا جذبہ، اور شوہر کی خریداری اشیا پر فضول خرچی کا اعلان، دوسروں سے شوہر کی برائی سُننے کی تاب نہ لانا، کفایت شعاری سے گھر کو آسودہ بنانا، ہر لمحۂ شکست پر شوہر کی رفاقت اور حوصلہ افزائی، رات کو مدھوش پیا کے لئے زنجیرِ در کھولنا اور شمع کی طرح گھر میں ساتھ آنا، بحث میں عورت کی شکست مگر عملی فیصلہ میں اُسی کی جیت وغیرہ

ڈاکٹر سیفی پریمی

استری کرنا ہوتی ہے اور ساڑی نچوڑ کر الگنی پر ڈالنی ہوتی ہے۔ وہ مشین پر کپڑے سینے بیٹھتی ہے اور جب شوہر سے گھر کے خرچ پر جھگڑتی ہے تو گھریلو زندگی کی داستان میں ایک نئے باب کا آغاز کرتی ہے اور یہ سب صرف اس لئے نہیں کرتی ہے کہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے میں مالی اور معاشی مجبوریاں حائل ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ گھر آنگن میں بسنے والی عورت کی روح ہمیشہ مغموم ہوتی ہے۔ وہ تو خوشیوں اور سکھ کا دان کرتی ہے، کسی سے کچھ مانگتی نہیں ہے۔ صرف اپنی خدمت اور ہنر مندی کا نور بانٹتی ہے اور اسی میں سکھ پاتی ہے۔

مجھے تو "گھر آنگن" جاں نثار اختر کی تصنیف نہیں، صرف "ترتیب" نظر آتی ہے۔ گھر آنگن کا سکھ، ازدواجی زندگی کی طمانیت اور روزمرّہ کا سکون انھیں جن ہستیوں سے ملا۔ جاں نثار اختر نے اس "اعتراف" کو اور خوبصورت یادوں کے کارواں کو اپنے شعری وجدان کے سہارے ایک منظوم شکل دیدی۔ صفیہ اختر کے خطوط کے مجموعے "زیر لب" کو پڑھئے۔ لگتا ہے گھر آنگن کے مصنف کی زبان سے "زیر لب" کی مصنفہ کی نثر۔ گیت کی مدھر لے کی طرح بکھر رہی ہے۔

جاں نثار اختر کے گھر آنگن کو صفیہ نے بنایا تھا۔ اور خدیجہ نے اس شکستہ گھر آنگن کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اسے اپنے سلیقہ اور پیار سے ایک نیا رنگ بھی عطا کیا۔ اور جاں نثار اختر کی زندگی کو ترتیب و توازن سے بھی روشناس کیا۔ ورنہ جاں نثار اختر بھی اپنی ہستی میں وہی شاعرانہ تڑپ اور بے باک مزاج۔ انداز کردار، ذہین اور سیماب صفت خوبصورت مگر جھلس دینے والا لاوا رکھتے ہیں جس کی زد میں بہت ساری مصلحتیں اور مجبوریاں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور جس کے بغیر کبھی کوئی خوبصورت تخلیق یا شہکار تصنیف، عالمِ وجود میں نہیں آتی ہے۔

میں نے تو جب گھر آنگن کا مطالعہ کیا تو میرے ذہن میں بہت سی خوبصورت یادیں ابھریں۔ آدھے اور پورے خوابوں کی تصویریں سامنے آئیں۔ گھر کے آنگن میں نیم اور املی کے درختوں میں سرسراتی ہوئی ہوائیں محسوس ہوئیں۔ سائبان میں چھت کی کڑھی سے لٹکا ہوا جھولا نظر آیا۔ اور اس گھریلو ماحول میں ہارسنگھار کے درخت اور مول سری کے پودوں کے بیچ ملگجے کپڑوں میں ملبوس وہ دلہن نظر آئی جو آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور شکنتلا کی سی بیقراری سے کہتی ہے۔

گھر آئی ہیں گھومتی گھٹائیں گھنگھور
آنگن میں مچا رہی ہے پُروائی شور
اب لوٹ کے آجاؤ کہ دن گن گن کے
ساجن! میری انگلیوں کے دُکھنے لگے پور

اپنے گھر آنگن کو محفوظ رکھنے کے لئے عورت کیا کچھ نہیں کر گزرتی ہے۔ وہ موت کا راستہ روک لیتی ہے۔ جلتی آگ پر ننگے پاؤں چلتی ہے۔ زندگی کا درجوانی کے آخری لمحے بھی اپنے سہاگ پر نثار کر دیتی ہے اور جب کوئی اُسے گزری ہوئی جوانی کی یاد دلاتا ہے تو وہ کہتی ہے۔

مت کہہ انھیں روپ سے رجھایا ہے سکھی
یو دن تو گزرتی ہوئی چھایا ہے سکھی
سچ۔ میں نے بہت تپسیّائیں کی ہیں
تب من کہیں اُن کا موہ پایا ہے سکھی

جاں نثار اختر کی تصنیف "گھر آنگن" اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اردو شعر و ادب میں عورت کو مخاطب کر کے تو "گفتی و ناگفتی" سب کچھ کہی جاتی رہی ہے۔ لیکن خود مجبور عورت اپنا درد کسی سے نہیں کہہ سکتی ہے۔ فراق نے اس صنف میں پہل کی اور بہت اچھی رباعیاں لکھی ہیں۔ ابن انشا اور جمیل الدین عالی نے گیت اور دوہے میں تجربے کئے۔ لیکن گھر آنگن کی عورت کے باب میں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ عورت کا درد سمجھنے کے لئے عورت کا دکھ درد بانٹنا بھی پڑتا ہے جو مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ عورت غم کو غم نہیں متاعِ زندگی سمجھتی ہے۔

جان نثار اب تک اس پسِ منظر سے بے خبر ہے۔

یہ تھی جاں نثار سے میری پہلی ملاقات۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس قدر محجوب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ سردار یا جاں نثار کی طرف سے تو اس بات کا اشارہ ہی نہیں ہوا تھا کہ جاں نثار کو شریکِ مشاعرہ کیا جائے۔ میں خواہ مخواہ ہی 'چور کی داڑھی میں تنکا' کے مصداق جھینپتا پھرتا تھا۔ حالانکہ مشاعرے کے انتظام سے میرا تعلق اتنا زیادہ نہیں تھا کہ میں انتظامیہ کمیٹی پر اثر انداز ہو سکتا۔

اِس کے چند برس بعد جاں نثار کے ساتھ گیلکے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ ہم تینوں کا قیام سرکٹ ہاؤس میں تھا۔ ساحر کے ساتھ تو میرا دل و جان کا تعلق ایک مدت سے چلا آرہا تھا۔ جاں نثار سے پہلی دفعہ کھل کے ملاقات ہوئی۔ مشاعرے کے بعد بہت دیر تک گپ شپ کی محفل رہی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جاں نثار کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات نہیں ہے بلکہ ایک مدت سے شناسائی چلی آرہی ہے۔

مجھے یورپ سے واپس آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ گپ شپ کے دوران میں سگار سلگانے کے لیے میں نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ یہ ڈبیہ ان ڈبیوں کے مقابلے میں جو ہندوستان میں ملتی ہیں کوئی چار پانچ گنا بڑی تھی۔ اسے انگلستان میں شاید کچن پیچ بکس کہا جاتا تھا۔ میں نے اسے اپنے لئے مفید مطلب پایا کیونکہ ماچس کی عام ڈبیہ سگار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ جاں نثار نے اس ڈبیہ کو دیکھتے ہی کہا کہ یہ کیا ہے بھئی۔ اور پھر اسے ہاتھ میں لیتے ہی ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا عجیب پیچ بکس ہے یہ۔ اور پھر یہ قہقہہ ایک ختم نہ ہونے والے قہقہے میں تبدیل ہو گیا ——— قہقہہ اور وہ بھی اتنی معمولی سی بات پر۔ مجھے پہلے تو اس پر حیرت ہوئی لیکن ساتھ ہی ہنسی بھی آگئی۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ ہنسی بلکہ قہقہے کا دورہ ساحر پر بھی پڑ چکا ہے۔ بے اختیار مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کے قابل بھی نہیں ہے کہ بھئی اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آخر خدا خدا کرکے یہ طوفان تھما۔ اور طوفان کے تھمتے ہی جاں نثار کے منہ سے بمشکل اتنا نکلا کہ عجیب ماچس ہے اور پھر اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ نہ جانے یہ سلسلہ کب ختم ہوا لیکن مجھے اس کی یہ ادا بھلی لگی۔ میری مصنوعی زندگی جو میں نے سالہا سال دفتری ماحول میں بسر کی ہے اس بے ساختہ پن سے خالی ہے کہ ایک عجیب و غریب قسم کی ڈبیہ طبیعت میں گدگدی کا احساس پیدا کردے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سچ مچ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔

ایک ریاست کے دارالحکومت کا ذکر ہے۔ جاں نثار وہاں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے۔ میں بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ مشاعرے کے منتظم میرے اور جاں نثار کے ایک عزیز دوست تھے اور بہت بڑے افسر تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن انھوں نے جاں نثار سے اور مجھ سے کہا کہ چلیئے آپ کو فلاں بڑے آدمی سے ملوا لائیں۔ خدا جانے جاں نثار کا اس ملاقات کو جی چاہتا تھا یا نہیں ——— غالباً نہیں۔ لیکن اپنے دوست کی دلجوئی کے لئے اُن کے ساتھ چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو وہ بڑے اخلاص سے پیش آئے۔ ہمارے دوست نے کہا کہ جاں نثار آپ سے ملنے کے بڑے خواہشمند تھے۔ اِس سے قبل کہ میزبان کچھ کہتے، جاں نثار نے چھوٹتے ہی کہا جی ہاں میں نے سوچا جب یہاں تک آگئے ہیں تو آپ سے بھی ملتے چلیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ فقرہ صاحبِ خانہ کے سر کے اوپر سے گزر گیا ورنہ شاید رنگِ محفل ہی بدل جاتا ——— یہ اس بے نیاز شاعر کی زندگی کا دوسرا بے تکلف پہلو تھا۔

ایک ملاقات میں جاں نثار نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں نے کشمیر آج تک نہیں دیکھا۔ میں یہ سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں تو مشاعروں کا وہ طوفان برپا رہا ہے کہ ان میں تیسرے درجے تک کے شعرا بھی آچکے ہیں۔ جاں نثار نے جواب دیا شاید میں چوتھے درجے کا شاعر ہوں۔

یہ بات کئی برس ہوئے دلّی میں ہوئی تھی۔ میں سری نگر واپس آیا تو ایک مشاعرے کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ منتظمین

جگن ناتھ آزاد

اردو شاعری کا اچھوتا باب

جاں نثار اختر سے بمبئی میں میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ چند ایک مشاعروں کو چھوڑ کر، اُس کے ساتھ میری ملاقاتیں بمبئی سے باہر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ہوئیں اور زیادہ تر دہلی میں۔

ہندوستان کی تقسیم کا زمانہ ادب میں ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور اگست ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی میں میرا قیام ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ قُرب کا باعث بنا جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن جان نثار اختر اس زمانے میں بھوپال میں تھے۔ حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو۔

ذہنی اور جذباتی اعتبار سے میں ترقی پسند تحریک سے جس قدر قریب تھا عملی اعتبار سے اسی قدر دور۔ سرکاری ملازمت میرے اور تحریک کے درمیان ایک سدِّ سکندری بن کے حائل تھی۔ اس لئے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں سے یہ ذوق و شوق ملنے کے باوجود اپنے اور ان کے درمیان میرے لئے ایک حدِ فاصل رکھنا ضروری تھا۔ اس حدِ فاصل کے باوجود اس زمانے میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری اور ساحر لدھیانوی سے جی بھر کے ملاقاتیں ہوئیں۔ مجروح اور کیفی سے بھی لیکن ایک شاعر جس سے ملاقات کا موقع نہ ملا جاں نثار اختر تھا۔

اور میں جاں نثار سے ملاقات کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس کا لب و لہجہ غنائیت میں ڈوبا ہوا، دوسرے تمام شاعروں سے الگ تھلگ اور ممتاز نظر آتا تھا۔

آخر دہلی کے ایک انڈو پاکستان مشاعرے کے موقع پر جاں نثار کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ چیمسفورڈ کلب کے بارے میں یہ غالباً ۴۸ء یا ۴۹ء کی بات ہے۔ جاں نثار اُس مشاعرے میں مدعو نہیں تھے۔ لیکن اس موقع پر وہ تھے دہلی میں۔ سردار جعفری مدعو تھے۔ میرا اس مشاعرے کے انتظام میں تھوڑا دخل تھا۔ جب سردار نے جاں نثار سے میرا تعارف کرایا تو مجھ پر ایک جھینپ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اس بات کا اظہار نہ کر سکا کہ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے وہاں سے اُٹھ کے چلے آنے ہی میں مصلحت دیکھی۔

لیکن میں نے اس امر کی کوشش کی کہ جاں نثار کو اس مشاعرے میں باقاعدہ مدعو کر کے پڑھوا لیا جائے۔ سوائے جوشؔ صاحب کے کسی نے میری حامی نہ بھری۔ اور جوشؔ ایسے عالم میں تھے کہ منتظمین میں سے کسی نے ان کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

یہ معاملہ خراب اس طرح ہوا کہ منتظمین جاں نثار اختر کو مقامی شاعر کے طور پر مدعو کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ میں اڑ گیا کہ بمبئی سے آمد و رفت کا کرایہ بھی دیا جائے۔ وقت کے وقت بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور میری یہ خواہش کہ جاں نثار مشاعرے میں شریک ہو پوری نہ ہو گی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے بے کار ضد کی لیکن اس وقت مشاعرے کے بارے میں میرا نظریہ کچھ اور تھا۔ اب یہ نظریہ نہیں رہا۔ بہر طور

جاں نثار اختر کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں شاعر نے از سرِ نو اپنی دریافت کی ہے۔ اس دور کی مدت بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ چند ہی برس ہوئے شروع ہوا ہے۔ اسی دور میں شاعر کے تجربے کی وسعت، گہرائی اور گیرائی جس طرح جذبے میں تحلیل ہوئی ہے وہ ہماری اردو شاعری کا بالکل ہی ایک۔ نیا اور اچھوتا باب ہے۔

اس دور میں اختر عصری حسیت کے شعور کی منزل سے اور آگے قدم بڑھا کے انکشافِ ذات کی منزل تک آیا ہے اور اس انکشافِ ذات نے اس فاصلے کو کم کیا ہے جو ہماری شاعری اور حقیقی سچی انفرادی زندگی کے درمیان حائل تھا۔ یہ حقیقی اور سچّی زندگی ہمیں "گھر آنگن" میں نظر آتی ہے۔

جاں نثار اختر سے پہلے فراق کی رباعیات میں گھر آنگن تو نہیں لیکن گھر آنگن کی تلاش ضرور ملتی ہے مگر یہ موضوع فراق کا موضوع نہ بن سکا۔ اسے جاں نثار اختر کا موضوع بننا تھا

کرشن چندر نے "گھر آنگن" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "فراق اس کے لئے قصوروار نہیں ہے۔ ان کی گھریلو زندگی اس کی ذمہ دار ہے، جس کا اعتراف انہوں نے بارہا کیا ہے۔" دراصل یہ قصوروار یا بے قصور ہونے کی بات نہیں ہے شاعری limitations کی بات ہے۔

یہاں کرشن چندر ایک اہم نکتے کو فراموش کر رہے ہیں۔ شاعری فوٹو گرافی نہیں ہے۔ فراق کے "گھر آنگن" کے موضوع تک نہ پہنچنے کا سبب ان کی گھریلو زندگی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ فراق متنوّع موضوعات کا شاعر نہیں ہے۔ فراق کی رباعیات فراق کی غزل ہی کا ایک دوسرا روپ ہیں۔ فراق کی زیادہ تر نظمیں سپاٹ اور شعریت سے مبرّا ہیں۔ صرف انہیں نظموں میں فراق ایک کامیاب شاعر نظر آتا ہے جو فراق کے محدود غزلیہ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ہاں غزل کے روایتی موضوع حسن و عشق کو فراق نے جو ایک جدت اور ندرت عطا کی ہے وہ ایک کارنامہ ہے۔ ان حدود کے باہر اول تو فراق نے کچھ کیا ہی نہیں اور جو کچھ کیا ہے وہ درجۂ اول کی تخلیق نہیں۔ جہاں تک ہمہ گیریت (versi tality) کا تعلق ہے جاں نثار اختر کا مقام فراق سے کہیں بلند ہے۔

گھریلو زندگی والی بات اپنی جگہ جیسی ہے سو ہے۔ لیکن اگر فراق غزل کے محدود موضوع سے باہر جانے کی صلاحیت رکھتے تو ان کی اسی تلخ گھریلو زندگی کا ردّ عمل خوشگوار گھریلو زندگی کی شاعری میں ظاہر ہوتا۔ لیکن فراق اپنی تمام تر ذہانت اور علمیت کے باوجود اس شاعرانہ ردعمل کی لذّت سے ناآشنا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں "نتھرے ہوئے پانیوں میں خوابیدہ رنگوں کو گھلا دینے کی کاوش" تو ملتی ہے لیکن زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھنے کے باوجود زندگی کی جانب اتنا شدید ردِّ عمل نہیں ملتا جس کی ایک حسّاس شاعر سے توقع کی جاتی ہے۔

دراصل فراق کی شاعری کا المیہ یہ ہے کہ آج ہمارے نقّاد فراق کی شاعری سے اتنا متاثر نہیں جتنا ان کی مقبولیت سے متاثر ہیں اور اس مقبولیت میں فراق کی شاعری کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا اُن کی ذہانت اور عالمانہ گفتگو کا۔ لیکن یہ گفتگو ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ انجام کار شاعری کو معیارِ نقد بننا ہے اور شاعری جب معیارِ نقد بنے گی تو اسے خالص ادبی اقدار سے ناپنا ہوگا۔ فراق کے ادب کو غیر ادبی پیمانے سے ماپنے کا طریقہ فراق کی گفتگو اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

اختر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انکشافِ ذات کے جس عمل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ کوئی میکانیکی عمل نہیں ہے۔ بلکہ ایک وجدانی عمل ہے اور "گھر آنگن" کی شاعری اسی وجدانی عمل کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس کے ساتھ وابستہ ہے، اس سے الگ نہیں۔ اور یہ ہمیں اختر کی غزل میں نظر آتا ہے۔

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگا ہے مجھے　　　　یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے

نے ازراہ عنایت فہرستِ شعراء مجھے دکھائی۔ میں نے کہا کہ فہرست یوں تو ٹھیک ہے لیکن اس میں ایک نام کی کمی ہے اور وہ ہے جاں نثار اختر کی۔ جواب ملا کہ صادق صاحب (مرحوم) اس فہرست کو منظور کر چکے ہیں اور اب اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ صادق صاحب ان دنوں علیل تھے اور ڈاچی گام کے بنگلے میں محوِ آرام تھے۔ میں وقت لے کر اُن کے پاس پہنچا۔ مقصدِ ملاقات محض فہرستِ شعراء میں ایک نام کا اضافہ کرنا تھا۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ جاں نثار نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا۔ تو پہلے تو انہیں تعجب ہوا پھر بھولے آپ لوگوں میں گروہ بندیاں بھی تو ہیں۔ اس لئے اُن کا نام کٹ جاتا ہوگا۔ اب کے انہیں ضرور بلوایئے۔

میں نے واپس پہنچتے ہی منتظمین کو صادق صاحب مرحوم کی منظوری سے مطلع کیا۔ لیکن خدا جانے کیا ہوا۔ فنڈ کم پڑا یا کوئی اور بات ہوگئی کہ وہ مشاعرہ منعقد ہی نہ ہو سکا۔ اور اپنی جھینپ مٹانے کا جو موقع ہمیں مل رہا تھا وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ صورتِ حال آج تک ویسی ہی ہے کہ جاں نثار اختر کشمیر کبھی نہیں آئے۔

جاں نثار کا شرمیلا پن بھی اپنی مثال آپ ہے۔ غالباً ۷۳ء کی بات ہے مجھے جاں نثار نے بمبئی کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ میں سرینگر سے ابھی دہلی ہی پہنچا تھا کہ فضائی مستقر پر چیف سیکرٹری جموں و کشمیر کا پیغام ملا۔ اور وہ یہ تھا کہ کل یہاں ایک اہم میٹنگ ہے۔ بمبئی نہ جاؤ بلکہ دہلی ہی سے سری نگر واپس آجاؤ۔ سرکاری فرائض کو مشاعروں پر ترجیح دینا تو ایک سرکاری ملازم کے لئے اشد ضروری ہے۔ چنانچہ میں انہی قدموں سری نگر واپس لوٹ آیا۔ لیکن طبیعت بہت منغض ہوئی۔ ایک تو بمبئی کا مشاعرہ ہاتھ سے گیا ساتھ ہی بمبئی کے تمام دوستوں سے ملاقات، جس کے شوق میں بمبئی جا رہا تھا صورت پذیر ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی! اور تیسرے سری نگر سے دہلی، اور دہلی سے سری نگر کا طیارہ کا کرایہ اپنی جیب سے دینا پڑا۔ اس نقصانِ مایہ کے ساتھ بقول شیخ سعدی شماتتِ ہمسایہ الگ۔ میں نے سری نگر سے بڑی بے تکلفی کے عالم میں جاں نثار کو خط لکھا کہ خیال تھا کہ چند روز اکٹھے بڑے مزے میں گذریں گے اس کی جگہ اب ایک بے لطفی نے لے لی ہے۔ لیکن جاں نثار کی بھی اس میں کیا خطا تھی۔ وہ تو میری اپنی مجبوری تھی۔ جاں نثار نے لکھا کہ آئندہ برس پھر مشاعرہ ہوگا اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ لیکن آئندہ برس کسی وجہ سے جاں نثار مجھے نہ بلا سکے۔ اب جو دہلی میں دو ایک مشاعروں میں ہم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں تو جاں نثار مُنہ چھپائے پھرتے ہیں۔ گویا مجھے مشاعرے میں مدعو کرنا اُن کے فرائض منصبی میں شامل تھا اور اس فرض سے کوتاہی ناقابلِ معافی جرم تھی۔

چند روز بعد میں نے انہیں دو ایک خطوط لکھے۔ مدت کے بعد جواب ملا۔

"پیارے آزاد! تمہارا خط ملا تھا۔ جواب اس لئے نہیں دیا کہ تمہیں امسال دادا بھائی فضل بھائی ٹرسٹ کے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا تھا۔ اس کی تھوڑی سی شرمندگی تھی۔ ......"

سبحان اللہ! زمانہ کہاں نکل گیا اور اس زمانے میں ایک جدید شاعر کس قدر "پرانی اقدار" کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔

۲

یہی خلوص، یہی صداقتِ احساس جاں نثار کی شاعری میں بھی جھلک رہا ہے۔ دراصل اس کی شاعری اس کی زندگی سے الگ تھلگ ہوا میں معلق کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کا اظہار ہے، اس کی شخصیت کا پرتو ہے۔

یہ شاعری دو ادوار میں منقسم ہے۔ ایک ترقی پسند شاعری کا دور جس کے بارے میں ان سطور کی ابتداء میں کہا جا چکا ہے کہ اس وقت بھی جاں نثار کی آواز باقی شعراء کی آوازوں سے مختلف تھی جو خاصیتِ شعر اس دور میں جاں نثار کو اپنے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کے کلام میں عصری حسیت کا شعور۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کی ترقی پسند شاعری میں عصری دور کی تصویر کشی کی کوشش تو کی گئی ہے۔ لیکن اس شاعری میں بحیثیت مجموعی عصری حسیت کا فقدان ہے۔ جاں نثار کی اس دور کی شاعری اس خلا کو بڑی حد تک پُر کر رہی ہے،

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

گھر آنگن ۔ ایک مطالعہ

اردو شاعری میں ہندوستانی موضوعات، ہندوستانی لہجہ اور ہندوستانی زبان کے مزاج سے بھرپور شاعری کی مثالیں ولی اور میر سے لے کر نئے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے یہاں کبھی شوخ اور کبھی ہلکے رنگوں میں نمایاں ہوتی رہی ہیں۔ میر نے اپنی شاعری کے پرستاروں سے کہا تھا کہ انھیں سمجھنے کے لئے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ یہ بات اردو کے تعلق سے اس پروپیگنڈے کا بہت واضح جواب ہے جو اردو کو قلعۂ معلّے اور امیروں اور رئیسوں کی زبان بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر نے اردو کے لئے جو معیار مقرر کیا تھا وہ عوامی زبان کا تھا۔ وہ زبان جو جامع مسجد کے آس پاس مختلف تجارت پیشہ لوگوں، سبزی فروشوں اور کبابیوں کی زبان تھی۔ یہ زبان، سادگی اور سلاست کے ساتھ عوامی دلوں اور دماغوں میں اظہار و ابلاغ کا بہترین وسیلہ تھی۔ میر ہمیشہ عوام ہی سے مخاطب رہے ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور عوام سے گفتگو کے لئے قلعۂ معلّیٰ کی سجی سجائی، تصنع آمیز زبان کام نہیں دے سکتی تھی اور نہ ہی عام آدمی کے مافی الضمیر کا اظہار ہو سکتی تھی۔ میر کے بعد اگرچہ متعدد لسانی اور غیر لسانی وجوہات کی بنا پر اردو عوامی لہجہ سے دور ہونی شروع ہوئی اور فارسی، عربی کا رنگ اس پر چڑھتا گیا اور پھر نظیر اکبرآبادی جیسے ہمہ گیر اور ہمہ جہت شاعر نے زبان، موضوع اور طرزِ ادا کے لحاظ سے اُسے جغرافیہ، تہذیب اور لسانی روایتوں یا بھاشکی پرم پراؤں سے ملا دیا۔ نظیر کی شاعری میں ہندوستانی تہذیبی ترقی، معاشرتی اخلاق، پھول اور پھل، میلے اور تہوار اور اسی قسم کی مختلف رنگوں کی شوخ مگر فطری باتیں سب سے زیادہ باقاعدگی اور بھرپور انداز سے سامنے آئی ہیں۔

نظیر کے بعد ملکی عناصر چاہے وہ ادبی ہوں، تہذیبی ہوں یا لسانی، اس کی بھرپور آواز فراق کی شاعری میں عموماً اور اُن کے مجموعہ "روپ" کی رباعیوں میں خصوصاً ابھری ہے۔ نظیر اور فراق سے چلی ہوئی تہذیبی فکر اور لسانی ہمہ گیری کی یہ خوب صورت روایت، نئے شاعروں میں جاں نثار اختر کی شاعری کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔

جاں نثار اختر اردو کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسندی اور رومانیت کے گرد گھومتی ہے۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک سے ان کا قریبی تعلق رہا ہے پھر بھی مجموعی حیثیت سے وہ ترقی پسندوں کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود کئی لحاظ سے مختلف بھی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندی کے سہارے ابھرنے کی کوشش ضرور کی لیکن آخر کار خود انھوں نے ترقی پسندی کو سہارا دیا۔ وہ نام نہاد نعرے بازی سے دور رہے اور انھوں نے شاعری کی روح یعنی شعریت کو ساتھ لے کر نئے انداز بیان کو پروان چڑھایا۔ وہ نئے اور پرانے کی خوبصورت آمیزش کے پرستار رہے۔ "کون سا گیت سنوگی انجم" سی ہلکی پھلکی رومانی نظم سے لے کر مخصوص عمر اور مخصوص ماحول کی یادگار نظمیں مثلاً "استالین"،

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے		بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے
نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے		کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

یہ دونوں پہلو ایک شخصیت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ مکمل شخصیت کا مطالعہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ دراصل اردو شاعری فرد کی عام روزمرّہ کی زندگی سے اپنا تعلق کچھ اس طرح توڑ چکی ہے کہ اِس احساسِ زیاں سے بھی بیگانہ ہوگئی ہے۔ جی۔ ایس فیریزر کے الفاظ میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ جو شاعری روزمرّہ کی عام اور معمولی زندگی سے بیگانہ ہو جائے وہ ممکن ہے "بڑے موضوعات" کے ساتھ بھی انصاف نہ کر سکے۔

جاں نثار اختر نے ایک عام انسان کی عام اور ہر روز بسر ہونے والی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی تمام تلخیوں، ناکامیوں، محرومیوں اور شکستوں کا جو عصرِ حاضر کی دین ہیں اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ زہر پینے کا یہ عمل اُس وقت تک نامکمل ہے جب تک یہ زہر شاعر کے فکر میں آکر امرت کی صورت اختیار نہ کرے۔ جاں نثار کی شاعری اسی زہر کے امرت میں تبدیل ہونے کا ایک عمل ہے۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے
تشنگی کچھ تو بجھے تشنہ لبانِ غم کی
اِک ندی درد کی شہروں میں بہا دی جائے
ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

لوگ خاموش سے کیوں ہیں		ایسی کیا آن پڑی ہے
زندگی ہاتھ پسارے		آج رستے پہ کھڑی ہے
کبھی ایسا بھی لگا ہے		زندگی بند گھڑی ہے

یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا		اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی رِدا رات گئے
دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس		دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتا رات گئے
بھیگی بھیگی ہوئی موسم کی ہواؤں پہ نہ جا		دل پہ برسے گی شراروں کی گھٹا رات گئے

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے — ساجن کب آئے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا! — جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

○

لہروں میں کھِلا کنول نہائے جیسے — دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ، یہ لوچ، یہ ترنم، یہ نکھار — بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

○

فراق نے اپنے موضوع اور زبان کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہندستان اور ہندوستانی کلچر کی نکھرتی ہوئی زندہ رگوں کو پرکھ لینا چاہتے تھے اور یہ کہ اردو کو سنسکرت اور ہندی شاعروں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اُن کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان رباعیوں میں مناسب موقعوں سے مگر نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آئے [1]

موضوع اور زبان سے متعلق فراق کے اس نظریے کے ارتقا کا سلسلہ گھر آنگن تک آ پہنچا ہے۔ گھر آنگن کی رباعیوں کا تعلق نہ دیومالائی تصورات سے ہے نہ ہی دور از کار شاعرانہ پرواز سے، بلکہ ان رباعیوں کا موضوع ہماری روزمرہ کی زندگی پر آدھارت ہے اور اِن کا ہر پڑھنے والا اگر کامیاب اور خوشگوار بیاہتا زندگی گزار رہا ہو تو وہ اس میں اپنی زندگی کی پرچھائیں دیکھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ رباعیاں کروڑوں ہندستانیوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے سجی ہوئی ہیں۔ اِن میں جن بھاؤناؤں کا اظہار ہوا ہے وہ وہ ہیں جن سے ہمارے بیشتر ہندوستانی گھرانوں کو زینت حاصل ہے، جو لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کا حصہ ہیں یا پرانی ہندی شاعری کا۔ گھر آنگن کی شاعری ہندوستانی تہذیب اور آداب کا نمونہ ہے جو اب شہروں اور خاص طور سے بڑے صنعتی شہروں میں روز بروز کم ہو رہے ہیں۔ البتہ دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے غیر صنعتی شہروں میں اس تہذیب اور آداب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ موجودہ صنعتی دور میں تیزی سے بدلنے والی زندگی اس تہذیبی آداب اور روایات کا کب تک ساتھ دے سکے گی یہ آنے والا زمانہ ہی بتا سکے گا۔ مگر شاعری اور ادب کو اس کے "حال" میں رکھ کر پرکھنا ہو تو ہندوستانی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کے لئے، یہ رباعیاں عصری دستاویز کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

جمالیاتی یا شرنگار رس کی شاعری نے اکثر عورت کے اس دورِ زندگی کا بیان ہوتا ہے جب وہ محبوب یا پریہ ہوتی ہے جو اصطلاحاً شادی سے پہلے کے دور سے تعلق رکھتی ہے اور جس میں شاعر اس کے حسن سے، اس کی ادا سے، اس کی چلت پھرت سے اور اس کے ناز و غمزے سے متاثر ہو کر اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے "گھر آنگن" کی رباعیاں شرنگار رس کی وہ شاعری ہے جس میں محبوب کو پا لینے کے بعد یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ بیاہتا زندگی میں محبوب کی محبوبیت قائم رہنے سے محبت نے جو پائداری دکھائی ہو۔ اس کا بیان ہے اس دور میں محبت کی پائداری ہی "من دیگرم تو دیگری" کی حدوں کو پار کر کے "من و تو" سے بلند اٹھ کر دو الگ جسم و جان کو ایک ہی جسم و جان میں سمو دیتی ہے۔ یہ زندگی اطمینانِ نفس اور دلوں کی ٹھنڈک سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستانی زندگی میں ایسی مثالی زندگیاں جن میں بیاہتا زندگی کی خوشحالی، آسودگی اور راگ و رس ہو۔ گھر آنگن میں سوانحی انداز یا آتم کتھا کے روپ میں پیش ہوئی ہیں۔ زندگی کے ہندوستانی آدرش کے مطابق یہاں شوہر کی شخصیت میں عورت کی ذات گھل جاتی ہے اور "سوامی" شوہر کی ذات میں سیتا، رادھا اور پاروتی جیسی بیوی کی شخصیت جذب ہو جاتی ہے۔

ہر بار تپسیا سے جیتا ہے انھیں — وہی میرے سوامی ہیں، وہی میرے پتی
اُن سے ہے مرا جنم جنم کا ناتا — ادما ہوں کبھی میں، تو کبھی پاروتی

---

[1] فراق: "روپ" دیباچہ

"امن نامہ"۔ اور "خاموش آموز"، "اک زخم تمنا اور سہی" اور "آخری ملاقات" تک شعری اور فکری اسالیب کے تجربے کرتے رہے۔ ادھر کچھ عرصے سے ان تجربوں میں تنوع کی ایک نئی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ اس دلکشی کو ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے موضوع نے جلا دی ہے اور اس سے شاعر فکر دلداریٔ سخن کے ساتھ عشق بتاں اور لیلیٔ وطن کا عاشق جاں باز بن گیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے پس منظر میں اور اس پس منظر کو پیش منظر سے ملانے کی کوشش میں جو نظمیں کہی گئی ہیں ان میں "آؤ نیا رگ وید لکھیں"، "اپنشد"، "آدمی کا گیت" "مہابھارت" اور ہندوستانی عورت کی خصوصیات سے سجی سجائی غیر مطبوعہ نظمیں ہیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری بھرپور انداز میں موضوع، فکر اور زبان ہر تین اعتبار سے ہندوستانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد زندگی کا اس قدر پھیلا ہوا کینوس اس ہندوستانی زندگی کے اتنے رنگا رنگ اور دل نشین نمونے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے نئی شاعری کی منجمد اصطلاحوں اور علامتوں سے ہٹ کر ایسی چلتی پھرتی، شوخ اور نٹ کھٹ اصطلاحیں اور سمبل استعمال کئے ہیں جو اسی دھرتی کی علامتیں ہیں، جن کا گہرا تعلق ہماری تہذیبی تاریخ یا سنسکرت اتہاس سے ہے اور جن کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں وہ ذہنی آسودگی مل جاتی ہے جو دوسری مجرد علامتوں میں نہیں ملتی اور جس کا رواج بھی اب ہمارے ہاں کم نہیں۔ جاں نثار اختر کی مذکورہ شاعرانہ خصوصیات کے نمونے بہت بھرپور انداز میں "گھر آنگن" کی زینت اور دلکشی کا بھی کام کرتے ہیں۔

"گھر آنگن" جاں نثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جب "جاوداں" شائع ہوئی تھی تو اس میں چند رباعیاں شامل تھیں جنہوں نے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا لیکن یہ تعداد میں اس قدر کم تھیں کہ اسی قسم کی اور رباعیوں کو پڑھنے کے لئے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی تھی۔ ایک عرصہ بعد "گھر آنگن" کی رباعیوں نے اس تشنگی کو دور کیا اور قارئین کی دلی خواہش کی تکمیل کی۔

اردو میں رباعی کی صنف، دیگر اصناف سخن کی طرح فارسی کی دین ہے۔ اس کے موضوعات (وحشی) تصوف، عشق حقیقی اور اخلاق ہیں۔ پرانے شاعروں نے دکن سے شمال سے تقریباً ہر شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ میر، درد، انیس، غالب، حالی، اکبر، آسی، رواں، محروم، یگانہ چنگیزی، فانی، امجد، جوش اور فراق نے مجموعی حیثیت سے اردو شاعری کے ساتھ اس صنف سخن کو بھی مالا مال کر دیا ہے دور جدید میں جوش اور فراق کی اردو رباعی سے اردو میں رباعیوں کے نشاۃ الثانیہ کا باب کھلا۔ امجد حیدر آبادی صوفی منش بزرگ تھے اور اس لحاظ سے رباعی میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہی کو اپنایا۔ تاہم جوش اور فراق نے رباعی کے موضوع کو وسعت دی اور عشقیہ اور نشاطیہ رباعیاں لکھیں۔ شباب اور شراب، موج اور ترنگ، جام اور مینا اُن کی رباعیوں کے اہم موضوع ہیں۔ اگرچہ رباعی کی ذیل میں فراق، جوش سے متاثر ہوئے ہیں، تاہم انھوں نے بہت جلد اپنے لئے نیا راستہ تلاش کر لیا اور انفرادیت حاصل کر لی۔ ان کی تمام تر رباعیاں رس اور سنگار یا حسن و جمال کی مختلف حسیاتی کیفیتوں پر مشتمل ہیں۔ اب تک فارسی کے رنگ و روپ اردو رباعی پر اثر انداز تھے۔ فراق نے اسے ہندوستانی لہجہ اور موضوع عطا کیا جو سنسکرت اور ہندی شاعروں کی اصل تھا۔ فراق کی شرنگار رس سے رنگا رنگ رباعیاں عرصہ پہلے "روپ" کے نام سے چھپ کر داد حاصل کر چکی ہیں۔ ان رباعیوں میں فراق نے جلبی جذبات یا کام اور کرودھ اور اس سے متعلق مختلف کیفیات کو علم اور کمال فن کاری اور زبان کے نئے تجربے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شاعرانہ لطافت ان رباعیوں کا بہت بڑا حسن ہے۔ ان رباعیوں میں ہندوستانی عورت کی رنگین اور چلتی پھرتی تصویروں کے ساتھ ہندوستانی بزم خیال کے فکری پہلو ہیں۔ اردو شاعری کو "روپ" فراق کی بہت بڑی دین ہے۔ فراق کی یہ دین سنسکرت اور کلاسیکل ہندی کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فراق کی چند رباعیاں دیکھئے ۔

پہلو کی وہ کہکشاں وہ سینے کا ابھار
ہر عضو کی نرم لو میں مدھم جھنکار
ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم
سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

ملتی ہے۔ وہ پڑھی لکھی اور شعر و ادب کی دلدادہ بھی ہے۔ زندگی کے آگے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ چلنا بھی جانتی ہے اور اپنے ملک اور قوم کی روایات کو سینے میں بسانا بھی چاہتی ہے۔ نئے زمانے کی اس نئی ناری کا روپ طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے۔

سیکھے کوئی کاش تجھ سے حسنِ گفتار　　　ہر بات کا ایک خوبصورت اظہار
یہ رنگِ ادب کا، یہ روایت کا رچاؤ　　　جملوں میں سلیقے سے پروئے اشعار

O

پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں　　　کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے　　　لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں

O

ہر رسم و روایت کو کچل سکتی ہوں　　　جس رنگ میں ڈھالیں مجھے، ڈھل سکتی ہوں
اُکتانے نہ دوں گی ان کو اپنے سے کبھی　　　اُن کے لئے سو روپ بدل سکتی ہوں

O

گھر آنگن کی رباعیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعر کے اپنے دل کی آواز اور اس کی اپنی زندگی کی صدائے باز گشت ہے۔ اس کا یقین ان لوگوں کو پوری طرح سے ہے جو اختر سے قریب ہیں، اور ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن دوسرے پڑھنے والوں کو یقین دلانے کا ایک اہم اور واضح ذریعہ صفیہ اختر کے وہ خطوط ہیں جو زیر لب کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ صفیہ کی شخصیت، ان کا ذہن و فکر، اُن کی جان لیوا بیماری، اختر سے اٹوٹ محبت اور عقیدت، ہجر و فراق کے تذکرے، زندگی کے سلسلے کو برقرار رکھنے کے لئے ذریعۂ معاش کی پریشانیاں اور زمانے کی شکایت کے ساتھ ساتھ زمانے کی انگنت انسانوں سے ہمدردی اور لگاؤ...... یہ سب زیر لب میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کی بنیاد پر کئی رباعیاں شاعر نے نظم کی ہیں۔ صفیہ اختر کے ساتھ خدیجہ اختر، جنھیں جاں نثار صفیہ کا دوسرا روپ کہتے ہیں۔ ان رباعیوں کی فضا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جو لوگ خدیجہ اختر سے مل چکے ہیں وہ ان کی نرم و نازک شخصیت اور ان کے رکھ رکھاؤ کی دلنشینی کو ان اشعار میں جا بجا دیکھ اور سن سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ گھر آنگن کی رباعیوں میں آتم کتھا یا سوانح عمری کا انداز موجود ہے۔ خاص طور سے صفیہ اختر کے احساسات اور جذبات کی آواز بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جاں نثار اختر جب پہلے پہل بمبئی میں تشریف لے آئے اور فلمی دنیا میں اُن کے قدم جمنے کے دوران وہ پریشانیوں اور مایوسیوں کا شکار رہے۔ ایسے میں بھوپال سے صفیہ نے اپنے خطوں کے ذریعے ان کی ڈھارس بندھائی اور صحت کی کمزوری اور مالی پریشانیوں کے باوجود اُن کا طریقۂ کار جو رہا ہے اس کا ایک صاف اور واضح ثبوت اس رباعی میں نظر آتا ہے

مَیں ہی نہ بٹاؤں گی اگر غم اُن کا　　　غم اُن کا بھلا کون بٹائے گا سکھی
میَں ہی نہ اگر انھیں بڑھاوا دوں گی　　　ہے کون جو ان کا دل بڑھائے گا سکھی

O

کہتی ہے کہ سہہ لوں گی جو سہنے پڑے غم　　　کچھ دیر کے اور ہیں زمانے کے ستم
تم اپنے ارادوں کو نہ کرنا کمزور　　　پیچھے نہ ہٹانا کہیں گھبرا کے قدم

O

صفیہ نے اپنے خطوں میں بار با اپنی بیماری اور اپنے بدلے ہوئے رنگ و روپ کا ذکر کیا ہے۔ اِن خطوں کی تہہ میں اُن کا

کل سوچ رہی تھی کہ مَیں تجھ سے پوچھوں	کچھ اُن کا پتہ چلا ؟ انھیں خط لکھا
وہ دور رہوں مجھ سے تو انھیں خط لکھوں!	جو میرا بنا سکھی ! وہی اُن کا پتا

O

سوامی میں پاروتی کے جذب ہونے کی کیفیت اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ اس میں اپنی خواہشوں اور پسند و ناپسند کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ عطر سہاگ کا، یہ اُبٹن کی مہک	تو کیوں نہ سگندھوں کی دلہن کہلائے
پر مجھ کو میری سکھی بدن سے اپنے	آئے تو فقط انھیں کی خوشبو آئے

O

اودے اودے پہن رکھے ہیں کپڑے	دیوانی یہ کیا رنگ تجھے بھاتا ہے
جب اُن کو پسند ہے سکھی تو مجھ کو	اس رنگ میں ہر رنگ نظر آتا ہے

O

صنعتی دور میں قدم رکھنے کے بعد ہندوستان کی سماجی زندگی میں بھی تیزی سے تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اور یہ رفتار اس قدر تیز ہے کہ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کب ایک مرکز پر آکر رُکے گی۔ سچ تو یہ ہے سماجی زندگی میں تبدیلی ایک اٹوٹ عمل ہے اور صنعت و حرفت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس میں ٹھہراؤ پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس صنعتی دور میں غریب امیر بن رہے ہیں اور امیر رئیس۔ نو دولتیے بھی اپنی دولت کے سہارے اپنی درمیانی درجہ کی زندگی کو تج کر فلیٹوں اور کلبوں کی زندگی سے دن بدن قریب سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ ایسے میں درمیانی درجہ کی زندگیوں کا، جس کی عکس ریزیاں "گھر آنگن" کی شاعری کا موضوع ہیں، سمٹ کر اور گھٹ کر رہ جانے کا ڈر ہے اسی کے ساتھ ہماری ہندوستانی سبھیتا، رسم و رواج، سوچنے سمجھنے اور زندگی کو برتنے کے طریقوں میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو شاعری کے اس ہندوستانی روپ میں، جو جاں نثار اختر نے رباعیوں کی شکل میں اردو شاعری کے ایوان میں سجائے ہیں۔ ہمارے متوسط طبقے کی سادہ اور پر کار زندگی رنگین اور متوازن زندگی، محفوظ ہو گئی ہے۔ متوسط طبقے کی زندگی پر یہ قول صادق آتا ہے کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو برابر پہیئے ہیں، یہاں زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے تعلق سے اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنا پڑتا ہے ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا پڑتا ہے، غم اور خوشی میں نہ صرف برابر کا حصہ دار بننا پڑتا ہے بلکہ اکثر اپنے غم کو چھپا کر دوسرے کی خوشی کو تازگی بخشنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر زندگی کا کڑا بوجھ اُٹھ پاتا ہے اور یہ سفر خوشی اور آنند کے ساتھ طے ہوتا ہے۔ متوسط طبقے میں زندگی گذارنے کے جتنے مسئلے ہیں اور ان کے حل میں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے طاقت ملتی ہے، اس کا بھرپور اظہار ان رباعیوں میں ہوا ہے۔

میں اُن کا سکھی ہاتھ بٹا سکتی ہوں	حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اُٹھائیں گے اکیلے کب تک	مَیں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

O

بھٹکا ہوا ذہن تھا تو بکھرے جذبات	سوچا بھی نہ تھا کہ بن سکے گی کوئی بات
مَیں جو بھی بنا ہوں وہ بنا ہوں تجھ سے	میں کچھ نہیں ہوتا جو نہ ہوتا ترا ساتھ

O

گھر آنگن کی ان رباعیوں میں ہندوستانی عورت کا وہ روپ نظر آتا ہے جسے اپنے گھر کے ہر کام کرنے میں روحانی مسرت اور تسکین

ڈاکٹر نریش

گھر آنگن کا شاعر

اُردو شاعری کا مزاج ابتدا ہی سے کچھ ایسا رہا ہے کہ یہ تصورات اور تخیلات کے آسمانوں پر اُڑانیں بھرتی رہی ہے اور زمین سے اس کے قدم اُکھڑے اُکھڑے رہے ہیں۔ غزل کو باقی تمام اصنافِ سخن سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ غزل کے لفظی معانی چونکہ "عورتوں سے باتیں کرنا" اور "عورتوں کی باتیں کرنا" ہیں۔ اِس لئے ظاہر ہے کہ "عورت" ہی اردو شاعری پر غالب رہی ہے۔ فارسی سے اردو تک کا غزل کا سفر عورت کے نہایت عجیب تصور کو لے کر چلا ہے۔ ایک عرصہ تک عورت کو صرف جنسی تعلقات کی نظر سے ہی دیکھا جاتا رہا ہے۔ اُس پر بے وفائی کی تہمت دھرنے والے مرد شعرا نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ درحقیقت بے وفائی تو خود انہوں نے عورت سے کی ہے۔ بے وفائی ہی نہیں بے انصافی بھی کی ہے۔ بھلے ہی اس کے پس منظر میں مسلم معاشرہ کا پردے کا رواج رہا ہو یا ایرانی تہذیب کی گہری چھاپ اس کے لئے ذمہ دار ہو۔ یہ الزام امرد پرستی کے سر دھر دیا جائے یا اسے اس بیان سے منسوب کر دیا جائے کہ چونکہ رسولِ پاکؐ کو خدا جس روپ میں نظر آیا تھا وہ روپ ایک مرد کا تھا، اس لئے اردو شاعری میں براہِ راست عورت کا ذکر معیوب سمجھا گیا[1]۔ لیکن اس حقیقت سے منکر نہیں ہوا جا سکتا کہ عام طور پر اردو شعراء نے عورت کو صرف کوٹھے پر سجے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ کسی شریف زادی، کسی پاک دامن دوشیزہ، کسی نیک بیوی یا کسی شفیق ماں کے روپ میں اسے پیش نہیں کیا۔ اردو شاعری کے مطالعہ سے مجموعی طور پر عورت کا جو تصوّر قاری کے ذہن پر اُبھرتا ہے وہ یہ کہ عورت ایک انتہائی خوبصورت شے ہے، جسے اپنے حسن پر غرور کی حد تک ناز ہے۔ اس کے عشق میں ہزاروں لوگ تڑپ رہے ہیں، اس کی ادا ادا پر جان چھڑک رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی رقابت میں جل بھن رہے ہیں۔ ملگروہ ہے کہ گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں خنجر لئے اس تمکنت اور اس قاتلانہ شان سے نکلتی ہے کہ لہو کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں، قتل اور خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور شہیدانِ وفا یکے بعد دیگرے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ عورت کا یہ روپ خونخوار ہی نہیں اس کے ہرجائی پن کا مظہر بھی ہے وہ سب کی ہے مگر کسی کی نہیں۔ اور پھر طرّہ یہ کہ وہ ساقی گری بھی کرتی ہے۔ غرض یہ کہ یہ عورت صرف بازاری عورت ہے، جس کے بارے میں آپ جو چاہے کہئے، جیسے جذبات کا اظہار پسند ہو کیجئے، اس پر دل پھینکئے، اس سے لپٹ جانے کی جسارت کیجئے۔ اس پر تن و جان سے قربان ہو جائیے۔ یا اُس کے ہاتھوں شہید ہو جائیے۔ جیتے جی مر جائیے یا مرنے کی تمنا میں زندہ رہ جائیے۔

اردو شاعری سے ایک اور شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ فراقؔ کے لفظوں میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "جہاں تک ایسی شاعری کا تعلق ہے جسے ہم صحیح معنوں میں ہندوستانی کہہ سکیں، جس میں یہاں کی فضا کی ٹھنڈک اور گرمی ہو، ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہو، یہاں کی ہواؤں کی لچک ہو، جو یہاں کے آکاش، سورج چاند اور ستاروں کا آئینہ بنے اور ان کو آئینہ دکھائے، جس میں وہ مخصوص احساسِ حیات و کائنات ہو جو کہ رِگ وید سے لے کر تلسی داس اور سور داس اور میرا بائی کے کلام میں نظر آتا ہے، جو اس زمانے میں بھی ٹیگور کے نغموں کی پنکھڑیوں کی آبیاری اور شادابی کا

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۱۹۲۷ء۔ حصہ دوسرا۔ صفحہ ۲۹۶

یہ اندیشہ لہریں لیتا ہوا نظر آتا ہے کہ شاعر کے نفیس و نازک احساسات اُن سے بدظن نہ ہو جائیں۔ لیکن اختر نے انھیں ہمیشہ دلاسہ دیا اور ایک جگہ یوں لکھا ہے :

جب کہتی ہوں اب مجھ میں رکھا کیا ہے بھلا　　وہ روپ، نہ رنگت، نہ جوانی کی ادا
کہتے ہیں، تری سی خوب صورت عورت　　جو بھی ہو، رہے گی خوبصورت ہی سدا

O

تم میرے لئے کیا نہیں کرسکتے ہو　　انداز اگرچہ بے خبر لگتا ہے
اتنا مجھے چاہو نہ دِوانوں کی طرح　　سچ، تم سے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے

بیوی کی محبت میں بھی کئی طرح کے رنگ شامل ہوتے ہیں۔ وہ شوہر کی ذہنی، فکری اور جسمانی رفاقت بھی کرتی ہے اور اسے ایک ماں، یا بہن کی بے لوث محبت کی طرح کا پیار بھی دے سکتی ہے۔ خاص طور سے ماں کا پیار جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے جس میں کوئی صلہ یا لالچ شامل نہیں ہوتا۔ زیرِ لب میں صفیہ اپنے پریشان حال شوہر کو تسلی دیتی ہیں اور اپنے بے لوث پیار کا بار بار اظہار کرتی ہے

ہر ایک مصیبت سے بچانے کو تمھیں　　ہر طرح کی بات خود پہ لے سکتی ہوں
کہتی ہے کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے　　میں ماں کا بھی پیار تمھیں دے سکتی ہوں

صفیہ نے اپنے خطوط میں اپنی ساری محبت اور الفت کا محور اگرچہ اپنے شوہر اور بچوں کو قرار دیا ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کے عوام اور نادار و مفلس لوگوں کو فراموش نہیں کرتیں، اور نہ ہی دنیاوی حقیقتوں کو فراموش کرتی ہیں۔ ان کے الفاظ کا دہرانا ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوگا۔

" آج دنیا کے مسائل ہی اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں فی الحال کوئی روشن حل قریب دکھائی نہیں دیتا، اور ہم بھی اسی دنیا کا ایک حصہ ہیں۔ ہمیں بھی غیر مطمئن اور ناآسودہ رہنا ہے۔ اور اسی طرح پوری بہادری سے جینا ہے، اس لئے کہ ہمارا یقین ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ ہم نے اگر یہ fight برقرار رکھی تو جیت ہماری ہی ہوگی۔"

بس اپنے ہی گھر کا سکھ تو کچھ بھی نہ ہوا　　ہر گھر کو ملے گی راحت کس دن
کس روز ہر اک صحن میں مہکیں گے گلاب　　آنگن آنگن بسے گی جنت کس دن

گھر آنگن کی لسانی (Lingvistic) اہمیت بھی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ گھر آنگن کے شاعر نے ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی پس منظر میں اپنے اور اپنی طرح کے کروڑوں ہندوستانی عوام کے احساسات اور جذبات پر آدھارت خوبصورت دیئے جلائے ہیں۔ اور اس کے لئے ہندی اور اردو کی گنگا جمنی ہندوستانی زبان استعمال کی ہے۔ ہندی اور اردو کے حسن کو قائم رکھتے ہوئے جاں نثار اختر نے دونوں زبانوں کے کومل، سرل اور پر بھاوت شبدوں کے استعمال سے اپنی شاعری اور جذبات کو سجایا ہے۔ لسانی اعتبار سے انھوں نے تت تدبھوسم tad bhau sam شبدوں کو ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے فراق گورکھپوری نے "روپ" کی رباعیوں میں اردو اور ہندی کو ایک کرنے کی کوشش میں سنسکرت اور ہندی کے خاصے مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں جو ہندوستانی زبان سے میل نہیں کھاتے۔ اس کے برعکس اختر نے گھر آنگن میں عام فہم لفظوں کا پریوگ کیا ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ فراق سے آگے نکل گئے ہیں۔ انھوں نے عوامی زبان کے عام بول چال کے لفظوں کے استعمال میں حسن اور فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ گھر آنگن ہمارے گھروں میں پائے جانے والے جذبات کے ساتھ ساتھ گھروں میں بولی جانے والی ہندوستانی زبان کا ایک خوشنما نمونہ ہے ★

اختر نے یہاں روایت شکنی کی ہے بلکہ یہ کہئے کہ روایت سے بغاوت کی ہے اور نتیجۃً ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔ اختر کے ہاں یہ بات بالکل نئی نہیں ہے لیکن الگ تھلگ ضرور ہے۔ اختر سے بہت پہلے ریختی شاعری میں ہندوستانی عورت کا تصور موجود ہے اور وہ عورت بازاری عورت نہیں ہے لیکن ریختی شاعری کی یہ عورت "بیوی" بھی نہیں ہے۔ ریختی شاعری میں عورت کی زبان، عورتوں کا روزمرّہ، عورتوں کی چھیڑ چھاڑ، عورتوں کا دصول دھپّہ تو موجود ہے لیکن اس کی ازدواجی زندگی یہاں بھی ناپید ہے۔ اردو مرثیے میں پہلی بار عورت، مرد کی بھوکی نگاہوں کے احاطے سے نکل کر، اس کے خون کے رشتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اردو شاعری کو پہلی بار بیوی، ماں اور بہن کا تصور مرثیے نے ہی عطا کیا ہے۔ لیکن یہ عورتیں، تاریخی عورتیں ہیں جن کو ہم عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہیں، محبت کی نظر سے نہیں۔ یہ عورتیں یا عورت کے یہ روپ ہمارے لئے احترام کے قابل ہیں، پیار کے قابل نہیں۔

پیار کے قابل عورت دستیاب ہوتی ہے لوک گیتوں میں اور وہ صدیوں پہلے سے۔ لیکن لوک گیتوں کی تخلیق نہ تو کسی شاعر کی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور نہ انہیں اعلیٰ ادب میں کچھ مقام حاصل ہے۔ جاں نثار اختر نے ریختی، مرثیہ اور لوک گیتوں میں جھلملاتی ہوئی عورت کی اس جھلک کو ایک روپ دیا ہے، جس کی رعنائی اردو غزل کی چمک دمک میں گم ہو گئی تھی۔ "گھر آنگن" کی رباعیات میرے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔

ریختی کی زبان اپنے بدلے ہوئے انداز میں ملاحظہ کیجئے۔

سچ میری تو ہر طرح مصیبت ہے سکھی
اپنے لئے ہر وقت کہیں گے بُری بات
جھنجھلا کے جو منہ پہ ہاتھ رکھ دوں گی کبھی
پھر کچھ نہ ہوا تو چوم لیں گے مرا ہاتھ

مرثیے نے عورت کی جس پاک دامنی کا تصوّر اردو شاعری کو عطا کیا ہے اس کی ایک تصویر دیکھئے۔

جب سوچتی ہوں کہ تم سے رشتہ کیا ہے
آنکھوں میں ہے اک غرور سا چھا جاتا
بنیاد ہے سنسار کے ہر ناتے کی
سوچو تو سہی میرا تمہارا ناتا

اور لوک گیتوں کی عورت اپنی تمام تر شوخیوں، اداؤں، کجکلاہیوں، وضعداری، وفاشعاری اور شرم و حیا کے ساتھ اختر کے یہاں یوں ظہور پذیر ہے۔

آہٹ مرے قدموں کی جو سُن پائی ہے
اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کر
روٹی جلتی توے پہ چھوڑ آئی ہے

(ملاحظہ ہو پنجابی زبان کا ایک لوک گیت — "جاندیاں دی پیٹھ دیکھنی بھاویں سڑ جے توے دی روٹی" (وہ جا رہے ہیں تو میری نگاہیں ان کا تعاقب ضرور کریں گی۔ بھلے ہی توے پر پڑی ہوئی روٹی جل جائے))

غرضیکہ اختر نے اردو شاعری پر لگے ان الزامات کو دھو ڈالنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ Source of inspiraton سرزمین ہند ہے، ہندوستانی فضا کی بو باس سے بھرپور ان کا کلام ہندوستانی کلچر کی خوشبو میں رچا بسا ہوا ہے۔ خوشحال ازدواجی زندگی کی مہک سے معطر یہ کلام قاری کے ذہن کو اپنے رنگ میں رنگ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اختر نے، اس کے علاوہ، عورت کو اردو شاعری میں ایک بلند مقام دیا ہے۔ وہ عورت، جو بازاری نہ ہوتے

کا باعث ہے، تو یہ صفات اردو شاعری میں ابھی بہت کم آئے ہیں اور اردو شاعری سے اس کی تمام اچھائیوں کے باوجود کسی قدر ناآسودگی کا احساس ناگزیر ہو جاتا ہے[1] مجھے اس کا علم ہے کہ اردو شاعری میں وہ ہندوستانیت جس کے ناپید ہونے کا شکوہ فراق کو ہے، سرے سے ہی ناپید نہیں ہے میر، غالب، مصحفی، امانت، انشا، آزاد، حالی، اقبال، چکبست، محروم، فیض، جوش، فراق کے یہاں آپ کو بیسیوں ایسے اشعار ملیں گے جن میں ہندوستانیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ قدیم اور جدید شعراء کا ایک طویل سلسلہ آپ کو ملے گا جس میں سرزمینِ ہند کے تقدس کے گیت گائے گئے ہیں یہاں کے پہاڑوں، یہاں کی ندیوں، یہاں کے موسموں، یہاں کے تہواروں، یہاں کے پھلوں، یہاں کے پھولوں کا ذکر محبت اور خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر کسی ایک شاعر کے یہاں ہندوستانیت کا وہ بھرپور تاثر نہیں ملے گا کہ آپ اس کی شاعری کو کلی طور پر ارضِ ہند سے وابستہ قرار دے سکیں۔ یا تو ہندوستانیت کے تاثر والی یہ غزلیں اور نظمیں اس شاعر کے مکمل کلام میں پیوند سی نظر آئیں گی یا ایسی غزلوں اور ایسی نظموں کے لئے اس کے باقی کلام سے مختلف اور اکھڑی ہوئی سی محسوس ہوگی۔ ہاں البتہ نظیر اکبرآبادی اس ضمن میں آپ کو مایوس نہیں کرتے، وہ گنگا نہا کر نماز پڑھتے ہوئے ملیں گے اور روزہ رکھ کر آرتی اتارتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہولی کے موقع پر انہیں بھڑ والیتے ہوئے دیکھئے اور محرم میں سینہ پیٹتے ہوئے۔ ان کے ہاں ہندوستانیت کا رچاؤ ہے صرف ہندوستانیت نہیں۔ نظیر کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال کے ابتدائی کلام میں ہندوستانیت کا زوردار جذبہ دستیاب ہوتا ہے۔ ہندوستانی ویدانت اور انسان دوستی کے جس جذبے سے اقبال کا ابتدائی کلام ہمکنار ہے، آگے چل کر وہ جذبہ صرف مسلم سماج تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اقبال قومی شاعر کی بجائے اسلامی شاعر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فراق البتہ خالص ہندوستانی شاعر نظر آتے ہیں، اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے۔ ہندوستانیت کا یہی جذبہ اور یہی تاثر ایک بھرپور انداز سے موجود ہے جاں نثار اختر کے کلام میں۔

یہاں ہندوستانیت کی اِس term کی وضاحت میں یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ ہندوستانیت سے میری مراد نہ ہندو فلسفہ کی تفسیر ہے اور نہ ہندو دیومالا کا ذکر۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ میں اردو شاعری کے فارسی کی روایات سے دستبردار ہونے کا حامی ہوں ہرگز نہیں۔ ہندوستان اپنی تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی مختلف مذاہب، مختلف زبانوں اور مختلف عقیدوں کا ملک رہا ہے۔ آریوں سے لے کر مسلمانوں تک نہ معلوم کون کون لوگ یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ لیکن وید سے لے کر ہندی تک اس کی کسی زبان کی شاعری ایسی نہیں ہے جسے آپ اِس دھرتی کی اُپج نہ کہہ سکیں۔ اردو ہی وہ واحد ہندوستانی زبان ہے جس کی جڑیں ایران اور عرب میں رہی ہیں اگرچہ اس کا پودا سرزمینِ ہند کے دامن میں ہی لہلہاتا رہا ہے اس میں کچھ خرابی ہے اور نہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ لیکن کسی ادب کو لمبی عمر تب تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے دیش کے ذرّے ذرّے کی دھڑکنوں کو اپنے اندر نہ سمیٹ لے اور جب تک وہ product of the soil نہ ہو۔

اردو شاعری میں عورت کا جو تصور عام طور پر ملتا ہے اور جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں، وہ عورت تہذیبی اعتبار سے مسلمان ظاہر ہوتی ہے اس کی گفتگو کا انداز، اس کا لباس، اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ، اس کا محاورہ اسے کسی طرح بھی غیر مسلم ظاہر نہیں کرتا۔ اور وہ صرف جنسی تعلقات تک محدود رہتی ہے۔ مذہب یا معاشرے سے اردو کا روایتی شاعر اوپر نہیں اٹھ سکا ہے وہ یا ہندو ہے یا مسلمان، یا ہندو ہو کر بھی مسلمان ہے یا مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندو ہے۔ وہ محض اور محض شاعر نہیں ہے۔ اردو کی روایتی شاعری میں جو عورت مسلمان دکھائی دیتی ہے، فراق کی "روپ" میں آکر وہی عورت ہندو بن گئی ہے۔ روپ کی رباعیاں روایت شکن ضرور ہیں مگر یہاں بھی عورت صرف عورت نہیں بن پائی، اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان سے ہندو ہو گئی ہے۔

جاں نثار اختر نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کو گھر آنگن میں اتارا ہے اور یہ گھر، یہ آنگن جس عورت کا ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہ بیوی ہے، صرف ایک بیوی۔ یہ بیوی کسی ہندو کی بھی ہو سکتی ہے، مسلمان کی بیوی بھی۔ اس کا گھر ہی اس کے لئے جنّت ہے اور اس کے شوہر کی محبت ہی اس کی سب سے بڑی دولت۔ یہاں ایک اور بھی قابلِ غور ہے کہ اختر کی ان رباعیوں میں مرد اور عورت بلکہ شوہر اور بیوی، دونوں کے ایک دوسرے کے لئے جذبات اور محسوسات کا ذکر ہے۔ گویا اردو شاعری کے مرد کی نگاہوں کا مرکز بازارِ حسن نہ ہو کر اپنا گھر، اپنا آنگن ہو گیا ہے۔

1 فراق گورکھپوری: روپ صفحہ 9

علی عباس امید

گھر آنگن کی شاعری

مدھیہ پردیش شاسن ساہتیہ پریشد کے زیر اہتمام امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا جا رہا تھا۔ اس چہار روزہ پروگرام میں جاں نثار اختر بھی مدعو تھے۔ جشن کی دوسری صبح رویندر بھون میں ایران ایمبیسی کے کلچرل صلاح کار ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی کی صدارت میں فارسی سیمینار کا پروگرام تھا۔ میں ''ہندی ہیرلڈ'' کے مدیر منوہر چوبے کے ساتھ اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا کہ جاں نثار اختر بغل کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اٹھ کر تعظیم کی، اپنے دوست سے متعارف کرایا اور پھر ہم تینوں ہی مشترکہ موضوعات میں کھو گئے۔ مزاج پرسی، بمبئی، سفر، جشن، بھوپال اور نئی تخلیقات سے ہوتی ہوئی گفتگو ''گھر آنگن'' تک پہنچ گئی۔ میں نے چوبے صاحب کو اس مجموعے کی انفرادیت کے بارے میں کچھ بتایا۔ جاں نثار صاحب اپنی پسند کی رباعیاں سنانے لگے۔ میں نے اس کتاب کو پوری توجہ سے پڑھا تھا لیکن اس وقت بھرے پُرے ہال میں آہستہ آہستہ ان کے منہ سے وہ رباعیاں سن کر کچھ اور ہی لطف آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لہجہ کی یہی نرمی ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں میں نہ صرف ممتاز کرتی ہے بلکہ بالکل ہی منفرد رکھتی ہے۔

جاں نثار اختر کی شعری روایات اس وقت بھی جدا تھیں جب نعرہ بازی کا فیشن تھا اور پُر شکوہ الفاظ اور گھن گرج سے تخلیق کے معیار کا تعین کیا جاتا تھا۔ اس دور میں بھی چند نظموں کو چھوڑ کر ان کا شعری سرمایہ زمینی فضا رکھتا تھا اور وہ کوندتی ہوئی تخلیقات کی بھیڑ میں اپنے لہجے کی شائستگی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ چونکہ ان کی شعری روایات خود ان کی اپنی تلاش کردہ ہیں لہٰذا وہ احساسات کی ترجمانی کے لئے لفظوں کو جیتا جاگتا روپ دے دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں الفاظ اسی طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں جیسے کسی مصور کے شاہکار میں رنگ۔ ان کی زبان، ان کے احساسات کو جیتے جاگتے روپ میں ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ یہ ان کی انفرادیت ہے کہ ہم ان کی شاعری پڑھنے کے علاوہ اسے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

''گھر آنگن'' میں جاں نثار کی شاعری کا اصل رنگ غنائی، رومانی، ذاتی اور سماجی ہے۔ یہ مجموعہ ان کے کلاسیکی نشاطیہ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ ان کے میلانِ طبیعت، زبان کے لچیلے پن، فکر کے انداز اور بیان کی والہانہ پن نے رباعیوں کے خاکہ کو ہفت رنگ بنا دیا ہے۔ اردو شاعری میں رومانی رباعیوں کی کمی نہیں ہے لیکن بیشتر میں وہی فکر رواں دواں ہے جو روایتی غزلوں کی روح ہے۔ دوسرے شعراء نے جس طرح اس موضوع کو اپنایا ہے۔ اس میں اول تو دوشیزگی کا فقدان ہے دوم ان کے محسوسات کافی فاصلے کے ہیں۔ ان کی فکر کا مرکز جو عورت ہے اس کے خد و خال اور نشیب و فراز تصوراتی محبوب کو بھی شرمسار کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ شاعری کی دسترس سے پرے ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہن اس کے وجود کو قبول نہیں کر پاتا۔ محبوبیت حسن کی رہین منت ہے اور حسن شباب کا۔ ان سب کا مجموعی دقفۂ حیات بہت زیادہ نہیں ہے اس لئے ان کے بیان کا کینوس

ہوئے بھی کبیر داس اور تلسی داس کے عتاب کا شکار ہوئی تھی ۔ جیسے کبیر نے ۔

نار ی کی جھائیں پرت اندھا ہوت بھجنگ
کبیرا ان کی کون گتی جو نت ناری کے سنگ

کہہ کر اور جیسے تلسی داس نے ۔

ڈھور گنوار شودر پشو ناری
یہ سب تاڑن کے ادھیکاری

کہہ کر حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا ۔ اختر کی رباعیوں میں وہی عورت ، جو خالص ہندوستانی عورت ہے ، دلیش کی سبھیتا کا جوہر بن کر ہمارے سامنے آئی ہے ۔ یہ عورت اپنے کنوارپن کا میٹھا سا غرور لئے جب پیا کی سیج پر پہنچتی ہے تو اس کی تمام شرارتیں ، چنچلتائیں ، پیار اور سیوا بھاؤ میں ڈھل جاتی ہیں ۔ یہ نیک چلن بیوی شوہر کے قرب کی خوشبو کو زلفوں میں سمیٹ کر صبح سویرے اٹھ کر نہاتی ہے ، دن بھر گھر گرہستی کے کاموں میں مصروف رہتی ہے ، سینا پرونا کرتی ہے ، ہانڈی روٹی کا اہتمام کرتی ہے اور شام کے دھندلکوں میں شمع بن کر جل اٹھتی ہے ۔ شوہر کی راتوں کو سپردگی سے جگمگاتی ہے ، اُس کے ہاتھوں گدگدایا جانا چاہتی ہے ، اس کے لمس کو بیقرار ہوتی ہے ۔ یہ ہندوستانی عورت مرد کو " صرف اپنا " مانتی ہے اور " صرف اسی کی " ہو کر رہنا چاہتی ہے ۔ جس گھر میں اس کی ڈولی آتی ہے ، وہاں سے ہی وہ اپنی ارتھی نکلنے کی تمنا کرتی ہے ۔ پتی کے ہر غم میں اس کا بوجھ بٹانے والی ، اس کے اداس لمحوں کو اپنی مسکراہٹوں سے سجانے سنوارنے والی ، اس پر جان چھڑکتی ہوئی ، دھرتی جیسا دشال سینہ لئے ہوئے یہ عورت مرد کے جسم کو صرف ایک بیوی ہی عطا نہیں کرتی ، اس کے اندر کی چنچلتا کو ماں کا پیار بھی عطا کرتی ہے ۔ ★

" حیرت ہوتی ہے کہ اختر نے اس موضوع کو شاعری کے لئے کیسے ممکن کر لیا ۔ بہاری کے یہاں بھی ایسی چھٹکی ہوئی چاندنیاں کم ہی ملیں گی اور کا تو کیا ذکر ۔ اردو شاعری تو ان سے اب تک محروم ہی رہی ہے ، اختر کی یہ صنفِ شاعری ہر انداز کی پاکیزگی لئے ہوئے ہے ، اور اس کی شگفتگی ، رعنائی ، رنگینی اور نغمگی تو شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئے ۔ "

ظفر ادیب

جواب تک اچھوتے رہے ہیں نہ صرف خوب صورتی سے بلکہ اہم بن کر سامنے آئے ہیں۔

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین
قطروں سے پسینے کے شرابور جبین
مصروف کسی کام میں دیکھوں جو تجھے
تو اور بھی مجھ کو نظر آتی ہے حسین

○

دیکھے مرے شانے پہ جو چسپاں کوئی بال
اِک غصے کو اس کا غیر ہو جاتا ہے حال
یکبارگی اُس کے سو کھتے ہونٹوں پر
رہ جاتے ہیں کپکپا کے کتنے ہی سوال

○

آہٹ مرے قدموں کی جو سن پائی ہے
اِک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کے
روٹی جلتی، توے پہ چھوڑ آئی ہے

○

لوک گیتوں میں یہ موضوع ضرور ملتا ہے۔ لیکن نکھری ہوئی شاعری نے نہ جانے کیوں اسے اتنا غیر اہم مانا کہ خال خال ذکر سے بھی اجتناب کیا۔ جاں نثار نے پہلی بار اس موضوع کو اپنایا ہے۔ ان کی رباعیاں کلاسیکی ضبط کا مزاج لئے ہوئے زندگی کے مختلف رنگین، روشن اور دلفریب زاویوں کی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں چونکہ اپنا ہی عکس دکھاتی ہیں لہٰذا قریب تر ہیں، انہیں پڑھتے یا سنتے وقت ایک ایسی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے جو حقیقی زندگی کا تقاضہ ہے۔ یہ تصوراتی۔ رومان سے ہر طرح محفوظ ہیں ان میں ذہنی کشادگی کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ جاں نثار نے جذباتی تصادم، لمسی کیفیات، سنجیدہ وا لہانہ پن اور شرگ انہ اضطراب کو بڑے ہی خوب صورت اور فطری انداز میں بیان کیا ہے۔ جذبات میں مختلف رنگوں کی آمیزش فطری بات ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ مزاجِ انسانی کی سرحدوں کو عبور کر جائیں گے۔ جاں نثار اختر کی یہی خوبی ہے کہ انھوں نے اپنی دھرتی کے رنگوں کو منتخب کیا ہے۔ کہیں بھی فضائی یا آسمانی چھینٹے ان کی رباعیوں کے فطری پیرہن کو داغدار نہیں کر پاتے۔

دیکھیں گے تو جی میں کڑھ کے رہ جائیں گے
لہرائیں گے ان کے دل میں کتنے آنسو!
آنچل کی بھری کھونپ چھپانے کے لئے
ساڑی کا اُڑستی ہے کمر میں پلّو

○

باہر وہ جہاں بھی کام کرتے ہوں گے

بھی بہت وسیع نہیں ہے۔ اس طرح کے عمومی تفکر و تذکرہ سے دامن بچانے کی شعوری کوشش پہلی بار فراق گورکھپوری کے یہاں ملتی ہے۔ انھوں نے ہندو دیو مالا، قدیم تہذیب اور سنسکرت کے سرمایہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ہندوستانی عورت کی تصویر بڑی چابکدستی سے کھینچی ہے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی "روپ" کی رباعیاں روپ تک ہی محدود رہیں۔ گو کہ ان کی بیشتر رباعیوں میں عورت کا سراپا تصویر کی طرح ابھرا ہے لیکن اس کا وہ روپ کہیں نہیں ملتا جو گھر آنگن کا حصہ ہے۔ حالانکہ حقیقی اور دیرپا روپ یہی ہے۔

"گھر آنگن" کی یہی خصوصیت ہے۔ جاں نثار اختر نے اسی عورت کی بات کی ہے جو خلوت و جلوت میں ساتھ ساتھ ہے۔ کیف و غم کی راہوں پر شانہ بہ شانہ ہے اور جس کا وجود حسن اور جنس سے پرے بھی باقی رہتا ہے۔ وہ زندگی کی شیرینی کے ساتھ ہی اس کی تلخیوں کو بھی پیتی ہے۔ اس کے ذہن میں اس کا اپنا گھر ہے اور اس کی فکر کا محور وہ ہستی ہے جس سے وہ وابستہ ہے۔ یہی ارضیت "گھر آنگن" میں منفرد ہو کر ابھری ہے۔

جاں نثار کا یہ مجموعہ ایک خوبصورت البم ہے۔ اس میں شامل ایک سو چونسٹھ تصویری رباعیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مرد کے جذبات، احساسات و خیالات کی تصویروں سے سجایا گیا ہے اور دوسرا عورت کے۔ ہر دو حصوں میں انفرادی جذبات و محسوسات کی شعاعیں دور دور تک روشنی بکھیرتی ہیں۔ گھریلو زندگی کی شوخی، خیالات، ولولہ انگیزی اور سوچ کی گہرائی مجسم ہو کر سامنے آئی ہے۔ جاں نثار اگر ایک طرف متحرک الفاظ سے محبت کی نگاہوں میں اسرار حیات کا خاکہ کھینچتے ہیں تو دوسری جانب ان کے زیر و بم کو دلی کیفیتوں کی گت دے کر وصل و ہجر، نشاط و غم اور سکون و اضطراب کی مرقع کشی کرتے ہیں

دو روحوں کی یہ جنم جنم کی یکجائی
لیتے ہوئے دو بدن یہ باہم انگڑائی
یگ یگ سے دلوں میں گونجتے پیار کے گیت
صدیوں سے یہ آنگنوں میں بجتی شہنائی

○

وہ پہلے پہل تجھ کو منانے کا سرور
گھونگھٹ میں وہ مکھڑے کا جھجکتا ہوا نور
شرما کے وہ باہوں میں سمٹنا تیرا
آنکھوں میں کنوارپن کا میٹھا وہ غرور

○

کہتی ہے کہ اتنا نہ کرو تم اصرار
رکھ جاؤں گی خود اپنی نظر سے اک بار
ایسی ہی تمہیں ضد ہے تو، اس پیالے میں
میرے لئے صرف چھوڑ دینا اک پیار

○

جاں نثار کے موضوع "گھر آنگن" میں بڑی وسعت ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے وہ پہلو، ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات

شہاب مالیر کوٹلوی (مرحوم)

دُنیا کا بہشت

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ شعر و ادب، آرٹ یا فن، زبان، پیرایہ، بیان، محبت، خلوص، پاسِ وفا، انسانیت، ازدواجی زندگی کی برکات اور اس کی گراں بار ذمہ داریاں اور اُن کو بجالانے میں طرفین کے احساسات اور باہمی خودداریوں کے خیال کا یہ عالم کہ "انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔ پھر روایت کے احترام کے ساتھ روایت پر دیدہ دارانہ تنقید، ترقی پسندی کا ایک جاذب نظر رخ اور حق گوئی میں فریق مقابل کے جذبات کا پُر خلوص لحاظ، بے باکی کے ساتھ گفتگو میں مرتبہ شناسی کا رکھ رکھاؤ۔ لطیف ترین احساسات تصورات و جذبات کی بول چال کے لفظوں میں مصوری کیسی ہوتی ہے، تو عرض کروں گا کہ تنہائی میں "گھر آنگن" کو پڑھئے اور جہاں تک ہوسکے دل و دماغ کو ہر قسم کے موافق و مخالف میلانات سے بچاتے ہوئے مطالعہ کیجئے اور پھر دل پر ہاتھ رکھ کر خود ہی انصاف کیجئے کہ میرے بیان میں کہیں مبالغے سے تو کام نہیں لیا گیا۔

غیر مناسب نہ ہوگا اپنی فہم ناقص اور محدود علم و نظر اور مذاق کے مطابق ذیل میں اس کتاب کی چند خصوصیات اور امتیازات کی طرف مختصر اشارہ کر دوں۔

۱۔ کتاب "گھر آنگن" کی زبان ٹھیٹھ ہندی، ہندوستانی یا خالص اردو ہے جسے بھارت یا ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ خواندہ ناخواندہ مرد عورت نہ صرف سمجھ سکتے ہیں، بلکہ اپنے روزمرہ کسی قدر اختلاف لب و لہجے کے ساتھ بولتے بھی ہیں۔ اور اسے "عامیانہ" بولی کہنے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا۔

۲۔ اس میں عربی، فارسی کے لفظ ضرور آئے ہیں مگر بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر۔ اور دو ایک انگریزی لفظ بھی نظر آتے ہیں۔ مگر یہ سب وہ ہیں جو ہندوستانی میں رس بس بلکہ رچ گئے ہیں اور ان کی آمد بے تکلف اور بے تصنع ہے۔

۳۔ اس "کتاب گھر آنگن" میں سنسکرت کے جو لفظ آئے ہیں، وہ اپنی شبد کوشی شدھ شکل میں نہیں بلکہ ایسی شکل اور ایسے لہجے میں آئے ہیں جس طرح وہ عموماً بول چال میں آتے اور سمجھے جاتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کی رباعیات کا موضوع آدم و حوا کے بلبیٹے بیٹی یا مرد عورت کے یکجائی رہن سہن یا ازدواجی بندھن کی زندگی کے خوشگوار تعلقات، نازک و لطیف احساسات، گھریلو زندگی میں روزمرہ پیش آنے والی مشکلات۔ ان کو حل کرنے کی باہمی کوششیں۔ اس کی تلخیاں، ترشیاں، اُن کی ناگواری میں باہمی گوارائی کے انداز، ناخوش گواری میں خوش گواری کے پہلو، آنسو، خوشی کے آنسو، مجبوری کے آنسو، کمزوری کے آنسو، درد کے آنسو، الجھن کے آنسو، خودداری کے آنسو، اپنائیت کے آنسو، جو کچھ ہے محبت ہی محبت اور خلوص ہی خلوص ہے اس ساری روداد میں بیگانگی کہیں بھی نہیں۔ نام کو بھی نہیں۔ اگر کہیں بظاہر بیگانگی ہے تو بے گانگی نہیں۔ گہری یگانگت ہے۔ غرض جو کچھ ہے وہ

رہتے ہی تو ہوں گے واں جھکائے ہوئے سر
گھر میں بھی نہ سر اٹھا سکیں گے تو سکھی
رہ جائے گا اُن کا دم نہ سچ مچ گھٹ کر

مجھ کو یوں ہی بازو سے لگائے چلنا
کانٹوں سے ہے زندگی کا رستا بھرپور
ہاتو کہ تمہارے ہی سہارے ساجن
جیون میں چلی آئی ہوں میں اتنی دور

میں ہی نہ بٹاؤں گی اگر غم اُن کا
غم اُن کا بھلا کون بٹائے گا سکھی
میں ہی نہ اگر انھیں بڑھا وا دوں گی
ہے کون جو اُن کا دل بڑھائے گا سکھی

انھوں نے الفاظ کو جذبات سے ہم آہنگ کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ بیشتر رباعیوں میں پیکر تراشی کا عمل بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ چونکہ ابھرنے والے پیکر ہمارے سامنے کے ہیں، ہمارے اپنے ہیں لہذا نہ تو کسی طرح کی اجنبیت کا احساس جنم لے پاتا ہے اور نہ ہی یہ ذہن پر بار ہوتے ہیں بلکہ اُن کی حقیقت ذہن کو اپنی جانب مائل کر لیتی ہے۔ لفظ اور امیجری کا اعتدال گھریلو زندگی کی مربوط حقیقتوں کی تصویر میں روح پھونک دیتا ہے۔

جاں نثار اختر اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں تجربہ کی وسعت آسمانِ تخیل کی حقیقت کو سمجھنے لگی ہے اور ذہن کی گمبھیرتا انسان کا رشتہ دھرتی سے جوڑ دیتی ہے۔ مشاہدہ استقامت دیتا ہے اور فضا میں تیرتے ہوئے قدم زمین پر ٹکنے لگتے ہیں۔ تصوراتی پیکر خود بہ خود ذہن سے ہجرت کرنے لگتے ہیں اور زندہ حقائق کی آبادکاری شروع ہو جاتی ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کا طویل سفر کرنے کے بعد جاں نثار کو جس منزل کا سراغ ملا ہے۔ "گھر آنگن" اسی کا بیان ہے۔ اردو ہی نہیں، دوسری بڑی زبانوں میں بھی اس منزل کے نقوش واضح نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں شعراء نے اسے Neglect کیا ہے۔ اگر کہیں اس کا ذکر ملتا بھی ہے تو وہ برائے نام۔ اس لحاظ سے جاں نثار اختر کی رباعیاں اردو شاعری میں بہت ہی اہم اضافہ ہیں۔ دوسری زبانوں کی بڑی شاعری سے اردو کے شعری سرمایہ کا تقابل کرتے وقت جاں نثار کی یہ جیتی جاگتی رباعیاں اسے ممتاز کریں گی۔

(ہندی سے ترجمہ۔ ممتاز امید)

افتخار بیگم صدیقی
لیکچرار ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جاں نثار اختر کی شاعری میں عورت

عورت کا حسن شاعری کا موضوع اور اس کی جان ہے۔ غزل کے تو معنی ہی عورتوں سے بات کرنے کے ہیں لیکن نظموں میں بھی اسی حدیثِ دلبراں ہی سے رنگینی اور شعریت پیدا کی گئی ہے۔ اردو شاعری جب تک دکن میں رہی اس میں عورت کا حسن اپنی فطری ادائیں دکھاتا رہا۔ جب یہ شاعری دکن سے نکل کر دہلی میں آئی تو کچھ محمد شاہی دور کے سپاہی پیشہ شعرا کی بدذوقی کے سبب اور کچھ فارسی اثرات نیز تصوف کی غلط تعبیر کی وجہ سے اس میں عورت کی جگہ ایک سبزہ خط معشوق نے لے لی۔ اور عشق کا تصور اور حسن کا انداز دونوں یکسر بدل گئے۔ کافی عرصہ تک یہی رجحان اردو شاعری میں عام رہا۔ پھر لکھنؤ کے رنگین مزاج شعرا نے شاعری میں نسوانی پیکر تراشے اور دہلی میں مومن نے ایک پردہ نشین سے اظہار عشق کیا۔ اس سے اتنا تو ہوا کہ شاعری میں جو غیر فطری عشق داخل ہو گیا تھا، اس کی جگہ اب ایک فطری اور حقیقی جذبہ آ گیا لیکن شاعری کی اخلاقی سطح پھر بھی بلند نہ ہو سکی۔ محبوب کی ادائیں اسی طرح قاتلانہ اور سفاکانہ رہیں۔ اس کے ہرجائی پن اور شقاوت و سنگ دلی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے لئے سولہ سنگھار سے آراستہ اور تیر و ترکش اور تلوار و خنجر سے لیس رہنا پھر بھی ضروری سمجھا گیا۔ اور اصلیت کا رنگ اس میں بہت کم ابھر سکا۔ سب سے پہلے حسرت نے اس روایت سے بغاوت کی۔ انہوں نے شاعری کو عورت کا وہ تصور دیا جو بازاری کی جگہ شریف ہرجائی کی بجائے وفا پرست اور آرائش و تصنع سے بیگانہ، بے ساختہ اور سادہ تھا۔ اس کے لئے اردو شاعری حسرت کی ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی۔ تصورات کی اس تبدیلی میں معیاروں اور روایات کی تبدیلی کو بڑا دخل ہے لیکن یہ ہمارے دائرۂ موضوع سے باہر ہے۔

اِن تمام عہد بہ عہد تبدیلیوں کے باوجود ہمارے شاعروں کی توجہ کبھی اس طرف نہیں گئی کہ عورت کا وہ روپ بھی خوب صورت ہو سکتا ہے جو بیوی کہلاتا ہے۔ شاید اس کی تہہ میں یہ ذہنیت کار فرما رہی ہو کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کی خواہش کے لئے بدنام تو حوا ہے لیکن شاید ابن آدم اس جرم کا زیادہ مرتکب ہوتا ہے بیوی کو شاعری کا موضوع کسی شاعر نے نہیں بنایا۔ بیوی اور محبوبہ دو متضاد الفاظ سمجھے گئے۔ اس کی وفا کے مقابلے میں دوسروں کی بے وفائی اور اس کی چاہت کے مقابلے میں دوسروں کی نفرت شعرا کو زیادہ حسین اور عزیز معلوم ہوئی۔

اردو شاعری کی اس کمی کو "گھر آنگن" نے پورا کیا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کی دنیا صرف گھر کے آنگن تک محدود ہے لیکن یہ آنگن محبت اور وفا کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے۔ اس میں جو محبت پروان چڑھتی ہے وہ اردو شاعری کے لئے تقریباً نئی ہے۔[1]

---

[1] یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ عورت کی یہ تصویر اس سے پہلے احسان دانش اپنی ایک نظم "شریک زندگی" میں پیش کر چکے ہیں لیکن اول تو صرف ایک نظم سے کوئی واضح تصور نہیں بنتا۔ دوسرے اس میں ایثار و وفا تو ہے مگر وہ دلکشی اور رنگینی نہیں جو جاں نثار کی تصویروں میں ہے۔ ان اشعار سے دونوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے

یہاں پر جس جگہ برپا ہے یہ ہنگامِ مجبوری ۔ یہیں ہیں ایک بیوی اور شوہر وقفِ مزدوری
برابر ہے مگر آگے قدم یوں دھرتی جاتی ہے ۔ رخِ شوہر پہ سایہ ٹوکری سے کرتی جاتی ہے
جبینِ ہند کی کھوئی ہوئی تابندگی یہ ہے ۔ بجا ہے ناز جس پر وہ شریکِ زندگی یہ ہے

سب کچھ اپنا ہی اپنا ہے۔ بھرپور اپنائیت، شب و روز کی گھریلو زندگی کا جو رومانی مرقع بھی ہے۔ اس کی بنیاد، اصلیت، حقیقت اور واقفیت پر ہے نہ کہ محض ایک ہیجانی اپج اور صرف کسی جذباتی خواب بے تعبیر کی بے معنی جھلکیاں۔ جس زندگی کا نقشہ ان رباعیوں میں کھینچا گیا ہے وہ سِن و سال کے بڑھنے کے ساتھ گھٹتا نہیں بلکہ عروج پاتا چلا جاتا ہے۔

(۵) اس میں ایک ہندوستانی عورت اور ایک ہندوستانی مرد کی خیالی نہیں واقعی شب و روز کی اپنی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

(۶) اس میں ہندوستانی شاعری کی مسلمہ محبوباؤں کو سنداً یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً ص۱۴۲ کی پہلی رباعی میں ہندوستانی ادب کی تین محترم خواتین کا نام آیا ہے۔ ان ہستیوں کی جذباتی زندگی، خلوص و وفا کی تصویر اور تاریخی زندگی ایک قابلِ غور مسئلہ ہے۔

(۷) ہندوستان کی ہماری اردو شاعری میں عموماً جن محبوباؤں کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ وہ سنے سنائے بیرونی قصوں کی "ملکائیں" ہوا کرتی ہیں جن سے نفسیاتی جذبات، ذاتی یا طبقاتی کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا مگر "گھر آنگن" میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اس میں جو کچھ ہے اپنا ہے۔ اپنے سماج کا ہے۔ اپنے گھر کا ہے۔ گھر کی باتیں، گھر کی زبان میں، گھریلو لہجے میں، گفتگو غیروں سے نہیں غیروں کی نہیں۔ وہی گفتگو جو ایک اچھے گھر والے اور ایک اچھی گھر والی میں ہوا کرتی ہیں۔ اگر کسی سہیلی، بہنیلی یا سکھی سے کہیں خطاب ہے تو اس انداز سے کہ دیکھنے والی سمجھ لے کہ گھر والی کو، خاوند کو اپنا بنا لینے میں کن کن اور کیسی کیسی تپسیاؤں سے کام لینا پڑا ہے۔ پڑھنے والے کے لئے ہر مضمون دلچسپ اور جاذب نظر۔ ہر بیان پُرصداقت۔ اس حد تک کہ اکثر جگہ پڑھنے والا غیر کی نہیں، اپنی ہی واردات سمجھتا ہے۔

(۸) معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر کو نیلا رنگ زیادہ مرغوب ہے۔ لباس میں نیلاہٹ اچھی لگتی ہے۔ ہمارے ہاں آسمانی رنگ، سبزہ رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالباً اسی لئے ہمارے شاعر نے اپنی کتاب "گھر آنگن" کے گردپوش کے لئے نیلا رنگ انتخاب کیا ہے۔ محبوبہ کو "گوری" کے خطاب سے مخاطب کرنا بے داغ محبت کا من بھاتا دستور ہے۔ اس لئے اختر نے جابجا اس صفت سے کبھی اپنے شعروں کو سجایا ہے "پانڈو رنگ" یعنی گورا۔ پاک اور پیار کی مقدس صفت ہے مگر تقدس اور محبت کی اس صفت سے موصوف تاریخی یا رومانی مقدس بھارتی ہستیاں آسمانی رنگ سے رنگین اور "سانوریا" کہہ کر بھی مخاطب کی جاتی اور دکھلائی جاتی ہیں۔

(۹) کتاب کے موضوع سے متاثر ہو کر نقاش نے کتاب کے گردپوش پر جو سادہ نقش بنایا ہے وہ موضوع کتاب کی بہترین بولتی ہوئی تفسیر یا تعبیر ہے۔ اس میں گھر کی نمائندہ گھر والی ہے اور گھر کے آنگن کی نمائندہ ماں کی گود ہے اور ماں کی گود میں مسرور بچّہ درختِ حیات کا میٹھا پھل ہے۔ گھر کی دیواریں ازدواجی رشتہ اور گھر کی چھت گھر والا ہے۔ جن کو یہ دولت حاصل ہو اُن کو سب کچھ حاصل ہے۔ ابن یمین کا قطعہ ہے

دو قرص نان گراز گندم است یا از جو	دو تائے جامہ اگر کہنہ ہست یا از نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع	کہ کس نہ گوید ازیں جا بخیز آں جا رَو
ہزار بار فزوں تر بہ نزدِ ابن یمین	ز فرِ مملکتِ کے قبادو کے خسرو

ازدواجی زندگی کے یہی عناصر اور اجزا ہیں جن سے خوشحال زندگی کی تشکیل ہوتی ہے اور دلکش اور حسین زندگی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی پیشِ نظر کتاب "گھر آنگن" کا موضوعِ سخن ہے۔ یہی دنیا کا بہشت ہے۔ اس کے باہر کی تاک جھانک محض ندیدہ پن اور فریب نفس کی چھلاوہ گری ہے۔

(۱۰) جاں نثار اختر اپنی ازدواجی زندگی سے ہر دور میں خوش اور مطمئن رہے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو کتاب کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے پوری کتاب اسی شادمانی و مسرت کی حکایت شیریں اور قابلِ احترام روداد ہے۔ لیکن میرے نزدیک تمہید کے حسبِ مختصر نثری جملہ نے اس کیفیت کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ پوری کتاب پر بھاری یا اس کے مضامین کی حکیمانہ کلید ہے اور وہ یہ ہے۔

"خدیجہ کے نام جو میرے لئے صفیہ کا دوسرا روپ ہے۔"

اشکوں سے بھرے نین کلائی سے چھپائے   کہتی ہے میں کیا مانگوں بس اب اس کے سوائے
جاتے ہو تو سینہ سے لگا کر اک بار   لیں بھینچ تو مجھ کو کہ میرا دم گھٹ جائے

دل کہتا ہے گوری کا وہ آئیں گے ضرور   کھڑکی سے پرے دیکھ رہی ہے کہیں دور
آتے انہیں دیکھ لے تو بھر مانگ بھرے   چٹکی میں لئے بیٹھی ہے کب سے سیندور

آنکھیں یہ تھکن سے چور اشکوں سے بھری   آنگن میں برس رہی ہے کیوں مولسری
آئے نہ پیا آج بھی وعدہ کر کے   گوری کو ڈسے لیتی ہے ساری یہ ہری

لیکن عورت کا وہ روپ جو حقیقت سے بالکل قریب ہے اور جس میں صرف جاں نثار کو حسن دکھائی دیا کچھ اور ہی ہے۔ گھریلو زندگی کی یہ چھوٹی چھوٹی سی مسرتیں بڑی حسین ہیں لیکن اب تک کسی شاعر نے ان کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔

پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں   کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے   لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں

آہٹ میرے قدموں کی جو سن پائی ہے   اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کے   روٹی جلتی توے پہ چھوڑ آئی ہے

سوتے سے اٹھی ہے کہ گرم کھانا کر دے   لو کا جو لگا جھلس گئی سب کایا
آیا ہے جو ہوش پوچھتی ہے اُن سے   "بتلائیے سچ آپ نے کھانا کھایا"

کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اُٹھی ہے مگر   ڈرتی ہے کہیں ان کو نہ ہو جائے خبر
تھک کر ابھی سوئے ہیں کہیں جاگ نہ جائیں   دھیرے سے اُڑھا رہی ہے اُن کو چادر

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین   قطروں سے پسینہ کے شرابور جبین
مصروف کسی کام میں دیکھوں جو تجھے   تو اور بھی مجھ کو نظر آتی ہے حسین

وہ آئیں گے چادر تو بچھا دوں کوری   پردوں کی ذرا اور بھی کس دوں ڈوری
اپنے کو سنوارنے کی سدھ بدھ بھولے   گھر بار سجانے میں لگی ہے گوری

بعض رباعیاں ذرا زیادہ شوخ ہو گئی ہیں اور ان میں جذباتیت زیادہ آگئی ہے لیکن ان میں بھی ابتذال یا رکاکت کا شائبہ نہیں آنے پایا۔ کیونکہ ان کی تہہ میں جو جذبات ہیں وہ مبتذل نہیں ان میں اور معاملہ بندی کے اشعار میں وہی فرق ہے جو ایک پجارن یا دیو داسی کے رقص اور ایک طوائف کے رقص میں ہوتا ہے۔ ان رباعیوں میں رومانس اور جنس کے ساتھ ازدواجی زندگی کا تقدس بھی ہے اس

صرف اردو ہی نہیں بلکہ اس کی مثال شاید ہی کسی زبان میں مل سکے۔ اس میں عورت کا وہ روپ سامنے آتا ہے جو آرائش اور تصنع سے بے نیاز اور پیار و وفا کا مجسمہ ہے جس کی سپردگی اس کا حسن اور جس کی سادگی اس کا زیور ہے اس مجموعہ کی سب سے پہلی رباعی میں جاں نثار صاحب نے ہندوستان کی تین چیزوں کا ذکر کیا ہے اور ان کو " دیس کا زیور" بتایا ہے۔ وہ تین چیزیں ہیں ...

ایک پھول گلاب، ایک ندی گنگا، ایک نار جیسے بلائیں گوری کہہ کر۔ اور انھوں نے عورت کا جو روپ پیش کیا ہے وہ گلاب اور گنگا دونوں کی خصوصیات کے امتزاج سے ابھرا ہے اس میں گلاب کا سا حسن اور کو ملتا ہے جس کی خوبصورتی صرف نگاہوں کی تسکین کا سبب نہیں بنتی بلکہ شامِ جاں کو بھی معطر کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں گنگا کا دھیما پن اور نرم روی، گہرائی، تقدس اور فیض رسانی بھی ہے وہ اس کو کھلونا بنا کر نہیں پیش کرتے بلکہ اس کو تہذیب کا خالق اور معمار مانتے ہیں۔

صدیوں میں کھلی ہے جا کے صدیوں کی یہ پھول　　　انساں تجھے کہتا تھا کبھی سیج کا پھول

تہذیب کے دنیا نہ بنا پائی اصول　　　جب تک تیرے جذبات کی دولت نہ لی

گھر آنگن کی عورت ایک جانب تو وفا اور ایثار کی دیوی اور سیتا و ساوتری کا دوسرا روپ ہے جو " آگ کے شعلوں" سے گزر سکتی ہے اور موت سے بھی " اپنا سہاگ چھیننے" کا عزم رکھتی ہے۔ جو حالات کو ہموار بنانے اور اپنے جیون ساتھی کا " بوجھ اٹھانے" کا حوصلہ رکھتی ہے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے " ہر روپ" اختیار کر سکتی ہے۔ اس نے اپنے " روپ" سے ساجن کا من نہیں حاصل کیا ہے بلکہ اس کے لئے بڑی " تپسیا" کی ہے۔ یہ کوئی الٹرا ماڈرن سوسائٹی گرل نہیں ہے جس کی ساریوں اور میک اپ کے بلوں کے بوجھ سے غریب شوہر کی کمر جھک جاتی ہے اور جو اظہار محبت میں بھی بے باک ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ایک مشرقی انداز کی لڑکی ہے جس کی دنیا اس کا آنگن ہے جو شوہر کو پریشانیوں سے بچانے کی خاطر " اپنی پھٹی ساری کا پلو" کمر میں اڑسیں لیتی ہے تاکہ شوہر کی نظر اس پر نہ پڑے۔ جو ہر طرح کی تنگی اٹھالے گی مگر " چپ چاپ سے کچھ بچا کے رکھے گی ضرور"، جو خود چاہے اس کی برائیاں کرے مگر دوسروں سے اس کی برائی کو نہیں سن سکتی۔ جو اپنے آرام و آسائش پر اس کی عزت کو قربان نہیں کرتی بلکہ اس سے کہتی ہے۔

تم میرے ہو یہ کم نہیں میری تسکین　　　جیسے بھی ہوا گذر بسر کرلوں گی ٭

اس میں نظر آتی ہے تمہاری توہین　　　نیچا نہ کروں گی خود کو سب کے آگے

وہ ہر گرم و سرد سہنے کو تیار ہے مگر شوہر کے ارادوں کی کمی نہیں برداشت کر سکتی۔ اور یہ کہہ کر اس کی ہمت بندھاتی ہے۔

کچھ دیر کے اور ہیں زمانے کے ستم　　　کہتی ہے کہ سہہ لوں گی جو سہنے پڑے غم

پیچھے نہ ہٹانا کہیں گھبرا کے قدم　　　تم اپنے ارادوں کو نہ کرنا کم زور

دوسری طرف وہ رادھا بھی ہے جو اپنے " کانہا" کی اس درجہ دیوانی ہے کہ اس کے ہونٹوں سے بانسری لگی دیکھ کر جل جاتی ہے جو کھڑکیوں کے پردے اس ڈر سے نہیں اٹھاتی کہ کہیں کوئی شوخ کرن ساجن کے پاس آکر نہ سو جائے۔ جو کہیں بھی ہو ساجن کی نگاہیں لکشمن ریکھا بن کر اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ جس کو ہر رنگ سے شیام رنگ اور ہر خوشبو سے ان کی سُگندھ زیادہ عزیز ہے جو مانگ میں وہ پھول ہی سجاتی ہے جس کی پنکھڑیوں پہ پیا کے قدموں کی دھول جم گئی ہو۔ عورت کا یہ روپ ملاحظہ ہو جو جذبات اور دلکشی سے بھرپور ہے اور روایتی شاعری کی محبوبہ کا حسن جس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

کیا غم جو ہوا سے تمتما تے رہیں گال　　　پرواہ نہ سردی کی نہ جاڑے کا خیال

گوری اوڑھے ہے ان کی اوڑھی ہوئی شال　　　اک آنچ سی تن بدن میں لہراتی ہے

خواجہ عبدالغفور آئی سی الیس

گھریلو زندگی کا مصوّر

یہ امر مسلمہ ہے کہ ممدوح کا فن ۶۴ سالہ اور ان کی شخصیت اُس سے اونچی ہے اور امریکہ میں تو یہ بات مان لی گئی ہے کہ خوشگوار زندگی تو ۶۰ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور یہ فکر روزگار کی حدود سے آگے اور فکر سخن اور دانشوری کے اعلیٰ ترین مدارج تک صیقل اور جلا پاکر پہونچ جاتی ہے۔ چنانچہ اختر نے بھی پروفیسری کو بہت پیچھے چھوڑ کر اردو شاعری کو اپنایا اور خاص مقام پیدا کیا۔ یہ فلمی بھی ہے اور ادبی بھی۔ بلکہ ادبی زیادہ ہی ہے۔ میری رائے میں یہ شاعر کم ہیں مصور زیادہ۔ اِن کے کینوس پر زندگی ابھرتی ہے مچلتی ہے لبھاتی ہے اور لفظوں کی تصویریں آنکھوں میں سماتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔ اُن کی شاعری کو ہم پڑھتے بھی ہیں اور آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں جب یہ کہتے ہیں۔

پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں

سیدھے سادھے لفظوں میں وہ رنگینی چھا جاتی ہے کہ جو دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ جاں نثار اختر نے ہندوستانی عورت کو ایک نیا روپ، ایک نیا رنگ، ایک نئی ادائے دلبری اور رومان پروری عطا کی ہے مگر یہ عورت گھر آنگن میں بسنے والی ہے یہ گلستان کی تتلی ہے نہ بال روم کی پری۔ عورت کی انھوں نے نئی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ گھر گرہستی والی بیوی کو محبوبہ، دلربا، دلنواز، ہمدم، غمگسار اور دھڑکتے دل والی حساس عورت کے روپ میں رکھ کر اس میں نئی روح پھونکی ہے جو شاعری کی روایتی معشوقہ نہیں بلکہ عاشق بھی ہے گو عاشق کا لفظ استعمال نہیں ہوتا مگر ان کی شاعری کے مرقع میں اس کا کردار عاشق کا ہے۔ جاں نثار اختر نے شاعری میں ایک اچھوتا تفکر ایک جدید رنگین اور دلچسپ رومان بھرا ہے جو اُن کے مجموعہ کلام "گھر آنگن" میں ایک نئے انداز میں ملتا ہے۔ گھر آنگن، چولہا چکی، دال روٹی، سیون بروون، تیلے دانی، بوغ بن، گھر گرہستی کے لوازمات ہیں۔ جو ہر گھریلو عورت اپنے مقسوم میں لکھا لاتی ہے۔ فکرِ معیشت غمِ روزگار، غمِ دوراں دماغی کیفیات ہیں جن سے کسی مرد کو چھٹکارا نہیں۔ دنیا کی گاڑی انہیں دو پہیوں کے سہارے چلتی ہے اور دنیا کے کاروبار کا یہی ڈھنگ ہے۔ جب زندگی اسی نہج پر چل رہی ہو تو پھر ادھر ادھر کی باتیں سوچنے کا موقع ہی کیا ہے اور جو موقع ملے بھی تو گھر سے باہر ہی جب شادی ہوئی کہ بیوی ساس سسر نند نندوئی اور دیگر سسرالی رشتہ داروں کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور شوہر کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ چاہے منہ دیکھے کہ نہ دیکھے، بال بچے آل اولاد اور خاندان کی تربیت، تدوین، تزئین اور سلسلہ داری شروع ہو جاتی ہے اور اگر محض حسن اتفاق سے کچھ عشق و عاشقی کی بنیادوں پر شادی ہوئی ہو تو اس کے متعلق حضرت اکبرالہ آبادی نے اس کی بشارت یوں دی ہے کہ

میں ایک طرف تو دو روحوں کی یکجائی کا احساس ہوتا ہے (خیال رہے کہ زیادہ زور روحوں کی یکجائی پر ہے جسموں کی نہیں) تو دوسری طرف اس میں خاندانی زندگی کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں۔

دو روحوں کی یہ جنم جنم کی یک جائی   لیتے ہوئے دو بدن یہ باہم انگڑائی
یُگ یُگ سے دلوں میں گونجتے پیار کے گیت   صدیوں سے یہ آنگنوں میں بجتی شہنائی

جب سوچتی ہوں کہ تم سے رشتہ کیا ہے   آنکھوں میں ہے اک غرور سا چھا جاتا
بنیاد ہے سنسار کے ہر ناتے کی   سوچو تو سہی میرا تمہارا ناتا

عورت کی شخصیت کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ ماں بن جاتی ہے اس میں رکھ رکھاؤ اور خود اعتمادی اس کے بعد آتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے "گھر آنگن" کی عورت ایک مشرقی عورت اور نسوانیت کا مکمل نمونہ ہے جو ماں بننے کی ذمہ داریوں کو اپنے لئے قید نہیں سمجھتی بلکہ اس کو اپنے لئے باعث فخر خیال کرتی ہے۔ ماں کی شکل میں ہی اس کا بھرپور روپ ہمارے سامنے آتا ہے۔ عورت کا یہ پہلو بھی جاں نثار کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔

بیٹھی ہے سہاگنی انہیں کی دھن میں   آنگن میں چہک رہا ہے ننھا بالک
سینہ میں سلگتی ہے برہ کی اگنی   نینوں میں مگر چھائی ہوئی ہے ٹھنڈک

اک روپ نیا آپ میں پاتی ہوں سکھی   اپنے کو میں بدلی نظر آتی ہوں سکھی
خود مجھ کو میرے ہاتھ حسیں لگتے ہیں   بچہ کا جو پالنا جھلاتی ہوں سکھی

من تھا بھی تو لگتا تھا پرایا ہے سکھی   تن کو تو سمجھتی تھی کہ چھایا ہے سکھی
اب ماں جو بنی ہوں تو ہوا ہے محسوس   میں نے کہیں آج خود کو پایا ہے سکھی

گھر آنگن کی رباعیاں صرف عورت کے جذبات اور اس کی اداؤں ہی کی اعکاس نہیں بلکہ ان میں اس کی نفسیات کو بھی بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کی فطری شرم و حیا نہ صرف اس کو اظہارِ جذبات اور پیار میں پہل کرنے سے روکتی ہے بلکہ اس کا اقرار بھی انکار کے پردے میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ دل میں خواہ کتنا بھی خوش ہو مگر بظاہر اظہارِ محبت پر ناراضگی کا اظہار کرے گی۔ اس نفسیاتی نکتہ کو ان رباعیوں میں بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔

رہتا ہے عجب حال میرا اُن کے ساتھ   لڑتے ہوئے اپنے سے گزر جاتی ہے رات
کہتی ہوں کہ اتنا نہ ستاؤ مجھ کو   ڈرتی ہوں کہیں مان نہ جائیں میری بات

دنیا کی انہیں لاج نہ غیرت ہے سکھی   اُن کا ہے مذاق میری آفت ہے سکھی
چھیڑیں گے مجھے جان کے سب کے آگے   سچ ان کی بہت بُری یہ عادت ہے سکھی

مختصر یہ کہ عورت کا جو روپ "گھر آنگن" میں پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف اردو شاعری کے لئے بالکل نیا ہے بلکہ یہ حقیقت اور جمالیت، رومان اور پاکیزگی کا ایک دلکش مرقع ہے۔ اس تصویر کے سارے رنگ خالص ہندوستانی ہیں اور یہاں کے روایات اور تصورات اس کے خدوخال میں پوری طرح ابھرتے دکھائی دیتے۔ ★

(اے میرے محبوب تیرے گریبان میں زعفران کا رنگ نہیں ہے بلکہ ہمارے چہرے کی زردی تیری گریبان گیر ہے)
ہندی کے دوہوں میں کبھی کہیں کہیں ایسا رنگ ملتا ہے ۔

پیاری ہمری نیند کی بات تمہارے ہاتھ
آدت تھی تم ساتھ ہی گئی تمہارے ساتھ
پریتم ہم تم ایک ہیں کہن سُنن کو دوئے
من سے من کو تول لو دو من کبھو نہ ہوئیے

ایسے کچھ استثنا کے سوا ہماری شاعری میں زیادہ تر معشوق کی تصویر ہیجان انگیز طریق پر کھینچی جاتی رہی ہے اور ایسے لگتا ہے کہ کوک شاستر پڑھ رہے ہیں ۔

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

دی شب وصل مؤذن نے اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

نمودِ حسن دونی ہو گئی ہے خود نمائی سے
اُبھر آیا ہے جوبن اور جب وہ تن کے بیٹھے ہیں

اُڑا لے جاتے ہیں عاشق کے دل کو سینہ زوری سے
غضب کے دو اُچکے بھیس میں جوبن کے بیٹھے ہیں

جاں نثار اختر نے پہلی بار ہدایت نامہ بیوی خاوند جیسی لاجواب چیز پیش کی ہے جس کا نام ہے "گھر آنگن" اُن کا یہ نیا تجربہ، اچھوتا مضمون اور دل چسپ اندازِ بیان اردو شاعری اور تفکر کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کے اتباع اور پیروی کی سخت ضرورت ہے تاکہ اردو ادب اس نئے مضمون سے مالا مال ہو جائے اور شادی شدہ حضرات کو بے کیف زندگی میں کیف نصیب ہو ۔

جاں نثار اختر نے جس گھر والی کو پیش کیا ہے وہ صرف محبوبہ نہیں بلکہ

تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے
لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں

شوہر کی خدمت کا دلولہ ملاحظہ فرمائیے ۔

سوتے سے اُٹھی کہ گرم کھانا کر دے
لو کا جو لگا جھلس گئی سب کایا

گھر کے کام کاج کی مصروفیت کا نقشہ کتنا دلچسپ ہے ۔

عاشقی قیدِ شریعت میں جو آجاتی ہے
جلوہ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

دنیا بھر کی تمام زبانوں میں اور رومان شادی کے بندھنوں یا ان بندشوں سے پہلے پروان چڑھتے رہے ہیں بالخصوص اردو میں ہجر و فرقت، جدائی و مجبوری، طرفین کی عائد کردہ پابندیاں، رقیب کی خلل اندازیاں یہی تو حاصل کلام ہوا کرتا ہے۔ مغربی ماحول میں البتہ کورٹ شپ کا زمانہ بڑا رنگین ہوتا ہے وہاں پر پابندیاں شادی جاتی ہیں صرف انتظار اور شادی کے سوا باقی راستے صاف رہتے ہیں اسی لئے تو مستشرقیوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہنا شروع کیا ہے کہ بھئی مغرب میں پہلے عشق و محبت پھر شادی اور ہمارے ہاں اس کے برعکس پہلے شادی پھر پریم کے پینگ مگر بتایئے نا، کہاں ہے وہ رنگین زمانہ اور وہ پُر کیف دن اور رات، حضرت عشق کی کارفرمائی گھر میں تو کہیں نظر نہیں آتی۔ اسی لئے ہماری شاعری میں رومان متاہلانہ زندگی کے باہر باہر ہی چکر کاٹتا ہے۔ کہیں تاک جھانک کہیں کسی کو دیکھ کر آہ بھر لی کبھی کسی کو بالواسطہ پیام بر کے ذریعے پریم پتر بھیج دیا۔ وہ بھی ڈرتے ڈرتے کہ اگر کسی کو رازداں بنالیا تو پھر ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

شاعری میں میاں بیوی کے تعلقات کا کہیں کچھ ذکر ملتا ہے تو جعفر زٹلی کی ہجو میں ؎

کھائے بہت اور کچھ نہ کرے
سارے گھر سے لڑتی پھرے
کام کرے تو ایسا کرے
چولہے کی ہانڈی کھڈی دھرے

البتہ اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر نے سلمٰی سے ہٹ کر لکھا تو "پردیسی پی کی یاد" ایک ہجراں نصیب بیوی کی زبانی یوں لکھا ہے ؎

مگر اب اُن کے جاتے ہی قیامت ہوگئی برپا
جس آفت کا تھا اندیشہ وہ آفت ہوگئی برپا

اختر شیرانی نے ہی "پہلا خط" ایک بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے نام اس طرح لکھا:-

احوالِ دل لکھوں خلشِ مدعا لکھوں
رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر کیا لکھوں

گھر آنگن کی شاعری کا انداز فارسی میں مغل شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نورجہاں کے مکالموں میں ملتا ہے۔

جہانگیر: تُرا کہ تکمۂ لعل است در قبائے حریر
شدہ است قطرہ خون منت گریبان گیر

(تیری حریر کی قبا میں لعل کا تکمہ لگا ہوا ہے دراصل میرے خون کا قطرہ تیرے گریبان میں لگا ہے)

نورجہاں: نیست جانان در گریبانِ تو رنگ زعفران
زردیٔ رنگ، رخ ماشد گریباں گیر تو

ہر رات تو سپنوں میں نظر آئے گی
اور اس کا بڑے ناز سے اتنا کہنا
کیا میرے بنا نیند بھی آجائے گی

چھیڑ چھاڑ ملاحظ فرمائیے۔ زبان کی شیرینی اور لوچ نے عورت کے لب ولہجہ کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ اگر ہمیں شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو بالکل ایسا لگے کہ یہ عورت کی کہانی خود اس کی زبانی ہے۔

وہ جان کے بھی مجھ کو ستاتے ہیں کبھی
نکلوں جو نہا کے تو ڈراتے ہیں کبھی
آئینہ کے آگے نہ بدلنا کپڑے
آئینے میں عکس رہ بھی جاتے ہیں کبھی

ایک صحت مند تومند جذبات سے بھرپور عورت کو ایک نہ ایک دن باوجود خاندانی منصوبہ بندی کے اس بات کا بھی سابقہ پڑتا ہے۔

اِک روپ نیا آپ میں پاتی ہوں سکھی
اپنے کو میں بدلی نظر آتی ہوں سکھی
خود مجھ کو مرے ہاتھ حسیں لگتے ہیں
بچّے کا جو پالنا ہلاتی ہوں سکھی

ریختی گوئی کیا ختم ہوئی کہ عورت کی زبان میں اس کے جذبات کے اظہار کا طریقہ بھی یک لخت ختم ہو گیا۔ اب تو خاتون شعراء بھی مردانہ وار صیغۂ تذکیر ہی میں سب کچھ کہتی ہیں۔

جاں نثار اختر نے اس اسلوب کو بڑی عمدگی سے ایک نئے روپ میں نبھایا ہے اور گھریلو عورت کو ایک نیا نکھار نیا جذبۂ وارفتگی عطا کیا ہے۔

ہر رسم و روایت کو کچل سکتی ہوں
جس رنگ میں ڈھالیں مجھے ڈھل سکتی ہوں
اُکتانے نہ دوں گی اُن کو اپنے سے کبھی
اُن کے لئے سو روپ بدل سکتی ہوں

جاں نثار اختر کی گھروالی ناز و انداز، حیا، شوخی اور بے باکی سے بھی بیگانہ نہیں۔

رہتا ہے عجب حال مرا اُن کے سات
لڑتے ہوئے اپنے سے گزر جاتی ہے رات
کہتی ہوں کہ اتنا نہ ستاؤ مجھ کو
ڈرتی ہوں کہیں مان نہ جائیں مری بات

بات مان جانے کا ڈر بھی کس قدر دلچسپ ہے۔ خدا کرے کہ یہ رنگ اور یہ اسلوب جلد از جلد مقبول اور ہر دلعزیز ہو اور اس کا اتباع تمام مفکر اور شاعر شروع کر دیں تاکہ متاہلانہ زندگی میں پھر سے جان پڑ جائے۔

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کا مشین
قطروں سے پسینے کے شرابور جبین
پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی تو ہاتھ
آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

اب اس کو کفایت کہو یا اس کا شعور
عورت کا تو یہ گن ہے سدا سے مشہور
ہر طرح کی تنگی بھی اٹھا لے گی مگر
چپ چاپ سے کچھ بچا کے رکھے گی ضرور

چولہے پہ پکاتے ہوئے روٹی اک بار
جھپکا جو لگا تو پڑ گئے ہیں چھالے
پھر بھی انہیں ہاتھوں سے وہ کپڑے دھوئے
اور خود ہی نچوڑ الگنی پر ڈالے

محبوبہ یا معشوقہ دلربا، دل آرا کیسے بن جاتی ہے روئداد شروع کی ہے سہاگ رات سے۔

وہ پہلے پہل تجھ کو منانے کا سرور
گھونگھٹ میں وہ مکھڑے کا جھمکتا ہوا نور
شرما کے وہ باہوں میں سمٹنا تیرا
آنکھوں میں کنوارپن کا وہ میٹھا سا غرور

گھر بار کی ساری تصویریں ان قطعات میں ابھرتی ہیں روزمرہ کے دکھ سکھ، کاروبار سے باہر آنا جانا، انتظار، حسن گفتار، تنگ دستی کا عذاب، فراغت کی گھڑیوں کا انتظار، سجاؤ، سلیقہ، دلاسہ سب کچھ ہے لیکن اس روزمرہ کی الجھن میں پیار نہ تو مرتا ہے نہ تو کھو جاتا ہے۔

اب تک وہی بچنے کی سمٹنے کی ادا
ہر رات مناتا ہے میرا پیار تجھے
سمجھا تھا تجھے جیت چکا ہوں لیکن
لگتا ہے کہ جیتا ہے ہر بار تجھے

جاتے ہوئے وہ پیار سے کہنا میرا

رباعیاں

یہاں پر بیوی ناصح یا محتسب نہیں ہے بلکہ ۔

کل تم تو چلی جاؤ گی پھر کون بھلا
اس طرح رکھے گا مرے پینے کا حساب
ہاتھوں سے مرے چھین کے بوتل ہر رات
اپنے ہاتھوں سے کون ڈالے گا شراب

جاں نثار اختر لائق تحسین و توصیف ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی دماغ کو ایک نئی فکر عطا کی اور ہندوستانی عورت کو ایک نیا رتبہ اور مقام ۔ "گھر آنگن" پر انہیں مدھیہ پردیش شاسن ساہتیہ پریشد نے ۱۹۷۲ء میں انعام دیا اور "خاک دل" کو ۱۹۷۴ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا ۔ ان کے خود کے کلام کے علاوہ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ "ہندوستان ہمارا" کے نام سے حب الوطنی سے بھرے کلام کو ایک جا کیا جو ہندوستانی تہذیب، ثقافت، فنونِ لطیفہ اور وہ سب کچھ ایک جا ہے کہ جو ہندوستانی ہے اور ہندوستان ہے ۔ اُن کے فن اور شخصیت کو جتنا سراہا جائے وہ کم ہے ۔ *

"سمجھ میں نہیں آتا کون سی رباعی پیش کی جائے اور کون سی چھوڑ دی جائے، شاید ہی کوئی رباعی ایسی ہوگی، جو دامن پکڑ کر نہیں کھڑی ہو جاتی، اور کہتی ہے کہ پہلے مجھ سے آنکھیں ملا لو پھر چلے جانا ۔"

ظفر ادیب

تو دیش کے مہکے ہوئے آنچل میں پلی
ہر سوچ ہے خوشبوؤں کے سانچے میں ڈھلی
ہاتھوں کو یہ جوڑنے کا دل کش انداز
ڈالی پہ کنول کی جس طرح بند کلی

○

یہ سولہ سنگھار اور یہ بارہ ابھرن
ہر طرح سجی ہے پھر بھی بھرتا نہیں من
جب تک نہ پیا آن کے انکھیاں موندیں
رکھنے کی نہیں آج تو گوری درپن

○

سینے پہ پڑا ہوا یہ دُہرا آنچل
آنکھوں میں یہ لاج کا جھلکتا کاجل
تہذیب کی تصویر، حیا کی دیوی
پر سیج پہ کتنی شوخ، کتنی چنچل

○

کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اُٹھی ہے، مگر
ڈرتی ہے کہیں اُن کو نہ ہو جائے خبر
تھک کر ابھی سوئے ہیں، کہیں جاگ نہ جائیں
دھیرے سے اُڑھا رہی ہے ان کو چادر

○

نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ (یوپی) نے اور مدھیہ پردیش شاسن ساہتیہ پریشد (بھوپال) نے گھر آنگن کو اردو شاعری کی اہم تصنیف قرار دے کے ۷۲ء کے ایوارڈس سے نوازا۔ یہ کتاب مہاتما گاندھی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے بیک وقت اردو اور ہندی رسم خط میں عنقریب شائع ہونے جا رہی ہے۔

مدیر

نظروں سے مری خود کو بچا لے کیسے!
کھلتے ہوئے سینے کو چھپا لے کیسے!
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی تو ہاتھ
آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے!

○

ہر ایک گھڑی شاق گزرتی ہو گی
سو طرح کے وہم کر کے مرتی ہو گی
گھر جانے کی جلدی تو نہیں مجھ کو، مگر
وہ چائے پہ انتظار کرتی ہو گی

○

اک بار گلے سے ان کے لگ کر رو لے
جانے کو کھڑے ہیں' ان سے کیا بولے
جذبات سے گھٹ کے رہ گئی ہے آواز
کس طرح سے آنسوؤں کے پھندے کھولے

○

پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے
لپٹی ہوئی ہاتھ کی ڈھلی ساری میں

کہتی ہے کہ اتنا نہ کرو تم اصرار
گر جاؤں گی خود اپنی نظر سے اک بار
ایسی ہی تمھیں ضد ہے تو اس پیالے میں
میرے لئے صرف چھوڑ دینا اک پیار

○

ہر صبح کو غنچے میں بدل جاتی ہے
ہر شام کو شمع بن کے جل جاتی ہے
اور، رات کو جب بند ہوں کمرے کے کواڑ
چھٹکی ہوئی چاندنی میں ڈھل جاتی ہے

○

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین
قطروں سے پسینے کے شرابور جبین
مصروف کسی کام میں دیکھوں جو تجھے
تو، اور بھی مجھ کو نظر آتی ہے حسین

○

آہٹ مرے قدموں کی جو سن پائی ہے
اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سُدھ بسرا کے
روٹی جلتی توے پہ چھوڑ آئی ہے

یہ راز سمجھ میں نہیں آیا اب تک
ہر چند میں اپنا جائزہ لیتا ہوں
جو راز چھپاتا ہوں میں خود اپنے سے
وہ بات میں تجھ سے کیسے کہہ دیتا ہوں

○

اب تک وہی بچنے کی سمٹنے کی ادا
ہر رات مناتا ہے مرا پیار تجھے
سمجھا تھا تجھے جیت چکا ہوں لیکن
لگتا ہے کہ جیتنا ہے ہر بار تجھے

○

کہتی ہے تمہاری مدھ بھری آنکھوں کی
مستی ہی تو مدہوش بناتی ہے مجھے
جس دن نہ پیوں عجب سا لگتا ہے مجھے
کھلتے ہوئے تم سے شرم آتی ہے مجھے

○

وہ کون سے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے
چندری تو کبھی کی ہو چکی ہے چوری
ساجن سے کھڑی پوچھ رہی ہے کب سے
سینے کو ہتھیلیوں کو ڈھانپے گوری

یہ تیرا سبھاؤ، یہ سلیقہ، یہ سروپ
لہجے کی یہ چھاؤں، گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی، شکنتلا بھی، رادھا بھی، تو ہی
یگ یگ سے بدلتی چلی آئی ہے تو روپ

○

تیرے لئے بے تاب ہیں ارماں کیسے
در آمرے سینے میں کسی دن ایسے
بھگوان کرشن کی سجی مورتا میں
چپ چاپ سما گئی تھی میرا جیسے

○

بس اپنے ہی گھر کا سکھ تو کچھ بھی نہ ہوا
ہر گھر کو ملے گی گھر کی راحت کس دن
کس روز ہر اک صحن میں مہکیں گے گلاب
آنگن آنگن بسے گی جنت کس دن

○

آنگن میں کھلے گلاب پر جا بیٹھی
ہلکی سی اڑی تھی اُن کے قدموں سے جو دھول
گوری تھی کہ بالوں میں سجانے کے لئے
چپ چاپ سے جا کے توڑ لائی وہی پھول

آنکھوں میں لئے موہنی صورت تیری
پلکوں پہ لئے تیری مہکتی چھایا
جب رات گئے کبھی میں گھر لوٹا ہوں
اپنے بستر پہ تجھ کو سوتا پایا

○

چُپ رہ کے ہر اک گھر کی پریشانی کو
کس طرح نہ جانے تو اٹھا لیتی ہے
پھر آئے گئے سے مسکرا کر ملنا
تو کیسے ہر اک درد چھپا لیتی ہے

اُن کی زبانی

جذبوں کی گرہ کھول رہی ہو جیسے
الفاظ میں رس گھول رہی ہو جیسے
اب شعر جو لکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے
تم پاس کھڑی بول رہی ہو جیسے

○

مت کہہ انھیں روپ سے رچایا ہے سکھی
یو دن تو گزرتی ہوئی چھایا ہے سکھی
سچ میں نے بہت تپسیائیں کی ہیں
تب میں نے کہیں اُن کو موہ پایا ہے سکھی

دروازے کی کھولنے اٹھی ہے زنجیر
لوٹا ہوں کہیں سے جب بھی پی کر کسی رات
ہر بار اندھیرے میں لگا ہے ایسا
جیسے کوئی شمع چل رہی ہے میرے ساتھ

○

کہتی ہے کہ وحشت کی بھی حد ہوتی ہے
کپڑوں کا بھی ہوش تم بھلا دیتے ہو
جب دیکھو گریبان کھلا رہتا ہے
کیا جانے بٹن کہاں گرا دیتے ہو

○

غازہ ہے نہ سرخی ہے، نہ کاجل کی لکیر
یہ سادگی اور اس پہ یہ عالم، یہ بہار
اس روز نہ جانے کیا قیامت ٹوٹے
جس روز اتر آؤ گی کرنے پہ سنگھار

○

کیوں ہاتھ جلا، لاکھ چھپائے گوری
سکھیوں نے تو کھول کر ہتھیلی رکھ دی
ساجن نے جو پلّو ترا کھینچا، تو نے
جلتے ہوئے دیپک پہ ہتھیلی رکھ دی

ہونٹوں پہ ہنسی، نہ مکھ پہ سونے کی دمک
کیا جانے کہاں کھو گئی آنچل کی دھنک
آنگن میں چنبیلی تو کھلی ہے لیکن
ساتھ ان کے چلی گئی چنبیلی کی مہک

○

شام اور بھی دل نشین ہو جاتی ہے
پھولوں کی طرح زمین ہو جاتی ہے
چلتی ہوں جو ساتھ ساتھ ان کے تو سکھی
خود چال مری حسین ہو جاتی ہے

○

رہتا ہے عجب حال مرا اُن کے ساتھ
لڑتے ہوئے اپنے سے گزر جاتی ہے رات
کہتی ہوں کہ اتنا نہ ستاؤ مجھ کو
ڈرتی ہوں کہیں مان نہ جائیں مری بات

○

وہ جان کے بھی مجھکو ستاتے ہیں کبھی
نکلوں جو نہا کے تو ڈراتے ہیں کبھی
آئینے کے آگے نہ بدلنا کپڑے
آئینے میں عکس رہ بھی جاتے ہیں کبھی

ہر رسم و روایت کو کچل سکتی ہوں
جس رنگ میں ڈھالیں مجھے ڈھل سکتی ہوں
اُکتانے نہ دوں گی ان کو اپنے سے کبھی
اُن کے لئے سو رُوپ بدل سکتی ہوں

○

ڈالی کی طرح چال لچک اُٹھتی ہے
خوشبو سے ہر اک سانس چھلک اُٹھتی ہے
جوڑے میں جو وہ پھول لگا دیتے ہیں
اندر سے مری روح مہک اُٹھتی ہے

○

آنچل ہی نہیں جسم بھی لہرایا ہے
آنکھوں میں قیامت کا نشہ چھایا ہے
وہ دُور ہیں، پھر سکھی، یہ قصّہ کیا ہے؟
"کل شام وہ آرہے ہیں، خط آیا ہے"

○

لہراؤں گی مہکا ہوا آنچل بن کے
شانے پہ اُڑے گی زُلف بادل بن کے
ساجن مرے جس گھڑی براجیں گے سکھی!
آنگن میں چھنک اُٹھوں گی پائل بن کے

کہتے ہیں کہ تو غم کو بھی دیدیتی ہے رُوپ
گھر تک نہیں محدود ترا رُوپ انوپ
جیون کی سلگتی ہوئی راہوں میں بھی تو
جب ساتھ چلے تو نرم پڑ جاتی ہے دھوپ

○

کہتے ہیں کہ من بھی موہنی بھی تو ہے
دھڑکے ہوئے دل کی راگنی بھی تو ہے
تیری ہی تو دین ہیں یہ سرز د نغمے
لگتا ہے مری سرسوتی بھی تو ہے

○

ہر ایک مصیبت سے بچانے کو تمہیں
ہر طرح کی بات خود پہ لے سکتی ہوں
کہتی ہے کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے
میں ماں کا بھی پیار تم کو دے سکتی ہوں

○

جب تم نہیں ہوتے تو جوانی میری
سوتے کی طرح سوکھ کے رہ جاتی ہے
تم آن کے باہوں میں جو لے لیتے ہو
یوُن کی ندی پھر سے اُبل آتی ہے

وہ ضد پہ اُتر آتے ہیں اکثر اوقات
ہر چیز پہ وہ بحث کریں گے مرے ساتھ
ہرگز وہ نہ مانیں گے جو میں چاہوں گی
لیکن جو نہیں چاہوں گی، کریں گے وہی بات

○

من تھا کبھی تو لگتا تھا پرایا ہے سکھی
تن کو تو سمجھتی تھی کہ چھپایا ہے سکھی
اب ماں جو بنی ہوں تو ہوا ہے محسوس
میں نے کہیں آج خود کو پایا ہے سکھی

○

اک رُوپ نیا آپ میں پاتی ہوں سکھی
اپنے کو میں بدلتی نظر آتی ہوں سکھی
خود مجھ کو مرے ہاتھ حسیں لگتے ہیں
بچّے کا جو پالنا ہلاتی ہوں سکھی

○

میں اُن کا سکھی ہاتھ بٹا سکتی ہوں
حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اُٹھائیں گے اکیلے کب تک
میں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

وہ شام کو گھر لوٹ کے آئیں گے تو پھر
چاہیں گے کہ سب بھول کے ان میں کھو جاؤں
جب تک انھیں جاگنا ہے میں بھی جاگوں
جب نیند انھیں آئے تو میں بھی سو جاؤں

○

وہ دور سفر پہ جب بھی جائیں گے سکھی
ساڑی کوئی قیمتی سی لے آئیں گے
چاہوں گی اسے سینت کے رکھ لوں لیکن
پہنوں نہ اُسی دن تو بگڑ جائیں گے

○

دو چار دنوں کی کہہ گئے تھے، تم تو
کیا بات ہے، کیوں دیر لگا دی اتنی
بازو پہ تمہارے قرض ہیں، یاد رہے
ساجن! مری اُچٹی ہوئی نیندیں کتنی

○

پڑھتی ہوں جو خط کو کڑھ کے رہ جاتی ہوں
آتا ہے انھیں مجھ کو ستانے میں مزا
یہ تک نہیں لکھیں گے کہ وہ کیسے ہیں
کچھ ہوگا نہ بس پیار کی باتوں کے سوا

وہ بڑھ کے جو باہنوں میں اُٹھا لیتے ہیں
ہو جاتا ہے معلوم نہیں کیا مجھ کو
ایسے میں نہ جانے کیوں سکھی، لگتا ہے
خود میرا بدن پھول ہے ہلکا مجھ کو

○

میں چاہے جہاں بھی جاؤں اُن کی نظریں
اس طرح سے گرد گھومتی ہیں میرے
لگتا ہے کہ جیسے کوئی لکھشمن ریکھا
چلتی ہے ہر اک قدم پہ مجھکو گھیرے

○

میں وہ ہی کروں، جو وہ کہیں، وہ چاہیں
مجھ کو بھی تو اس بات میں چین آتا ہے
منوا بھی لوں اُن سے اپنی مرضی جو کبھی
ہفتوں کو مرا سکون مر جاتا ہے

○

ناراض اگر ہو تو بگڑ لو مجھ پر
تم چپ ہو تو چین کیسے آ سکتا ہے
کہتا ہے یہ احساس نہ چھینو مجھ سے
مجھ پر بھی کوئی زور چلا سکتا ہے

اودے اودے پہن رکھے ہیں کپڑے
دیوانی یہ کیا رنگ تجھے بھاتا ہے
"جب ان کو پسند ہے سکھی تو مجھ کو،
اس رنگ میں ہر رنگ نظر آتا ہے"

○

اک پل کو نگاہوں سے تو اوجھل ہو جاؤں
اتنی بھی کہاں سکھی اجازت ہے مجھے
آواز پہ آواز دیئے جائیں گے
ساڑی کا بدلنا بھی مصیبت ہے مجھے

○

باہر وہ جہاں بھی کام کرتے ہوں گے
رہتے ہی نو ہوں گے وہ جھکائے ہوئے سر
گھر میں بھی نہ سر اٹھا سکیں گے تو سکھی
رہ جائے گا اُن کا دم نہ سچ مچ گھٹ کر

○

جاڑوں کی یہ چاندنی، یہ اُجلا آنگن
آنگن میں یہ سیوتی کے ہنستے ہوئے پھول
وہ دور رہیں سکھی! تو یوں لگتا ہے
یہ رات مرے حسین سپنوں کی ہے دھول

جب جاتے ہو کچھ بھول کے آ جاتے ہو
اس بار مری شال ہی کر آئے گم
کہتی ہے کہ تم سے تو یہ ڈر لگتا ہے
اک روز کہیں خود کو نہ کھو آؤ تم

○

خود ہل کے وہ کیا مجال پانی پی لیں
ہر رات بندھا ہوا ہے یہ ہی دستور
سرہانے بھی چاہے بھر کے چھاگل رکھ دوں
سوتے سے مگر مجھے جگائیں گے ضرور

○

آتی ہے جھجک سی ان سے آگے جاتے
وہ دیکھتے ہیں کبھی کبھی تو ایسے
گھبرا کے میں باہوں میں سمٹ جاتی ہوں
لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں پہنے جیسے

○

یہ عطر سہاگ کا یہ اُبٹن کی مہک
تو کیوں نہ سگندھوں کی دلہن کہلائے
پر مجھ کو مری سکھی بدن سے اپنے
آئے تو فقط انھیں کی خوشبو آئے

جائزے

○

دیکھیں گے اور جی میں کڑھ کے رہ جائیں گے
لہرائیں اُن کے دل میں کتنے آنسو
آنچل کی بھری کھونپ چھپانے کے لئے
ساڑی کا اُڑستی ہے کمر میں پلّو

○

اچھی ہے کبھی کبھی کی دوری بھی سکھی
اس طرح محبت میں تڑپ آتی ہے
کچھ اور بھی وہ چاہنے لگتے ہیں مجھے
کچھ اور بھی میری پیاس بڑھ جاتی ہے

○

وہ تاج ہو یا نشاط یا وندرابن
ایک لمحے کو جم جائے تو جم جائے نظر
پھر بھی مرا احساس یہی رہتا ہے
دنیا میں ہے سب سے خوبصورت مرا گھر

○

ہر بار تپسیا سے جیتا ہے انھیں
وہی میرے سوامی ہیں وہی میرے پتی
اُن سے ہے مرا جنم جنم کا ناتا
اوما ہوں کبھی میں۔ تو کبھی پاروتی

بلراج ورما

ایک جوگی

عزیزی صابر دت!

جدید اردو ادب کے ممتاز ادبا اور شعرا کے کام و کلام کو ہر خاص و عام تک پہونچانے کا جو نرالا قدم تم نے اٹھایا ہے ہر لحاظ سے قابل ستائش اور ادب پسندوں اور ادیب پرستوں کی توجہ کا مستحق ہے۔ اردو کے نثری ادب کے ایک منفرد ادیب کو جس نیک دلی اور شان و جمال سے تم نے ادب کے سچے پارکھیوں کا سلام پہنچایا وہ دنیائے ادب میں ایک قطعی انوکھا تجربہ تھا۔ یہ مناسب ہی تھا کہ مہندر ناتھ کے بعد اپنے نئے شمارے کے لئے تم ایک ایسے شاعر کو چنتے جو مہندر ناتھ کی طرح ایک بلند مرتبہ انسان بھی ہے اور ایک ایسا شاعر بھی جس نے اپنا سارا سرمایۂ فن آدمی کی خوشی، ترقی اور بہبودی کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

میں نے جاں نثار اختر کو پڑھا اور سنا تو بہت ہے مگر انہیں قریب سے دیکھنے کے زندگی میں صرف دو ہی موقع آئے ہیں جن میں سے ایک تو تم نے ہی میرے لئے فراہم کیا تھا۔

مجھے وہ دوپہر کبھی نہ بھولے گی جب تم اور فکر تونسوی اختر بھائی کو ایشیا ہاؤس مجھ سے ملوانے لائے تھے۔ میں اُن دنوں خاصا بیمار تھا، مگر اپنے محبوب شاعر اور دو اچھے دوستوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میری بیماری آدھی رہ گئی تھی۔

امرتا میری بڑی بیٹی جو ایک مقامی کالج کی طالبہ ہے اردو نہیں جانتی، مگر گھر آنگن کی جو دلکش و دلفریب رباعیاں اُس روز اختر بھائی نے ہمیں اپنے مخصوص و منفرد انداز میں سنائی تھیں وہ بچی کے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں۔ اُس کے اصرار پر میں نے "گھر آنگن" سے چُن چُن کر وہ اشعار اُسے ہندی میں لکھوا دیئے تھے۔ آج کل وہ بڑے چاؤ سے یہ اشعار اپنی سہیلیوں کو سنایا کرتی ہے۔

"گھر آنگن" کی رباعیوں کو فراق گورکھپوری نے سورداس کے پدوں کا ہم پلہ مانا ہے اب اس سے زیادہ اُن کے بارے میں کوئی کیا کہے۔

اُن سے دوسری ملاقات جن پتھ ہوٹل کے اس کمرہ میں ہوئی تھی جہاں حال ہی میں روس جانے سے ایک روز پہلے وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بہت سے اور لوگ بھی انہیں ملنے اور مبارک باد کہنے اس شام وہاں آئے تھے، جن میں سے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر فاروقی مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ یہ دوسری ملاقات کوئی ملاقات نہ تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے باہر کے لوگ دلّی سے گزرتے ہوئے کسی مقامی لیڈر پر 'کال آن' کرنے آتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ کسی ادیب یا شاعر پر تب تک مُستند و مناسب قسم کا مضمون نہیں لکھا جا سکتا جب تک کہ مضمون نگار، شاعر موصوف کو شخصی طور پر نہ جانتا ہو۔ اُس کے حالاتِ زندگی اور اس کے ذہنی ارتقا کے ان تاریخی پہلوؤں سے واقف نہ ہو جن سے اس کے فن اور شخصیت کی نشو و نما ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دو سرسری اور مختصر ملاقاتوں میں کسی بڑے دانشور کو اس نظریہ سے جان لینا بلکہ

جاں نثار اختر کی غزل کا تفصیلی
جائزہ جو وارث علوی نے
لیا ہے اور سی ایل کاوش کا
طویل مقالے جو جاں نثار اختر کی
زندگی کے ایک اہم باب سے متعلق ہے ہم
جائزے میں الگ سے دے رہے ہیں
بلراج ورما کا ایک مختصر مضمون اور ربانی
کی ایک نظم بھی اس میں شامل ہے
مدیر

وغم وغصہ سے بلبلا رہا ہیں۔ اختر نے اپنے دور کی اِن اندوہناک کیفیات اور ان کے تئیں اپنے فرض کو سمجھا ہے اور کبیر اور نانک کی طرح اُن کی ترجمانی اور تصویر کشی کی ہے۔

زندگی کی بے پناہ وسعتوں اور حیاتِ انسانی کے بے پناہ مظاہر کو انہوں نے دوربین سے نہیں خوردبین سے دیکھا ہے۔ جانچا ہے پرکھا ہے اور جہاں کہیں اس دکھ اور درد کو دور کرنے کے سُجھاؤ کے طور پر اپنے کسی پسندیدہ و مخصوص نظریہ کی تبلیغ بھی کی ہے تو کسی چالو یا بندھے ٹکے انداز اور زاویوں سے نہیں بلکہ اپنے انفرادی رنگ ڈھنگ سے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہنگامی سے ہنگامی نثری اور منظوم تخلیقات جدید اور کلاسیکی اصولوں اور رواجوں کے عین مطابق بھی ہیں اور اپنے وقت اور سماج کی ترجمان اور فن اور اسلوب و معانی کی سچی علم بردار ہیں۔ یہ اشتہاری یا ہنگامی ادب نہیں ہے۔ زندہ رہنے والا ادب ہے۔

اختر ترقی پسند ادیب ہے جو آدمی ہی کو دورِ حاضر کا خدا مانتا ہے مگر اپنے ساتھی ترقی پسندوں کی طرح نعرے اور نقارے بجانے کی بجائے سُر تال میں ڈوب کر گاتا ہے، ایک جوگی بیراگی کی طرح۔

کسی بھی اچھے ادیب و شاعر کے لئے زبان اور گرامر کی پوری جانکاری کے علاوہ مشق، مطالعہ و مشاہدہ، عقل و فہم اور تندرست و توانا شعور سے لیس ہونا ضروری ہے۔ شعری ذہن بلاشبہ عطیۂ قدرت ہے مگر بغیر رت جگوں کے، بغیر محنت و مشقت کی بھٹی میں ایک عرصہ تک تپنے کے آج تک کوئی بڑا ادیب بنا ہے نہ شاعر۔

میں اختر کے تخلیقی موڈ سے آگاہ ہوں نہ میں نے کبھی ان کے شعری مسودے دیکھے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ انہیں اپنے فن کی عظمت کا پورا احساس ہے اور شعر کو شاعر سے بلند و بالا مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہر شعر صنّاعی اور سنگ تراشی چاہتا ہے۔ اور اپنی قطعی آخری تکمیل اور چمک، دمک تک پہنچنے سے پہلے مجنوں کی کھوج اور فرہاد کی کوہکنی مانگتا ہے۔ ایک ایک لفظ، ایک ایک مصرعہ تراشا خراشا جاتا ہے اہتمام و محبت کے ریشمی ہاتھوں سے سہلایا، سجایا اور سنوارا جاتا ہے تب کہیں جا کر وہ تیر نیم کش تیار ہوتا ہے جس کی خلش حساس ذہنوں میں تاحیات بنی رہتی ہے اور سننے والے ہر بار وجد و مستی میں جھوم جھوم جاتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے تصورات کا کینوس بڑا وسیع و عریض ہے۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور قومی اور بین الاقوامی مسائل کو ایک سی بیداری، چوکسی اور مستعدی سے دیکھتا پرکھتا ہے۔ انھوں نے محبوب، وطن بلکہ ساری انسانیت کو ایک سی شدت سے چاہا ہے اور تہذیب و تمدن کی تنظیم و تحفظ، امن و آزادی اور خوشحالی کے لئے ایفرو ایشیائی کشمکش، قومی یک جہتی، جمہوریت، سوشلزم اور آدمی اور اس کی شخصی آزادی کے ترانے گائے ہیں۔

ادب میں مقصدیت کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے اشعار کو کوری مادّی افادیت تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ دلوں کو وسعت، گہرائی، تازگی، شگفتگی اور راحت بہم پہنچانے کا آلہ بھی بنایا ہے۔ نرم و نازک نغموں کی لطیف مستی اور بے خودی سے زندگی کو سکون و تسکین بخشا ہے۔

اپنے دور کی تہذیبی اقدار سے بے پناہ ہمدردی کے باوجود اختر نے پرانی قدروں کی بے حرمتی کبھی نہیں کی بلکہ اپنے اجداد کی میراث مان کر انہیں ہمیشہ احترام و عقیدت سے سلام ہی کیا ہے

اپنے نجی دکھ درد کو اختر نے اپنے ہی چہرے کی جھریوں میں ڈھال لیا ہے۔ دوسروں کو غم بھی اپنایا ہے مگر اپنا دوسروں میں نہیں بانٹا۔ مصروفیاتِ حیات نے انہیں تھکایا ہے نہ ہار کر سو جانے کی ترغیب دی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وقت سونے کا نہیں جاگتے اور متواتر بیدار رہنے کا ہے۔

کچھ لوگ انہیں مرحوم اختر شیرانی کی طرح کا رومانی شاعر مانتے ہیں تو کچھ مخدوم کی طرح کا انقلابی شاعر۔ اختر کو ریلو وشنوئی

سمجھ لینا کہ جان لیا ہے لڑکپن اور حماقت ہے۔

اس قسم کے مضمون کو ترتیب دینے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صاحب مضمون کے پاس اس دانشور کی تخلیقات کے سارے نسخے موجود ہوں اور وہ ایک ایماندار طالب علم کی طرح پہلے ان کا باقاعدہ مطالعہ کرے۔ پھر غور سے سوچے اور پھر ذہن میں ایک واضح خاکہ، ترتیب و نقشہ بنا کر کام شروع کرے۔

ظاہر ہے کہ میرے پاس یہ سب نہیں ہے۔ نہ یادیں اور نہ جاں نثار اختر کا پورا کلام و کام۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ لکھوں گا لہٰذا لکھ رہا ہوں۔ یہ مضمون نہیں میرے اُن تاثرات کا مجموعہ ہے جو جاں نثار اختر کو پڑھ کر یا سُن کر میں اُن کے فن کے بارے میں محسوس کرتا رہا ہوں۔ میں نے اختر کے کلام کے بارے میں کبھی کسی نقاد سے بات نہیں کی کیونکہ میرا اُن کے بارے میں ایک نجی تصور ہے جس میں مانگے کے رنگ بھرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ میری عبادت ہے کہ میں جن چیزوں کو متبرک مانتا ہوں انہیں دل میں چھپا کر رکھتا ہوں۔ بحث و مباحثہ کا ٹارگٹ نہیں بننے دیتا۔ بے لاگ تنقید میرے عزیزہ ہے ہی کہاں؟

غزل، نظم، گیت اور رباعی جدید اردو شاعری کے تین بلکہ چار متوازی دھارے رہیں جن پر جاں نثار اختر نے یکسر اعتماد و یقین سے اپنا ہنر مند قلم اٹھایا ہے۔ الفاظ کا رکھ رکھاؤ، معانی و مناسبت، اندازِ بیان کا حسن، شوخی، بانکپن اور تناسب اور اسلوبِ خیال میں تعلق و توازن ہر دور میں شاعرانہ اظہار کے مقصود و معیار رہے ہیں۔ شاعری ان زریں عناصر کا کیمیائی مرکب ہے۔ جس کسی شاعر نے جب جب شعر کی ان جزئیات سے بغاوت یا انحراف کیا ہے شعر کی تاثیر کم ہوگئی ہے۔ خیال و اظہار میں ربط رہا ہے نہ وزن۔

الفاظ کے پیچ و خم سچی شاعری کی معراج ہیں نہ ہیئت کے نئے تجربات اور مواد کی سماجیت ہی۔ شاعری نہ لفظ پرستی ہے نہ خیال بندی، بلکہ ان سب اجزاء کا مرکب۔ خوبصورت شعر دل کی چیز ہوتا ہے اور لافانی شعر دل و دماغ اور روح کی مشترکہ گونج۔

جاں نثار اختر نے نہ زبان و بیان سے بے رخی برتی ہے نہ کبھی حیات و حقیقت یا سماجی بصیرت ہی کو خیرباد کہا ہے۔ ہمیشہ فن کے دائرے میں رہ کر دل کی بات کہی ہے، عقل و فہم کی بات کہی ہے۔ نجی اور اجتماعی دکھ درد کی بات کہی ہے۔ انھوں نے بے ہنگم اور بے مقصد ترانے کبھی نہیں چھیڑے۔ سینکڑوں غزلیں، نظمیں، گیت، رباعیاں اور نثری مضامین و عالمانہ مقالے لکھے ہیں۔ درجنوں فلمی گیت بھی لکھے ہیں۔ وہ اور کچھ نہ لکھ کر محض "گھر آنگن" ہی لکھ کر چھوڑ دیتے تو بھی بڑا احسان ہوتا ان کا دنیائے ادب پر۔

"گھر آنگن" میں حسن ہے، عشق ہے، نغمگی اور رومانیت ہے۔ اور وہ سنجیدہ غور و فکر جو درد کے رشتوں کی مخلصانہ آئینہ داری کرتا ہے۔ شاعر نے اپنے جذبۂ اظہار کے لئے جن لطیف و نازک الفاظ و زبان کا انتخاب کیا ہے وہ قطعی انوکھی چیز ہے، ادب کے روایتی جھرمٹ سے قطعی الگ۔

ایسے نئے جاندار اور شگفتہ پیرائے زبان کا موجد کوئی جوگی ہی ہو سکتا ہے۔ جاں نثار اختر واقعی جوگی ہے (وہ دیکھنے میں بھی روایتی جوگی سے ہی ہیں) جوگی اور راگی حسن کا، عشق کا، درد کا، موسیقی کی کوئی دھن، مصور یا مجسمہ تراش کا کوئی شاہکار، بلکہ رنگ برنگے پھولوں کا مہکتا مسکراتا حسن بھی "گھر آنگن" کے مرد عورت کی باہمی کشش کا ہم پلہ نہیں۔

ٹیگور نے ایک بار کہا تھا کہ "ہر نئے بچے کی ہماری دنیا میں آمد اس حقیقت کی ضامن ہے کہ خدا اپنی مخلوق سے ابھی قطعی طور پر نراش و بیزار نہیں ہوا۔"

اختر نے ٹیگور سے بھی بڑی بات کہی ہے۔ اس نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بلند و عظیم مانتے ہوئے گھر آنگن کو کعبہ و مندر سے بھی پاک و متبرک قرار دیا ہے۔

ہمارے دور میں ہر چیز ٹوٹ رہی ہے۔ بدن ٹوٹ رہے ہیں، دل ٹوٹ رہے ہیں۔ ذہن بدظن ہو کر بکھر رہے ہیں۔ روحیں درد

وارث علوی

"جاں نثار اختر کی شاعری"

مجھے جاں نثار اختر کی ایک نظم بہت پسند ہے۔ عنوان ہے "اندیشہ" یہ ۱۹۵۹ء میں لکھی گئی ہے :-

مجھ کو اکثر ترے پہلو میں خیال آتا ہے
تو کہیں مجھ سے میرا ذوقِ سفر چھین نہ لے
تیری زلفوں کی یہ لہرائی ہوئی چھاؤں کہیں
میرے قدموں سے میری راہگزر چھین نہ لے
یہ تری نیم نظر کا متبسم جادو
مرے دل سے غمِ دوراں کا اثر چھین نہ لے
یہ تری نرم لپٹتی ہوئی باہوں کا گداز
میرے ہاتھوں سے کہیں تیغ و سپر چھین نہ لے
یہ سلیقے سے ڈھلکتا ہوا آنچل تیرا
میری پلکوں سے مرا خونِ جگر چھین نہ لے
ترا یہ لوچ، یہ نرمی، یہ لطافت، یہ جمال
صرف فن دے کے کہیں فکر و نظر چھین نہ لے

اور رومانس کے اُن قافلہ سالاروں کا ہمنوا مانتا ہوں جنہوں نے ترقی پسند نظریۂ حیات کی عظمت ہمیشہ بلند و بالا رکھی ہے۔ جاں نثار اختر کے ساتھ تحریک کے ان قافلہ سالاروں کی پہلی قطار میں فیض، قاسمی، مجاز ایسے کتنے ہی شعرا ہیں جنہوں نے زندگی کے غموں کا بوجھ اپنے مابین بانٹ کر آنے والی نسلوں کے راستے ہموار کر دئے ہیں۔

میں نے جاں نثار اختر کے فن کی مقصدیت پر جان بوجھ کر مفصل بحث نہیں کی۔ کیونکہ اس کے لئے اُن کے اشعار سے ٹکڑوں کو بطور حوالہ دُہرانا پڑتا اور مجبوراً مجھے ایک باقاعدہ مشقی بندش ترتیب دینا ہوتی جو ظاہر ہے کہ نظریاتی مقالہ کی صورت لے لیتی۔ وقت اور کاغذ کی گرانی کے اس دور میں یہ ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں میرے جیسے مضمون نگار کے لئے یہ کام تو اور بھی مشکل ہو جاتا کیونکہ میں جاں نثار اختر کا ناقد نہیں، عاشق ہوں۔ میں اُن کے شعری ادب سے حوالے چُننے لگوں تو بات چناؤ کی نہ رہ کر "کیا لوں اور کیا چھوڑوں" والی ہو جائے گی۔ +

تمہارا

بلراج ورما

جاں نثار صاحب میں زندگی سے مقابلے کی غیر معمولی توانائی میں نے پائی ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ کارزارِ حیات میں یہ ہمت ہارنے والوں میں نہیں ہیں بلکہ اس جنگ کو جیت کر سنگِ میل قائم کر چکے ہیں۔ اس نشان پر ہمیشہ جاں نثار اختر صاحب کا نام جگمگاتا رہے گا۔

پرنس نقی علی خاں ثاقب

قالینوں اور ایرانی بلیّوں کی شاعری بن جاتی ہے اپنی خوبصورت ترین شکل میں جیسا کہ فراق اور جاں نثار اختر کے یہاں ہوا ہے، یہ بہاری اور کشیدہ زاس کے EROTICISM کی آنچ پاکر معاملاتِ حسن و عشق کی دو آتشہ جمالیاتی تعبیر میں بدل جاتی ہے۔ لیکن اپنی بہترین شکل میں بھی یہ شاعری لطیف جذبات اور ننھی منی تصویروں کی شاعری ہوتی ہے۔ اس میں ان جذبات کا بیان ہوتا ہے جو شاعر زمانہ کی دست برد سے بچا لایا ہے۔ اپنی جذباتی شخصیت کو پاش پاش ہونے سے بچانے کی یہ کوشش بذاتِ خود اہم ہے اور اپنی قدر رکھتی ہے۔ لیکن شخصی ارتباط جب خارجی دنیا میں جاری پیکارِ حیات سے دامن کش ہو کر حاصل کیا جاتا ہے تو اپنی قدر کھو دیتا ہے۔ جاں نثار اختر کو نہ تو خواتین ناول نگاروں کا گھریلو پن پسند ہے نہ نفاست پسندوں کی حسن پرستی۔ جاں نثار اپنی رومانی شاعری کو بدن کا لمس دے کر اسے لجلجے جذبات کے جھاگ سی تر دامن ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان نے کئی صدیوں کا سفر طے کر کے تہذیب جنسی کی ہے، لیکن وہ نفیس نازک اندام جمال پرستوں کی مانند انسانی جبلتوں کی حدت شدّت اور سرکشی کی قیمت پر اس تہذیب کو خریدنے کے لئے تیار نہیں۔ اسی طرح وہ نیم نظر کے متبسم جادو کو سمجھتے ہیں، لیکن نہیں چاہتے کہ یہ جادو غمِ دوراں کا قیمتی سرمایہ اُن سے چھین لے۔ یہاں محبوب پر الزام نہیں بلکہ اپنی ذات کی آزمائش ہے یعنی بالآخر فیصلہ تو انہیں کرنا ہے کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے بیچ توازن کیسے برقرار رکھیں گے۔ یہ ذمہ داری ہے اور ذمہ داری کو قبول کرتے ہی میں کردار کی کسوٹی ہے اس کسوٹی پر جاں نثار پورے اترتے ہیں۔ کوئی جادو انہیں گھریلو اور کوئی SENTIMENT انہیں پالتو نہیں بنا سکا صفیہ اختر پر جو نظمیں خاکِ دل میں ہیں وہ اردو کی چند بہترین نظموں میں ہیں، لیکن خاکِ دل کی پہلی نظم "آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے" خدیجہ کے نام ہے جن سے جاں نثار نے صفیہ کے انتقال کے بعد شادی کی۔ جاں نثار نے خود کو رومانی محبت کی MYTH کا شکار بننے نہیں دیا۔ زندگی کے متعلق سوچے گئے تمام تصورات سے کہیں زیادہ حقیقت پسند ہے۔ جاں نثار کی وابستگی تصورات سے نہیں حقیقت سے ہے۔ MARY MCCARTHY نے مادام بواری پر ایک نہایت ہی خیال افروز مضمون لکھا ہے۔ عموماً لوگ ایما بواری کو رومانی کردار سمجھتے آئے ہیں۔ میری مکارتھی نے ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے کہ ناول کا رومانی کردار ایما نہیں بلکہ اس کا خشک بے ڈھنگا اور معمولی شوہر شارل بواری ہے۔ ایما کی خودکشی کے بعد شارل پائیں باغ میں بیٹھا ایما کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ محبت یہاں افلاطونی عینیت کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔ جاں نثار اختر نے صفیہ کی موت پر غمناک احساس میں ڈوبی ہوئی نظمیں لکھیں لیکن زندگی کو وہ جو نہیں رہا اس کے غم ناک تصور میں رائگاں کرنے کی بجائے وہ جو ہے اسے چاہنے کے لئے وقف کر دی۔

دل میں اتری چلی جاتی ہیں نگاہیں تیری

مجھ کو حلقے میں لئے لیتی ہیں باہیں تیری

اک اُجالا سا مرے گردِ سرِ شام سے ہے

آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

اس نظم میں جن چیزوں کے چھن جانے کا خوف ہے وہ ذوقِ سفر، راہگذر، غمِ دوراں کا اثر، تیغ و سپر، خونِ جگر، اور فکر و نظر ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو باہم مل جل کر آدمی کے کردار کو حوادث کی دنیا میں ایک جوہر کی شخصیت عطا کرتی ہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ جب احساس کی تیزی اور جذبہ کا گداز شامل ہوتا ہے تو وہ نکھرا ہوا کردار جنم لیتا ہے جو بقول اقبال کے کوہ و بیاباں میں سیلِ تند رو اور گلستاں میں جوئے نغمہ خواں بن جاتا ہے۔ نظم میں باہوں کے گداز اور بدن کے لوچ کا انکار یا اس سے دامن کشی کا اظہار نہیں ہے۔ صرف یہ خوف ہے کہ حسن کا تجربہ اگر زندگی کے دوسرے تجربات سے مل کر معنی خیز نہیں بنتا تو محض فرار و خودفراموشی کا بہانہ بن جاتا ہے۔ ایسی حسن پرستی جو آدمی کو پیکارِ حیات سے غافل کر دے اور اس سے غور و فکر سے عاری جمال پرستوں کا کام صرف فوائد لکھنا ہے شاعر کو قبول نہیں۔ جاں نثار یہ نہیں کہتے کہ تو میرے ساتھ کہاں جائے گی، یا مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ، یا کبھی کبھی تیری زلفوں کی نرم چھاؤں میں۔۔۔۔۔۔ انہیں تو صرف ایک ہی خوف ہے کہ حسن کی عشوہ فروشیاں انہیں غمِ دوراں سے بے خبر نہ بنا دیں۔ جاں نثار کو محبوب کی زلفوں کی چھاؤں اور پیکارِ حیات کی تپتی ہوئی دھوپ کے درمیان ثنویت پسند نہیں۔ اسی لئے ان کا کردار اول تا آخر دوسرے ترقی پسند شاعروں ہی کی مانند ایک رومانی انقلاب پسند کردار ادا کر رہا ہے۔ رومان اور انقلاب میں کوئی ثنویت نہیں بلکہ انقلاب پسندی رومانی حسیت کا ایک اہم عنصر رہا ہے لیکن رومان پسندی کی مصیبت یہ ہے کہ اس کے آدرش اور خواب ذرا کم ہی شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں۔ فریب شکنی کا دور پھر اس احساس کو شدید بنا تا ہے کہ ضروری نہیں کہ سیاسی آدرشوں ہی پر انفرادی مسرت کی تعمیر کی جائے۔ یعنی آدمی اپنی آج کی مسرت اپنی زندگی کی چھوٹی موٹی خوشیوں کو وعدۂ فردا پر ملتوی کرنا پسند نہیں کرتا جہاں آدمی کی ایک اجتماعی زندگی ہے وہیں اس کی ایک انفرادی زندگی بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ موسم سازگار نہیں، فضا ابر آلود ہے اور بجلیاں چمک رہی ہیں، لیکن پھر بھی وہ تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بناتا ہے۔ گویا ایک طرف تو چمن بندی کی آرزو اسے بے قرار رکھتی ہے اور دوسری طرف آشیانہ کی نرم گرم آسائشیں اسے لبھاتی ہیں۔ دونوں میں یعنی چمن بندی اور آشیانہ نشینی، خارجی دنیا کی تعمیر اور گھریلو زندگی کی تربیت میں بظاہر کوئی تضاد نہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے فرار کا بہانہ بھی بن سکتے ہیں گھریلو الجھنیں محض اقتصادی نہیں ہوتیں بلکہ بنیادی طور پر جذباتی بھی ہوتی ہیں۔ ان سے گھبرا کر آدمی اپنی ذات کو سیاسی گہما گہمی میں گم کر سکتا ہے خصوصاً وہ آدمی جو گھریلو مسائل کی طرف ایک مدون نظامِ جذبات کی تدوین نہیں کر سکا، ——— اسی طرح وہ آدمی جو خارجی دنیا کے خلفشار اور انتشار سے بوکھلایا ہوا ہے وہ گھریلو زندگی کی آسائشوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ پناہ کی تلاش بذاتِ خود ایک تھکے ہارے واماندہ جذبہ کی علامت ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری ایک ایسے تندرست اور توانا جذبہ کی شاعری ہے۔ جو بزمِ حیات اور رزمِ حیات کی مختلف منازل سے گزرتی ہے لیکن رزم و بزم میں سے کسی ایک کو بھی فرار اور پناہ گزینی کا بہانہ نہیں بناتی وہ بزمِ حسن و عیش اور رزمِ خیر و شر میں ایک ہی دل دہی اور جاں نثاری سے شریک ہوتے ہیں۔ والیتر کا کانڈید اور جانسن کا رسالیس جب خارجی دنیا میں مسرت کی تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو مایوس گھر لوٹ کر اپنے پائیں باغ کی کتر بیونت میں لگ جاتے ہیں۔

لیکن "گھر آنگن" کی شاعری جہاں نصیب واماندۂ سفر کی زندگی سے مفاہمت کی شاعری نہیں ہے۔ یہ ایک بھرے پرے انسان کی زندگی کی عام لیکن بنیادی مسرتوں اور حسن آفرینیوں سے انبساط و لغمہ کی جاندار کوشش ہے۔ "گھر آنگن" کی شاعری اپنا ایک حسن رکھتی ہے لیکن اس گھریلو پن کو پالتو پن میں بدلتے بہت دیر نہیں لگتی۔ اپنی بدترین شکل میں یہ نرم

آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غم دوراں کا اٹھانا ہوگا

(خاکِ دل)

"خاموش آواز" میں صفیہ ہندوستانی گیتوں کی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ مزار کی خاموش آواز میں زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی ہے۔ قبرستان کی اداس چاندنی میں ایک شوخ اور رنگین آواز کے دلفریب رنگ بکھرے ہیں۔ نظم میں موت کے سناٹے کو زندگی کی ہنگامہ آرائی نے مغلوب کر دیا ہے۔ زندگی اور موت کا معاملہ ہجر و وصال کے مانوس تجربے میں بدل گیا ہے۔ جاں نثار مزار پر نہیں گئے۔ بلکہ روٹھا ساجن گھر آیا ہے۔ زماں و مکاں کی تفریق اٹھ گئی ہے اور یاد ماضی حرکی اور حسی تصویروں کی صورت حال کا زندہ تجربہ بن گئی ہے جاں نثار اختر نظم کے محبوب بھی لیکن وہ نظم میں نمایاں نہیں ہیں۔ نظم میں اہمیت محبوب کی ذات اور صفات کی نہیں بلکہ ایک عورت کے شوخ اور سوگوار جذبات کی ہے۔ جاں نثار خود تو ایک عجیب غم ناک سنگینی چہرے پر لئے اس خاموش آواز کو سنتے رہتے ہیں۔ جو صفیہ کے مزار سے آتی ہے۔ یہ آواز بے پایاں محبت اور بے کراں غم کا ایک ایسا تجربہ ہے کہ اس کے سامنے شاعر کو اپنی ذات اور اپنی دلی کیفیات کی باتیں بے قیمت معلوم ہوتی ہیں۔ اس تجربہ کی بقاء پانے کے لئے ذات کی نفی ضروری ہے۔ اس نظم کا فنکارانہ حسن یہی ہے کہ خود کی ذات کو صفیہ کا "موضوعِ سخن" بنانے کے باوجود جاں نثار اختر نے اپنی ذات کو نظم کا موضوعِ سخن نہیں بنایا ایک عورت کی پرستش کے باوجود جاں نثار نظم کے ہیرو کی صورت میں سامنے نہیں آتے۔ راز و نیاز کے ان نازک معاملات میں اپنی مرکزیت کو اس طرح مٹا دینا شاعرانہ شخصیت کی پختگی اور رچاؤ کی علامت ہے۔ نظم موت کی وادی سے آتی ہوئی آواز ہے لیکن نظم کا بنیادی احساس حیات آفریں اور حیات افروز ہے۔ صفیہ کی آواز میں شوخی چلبلاہٹ، تہذیب شائستگی، غم نشاط کامرانی اور نارسائی کی ایک عجیب آمیزش ہے۔ اس آواز کے لئے وہی زبان مناسب تھی جو گیت اور غزل کی زبان کی ملی جلی گھلاوٹ لئے ہو۔ اس زبان کے آہنگ کے لئے وہی بحر مناسب تھی جو رازدارانہ گفتگو کے بے تکلف لب و لہجہ کو بلند بانگ بننے نہ دے۔ جاں نثار اپنے تجربے کے اظہار کے لئے ایک مکمل فارم پانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "خاموش آواز" بلاشبہ اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

فارم کا یہ PEREECTION "آخری لمحہ" کے حصہ میں نہیں آیا۔ سردار جعفری کا کہنا ہے کہ "آخری لمحہ" ایک طرح کی وصیت ہے۔ جواہر لال نہرو کی وصیت کی طرح خوبصورت"، وصیت بطور وصیت کے خوبصورت ہے لیکن وصیت کے وہ اجزا جن کا تعلق سماجی اور سیاسی حالات سے ہے۔ شاعری نہیں بن پائے اور نظم کی غنائیت جو ایک شدید جذبے کی کپکپاہٹیں لئے ہوئے ہے، سماجی تبصرے کی پیوندکاری سے جا بجا مجروح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غمِ دل اور غمِ دوراں کی اس ثنویت کو دو مختلف بحروں کا انتخاب اور زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ آخری لمحہ جو شاعر کا ہے، مرورِ ایام کا جیسے شاعر تاریخ کے آئینہ میں دیکھتا ہے ترجمان نہیں بن سکا۔ یہ نظم شاعر نے اس وقت جب اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ موت اور زندگی کی کشمکش سے گذر رہا تھا اپنی بیٹی عنبرہ کو خطاب کر کے لکھی ہے نظم "موت" کی نظم نہیں ہے، کیوں کہ نظم میں موت پر فلسفیانہ سوچ بچار نہیں ہے۔ نظم کا لمحۂ نزول لمحۂ موت سہی لیکن موضوعِ فکر

اس حقیقت پسندی کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جاں نثار جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے حالانکہ ایک حساس اور جذباتی وجود ہونے کے ناطے خوشگوار اور سوگوار حالات میں شاعر کا جذباتی بننا قدرتی بات ہے لیکن شاعری وہی پختہ ہوتی ہے جس میں جذبہ عقل کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو جانا زندگی اور شاعری دونوں میں مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ جاں نثار شدید جذباتی مراحل بھی بڑے پُروقار انداز سے پار کر گئے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی چار نظمیں توجہ طلب ہیں ان میں سے دو صفیہ سے متعلق ہیں۔ "خاکِ دل" اور "خاموش آواز"۔ ان دو نظموں میں شاعر کی ذاتِ غم کا مرکز ہے۔ دوسری دو نظمیں ہیں "آخری لمحہ" اور "آخری ملاقات"۔ ان میں شاعر کی ذات موت کی کربناک تجربہ سے گذرتی ہے۔ اور اسی لئے غم دوسروں کے حصہ میں آیا ہے۔ اور شاعر غمِ زندگی کی حدود کو پار کر گیا ہے۔ "خاکِ دل" شاعر کا خطاب اس سرزمین سے ہے جہاں صفیہ پیوندِ خاک ہے۔ ابھی غم بہت تازہ ہے، آنسو خشک نہیں ہو پائے لیکن نالۂ بے اختیار ضبطِ فغاں کے آداب کی پاسداری کرتا ہے اور اسی لئے اس آرٹ میں بدل جاتا ہے جو بے قابو جذبہ پر قابو پانے کی کشمکش کا زائیدہ ہے۔ آرٹ جذبہ کی موجِ تند پر بے دست و پا بننے کا نہیں، بلکہ جذبہ کے بھنور میں گھری ہوئی کشتی کے توازن کو برقرار رکھنے کا نام ہے، نظم میں غم ناکی رقت اور سوگواری مسکین بیچارگی کی سطح پر گرنے نہیں پاتی۔

تجھ کو روؤں بھی تو کیا روؤں کہ آنکھوں میں

اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے

زندگی عرصہ گہہ جہدِ مسلسل ہی سہی

ایک لمحہ کو قدم تھم سے گئے ہیں میرے

(خاکِ دل)

اس بند کی امیجری اور اسلوب میں جو سنگینی اور صلابت ہے وہ نظم کو آنسوؤں میں بھیگے ہوئے مرثیہ سے بہت مختلف بناتی ہے۔ جاں نثار موت کے غم کو فلسفیانہ دلاسوں سے غلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان نظموں میں موت پر کوئی فلسفیانہ افسردگی میں ڈوبا ہوا تفکر نہیں ہے۔ موت کے غم کو وہ فلسفہ کی قوت پر نہیں بلکہ زندگی کی طاقت پر جھیل جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ جاں نثار کو متفکرانہ شاعری سے رغبت نہیں۔ اقبال کے زیرِ اثر انہوں نے طویل متفکرانہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں ان کی قدرتِ زبان کے جوہر کھلتے ہیں۔ لیکن جاں نثار کو جو چیز زندگی سے وابستہ رکھتی ہے، اور اپنی متاعِ عزیز لٹ جانے کے بعد بھی انہیں جینے پر مجبور کرتی ہے وہ خود زندگی ہے جو تجریدی خیال کی صورت میں نہیں بلکہ بے شمار ننھی منی تصویروں کی صورت میں ان کی نظروں کے سامنے ناچ اٹھتی ہے۔ زندگی کے اس بلاوے کو انہوں نے کبھی رد نہیں کیا۔

پھر کبھی اس عرصہ گہہ جہدِ مسلسل سے مجھے

کوئی آواز پہ آواز دیئے جاتا ہے

ہوں لاکھ کہسار بھی حائل تو کیا ہوا

پل پل چمک رہا ہے جو تیشہ حسین ہے

(آخری لمحہ)

اس بند میں استعاروں اور حسی پیکروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جاں نثار کا تخیل فکر کی تجریدی فضاؤں میں نہیں بلکہ تجرباتِ حیات کی ٹھوس ارضی سطح پر حرکت کرتا ہے۔ شعری پیکر اور استعارے موجودات اور اشیاء سے شعری تخیل کا رشتہ برقرار رکھتے ہیں۔ شاعری اپنی مجروح فکر کو سنبھالنے کے لئے شاعروں کو بلند بانگ الفاظ اور قلابازیں مارتے آہنگ کے سہارے ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ جاں نثار کا آہنگ سنبھلا ہوا دلکش متناسب اور نکیلا اور اسلوب صاف شفاف اور براہ راست ہے۔ دریا کی تند باڑھ اور صحرا کا سکوت فنا کی عنصری طاقتوں کے استعارے ہیں راتوں کی تیرگی، گھٹاؤں کی گھن گرج، کہساروں کے سلسلے، خوف، مصائب، اور سماجی اور سیاسی مظالم جو ایک معنی میں نیستی کے اندھیروں کی پرچھائیاں ہیں کے استعاروں میں بدل گئے ہیں اس طرح پورا بند کائناتی، طبیعی، سماجی اور سیاسی سطح پر قوت حیات کی پیکار عمل اور جد و جہد کا ایک طویل استعارہ بن گیا ہے۔

جس طرح جاں نثار زندگی کو حقیقت کی سطح پہ قبول کرتے ہیں اسی طرح وہ موت کو بھی حقیقت کی سطح پر قبول کرتے ہیں۔ وہ نہ تو موت کو دلہن کی طرح سجاتے ہیں ــــــ نہ اس کی بھیانکتا کو گھٹاتے ہیں۔ ہر فرد اپنی موت آپ مرتا ہے اور وہ زندگی میں سب کے ساتھ سہی لیکن موت کے تجربہ میں وہ ٹالسٹائی کے ایوان ایلچ کی طرح یکا و تنہا ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ مرنا تو سبھی کو ہے اس کی تنہائی کے کرب کو کم نہیں کرتا کیونکہ بہر حال وہ تو اپنی ہی موت مرتا ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ہیڈگر کا مشہور قول ہے کہ "مرنا ہی ایسا کام ہے جو میرے لئے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے موت کے لمحہ میں آدمی کی خود آگہی جو اسے اپنی مکمل انفرادیت کا شعور عطا کرتی ہے اپنے عروج نقطہ پہ ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعیاتی سہاروں کی عدم موجودگی میں، جاں نثار کے یہاں یہ خود آگہی اور اس کی زائیدہ تنہائی اپنے برہنہ ترین روپ میں سامنے آتی ہے۔ محبت تنہائی کا توڑ ہے کیونکہ وہ ذات سے غیر ذات کی طرف ہے۔ اپنی بیٹی عنبرہ کی محبت جاں نثار کا آخری سہارا، آخری دلاسا بن جاتی ہے۔ اگر عنبرہ پاس ہے تو موت اپنی سب بھیانکتا کھو دیتی ہے۔ کیونکہ محبت نے غیر ذات کی طرف سفر نے، ذات اور ذات کی تنہائی کا احساس ہی مٹا دیا ہے۔ شاعر تو اپنی بیٹی میں زندہ ہے اور یہ زندگی کی موت پہ فتح ہے۔

آؤ اس چاند سے ماتھے کو ذرا چوم تو لوں

پھر نہ ہوگا تمہیں یہ پیار نصیب آجاؤ

آخری لمحہ ہے سینے پہ مرے سر رکھ دو

دل کی حالت ہوئی جاتی ہے عجیب آجاؤ

زندگی ہے ـــــ وہ زندگی جو شاعر کی تھی اور جو اب قریب الختم ہے، اور وہ زندگی جس کی شاہراہ پر عنیزہ نے نئے نئے قدم رکھے ہیں۔ فلسفیانہ خیالات ہی میں جاں نثار کو دلچسپی ہوتی تو اس مقام پر تسلسلِ حیات کا تصور اقبال اور سردار جعفری کی طرح انہیں لبھا سکتا تھا اور فلسفیانہ دلاسا بن سکتا تھا۔ لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ جاں نثار فلسفیانہ دلاسوں سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ عنیزہ زندگی کے تسلسل کا سبب ہے۔ جب خود ان کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو اس لمحہ میں یہ احساس کہ حیات کا سلسلہ کسی ایک وجود سے جاری رہے گا چاہے کتنا خوبصورت سہی لیکن فی نفسہ ہے جذباتی، حقیقت پسندانہ نہیں۔ زندگی مرنے والے کے لئے چاہے ایسی رہی ہو وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ وہ نووارداں بساطِ حیات کو اپنا کھیل کھیلنے کا حوصلہ دلا کر رخصت ہو جائے۔ اس قمارخانۂ ہستی میں آدمی کسی فلسفیانہ یا اخلاقی خیال کے زیرِ اثر نہیں بلکہ "قوتِ حیات" کی بے پناہ طاقت کے تحت بیئے بہ بیئے ہارنے کے باوجود زندگی کا کھیل اس کے ختم ہونے تک کھیلتا رہتا ہے۔ فلسفہ دو دھاری تلوار ہے۔ اس سے اثباتِ حیات کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور نفیٔ حیات کا بھی۔ وہ جینے کی امنگ دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی سکتا ہے فکر کا ایک مقام وہ بھی ہے جہاں دوسرا قدم خودکشی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کامیو نے بتایا ہے کہ خالص PHYSICAL سطح پر بھی بدن فنا کے تصور سے لرزتا ہے۔ چھری کی تیز دھار دیکھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوتی ہے۔ فنا کے اندھیروں کے سامنے زندگی کی یہ پیکار بذاتِ خود HEROIC ہے۔ موت کی گھڑی میں بھی جاں نثار اختر زندگی کے اسی اولو العزمانہ غیر رزمیہ کا رجز گاتے ہیں۔

جینے کی ہر طرح سے تمنّا حسین ہے
ہر شعر کے باوجود یہ دنیا حسین ہے

دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے

صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستہ حسین ہے

دل کو ہلائے لاکھ گھٹاؤں کی گھن گرج
مٹی پہ جو گرا ہے وہ قطرہ حسین ہے

راتوں کی تیرگی ہے جو پرہول غم نہیں
صبحوں کا جھانکتا ہوا چہرہ حسین ہے

پسندِ خاطر کرتا ہے، ان کا شعور عطا کرتی ہے۔ جاں نثار اختر کو چند قدروں پر اصرار ہے کیونکہ یہ قدریں بذاتِ خود جزوِ حیات ہیں۔ نوجوانی کے پرجوش دنوں میں بھی جاں نثار کی رومانیت اور بغاوت قدروں کا شعور رکھتی تھی۔ اسی لئے وہ جدید شاعروں کی بے محابا بغاوت کے سامنے خاصے معتدل اور سنبھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سماجی تبدیلی کا ان کا آدرش زندگی کے ٹھوس تجربات سے کبھی جدا نہیں ہونے پاتا۔ اور یہ تجربات ایک ایسے نظامِ حیات کے بخشے ہوئے ہیں۔ جو قدروں کا شعور رکھتا تھا ان کی شاعری کا گراں مایہ سرمایہ زندگی کے تجربات ہی ہیں جو سایوں کی طرح حرکت کرتی تصویروں کی صورت، افسانوں کے عنوانات بن کر، خوشگوار یادوں کے روپ میں ہمیشہ انہیں گھیرے رہتے ہیں وہ بڑے سے بڑے انقلاب کے لئے تیار ہیں لیکن کوئی ایسا قدم اٹھانا پسند نہیں کرتے جو انہیں اور اس معنی میں زندگی کو ان دلچسپ تجربات سے محروم کر دے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ پرانی دنیا کی بوسیدگی کو ایک انقلابی کی حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ آدمی ان فرسودہ روایات اور غیر منصفانہ طبقاتی رشتوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے جو اس سے زندگی کی بنیادی مسرتوں کا امکان تک چھین لیتے ہیں۔ انسان کی بنیادی مسرتوں کا انہیں احساس بھی تھا اور ان پر یقین بھی تھا۔ اب وہ ابھرتی ہوئی نئی دنیا کو حیرت سے دیکھتے ہیں جو ایسی غیر متوقع تبدیلیوں سے گذر رہی ہے کہ بنیادی مسرتوں کا تو سوال ہی کیا انسان اپنی بنیادی انسانیت تک سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے اور حصولِ مسرت کی بے محابا دوڑ میں زیادہ پراگندہ خاطر بنتا جاتا ہے۔ دل پسند طرزِ حیات کی جستجو میں وہ تجربات پر تجربات کئے جا رہا ہے۔ اور تجربات کی اناڑی میں آزمودہ رویئے اس قدر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں کہ آدمی سے اس کا قرینۂ زندگی ہی چھن گیا ہے۔ اس نئے آدمی کی آزمائشوں کو جاں نثار اپنی نئی غزلوں میں جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا حیرت اور ہمدردی سے دیکھتے ہیں، یہ حیرت اس آدمی کی ہے جو قدروں کا شعور رکھتا ہے اور اب ایسی دنیا میں جیتا ہے جس میں قدریں تہس نہس ہو گئی ہیں۔ انسان نے اپنے تاریخی عمل کے ذریعہ جس تمدنی اور زندگی کی تشکیل کی تھی وہ جاں نثار کو عزیز ہے اس کی قیمت پر وہ کوئی تبدیلی گوارا کرنے کو رضامند نہیں وہ اپنی بیٹی کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہزاروں سال میں تہذیب جسم نکھری ہے
بجا کہ جنس تقاضہ ہے ایک فطرت کا
تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دَور کو تہذیب آگہی دی ہے
(آخری لمحہ)

وہ سماجی انقلاب چاہتے ہیں لیکن ایسا نہیں جو نظامِ حیات کو درہم برہم کر دے۔ وہ حقائق کے بیچ رہ کر سوچنا پسند کرتے ہیں اور اسی لئے ان کی فکر UTOPIAN بننے نہیں پائی وہ رومانی انقلاب پسند ہیں لیکن زندگی میں نظم و ضبط کی قدروں کی اہمیت کا شعور رکھتے ہیں۔ آدمی نے اپنے تہذیبی اور تمدنی ارتقاء کے دوران جن انسانی تعلقات اور جذباتی رویوں کو پروان چڑھایا ہے اُن کے متعلق جذباتی بنے بغیر وہ

نہ اعزاء، نہ احبّا، نہ خدا ہے نہ رسول
کوئی اس وقت نہیں میرے قریب آجاؤ
تم تو قریب آجاؤ۔

صاف بات ہے کہ شخصی جذبات میں ڈوبی ہوئی اتنی غنائی نظم میں ایسے شعر۔

تاریخ بتائے گی تم کو انساں سے کہاں پر بھول ہوئی
سرمائے کے ہاتھوں لوگوں کی کس طرح سے محنت دھول ہوئی

جو استعاروں اور پیکروں میں ڈھل نہیں پائے سپاٹ بیانیہ کی سلاخ بن کر نازک تاروں کے بنے ہوئے غنائیہ کے عنکبوت کو تار تار کرتے ہیں۔

موت اور زندگی کے موضوع پر جاں نثار کی ایک اور نظم ہے۔ "آخری ملاقات"۔ اس نظم کا تار و پود شعری تصویروں سے بُنا گیا ہے۔ ماضی کے خوبصورت تجربات حال کے اس لمحہ میں جو نیستی کے اندھیرے پانیوں میں آخری بوند کی صورت گراہی جا رہے ہیں نازک موئے قلم سے کھینچی ہوئی ننھی منی تصویروں کی صورت سامنے آتے ہیں۔ نیستی جو سناٹا ہی سناٹا ہے ایک ایسا بے رنگ جو تصویر میں ڈھل ہی نہیں پاتا موت کے لمحہ میں بھی شاعری تو زندگی پر ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ شاعری تخلیق ہے اور تخلیق زندگی ہے جو موت کی ضد ہے۔

دریاؤں بہتے ہریالی پر　∴　اک تتلی بیٹھی ڈالی پر
کچھ جگ مگ جگنو جنگل سے　∴　کچھ جھومتے ہاتھی بادل سے
السائی ہوئی رُت ساون کی　∴　کچھ سوندھی خوشبو آنگن کی
اک ٹوٹی رسی جھولے کی　∴　اک چوٹ کسکتی کولھے کی

اس نظم کی زبان گیت غزل اور مثنوی کی زبان کا نہایت ہی لطیف امتزاج ہے۔ عجیب انداز سے پوری نظم لکھی گئی ہے۔ اور تصویریں دھندلے سایوں ہی کی طرح بغیر کسی کاوش کے آنکھوں کے سامنے ابھرتی اور ڈوبتی ہیں۔ نظم میں ان تصویروں کو الوداع کہنے کا کوئی غم ناک رویہ نہیں ہے کیونکہ ماضی کی تصویریں حال کا تجربہ بن گئی ہیں اور شاعر اس تجربہ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ وہ اس لمحہ کی ہولناکیوں تک کو بھول گیا ہے جو عدم کی بے کرانیوں میں گم ہونے والا ہے۔

"آخری لمحہ" میں محبت کی قدر کا اثبات ہے۔ یہ اثبات ذاتی سماجی اور کائناتی متنوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ مابعد الطبیعاتی سہاروں کی عدم موجودگی میں انسانی محبت موت کی تنہائی کا آخری تریاق ثابت ہوتی ہے۔ شاعری قدروں کا یعنی موجودات اور انسانی تعلقات کی دنیا میں جن رویوں کو آدمی

فن کار کے سامنے جب سیاست سیاسی واقعات اور حقائق کی صورت میں نہیں بلکہ سیاسی آئیڈیا لوجی کی صورت میں سامنے آئے تو خواب اور حکمت ہے اب یہ فریب اور شکست فریب اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ جاں نثار اختر کی سیاسی شاعری عام ترقی پسند شاعری سے بہت مختلف نہیں ہے۔ سیاسی احتجاج کی شاعری کو ایک منفرد لب و لہجہ اور ایک نیا اسلوب دینے کی کوشش سردار جعفری کے یہاں نظر آتی ہے۔ فیض شروع ہی سے اپنے غنائی اسلوب کو پروان چڑھا رہے تھے اور آگے چل کر انہوں نے اس کا استعمال سیاسی شاعری کے لئے نہایت کامیابی سے کیا۔ اس اسلوب کی نرمی گرمی نشیب و فراز اور پیچ و خم کے جائزے کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ ترقی پسندی کے شباب کے زمانے میں جاں نثار اختر کو وہ شہرت اور مقبولیت نہ ملی جو دوسرے شاعروں کو ملی تو اس کی بڑی وجہ رسمیہ اسلوب پر قناعت اور انحراف کا خوف ہے۔ حقیقتاً یہ ہے کہ جاں نثار ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہم کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں پیدائشی شاعر کہتے ہیں جب انہوں نے شعر کہنا شروع کیا تو شاعری کی بندھی ٹکی، سجی سجیلی روایت پورے سولہ سنگھار کئے اور ان کی آغوش میں آ بیٹھی۔ قدرت زبان جسے رجھاتے رجھاتے دوسرے شاعروں کو ہونیز سے پسینہ اُتر تا ہے شروع ہی سے دست بستہ اُن کی خدمت میں موجود رہی ہے۔ ان کی طویل منفکرانہ نظمیں اور وہ سیاسی اور وطنی نظمیں جو مختصر ہونے کے باوجود سخن مختصر نہ بن سکیں ان کی قدرت زبان اور پختگی ادا کی ضامن ہیں۔ جاں نثار اپنے مروجہ اسلوب پر مدت دراز تک اقانع رہے ہیں۔ پیدائشی شاعر کو خود اطمینانی کے آسیب کا صید زبوں بننے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جو چیز اسے دیدہ ریزی کے بغیر حاصل ہوتی ہے اسے وہ دیدہ دلیری کے ساتھ صرف کرتا ہے۔ اس کے پاس اتنا کچھ ہوتا ہے کہ جو نہیں ہے اس کے لئے کوئی بے قراری محسوس نہیں کرتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اپنی تمام رومانیت اور انقلاب پسندی کے باوجود دوسرے ترقی پسند شاعروں ہی کی مانند جاں نثار بھی اس روحانی خلفشار اور کرب ناک بے چینی سے نہیں گذرے جو اس رومانی باغی کا مقدر ہے جو اپنی بغاوت کو اس کی آخری حدود تک پہنچاتا ہے۔ دراصل ہمارے یہاں کی رومانیت احساس کی نزاکت سے آگے بڑھی ہی نہیں۔ رومانی حسیت جن ہولناک اور پر فریب منازل سے مغرب میں گذری ہے اس پر ترقی پسند انفعالی رومانیت کی تہمت لگا کر مطمئن ہو گئے۔ ورنہ بلیک بائرن، کیٹس، کالرج، گوئٹے، یا ویگر اور ایٹس کی شاعری ہمیں بتاتی ہے کہ شاعرانہ تخیل کیسی کیسی پُراسرار فضاؤں میں پرواز کرتا رہا ہے۔ شاید ہمارا قومی مزاج المیہ ہی کی مانند رومانیت کے لئے بھی بہت سازگار نہیں رہا۔ مارکسی آئیڈیولوجی کو بھی ہمارے شاعروں نے من حیث القوم اپنایا لیکن یہ اپنائیت بھی رومانی بغاوت سے زیادہ یوٹوپین آرزو مندی کا بیج سیراب کرتی رہی۔ سماجی ناانصافی کے خلاف جنگ بتدریج سیاسی اور اقتصادی رنگ اختیار کرتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورژوازی قربانی کا بکرا بن گیا لیکن زندگی کے بنیادی مسلمات جن پر ایمروز کی قیمت پر تمدن کی تعمیر ہوئی تھی کبھی چیلنج نہیں کئے گئے۔ ایک نو کلاسیکی مفاہمت ترقی پسندوں کا بھی عام رویہ رہا ہے۔ ترقی پسندوں کی شاعری اچھی ہے لیکن محدود ہے ان کی منظر کبھی بصیرت نہیں بنتی اور ان کی سیاسی شاعری شیلی اور اقبال کی شاعری کی مانند VISIONARY نہیں بنتی۔ یہ شاعری لبرل ہیومنزم کی شاعری زیادہ ہے REVOLUTIONARY ROMANTICISM کی شاعری کم۔ بغاوت جب جھجک اور پس و پیش کا شکار ہوتی ہے تو اسالیب کے تجربے ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن منفرد عظیم اور عہد آفریں اسلوب مشکل ہی سے ہاتھ آتا ہے۔ جاں نثار کی سیاسی نظمیں ایک محدود حسیت کی ترجمان ایک رسمیہ اور تسلیم شدہ طرز کی نظمیں ہیں۔ ان میں انسان دوستی کے جذبے کو فروغ کرنے والی غذائیت ہے لیکن احساس جمال کو سیراب کرنے والی توانائی نہیں۔

جاں نثار اختر کی طویل منفکرانہ نظموں کی ناکامی کا سبب کمزور فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس تخلیقی تجربے میں بھی تلاش کرنا چاہئے

ایک کلاسیکی انداز نظر سے سوچتے ہیں۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ کلاسیکی ذہن سماجی تبدیلی نہیں چاہتا یہ بھی ہماری خوش فہمی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر رومانی ذہن انقلابی یا ترقی پسند ہوتا ہے۔ رومانی بغاوت جس طرح نراج میں منتج ہوتی رہی ہے اس کی وجہ سے آج کا دانشور سماجی تبدیلی کے مسائل پر زیادہ دانش مندانہ طریقہ پر سوچ بچار کر رہا ہے پچھلے دو سالوں میں پوری دنیا زبردست سیاسی انقلابات سے گذری ہے۔ یہ انقلابات تاریخی تجربات کی صورت فکر و نظر کا نیا مواد فراہم کرتے ہیں۔ چند قدروں کو CONSERVE کرنے کا احساس انقلابی کو کنزرویٹیو نہیں بناتا۔ جب تک انقلاب تاریخی حقیقت نہیں بنتا اس کے متعلق رومانی اور جذباتی طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ تاریخی حقیقت بننے کے بعد انقلاب کے رومانی تصور کو تجربہ کی زائیدہ دانش مندی کے ذریعہ ایک کلاسیکی توازن عطا نہ کیا جائے تو فکر و نظر عنفوان شباب کی ناپختہ اور پرجوش سطح سے بلند نہیں ہو پاتی۔ نعرہ بازی کی شاعری اس وجہ سے خراب نہیں ہے کہ وہ نعرے لگاتی ہے شعر اگر ضرب المثل بن سکتا ہے تو سمجھئے کہ نعرہ سیاسی ضرب المثل ہے۔ نعرہ بازی کی شاعری خراب اس لئے ہوتی ہے کہ وہ تجربات کے گاڑھے مواد سے محروم ہوتی ہے۔ محض آدرش کی بات کرتی ہے لیکن آدرش کو حقائق کے بیچ رکھ کر دیکھتی نہیں شاعر آدرش وادی ہوتا ہے لیکن آدرش وادی سے بہت کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے۔ وہ آدرش وادی کی طرح محض اپنے آدرشوں میں نہیں جیتا بلکہ اس کی جڑیں زندگی میں بہت دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ خالص سیاسی آدرش وادی اس نعمت سے محروم ہوتا ہے اس لئے ہر شاعر آدرش وادی ہوتا ہے لیکن ہر آدرش وادی شاعر نہیں ہوتا۔ انقلابی جب کمیسار بن جاتا ہے تو جس آدمی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ شاعر ہی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعر کا رشتہ زندگی سے گہرا ہوتا ہے اور وہ تجربات کی سنگلاخ چٹانوں پر پاؤں جما کر بات کرتا ہے۔ جبکہ سیاسی آدرش وادی انسانی فطرت، انسانی نفسیات اور انسانی جذبات کا خیال کئے بغیر اپنے نصب العین کے حصول کے لئے، یوٹوپیا کی تعمیر کی غرض سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ شاعر جب کہتا ہے کہ چند چیزیں حسین ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ان سے حسین تر چیزیں میں تمہیں دوں گا۔ کمیسار شاعر کی بات اس لئے سمجھ نہیں پاتا کہ شاعر جن تجربات کا بیان کرتا ہے ان کی UTILITY VALVE کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ترقی پسند شاعروں کی شاعری محض شاعری ہونے کے سبب ایسے عناصر بھی رکھتی ہے جن کا براہ راست زندگی سے تعلق ہے اور جو خالص سیاسی آدرش وادی، یوٹوپین مفکر کے یہاں کم سے کم پائے جاتے ہیں۔ بڑا فن کار زندگی کی قیمت پر تو آرٹ تک کو قبول نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ سیاست۔ انتہا پسند رومانیوں نے جب کہا کہ آرٹ ہی زندگی ہے تو شاید یہ گوئٹے ہی تھا جس نے اعلان کیا کہ آرٹ زندگی کے لئے ضروری ہے، لیکن زندگی آرٹ نہیں ہے۔ زندگی اتنی وسیع ہے کہ آرٹ زندگی کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔ زندگی پر آرٹ محیط نہیں ہو سکتا تو فلسفیانہ اور سیاسی آدرش کا تو ذکر ہی کیا۔ آرٹ کے باہر بھی زندگی ہے اور اس کا جاں نثار اختر کو پورا احساس ہے، اور یہ زندگی بڑی تند رو، بڑی سرکش، بڑی رنگا رنگ ہے، ہر بڑا فنکار اپنی بساط احساس کو اس کی ہنگامہ خیزی کی جولانگاہ بناتا ہے اور اس کے بخشے ہوئے غم اور مسرتوں سے اپنے دامن کو مالا مال کرتا ہے۔ جاں نثار تو کہہ ہی چکے ہیں "ناز یہ بھی غم دوراں کا اٹھانا ہوگا" اور جاں نثار میں یہ ناز اٹھانے کا حوصلہ ہے "خاک دل میں"۔ استالن کا مرثیہ غم دوراں کا ایک اور عطیہ ہے۔ جسے جاں نثار کی شاعری خاک بسر ہوئے بغیر قبول کرتی ہے۔ جاں نثار کے مجموعہ میں استالن پر نظم کی وہی اہمیت ہے جو اقبال کے یہاں مسولینی پر لکھی ہوئی نظم کی ہے۔ ان نظموں کو فنکار کی سادہ لوحی یا سیاسی GULLIBLITY کے طور پر دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ یہ نظمیں صرف ایک ہی بات بتاتی ہیں کہ تاریخ کی قوتیں فن کار اور عام آدمی کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہوتی ہیں فن کار اساطیر کا بنانے والا نہیں بلکہ اساطیر کا نغمہ سنج ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ اگر تاریخ کا ہیرو ہے تو استالن تاریخ کا آخری ارسطو تھا۔

تو جیتی جاگتی تصویروں کا نگار خانہ کھل جاتا ہے۔

وہ سبزے پہ اُڑتا دھواں سا غبار   پہاڑوں کے دامن میں وہ مرغزار
کہیں دور مرلی بجاتے ہوئے   گڈریے وہ ریوڑ ہنکاتے ہوئے
وہ کھلیان، اوسر، چراگاہ کھیت   وہ میدان، ٹیلے، ندی، جھیل، ریت
وہ دُکھ سکھ کی پڑتی ہوئی دھوپ چھاؤں   کوئی پاس بستی کوئی دور گاؤں
زمیں سے اندھیرے ابھرتے ہوئے   وہ کھیتوں میں سائے اُترتے ہوئے

اب ان شعروں کا مقابلہ سپاٹ فلسفیانہ بیان سے کیجئے۔

ہر کہیں ہے دو ضدوں کا اتحاد   —— ارتقا کا راز ہے رازِ حیات

یا پھر یہ شعر دیکھئے۔

کلیجوں میں چھدتی ہوئی ہل کی دھار   وہ فاقوں سے مرتے ہوئے کاشتکار
جماہی سی لیتے وہ ذاتی مفاد   وہ جاگے ہوئے ملکیت کے فساد

فرق ظاہر ہے۔ جماہی لینے کا فعل شعر کو استعارہ نہیں بناتا۔ پھر غربت کے بیان میں عجز کلام مبالغہ کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ فاقوں سے مرتے ہوئے کاشتکاروں کے کلیجے ہل کی دھار سے چھلنی کرنے پڑتے ہیں اس کے برعکس

وہ دکھ سکھ کی پڑتی ہوئی دھوپ چھاؤں   کوئی پاس بستی کوئی دور گاؤں

میں بغیر کسی مشاطگی کے کیسے سہل انداز میں زندگی کا دلفریب نقشہ ابھر آیا ہے۔ جب بھی شاعر نے دُکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں کو الگ کر کے دکھ کی دھوپ کو رحم طلب شدت بخشنے کی کوشش کی ہے اسے جذباتیت سے لیکیلئے مبالغہ آمیز استعاروں کی پناہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ سردار جعفری کے یہاں یہ تصویر بالکل ہی ابلتی ہوئی لاشوں کی صورت ابھرتی ہے۔ نقاد شاعر پر کیا تنقید کرے گا۔ خود زندگی شاعر سے انتقام لیتی ہے اور شعر کی تصویر کو اپنی تصویر کہنے سے انکار کرتی ہے۔

جاں نثار کی مثنویوں سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے مارکسی آئیڈیولوجی کو گہرے مطالعہ کے بعد اپنایا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کا زمانہ آئیڈیولوجی کے لئے بہت ساز گار نہیں رہا۔ اس کا سبب خروشچیف کا دورِ مسعود، روس و چین کے نامسعود تعلقات یساری سیاست کا بکھراؤ، حقوق و مراعات ملنے کے بعد پرولتاریہ کی انقلابی کشمکش سے دامن کشی، اور ریڈیکلزم کو لبرلزم کے ساتھ مصالحت کے علاوہ اور دوسری بہت سی تاریخی قوتوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک بڑے خواب کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنا بڑا جاں گسل تجربہ ہے نئی نسل کو ورثہ میں ملا ہے۔ فاشزم کا ہولناک تجربہ، کوریا اور ویت نام میں انسانوں کا قتلِ عام، فسادات کا اندھا

جس کی وجہ سے خود اقبال تک کے یہاں اکثر فلسفیانہ خیال شاعرانہ تجربہ کا روپ اختیار نہیں کر پاتا۔ مگر در فلسفہ سے میری مراد اس مادہ پرست فلسفہ سے ہے جو ہیومنزم کو کوئی جامع نظام افکار عطا کرنے میں تا حال کامیاب نہیں ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو صرف تاریخ میں ارتکاز کر دیکھنے سے انسانی فکر بار بار اندھی گلیوں میں داخل ہوتی ہے اور تھک ہار کر اسے انسانی اخلاقیات کی قدریں مابعد الطبیعاتی فلسفوں سے مستعار لینی پڑتی ہیں۔ روحانی ڈائمنشن سے محروم ہیومنزم کوئی معتبر نظام افکار کی تشکیل نہیں کر سکا ہر وہ شاعر جو فلسفیانہ مسائل سے سروکار رکھتی ہے اسے نقطۂ تکمیل پر پہنچنے کے لئے روحانی عقائد، سریت، تصوف اور مابعد الطبیعات کی منزل میں قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ایٹس۔ ایلیٹ اس کے سامنے کی مثالیں ہیں۔ سردار جعفری نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قدیم شعراء کے یہاں اگر مابعد الطبیعات اور ہمہ اوست کے مسائل شعر کا موضوع بن سکتے ہیں تو جدید شاعر کے یہاں جدلی اور تاریخی مادیت شعر کا موضوع کیوں نہیں بن سکتی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ شعر کا موضوع کونسا فلسفہ بن سکتا ہے کوئی بھی فلسفہ بن سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جدلی اور تاریخی مادیت انسان کے بعض بنیادی سوالات کے ایسے جواب تلاش کر سکی ہے جو مثلاً ہمہ اوست اور ویدانت کے فلسفوں کی مانند انسان کی ذہنی بے قراری اور روحانی بے چینی کو قرار بخش سکیں۔ اور اس کائنات میں اس کے عمل کو معنی خیز بنا سکیں اگر محبت کا جذبہ انسان میں فطری ہے اور محبت ذات سے غیر ذات کی طرف سفر ہے تو آخری لمحہ میں غلیزہ کی محبت کے ماورا بھی ایک مقام کی گنجائش تھی جس کے ہونے یا نہ ہونے سے جو فرق پیدا ہوا ہے جدید انسان اس کی علامت ہے۔ کیونکہ محدود ہونے کے ناطے لامحدود ہونے کی خواہش ابدیت کی تمنا، فنا کے خوف پر قابو پانے کی کوشش، حیات مستعار کو شہر رحبتہ کی بے معنویت سے محفوظ رکھنے کی تڑپ، ماورائیت کو ناگزیر بناتی ہے۔ ماورائیت سے ہٹ کر ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش وجودیت میں نظر آتی ہے، لیکن وجودیت حیات کے کرب کو ایک رواقی ذہنی صلابت سے قبول کرنے کی تعلیم دیتی ہے جدید شاعری میں کرب زیادہ اور نشاطِ زیست کم ہے جبکہ ہمہ اوست کی شاعری نشاط زیست کے نغموں سے گونجتی ہے کیونکہ اس میں جذبۂ عشق کا لیے محابا چھیٹا ہے اور زندگی کا کرب غم فراق کی ادا بندیوں میں بدل گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جدلی اور تاریخی مادیت کا فلسفہ فطرت پسند آرٹ کی مانند ہی جبریہ ہے جب کہ آدمی اپنے ارادے کا آپ مالک ہونے کے سبب آزاد ہے اور اسی لئے UNPREDIC TABLE ہے۔ اور اسی لئے تاریخ آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں بتاتی جو اٹل قوانین کا حکم رکھتی ہو۔ تاریخ کی مارکسی تفسیر اہم سہی لیکن محدود اور یک طرفہ ہے۔ تاریخ مارکسی آرزو مندیوں اور پیشین گوئیوں کی نفی کرتی رہی ہے جس کی ایک عبرتناک مثال ریاست کا مارکسی تصور ہے جسے جاں نثار نے نظم کیا ہے۔ اشتراکی سماج میں ریاست ختم تو کیا ہوتی، وہ ایسی مطلق الحکم بن گئی کہ اس کے سامنے تاریخ کے آمر بھی طفل مکتب نظر آنے لگے۔ یہ نظمیں حقیقت کے انکشاف کا جامہ نہیں بنتی محض ان کی مارکسی نقطۂ نظر سے تفسیر کرتی ہیں اور ضروری نہیں کہ یہ تفسیر درست یا قابل قبول ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے متعلق تجریدی سطح پر جو تصور قائم کیا جائے، آرٹ میں اس کی پیش کش کا بہترین طریقہ ڈرامائی نظم رہی ہے۔ شیلی کا پرومیتھس یا سین ببی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اساطیر فلسفیانہ تصورات کی تجسیم بنتے ہیں اور فلسفیانہ شاعری کے لئے زبردست تخلیقی امکانات فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں فلسفی شاعروں نے اساطیر سے بہت کم کام لیا ہے جاں نثار کی قدرت زبان میں کلام نہیں لیکن زبان کا تخلیقی استعمال کم اور فلسفیانہ استعمال زیادہ ہوا ہے۔ البتہ جب ان کا تخیل پیکر تراشی کرتا ہے۔

کتنا اس کا متحمل ہوتا۔ ان میں اور نئے شاعروں میں بڑا فاصلہ تھا اور انہوں نے اس فاصلہ کو برقرار رکھا یعنی انہوں نے نئے شاعروں کے احساس کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ عقائد کے سراب سے باہر نکل آئے۔ لیکن صحرا نوردوں کی ہم سفری کے لئے نہیں بلکہ ان کے کرب کی شناخت کے لئے یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون سی بادِ سموم کے جھلسے ہوئے اور بے قراری کے مارے ہوئے ہیں۔ جاں نثار ایک دردمند انسان دوست آدمی کی طرح اس بے قراری کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ان تجربات سے نہ گذرے ہوں جن سے نیا شاعر گذر رہا ہے۔ ممکن ہے اُن کی حسیت نے وہ زخم نہ کھائے ہوں جو نئے شاعر کی حسیت کی قسمت میں آئے ہیں لیکن ان کی آنکھیں اضطراب وقت کی تماشائی ہیں اور وہ جو دیکھتے ہیں اسے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ غزل جاں نثار کے کلام میں ہمیشہ ایک سوئی ہوئی صنف رہی ہے۔ اپنے ہم سخنوں فیض۔ جذبی۔ مجاز کے برعکس ان کے یہاں غزل روایتی اسلوب کی دُلائی کے نیچے اونگھتی ہوئی ملے گی۔ اس نئے احساس کی ترجمانی کے لئے وہ ایکاایکی انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے۔ اور ان نقادانِ سخن کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جو تخلیق فن کے طلسم کا راز پانے کے متلاشی ہوتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ فن کار اپنا فارم کیسے پاتا ہے۔ "پچھلے پہر" کی غزلیں جاں نثار کے شاعرانہ احساس کا ایک نیا موڑ ہیں۔ ان غزلوں میں اس صورتِ حال کا بیان ہوا ہے جو شکست خواب کی پیدا کردہ ہے جو ان کے ذاتی تجربوں میں آئی ہے اور وہ صورت حال کا بھی عکس ہے جو نئے حالات کا پیدا کردہ ہے اور جس کی آگہی جدید زندگی کے مشاہدہ اور جدید شاعری کے مطالعہ کی مرہونِ منت ہے۔ "پچھلے پہر" کی غزلوں میں وہ موضوعات جو جدید شاعر کے زخمی احساس کے ترجمان ہیں اور جو جدید آدمی کے کرب کی تصویر ہیں نفسی پیرایہ میں نہیں بلکہ "دوسرے" آدمی کے غم کی صورت میں سامنے آئے ہیں

مجھ سے نظریں تو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے
میری آنکھوں میں سُلگتے ہیں سوالوں کی طرح

یا پھر "دوسرے آدمی" سے ایسا مشفقانہ خطاب ہے کہ جو دوسروں کا غم سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ یہاں صحت مند انسان دوستی کی نمائش کی جگہ دل گرفتگی اور افسردہ طنز نے لے لی ہے۔

تم پہ کیا بیت گئی کچھ تو بتاؤ یارو
میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

مزاجِ رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں
"زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں"

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

تشدد، آبادی کی ہجرت، بڑی طاقتوں کی گرم و سرد جنگ، بڑے شہروں کے انسانی جنگلوں میں مرکزی تہذیبی روایت کا خاتمہ، انفرادیت کی شہر بہ رنگ بے رنگ شکل اداروں کے شکنجے کی مضبوط ہوتی ہوئی گرفت، کمرشل، اکاڈمیک اور ریاستی کلچر کا ہائی کلچر پر غلبہ بے یقینی اور خواب آفرین مزاج پر علمی روشن خیالی کا تسلط، مادہ پرست لبرل اور آزادی تمدن کی کامیاب زندگی کے لئے اعصاب شکن بھاگ دوڑ، سائنسی ایجادات کی انسانی قدروں سے بے نیازی، ٹکنولوجیکل انقلاب اور الیکٹرانکس کا فنونِ لطیفہ کو نیا چیلنج، ماورائیت اور مابعد الطبیعیات کا سقوط، خاندانی تعلقات کی غیر ارتباطی، جنسی اخلاقیات کی اتھل پتھل، اور بائیو کیمسٹری اور دوسرے سائنسی علوم کے چکرا دینے والے انکشافات، فلسفہ میں وجودیت، ادب اور آرٹ میں جدیدیت اور سیاست میں نئے ریڈیکلزم کے دھارے بہ نکلے۔ اردو کا نیا شاعر ایک نئے فارم میں ایک نئے احساس کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ترقی پسند روایت اس نئی صورتِ حال کی معنی خیز تعبیر سے قاصر تھی۔ اور اپنی RELEVANCY کھو چکی تھی۔ ترقی پسند یا تو خاموش تھے یا اپنا پرانا خواب دیکھنے میں مگن یا اگر نئی صورتِ حال کو دیکھتے بھی تو ہمارا خواب ایک لجلجی انسان دوستی کے خمار کی صورت ان کی تخلیقات کے انگ انگ کو توڑتا نظر آتا۔ جدید شاعر کے کرب کے سامنے ان کی صحت مند انسان دوستی کی باتیں ایک SELF - RIGHTEOUS مطمئن لبرل کی۔ آسودہ گفتگو کی مانند خود پسند کھوکھلی اور چکنی چپڑی معلوم ہوتیں۔ ترقی پسند نئے شاعر کے کرب کی نوعیت کو پہچان ہی نہ سکے نیا شاعر لمحہ بہ لمحہ سرکتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور ترقی پسند ESTABLICHED بزرگوں کی زبان بول رہے تھے۔ ترقی پسند دیکھ رہے تھے کہ نیا شاعر آبلہ پا ہے اور ان کے پاس اس کے زخموں کا مرہم نہیں ہے پھر بھی وہ اسے اس سراب میں آنے کی دعوت دیتے تھے۔ جہاں وہ خود تھے اور نیا شاعر جانتا تھا کہ جہاں کہ وہ ہیں وہاں بھی تاریکی اور تشنہ لبی ہے اور خود فریبی سراب کو حقیقت سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تمام ترقی پسندوں میں جاں نثار اختر واحد شاعر ہیں جنھوں نے دانائے راز کا رول اختیار کرنے اور روشن خیال معلم اخلاق کی ڈھیلی قبا پہننے سے صاف انکار کر دیا وہ جانتے تھے کہ اپنی ہی آگ میں جلتے ہوئے بگولے کے سامنے نظارۂ گلستاں کی بات نہ دلاسا ہے نہ ترغیب، محض تمسخر ہے، عقائد کی شکست کے بعد عقائد کی بلند بانگ باتیں خود فریبی ہیں اور ایسی خود فریبی میں مبتلا رہتے۔ اگر ان کی بنیادی دلچسپی محض عقائد آدرشوں میں ہوتی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ان کی بنیادی دلچسپی زندگی میں ہے۔ زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ہے۔ اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ نیا موڑ کونسا ہے اور سفر کے اس مرحلے میں آدمی پر کیا بیتی ہے۔ آدمی پہ جو کچھ بیتی تھی اور بیت رہی تھی اس کی کہانی نئی شاعری کے اوراق پر منظور تھی۔ جاں نثار نے نئے احساس کو نئی شاعری کے ذریعہ پہچانا وہ زندگی بھر عقائد اور ایمان کی شاعری کرتے رہے تھے۔ لیکن شکستِ خواب، بے یقینی اور تشکیک کے احساس کے اظہار کے لئے جس زبان اور فارم کی ضرورت تھی اسے وہ ڈھونڈھ نہیں پائے تھے۔ جاں نثار کی شاعری کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے کسی بھی اسلوب شعر کو بطور فیشن کے نہیں اپنایا۔ انہوں نے فیض، راشد، میراجی یا سردار جعفری کے اسلوب میں شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مدت دراز تک روایتی اسلوب کے پابند رہے اور جب اپنا انفرادی لب و لہجہ پیدا کیا تو وہ اسی اسلوب میں تھا اسی طرح یہ بھی قرینِ قیاس نہیں ہے کہ وہ جدید شاعری کے اسلوب کو اپناتے۔ لیکن نئی غزل ایک نئے احساس کی ترجمان تھی اس لئے غزل کے ڈکشن، امیجری اور موضوعات میں انقلابی تبدیلیاں کی تھیں وہ فارم کے معاملے میں RELAXED تھی اور موضوع کے معاملے میں تو دور دور تک ہاتھ پھیلائے تھی۔ غزل کا آرٹ اشاروں کا آرٹ ہے اور جاں نثار کا نئی دنیا کا مشاہدہ کوئی ایسا منتظم، دانشورانہ اور فلسفیانہ رویہ ترتیب نہیں دے پایا تھا کہ وہ نظم کے مسلسل مربوط اور وسیع

پیدا ہوا جب کہ ترقی پسندوں کی تو آدھی زندگی خواب دیکھنے میں بیتی۔ یہ تجربہ جاں نثار کا شخصی ہے اور اس کا بیان وہ اپنی ذات کی مناسبت ہی سے کرتے ہیں۔

پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا، اور اب
ایک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھئے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

کیا سوچ ہے میں رات میں کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے، جو مجھ سے سوالات کرے ہے

افق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

گفتگو کے یہ آداب کہ مختلف تجربات میں اپنائیت اور فاصلہ کا فرق ملحوظ رکھ کر لب و لہجہ کو اختیار کیا جائے۔ فن کارانہ شخصیت کی ایسی پختگی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جو کم یاب اور قابلِ رشک ہے۔ جاں نثار اپنے غم کا بیان نظم و ضبط اور غمِ دوراں کا بیان دل گداختگی سے کرتے ہیں۔ وہ خود ترحمی، جذباتیت اور اعصاب زدگی سے بلند ایک پُرسکون سطح سے گفتگو کرتے ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز اس وقت ایک دانش مند کا پروقار اور پُرسکون لہجہ اختیار کر لیتا ہے جب دنیا کی ہنگامہ آرائیاں ایک کھیل ایک تماشا، ایک میلا نظر آنے لگتی ہیں

جو ایک سمت گماں ہے، تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں

یا پھر شاعر کی ذات "اضطرابِ وقت" کے مشاہدے میں اس قدر گم ہوگئی ہے کہ شعر بے قرار دل کا نہیں بے قرار وقت کا ترجمان بن گیا ہے۔

ہر ایک شخص پریشان و دربدر سا لگے
یہ شہر مجھ کو تو یارو کوئی بھنور سا لگے

کسے پتا ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے

وہ تند وقت کی رو ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکیں
ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے

اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جاں نثار اپنی شخصیت کی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے ایک بدلی ہوئی نئی دنیا کے احساس کو پانے میں کامیاب ہوئے ہیں انہوں نے جدیدیت کی پذیرائی نہیں کی مزدوری نہیں کہ کریں۔ فی الحقیقت جدیدیت کی ہر لونگ کو قبول کرنا منتعلیق کلاسیکی مزاج کے لئے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن انہوں نے جدیدیت کے سفر کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا ہے، کیونکہ بالآخر یہ حیثیت آدمی ہی کی ہے اور آدمی اور زندگی میں انہیں دلچسپی ہے — جہاں دوسروں کو جدید شاعری میں کرتب بازیاں نظر آئیں وہاں جاں نثار نے ایک TOPSY TURVY صورت حال کا نقشہ دیکھا۔ یہ صورت حال ان کی نہیں اسی لئے جاں نثار جدید شاعری کی طرح اس کا بیان ذاتی تجربہ کی شخصی زبان میں نہیں کرتے۔ وہ اس معنی میں جدید شاعری نہیں کر رہے ہیں جس معنی میں جدید شاعر جدید شاعری کر رہے ہیں وہ شاعری اپنی ہی کر رہے ہیں لیکن یہ شاعری اس غم سے پیدا ہوئی ہے جو جدید شاعر کی شاعری میں جدید انسان کے PREDICAMENT کے مشاہدے کا نتیجہ ہے جاں نثار کڑی دھوپ میں سہی لیکن وہ وہاں نہیں ہیں جہاں جدید شاعر ہے ——— اور جہاں سورج سوا نیزے پر ہے۔ لیکن ان کا انسان دوست دل اس منظر کو دیکھ کر دہل گیا ہے۔ انہوں نے جدید شاعر کے غم کو سمجھا ہے۔ وہ اس میں شریک ہیں لیکن اسے اپنایا نہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری جدید شاعری کی ریس نہیں ہے۔ ان کی اپنی شاعری ہے۔ اس نکتہ کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے ورنہ وہ لوگ جو جدیدیت سے بدکے ہوئے ہیں کہتے پھریں گے کہ اچھی جدید شاعری بھی ایک ترقی پسند شاعر جاں نثار ہی نے کی۔ جدید شاعری کی لسانی توڑ پھوڑ کے مقابلہ میں ان کا رچا ہوا شگفتہ اسلوب ایسے بیانات کے لئے راہ کشادہ کرتا ہے۔ جاں نثار ظفر اقبال یا عتیق اللہ کی طرح عہد حاضر کے جہنم زار کا بیان بطلے بھنے واحد متکلم کے صیغہ میں نہیں کرتے بلکہ جیسا کہ محولہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے وہ اپنی ذات کو یا تو الگ کر لیتے ہیں یا مٹا دیتے ہیں لیکن چند تجربات ایسے ہیں جو ان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً خوابوں کی شکست یا یقین و عقیدہ کا انہدام — جاں نثار سراب سے باہر نکل آئے ہیں اور حقائق کو برہنہ شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان کا یہ تجربہ جدید شاعر سے بھی زیادہ شدید اور تلخ ہے۔ کیونکہ جدید شاعر تو خوابوں اور عقائد کی شکست کے بعد

سی ایل۔ کاوش

زیرِ لب کوئی سُناتا ہے۔

جاں نثار اختر کا نام پہلی بار اُس زمانے میں سُنا تھا۔ جب مسلم لیگ دو زبانوں اور دو قوموں کا نعرہ لگا رہی تھی۔ مُسلم لیگ انگریزوں کی حمایت اور ہندی کی مخالفت پر کمر باندھ چکی تھی۔ انہیں دنوں ہم نے اردو سبھا بنائی ہم اردو کی حمایت اور انگریز کی مخالفت کرتے تھے۔

سن ۳۹۔۴۰ کی بات ہے کہ لاہور اردو کا گڑھ تھا۔ اُدھر حلقۂ اربابِ ذوق۔ اِدھر حلقۂ اربابِ علم۔ شمس العلماء علامہ تاجور کہا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ذوق کی کمی ہے۔ اُن کے ہاں علم کی وجہ اس کی یہ تھی کہ حلقہ اربابِ ذوق کے اراکین کے ہاں ابہام ایہام تک پہونچ گیا تھا۔ اور اربابِ علم والے ڈاکٹر سر محمد اقبال کو خالص اسلامی فلسفی شاعر ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جبکہ علامہ تاجور اقبال کو شاعرِ مشرق مانتے تھے اور اس کی شاعری کے ہمہ گیر تاثر کے قائل تھے۔

اُردو سبھا میں کسی نے جاں نثار اختر کا یہ قطعہ پڑھا۔

کھو گئے دل میں کتنے ہنگامے
کتنے غم، شادمانیاں کتنی
آج اُس پُر سکوت وادی میں
پُر فشاں ہیں کہانیاں کتنی

کسی نے پوچھا "یہ جاں نثار اختر کس انداز کا شاعر ہے۔؟"

مولانا تاجور نے فرمایا "میں نے اُس کا کچھ کلام دیکھا ہے۔ میری رائے میں جاں نثار اختر زندگی کے حقائق کو سحر کارانہ زبان اور دلگیر انداز میں پیش کرتا ہے اور اُس کا کلام جدید خیالات کا آئینہ دار ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "جدید خیالات کیا ہوتے ہیں۔" جن کو اختر سحر کارانہ انداز میں کہنے کی قدرت رکھتا ہے۔"

مولانا نے مسکرا کر کہا۔

بدلتے رہتے ہیں بس نام اور تو کیا ہے
ہزاروں سال سے اِک انساں چلے ہے میاں
وہ ایک لمحۂ حیرت کہ لفظ ساتھ نہ دیں
"نہیں چلے ہے نہ ایسے میں، ہاں، چلے ہے میاں"

لیکن پچھلے پہر کی غزلوں کے تمام اشعار "اضطرابِ وقت" کا آئینہ نہیں ہیں۔ حکایاتِ دل بھی ایک نئے بانکپن کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔ وہ EROTICISM جو جاں نثار کی شاعری کو ہمیشہ ایک آنچ دیتا رہا ہے۔ زیادہ شوخ رنگ میں ان غزلوں کو پُرنشاط بناتا ہے۔ حواس کو چھونے والے پیکر، مرقع سازی اور تصویر کشی اور کردار سے عشق کی بذلہ سنجی اور شوخ بیانی غزل کے عشقیہ اشعار کو ایک ایسا منفرد حسن عطا کرتے ہیں جو جدید غزل میں کم یاب ہے۔ "پچھلے پہر" کی غزلوں میں فکر و نظر، مشاہدہ اور تجربہ، شیوۂ بیانی اور بانکپن کے اتنے انداز ہیں کہ ہر صاحبِ نظر اس پر ایک نئے زاویے سے قلم رانی کر سکتا ہے میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ بغاوت جب جھجک کا شکار ہوتی ہے تو منفرد اور بڑا اسلوب مشکل ہی سے ہاتھ آتا ہے۔ جاں نثار نے بھی ایک جگہ کہا ہے۔

ہر مصلحت سے فن کو چھڑاتے چلے ہیں ہم!
وہ ہچکچاہٹیں گئیں، وہ پیش و پس گیا

اور ہچکچاہٹوں اور پیش و پس سے گلو خلاصی میں اس فضا کا بڑا عطیہ ہے جسے نئے ذہن کی بغاوتوں اور ہنگامہ آرائیوں نے آب و رنگ دیا ہے۔ رومان سے انقلاب اور انقلاب سے جدیدیت کی طرف جاں نثار کی شاعری کا سفر ایک ایسی تخلیقی توانائی کی نشان دہی کرتا ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ کا چیلنج قبول کرتی ہے۔ آدرش اور عقیدے آتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ خواب چکنا چور ہو جاتے۔ تحریکیں ابھرتی ہیں اور دم توڑ دیتی ہیں۔ تہذیبیں ابھرتی ہیں، تمدن مسمار ہوتے ہیں اور تاریخ ہر آن نیا موڑ لیتی ہے اور نئی کروٹ بدلتی ہے۔ فنکار وہی بڑا ہے جو اس توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت اور اتھل پتھل کے بیچ تخلیق کی جوت جلائے رکھے۔ سوائے اس جوت کے اس کا کسی چیز پر اقتدار نہیں اور سوائے اس جوت کے اس کا کوئی سرمایہ نہیں۔

جاں نثار اختر نے سویرا کے عنوان سے نظم کہی۔
روس اتحادیوں میں شامل تھا۔ ہٹلر نے ماسکو کا محاصرہ کیا اور شکست کھا کر پلٹا تھا۔
اور جاں نثار اختر نے کہا۔

افلاس کی بے رنگ آنکھوں میں اُمید کی لالی چھلنے لگی
مزدور کے سادہ ماتھے پر گل رنگ شفق لہرانے لگی
رنگین کرن بل کھانے لگی

ادھر ہندوستان میں آزادی کی تگ و دو تھی۔ جناح بٹوارے کے درپئے تھے۔ گاندھی جی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں تھے۔
دونوں کی ملاقات ٹھہری اور جاں نثار اختر نے کہا۔

"بچھڑے ہوئے ساتھی مدت کے لو آج گلے پھر ملتے ہیں"
لو پھر سے بہاریں لوٹ آئیں، لو پھول دوبارہ کھلتے ہیں
اب تک جو گریباں چاک رہے۔ وہ آج گریباں سلتے ہیں
پھر پریم بھرے جے کاروں سے گردوں کے انگارے ہلتے ہیں"

بچھڑے ہوئے ساتھی ----------------

یہ ساتھی مل کر پھر بچھڑ گئے، نتیجہ دیش میں ایک لکیر ـــــ بٹوارہ۔ پاکستان زندہ باد اور اکھنڈ ہندوستان کے نعروں کے بیچ عوام تقسیم ہو گئے۔ سرمایہ دار ہوشیار تھا۔ وہ تبادلے میں صحیح سلامت بچ گیا۔ عوام بچارے سادہ لوح، نردوں کی طرح بٹ گئے۔ ہر شاعر اس خونی آزادی سے متاثر ہوا۔
کسی نے کہا۔

"یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں"

کوئی بولا۔

"یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر۔"

کسی نے چیخ ماری۔

"بہار اس شرط پر آئی چمن تقسیم ہو پہلے"

مگر جاں نثار اختر نے کہا۔

کچھ ہو اُمید کی سینے میں جھلک آج بھی ہے
دل میں بجھتے ہوئے شعلے کی چمک آج بھی ہے

"جدید خیالات وہ ہوتے ہیں۔ کاوش اجو تم جیسے بڈھے پسند نہیں کرتے اور میرے جیسے جوان بلکہ نوجوان سن کر تڑپ اٹھتے ہیں۔"

پوری مجلس قہقہہ زار بن گئی۔ میں جھینپ گیا۔

مولانا نے سمجھانا شروع کیا۔

ندرت اور جدت ایک شاخ کے دو پھول ہیں زندگی ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ اس کی نئی کرنیں پڑتی ہیں۔ شاعر ترقی پسند وہ ہے جو ہر روز طلوع کے ساتھ نئے احساسات کا تجربہ کرتا ہے۔ قدامت پرستوں کو ہر روز پھول کے اوپر بلبل ہی نظر آتا ہے۔

شمع جلتی نہیں آج کل بجلی کا بلب جلتا ہے۔ وہ بھی بند کر دیتے ہیں۔ اس شاعر کو پھر بھی پروانہ نظر آتا ہے۔ اور اس کے پر بھی جلتے ہیں اور گر کر عشق پر قربان بھی ہو جاتا ہے۔ واردات کا احساس شاعری ہے۔ ہمارے چاروں طرف درد ہے۔ اس کو محسوس کرنا یہ جدید شاعری ہے۔ احساس کے ان تاروں کو جو انسان کے اندر ہیں اور کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اُن کو جو چھیڑ دیتا ہے وہی جدید شاعر ہے"۔ زمانے نے کروٹ لی ہٹلر نے انگریزوں کے پر کاٹنے شروع کئے۔

اور انگریز اپنے دفاع کے لئے دنیا سے اپیل کر رہا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے فرمایا۔

"دیر سے بیٹھے ہو نخل راستی کی چھاؤں میں

کیا خدا نا کردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں

ساحر لدھیانوی تاج محل میں کھڑے اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے نئی جگہ کی تلاش میں تھے۔ اور فیض احمد فیض کہہ چکے تھے۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

خان صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری گیت گا رہے تھے۔

"میں تو چھوڑ رہے کو بھرتی کرا آئی رے"

فیض۔ حفیظ۔ تاثیر۔ چراغ حسن حسرت۔ اور اُس زمانے کے اساتذہ شاعر نہ رہ کر پروپیگنڈسٹ ہو گئے تھے۔

رومانی شاعر اختر شیرانی نے کہا تھا۔

"اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا"

روس کے ساتھ اتحاد ہو گیا۔ کمیونسٹ شاعر بھی دو شعبوں میں بٹ گئے۔ کچھ کیپٹن اور میجر ہو کر انگریز کے نوکر ہو گئے کچھ ہم جیسے لوگ جیلوں میں چلے گئے۔

جاں نثار اختر کمیونسٹ تھے۔ ترقی پسند شاعر تھے۔ پروفیسر تھے۔ گوالیار کالج میں پڑھاتے تھے شعر کہتے تھے ان کی شاعری اُس وقت جوانی کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنگ ختم ہو گئی۔

ساتھ دو شاعر اور تھے۔ ساحر مجھے ملے۔ اور میرا تعارف کرایا۔ مجاز ہیں۔ اور یہ جاں نثار اختر۔
میں نے اختر کو سر سے پیر تک دیکھا۔ کرتہ پائجامہ اوپر ایک جیکٹ تھی۔ بال بڑے بڑے لیکن خشک، آنکھیں چھوٹی مگر اُن میں ایک خمار اور ساتھ ہی ویرانی بھی تھی۔
میں سر سے پیر تک اختر کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ جان نثار اختر پروفیسر ہیں۔ نہ پلینٹ، نہ سوٹ، نہ فراک کوٹ نہ فربنا کو دفر کے میرے سامنے کھڑے تھے۔ گم سم چہرے پر ویرانی۔ خلوص مزدور ہوگا مگر دل میں تپاک قطعی نہیں تھا اور مجاز چپ چپ تھے۔
ہمارے کمرے کے آگے کھلا کمپاؤنڈ تھا۔ اس میں سب ٹک گئے۔
دو کمرے چھوڑ کر۔ ایس ڈی۔ برمن بھی وہیں رہتے تھے۔
یزدانی کے جیب میں اٹھنی تھی۔ اُس نے پوچھا "چائے پیو گے؟"
اور ہمارا دل لرز گیا کہ لو بھئی آج تو پورا فاقہ کرنا پڑے گا۔
مجاز نے شاید کہا تھا۔ "چائے بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟"
ساحر نے یزدانی کی طرف دیکھا اور اشارے کنائے میں جانے کیا ہوا۔ کہ پہاڑی کے نیچے سے نشاط کاشمیری بادہ پیے رنگ لے آئے۔ ظاہر ہے بمبئی میں جو کچی کشید کی جاتی ہے۔ اُسے گل رنگ کیسے کہا جائے گا۔ یہ پیسے ساحر نے دیئے تھے۔
جاں نثار اختر سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اور جاں نثار اختر زیادہ بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ ہاں سکے پیمانے کی کھنک بڑھتی جاتی اور جاں نثار اختر زیادہ خاموش ہوتا جاتا تھا۔
کلام سے وہ رومانی شاعر تھا۔ لیکن رومان کہیں اندر ہو تو ہو باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر تو اُس کی پریشانی تھی اور ایک درد تھا جو جاں نثار کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ یہ سب لوگ تو عمر خیام کو یاد کر رہے تھے اور غالب کے اس مصرعے پر گرہ لگا رہے تھے۔
"رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے"
اور یزدانی جام اُٹھائے ہوئے اختر شیرانی کو یاد کر رہا تھا۔

اچھی پی لی خراب پی لی، جیسی پائی شراب پی لی

سب چپ تھے۔ یہ محفل کب اُجڑ گئی پتہ نہیں چلا۔ صبح جب میں اور یزدانی نشاط کاشمیری کے ساتھ یزدانی ریسٹورنٹ میں براؤن اور چائے کا ناشتہ کر رہے تھے۔ تو میں نے یزدانی سے پوچھا تھا۔
"واقعی یہ جاں نثار اختر تھا۔"
"ہاں! کیوں ___ ؟"
"کلام سے تو رومانٹک لگتا ہے، لیکن چہرے سے بہت بجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"
"یزدانی نے کہا فکر معاش۔ اور رنج بتاں ۔ ؟!"
"یہ تو پروفیسر ہے ؟"

"پردۂ ابر میں ہلکی سی دھنک آج بھی ہے
پھول کھلنے کی ہواؤں میں مہک آج بھی ہے"

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک میں صرف جاں نثار کو کہیں کہیں پڑھتا رہا۔ رسالوں میں اکثر کلام چھپتا تھا۔ افکار بھوپال، صہبا لکھنوی کا پرچہ تھا۔ وہ لاہور میں مولانا تاجور کے ہاں آیا کرتا تھا۔ ہم پرچہ مار کر لے جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ خرید کرنے کو پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اور مولانا کی رائے تھی کہ افکار ایک اچھا صحت مندانہ پرچہ ہے۔

ان پرچوں کو پڑھ کر جاں نثار کے بارے میں ہمارے دماغ میں بنا تردد کے ایک ہیولا سا بن گیا تھا۔ ترقی پسند شاعر۔ یوپی کا رہنے والا۔ اور پھر مجاز کی ہمشیرہ کا دولہا۔ اوپر سے پروفیسر۔ ہمارا خیال تھا کہ ہو گا کوئی خوبصورت، کوٹ پتلون اور سر پر ہیٹ پہننے والا، پائپ پیتا ہوگا یا ایک موٹا سا سگار منہ میں رکھتا ہوگا۔ لکھتا تو اردو میں ہے لیکن اس کی زندگی کا اسٹائل خالص انگریزی ہوگا نہیں تو روسی ضرور ہوگا۔ اسٹالن کا مداح ہے۔ سردیوں میں فر کا فراک کوٹ پہنتا ہوگا۔ سر پر قراقلی ٹوپی ہوگی۔ ٹائی گلے میں ٹھاٹھ سے زندگی گزارتا ہوگا

اصل میں یہ سب ہمارے اندازے پنجاب کے کمیونسٹ پروفیسروں کو دیکھ کر لگائے گئے تھے۔

لیکن ۱۹۴۹ء میں جب میں بمبئی آیا اور سائن اسٹیشن کے پاس کی پہاڑی پر یزدانی جالندھری اور مہندر ناتھ نشاط کاشمیری کے ہاں ٹھہرا، تب ایک اتوار کی دوپہر کو میں یزدانی جالندھری اور نشاط کاشمیری ہم تین آدمی تھے۔ اور ہمارے پاس کل سرمایہ تھا آٹھ آنے ہم سوچ یہ رہے تھے کیا ترکیب کی جائے کہ آٹھ آنے میں سب کا پیٹ بھر جائے۔ صبح سے چائے بھی نہیں پی تھی اور یزدان کا ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔

نشاط کاشمیری ہوٹل یونین کے آفس سکریٹری تھے۔ داور یزدان ریسٹورنٹ کے اندر اوپر کیبن میں اُن کا آفس ہوتا تھا۔

ہر روز ہم وہاں جاتے اور ناشتہ کرتے تھے۔ کیونکہ نشاط کاشمیری کو تنخواہ کے ساتھ دو براؤن اور دو کپ چائے کے بھی ملتے تھے۔ وہ ہم مل کر بانٹ کھاتے۔ لیکن اتوار کے دن یہ ناشتہ نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ چھٹی ہوتی تھی اور ہر شام کو یزدانی جالندھری کسی اردو اخبار یا رسالے کے دفتر سے یا کسی فلم کمپنی میں کچھ ڈسکشن کے بعد یا جن کا کام کیا ہوتا تھا ان سے کچھ وصول کر کے لاتے تو ڈنر کھا لیا جاتا تھا۔ ورنہ نشاط کاشمیری کو ہوٹل یونین کے دفتر سے دو تین روپے ایڈوانس لینے پڑتے۔

اُن دنوں میں کام کی تگ ودو میں رہتا تھا۔ بمبئی کی زندگی الاماں آدمی کی جیب میں پیسہ نہ ہو تو گھر سے نکلنا دشوار۔ ہم لوگ اکثر دادر سرکل سے سائن تک پیدل جاتے تھے۔ حالانکہ اُس زمانے میں کنگ سرکل تک ٹرام چلتی تھی اور ٹرام کا کرایہ ایک آنہ ہوتا تھا۔ بس! مگر ایک آنے میں تو براؤن پاؤں آتا تھا۔ اُن دنوں۔

اُس اتوار کی دوپہر کو ہم نے طے کیا کہ ڈبل روٹی کھا لی جائے۔ پھر کل یزدان ریسٹورنٹ میں جا کر صبح کا ناشتہ کر لیں گے۔

یزدانی، میں اور نشاط تینوں سگریٹ پینے والے تھے۔ مگر سگریٹ والے کا اُدھار چلتا تھا۔

نشاط چار مینار کے پیکٹ لے آتا تھا مگر روٹی کا اُدھار سائن میں ممکن نہیں تھا۔ ایسے حالات میں دوپہر کے بعد ساحر لدھیانوی تشریف لائے۔ انکے

عزم کا ثبوت دیا۔ اور سچ جانو میں تمہاری فوقیت کے احساس سے سر جھکا دینے پر تیار ہوں۔

تمہیں کل ہی پیسے روانہ کروں گی۔ تمہیں اس طرف سے واقعتاً سخت تکلیف ہوگی بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے آگاہ کرتے رہو۔

ہاں عصمت آپا کے یہاں ایک آدھ ماہ گزارا کر لو تو اچھا ہے۔ شاہد سے تمہارا پُرانا خلوص ہے۔ اور عصمت آپا کو تمہارے cause سے خلوص ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں پر تم کبھی بار نہ ہوگے۔ اس طرح سے سوچنا تمہاری زیادتی ہوگی۔"

اس خط میں اور بہت سی باتیں ہیں۔

صفیہ جاں نثار اختر سے کہتی ہیں۔

اچھے بُرے وقت گزر جاتے ہیں پریشانی کا مقابلہ عزم اور استقلال سے کرنا اخلاقی بلندی کی دلیل ہے۔ جذباتی طور پر اپنی بے روزگاری کا صدمہ نہ لے بیٹھنا۔ ظاہر ہے اگر تم چاہو تو تمہاری ٹھاٹھ دار ملازمت آج بھی تمہاری منتظر ہے۔"

اختر کو تسلی دے کر اپنے بارے میں لکھا کہ

"میں تم سے علیحدگی کے دن پوری ہمت اور استقلال سے گذار لوں گی۔ کالج کی دنیا اور گھر کی دنیا سبھی کچھ تو میرے لئے اُجڑ گیا ہے۔ مگر اختر بہت سے لوگ تو ہم سے بھی زیادہ پریشانیاں اٹھا رہے ہیں تو ان کی طرف دیکھنا ہوگا۔ اپنے غم کو میں طول نہیں دوں گی۔"

بھوپال کے بارے میں کہتی ہیں۔

بھوپال کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ ہر ایک گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ اور مختلف لوگوں کو مختلف طریقے سے پریشان کیا جا رہا ہے۔ میرے لئے ملازمت کی کوئی صورت ضرور سوچتے رہنا۔ میں ہر چھوٹی بڑی ملازمت کرنے کو تیار ہوں مجھے تمہارے ساتھ رہ کر دُکھ بھی سکھ معلوم ہوگا۔ تم سلطانہ سے اس معاملے کا تذکرہ کرنا، شاید وہ کچھ مدد کرسکے۔ اگر کوئی الٹی سیدھی صورت پیدا ہوسکی تو میں فوراً تمہارے پاس پہونچ جاؤں گی۔ ہاں کپڑوں کی تمہیں تکلیف ہوگی۔ دو پاجامے بے سلے میں نے رکھ دیئے تھے۔ وہ تم عصمت آپا کی بھانجیوں سے سلوا لینا۔ شیروانی کل ہی منگواؤں گی۔ اور تمہیں بھیج دوں گی۔ — اچھا بہت پیار

تمہاری اپنی صفّو

اس خط کو پڑھ کر مجھے اختر کی خاموشی اور اُس وقت کی ویرانی سمجھ میں آئی۔ کچھ شاعر حالات سے متاثر ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے کے درد کا تاثر لیتے ہیں اور کچھ اپنے پس منظر میں سمجھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۹ کا پس منظر عجیب سا تھا۔ ریفوجیوں کی پرابلم کھڑی تھی۔ دلّی میں کہیں کہیں فساد پھوٹ پڑنے کا خدشہ تھا نئی حکومت اس وقت پڑوسی ملکوں سے تعلقات بنا رہی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین راندۂ درگاہ ہوگئی تھی اس کے پیچھے بھی خاص وجوہات رہی ہوں گی۔ ایک تو جو لوگ کرسیوں پر تھے۔ وہ ایک خاص ذہن کے مالک تھے۔ جیسے میراجی دلیپائی (؟) دوسرے سجاد ظہیر۔ جو ترقی پسند گٹ کے لیڈر مانے جاتے تھے۔ وہ پاکستان چلے گئے۔

"ریزائن کر دیا ہے"
"کیوں۔؟"
"کیوں کہ ترقی پسند ہیں۔ یا انجمن سے استعفےٰ دیں یا پھر لوکری سے .... اور یہاں پر اسٹوڈیوز کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ اُدھر بیوی دو معصوم بچّوں کے ساتھ اکیلی ہے۔ ان پریشانیوں میں سے گزرنے والا حساس شاعر زندہ نہیں ہے۔ زندگی کو بھگت رہا ہے۔"
"پریشان تو ہم بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں۔" میں نے کہا۔
"ہم یوپی کے دھان پان نہیں۔ پنجابی ہیں۔ اور یہ کہہ کر کہ۔
"کی فرق پیندا اے۔" گزر کر لیتے ہیں۔ مگر جاں نثار اس فرق پیندا سے بہت دور ہیں۔ یوپی کے لوگ پریشانیوں کو اپنے احساسات سے بڑھا لیتے ہیں اور شاعر تو بیمار آدمی کی دوا لینے جائے تو کوئی تعجب نہیں کہ کفن بھی خرید کر چلا آئے۔"
"قنوطیت کی حد ہے۔" میں نے کہا۔

جاں نثار اختر کی پریشانیوں کو جوں جوں یزدانی جالندھری بیان کرتے تھے مجھے الجھن ہوتی تھی کیونکہ ساحر میرے نزدیک زیادہ پریشان تھے۔ اُس کی والدہ اور خاندان کے لوگ لدھیانہ سے لاہور چلے گئے۔ پاکستان میں۔ ساحر یہاں رہے۔ اور بے کار رہے فلم والے قریب نہیں آنے دیتے۔ اب روپیہ اکٹھا کرے۔ پاکستان جائے اور وہاں پر ترقی پسندوں کی گنجائش قطعی نہیں ہے۔ وہ ایک مذہب پرست حکومت ہے۔ اور ترقی پسند بہت کے حریف کھلے ہی نہ مانے جائیں لیکن مذہب کے مخالف تو سمجھے ہی جاتے ہیں۔

جاں نثار اختر میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔
لیکن میری عادت ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے۔ میں اُس کی تگ و دو میں لگا رہتا ہوں۔ اُس زمانے سے اب تک اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

جاں نثار کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ "زیر لب" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ "زیر لب" جاں نثار کی مرحوم بیگم صفیہ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

صفیہ کا پہلا خط ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس نے آخری خط ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں لکھا ہے۔ اور اُس کے بعد "رہے نام اللہ کا" خط لکھنے والی فراق میں گھل گھل کر ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہو گئی۔

"پہلے خط میں صفیہ نے لکھا ہے۔
شدید انتظار کے بعد خط ملا۔ استعفےٰ میں آج پرنسپل کو نہیں پہنچا سکی۔ وہ جا چکا تھا۔ کل لے جاؤں گی۔

تم نے استعفےٰ دیدیا اچھا کیا۔ ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یونہی ممکن تھا۔ اگرچہ دوسری جانب بھوپال کی زندگی کی سہولتیں اور کالج کی ملازمت کشش انگیز تھی۔
میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی، میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا۔ بہرحال تم نے اپنے

لیکن شاعر ممبئی سے نکل نہیں پاتا۔ جو لوگ بمبئی کی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ فرصت ہوتی ہے تو کرایہ نہیں ہوتا اور کرایہ ہوتا ہے تو فرصت نہیں ہوتی۔ ہاں چند لوگ ایسے ہیں کہ جن کے پاس بیک وقت یہ دونوں سہولتیں ہوتی ہیں۔

۱۰ر مئی کا ایک خط صفیہ نے لکھنؤ سے لکھا ہے۔ جاں نثار نے ایک منی آرڈر بھیجا ہے۔ صفیہ لکھتی ہے۔

صبح ۰.۵۰.۱۲۱.T ملا۔ ابھی ابھی خط پہنچا۔ جس کے جواب میں یہی لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ،، یہی آزمانا ہے تو ستانا کس کو کہتے ہیں۔ ،، میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میرا یہ اعتماد تم کو برہم کر دے گا۔ تمہارے احساس کی نزاکتوں کی ناقدری اکثر میں نے اپنے بھونڈے پن سے کی ہے۔ اور ہر بار تم نے مجھے معاف کیا ہے۔ گو کہ اس اذیت کی تلافی میں نہ کر سکی۔ جو تم نے خود کو پہنچائی ہے۔ یہی کیفیت اس مرتبہ بھی ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ تم مئی میں آؤ گے اور غالباً گھر نہ مل سکنے کی وجہ سے جون میں ہم سب کو بمبئی نہ لے جاؤ گے۔ چنانچہ اگر تم پسند کروگے تو جون کا مہینہ میں حمیدہ وغیرہ کے ساتھ گزار دوں گی۔ اس کا تذکرہ میں نے پورے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ خط میں کر دیا۔ میرے دوست تم پہاڑ کے پتھروں سے بھی رشک و رقابت رکھ سکتے ہو۔

اگر میں نے یہ سوچا ہوتا تو میں تمہیں ہرگز غصہ ہو جانے اور غم کرنے کا موقعہ نہ دیتی۔ بہر حال اب تو مجھ سے قصور ہو چکا۔ تم نظر انداز کرو۔ تین ماہ کس انتظار میں گذر گئے۔ میری زندگی کا ایک لمحہ بھی تمہاری یاد اور تمہارے تصور سے خالی نہ رہا۔ میں نے بھوپال کی بھیانک اور تنہا زندگی تمہارے آسرے کاٹ لی۔ میں کس قدر خوش اور مسرور تھی کہ تم آؤ گے میری سوتی ہوئی تقدیر جاگ جائے گی۔ یہ اندیشہ تک نہ تھا کہ تم اس طرح برہم ہو جاؤ گے۔

میں نینی تال ہرگز نہ جاؤں گی۔ تم اس خط کے پاتے ہی چلے آؤ۔ ورنہ یقین رکھو میں بیس مئی کو تمہارے پاس پہونچ جاؤں گی۔ پھر تمہیں کس طرح ہم سب کو رکھنا پڑے گا۔ یہ میں نہ سوچوں گی۔

۱۲ر مئی کو صفیہ نے پھر خط لکھا اور جاں نثار بمبئی سے روانہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔

۱۳ر مئی سے ۲۳ر مئی تک اختر لکھنؤ رہے۔

۲۳ر مئی میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ پھر ۲۳ر مئی کو صفیہ۔ اختر کو اسٹیشن پہونچا کر گاڑی میں بٹھا کر گھر آئی ہے تو بچوں کے سامنے نہیں بلکہ غسل خانے میں جا کر اس نے ڈھیروں آنسو بہائے ہیں۔ اس نے اقرار کیا۔ ،، میں غسل خانے میں نہانے کے بہانے ڈھیروں آنسو بہا چکی ہوں۔ مگر پھر بھی طبیعت ہے کہ امڈی چلی آتی ہے۔ تم سے دور میں نہ رہ سکوں گی تم مجھے اپنے پاس بلانے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

جون میں اگر تمہارے آسکنے کا خفیف سا بھی امکان ہو تو مجھے ضرور لکھو! میں تمہارا انتظار کروں گی۔

اختر! جون میں پھر دس بارہ دن کے لئے نکل آؤ۔ میرے دن سہل ہو جائیں گے۔ اعصاب پر ایک عجیب وحشت طاری ہے۔ گھر کی ہر چیز جو تم سے وابستہ تھی تمہارے اس طرح جلدی چلے جانے پر فریاد کرتی نظر آتی ہے۔

بہت سے پیار میرے پردیسی ساجن

تمہاری دل شکستہ۔ صفیہ ،،

کرشن چندر کی فلم "سرائے کے باہر" فلاپ ہو گئی تھی۔ وہ ورسوا میں رہتے تھے اور ہر ترقی پسند جو بھی ادھر اُدھر سے آتا۔ وہاں ڈیرا ڈال دیتا۔ کرشن چندر کے اپنے حالات بھی خوشگوار نہیں تھے۔ اُن کے اللّے تللّوں کی وجہ سے بیوی اُن کی ناخوش رہتی تھی۔ وہ سوائے اس کے کہ۔

آؤ سجنوں ٹھہر جاں۔ کھاؤ اپنا اور سُرخ لکیروں کو ابھارو" اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُدھر شاید سینٹرل گورنمنٹ کا ایک سرکلر شائع ہوا کہ جو لوگ سرکاری ملازمتوں میں ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے اپنا ناطہ توڑ لیں۔

صفیہ کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ بھوپال میں اس سرکولر کا اثر زیادہ گہرا ہوا۔ گرفتاریاں ہوئیں تلاشیاں ہوئیں۔ اختر بھوپال سے نکلے تو بمبئی آ گئے۔ عصمت آپا کے ہاں ہی ٹھہرے ہوں گے۔ کیونکہ مجاز اور ساحر لدھیانوی تو کرشن چندر کے یہاں ورسوا میں تھے۔ جاں نثار نے سوچا ہو گا اتنے آدمیوں کے بیچ کہاں ڈیرا ڈالوں گا۔ اب دو راستے تھے۔ یا تو اُس اچھی خاصی نوکری کو تلانجلی دیدیں۔ یا پھر اپنے ایمان کو چھوڑ دیں۔ ترقی پسند جاں نثار اختر کا ایمان معلوم ہوتا ہے انہوں نے استعفیٰ بھجوا دیا۔ اور بمبئی کی مشینی زندگی میں پسنے کو تیار ہو گئے۔ حالانکہ ان کے کئی ساتھی (صہبا لکھنوی) اس ترقی پسندی سے الگ ہٹ گئے تھے۔ اور دوسرے لوگوں کا آزمودہ راستہ اور بھی تھا کہ پاکستان چلے جائیں۔ اختر کی بہن اور والدہ پاکستان میں تھیں۔ والدہ کے انتقال کی خبر بھی صفیہ نے ہی دی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کل خط آیا کراچی سے اماں ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں اور ہم ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکے۔ اختر کی زندگی صفیہ کے خطوط سے ہی اُجاگر ہوتی ہے ورنہ اختر اپنی زندگی کے بارے میں ہر جگہ خاموش ہے۔

۱۹۴۹ء سے اختر کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ ورنہ زندگی بھر تو انہوں نے کوئی مصیبت نہیں اٹھائی بڑے خاندان کے لڑکے ہیں۔ باپ بھی شاعر، سیشن جج۔ حضرت مضطر خیر آبادی۔ مضطر خیر آبادی کا کلام ہر اردو داں کی زبان پر ہے۔ علی گڑھ میں پڑھے۔ پڑھنے کے فوراً بعد گوالیار میں نوکر ہو گئے۔ اور پھر بھوپال چلے گئے۔ اقتصادی الجھنوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔

اختر کی لگی بندھی نوکری تھی۔ سلیقہ شعار بیوی وہ بھی پڑھی لکھی، دونوں پروفیسر ایک ہی کالج میں پڑھاتے ہیں، وہ بھی ادیبہ ہے اور ترقی پسندی کی طرف مائل۔ ان کا بھائی بھی ہندوستان گیر شہرت کا مالک اور ترقی پسند۔ لہٰذا کبھی کسی تضاد سے سابقہ نہیں پڑا۔ مگر زندگی کے اس دوراہے پر عجیب تذبذب سے گذر رہے ہوں گے۔ بہرحال گذر گئے اور پھر بمبئی میں جس پریشانیوں سے گزرے وہ حالات انہوں نے کبھی بیان نہیں کئے۔ اور نہ کبھی ماتھے پر شکن ہی ڈالی۔ نہ اپنے کئے پر افسوس ہی ہوا۔ لیکن حالات کتنے دگرگوں تھے یہ صفیہ کے خطوط ہی سے آشکارا ہوتے ہیں ہر تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ جاں نثار کے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے۔ پہننے کو کپڑے بھی نہیں ہیں۔ یہاں کے پروڈیوسر کام دیتے ہیں تو پیسے نہیں دیتے اور پیسے دیتے ہیں تو اتنے کم کہ انسان باعزت طور پر زندہ نہیں رہ سکتا شاعر حالات میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ بیوی کے خطوط کو بھی دھیان سے نہیں پڑھ پاتا۔ صفیہ ملنے کو تڑپ رہی ہے دسمبر سے لے کر مئی تک دونوں الگ ہیں۔ دونوں میں بے پناہ محبت ہے مگر حالات نے بیچ میں فراق کی خلیج حائل کر رکھی ہے۔

بھوپال کا کالج بند ہو رہا ہے۔ صفیہ بچوں کے ساتھ لکھنؤ جا رہی ہے۔ اختر کو لکھتی ہے کہ۔ تم لکھنؤ آجاؤ۔ ہم کچھ دن اکٹھے رہ جائیں گے اور وہ پروگرام بناتی ہے کہ نینی تال بھی گرمیوں میں چلیں گے۔

کیونکہ جاں زندگی میں پہلی بار محبّت کی چمک دیکھی تھی وہ لڑکی شادی کر کے سسرال جا چکی تھی۔ یہ عشق بچپن کا تھا۔ شاید اختر انٹرمیڈیٹ میں پڑھتے تھے۔ وہاں بھی شادی ہو سکتی تھی مگر ہوئی نہیں وجہ اتنی تھی کہ اختر اس وقت پڑھتے تھے۔ کمانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ عشق کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں مگر زندگی کے اپنے تقاضے زیادہ شدید تھے۔ اس لئے عشق تو ہوا مگر ہو کر رہ گیا۔ تکمیل نہ پا سکا۔ اور شاعر نے دل کی بھڑاس یوں ایک نظم کہی:- "بے زاری"۔

رات اور یہ چاند تاروں کے نشاں
تیرگی اور ٹمٹماتا آسماں!
اُکھڑ رہا ہے دل سے رہ رہ کر دھواں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اس نظم کا ایک بند ہے۔

یہ ستارے، یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک بے اُمّت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ نظم چودہ بندوں پر مشتمل ہے۔ بڑی جذباتی ہے اور روایات کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس نظم کو مجاز کی نظم "آوارہ" کا مخرج بتایا ہے۔
اس کا ایک بند ہے۔

دل تو دل ہستی لٹا بیٹھا ہوں میں
گھر تو گھر، دنیا لٹا بیٹھا ہوں میں
اب تو اُن کو بھی بھلا بیٹھا ہوں میں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

حضرت جوش ملیح آبادی نے یہ نظم سن کر ایک بار کہا۔ مجھے کبھی کسی کے کلام پر رشک نہیں ہوا۔ مگر جاں نثار اختر کی اس بے زاری پر مجھے رشک آتا ہے۔ کاش یہ نظم میں نے کہی ہوتی۔
اس نظم کا تعلق بھی پیکر ناپید سے تھا۔

جاں نثار اختر صفیہ کا شوہر تو ہے ہی اُن کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کا محبوب ہے معشوق ہے۔ اور وہ اُن کے لئے کس کس طرح پریشان ہوتی ہے اس کی خوشی کے لئے کیا کیا کرتی ہے۔
یہ معشوقانہ انداز اختر میں آج بھی موجود ہے۔
جب ساحر بمبئی میں آکر کامیاب ہو گئے۔ تب جاں نثار کے وہ بھی ناز اُٹھاتے تھے۔ جاں نثار اختر پروڈیوسر بن گئے۔ مگر شاعر۔۔۔

آدمی جس کو تن بدن کی خبر نہیں۔ وہ فلم بنائے تو کیونکر۔ اور اس کا حساب کتاب رکھے تو کیونکر۔ پھر بھی ایک فلم بنائی۔ نام تھا "بہو بیگم"۔ اُس میں بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ مگر لٹ گئے۔
بھلا جس کے پاجامے اُس کی بیوی سلوا کر بھوپال سے روانہ کرتی ہو۔ جس کے کرتے اور شیروانی کا حساب صفیہ کے پاس ہو۔ وہ فلم بنا کر کامیاب کیسے ہو سکتا ہے۔۔
اختر نے زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد نہیں کی۔ جو جد و جہد کی وہ شاعری کے لئے۔ ترقی پسندی کے لئے مارکسزم کو پڑھا اُس کو سمجھا۔ اُس کے نظریے کو شعروں میں ڈھالا اور بس!
حتیٰ کہ صفیہ کی شادی کے لئے بھی کوئی ارادہ نہیں کیا۔ مجاز سے دوستی تھی۔ دوستی بھی گہری لیکن یہ تجویز کہ صفیہ سے شادی کر لو اُس کے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔
صفیہ کو اختر نے پہلی بار علی گڑھ میں ہی دیکھا تھا۔ اختر ۱۹۴۰ء میں گوالیار میں نوکر ہو کر جا چکے تھے پھر کسی کام سے علی گڑھ گئے۔ تو گرلز کالج میں ان کے رشتے کی ایک بہن سلمیٰ پڑھتی تھیں۔ سلمیٰ اور صفیہ دونوں ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ سلمیٰ امتحان دے کر جا چکی تھیں اور صفیہ وہاں تھی۔
صفیہ کے گھر پر لکھنؤ میں وہ کئی بار جا چکے تھے۔ اُس زمانے میں صفیہ پردہ کرتی تھیں۔ لیکن صفیہ نے سوچ سمجھ کر پردہ اتار پھینکا تھا۔ اور اختر کو یہ معلوم بھی نہیں تھا۔ اختر نے سوچا چلو صفیہ سے معلوم کرتا چلوں۔ اتنا تو پتہ چل جائے گا کہ سلمیٰ کے پرچے کیسے ہوئے ہیں۔ دہلیز کے اندر سے پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر وہ بات کا جواب تو دے ہی دے گی۔ دوست کی بہن ہے۔
مگر وہاں تو پردہ ہی غائب تھا۔ اختر باہر لان میں بیٹھے تھے۔ کہ صفیہ اندر سے نکل کر آئیں اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ بات چیت کر کے اختر چلے آئے۔
نہ کوئی عشق کا تاثر لیا۔ نہ شاعرانہ حس ہی پھڑکی۔
صفیہ اُن دنوں علی گڑھ کے بی۔ ٹی کالج کی لکچرار ہو چکی تھیں۔
دونوں کے بیچ موضوع سلمیٰ اور مجاز ہی تھے۔
چونکہ اختر گوالیار میں نوکر ہو چکے تھے۔ اس لئے والدہ نے شادی کے لئے اصرار کیا۔ اور کہا لڑکی تم خود تجویز کر لو۔
اختر شادی کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔

آ کے مشعل سے تری میں بھی جلا لوں مشعل
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

اور پھر صفیہ علی گڑھ سے گوالیار آئی آگ بھڑکتی سمٹتی رہی۔ چھٹیوں میں صفیہ گوالیار آجاتی۔ دسمبر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک مِل مِل کر بچھڑتے رہے۔ ایک جگہ گھر بنانا نصیب نہیں ہوا۔

مگر ۱۹۴۷ء میں جب گوالیار سے بھوپال منتقل ہوئے تو صفیہ کو بھی وہیں بھوپال میں پروفیسری مل گئی۔ اور اب ان کا گھر بس گیا مگر کب تک۔

۱۹۴۹ء میں پھر بچھڑنا اور ملنا شروع ہو گیا۔ ان دونوں کے مقدر میں سکون نہیں تھا۔ صفیہ بچاری تو تڑپتی رہی۔

اکیلا بمبئی میں دوسرا بھوپال میں۔ بیچ کا فاصلہ لمبا ہی ہوتا رہا۔

۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہد اور اختر کے تعلقات میں بال آگیا۔ صفیہ نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ تم کو شدید کوفت ہوئی ہوگی۔ شاہد بچارے ذرا مذبذب آدمی ہیں۔ تمہیں شاید یہ کمزوری پہلے ہی معلوم ہے۔ لہٰذا تم کسی قسم کا غلط اثر قبول مت کرو لمحاتی اور عارضی کوفت کو Reason out کر کے دور کر دو۔ اور شاہد سے جتنے شگفتہ تعلقات تمہارے اس سے پیشتر تھے ویسے ہی رکھو۔ شاہد اور عصمت کی مہربانیاں ہم دونوں کے ساتھ بہت رہی ہیں۔ شکر کرو کہ فی الحال تمہارے تین سو روپئے ماہوار کہیں نہیں گئے۔ اسکے علاوہ کہیں نہ کہیں سے ملتا بھی رہا۔ اور ملتا بھی رہے گا۔ البتہ اپنا Poise قائم رکھنا اور توازن نہ کھونا یہ ضروری چیزیں ہیں۔ تم نے چار مہینے کتنی دقتوں کے ساتھ کیسی خندہ پیشانی سے گزار دیئے۔ پھر اب حالات ہر طرح سے سنبھل گئے ہیں۔

ہاں تم نے جون میں آنے کے بارے میں لکھا ہے۔

اختر میری عادت سی بن چکی ہے کہ تم فیصلہ کرو اور میں اُسی پر عمل کروں۔ اسی میں اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اگر کبھی اپنی مرضی منوا لیتی ہوں تو احساس جرم کی ایک کھٹک باقی رہتی ہے۔ بہر حال تم لکھتے ہو اور حمیدہ گھر بنا لے چکی ہے تو بچوں کے خیال سے چلی جاتی ہوں۔

میں نے جاں نثار اختر سے پوچھا۔ شاہد کے ہاں واقعہ کیا ہوا تھا۔“

”ارے بھئی شاہد کے گھر میں کیا ہوا۔“ میں نے پھر سوال کیا.....

بولا۔ ”کچھ نہیں یار! شاہد نے کہا کہ میرے مہمان آنے والے ہیں۔ تم کب تک یہاں رہو گے؟؟ میں دو چار دن میں اٹھ گیا۔ لیکن مہمان نہیں آئے۔“

”نہیں آئے؟“

”آنے والے ہی نہیں تھے۔“

”تم گئے کہاں۔؟“

”جاتا کہاں۔۔ حالات اچھے نہیں تھے تین سو روپیہ شاہین پکچرز سے ملتے تھے۔ گذارہ مشکل تھا

پھر سے برباد رہا پھر تو بہت میں کوئے ہوس ہیں
آباد بہت مجھ سے رہی بزم خرابات

اِس بزمِ خرابات کی سحر کب ہوئی؟ غالباً گوالیار میں صفیہ سے شادی کے بعد۔

والدہ نے مجبور کرنا شروع کیا، ''شادی کرو۔''
''کس سے کروں''۔؟
''جس کو تم پسند کرو۔''
''کس کو پسند کروں۔''
''جس لڑکی کو چاہو اُس کو پیغام بھجوا دوں گی۔ بیٹے'' والدہ نے کہا ہوگا۔
''چلو اماں! صفیہ سے شادی کر لیتے ہیں۔ اختر نے جواب دیا ہوگا۔
''صفیہ کون۔''؟
''مجاز کی بہن۔''
اماں نے یہ سنا اور پیغام بھجوا دیا۔
مجاز کی والدہ نے اقرار کا خط لکھ دیا۔
اب اختر نے اپنی طنابیں توڑ لیں۔ ''نہیں اماں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑیں گے ہم۔''
لیکن صفیہ پڑھی لکھی لیکچرار تھیں۔
اُس کے والدین نے صفیہ سے پوچھ کر ہی یہ رشتہ منظور کیا ہوگا اب جب ادھر سے انکار ہوا۔ تو صفیہ نے اختر کو خط لکھا۔

اختر کی شادی لکھنؤ میں ہو گئی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو۔
بیس دن کی چھٹی لے کر صفیہ گوالیار آئی تھی۔ اور گھر آباد کر کے پھر علی گڑھ لوکری پر چلی گئیں۔
اختر نے نظم کہی۔ ''حسین آگ''

تیری پیشانیٔ رنگیں میں جھلکتی ہے جو آگ
تیرے رخسار کے پھولوں میں دمکتی ہے جو آگ
تیرے سینے میں جوانی کی دہکتی ہے جو آگ
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

(آخری بند ہے)

بارِ ظلمات سے سینے کی فضا ہے بوجھل
نہ کوئی سازِ تمنا نہ کوئی سوزِ عمل

نتیجہ ہے۔

یوپی کی سہاگن کو شال ہو یا چنری ہو۔ سر کے ڈھلکنے کا کوئی بھی کپڑا ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کے ساجن کا ہو۔ وہاں کے لوگ لاکھ مادہ پرستی کی طرف مائل ہو جائیں۔ مگر ان توہمات کو چھوڑ نہیں سکتے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے اختر کو جو خط لکھا ہے۔ اُس میں بھی سیندور کی چاندی کی کٹوری کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"مجھے وہ دن کل کی طرح یاد ہے کہ اس (صفیہ) کے انتقال سے چند ہی دن پیشتر سجاد ظہیر صاحب کو چار سال کی سزا ہونے کی خبر آئی تھی۔ (پاکستان سے) دوسرے ہی دن اُس نے مجھے اپنے یہاں بلوایا۔ بستر پر پڑی تھی۔ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ اُٹھ کے بیٹھنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ یکایک اُٹھ بیٹھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ لیکن دونوں کے دلوں میں کیا جذبات تھے ایک دوسرے کو خوب معلوم تھے۔ پھر اس نے اپنے سرہانے سے چاندی کی ایک کٹوری اُٹھائی۔ تمہیں معلوم ہے آخری وقت میں اعصاب کے کھنچاؤ کی وجہ سے اس کے ہاتھ ٹیڑھے سے ہو گئے تھے۔ اور کانپتے تھے۔ لیکن اس کٹوری کے اُٹھاتے وقت جس میں سیندور اور افشاں بھری تھی۔ اس کے ہاتھ بالکل نہیں کانپے۔ پھر اُس نے چٹکی میں سیندور اُٹھا کر میری مانگ بھرنی شروع کی۔ ابھی مانگ بھر کے وہ آہستہ سے بولی۔ "آپ کا سہاگ امر رہے رضیہ بھابی! خدا وہ دن جلد لائے۔ جب بھیا خود واپس آ کے آپ کی مانگ بھریں۔"

میں نے اسے ہنستے دیکھ کر کٹوری اس کے ہاتھ سے لے لی۔ لیکن اتنی حرکت کا بار بھی اُس کے جسم ناتواں کے لئے بہت تھا۔ وہ تکیہ پر گر پڑی۔ ایک پل آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"چار سال ـــ لیکن چار سال ـ کچھ نہیں ہوتے ـ کچھ نہیں ہوتے چار سال۔" پھر ذرا مسکرائی اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"رضیہ بھابی! شاید حکمرانوں کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آئے گا کہ ہم لوگ چار سال نہیں، چار سو سال، چار ہزار سال جد و جہد کر سکتے ہیں۔ سالوں کے شمار اور جد و جہد کی رفتار کا کیا مقابلہ ہے؟"

رضیہ سجاد ظہیر کا خط ایک واقعہ ہے لیکن اس میں ترقی پسند تحریک اور ہندوستانی کلچر کی ابھرتی تصویر ملتی ہے۔

یہ سیندور سہاگ کی رکھشا کا نشان ہے۔ صفیہ نینی تال میں بھی یہ چاہ رہی ہے کہ ایک ایسی شال اختر اسے خرید کر دیدے جو اس کی مانگ کی سیندور کو نکھار دے۔ اور نینی تال کی سرد راتوں میں اسے گرما سکے۔ لیکن پھر اس کا دل بھی دکھتا ہے۔

اختر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔

اُس خط میں آگے چل کر لکھتی ہے۔

"اگر تمہیں پیسے نہ مل سکے۔ تو کسی طرح اپنا دل مت دکھانا۔ شال زندگی کے لئے ایسی ضروری چیز نہیں ہے جس کے لئے کڑھا جائے۔"

میں خلیل صاحب کے ہاں چلا گیا۔

خلیل صاحب۔ آرکیڈیا بلڈنگ کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اکیلے تھے۔ فرنیچر کے ڈیزائن بناتے تھے۔ سڑک پر رہنا پڑتا تو بھی نکل آتا وہاں سے مگر صفیہ کے خط نے مجھے Reason out کرنے پر مجبور کر دیا اور میں مسکرا کر تعلقات سیفوائی کر آ گیا۔ شاہد میرا دوست۔ عصمت صفیہ کی سہیلی تھی۔ تعلقات یوں کے توں بنے رہے۔

اختر پریشان حالی میں زندگی بسر کرتا رہا۔ مگر اس نے صفیہ کو بچوں کے ساتھ نینی تال جانے پر مجبور کر دیا تاکہ گرمی میں بچے اور بیوی کو تکلیف نہ ہو۔

مجھے اس مقام پر محسوس ہوتا ہے کہ اب اختر کو صفیہ سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے وہ صرف معشوق تھا۔ اب عشق کی آگ بھی موجزن ہے۔

جس حسین آگ کی اس کو طلب تھی۔ وہ اجاگر ہو گئی۔

ادھر صفیہ نینی تال پہونچکر بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن دل میں برہا کے درد کی کسک ہے۔ وہ کہتی ہے۔

"موسم کی خوش گواری سے بچے بہت مسرور ہیں۔ ان کی مسرت کا خیال کروں تو آنا سپھل ہوتا نظر آتا ہے ورنہ میری نگاہیں تو ہر ذرے میں تمہاری ہی تصویر پاتی ہیں۔ دل میں جیسے ایک چور سا چھپا بیٹھا ہے کہ چٹکیاں سی لئے جاتا ہے۔

دونوں راتیں تمہیں دیکھنے سے وصول ہو گئیں۔ کہیں تم پریشان تو نہیں۔ اختر میں نے دونوں بار تمہیں پریشان ہی دیکھا ہے۔"

یہ صفیہ نے خواب میں کیونکر دیکھ لیا۔ کیسے دیکھ لیا۔ کیوں کہ اختر ان دنوں واقعی بیمار رہیں۔ صفیہ ان کے خط نہ لکھنے کا بار بار ذکر کر رہی ہے۔ ان کے بیمار رہنے کے شکسا میں مری جا رہی ہے۔ اور اختر چپ سادھے ہیں۔

لیکن صفیہ نے محبت کی آنکھوں سے اپنے اختر کو پریشان دیکھ لیا ہے۔

۲۸ مئی سے لے کر دس جون تک جاں نثار نے صفیہ کو خط نہیں لکھا اور اس کی وجہ ہے وہ نہیں چاہتا کہ اپنے علیل ہونے کی خبر وہ صفیہ کو دے کر نینی تال کے خوشگوار موسم کو سوگوار کر دے۔

اختر کا خط نہیں آ رہا۔ صفیہ پریشان ہے پھر بھی اسے اپنے وسوسوں پر یقین نہیں ہو رہا کہ اختر بیمار ہے۔ یہ وہی کھٹک ہے۔ جو ماں کے دل میں اس وقت ہوتی ہے۔ جب بچہ اسکول سے آنے میں لیٹ ہو جاتا ہے۔

آٹھ جون کے خط میں صفیہ نے اختر سے ایک مانگ کی ہے اس نے نینی تال میں ایک شال دیکھی ہے وہ خرید کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے لئے وہ اختر کو لکھ رہی ہے۔ کہ پیسے تم بھیجو۔

اختر کا خاندان اور صفیہ کا خاندان یو پی کا ہے۔ یو پی کے ہندو مسلمان کا ایک اپنا کلچر ہے۔ اس کلچر کی اپنی خوبصورتیاں ہیں۔ نزاکتیں ہیں۔ سہاگ۔ سیندور۔ برہا۔ پیا۔ یہ ہندو مسلمان کے گنگا جمنی کلچر

دوست! تم نینی تال کی سرد ہواؤں کو شک کی نظروں سے نہ دیکھو!

"یہاں تم سے جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظریں"

والا عالم ہے۔ یہاں کتنے ہی شادی شدہ جوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو کہیں بھی وہ رنگ، وہ گرمی، وہ گداز، وہ والہانہ پن نہ دکھائی دیا۔ جو ان سات سالوں نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کر دیا۔ تمہیں اس کی قدر ہے تو مجھے اس سے چوگنی زیادہ ہے۔

اختر! میرے لئے یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں اس امید اور یقین پر خوش ہوں کہ میری زندگی پھر ایک دن تمہارے قدموں کے سائے میں گزرے گی۔ میرے بچے ابھی اپنے شاعر باپ کی تربیت سے محروم ہیں۔ تو یہ دوری ابدی تو نہیں، ان کو تمہارا ساتھ ضرور ملے گا۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی دقتیں کیوں نہ اٹھانی جائیں۔

تمہاری تنہائی کے خیال سے جی کس بری طرح کڑھتا ہے۔ ہر لمحہ خیال دوڑاتی ہوں کہ نہ جانے اس وقت کیا کر رہے ہوگے۔ تمہاری راحت اور آسائش کے لئے اتنی دور سے کیا کروں۔ کھانے کے تم شوقین نہیں۔ پہننے کی طرف سے تم بے خبر ہو، پھر اور کیا رہ گیا؟ بہرحال تمہارے لئے کشمیری سلک ضرور لوں گی۔ اور لکھنؤ سے کرتے سلوا لوں گی۔

اور کیا لکھوں؟ یاد کرو ہفتوں ہماری گفتگو ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔"

زیر لب کے یہ خطوط مئی سے جون تک بے حد شدید ہیں۔ خطوط پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اختر صفیہ کے اس درد سے خود گزر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے صفیہ اس کے لئے بے قرار ہے۔

شادی سے پہلے اختر کی زندگی کچھ تو آوارہ تھی۔ "بے نیازی" نظم سے یہ پوری طرح ہوتا ہے کہ شاعر ایک فرسٹریشن سے گزر رہا ہے۔ پھر اختر نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ وہ شاہد اور شراب کا رسیا ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ صفیہ سے لوٹ کر محبت کرنے لگا۔ صفیہ نے اسے محبت کرنا سکھا دیا۔ یہ کچھ دوستوں کا کہنا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے نہیں۔ بلکہ اختر کے اندر ایک پیاس تھی جو شاعر کو عموماً ہوتی ہے۔ کوئی اسے چاہے۔ یہ بچے کی سی طلب ہے۔ وہ پیار مانگتا ہے۔ بچہ پیار پا کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب کی ممتا کو تڑپاتا بھی ہے۔ لیکن شاعر ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ کسی کو بے چین نہیں دیکھ سکتا۔ اور خود بے چین رہتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ اس کی شاعری درد سے عروج پاتی ہے۔ اگر اختر کے اس دور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ اختر کی شاعری کے زخم رسنے لگے ہیں

دیکھ جا آکے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

زیر لب کے خطوط بھی اس عرصے کے بے حد دردناک اور بے حد رومانی ہیں۔ فراق کی سیاہ راتوں کا ذکر ہے۔

رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ ۲۹ جون کا خط بہت تاثر رکھتا ہے۔ جاں نثار اختر کے ایک خط میں لکھا ہے۔

ویسے رشید صاحب نے ان خطوط کے بارے میں

" ان خطوط کے مطالعہ سے مرحومہ کی بے شمار خوبیوں کی طرف ذہن جاتا ہے جن کا اس وقت احاطہ

اختر نے اپنی بیماری کی خبر تو نہ دی لیکن شال کے لئے روپئے بھجوا دیئے۔ دوستوں کے آگے اُس کا ہاتھ نہیں پھیلتا۔ پھر بھی دو روپے بھیج دیتا ہے۔

اور صفیہ شال خرید کر پریشان ہو جاتی ہے۔ خوشی اور غم دونوں ایک ساتھ اُسے دبوچ لیتے ہیں۔

۱۱ جون کو اختر نے خط لکھا ہے۔ کہ میں کچھ علیل تھا۔ اب تندرست ہوں۔

صفیہ نے لکھا ہے۔

اختر عزیز!

کل شام کتنے شدید انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ تمہاری بیماری کی اطلاع سے اور تشویش ہو گئی۔

میرے خواب غلط نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ تم پریشان ہو گے۔ شکر ہے اب بخار گیا۔ کھانے پینے کی طرف سے بے خبر نہ ہونا۔ مشیت نے کتنا زبردست فاصلہ ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا ہے۔ مگر دل سے تو ہم دونوں اس درجہ نزدیک ہیں جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے تھے۔ تمہاری بیماری کی راتوں میں اگر میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ تو یہاں تکیہ آنسوؤں سے ضرور تر کیا ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ خود کو اس طرح دل شکستہ مت ہونے دو۔ تمہارا کوئی لمحہ بھی میری شرکت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کو اگر سچ سمجھ سکو تو تمہیں بہت تسکین ہو گی۔"

خط آگے بڑھتا ہے۔ بیوی جانتی ہے۔ شوہر جام و مینا کے شوقین ہیں۔ کہتی ہے۔

"نینی تال سے تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں۔ دعوت شیراز کا انتظام مکان سے حد درجہ قریب ہے آتے جاتے تمہاری یاد ضرور آتی ہے۔

اختر میرے سکون کی خاطر خود کو خوش رکھو اور زندہ رکھو۔ —— تمہاری سوگواری میرے لئے کسی طرح قابل برداشت نہیں ہوتی تم خود کو اس طرح مضمحل نہ کرو۔ پڑھو۔ شعر کہو۔ تفریح کرو۔ وہ دن بھی آجائیں گے۔ جب پھر میں تمہارے قدموں میں آ رہونگی اور پھر کوئی ظالم قوت بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے گی۔

کل پھر خط لکھوں گی۔ اور ہر روز تمہیں میری ایک تحریر ملتی رہے گی۔ شاید تمہاری طبیعت اس طرح بہل سکے گی۔

بہت سے پیار —— تمہاری صفو!

ایسا خط سے مترشح ہوتا ہے کہ اختر بھی ملنے کیلئے بے تاب ہیں۔ انہوں نے لکھا ہوگا۔ "تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں۔"

۱۴ جون کے خط میں اختر کی صفو نے کہا ہے۔

"میں دو دن سے وعدہ کے باوجود خط نہیں لکھ سکی۔

بارش نے عجیب بدمزگی پیدا کر رکھی ہے۔ پھر چونکہ کھانا عثمان پکاتا ہے۔ اس لئے بچوں کی پوری نگرانی میرے ہی سر آجاتی ہے بری طرح تھک کر رہ جاتی ہوں۔

تمہاری محبت کتنی راحت افزا اور ساتھ ہی کتنی اذیت انگیز ہے۔

دوست! تم نینی تال کی سرد ہواؤں کو شک کی نظروں سے نہ دیکھو!
"یہاں تک بچھتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظریں"
والا عالم ہے۔ یہاں کتنے ہی شادی شدہ جوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو کہیں بھی وہ رنگ، وہ گرمی، وہ
گداز، وہ والہانہ پن نہ دکھائی دیا۔ جوان سات سالوں نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کر دیا۔ تمہیں اس کی
قدر ہے تو مجھے اس سے چوگنی زیادہ ہے۔

اختر! میرے لئے یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں اس امید اور یقین پر خوش ہوں کہ میری زندگی
پھر ایک دن تمہارے قدموں کے سائے میں گزرے گی۔ میرے بچے ابھی اپنے شاعر باپ کی تربیت سے محروم ہیں۔
تو یہ دوری ابدی تو نہیں۔ انہیں تمہارا ساتھ ضرور ملے گا۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی دقتیں کیوں نہ اٹھانی جائیں۔
تمہاری تنہائی کے خیال سے جی کس بری طرح کڑھتا ہے۔ ہر لمحہ خیال دوڑاتی ہوں کہ نہ جانے اس
وقت کیا کر رہے ہو گے۔ تمہاری راحت اور آسائش کے لئے اتنی دور سے کیا کروں۔ کھانے کے تم شوقین نہیں۔
پہننے کی طرف سے تم بے خبر ہو، پھر اور کیا رہ گیا؟ بہرحال تمہارے لئے کشمیری سلک ضرور لوں گی۔ اور لکھنؤ سے کرتے
سلوا لوں گی۔

اور کیا لکھوں؟ یاد کرو ہفتوں ہماری گفتگو ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔"
زیرِ لب کے یہ خطوط مئی سے جون تک بے حد شدید ہیں۔ خطوط پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اختر
صفیہ کے اس درد سے خود گذر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے صفیہ اُس کے لئے بے قرار ہے۔
شادی سے پہلے اختر کی زندگی کچھ تو آوارہ تھی۔ "بے زاری" نظم سے یہ پوری طرح ہو سکتا ہے شاعر ایک
فرسٹریشن سے گذر رہا ہے۔ پھر اختر نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ وہ شاہد اور شراب کا رسیا ہو گیا تھا۔
اور پھر وہ صفیہ سے لوٹ کر محبت کرنے لگا۔ صفیہ نے اُسے محبت کرنا سکھا دیا۔ یہ کچھ دوستوں کا کہنا ہے۔ لیکن میں
سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے نہیں۔ بلکہ اختر کے اندر ایک پیاس تھی جو شاعر کو عموماً ہوتی ہے۔ کوئی اُسے چاہے۔ یہ بچے کی سی
طلب ہے۔ وہ پیار مانگتا ہے۔ بچہ پیار پا کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب کی ممتا کو ترڑپاتا بھی ہے۔ لیکن شاعر ایسا نہیں
کر سکتا۔ وہ کسی کو بے چین نہیں دیکھ سکتا۔ اور خود بے چین رہتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ اُس کی شاعری درد سے عروج
پاتی ہے۔ اگر اختر کے اس دور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہو گا۔ کہ اختر کی شاعری کے زخم رسنے لگے ہیں

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

زیرِ لب کے خطوط بھی اس عرصے کے بے حد دردناک اور بے حد رومانی ہیں۔ فراق کی سیاہ راتوں کا ذکر ہے۔
رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ ہر جملہ کا خطابت تاثر رکھتا ہے۔ جاں نثار اختر کے ایک خط میں کہا ہے۔
ویسے رشید صاحب نے ان خطوط کے بارے میں جہاں ذہن جاتا ہے جن کا اس وقت احاطہ
"ان خطوط کے مطالعہ سے مرحومہ کی بے شمار خوبیوں کی طرف

اختر نے اپنی بیماری کی خبر تو نہ دی لیکن شال کے لئے روپئے بھجوا دیئے۔ دوستوں کے آگے اُن کا ہاتھ نہیں پھیلتا۔ پھر بھی وہ روپے بھیج دیتا ہے۔

اور صفیہ شال خرید کر پریشان ہو جاتی ہے۔ خوشی اور غم دونوں ایک ساتھ اُسے دبوچ لیتے ہیں۔

اا۔ جون کو اختر نے خط لکھا ہے۔ کہ میں کچھ علیل تھا۔ اب تندرست ہوں۔

صفیہ نے لکھا ہے۔

اختر عزیز!

کل شام کتنے شدید انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ تمہاری بیماری کی اطلاع سے اور تشویش ہو گئی۔

میرے خواب غلط نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ تم پریشان ہو گے۔ شکر ہے اب بخار گیا۔ کھانے پینے کی طرف سے بے خبر نہ ہونا۔ مشیت نے کتنا زبردست فاصلہ ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا ہے۔ مگر دل سے تو ہم دونوں اس درجہ نزدیک ہیں جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے تھے۔ تمہاری بیماری کی راتوں میں اگر میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ تو یہاں تکیہ آنسوؤں سے ضرور تر کیا ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ خود کو اس طرح دل شکستہ مت ہونے دو۔ تمہارا کوئی لمحہ بھی میری شرکت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کو اگر سچ سمجھ سکو تو تمہیں بہت تسکین ہو گی۔"

خط آگے بڑھتا ہے۔ بیوی جانتی ہے۔ شوہر جام و مینا کے شوقین ہیں۔ کہتی ہے۔

"نینی تال سے تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں۔ دعوت شیراز کا انتظام مکان سے حد درجہ قریب ہے آتے جاتے تمہاری یاد ضرور آتی ہے۔

اختر میرے سکون کی خاطر خود کو خوش رکھو اور زندہ رکھو۔ ——— تمہاری سوگواری میرے لئے کسی طرح قابل برداشت نہیں ہوتی تم خود کو اس طرح مضمحل نہ کرو۔ پڑھو۔ شعر کہو۔ تفریح کرو۔ وہ دن بھی آجائیں گے۔ جب پھر میں تمہارے قدموں میں آرہوں گی اور پھر کوئی ظالم قوت بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے گی۔

کل پھر خط لکھوں گی۔ اور ہر روز تمہیں میری ایک تحریر ملتی رہے گی۔ شاید تمہاری طبیعت اس طرح بہل سکے گی۔

بہت سے پیار ——— تمہاری صفو!

اس خط سے مترشح ہوتا ہے کہ اختر بھی ملنے کیلئے بے تاب ہیں۔ انہوں نے لکھا ہوگا۔ "تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں۔"

۱۴ جون کے خط میں اختر کی صفو نے کہا ہے۔

"میں دو دن سے وعدہ کے باوجود خط نہیں لکھ سکی۔

بارش نے عجیب بدمزگی پیدا کر رکھی ہے۔ پھر چونکہ کھانا عثمان پکاتا ہے۔ اس لئے بچوں کی پوری نگرانی میرے ہی سر آجاتی ہے بُری طرح تھک کر رہ جاتی ہوں۔

تمہاری محبت کتنی راحت افزا اور ساتھ ہی کتنی اذیت انگیز ہے۔

دوست! تم نینی تال کی سرد ہواؤں کو شک کی نظروں سے نہ دیکھو!

"یہاں تپتے نہیں بخشتے ہوئے فردوس نظریں"

والا عالم ہے۔ یہاں کتنے ہی شادی شدہ جوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو کہیں بھی وہ رنگ، وہ گرمی، وہ گداز، وہ والہانہ پن نہ دکھائی دیا۔ جو ان سات سالوں نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کر دیا۔ تمہیں اس کی قدر ہے تو مجھے اس سے چوگنی زیادہ ہے۔

اختر! میرے لئے یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں اس امید اور یقین پر خوش ہوں کہ میری زندگی پھر ایک دن تمہارے قدموں کے سائے میں گزرے گی۔ میرے بچے ابھی اپنے شاعر باپ کی تربیت سے محروم ہیں۔ تو یہ دوری ابدی تو نہیں ہے، تمہارا ساتھ ضرور ملے گا۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی دقتیں کیوں نہ اٹھانی جائیں۔

تمہاری تنہائی کے خیال سے جی کس بری طرح کڑھتا ہے۔ ہر لمحہ خیال دوڑاتی ہوں کہ نہ جانے اس وقت کیا کر رہے ہوگے۔ تمہاری راحت اور آسائش کے لئے اتنی دور سے کیا کروں۔ کھانے کے تم شوقین نہیں۔ پہننے کی طرف سے تم بے خبر ہو، پھر اور کیا رہ گیا؟ بہرحال تمہارے لئے کشمیری سِلک ضرور لوں گی۔ اور لکھنؤ سے کرتے سلوا لوں گی۔

اور کیا لکھوں؟ یاد کرو ہفتوں ہماری گفتگو ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔"

زیرِ لب کے یہ خطوط مئی سے جون تک بے حد شدید ہیں۔ خطوط پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اختر صفیہ کے اس درد سے خود گزر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے صفیہ اُس کے لئے بے قرار ہے۔

شادی سے پہلے اختر کی زندگی کچھ تو آوارہ تھی۔ "بے زاری" نظم سے یہ پوری طرح ہوتا ہے کہ شاعر ایک فرسٹریشن سے گزر رہا ہے۔ پھر اختر نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ وہ شاہد اور شراب کا رسیا ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ صفیہ سے لوٹ کر محبت کرنے لگا۔ صفیہ نے اُسے محبت کرنا سکھا دیا۔ یہ کچھ دوستوں کا کہنا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے نہیں۔ بلکہ اختر کے اندر ایک پیاس تھی جو شاعر کو عموماً ہوتی ہے۔ کوئی اُسے چاہے۔ یہ بچے کی سی طلب ہے۔ وہ پیار مانگتا ہے۔ بچہ پیار پا کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب کی مامتا کو تڑپا پاتا بھی ہے۔ لیکن شاعر ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ کسی کو بے چین نہیں دیکھ سکتا۔ اور خود بے چین رہتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ اُس کی شاعری درد سے عروج پاتی ہے۔ اگر اختر کے اس دور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ اختر کی شاعری کے زخم رسنے لگے ہیں۔

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

زیرِ لب کے خطوط بھی اس عرصے کے بے حد دردناک اور بے حد رومانی ہیں۔ فراق کی سیاہ راتوں کا ذکر ہے۔

رشید احمد صدیقی کی رائے یہ ہے کہ ۱۴ر جون کا خط بہت تاثر رکھتا ہے۔ ویسے رشید صاحب نے ان خطوط کے بارے میں جاں نثار اختر کے ایک خط میں لکھا ہے۔

" ان خطوط کے مطالعہ سے مرحومہ کی بے شمار خوبیوں کی طرف ذہن جاتا ہے جن کا اس وقت احاطہ

اختر نے اپنی بیماری کی خبر تو نہ دی لیکن شال کے لئے روپے بھجوا دیئے۔ دوستوں کے آگے اُس کا ہاتھ نہیں پھیلتا۔ پھر بھی دو روپے بھیج دیتا ہے۔

اور صفیہ شال خرید کر پریشان ہو جاتی ہے۔ خوشی اور غم دونوں ایک ساتھ اُسے دبوچ لیتے ہیں۔

۱۱ جون کو اختر نے خط لکھا ہے۔ کہ میں کچھ علیل تھا۔ اب تندرست ہوں۔

صفیہ نے لکھا ہے۔

اختر عزیز!

کل شام کتنے شدید انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ تمہاری بیماری کی اطلاع سے اور تشویش ہو گئی۔

میرے خواب غلط نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ تم پریشان ہو گے۔ شکر ہے اب بخار گیا۔ کھانے پینے کی طرف سے بے خبر نہ ہونا۔ مشیت نے کتنا زبردست فاصلہ ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا ہے۔ مگر دل سے تو ہم دونوں اس درجہ نزدیک ہیں جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے تھے۔ تمہاری بیماری کی راتوں میں اگر میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ تو یہاں تکیہ آنسوؤں سے ضرور تر کیا ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ خود کو اس طرح دل شکستہ مت ہونے دو۔ تمہارا کوئی لمحہ بھی میری شرکت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کو اگر سچ سمجھ سکو تو تمہیں بہت تسکین ہوگی۔"

خط آگے بڑھتا ہے۔ بیوی جانتی ہے۔ شوہر جام و مینا کے شوقین ہیں۔ کہتی ہے۔

"نینی تال سے تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں۔ دعوت شیراز کا انتظام مکان سے حد درجہ قریب ہے آتے جاتے تمہاری یاد ضرور آتی ہے۔

اختر میرے سکون کی خاطر خود کو خوش رکھو اور زندہ رکھو ——— تمہاری سوگواری میرے لئے کسی طرح قابل برداشت نہیں ہوتی تم خود کو اس طرح مضمحل نہ کرو۔ پڑھو۔ شعر کہو۔ تفریح کرو۔ وہ دن بھی آجائیں گے۔ جب پھر میں تمہارے قدموں میں آرہوں گی اور پھر کوئی ظالم قوت بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے گی۔ کل پھر خط لکھوں گی۔ اور ہر روز تمہیں میری ایک تحریر ملتی رہے گی۔ شاید تمہاری طبیعت اس طرح بہل سکے گی۔

بہت سے پیار ——— تمہاری صفو!

ایسا خط سے مترشح ہوتا ہے کہ اختر بھی ملنے کیلئے بے تاب ہیں۔ انہوں نے لکھا ہوگا۔" تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں۔"

۱۴ جون کے خط میں اختر کی صفو نے کہا ہے۔

"میں دو دن سے وعدہ کے باوجود خط نہیں لکھ سکی۔

بارش نے عجیب بدمزگی پیدا کر رکھی ہے۔ پھر چونکہ کھانا عثمان پکاتا ہے۔ اس لئے بچوں کی پوری نگرانی میرے ہی سر آجاتی ہے بری طرح تھک کر رہ جاتی ہوں۔

تمہاری محبت کتنی راحت افزا اور ساتھ ہی کتنی اذیت انگیز ہے۔

دوست! تم نینی تال کی سرد ہواؤں کو شک کی نظروں سے نہ دیکھو!

"یہاں تو بچے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر ہیں"

والا عالم ہے۔ یہاں کتنے ہی شادی شدہ جوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو کہیں بھی وہ رنگ، وہ گرمی، وہ گداز، وہ والہانہ پن نہ دکھائی دیا۔ جوان سات سالوں نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کر دیا۔ تمہیں اس کی قدر ہے تو مجھے اس سے چوگنی زیادہ ہے۔

اختر! میرے لئے یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں اس امید اور یقین پر خوش ہوں کہ میری زندگی پھر ایک دن تمہارے قدموں کے سائے میں گزرے گی۔ میرے بچے ابھی اپنے شاعر باپ کی تربیت سے محروم ہیں۔ تو یہ دوری ابدی تو نہیں۔ تمہارا ساتھ ضرور ملے گا۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی دقتیں کیوں نہ اٹھانی جائیں۔

تمہاری تنہائی کے خیال سے جی کس بری طرح کڑھتا ہے۔ ہر لمحہ خیال دوڑاتی ہوں کہ نہ جانے اس وقت کیا کر رہے ہوگے۔ تمہاری راحت اور آسائش کے لئے اتنی دور سے کیا کروں۔ کھانے کے تم شوقین نہیں۔ پہننے کی طرف سے تم بے خبر ہو، پھر اور کیا رہ گیا؟ بہرحال تمہارے لئے کشمیری سلک ضرور لوں گی۔ اور لکھنؤ سے کرتے سلوا لوں گی۔

اور کیا لکھوں؟ یاد کرو سفیتوں ہماری گفتگو ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔"

زیر لب کے یہ خطوط مئی سے جون تک بے حد شدید ہیں۔ خطوط پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اختر صفیہ کے اُس درد سے خود گذر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے صفیہ اُس کے لئے بے قرار ہے۔

شادی سے پہلے اختر کی زندگی کچھ تو آوارہ تھی۔" بے زاری" نظم سے یہ پوری طرح ہوتا ہے کہ شاعر ایک فرسٹریشن سے گذر رہا ہے۔ پھر اختر نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ وہ شاہد اور شراب کا رسیا ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ صفیہ سے لوٹ کر محبت کرنے لگا۔ صفیہ نے اُسے محبت کرنا سکھا دیا۔ یہ کچھ دوستوں کا کہنا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے نہیں۔ بلکہ اختر کے اندر ایک پیاس تھی جو شاعر کو عموماً ہوتی ہے۔ کوئی اُسے چاہے۔ یہ بچے کی سی طلب ہے۔ وہ پیار مانگتا ہے۔ بچہ پیار پا کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب کی ماںتا کو تڑپا پاتا ہے۔ لیکن شاعر ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ کسی کو بے چین نہیں دیکھ سکتا۔ اور خود بے چین رہتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ اُس کی شاعری درد سے عروج پاتی ہے۔ اگر اختر کے اس دور کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ اختر کی شاعری کے زخم رسنے لگے ہیں

دیکھ جا آکے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

زیر لب کے خطوط بھی اس عرصے کے بے حد دردناک اور بے حد رومانی ہیں۔ فراق کی سیاہ راتوں کا ذکر ہے۔ رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ ہر جون کا خطابت تاثر رکھتا ہے۔

ویسے رشید صاحب نے ان خطوط کے بارے میں جاں نثار اختر کے ایک خط میں لکھا ہے۔

" ان خطوط کے مطالعہ سے مرحومہ کی بے شمار خوبیوں کی طرف ذہن جاتا ہے جن کا اس وقت احاطہ

اختر نے اپنی بیماری کی خبر تو نہ دی لیکن شال کے لئے روپئے بھجوا دیئے۔ دوستوں کے آگے اُس کا ہاتھ نہیں پھیلتا۔ پھر بھی دو روپے بھیج دیتا ہے۔

اور صفیہ شال خرید کر پریشان ہو جاتی ہے۔ خوشی اور غم دونوں ایک ساتھ اُسے دبوچ لیتے ہیں۔

۱۱ جون کو اختر نے خط لکھا ہے۔ کہ میں کچھ علیل تھا۔ اب تندرست ہوں۔

صفیہ نے لکھا ہے۔

اختر عزیز!

کل شام کتنے شدید انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ تمہاری بیماری کی اطلاع سے اور تشویش ہو گئی۔

میرے خواب غلط نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ تم پریشان ہو گے۔ شکر ہے اب بخار گیا۔ کھانے پینے کی طرف سے بے خبر نہ ہونا۔ مشیت نے کتنا زبردست فاصلہ ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا ہے۔ مگر دل سے تو ہم دونوں اس درجہ نزدیک ہیں جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے تھے۔ تمہاری بیماری کی راتوں میں اگر میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ تو یہاں تکیہ آنسوؤں سے ضرور تر کیا ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ خود کو اس طرح دل شکستہ مت ہونے دو۔ تمہارا کوئی لمحہ بھی میری شرکت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کو اگر سچ سمجھ سکو تو تمہیں بہت تسکین ہو گی۔"

خط آگے بڑھتا ہے۔ بیوی جانتی ہے۔ شوہر جام و مینا کے شوقین ہیں۔ کہتی ہے۔

"نینی تال سے تمہارے لیے کیا تحفہ لاؤں۔ دعوت شیراز کا انتظام مکان سے حد درجہ قریب ہے آتے جاتے تمہاری یاد ضرور آتی ہے۔

اختر میرے سکون کی خاطر خود کو خوش رکھو اور زندہ رکھو ——— تمہاری سوگواری میرے لئے کسی طرح قابل برداشت نہیں ہوتی تم خود کو اس طرح مضمحل نہ کرو۔ پڑھو۔ شعر کہو۔ تفریح کرو۔ وہ دن بھی آجائیں گے۔ جب پھر میں تمہارے قدموں میں آ رہونگی اور پھر کوئی ظالم قوت بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے گی۔

کل پھر خط لکھوں گی۔ اور ہر روز تمہیں میری ایک تحریر ملتی رہے گی۔ شاید تمہاری طبیعت اس طرح بہل سکے گی۔

بہت سے پیار ——— تمہاری صفّو!

اِس خط سے مترشح ہوتا ہے کہ اختر بھی ملنے کیلئے بے تاب ہیں۔ انہوں نے لکھا ہوگا۔ " تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں۔"

۱۴ جون کے خط میں اختر کی صفو نے کہا ہے۔

"میں دو دن سے وعدہ کے باوجود خط نہیں لکھ سکی۔

بارش نے عجیب بدمزگی پیدا کر رکھی ہے۔ پھر چونکہ کھانا عثمان پکاتا ہے۔ اس لئے بچوں کی پوری نگرانی میرے ہی سر آجاتی ہے بری طرح تھک کر رہ جاتی ہوں۔

تمہاری محبت کتنی راحت افزا اور ساتھ ہی کتنی اذیت انگیز ہے۔

تم اپنے کو مجھے چاہنے دو۔ مجھے تمہیں چاہنے میں ہمیشہ راحت ملی ہے۔

میں اب ہر تفریح اور ہر سیر کے موقع پر مجرم محسوس کروں گی۔ میں آج ہی سامان پلندہ کرنا شروع کروں گی اور جلد سے جلد روانہ ہونے کی کوشش کروں گی۔

تم وہاں تنہا پریشان ہوتے رہو اور میں غم غلط کرنے کی کوشش کروں، یہ برداشت سے باہر ہے۔ مجھے جبر محسوس ہوتا ہے اختر!

تم دوستوں سے ملو میں ادنیٰ سی نوکری کے سہارے بھی تم تک پہونچ سکوں گی۔

اگر یہ بچے درمیان حائل نہ ہوتے تو میں بغیر نوکری کے بہانے بھی آ ہی جاتی۔

کیا تم میرا نیٹ نہ بھر سکتے۔۔۔؟ پر ان الجھنوں کو دیکھتے ہوئے بچوں کی ذمہ داری کا احساس کھٹکتا ہے۔ دوست اچھا تم اس کا جواب اب لکھنؤ کے پتہ پر لکھنا تاکہ میں اکیس کو مجھے وہاں مل سکے۔

آؤ بہت سے پیار کر لوں۔

تمہاری صفو

سولہ جون کو خود ہی صفیہ کہہ رہی ہے کہ مجھے اب لکھنؤ کے پتہ پر خط لکھنا مگر سترہ جون کو دوسرے دن ہی پھر قلم لے کر بیٹھ گئی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔

اختر عزیز

کل خط لکھ چکی ہوں۔ غالباً شام کو ہی پوسٹ ہوا ہے پھر اتوار آ جائے گا۔ اور میں تم سے باتیں نہ کر سکوں گی۔ اس لیے آج پھر لکھ رہی ہوں۔ یہ کم بخت بچے اس تحریری ملاقات میں بھی مخل ہوتے ہیں۔

اویس (سلمان) برابر کاغذ کا مطالعہ پلیتی کر رہا ہے اور خط لکھنے نہیں دیتا۔ جادو (جاوید) کو پرسوں رضیہ بھیابی آ کر اپنے ہمراہ لے گئیں۔ وہ جہاں گیر پیلس میں ٹھہری ہیں۔ جادو کو راجہ کا محل اس قدر پسند آیا کہ وہ واپسی کا نام لیتے ہی چیخ رہیں عالم کہ گئی مگر واپس نہیں آئے۔"

صفیہ کے سارے خطوط میں بچوں کو اس نے صرف اسی خط میں کم بخت کہا ہے۔ ہر جگہ بچوں کا ذکر ہے ان کی بیماری کا ان کی قابلیت کا ان کی شرارتوں کا ان کی نفسیات کا مگر ماں نے صرف اس خط میں کم بخت کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

جادو یعنی جاوید اختر بیٹے۔ جو آج کل فلمی ادیب ہیں۔ اور سلیم جاوید کے نام کے ساتھ فلمی دنیا کی کامیاب ترین اور مقبول ترین ہستی بن گئے ہیں۔ ان کی نفسیات کو راجہ کا محل پسند آ گیا ہے۔ اُن کی آگے کی زندگی کا اشارہ کرتا ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء کے خط میں جادو کی ذہانت کی اور بھی خبر دے رہی ہیں اور پیشین گوئی بھی کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں۔

جادو کے دو خط تمہارے نام آئے۔ بھیج رہی ہوں۔ اس کی پیدائش ہی مجھے چند دنوں کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اب وہ خط بھی لکھنے لگا ہے مجھے بڑی فاتحانہ مسرت ہوتی ہے۔ اس کی ذہانت اور اس کے دماغ کو دیکھ کر۔ میں نے تمہارا بہترین عنصر تم سے نچوڑ کر اپنا لیا ہے نا؟ لیکن تم نے کچھ کھویا نہیں بلکہ پایا ہے

کرنا میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ میں نے اکثر مشاہیر کے خطوط دیکھے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جن میں خود نمائی زیادہ اور خلوص کم ملا۔ مرحومہ کے خط میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ تو بیچ مچ آپ پر مٹی ہیں۔ انہوں نے عورت اور بیوی دونوں کا پایہ میری نظر میں بہت بلند کر دیا۔ اشتراکی عقیدہ رکھتے ہوئے بھی اُن کا ادب، شاعری اور زندگی کا تصور کتنا حسین ہے اور محرمانہ تھا۔ مجھے تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ خیالات اور جذبات کا اظہار کس شائستگی اور توازن سے کرتی تھیں اور ہماری تہذیب کی کیسی تزئین اور حسین عکاسی اُن کے خطوط میں ملتی ہے۔"

رشید احمد صدیقی

۱۷ نومبر ۱۹۵۴ء

رشید صاحب نے سچ کہا ہے۔ اشتراکیت جب شدت اختیار کرتی ہے تو نعرہ بازی ہو جاتی ہے۔ مگر صفیہ کے خطوط میں نہ نعرہ بازی ہے اور نہ اپنا رونا ہے۔ کہ میرا کیا ہوگا۔ آج کل پڑھی لکھی عورتوں میں یہ مرض سرایت کر گیا ہے کہ "میرا کیا ہوگا" مگر ہندوستان کی عورت سدا سے یہ سوچتی رہی ہے کہ اُس کے گھر کا کیا ہوگا۔ اُس کا شوہر جو اس کی نظر میں ہمیشہ عظیم رہا ہے۔ اُس کی قدر کیوں نہیں ہوتی۔ اُس کے بچے عظیم ہونے چاہئیں۔ ان کا بھی زندگی میں احترام ہو۔ اور صفیہ خالص ہندوستانی عورت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا جاگتا ہوا ملک ہے۔

۱۴ جون کا خط نینی تال سے لکھا گیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں

اختر عزیزم۔

بار بار جی چاہا کہ تمہیں خط لکھوں کہ کسی طرح مجھ تک نینی تال پہنچ جاؤ۔ آگرے سے سیدھی گاڑی کاٹھ گودام آتی ہے۔ مگر اس ڈر سے نہ لکھ سکی کہ تم منظور نہ کر دگے یہ پچھلے دن کیسے تڑپ اور ترس کر گزر گئے زندگی کیسی کھوکھلی اور ادھوری رہی اختر!! اگر تمہارا جی چاہے تو تم دنیا کی ہر مصلحت کو ٹھکرا کر میرے پاس آ جاؤ میری آغوش تم کو پناہ دے گی اور میں تمہیں پا کر دنیا کی ہر راحت پا لوں گی۔

پیسوں کی خاطر جو ہم تم دونوں اس لئے دردی سے اُٹھا دیا کرتے ہیں۔ ان کے لئے خود کو اس طرح ہلکان نہ کرو۔ میں اس کی قائل نہیں۔

تم نے مجھے ڈیڑھ سو روپے بھیج دیئے جبکہ تمہیں صرف تین سو ملے ہوں گے۔ صرف ڈیڑھ سو سے تم مہینہ کاٹو گے۔ تم نے اپنے ساتھ اور ساتھ ہی میرے ساتھ بھی بڑا ظلم کیا اختر!

کل سے آج تک میں پیسے پا کر بڑی مسرور اور فتح مند تھی آج مجھے جرم کا احساس ستا رہا ہے یعنی اس دریا دلی سے پیسے اُٹھاؤں اور تم وہاں اتنے بڑے بے پناہ شہر میں پیسے گن گن کر خرچ کرو۔ یہ کہاں کی محبت ہے دوست!

میں نے آج ہی صبح باون روپئے کی شال، دس کی چھتری، پندرہ کا کشمیری نمدہ اور سترہ کی ایک Folding Table خریدی ہے۔ شام کو تمہارا خط ملا اختر! مجھے اس درجہ نہ چاہو، تمہاری دیوانی محبت سے مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔

کے مسئلوں پر شعر کہتا ہے۔ اشتراکیت کے رموز کو سمجھتا ہے۔ شراب پی کر بہکتا نہیں ہے۔
اپنی غریبی پر اُسے شرم محسوس نہیں ہوتی اپنے حالات کو وہ چھپاتا نہیں بے باک ہے۔ مست ہے۔ ملنگ ہے۔

آج کا آدمی اپنے حالات کو اپنی کمزوریوں کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ بیوی سے اُس کے وہ تعلقات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ جو ہونے چاہئیں۔

صفیہ اختر کی بیوی بھی ہے اور دوست بھی۔ اس لئے صفیہ بے تکلفی سے ہر بات اپنے شوہر سے کہہ سکتی ہے اُن کا جسمانی رشتہ بھی بہت بھرپور ہے۔ بلکہ روحانی بھی دونوں کی روحوں کا ملن ہو رہا ہے۔

صفیہ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

"ہم دونوں کی صحبتیں کتنی رنگین کتنی بھرپور اور کیسی دلچسپ ہوتی ہے اختر! ہم نے دوستی کا لطف ایک دوسرے سے پایا۔ میں نے زندگی میں تم سے دوستی۔ رفاقت۔ سرپرستی۔ شفقت۔ ملائمت۔ سبھی چیزیں پائیں تمہیں پاکر پھر مجھے زندگی میں کسی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی کتنی بھٹکی ہوئی زندگی کتنے متلاشی جذبات کو پناہ مل گئی۔ اختر تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔ زندگی ہی کے برابر! تم سے جینا ہے اور تمہیں سے مرنا۔ کتنی واقعیت ہے ہمارے ساتھ میں۔ اور ساتھ ہی کتنا رومان۔ تمہارے تصور سے ہی اکثر میں کتنی جذباتی ہو جاتی ہوں۔ اور تمہاری تکلیف کے خیال سے یہاں رہ کر بھی کتنے آنسو بہا لیتی ہوں۔ تم مت گھبراؤ دوست! تمہارے رنج و راحت، کسی چیز سے اگر تم مجھے لمحے بھر کے لئے بے خبر پاؤ تو مجھے زہر دیدینے کا حق تمہیں حاصل ہے۔"

یہ سب باتیں جو صفیہ کہہ رہی ہیں۔ انسان کو میسّر نہیں آتیں۔ اور شاعر کو تو اکثر ان سے مبرا ہوتا ہے مگر اختر کی شخصیت میں ایک توازن ہے ہندوستانی تہذیب کی پوری جھلک ہے۔ اور انسانیت کی پوری دمک ہے۔

اسی خط میں صفیہ نے اپنی بیماری کا ذکر بھی کیا ہے۔

ایک بڑی ذاتی اور عجیب بات کا ذکر صفیہ کے جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں ملتا ہے۔

اختر نے پوچھا ہے۔ تم میرے نام کے ساتھ عزیز اختر کیوں لکھتی ہو۔

تم نے پوچھا ہے۔ میں تمہارے نام کے ساتھ عزیز کیوں لکھتی ہوں۔ تو اختر! اس لفظ نے تو احساس کی استواری کا پتہ دیا ہے۔ تم مجھے ہر حال میں۔ ہر موقع پر عزیز رہے ہو۔ اس سے انکار نہ کر سکو گے۔ اچھا اب میں تمہیں میرے اپنے اختر سے مخاطب کیا کروں گی۔ البتہ اس شرط پر کہ میرے اس احساس کو کبھی مجروح نہ کرنا اکثر برہمی کے مواقع پر جب تم "تمہارا" حذف کر کے محض اختر لکھ جاتے ہو تو بس یقین کرو میری جان آدھی تو ہو ہی جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو شرط تم سے رکھی ہی نہیں جا سکتی۔ شرط میں نے لگائی بھی تو وہی۔ ورنہ۔ والا لطیفہ دہرانا پڑے گا۔ وہ اور ہی ہوتے ہیں؟ جو اپنی ہوئے وفا سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں عاشقی بندگی نہ ہو جائے۔"

یہاں تو عاشقی و بندگی کے امتیازات ہی قائم نہیں ہو سکتے۔ میں تو ہوں ہی تمہاری اور تم بھی مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔

"۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں صفیہ نے اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ شادی تمہارے ساتھ میری مرضی سے ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

اس کا دوسرا خط پڑھنے میں شاید تمہیں دقت ہو گی۔ لکھا ہے اپنی وہ شیر دشعر، جو آپ نے لکھا ہے۔" اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔" غلط ہے۔ اس کو گمان ہے کہ یہ مصرعہ تمہارا ہے اور اس کی تنقید کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے وہ تم جیسے رومانی انقلاب پسندوں میں آ گئے ہو گا۔ وہ فرار کا قائل نہیں ہو سکتا تم گھبرا جاتے ہو اور شکست محسوس کرنے لگتے ہو۔ وہ ڈٹ کر لڑے گا اور تم سے آگے بڑھ جائے گا۔ ہے نا۔ آؤ دونوں مل کر اسے پیار کریں اور اپنے جذبات کے دھاروں کا ایک سنگم تلاش کر لیں۔

جادو اس وقت فلم میں سب سے زیادہ کما رہے ہیں۔ مگر اختر کی بے نیازی کہیے یا خودداری کہ وہ اپنے ڈیڑھ سو فٹ کی فلیٹ میں دوسری بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔

سلمان جس کا صفیہ نے اویس کے نام سے ذکر کیا ہے۔ وہ آج کل امریکہ میں ڈاکٹر ہیں۔ وہ بھی کافی زیادہ ڈالر کما رہے ہیں۔

باپ اشتراکی ہے۔ ڈالر دنیا کو خرید سکتا ہے مگر اختر کو نہیں خرید سکا۔

صفیہ ۱۷ جون کے خط میں اختر سے کہتی ہے۔

" تم آرام و تکلیف کے مسئلے کو نظر انداز کر کے ملازمت کے امکانات ضرور دریافت کرو۔ صفدرا بیگم اور دوستوں سے کام نکل سکے گا۔ عصمت آپا کی بہن یا کرشن چندر کے گھر گزر ہو ہی جائے گی۔ ورنہ تم تنہا نہ رہ سکو گے۔ اور اس طرح مجھے اور تمہیں دونوں کو نقصان پہنچ جانے کا پورا خدشہ ہے۔

بہرحال تم اپنے ذہن و دماغ کو زیادہ متاثر نہ کرو۔ اب تک جو کچھ ہوا، وہ ہم سب کی بہتری کے لئے ہوا آئندہ بھی جو کچھ ہو گا وہ بہتر ہی ہو گا۔

" خلوص اور نیت کی صداقت یہ دو چیزیں انسان کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا کرتیں کچھ مادی یا افادی پہلو نہ نکلے تو کردار کی برتری تو ہاتھ سے نہیں جاتی اختر!

تمہارے ساتھ رہ کر میں نے جینا پایا ہے۔ مجھے دنیا کے کسی دوسرے مرد سے یہ سب کبھی نہیں مل سکتا تھا، پھر تمہارا جیسا نازک دل اور تمہارے جیسے لطیف جذبات جن کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی بعض وقت ڈرتی ہوں۔ کہ کہیں ان میں میل نہ آ جائے۔

میرے شاعر! تمہاری شاعری اور تمہارے نغموں سے بہت سے لوگ لطف اُٹھاتے ہیں مگر اُسے live کرنے کے مواقع کسے ملے ہیں میں تو تمہاری شاعری کو زندگی بنا چکی ہوں۔ دوست! شعر کہو اور تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول کر کہو۔

بے شمار پیار۔ گہرے اور گرم

تمہاری صفی۔!

میرا یہ یقین ہے کہ اگر اختر شاعر نہ ہوتا تو اس کی صفیہ سے شادی نہیں ہو سکتی تھی اور اگر اختر صفیہ سے شادی نہ کرتا تو اسے ایسی جاں نثار بیوی نہ ملتی تو اختر ایسا شاعر تو نہیں۔ لیکن ایسا انسان نہیں بن سکتا تھا۔ (شاعر تو وہ پہلے بھی اچھا تھا)

اختر آج بوڑھے ہو کر بیٹھ کر بھی مطمئن ہے۔ کھری چارپائی اور بچھی ہوئی چٹائی پر لیٹ کر دنیا جہاں

صفیہ نے صاف طور پر کہا ہے۔

کہیں نے بچوں کی صورت میں ہمیں Reproduce کیا ہے۔ اور ان بچوں پر اسے ناز ہے۔ جاوید اور سلمان اسے دو چھوٹے جاں نثار اور اختر نظر آتے ہیں۔

اس خط میں اس کی بیماری کا ذکر ہے۔ حرارتی کیفیت کو اس نے سوزِ ہجر کہا ہے۔ اور یہ بیماری بڑھا سے ہوتی ہو گی! جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ہندوستانی عورت ہندو ہو یا مسلمان اس کے اندر ہندوستانی تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور ترقی پسند ہو یا روایتی عورت اس کے تحت الشعور میں ایک ہی بات رہتی ہے کہ اس کا جنازہ شوہر کے کندھوں پر اٹھے وہ سہاگن ہی اس دنیا سے جائے۔ ہندوستان کی عورت بیوہ ہو کر مرنا نہیں چاہتی ستی کی رسم کتنی غیر منصفانہ اور بہیمانہ سہی مگر اس ہندوستانی عورت سے پوچھئے جو بیوہ ہو کر جیتی ہے۔

صفیہ نے ۱۵ر فروری ۵۱ء کے خط میں اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے علی گڑھ کے ایک واقعہ سے متاثر ہوئی ہے۔ لکھتی ہے۔

اس طرف ایک ایسے اندوہناک حادثے کی اطلاع ملی ہے کہ جس کا اثر طبیعت پر آج بھی تازہ ہے۔ سعیدہ (پروفیسر جغرافیہ مسلم گرلز کالج علی گڑھ) کے شوہر کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ کشمیر سے لاش علی گڑھ لائی گئی سعیدہ کی بدنصیبی کا یہ آخری حربہ تھا۔ غریب کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے بدقسمت کا ایک بچہ تھا تین سال سے میں اس سے الگ ہوں۔ لیکن اس خبر سے دل پر بری طرح چوٹ لگی۔ خدا مجھے تمہارے سامنے ہی اس دنیا سے اٹھا لے۔ طبیعت اس خبر سے بری طرح خوف کھا گئی ہے۔

صفیہ کی بیماری اس کے بعد بڑھتی گئی۔ وہ کبھی اختر کو لکھتی ہے۔ کبھی نہیں لکھتی۔ اپنی بیماری کے بارے میں۔

اختر ادھر حالات سے جوجھ رہا ہے۔ کبھی کبھی مایوس ہوتا ہے۔

۲۳ر اپریل ۱۹۵۱ء کا خط اختر کی ذہنی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔

بھوپال۔ ۲۳ر اپریل

اختر میری جان!

"دوپہر کو خط ملا تھا اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گئی تھی۔ پھر خط پوسٹ نہ ہو سکا۔ اب شام کو اسٹیشن بھیج رہی ہوں۔ تمہاری شوریدہ سری سے سخت وسوسے پیدا ہو رہے ہیں۔ آؤ میری جانب دیکھو! پیار سے ملامت ہے۔ آج میں تمہارے دل میں کبھی ایسے خیالات کا آنا برداشت نہ کروں گی۔ تمہاری زندگی تمہاری تندرستی اور مسرتوں کی مجھے ضرورت ہے۔ میرے بچوں کو ضرورت ہے۔ تمہارے ادبی حلقے کو ضرورت ہے۔ خود آج زندگی کی بڑھتی ہوئی تحریک کو ضرورت ہے۔ تم اس طرح کہ جینے کے مفہوم کو بعض وقت محدود نہ کر لیا کرو۔ خود کے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیو۔ پھر غم تمہارے پاس کبھی نہ پھٹکے گا۔

اب تم مجھے لمبے خط لکھنے لگے ہو۔ مگر پیار کی باتوں میں تلخی شامل نہ کر لیا کرو۔ تم جانتے ہو میں اپنی خواہش اپنی پسند اور اپنے ارادے سے منسوب ہوئی ہوں۔ "میری ایک بہن" بھی اس سلسلے کو ختم کر سکتی تھی۔ پھر تمہاری ہچکچاہٹ اور تمہارے تذبذب پر تمہارے قدم میں استقلال پیدا کرنے میں میرا حصہ رہا ہے۔ اگر میں اپنے شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ کو استعمال کر کے تمہیں خط لکھنے میں خود اقدام نہ کرتی تو نہ جانے ہماری زندگیاں آج کہاں بھٹک رہی ہوتیں۔ تم سے وابستہ ہوئے آج سات سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ ان سات سالوں میں جس قدر خوشگوار سمجھوتہ ہم دونوں کے درمیان رہا ہے۔ اس کی مثال ازدواجی زندگی میں مشکل سے ملے گی۔ میرے سامنے راستہ واضح تھا۔ مجھے ہر حال تمہارے ساتھ ہی رہنا تھا۔ لیکن تم نے بھی اپنی کش مکشوں اور الجھنوں کے باوجود مجھے کسی قدم پر اپنے سے علیحدہ نہ سمجھا۔ تم نے اکثر دل و دماغ کا خون کر لیا۔ میری پاسداری میں کوئی فرق نہ لائے۔ تم نے میرا ساتھ چاہا اور میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ اس رفاقت میں جتنا تم نے مجھ سے پایا ہے اس سے غالباً کچھ زیادہ ہی میں نے تم سے حاصل کر لیا۔ دوست! اپنے چمکتے ہوئے معصوم چہرے پر غیر معمولی ذہانت اور ملائم دل رکھنے والے بچے، میری مامتا تمہارے اس چھوٹے کو میری زندگی کی ہر سانس میں ایک لہر اور ایک انوکھی اُمنگ سے خوش آمدید کہتی ہے۔ میں جادو اور رادین کی نگاہوں میں تمہارا پرتو دیکھ کر جو غرور محسوس کرتی ہوں وہ مجھے تمہارے قدموں پر جھکا دینے کو کافی ہے۔

اختر! تم نے زندگی میں سکھ کم اور دکھ زیادہ جھیلے ہیں وہ آسودگی جو اعتماد اور سکون پروری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تمہارے حصے میں کم رہی ہے۔ میں اگر تمہیں اس قسم کا ذہنی سکون پہنچا سکوں جس میں خون کی کھولن، اعصاب کی تڑپ اور ذہن کی الجھن نہ شامل نہ ہو تو میں سمجھوں گی کہ میری زندگی سپھل ہو گئی۔ اس عرصہ میں ایک آدھ بار میں نے تمہیں ضرور اپنی طرف سے پریشانیاں دی ہوں گی۔ مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں ان پر نادم نہ ہوئی ہوں۔ تم ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے ذہن میں اس خیال کو جگہ مت دو کہ میری زندگی تم سے علیحدہ ہو کر کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی کٹھن راہوں اور پریشانیوں کی منزلوں میں تم مجھے ساتھ رکھو! اور تم مجھے مسکراتا ہوا پاؤ گے۔ البتہ ساتھی میں سمجھوں گی کہ میری زندگی بے مقصد ہو چکی ہے۔ جب تم کو میری ضرورت باقی نہ رہے گی۔ میں اس دن کو دیکھنے سے پہلے مرنا بہتر سمجھتی ہوں۔

آگے چل کر لکھتی ہیں۔

" آج کل شام کو مجھے حرارتی کیفیت سی معلوم ہوتی ہے۔ تمام جسم میں آگ سی پھنکتی جاتی ہے۔ گو کہ ٹمپریچر کوئی خاص نہیں ہوتا۔ سوزِ ہجر شاید اسی کا نام ہے۔ دو چار دن اور دیکھتی ہوں پھر کسی حکیم کو دکھاؤں گی۔ ڈاکٹروں کا علاج تو فضول ہی سا ہے۔ جادو کے تلخ تجربے کے بعد ہمت نہیں ہوتی۔ "

اس خط کے مضمون میں زندگی کے بعض گوشوں سے صفیہ نقاب اٹھاتی ہے۔ وہ بہت غور طلب ہے پہلی بات یہ ہے کہ صفیہ نے خود اختر کو پسند کیا ہے۔

ہندوستانی فلاسفی میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان نے پسند کرنے کا ادھیکار عورت کو دیا ہے۔ مرد کو نہیں۔ سوئمبر کی رسم اسی بات کی مظہر ہے۔ اور اس کے پیچھے نظریہ یہ ہے کہ عورت جس کو پسند کرتی ہے اسی کو دوبارہ تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ یہ قدرت کا منشا ہے مرد صرف عورت کی محبت کے ردِ عمل کے طور پر اُسے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وقتی طور پر مبتلا بھی ہو جاتا ہو گا۔ مگر اس کا دائمی اثر نہیں لیتا۔

اختر پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نظم سے توہم پرستی کو تحریک ملتی ہے۔ دل برداشتہ ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں کی رائے صفیہ کو لکھ بھیجی۔

۱۶ ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط میں صفیہ نے اس کا جواب دیا ہے۔ اُس نے اختر کو کہا ہے۔

" تمہاری نظم "ستاروں کی صدا" پر کرشن چندر اور مہدی کا اعتراض جو تم نے لکھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بعض وقت انجمن میں الٹی سیدھی بحثیں ہوتی ہیں۔ کرشن اور مہدی کا اعتراض تمہاری نظم پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ تم نے اوہام پرستی کو بنیاد ضرور بنایا ہے۔ لیکن اس کا غلط استعمال نہیں کیا بلکہ اوہام کو یہ نظم توڑتی ہے۔

کرشن کو میں بڑا افسانہ نگار مانتی ہوں۔ لیکن اُن کی سخن فہمی کی میں قائل نہیں اور اختر تم کرشن سے ضرور پوچھنا کہ اُن کے افسانے بت جگاتے ہیں سے توہم پرستی پھیلتی ہے یا نہیں۔ ؟

اختر نے صفیہ کو ایک مضمون بھی لکھنے کو کہا ہے۔

" اردو ادب میں عورت کا تصور" صفیہ نے وعدہ کیا ہے کہ مضمون میں ضرور لکھوں گی۔ سنجیدہ قسم کا۔ اس بارے میں بہت سی باتیں ذہن میں آچکی ہیں۔ البتہ comparative مطالعہ کے لئے دوسری زبانوں کے ادب سے بھی اس بارے میں کچھ مواد ملنا ضروری ہے۔ عورت کے بارے یہاں اشتراکی ادیبوں کا رویہ کیا ہے؟ (یہ اعتراضات اکثر ہوتے رہتے۔ ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں تنقید کا رواج ہے۔ اور تنقید ادب کے فروغ کے لئے ضروری بھی ہے۔

مگر اختر پر جو اعتراضات ہوئے ہیں۔ اُن میں گہرائی نہیں ہے۔ یہ اعتراضات سطحی ہیں۔ مثلاً "ستاروں کی صدا" میں شاعر نے ہر ستارے کا مزاج اور اس کا کمال علم و نجوم کے حساب سے بیان کیا ہے اور آخر میں یہ کہا ہے کہ انسان اب تو ہم سے اوپر اُٹھ گیا ہے۔ فلک پر چاند اور ستاروں کے بیچ بحث ہو رہی ہے۔ چاند انسان کے گن گا رہا ہے اور مشتری زہرہ۔ مریخ۔ عطارد اپنے اپنے کمالات بیان کر رہے ہیں۔

چاند کہہ رہا ہے۔

قبضے میں ہاں تدبیر ہے —— قبضے میں یاں تقدیر ہے
انسان بڑھے گا اور بھی —— آئے گا ایسا دور بھی
ہوگا فضا پر اقتدار —— سر قضا پر اقتدار
آئے گا گردوں زیر دام —— قبضے میں ہوں گے صبح و شام
خود کہکشاں افلاک پر —— بن جائے گی اک رہ گزر
اے ماہ پارو کیا ہو گم —— کل خود قدم چوموگے تم

اور آخر میں سب چاند کے ساتھ مل کر نعرہ لگاتے ہیں۔

فن اور شخصیت   جاں نثار اختر نمبر

آؤ مسکراؤ! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بڑے آئے قاتل بننے والے میری امانت کے، تمہاری زندگی پر تمہارے علاوہ دوسروں کو اختیار حاصل ہے اسے بھول مت جایا کرو۔

اچھا کڑوی باتیں سوچنا ترک اور اب ہنسی خوشی کی گفتگو شروع ہونی چاہیئے۔ میں جانتی ہوں تم اداس ہو جاتے ہو میں بھی ہو جاتی ہوں۔ مگر آؤ حوصلہ نہ کھوئیں۔ ہمت نہ ہاریں۔ امیدیں رہیں۔ اور فتح مند شکست ہماری ہو نہیں سکتی۔

تمہاری دوست ـ ساتھی

اور دلہن ___ صفو

بمبئی نے اختر کا کیا حال کر دیا ہے وہ شکستہ دل ہو گیا۔ خودکشی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اپنی محبوب بیوی سے کہہ رہا ہے۔ اس بے کار زندگی سے تو موت بہتر ہے مر جانا اچھا ہے۔ زندگی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اور صفیہ کہہ رہی ہے۔ "بڑے آئے قاتل بننے والے میری امانت کے۔ پھر وہ لڑنے کی ہمت دلاتی ہے دنیا کو ضرورت ہے اختر کی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ کہ انسان خودکشی کی طرف تب راغب ہوتا ہے جب وہ جینے کے مفہوم کو محدود کر لیتا ہے اور صفیہ کہتی ہے "جو دوسروں کے لئے جیتا ہے غم اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔

یہ ایک باضمیر اور سمجھدار بیوی جو سارے جہاں کو اپنا سمجھتی ہو۔ وہی کہہ سکتی ہے۔ ورنہ آج کل کی عورتیں سوائے اپنے میکے اور زیادہ سے زیادہ اپنی سسرال سے آگے نہیں سوچ سکتیں۔

اس میں قصور کس کا ہے؟ شاید مردوں کا۔ وہ اپنی بیوی سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کر سکتے۔ اختر نے صفیہ سے دوستانہ تعلق پیدا کر لیا ہے دوسرے مرد گھر اور باہر دو ٹکڑوں میں رہتے ہیں۔ اپنے گھر یہاں کی ایک شخصیت ہوتی ہے باہر دوسری۔ اختر کی ایک ہی شخصیت ہے جو ساده گھر کے اندر ہے ویسا ہی باہر بیوی سے کوئی بات چھپا نہیں رہا۔ حتیٰ کہ اسے دماغ میں فرسٹریشن ہے۔ اس میں بھی وہ صفیہ کو شریک کر لیتا ہے اور اس کی وجہ سے ہر موقعہ پر اسے سہارا ملتا ہے۔ دلوں میں رفاقت ہر ذہنی رفاقت۔ اس کا تذکرہ صفیہ نے ۲۷ اگست ۱۹۵۱ء کے خط میں کیا ہے۔

"جسم کی دوری اذیت انگیز ضرور ہے مگر شکر ہے کہ ہمارے دماغوں کی رفاقت میں کوئی دوری نہیں پیدا کر سکتا۔"

اسی خط میں صفیہ نے اختر کی نظم کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک عنوان پر سردار جعفری اور اختر نے نظمیں کہی ہیں۔ صفیہ نے اپنی طالبات کو دونوں نظمیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تم نے نظم بہت ہی شاندار لکھی ہے لیکن کہیں کہیں بمبئی کا رنگ آگیا ہے ذرا خود پڑھ کر دیکھو اسے۔ بہر حال تمہاری نظم جعفری سے اونچی ہے۔

اس زمانے میں ترقی پسند مصنفین زندہ تھے۔ وہ زندگی کا ثبوت دیتے تھے ان کی مجلسیں ہوتی تھیں اپنی تازہ نگارشات پڑھتے تھے۔

اختر کے جہاں حالات اچھے نہیں تھے وہاں انہیں اور بھی شکایتیں تھیں۔ جیسے انہوں نے انجمن کی کسی نشست میں اپنی نظم "ستاروں کی صدا" پڑھی اس پر کرشن چندر اور مہدی نے چند اعتراضات کئے۔

بناتی ہے تو غالب کو کس زمرے میں رکھیئے گا؟ میر تقی میر کیا ترقی پسند نہیں تھے؟

فارم کے معاملے میں یہ دونوں بھی روایاتی شاعر تھے۔ ترقی پسند نقادوں کے بارے میں صفیہ نے بھی ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ یہ خط ۳ دسمبر ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا ہے۔

"مجھے تو بڑی شکایت ہے اپنے نقادوں سے کہ سوائے اپنے دوست احباب کے دوسرے کی بات ہی نہیں کرتے۔ چند نام لے لئے ہیں انہیں کو سیٹتے رہتے ہیں۔ چاہے ڈھول ہی اڑ رہی ہو۔"

کرشن چندر جب افسانہ نگاروں کا تذکرہ کریں گے۔ تو عصمت، بیدی، اور ایسے ہی دو چار لوگوں کے آگے نہیں بڑھیں گے۔ ہاں عباس کا نام لے لیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان سب کی نظریں کمزور ہیں۔

سردار جعفری اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور دوسرے نقاد جب ترقی پسندی کے منبر پر کھڑے ہوتے ہیں۔ تو وہی گنے چنے اپنے قریب کے شاعروں کا نام لے کر منبر سے اُتر آئیں گے۔ پاکستان کے شاعروں کا ذکر تو کریں گے۔ مگر ہندوستانی شعراء کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے۔ انہوں نے نقوش کو سراہنا شروع کیا تھا۔ اور آج بھی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔

صفیہ نے ۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں نقوش کے سالنامے پر ایک نظر ڈالی ہے اور کہا ہے

"اس مرتبہ نقوش کا سالنامہ مجھ تک پہونچ گیا ہے۔ عجیب خلط ملط قسم کا رسالہ بن چکا ہے دراصل سلطنتِ خداداد پاکستان کا اقتدار نقوش کی پالیسی کو خریدنے میں کوئی دشواری نہ محسوس کرتا ہوگا۔

رسالہ پاکستانی ادب جو آج کل پاکستان سے نکل رہا ہے اُس کا ذکر کوئی نہیں کرے گا۔ خیر یہ تو متعصبانہ اور معاصرانہ ترقی پسند نقادوں کی ایک جچی تلی پالیسی ہے۔

اس بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اپنے ضمیر کے سامنے وہ خود جوابدہ ہیں۔ اللہ کو تو میں بھی نہیں مانتا لیکن نیک نیتی اور ضمیر کو مانتا ہوں۔

اختر کا ضمیر بہت صاف ہے۔ اُس کی نیت بھی نیک ہے۔ نئے لکھنے والے اس کے ہاں اصلاح لیتے ہیں۔ وہ ان کا ذکر بھی کرتا ہے اُن کو بڑھاوا بھی دیتا ہے۔ اور اصل بات جو اختر کو ترقی پسندوں کے حلقے میں زیادہ نہیں اچھال سکی وہ اُس کی مدھم اور دھیمی لے ہے۔ وہ نعرہ نہیں لگاتا۔ وہ چھاتی نہیں ٹھونکتا۔ آستین نہیں چڑھاتا اور ~~بڑھتے بڑھتے~~ اُس کے منہ سے جھاگ نہیں اڑتا۔

اس مدھم اور میٹھی لے کی وجہ سے وہ اس کی مقبولیت کی بام تک نہیں پہنچ پایا۔ جہاں اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے شاعر اُس کے فارم کو اپنا کر اور آواز کو پنجم میں اُٹھا کر زیادہ کامیاب ہوگئے ہیں۔

اختر مذہب کی بات نہیں کرتا۔ مگر اپنے کلچر سے جڑا ہوا ہے۔ ماحول کی نقاشی گھریلو معاملات کی تصویریں وہ خوب کھینچتا ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں جو "گھر آنگن" کے عنوان سے اس نے رباعیات لکھی ہیں اردو ادب میں اس کا ایک انوکھا مقام ہے۔ اس کی دو چار تصویریں دیکھئے۔

اے آدمِ نو زندہ باد
تابندہ و پائندہ باد

اسے توہم پرستی پر مبنی کیوں کہا گیا ہے۔ صفیہ کی طرح اپنی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔
اصل میں اختر کو کلاسیکی انداز اور لہجہ وراثت میں ملا ہے۔ اس کے ہاں کھردرا پن یا اکھڑ انداز اور گنوارو طرز، نہیں ہے، شائستگی اور مہذب اسٹائل اُس کا شیوہ ہے۔
اختر کے والد مضطر خیر آبادی مشہور شاعر تھے۔ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔
صفیہ نے ایک خط میں ذکر کیا ہے۔
"موسم الگ جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ دوست! تمہارے ابّا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ٹھمری ہے۔

"ایسے دِنن برکھا رُت آئی، گھر ناہیں ہمرے شیام رے۔"
مضطر کا ایک بر ہا لوبی میں بہت مشہور ہے۔

"چھا رہی کالی گھٹا جیرا مورا لہرائے ہے

سُن ری کوئل باوری تو کیوں ملہاریں گائے ہے"

اختر نے پیدا ہوتے ہی اذان کے بعد شعر ہی سنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کے اذان سے پہلے شعر ہی اُس کے کانوں میں پڑا ہوگا۔ اختر اس ماحول میں پلا بڑھا۔ انداز اُسی ماحول کا لے کر آیا۔ بزرگوں کی شاعری کا فارم (طرز) موسیقارانہ تھا۔
ترقی پسندوں نے جب روایات سے بغاوت کی تو اس فارم کو توڑ کر نئے نئے تجربے ہونے لگے۔ اور بزرگوں کی مخالفت پر اس طرح کمربستہ ہو گئے کہ ان کی ہر چیز کو ٹھکرانے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگوں کی حویلی شکستہ تھی۔ دیمک خوردہ تھی۔ اُسے توڑ کر پھر سے اُس کی تعمیر لازم تھی۔ مگر اُس پرانی حویلی کے بام و در میں کچھ ہیرے اور جواہرات بھی ٹنکے ہوئے تھے اگر کوئی ان کو چن لیتا ہے تو اس پر نکتہ چینی کی کیا ضرورت ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ وہ بنا کیا رہا ہے۔
شاعر جو کہہ رہا ہے۔ اُس میں رجعت پسندی تو نہیں۔ مگر ہم لوگوں نے ایک خاص نظریہ اپنا لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے ماضی کو بالکل توڑ ڈالیں گے۔ اُس کو مٹا دیں گے۔ لیکن زمین کو کیسے مٹائے گا۔ جو کچھ بنے گا اُسی زمین پر بنائے گا۔ نا۔
شاعری کی یہ زمین اختر نے بزرگوں سے ہتھیا لی ہے۔ اُس پر وہ ترقی پسندانہ نظریئے کے محل تعمیر کرتا ہے۔ اُن میں فٹ پاتھ چھاپ غریب عوام اُس کی عظمت کے گیت گاتا ہے۔
اس پر اُسے روایاتی شاعر کہہ دیا جاتا ہے۔ قافیئے اور ردیف کی پابندی اگر انسان کو روایاتی شاعر

آپ روز دیکھ کر بھی دھیان نہیں دیتے۔ وہ انہیں اس طرح محسوس کرا دیتا ہے کہ آپ کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ دل کے اندر ایک رس گھلنے لگتا ہے۔

اختر کی ہر نظم ایک اثباتی انداز رکھتی ہے وہ انسان کو مایوسی کی طرف جانے ہی نہیں دیتا۔ اور اس کی نظریں زندگی کے حسن کو ڈھونڈھ لیتی ہیں۔ انسان کے دل کی گہرائیوں میں جو درد ہوتا ہے اُس کو محسوس کر لیتی ہیں۔ اور پھر اُس کے شعر پڑھنے اور سننے والے کے دل بھی دھڑکنے لگتے ہیں۔ ترقی پسندی کے لئے محسوس خیال کی ضرورت ہوتی ہے۔

اِدھر دو طرح کے شاعر ترقی پسند دنیا میں پائے جاتے ہیں ایک، وہ جو محسوس کر کے نعرہ لگا دیتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو سوچ کر کہہ دیتے ہیں یہ دونوں خاصتیں یکجا ہونی چاہئیں۔ پہلے کسی احساس سے گزرنا، پھر اُس کو سوچنا اور اس کے بعد دونوں کا یعنی خیال اور احساس کا امتزاج کر لینا اسے شعر میں ڈھال دینا۔ یہ ترقی پسندی ہے اور اختر کی شاعری کا راز یہی ہے۔ اُس کے یہاں احساس اور خیال کا امتزاج ملتا ہے۔

„ستاروں کی صدا،، کو صفیہ نے اپنے کالج کے اسٹیج پر کبھی ڈرامائی انداز میں پیش کیا۔ اور اس کو بے حد داد ملی، صفیہ نے کہا کہ اب تو اس طرح تمہاری یاد تازہ ہو جاتی ہے،،

اختر صفیہ کو کتنی محبت کرتا ہے۔ اس کے بارے میں صفیہ نے، دسمبر ۱۹۵۰ء میں کہا ہے۔

„اختر بہت سی باتیں تم ایسی لکھ دیتے ہو۔ جن سے میں خود کو کم پاتی ہوں۔ یاد ہے تم نے میرے لئے معصوم کا لفظ استعمال کیا تھا میں کانپ گئی۔ کاش میں تمہاری توقعات کی تکمیل کر سکوں۔ تم میرے لیے کیسی حسین اور کتنی شیریں یادیں رکھتے ہو۔ میرے پاس وفاداری اور محبت سے زیادہ کیا پا سکو گے۔ حسن، تندرستی جوانی کاش یہ سب کچھ میں تمہیں دے سکتی اور تمہارے لئے خود سب پیدا کر سکتی۔ بہرحال تم میری وفاؤں کے قدرشناس رہو۔ اور میں اپنی زندگی اس طرح پوری کر لوں!،،

ہر عورت محبت کرنا جانتی ہے۔ لیکن جب اُس کا محبوب اُس پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتا ہے تو وہ خائف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عورت کو قدرت نے محبت کا جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اور مرد صرف اپنے فرائض پورے کرتا ہے۔ اسی فرائض سے ہی اُس کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ اگر وہ کرے تو عورت کو ایسا احساس ہونے لگتا ہے کہ اُس کے مقام پر کوئی مخالفانہ قبضہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں صفیہ نے اپنے تحت الشعور کی بات کو اس طرح کہا ہے کہ اختر کی فطرت کبھی اتنی بے اُجاگر ہو جاتی ہے

„تم نے ایک آدھ بات ایسی لکھ دی ہے جس سے میں اتفاق نہیں کر سکتی۔ اختر تمہاری فطرت میں تھکاوٹ کا احساس مجھے آج تک نہیں ہوا۔ تمہاری ہر صلاحیت بھرپور طریقے پر آج بھی زندہ ہے۔ تم بے پناہ محبت اور شدید نفرت کر سکتے ہو۔ میں تمہاری محبت اور نفرت دونوں سے ہمیشہ خائف رہی۔ یہ تمہاری کمزوری نہیں صبری ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ کمزوری بھی نہیں۔ میں بہ جانے کی قائل نہیں رہی۔ میں تمہارے قدم کبھی ہمیشہ زمین پر ٹکانے چاہے۔ اس سے اگر تم یہ سمجھو کہ تمہیں میرے دل کی وہ محبت نہیں مل سکی جو تم چاہتے تھے۔ تو میں یہ بات نہ مانوں گی۔ اختر تم چاہ سکتے ہو اور دیوانہ وار چاہ سکتے ہو۔ میری چاہت دیوانی ہو کر

مرد - "پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے
لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں"

عورت - "خود ہل کے وہ کیا مجال پانی لے لیں
ہر رات بندھا ہوا ہے یہی دستور
سرہانے بھی چاہے بھر کے چھاگل رکھ دوں
سوتے سے مگر مجھے جگائیں گے ضرور"

مرد - "چہروں کے حسین چاند تو کھلتے دیکھے
ہم گیتوں کے دل رُبا حسیں مکھڑوں میں
لیکن یہ تیری پلیٹھ کی گہری کھائی
تُو جیسے بٹی ہو دو ٹکڑوں میں"

عورت - "بس آپ نے پان خود لگایا ہو گا
گردی ہے میرے لئے مصیبت اچھی
میں سوچ رہی تھی کہ بھلا کتھے میں
چونے کی کس نے ڈال دی ہے چمچی"

اپروچ اختر کے یہاں کیا خوب ہے۔ اور یہ مڈل کلاس گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ جنہیں انسان روز دیکھتا ہے۔ لیکن جب شاعر انہیں دکھاتا ہے۔ تب ان باتوں کا حسن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اختر میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو

"میرا دل رہ رہ کر کہتا ہے کہ تم میرے بمبئی نہ آنے سے ناراض ہو۔ لیکن اختر کبھی یہ نہ تمہارے لئے کوئی کمی کی ہے۔ جو آج ایسا ممکن ہوتا۔ میری مجبوری اور بے بسی کا یقین کرو۔ اور اس اعتماد کو نہ مٹاؤ جو ہمارے آٹھ سال کے ساتھ کی پیداوار ہے۔ تم مجھ پر اعتماد پیدا کرو۔ دوست! میں تم سے باہر نہ ہو سکوں گی۔ میرا ہر قدم تمہارے لئے یہی آتے تھے بڑھتا ہے۔ لیکن میرا حوصلہ تمہاری برہمی سے پست ہونے لگتا ہے۔ مجھے کسی طرح بیماری کے چکر سے نکال لے جاؤ اختر! میں اس کے لئے کسی کی ممنت کش ہونا نہیں چاہتی۔ آؤ سب کچھ بھول کر مجھے اپنے سینے سے لگا لو!

تمہاری

صفیہ

اختر پھر لکھنؤ گیا ہے۔ ڈاکٹروں سے ملا۔ اُس کے علاج کے لئے پریشان ہے۔ بیوی کو تسلی دیتا ہے۔

اختر کہتا ہے ــــ لکھنؤ میں صفیہ نے مجھ سے کہا۔

"اچھا اگر میں مر جاؤں گی تو تم مجھ پر بڑی دردناک نظم لکھوگے۔ ؟"

اختر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔ اپنے احساس کی گہرائیوں میں اتر رہا ہے۔ درد کے طوفانی تھپیڑے کھا رہا ہے۔ مگر بیوی سے مسکرا کر کہتا ہے۔

"بے کار کی بات ہے۔ تم مر مت! ہم نظم وظم کچھ نہیں لکھیں گے۔"

اختر آج بھی اُس کا ذکر کرتا ہے تو اُس کی آنکھیں جھلجھلا جاتی ہیں۔

اختر اس کے بعد بے چین ہو گیا۔ وہ بیوی کو کسی طرح بچا لینا چاہتا ہے۔ اُس نے بمبئی میں کام ڈھونڈ لیا ہے۔

ایک کمرے کا بندوبست کیا ہے۔ بچوں کو خود سنبھالا ہے۔

صفیہ کو علاج کے لئے جے جے ہسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔

صفیہ بہتر ہو گئی ہے۔ واپس چلی گئی ہے۔ اب یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ صفیہ بمبئی کے علاج سے بہتر ہو گئی ہے۔ یا اختر کی قربت سے واللہ اعلم!

بھوپال میں پھر بیماری عود کر آئی ہے۔ اختر اُسے دوبارہ بمبئی بلانا چاہتا ہے۔ اُس نے صفیہ کو روپئے بھی بھیجے ہیں۔ لیکن صفیہ کے خطوط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بمبئی نہیں آنا چاہتی کیونکہ اختر کو بچے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ اور صفیہ کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ وہ لکھنؤ جانا چاہتی ہے وہاں میکے میں اُس کی دیکھ بھال بھی ہو گی۔ اور بچے بھی سنبھلے رہیں گے۔

اس کے بعد صفیہ لکھنؤ میں ہے اور اختر بمبئی میں۔

اختر کے حالات دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں۔ صفیہ کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ اب صفیہ سفر کے قابل نہیں ہے۔ کالج والوں کو اُس نے چھٹی کی درخواست بھیج دی ہے۔ جون تک اختر کے لئے تڑپ

بھی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرتی۔ محبت کے اس امتزاج کے سہارے ہم یہاں تک پہنچے ہیں جہاں ہم ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور بے معنی رہ جاتے ہیں۔ دوست مجھے تم سے وہ ملا جو دنیا میں تمہیں سے مل سکتا تھا۔ زندگی کے عظیم الشان تجربے، سماج کی عزت، بچے، گھر، کردار، شخصیت سبھی کچھ تو میں نے تم سے پایا۔ پھر بھی ایسا سوچ کر دل دکھاتے ہو کہ تم مجھے کچھ نہ دے سکے۔ زندگی کے حالات الجھے ہوئے ہیں دوست! آؤ ایک دوسرے پر اعتماد بڑھائیں تم میرے سامنے سرخرو اور سر بلند ہو کر آؤ! تم نے مجھے ایک انوکھی اور نرالی زندگی دی ہے۔ جو تمہارے بغیر میں نہیں پا سکتی تھی۔ ایک شاعر کی بیوی ہونا کوئی معمولی رتبہ نہیں اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر احساس کی یہ لطافتیں میرے حصے کی نہ ہوتیں تو زندگی کتنی بے کیف ہوتی اور مکدر۔"

شاعر کی بیوی ہونے پر صفیہ کو کتنا غرور ہے۔ اور ادھر شاعر کی حالت یہ ہے کہ پھٹے حال بمبئی میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ باہر نکلنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ کیونکہ شاہین پکچرز بند ہو گئی ہے۔ اب شاہد کا دھیان نہیں ہے۔ فلمستان والوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اور کام نہیں مل رہا ہے۔ خلیل سے ادھار لیتے ہیں دیوار وں پر حساب لکھتے ہیں اور گذر کر رہے ہیں۔

صفیہ بیمار ہے اُس کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر خط میں وہ بیماری کا ذکر کرتی ہے اور اپنے شوہر کو ڈھارس بھی دیتی چلی جاتی ہے۔

جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل خلیل صاحب ان کے فنانسر ہیں تو لکھتی ہے کہ۔

"مجھ سے فنانس مانگ لیا ہوتا۔"

اختر بیوی کی بیماری کی وجہ سے ازحد پریشان ہے۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں بیماری نہیں آ رہی ہے۔ میڈیکل کانفرنس تک ہو رہے ہیں۔ ایلوپیتھی سے لے کر ہومیوپیتھی تک کے علاج ہو گئے ہیں، مگر حالت نہیں سنبھلی۔ ڈاکٹر بوس کہتا ہے۔ صفیہ کی بیماری اعصابی ہے اُس کو نارمل لائف میسر آنی چاہیئے یا صفیہ کو کوئی مختلف فلاسفی آف لائف اختیار کرنی چاہیئے۔

ڈاکٹر ٹی بہادر کا کہنا۔ یہ بیماری NERVS SHOCKS ہے۔

اپنا دُکھ درد اپنے تک رکھنا اس سے اس بیماری کی ابتدا ہوتی ہے۔ صفیہ اکتوبر کے خط میں کہہ رہی ہے۔

"اختر میں نے اپنے پیار سے تمہیں جیتا ہے۔ تم بھی مجھے ایک بار زندہ کرو۔ تم آجاؤ تو شاید میرا علاج کارگر ہو جائے۔ تم نہیں آ رہے اور خط بھی نہیں لکھ رہے۔ میں چپ رہتی ہوں اور ہر لمحہ BROOD کرتی ہوں نہ جانے انجام کیا ہوگا۔ بچے الگ تمہاری آمد کے متعلق مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں۔ تم آجاؤ مجھے میری زندگی واپس مل جائے گی۔"

اس خط کو پڑھ کر لگتا ہے اختر بڑا پتھر دل ہے۔ بیمار بیوی کو خط نہیں لکھتا وہ تڑپ رہی ہے ملنے کو ترس رہی ہے۔ خود بمبئی میں عیش کر رہا ہے۔ عیش سے مطلب؟ غریبی سے لڑ رہا ہے لیکن اپنی ذمہ داریاں سب کی سب بیمار بیوی پر ڈال رکھی ہیں۔ اول درجہ کا خود غرض ہے اختر!

مگر نو دن بعد ۲۶ اکتوبر کا خط پڑھ کر صفیہ خود بھی Reason out کر رہی ہے۔

میرے بے شمار پیار تم پر نچھاور ہیں -

تمہاری اپنی صفو ! "

اس خط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۔ ۰ اب حال جو ہونے والا ہے وہ تم سے نہ دیکھا جائیگا،، صفیہ کی کہانی لکھنؤ سے لکھے گئے خطوط سے ظاہر ہو گئی ہے ۔ اختر کی کہانی میں سناتا ہوں ۔

اُس زمانے میں اختر ،، ڈنکا ،، کے گانے لکھ رہے تھے ۔ ایڈوانی اُس کے ڈائریکٹر تھے ۔ نمی پروڈیوسر تھیں ۔ یہاں فلم انڈسٹری کا ایسا دستور ہے کہ پہلے کہانی میں گانے کی سچویشن پر ڈسکس ہوتی ہے ۔ پھر میوزک ڈائریکٹر اُس کی دھن بناتے ہیں اور پھر شاعر لکھتے ہیں ۔ جب گانا ریکارڈ ہوتا ہے ۔ تب میوزک ڈائریکٹر اور میوزیشینز کو روپیہ دیا جاتا ہے ۔ اور اس کے بعد شاعر کا معاوضہ ادا ہوتا ہے ۔ اختر اُس ایک گانے کا انتظار کر رہا ہے کہ روپیہ ہاتھ میں ہو تو وہ لکھنؤ جائے ۔ بیمار بیوی جس کا بھائی راہی کے پاگل خانے سے آیا ہے اُس کو ملے ۔ اپنی شریک حیات کی تیمارداری کرے ۔ مگر وقت گذرتا جا رہا ہے ۔ وہ انتظار ہی کر رہا ہے ۔

حتیٰ کہ اختر کو تار ملتا ہے ۔ کہ صفیہ کی حالت نازک ہے ۔

اختر ایڈوانی کے پاس جاتا ہے ۔ اُس کی طرف پانچسو روپے نکلتے ہیں ۔ ایڈوانی اُس سے کہتا ہے کہ پروڈیوسر کے پاس جایئے !!

وہ نمی کے پاس پہنچ گیا ہے ۔

نمی نے کہا ہے "تین چار دن میں آپ کے روپے مل جائیں گے ۔"

اختر لکھنؤ کا تار دکھاتا ہے ۔ نمی کے گھر سے پچاس روپے لیتا ہے ۔ اس تگ و دو میں چوبیس گھنٹے بیت گئے ہیں ۔ اختر نمی کے گھر سے سیدھا اسٹیشن بھاگا ہے اس نے گاڑی پکڑ لی ہے گاڑی بھاگ رہی ہے لیکن اختر کو گاڑی کے رینگنے کا احساس ہو رہا ہے ۔ وہ کیا کرے ۔ آخر وہ لکھنؤ پہونچا ہے ۔

گھر کے کمپاؤنڈ میں بچے ملتے ہیں ۔ جاوید اور اویس ۔ ،، ابی آ گئے ۔ ابی آ گئے ۔،، شور مچتا ہے ۔ اختر بچوں سے ملے بنا بیوی کے کمرے کی طرف بڑھ جاتا ہے ۔

گھر کے اندر خاموشی ہے ۔ سناٹا ہے سب اختر کو دیکھ رہے ہیں ۔ اختر سب کو دیکھ رہا ہے ۔ اختر گھر آ گیا ہے کوئی بول نہیں رہا ہے ۔ سب دیکھے جا رہے ہیں ۔

یکایک حمیدہ صفیہ کی چھوٹی بہن اپنے بہنوئی کو دیکھ کر پھوٹ پڑتی ہے ۔ سب رونے لگتے ہیں ۔ اور اختر کو چاروں طرف سے موت کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں ۔

صفیہ گھر میں تھی کہاں ۔ ! وہ تو قبرستان میں دفن ہو چکی تھی ۔ اختر نے صفیہ کی قبر پر پھول نہیں چڑھائے

آنسو ارپن کئے ۔ یہ آنسو نہیں دل کے ٹکڑے ہیں ۔ اختر کے احساس نے خون ٹپکایا ہے ۔ جو خاک میں ملا ہے ۔ یہ خون ۔ اختر نے نظم کہی ہے ۔

رہی ہے ۔ اُدھر اختر صفیہ سے ملنے کے لئے بے چین ہے ۔ اُن کے پاس روپئے نہیں ہیں ۔
اختر ہر خط میں ایمانداری سے آنے کا وعدہ کرتا ہے مگر حالات نے اُسے بمبئی میں قید کر رکھا ہے ۔
۲ مئی ۱۹۵۲ء کے خط میں صفیہ نے اختر کے وعدوں کے بارے میں کہا ہے کہ

" آنے کے بارے میں تمہارے وعدے ایشیائی محبوبوں کے وعدوں سے کم نہیں ۔
سوچو تو سہی اپریل سے آرہے ہو ۔ یہ سب سہی ۔ لیکن تم میرے لکھنؤ کے قیام میں ضرور آجاؤ اس کے بغیر اچھی نہیں ہو سکوں گی ۔ "

۳ ر نومبر کے خط میں کہا ہے ۔

تم آسکو تو آجاؤ میں چارپائی سے لگ گئی ہوں ۔ "

اُسی خط میں صفیہ نے آخر میں لکھا ہے " اختر خط لکھو تھک مت جاؤ ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے ۔ ہر طرح تمہیں مجھے سنبھال سکتے ہو مجھے دیکھو !
میں آج مر کر بھی مایوس نہیں ہوں ۔

بہت سے پیار
تمہاری اپنی صفو !

۲۳ ر دسمبر کے خط میں لکھا ہے ۔

دسمبر کا مہینہ تمہارے انتظار میں بیت گیا تو اب کیا جنوری میں آنے کا قصد کر رہے ہو ۔ میرے بہت سے پیارے دوست ! میں جانتی ہوں تم میری ہی ضرورتوں کی خاطر وہاں پریشان ہو رہے ہو ۔ لیکن ایک بار مجھے اپنی صورت دکھا جاؤ ! جنوری میں فرصت ہی آ گیا تو اس سے زیادہ مجھ میں انتظار کی سکت نہیں ساتھی "

آخر میں لکھا ہے تمہارے دیدار کی پیاسی ۔

صفیہ "

اور ۲۹ ر دسمبر ۱۹۵۲ء کا آخری خط ہے

" عزیز اختر ! میری جان
نظم ملی ۔ تمہارا بہت پیارا تحفہ ! سچ جانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے ۔ آج میں کتنی مغرور ہوں اور ناز اں ، مجھے تمہاری محبت ، ملائمت ، دوستی شفقت ، خلوص ، اور اعتماد سب کچھ تو حاصل رہا ہے آج مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے تمہاری شاعری کو بھی جیت لیا ہے ۔ اب مجھے اور کیا چاہیئے ۔

اختر آؤ ! تم مجھے مرنے نہ دو ۔ میں مرنا نہیں چاہتی البتہ میں تھک بہت گئی ہوں ساتھی ! آؤ میں تمہارے زانوں پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں ۔ پھر تمہارا ساتھ دینے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوں گی ۔

باقی

جاں نثار اختر کی زندگی کا ایک ورق

ع۔ ورقِ گُل بہ کفِ باد صبا می بینم

ایک بے داغ
رُومان کے
کاجلی ابر
کی ہم سفر

اُجلی اُجلی
برہنہ حوا سی
کُھلے بابِ گُل سی ــــــ
محبّت کی جانب
رواں

رہ گذر رہ گذر
خوابِ گُل کا
دُھواں
منظرِ شام پر

یہ وہی نظم ہے جس کی فرمائش کبھی صفیہ نے کی تھی۔ اور اختر نے جس کے نہ کہنے پر اصرار کیا تھا۔

لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زارِ وطن

تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار

اپنی دنیائے حسین دفن کئے جاتا ہوں

تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی!

آج وہ بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

نوٹ :- نمی نے وعدے کے مطابق دو تین دن کے اندر ۵۰ روپے کا منی آرڈر لکھنؤ بھجوا دیا۔


آپ اسی وقت عظیم
ہو سکتے ہیں جبکہ آپ کی قوم عظیم ہو
— اور قوم کی عظمت اسکے نوجوانوں کی
مساعی اور کامرانیوں پر منحصر ہے
اپنے دیش کو
آزاد کرانے کے لئے ہمارا بہت خون بہا ہے
آج کے نوجوان کو
ملک کو عظیم بنانے کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہیئے
اس عظیم قوم کی تعمیر میں نوجوان
نسل کو اپنا زبردست کردار یقیناً
ادا کرنا چاہیئے
مہاراشٹر کے نوجوان قومی تعمیر نو کے
فوری کام میں ہمیشہ پیش پیش
رہیں گے
آیئے ہم ہر میدان
میں پیداوار بڑھانے
کا عہد کریں تاکہ
سماجی انصاف اور
ترقی کی سمت
قدم تیز سے
تیز تر ہو

دُور جاتی ہوئی
اِک نگاہ
آس پاس
آبِ گُل
کی پناہ
لمسیاتِ شگفتہ کی
آماجگاہ !

دستِ اقرار میں
ایک حنائی
تعلّق کی جھنکار
لیکن
بہت مختصر
کیا بکھر سا گیا
ٹوٹ کر
کون تھا
تجھ سے رخصت ہوا
کون تھا
ایک بے داغ
رُومان کے
کاجلی ابر
کا ہم سفر !!



صرف یہی کافی نہیں کہ آپ پڑھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کیا پڑھتے ہیں۔ نئی ہند پاکٹ بکس حاضر ہیں جو زبان و ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

آئینے اکیلے ہیں (ناول)
کرشن چندر ۳/-

نازک خیالیاں (طنز و مزاح)
کنہیا لال کپور ۲/۵۰

مہارانی (سچی داستانیں)
دیوان جرمنی داس ۴/-

پُراسرار قاتل (جاسوسی ناول)
کرنل رنجیت ۴/-

ناز و انداز (شعر و شاعری)
مرتبہ پرکاش پنڈت ۲/۵۰

ہماری دیگر مطبوعات

دو روپے قیمت کی کتابیں:-

ایک معمولی لڑکی (ناول) بلونت سنگھ
عورت اور آبشار 〃
خلش 〃 امرتا پریتم
بندگی 〃 ہنس راج رہبر
یاد 〃 پرل بک
فسانۂ عجائب 〃 رجب علی بیگ سرور
فرانس کے عظیم ناول (افسانے) مرتبہ: رانگے راگھو
روس کے عظیم ناول 〃 〃
انگریزی کے عظیم ناول 〃 〃
پلنگ 〃 اوپندر ناتھ اشک
گستاخیاں (طنز و مزاح) کنہیا لال کپور
بک رہا ہوں جنوں میں 〃 پرکاش پنڈت
فلمی قاعدہ 〃 کرشن چندر
جان پہچان (سوانح) / افسانہ نگاروں سے انٹرویو — نریش کمار شاد
میری سنو (اخلاقیات) خلیل جبران

امول موتی (اخلاقیات) مرتبہ: مالتی ہنس
گلکاریاں (شاعری) فراق گورکھپوری
قتل کا راز (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
چھ لاشیں 〃 〃

ڈھائی روپے قیمت کی کتابیں:-

پیار ایک خوشبو (ناول) کرشن چندر
پہلگام کا بدنام 〃 〃
میلی چاندنی 〃 گلشن نندہ
محبت اور قتل کے / پراسرار مقدمے — پرکاش پنڈت
برتھ کنٹرول (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
میاں بیوی کے / جنسی تعلقات — 〃 〃

تین روپے قیمت کی کتابیں:-

آنکھ کی چوری (ناول) کرشن چندر
سات ہندوستانی 〃 خواجہ احمد عباس
دو بوند پانی 〃 〃

رات اندھیری ہے (ناول) مہندر ناتھ
ہجر و وصال (شاعری) مرتبہ: پرکاش پنڈت

چار روپے قیمت کی کتابیں:-

نرملا (ناول) پریم چند
چنبل کی چمبیلی 〃 کرشن چندر
عجیب آدمی 〃 〃
بڑی بڑی آنکھیں 〃 اوپندر ناتھ اشک
جھیل کے اُس پار 〃 گلشن نندہ
کالے کوس 〃 بلونت سنگھ
ٹیڑھی انگلیاں (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
خونی کنگن 〃 〃
بھیانک مورتی 〃 〃
خون کے چھینٹے 〃 〃
موت کے بیوپاری 〃 〃
یادوں کی برات (سوانح) جوش ملیح آبادی
آپ بیتی 〃 خان عبدالغفار خاں

تمام کتب فروشوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں
ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ جی ٹی روڈ، دہلی ۳۲

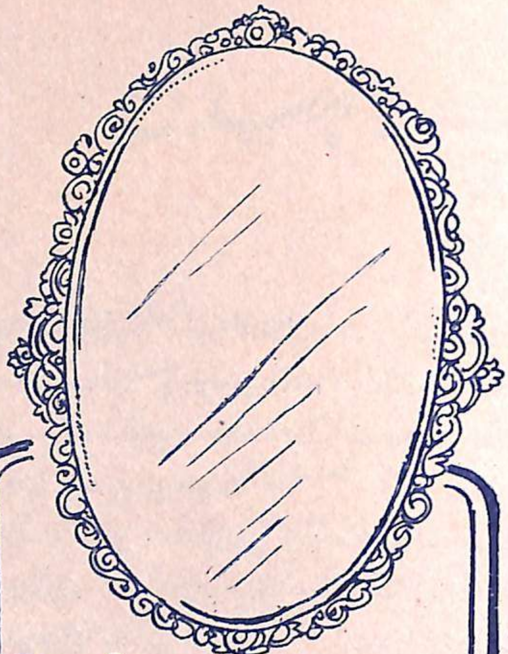
اپنے محبوب ترین شاعر

جاں نثار اختر

کیلئے

دلی عقیدت کے ساتھ

گنیش بہاری طرز لکھنوی



آئینہ خانے میں

جاں نثار اختر نمبر

کیلئے

نیک خواہشات

شام کشن نگم

صفیہ اختر (مرحومہ)

گھر کا بھیدی

رفعت صاحب کی اس انوکھی فرمائش کی داد دینی پڑتی ہے۔ شوہر جیسی واجب التعظیم ہستی کی شان میں قلم اٹھانے کے بعد حمد و ثنا کے اسلوب ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی کوئی سوال کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ آیا یہ پرستش خوف کے ماتحت ہے یا محبت کا نتیجہ؟ اس ذہنی کشمکش کو حل کرنے کے لئے نہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہ مجھے مدد درکار۔ اس نازک اور دلچسپ ذمہ داری کو مجھ پر ہی چھوڑ دیجئے۔ رہا لنکا ڈھانا سو تو یہ کام تو سرکش اور سماج سے باغی راکھشش راون کے خدا پرست بھائی نے ہنومان جی سے سازباز کر کے انجام دیا تھا اور وہ بھی اپنے جذبۂ ایمان کا سہارا لے کر ایک مقدس فرض کی خاطر بیچاری بیوی تو روز ازل سے شوہر کی ہر ادنیٰ اعلیٰ خدمت کے لئے کنیز بنا کر بھیجی جاتی ہے۔ وہ اپنی مقدس لنکا کو ڈھانا شروع کر دے تو بحرِ ہند کی ہیبتناک موجوں میں غرق ہو کر کبھی واپس نہ آنے کا تہیہ پہلے کر لے۔ بہرکیف چونکہ فرمائش خاص توقع کے ساتھ کی گئی ہے اس لئے تعمیل ضروری ہے تاہم اسی شرط پر کہ نہ آپ مجھے گھر کا بھیدی قرار دیں نہ میں لنکا ڈھاؤں! اسی میں میری سلامتی ہے اور بحیثیت مجموعی پوری انسانیت کی فلاح ہے۔

اختر کے مرنجان مرنج انداز اور دوسروں کی ہر بات پر وہ مستقل جنبش سر وہ بھی نیچی نظر اور میٹھی مسکراہٹ سمیت ان کے احباب پر ان کی نیک مزاجی کا نقش قائم کئے ہوئے ہے لیکن شاید ہی آپ اس صداقت پر اعتماد کریں کہ اختر کی نازک مزاجی کو گوارہ بنانے کے لئے گاندھی جی کے اہنسائی قلب و جگر کی ضرورت ہے خواہ اپنا دل شیشے سے سوا نازک کیوں نہ ہو لیکن خوئے دوست کے نازک تر ہونے کا سوال ہے۔ اس لئے اگر اس بلائے جان سے نبھائے رکھنی ہے تو کسی موقع پر لہجہ میں یا گفتگو میں تندی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ معاملات تخریب کی حد تک ایک جست میں پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ فطرت نے معاوضے کے طور پہ اُن میں بچوں کی سی معصوم مسرت کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے جس سے شاید وہ زندگی بھر کبھی محروم نہ ہو سکیں گے۔ اگر ان کی طبیعت میں چڑ نہ پیدا کی جائے تو وہ خود اپنی طرف سے شورش نہ پیدا کریں گے اور دل آزاری کا باعث نہ بنیں گے۔ ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اُن کا شدید طریقہ پر حساس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ غصہ و غم، کیف و مسرت دونوں حالتوں سے برابر متاثر ہونے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ شدید ہے۔ اسی طرح محبت اور نفرت دونوں میں شدت پسندی سے بری نہیں۔ ان کے ضمیر میں جذبات کا عنصر زیادہ ہے اس لئے وہ معاملات پر تنقیدی نظر رکھنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں۔ یہ میں اختر میں کوئی نرالی بات نہیں بتا رہی البتہ اس سلسلے میں ایک کمی جو میں اُن میں پاتی ہوں وہ یہ کہ ان میں ذاتی معاملات کے سلسلے میں تفریحی شعور بیدار رکھنے کی صلاحیت نہیں۔ یہ چیز تضاد کے طور پر مجھے اپنے بھائی مجاز میں ملتی ہے۔ ان کے شکستہ حالی اور بربادی کے بعد بھی اُن میں آپ "خندہ ہائے بیجا" کا دماغ پائیں گے۔ اختر غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں دونوں حالتوں میں اٹکھیلیوں سے بیزار ہی نظر آئیں گے۔ انہیں سپردگی میں لذت حاصل ہے

پیدا ہو جانا۔ اُن کی یہ نازک مزاجی اور نفاست پسندی ان کی مجموعی لاپرواہی سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی۔ آپ کو ان کی اچھی سے اچھی قمیص بغیر بٹنوں کے نظر آئے گی۔ سیپ کے بٹن کے وہ قائل نہیں چنانچہ ہر دوسرے تیسرے مہینے اگر بٹن کا ایک سیٹ منگوا کر ان کی نذر کر دیا جاتا ہے تو کس کام کا؟ دو ایک ہفتے کے اندر اس راہ میں آخر تھک تھک کے ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا ۔۔ کا مصداق بن جاتے ہیں اور اختر حسبِ دستور چاک گریباں ہی نظر آتے ہیں۔

کپڑے بنانے کا تو سوال ہی کیا بدلنے کا خیال بھی انہیں دلانا پڑتا ہے اگر خوش نصیبی سے کسی ذہنی ابتلاء کے دور سے نہیں گذر رہے ہیں تو اِس آرزو کو قبولیت نصیب ہو جاتی ہے ورنہ الیسوں سے التجا کر کے، بات تو کھوئی ہی جاتی ہے۔ نہانے میں حد درجہ چور، جانے اختر کا سلسلۂ نسب "ڈارون کی تحقیق کی رو سے ایسے جانوروں سے تو نہیں ملتا جو پانی سے تحفظِ حیات کی خاطر جبلّی طور پر خائف ہوتے ہیں۔

اختر کی لاپرواہی لباس پوشاک اور بالوں پر خاص طور سے نمایاں رہتی ہے، گویا بڑے دکھ میں رہتے ہیں شاعر بیچارے کا اظہار انہیں اپنے حلیئے کے ذریعہ پسند ہے۔ البتہ وہ اپنی کتابوں، کاغذات اور خطوں وغیرہ کے متعلق بہت باخبر اور ذمہ دار ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان معاملات میں مجھے خود ان سے مدد مل جاتی ہے۔ خط لکھنے میں بھی زیادہ سست نہیں۔ تاہم جواب دینے کی ساری ذمہ داری وہیں تک ہے جہاں دوستانہ لگاؤ ہو یا ذاتی فائدہ۔

احباب کے معاملے میں اختر کی طبیعت خاصی دیر آشنا ہے۔ خود کبھی پیش قدمی کر کے کسی سے ملنے کے عادی نہیں۔ نہ تیزی سے ربط ضبط بڑھانے کے قائل، البتہ ہم مذاق اور ہم مسلک دوستوں سے ان کی وفاداری استوار ہے، اُن کے تذکروں سے اکثر تنہائی کے لمحوں میں گرمی اور روشنی پیدا کرنا اختر کا محبوب مشغلہ ہے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں اختر کی کم گوئی کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ گفتگو میں خاصی مستعدی اور گرما گرمی سے شریک نظر آتے ہیں۔ البتہ ان کے رخصت ہوتے ہی اس محفل کے کیف کی تردید اکثر اس طرح کرتے ہیں "لاحول ولاقوۃ، تمام وقت ضائع ہو گیا۔ سخت کوفت ہو رہی ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ان کی ایک ادا ہے جسے ادا سمجھ کر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس اظہار میں حسنِ ادا کا کتنا دخل ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اختر کبھی محفل میں جائیں تو ان کا مشاہدہ ادنیٰ جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، بظاہر وہ اپنے انداز سے کھوئے کھوئے بے خبر سے نظر آتے ہیں لیکن ان کا شعور بڑی تیزی اور بے داری سے کام کرتا ہے۔ کسی کے چہرے پر رنگ آنے، کسی کے آنچل ڈھلک جانے، یا کسی کے لہجے میں تلخی جھلک جانے کا احساس انہیں بہت تیزی سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی موجودگی مجھے محفلوں میں Self concious بنا دیتی ہے۔

اختر کے مذاقِ حسن پر کوئی بحث اٹھانی میرے لئے کس حد تک موزوں ہے اس پر غور کرنے کا ارادہ ملتوی رکھئے تو میں آپ کو یہ راز کی بات بتاؤں کہ عموماً شوہر کی پسندیدہ خوبصورتی سے بیوی کو شدید انکار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں معاملہ برعکس ہے میں اکثر اختر کی پسند سے متفق نظر آتی ہوں جبکہ اختر میرے مذاقِ حسن کی داد دینے پر شاید ہی کبھی آمادہ ہوتے ہوں۔ "لاحول ولاقوۃ، کیا بھدی سی صورت تھی، کیسا پھیکا سا چہرہ تھا" وغیرہ۔ ان کی تنقید کے اہم فقرے ہیں۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ لطیف و پاکیزہ حسن سے زیادہ انہیں شوخ اور VOLUP TUOUS حسن متاثر کرتا ہے۔ حسن کے معاملے میں وہ روحانی لطافت سے زیادہ حواس کے کیف کے قائل ہے۔

اُن کی حسن پرستی کے ساتھ ہی ان کی شعر گوئی کا تذکرہ ضروری ہے۔ میں نے شادی سے پہلے اپنے گھر میں اپنے بھائی مجاز کو شعر کہتے ضرور دیکھا تھا لیکن ان کا انداز اس سلسلے میں بہت مختلف ہے۔ اسرار بھائی ہمیشہ شعر تنہائی میں کہتے ہیں اور بڑی رازداری کے ساتھ کیا مجال کہ کسی کی نظر بھی اس وقت تک پڑ سکے جب تک وہ مکمل نہ ہو جائے۔ اختر ہم لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں۔ اکثر خود لکھنے کی زحمت سے بچتے ہیں، اور یہ فرض فاطمہ بہن کے سپرد ہوتا ہے کہ وہ لکھتی جائیں۔ فاطمہ بہن کی ہستی ادبی حلقے میں اسی حد تک متعارف ہے

مزاجی کیفیت کے علاوہ جہاں تک اختر کی فطرت کا تعلق ہے یہ کسی PROBLEM CHILD کی فطرت سے کم دلچسپ نہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکی ہوں، کافی روشن دماغ اور غیر معمولی ذہانت رکھنے کے باوجود وہ اپنے ذہن کی کارفرمائیوں کو اپنے جذباتی ردعمل پر حاوی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اکثر ذہنی مرکبات سے خود کو بری کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے (ممکن ہے یہ میری خوش اعتقادی اور امید پروری کا نتیجہ ہو) کہ ان کی فطرت میں تھکاوٹ کا احساس نہیں۔ وہ سہارا پاکر بالیدگی سے آشنا ہو سکتی ہے اور اس میں نشوونما ممکن ہے۔

کسی فنکار کو لیجئے اُس کی خود پسندی، اور خود پرستی پر آپ کو حیرت نہ ہوگی۔ اس خود پرستی کا اظہار اختر کے یہاں گھر کے محدود دائرے میں بڑی شد و مد کے ساتھ ہوتا ہے غالباً اسی خود پرستی کا نتیجہ ان کا ذوقِ تحکم ہے جس سے جتنا زیادہ قریب ہوں گے اسی قدر اس پر اپنے تحکم کا نقش جمانا چاہیں گے۔

بیوی بچے تو گویا ان کی شہنشاہیت کو تسلیم کرنے کے لئے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں ورنہ ان کا مقصدِ حیات ضبط ہو جاتا ہے۔ مثلاً مجھے اگر کہیں جانا ہے تو فیصلہ کرنے سے پیشتر اختر کا ایما لینا ہوگا۔ واپسی کا وقت مقرر کرنا ہوگا۔ اس معاملے میں فرق کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ اس کے بعد میرے آنے جانے کے متعلق ہر سہولت پیدا کرنے کی ذمہ داری اختر کے سر ہوگی۔ جس کی ہر نازک تفصیل پر اُن کی نظر پڑے گی اور وہ میرے لئے ہر آسانی فراہم کریں گے۔ لیکن یہ سب اسی وقت جب میں انہیں اپنے آقائے نامدار ہونے کا یقین اپنی زبان ہی سے نہیں اپنے احساس اور اپنے طرزِ عمل سے بھی دلا سکوں۔ اِن کڑی آزمائشوں میں پورا اترنے کے لئے اکثر امتحانات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اختر ان راستوں پر اپنی ذہانت صرف کرنے کا فطری شوق رکھتے ہیں نہ معلوم کیوں؟ مثلاً میں نے کسی دعوت نامہ کی اطلاع اُن تک پہونچائی۔ جواب میں انہوں نے کہہ دیا "ہٹاؤ بھی کیا کروگی جاکر؟" میں نے یہ انکار خندہ پیشانی سے سن لیا اور اُن کی نازبرداری میں کوئی فرق نہ لائی۔ اب انہیں اپنے ALMIGHTY ہونے کا یقین ہوگیا۔ اور چونکہ بندی بھی ایمان کامل کا ثبوت پیش کر چکی اس لئے ممکن ہے کہ جذبۂ کرم جوش میں آجائے لیکن رضامندی کے اعلان کے لئے کسی سہارے یا آڑ کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً یہ کہ "چونکہ تمہیں گھر پر تنہا رہنا پڑے گا اس لئے چلی جاؤ" وغیرہ۔ ایسے موقعوں پر "سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا" کو پالیسی بناکر برتنا پڑتا ہے۔

اُن کے ذوقِ ملکیت اور جذبۂ تحکم کے علاوہ ایک دلچسپ خصوصیت میں نے اُن میں دریافت کی ہے وہ یہ کہ محبت اور خیال کے بارے میں وہ ضبط کے قائل ہیں جس کا انہیں جتنا زیادہ خیال ہوگا اتنی ہی کڑی نظر رکھیں گے اور اظہار سے بچیں گے۔ حد یہ ہے کہ بچے کسے عزیز نہیں ہوتے؟ اختر کو جاوید کا غیر معمولی طور پر خیال ہے۔ چوری چھپے اس کی دل داری بھی کر لیتے ہیں۔ مگر زبان سے اس کا اعتراف کرنے میں وہ اپنی شکست سمجھتے ہیں بلکہ کوئی اگر بدقسمتی سے کہہ بیٹھے کہ وہ اسے چاہتے ہیں تو وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی تردید ضروری خیال کریں گے۔ اپنے احساس کی رازداری انہیں عزیز ہے۔ ان کے خطوں میں اکثر یہ بندھن ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور ان کی تحریر میں والہانہ پن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک سبب ممکن ہے یہ بھی ہو اختر کو گویائی پر غیر معمولی قدرت نہیں۔ فضول قسم کی گپ بازی میں شریک ہونے کا شوق تو شاید علی گڑھ کی صحبتوں کا صلہ ہو ورنہ معاملات پر سلجھی ہوئی اور مسلسل گفتگو ان کے بس کی چیز نہیں۔ نہ جذبات سے متاثر ہونے کے بعد وہ گفتگو کا دم رکھتے ہیں ان کے بشرے سے ان کے احساس کا اظہار ہو جائے تو ہو جائے، الفاظ سے کبھی نہ ہوگا۔ غصہ، غم، خوشی، محبت، نفرت اور کیف سب کے ساتھ یہی برتاؤ ہوگا۔ شاید یہی اظہار کا سرمایہ ان کی شاعری کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اختر کی نازک مزاجی کی مثالیں ان کی روزمرہ کی زندگی سے سنئے۔ پلنگ کا ٹیڑھا ہو جانا۔ دماغ میں انتشار پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بستر کی چادر کا کونہ لٹک جانا اسی قدر اہم اور سنجیدہ جتنا کہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی مقررہ حدود میں ذرا سا ترچھا پن

دیا ہے۔ بہلا دے پھسلا دے، منت و سماجت کا کوئی حربہ کام کر گیا تو خیر ورنہ "ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے" کے خیال سے کوفت رفع کرنی پڑتی ہے۔

سب سے بڑی تپسیا جو مجھے اختر کے ساتھ انجام دینی ہے وہ اُن کی شب بیداری میں شریک ہونا ہے رات بارہ بجے سے پیشتر ان کی مملکت میں نیند کا خیال کرنا بھی جرم ہے۔ محفل داری ہو، مطالعہ ہو یا پھر "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ یہ بھی نہ سہی انھیں کچھ لکھنا ہے تو جب تک وہ اپنے کام میں مصروف ہیں مجھے ان کے ساتھ جاگنا ہے اور کسی طرز عمل سے یہ ظاہر نہیں کرنا ہے کہ ان کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی بے نیاز ہوں۔ چنانچہ یہ میرے فرائض منصبی میں سے ہے کہ کم سے کم بارہ بجے تک جاگوں اور اپنی اس بیدار بختی پر مطمئن بھی نظر آؤں اور اگر اس کارِ خیر پر خفیف سے ذہنی احتجاج کا اظہار میرے کسی طرز عمل سے ملتا ہے تو میری ساری نیکیاں خاک میں مل جائیں گی۔ اس لئے کہ اختر کے نزدیک محبت میں نیت کو اعمال کے برابر ہی اہمیت ہے۔

گھر کے اندر اختر کی اخلاقیات میں "جیو اور جینے دو" کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا ان سے وابستگی کا صرف یہی مطلب ہے کہ صرف ان کے لئے زندہ رہا جائے۔ گویا گھر کی دنیا اختر کی زندگی کو محور بنا کر اس پر رقص کرتی ہے۔ اگر ایک ذرہ بھی محور سے علیحدہ ہونے پہ باغی نظر آتا ہے تو اس دنیا کی تنظیم کا شیرازہ برہم ہونا یقینی کیا سائنٹیفک اصول سے لازمی ہے اور کچھ دور نہیں کہ قیامت کا نقشہ اہل دنیا کی عبرت کے لئے قیامت سے قبل اس گھر میں مرتب ہو جائے۔ اس بھلک اندیشے کو حقیقت بننے میں اس لئے دیر لگ رہی ہے اور لگتی رہے گی کہ محور اپنی ذاتی کشش سے مختلف ذروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور میری دلی آرزو یہی ہے کہ میرے جیتے جی محور کی یہ کشش کمزور نہ ہونے پائے۔ ✱

(۱۹۴۸ء)

صفیہ نے جاں نثار کو نہ صرف ذہنی رفاقت دی بلکہ انہیں ذہنی طور پر متاثر بھی کیا۔ مجھ سے پوچھئے تو میں یہی کہوں گی کہ جاں نثار کو جینے اور مرنے کا سلیقہ صفیہ ہی نے سکھایا ہے۔ مجھے کسی کا شعر یاد آتا ہے۔

نہ کچھ ہم ہنس کے سیکھے ہیں نہ ہم کچھ رو کے سیکھے ہیں
جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں تمہارے ہو کے سیکھے ہیں

فاطمہ زبیر

جتنا کہ اختر کا کلام ۔ اختر کے پچھلے مجموعۂ کلام "سلاسل" کا انتساب فاطمہ بہن کے نام "از رموزِ فطرتِ من محرم مے" کے عنوان کے ساتھ شامل ہے ۔ اختر کی سرکشی اگر کسی کے سامنے شکست آشنا ہوتی ہے تو وہ فاطمہ بہن کی ذات ہے ۔ شعر کہنے کے دوران میں داد بھی چاہتے جائیں گے اور اکثر اصلاحات بھی قبول کرلیں گے ۔ شعر بہت تیزی سے کہتے ہیں اور اکثر طویل نظمیں دو ڈھائی گھنٹے میں مکمل کر لیتے ہیں ۔ نظم ختم ہوتے ہی ردّ عمل شروع ہوتا ہے ۔ "کیا فضول لکھا ہے ۔ ہٹاؤ پھینکو"

لکھنے پڑھنے کے لئے ان کو سکون کے علاوہ اور کوئی لوازمات درکار نہیں ۔ گوالیار کی خانماں بربادی کے بعد بھوپال میں ہمارا گھر ظاہر ہے اب تک کرسی میز کے تکلفات سے آلودہ نہیں لیکن اس سے قبل بھی اختر لکھائی اور پڑھائی کا کام فرش پر بیٹھ کر ہی انجام دیتے تھے ۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ گرمی اور پسینے سے بچنے کے بجائے اس سے حظ اٹھاتے ہیں اور کام کرنے کے لئے اس فضا کو سازگار پاتے ہیں ۔ فرش پر اوندھے لیٹ کر پڑھتے پڑھتے سو جانا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں ۔ مطالعے کے سلسلے میں میں نے ان کا کوئی محدود یا مخصوص مذاق نہیں پایا ۔ اختر، طب، فلسفہ، تصوف، دیوانِ غالب اور MARXISM کی کتاب ایک ہی انہماک اور مصروفیت کے ساتھ پڑھتے پائے جائیں گے ۔ بے کیفی کے لمحات کاٹنے کا طریقہ ان کے یہاں یہی ہوتا ہے کہ جو پہلی کتاب ہاتھ لگی لے کر بیٹھ گئے اور اس توجہ اور سرگرمی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کیا کہ گویا کل کے کل ہی اس کی تردید میں کتاب لکھنا پڑے گی ۔ اس قسم کے مطالعے کو گھر پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بھی اکثر استعمال کرتے ہیں مثلاً کھانا لگ گیا ہے ۔ کتاب کے کسی باب کے آٹھ صفحے باقی ہیں ۔ اب کھانا ٹھنڈا ہو جائے مگر اختر اسے ختم کرنے سے پیشتر نہ اٹھیں گے ۔

کھانے کے معاملے میں ان کی گرم رفتاری سے ہر شخص کو شکایت ضرور پیدا ہوتی ہے ۔ وہ نظریں نیچی کر کے کھانا شروع کریں گے اس دوران میں کسی گفتگو میں شریک نہ ہوں گے ۔ اور قبل اس کے کہ آپ محسوس کریں کہ آپ نے کھانے کی صحیح رفتار شروع کر دی ہے وہ دستر خوان سے اٹھ کر ہاتھ دھوتے نظر آئیں گے اور آپ سوائے اس کے ان سے کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ ۔

گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح
دلے از خوابِ ما بیزار رفتی

مجھے ان کے سامنے اپنی بسیار خوری پر مستقل نادم ہونا پڑتا ہے ۔ کھانے کے سلسلے میں گوشت کے حد درجہ شائق اور مٹھاس سے بے نیاز ۔ بُرے کھانے کے خلاف احتجاج ہمیشہ گاندھی جی کے ستیہ گرہی انداز سے کرتے ہیں ۔ ان کا بھوکا اٹھ جانا اعتراضات سے زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے ۔ البتہ کھانے کی خرابی کا ناخوشگوار اثر گھر کے دوسرے معاملات پر مستقل نہیں کرتے ۔ غالباً اس لئے کہ ان میں بھوک کی غیر معمولی برداشت ہے ۔

برداشت کا ذکر آتے ہی مجھے اختر کی بیماری کا خیال آتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اختر کی علالت ہی کے لئے کہا تھا کہ ۔

"غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے"

میں نے اپنے گھر کے مردوں کو بیمار ہو کر اس طرح صبر کھوتے نہیں دیکھا تھا ۔ اختر کی انگلی میں پھانس لگ جانا بھی کسی تیر نیم کش کی خلش سے کم نہیں جو جگر کے پار نہ ہوا ہو ۔ حرارت کے سو درجہ تک پہنچتے ہی تقریریں شروع ہو جاتی ہیں اور لہجہ پر صد درجہ کا سوز و گداز طاری ہو جاتا ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں وہ psedu serious ہی کہے جا سکتے ہیں ۔ بیماری کی حالت میں ان کے لئے ایک لحظہ اور ایک نظر کی بے توجہی ناقابل برداشت ہوتی ہے ۔ گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ دوا سے بچوں کی طرح بھاگتے ہیں اور ڈرتے ہیں ۔ اس تلخئ کام و دہن کی مصلحت آمیزی کا احساس انہیں بڑی مشکل سے ہوتا ہے ۔ وہ ہمیشہ اپنی بیماری کو طول دے لیتے ہیں تب علاج کرتے ہیں اور مکمل افاقے سے قبل ہی بد پرہیزیاں شروع اور علاج ختم کر دیتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ میں نے بھی ان کی اس عادت پر دل کڑا کرنا کر

میں جُٹے تھے۔ اپنے اندر کے شاعر کو بھولے ہوئے تھے مگر رات گئے تک میں اور صفیہ باتیں کرتے۔ وہ گھوم پھر کر جاں نثار کے ذکر پہ تان توڑتی۔ جیسے وہ اس کا شوہر نہیں معشوق ہو۔ اتنا ذکر کیا اس نے کہ جی جل گیا۔

عموماً مرد عاشق ہوتے ہیں اور معشوق عورت۔ اس کے الٹ کرنا الٹی گنگا بہانا ہے۔ مگر صفیہ گنگا کو بحر نا پیدا ر بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کی ہر سانس میں اختر بسے ہوئے تھے۔ صفیہ نے جو اختر کو خط لکھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سچ مچ ہندوستان کے لوک گیتوں کی ہیروئن کی طرح اپنے مرد کی دیوانی تھی۔ اِن خطوں میں جو لکھا ہے وہی بھوپال کانفرنس والی راتوں میں مجھ سے کہا کرتی تھی۔ اس قدر ڈھٹائی سے اظہارِ عشق کرتی کہ چڑ سی آنے لگتی۔ میں اس سے کہتی،

"اوّل تو اتنا شدید عشق ہی علت ہے۔ دوسرے تمہارے خصم کا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"ہو جائے میری بلا سے"

"پھر تمہیں یوں ٹوٹ کر نہ چاہے گا!"

"نہ چاہے، مگر میں تو چاہے جاؤں گی۔"

"ڈھٹائی سے؟"

"ہاں ڈھٹائی سے اُسے چاہے جاؤں گی۔"

"مرو!"

"ہاں مر بھی جاؤں گی۔"

"وہ بور ہوتا ہوگا۔"

"ہوتا ہوگا۔"

"یک طرفہ عشق گدھا پن ہے!"

"یک طرفہ عشق ہی سہی۔ مجھے اس سے مفر نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے کہتی۔

"جو وہ کسی اور کو دل دے بیٹھے۔"

"تب تو میرا عشق سہ آتشہ ہو جائے گا۔"

"پھٹکار ایسے عشق پہ!"

"کیا مردوں کو جنون کی حد تک عشق کرنے کا حق حاصل ہے۔ عشق ان کی جاگیر ہے۔ ہم بھی عشق کریں گے سو بار کریں گے۔"

"عشق ذہنی بیماری ہے۔"

"میں بیمار ہوں، مجھے اپنا مرض بہت پیارا ہے۔"

"اِن گنوں سدا برہا کے گیت گاؤ گی۔"

"برہا میں لذت ہے۔"

"سٹرن تجھ میں ذرا بھی خودداری نہیں۔"

"خودداری میں گھٹن ہے۔ میرا دم گھٹتا ہے۔" وہ دیوانوں کی طرح جھوم کر کہتی۔

"ایک دن منہ کی کھائے گی۔ چھوڑ کے چل دے گا۔" میں نے گھسی پٹی بات دہرائی۔

"اُس کی کیا مجال جو میرے چنگل سے نکل پائے۔ میرا جادو اختر کا جر یہ ہے۔ یہ ننھا منا اختر میں نے جاں نثار سے چرا لیا ہے میرا

عصمت چغتائی

کانٹوں بھری وادیاں

جاں نثار اختر کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب وہ محض ایک افواہ تھے۔

انھوں نے علیگڈھ گرلز کالج کی لاری پر ایک نظم جڑ دی تھی اور کالج کی لڑکیوں میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ کچھ یہ بھی پتہ ملا تھا کہ مجاز کے دوست ہیں۔ فوراً صفیہ کے کمرے پر دھاوا بولا گیا۔ صفیہ صرف اتنا بتا سکیں کہ یہ گھومتے ہوئے رومانی نام والے جاں نثار اختر نئے ابھرتے شاعروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجاز کے بہت قریب کے دوستوں کی فہرست میں آتے ہیں۔

سر جوڑ جوڑ کر نظم پڑھی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ جاں نثار اختر اتنے حسین مغالطے میں مبتلا ہیں۔ انہیں اس کبوتر خانوں کی کابک میں حوریں نظر آتی ہیں۔ کتنی غنیمت بات تھی کہ انھوں نے دوڑتی، دندناتی لاری میں لڑکیوں کی اچٹتی ہوئی جھلک ہی دیکھی سوکھی، ماری کالی کلوٹی، کچر پچر لڑتی ایک دوسرے کی پسلیوں میں کہنیاں مارتیں بدذات لڑکیاں نہیں دیکھیں ورنہ یقیناً بھوسے کی گاڑی پر نظم لکھنا بہتر سمجھتے۔

علیگڈھ میں ماسٹر صاحب لڑکیوں کو پردے کے پیچھے بیٹھ کر لڑکیوں کو اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ کبھی کوئی شعر سمجھانے کے لئے کہتے

"لڑکی ذرا اپنا ہاتھ باہر نکال"

لڑکیاں فوراً کسی گوری سی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیتیں۔

"اری تیرا ہاتھ تو بڑا سہانا گورا گورا ہے" ماسٹر صاحب بوڑھے تھے مگر دل کے جوان تھے۔ ہماری کلاس میں صرف ایک لڑکی زہرہ بٹ گوری بھک تھی۔ ہم ہمیشہ ہر لڑکی کے بجائے اسی کا ہاتھ دکھایا کرتے تھے۔ اور ماسٹر صاحب سمجھتے تھے کہ پردے کے پیچھے پرستان چھپا بیٹھا ہے۔ ضرور جاں نثار بھی خبطی ہوں گے۔ ویسے شاعر ہوتے بھی خبطی ہیں۔

دوسری دفعہ جب ان کی خیر خبر ملی تو سنا صفیہ سراج کی ان سے شادی ہوگئی۔ یہ شادی مجاز کی مرضی سے ہوئی تھی۔ بوڑھے تو نہیں لیکن مجاز کی طرح خبطی ضرور ہوں گے۔ اس ایک نظم گرلز کالج کی لاری نے جاں نثار سے بہت قریب کی جان پہچان کرادی۔ عرصہ تک مجاز کی بہن صفیہ کے حوالے سے علیگڈھ والوں میں پہچانے گئے۔ کسی مشاعرے میں اُن کا نام نہ اُچھلا۔

مگر میری اُن سے دو بدو ملاقات بھوپال کانفرنس میں ہوئی جب میں ان کے ہاں جا کر ٹھہری۔ صفیہ سے میری دانت کاٹی روٹی تھی۔ جاں نثار کچھ گھر والی کے شوہر ہی نظر آئے۔ میرا مطلب ہے جہاں تک میرا تعلق ہے کوئی قابلِ ذکر بات چیت نہیں ہوئی۔ ویسے مردانے میں جوش صاحب مہمان تھے کسی دوسرے کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے تھی ان کے علاوہ اور شاعر اور ادیب بھی چھائے ہوئے تھے۔

مشاعرہ بڑی دھوم دھام کا رہا۔ جاں نثار زیادہ تر میزبان ہی بنے رہے۔ مجھے نہیں یاد انھوں نے مشاعرہ میں کیا سنایا۔ ایک ہنگامہ برپا تھا شاعر نہایت بکھرے ہوئے تھے۔ جاں نثار اندر اور باہر کے درمیان کا سلسلہ بنے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ دوسروں کی خاطر میں

دوسرے لمحے اختر "ایک زخم تمنّا اور سہی" میں کہنے لگتے ہیں۔

کیوں کہتے ہوئے شرمائے ہم دنیا نے ہمیں ٹھکرایا ہے

یہ نظم نہیں، مکالمے ہیں، صاف صاف بات کہی ہے۔ جو عرصے تک اختر پر بیتی جس بے توجہی کا وہ شکار رہے۔ دوسروں کے دل کا حال تو معلوم نہیں خود میرے دل میں جو اختر کی طرف سے احمقانہ وسوسے تھے۔ ایک کینہ سا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان شعروں میں وہ مجھ سے بھی مخاطب ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اختر کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ خود اُن کا بھی اس میں کچھ ہاتھ ہوگا۔ وہ ہمیشہ سے ذرا جھجک کر پیچھے رہنے والوں میں سے ہیں۔ ہاتھ بڑھا کر جام اٹھا لینے والوں میں سے نہیں۔ لکھنوی تکلف سے ذرا دور ہی بیٹھنے والے کہ میزبان کی کب اُن پر نظر پڑے، اور وہ متوجہ ہو۔ میں نے ہمیشہ ہر محفل میں انہیں تکلف سے خاموش کچھ اپنے وجود پر نادم سا بیٹھے دیکھا۔ کبھی وہ کوئی نہایت پیارا سا جملہ بولتے بھی تو ہلڑ بازی کی نذر ہو جاتا۔ غل غپاڑے میں غرق ہو جاتا۔ وہ ایسے بیٹھے رہتے جیسے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہوں۔ حالانکہ یہ ان کی تربیت اور لکھنو کے ماحول کا قصور ہے کہ ان کا تکلف اکثر احساس کمتری کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔

زندگی کی ہماہمی میں کب کون کسی کو دیکھتا ہے۔ سب کی اپنی محرومیاں کچھ کم نہیں۔ اختر کی یہ حالت ہے کہ دعوت میں کوئی پلیٹ نہ تھمائے تو کونے میں کھڑے مسکراتے رہیں گے۔ صفیہ کے بعد اختر کی طرف سے دل میں زخم پڑ گئے۔ لیجیے پھر وہی صفیہ۔ مگر صفیہ سے مفر نہیں۔ میں نے جاں نثار اختر کو جانا ہی صفیہ کے وسیلے سے۔ تو صفیہ کے انتقال کے بعد میں نے وہ اشعار کبھی نہ پڑھنے چاہے جو انھوں نے صفیہ کی یاد میں لکھے۔ میں صفیہ سے کہا کرتی تھی، تو مر جائے گی تو یہ مرد تیری قبر پر پلکوں سے جھاڑو دے گا۔ وہ نیک بخت بڑی خوش ہوتی تھی اور مرنے کی آرزو کرتی تھی۔ مجھے ایسے جذباتی انسانوں سے چڑ ہے مگر اُن لوگوں سے جان چھڑانا بھی مشکل ہے۔ جان کو روگ بن کر لگ جاتے ہیں۔

اختر بھی جان کو روگ بن کے لگے ہوئے تھے۔ ان سے مکمل نفرت ہوتی تھی نہ دل سے کدورت جاتی تھی۔ نہ جانے کونسا رشتہ تھا جو توڑے نہ ٹوٹتا تھا۔

پھر سنا انھوں نے شادی کرلی۔ ایسا لگا وہ صفیہ پر سوت لے آئے۔ بڑے بڑے وہم اور کدورتیں لے کر میں پہلی بار خدیجہ سے ملی۔ ایسا لگا صفیہ واپس لوٹ آئی۔ دل کو بہت سمجھایا مگر خدیجہ سے مفر ممکن ہوئی۔ جیسے میں اُسے برسوں سے جانتی ہوں۔ برسوں سر جوڑ کر اس سے باتیں کی ہیں۔ ویسی ہی دبلی پتلی مسکراتے ہوئے نازک چہرے اور کھلے دل کی لڑکی۔

بڑا نصیب والا ہے اسے ایک ہی زندگی میں دو نعمتیں ملیں۔ یہ کہاں سے صفیہ کا نعم البدل ڈھونڈ لایا۔ یہ دُکھی سی معصوم لڑکی پھر اُسے مل گئی۔ جو لمحوں میں قریب آ جانا جانتی ہے جہاں سے صفیہ نے ڈور چھوڑی اس نے تھام لی۔ اختر نے ضرور پچھلے جنم میں کچھ کرم کئے ہوں گے ورنہ پتنگ کٹ جائے تو دوسری پتنگ اُسی ڈور میں ہلکی نہیں چلی آتی۔ خدیجہ کے آنے پر بھی اختر کی گت وہی رہی وہی میلے کچیلے کپڑے، بے کنگھی کے بال اور وہی آخری صف کے آخری کونے میں مقام۔ مشاعروں میں بھی وہ مرتبہ نہ ملتا جس کے وہ حقدار تھے۔

اب میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی تخلیقات پر توجہ دینی شروع کردی۔ توجہ میں نے نہیں دی خود بخود کھنچ گئی۔ کچھ دن فلموں میں غرق رہنے کے باوجود اختر کی شاعری میں تنومندی پیدا ہوتی گئی۔ شاید یہ سب سے زیادہ شعر کہتے رہے۔ پھر بھی عوام میں ان کی مانگ نہ بڑھی۔ بسری رام کے دتی والے مشہور مشاعرے میں بمبئی کے سب شاعر جاتے اور جاں نثار اختر مدعو نہ کیے جاتے۔

خدا جانے اس زمانے کو اختر نے کن جذبات کے سہارے جھیلا۔ کبھی چہرے پر شکن نظر نہ آئی۔ ہمت نہیں ہاری۔ اسی شدت سے شعر کہتے رہے فلموں میں بھی کوئی اونچا مقام نہ حاصل تھا۔ پروڈیوسر جانتے تھے کہ وہ بڑے شاعر ہیں فلموں کے لئے بہت خوبصورت لکھتے ہیں۔ لیکن نام نہیں۔ نام ان سے بہت کچے شاعروں کا بہت اونچا ہے۔ اور اختر لکھ رہے تھے۔

جاوید ..... میرا اختر۔"

"پگلی پگلی پگلی!"

یہ لیجیے مضمون جاں نثار اختر پر لکھ رہی ہوں دماغ پر صفیہ چھائی ہوئی ہے۔ دراصل میں نے برسوں اختر کو صرف صفیہ کے رشتہ سے پہچانا۔

اور جب وہ مرگئی تو مجھے ایسا لگا اختر نے اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔

انسان کتنی مشکل سے دوسرے انسان کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنے وہموں کا ایک ہیولا تعمیر کر لیتا ہے اور اپنے احساس کی فوج اس کی حفاظت پر جُٹا دیتا ہے۔

لیکن مدافعت کی یہ فوج اس دن پسپا ہوگئی جس دن میں نے اختر کو صفیہ کے معشوق شوہر کے بجائے ایک حساس اور دھڑکتے ہوئے دل والے شاعر کی صورت میں جانا اور پہچانا۔

اختر اپنی نظم "آخری ملاقات" پڑھ رہے تھے۔ اور ایک ایک شعر فلمی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے گذر رہا تھا۔ شاعر کی انگلیوں میں ایک برش ہے جو ننھی ننھی چوٹیں لگا تا رنگوں کے طوفان کی طرح بکھیرتا چلا جا رہا ہے۔

عموماً جب اختر اپنی تخلیق پڑھنے کھڑے ہوا کرتے تھے تو میں عموماً اپنے آپ کو صفیہ کے عزیزوں کی صف میں جا دیتی۔ اور یہ دیکھا کرتی کہ ان کا کرتا ضرورت سے زیادہ چھوٹا ہے پاجامہ ایڑیوں سے گھسٹ رہا ہے اور کسی لمحہ بھی کمربند طلوع ہو سکتا ہے۔ بالوں میں صدیوں سے کسی نے کنگھی نہیں پھیری۔ جیسے کسی نے ابھی انہیں گھوڑے میں سے نکال کر کھڑا کر دیا ہے۔ ترنم نہایت روتا بسورتا ہے جو ہر شعر کی مٹی پلید کر دیتا ہے۔ شعر کے معنی کو گھن لگ جاتا ہے۔ ساری لطافت ایک لرزتی، رینگتی آواز میں دفن ہو جاتی ہے۔ جو حسن شعر کو پڑھتے وقت نظر آتا ہے یہ پڑھتے ہیں تو کافور ہو جاتا ہے۔ ان کی آواز میں نہ سردار جعفری کی صداقت ہے نہ جوش ملیح آبادی کی گھن گرج نہ کیفی اعظمی کی شدت نہ مجروح سلطانپوری کا لحن۔ جو ہر شعر کا روپ سنوار دیتا ہے۔

"خدا کا واسطہ ترنم سے نہ پڑھا کرو" ہم اختر پر ہمیشہ زور ڈالتے۔ "ترنم کا بھی گلا گھٹتا ہے اور تمہارے شعروں کا بھی"۔

مگر جب میں نے ان کی نظم پہلی بار سنی تو نہ اُن کا نیم مردہ لہجہ آڑے آیا اور نہ اُن کا اُجاڑ حلیہ مجھے نظر آیا۔ اس نظم نے مجھے ایک دم اس دنیا میں پہونچا دیا جس میں میں اور جاں نثار اختر بڑھتے پلے تھے۔ مجھے ایسا لگا اُن کے ماتھے پر میری آنکھیں جا لگیں۔ اور جب انھوں نے یہ معصوم سا شعر پڑھا

یہ چہرہ بنو بوڑھی کا
یہ ٹکڑا ماں کی چوڑی کا

تو کوئی چیز اُچھل کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں نے یہ شعر اُن سے بار بار سنا۔ اس دن پہلی بار میری جاں نثار اختر سے ملاقات ہوئی اور میں صفیہ کو بھول کر انہیں پہچان سکی۔ وہ جذباتی رشتہ بکھر کر ذہنی رشتہ قائم ہوا۔

سچ پوچھئے تو اختر کی وسیع شاعری میں یہ نظم کوئی خاص مقام نہیں پاتی۔ ہر انسان کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اور اس نظم نے اپنی سادگی اور بھولپن سے میری کسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کتنی پرانی ہیں یہ باتیں اور کتنی دل سے قریب!

اور پھر،

ایک سُرخ دُلائی گوٹ لگی
کیا جانے کب کی چوٹ لگی
ایک ٹوٹی رسی جھولے کی
ایک چوٹ کسکتی کولہے کی

ادب میں ایسی محبوبہ ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ جو سادہ ہے بھولی ہے چنچل اور معصوم بھی ہے۔ نہایت لذیذ جسم کی مالک ہے اپنی خوشبو میں مہکتی ہے۔ صدیوں پرانی بھی ہے اور نئی نویلی بھی۔ اس کی آہٹ لوک گیتوں میں بھی ہے اور فارسی کی غزلوں میں بھی۔ وہ معشوقہ بھی ہے اور عاشق بھی، شرمیلی بھی اور نڈر اور بے جھجک بھی۔

اختر بہت سیدھے انسان ہیں اگر بدھو کہا جائے تو زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ شاعروں میں چالاکی، ہوشیاری اور دنیاداری بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس رشتہ سے اختر شاعر زیادہ ہیں اور دنیادار بس نام کو۔ کبھی کوئی تکڑم بازی ان کی ذات سے وابستہ سننے میں نہ آئی۔

پھر ادھر میں کیٹرارینگ اور فلم پروڈیوس کرنے چل پڑے۔ فلم بنانا دیکھنے میں بڑی معمولی سی بات لگتی ہے مگر جب ایک شاعر انسان اوکھلی میں سر دیتا ہے تو دھماکے زیادہ حصہ میں آتے ہیں۔ جس ہوشیاری اور دوراندیشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس قبیلہ کی ذات میں عنقا ہے۔ اختر کا بھی وہی انجام ہوا جو سردار جعفری جیسے ہوش مند کا ہوا۔ سب چوپٹ ہوگیا۔ خالی ہاتھ جھاڑنے کی بھی سکت نہ رہی۔

اس چپقلش میں یا پتہ نہیں کیوں ساحر کا ساتھ چھوٹ گیا اور اختر بالکل ہی کٹی پتنگ کی طرح خلا میں تپیانے لگے۔

جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ دل کے دورے نے پوری کردی۔

یہ شاعر بھی عجیب شئے ہے۔ جب موت دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو مرنے کے بجائے اور زور شور سے جینے لگتا ہے۔ اختر بھی بحیثیت شاعر کے ایک دم جی اُٹھے۔ اور اپنی وہ معرکہ کی نظم لکھ ڈالی جو اُن کی ہی نہیں کروڑوں انسانوں کی آپ بیتی کہی جا سکتی ہے انھوں نے اس نظم میں اپنی لاڈلی بیٹی سے خطاب کیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو پر اس سے بات چیت کی ہے۔ خود اپنے ہی نہیں دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔

اگر اختر نے زندگی میں بس یہ ایک نظم لکھی ہوتی تو بھی شاعری میں اپنا ایک واضح مقام بنالیتے۔ یہ نظم انسان کی تمام مجبوریوں اور نامرادیوں کا افسانہ ہے۔ خود اختر کی زندگی کا ہی نہیں اُن کے زمانے کے ہر انسان کی بے بسی کا خلاصہ ہے۔

موت کو اپنے گرد منڈلاتے دیکھ کر اختر چڑ کر جینے لگے۔ وہ مشاعروں میں بڑے انہماک سے شرکت کرنے لگے، فلموں میں بھی اُن کا نام ابھرنے لگا۔ رینگتی ہوئی آواز میں ایک انفرادی رنگ پیدا ہوگیا۔ وہ مشاعروں میں جمنے لگے، جمنے ہی نہیں گونجنے لگے۔ بغیر سہارے ان کی مانگ بڑھنے لگی۔

پتہ نہیں اختر کو تیرنا آتا ہے کہ نہیں۔ مگر وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو مسموم ہواؤں کی لُو دیر چٹانوں پر چمن لگاتے ہیں۔ دھارے کے خلاف اُن کے ہاتھ بیر کھیلتے ہیں۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر جھنجھلا اُٹھے اور ناکامیوں نامرادیوں کے منہ پر طمانچہ مار کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک اور سانحہ ان کی زندگی میں واقع ہوا۔

اختر سوویت روس کے سفر پر گئے۔ واپسی پر میری اُن سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ لمحہ بھر کے لئے تو میرے حواسوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کردیا۔ وہ کھڑے میں سے نکلے ہوئے چڑ مڑ اختر ایک دم غائب، ساری کائی، ساری پھپھوند ندارد۔ جیسے کسی نے پرانی دھندلی تصویر میں جیتے جاگتے رنگ بھر دئے۔ پاجامہ زندگی میں شاید پہلی بار جائز مقام پر، نہایت نفیس دھاری دار کرتا اور اس پر سخت میچنگ واسکٹ بڑے پُر وقار الجھے ہوئے بال، جیسے کسی مشاق ہیر ڈریسر نے بڑے انہاک سے انہیں الجھایا ہو۔ قد کئی انچ نکلتا ہوا۔

میرے خیال میں تو ہر انسان کو زندگی میں ایک بار روس کا دورہ ضرور کرنا چاہئے۔ یورپ جاؤ تو احساس کمتری بڑھ جاتا ہے۔ اپنا ملک میلا میلا لگنے لگتا ہے مگر روس جاؤ تو میل کچیل کی ساری پرتیں اتر جاتی ہیں۔ روس والے نہ صرف ایک فنکار کا مقام خود پہچانتے ہیں بلکہ اس کی خود اُس کی اپنی ذات سے ملاقات کروا دیتے ہیں۔

خود کو پہچان کر اختر قطعی حیرت زدہ نہیں۔ جیسے ان کے یقین کی تصدیق ہوگئی ہو۔ دیر سے سہی مگر شکر ہے انھوں نے اپنے آپ کو پالیا۔ یہ مضمون لکھتے وقت مجھ کو بڑا مزہ آرہا ہے۔ میرے پاس ان کی تخلیقات بکھری پڑی ہیں۔ صفحہ اُلٹتی ہوں تو نت نئی تصویر اُجاگر ہو جاتی ہے

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک امت بے رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

چاند کا چہرہ ہے بے حد مضمحل
صبح ہوتی ہے بجھا جاتا ہے دل
لا پلا ایک اور جام مشتعل
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اختر نے آگ کے سہارے ان تلخیوں کی آگ کا مقابلہ کیا۔ انجام میں دل کا دورہ ہاتھ آیا۔ اور اسپتال جا پہنچے۔
اِن شاعروں کی بیویاں کس مٹی کی بنی ہوتی ہیں ۔ دو ننھی بچیوں کے ساتھ خدیجہ کے دل پر کیا گذری ہوگی ۔ اختر پر پھر غصہ آنا شروع ہوا۔ انہیں یوں بکھر جانے کا کس نے حق دیا ہے۔ خدیجہ کی طرف سے دھڑکا لگ گیا۔ یہ احمق لڑکیاں اِن سرپھرے شاعروں کے چکر میں کیسے آجاتی ہیں۔ صفیہ پر کون سا جادو چڑھا تھا۔ خدیجہ کن پھندوں میں پھنسی ہے۔
کیا وہ رباعیاں جو "گھر آنگن" میں ہیں اختر، صفیہ کے کانوں میں پڑھ دیا کرتے تھے۔ ان کا جادو اس کے سر چڑھ کر بولتا تھا کہ ان رباعیوں میں جادو بھرا ہے۔
جس لڑکی کا تصور اِن رباعیوں میں پایا جاتا ہے وہ صرف ہندوستان کی پیداوار ہے۔ وہ چلتی پھرتی ہنستی مسکراتی گھریلو ننھے ننھے فرض انجام دیتی لڑکی ہر متوسط طبقہ کے معمولی گھر میں ہے۔ لوگوں نے بنِ کافر قسم کی حسینوں پر تو بہت خامہ فرسائی کی ہے اس سانولی سلونی دلکش لڑکی کا تصور صرف اختر کے ہاں پایا جاتا ہے۔ یہ اتنی زندہ ہے کہ لگتا ہے یہیں کہیں پہلو میں کھڑی ہے گردن گھماؤ اور دیکھ لو۔ اس کی رنگت مہۂ شہاب نہیں نہ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں ہیں، نہ آنکھیں نرگس کو شرماتی ہیں، نہ ڈوراسی کمر ہے۔ پھر بھی وہ ہے۔ بہت زندہ ہے جسم سے زیادہ وہ جذبات اور احساسات کا مجموعہ ہے۔

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین

اور

آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی تو ہاتھ

یا

پانی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے رکھ رہی ہے الماری میں
تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے
لپٹی ہوئی ہاتھ کی دُھلی ساری میں

یہ محبوبہ نہیں اپنی بیوی ہے جو کھانا گرم کر کے کھلاتی ہے۔ سوئٹر بنتی ہے۔ روٹی پکاتے ہوئے ہاتھ جل جائے پھر بھی کپڑے دھو کر انہیں ہاتھوں سے نچوڑتی ہے۔ ذرا سا تحفہ پا کر کئی دنوں تک مسرور رہتی ہے۔ پاؤڈر سُرمے کی اُسے حاجت نہیں بس

کھلتے ہوئے ہونٹ مسکراتی آنکھیں
عورت کا نہیں اس سے حسین کوئی سنگھار

میرا سنٹ کوی

" ہیلو، فکر بھائی! قہ قہ قہ۔"

قہقہے میں رومانوی غزل کا سا ترنم اور کلکاریاں مارتے بچّے کی سی معصومیت ـــــ میں جھٹ پہچان جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔

" اوہ! اختر بھائی! کب آئے، کہاں ٹھہرے، کیا منصوبے ہیں۔؟" میں ایک ساتھ کئی سوال انڈیل دیتا ہوں۔ جاں نثار اختر کی آواز سنتے ہی میں بے ساختہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہوں ـــــ خدا، کسی کو عشق کے پھندے میں نہ ڈالے۔

قہ قہ قہ، آج بور ہوا ہوں۔ ڈیڑھ سو روپے روزانہ والے ہوٹل میں ٹھہرا دیا گیا ہوں۔ ابھی ابھی شہر کی ایک معزز، بلکہ معزز ترین خاتون نے شام کو چائے کی دعوت دی ہے۔ سنا ہے اہلِ ذوق ہے۔ قہ قہ قہ، جبھی تو جاں نثار اختر کو بلوایا ہے۔ لیکن دیکھو فکر بھائی! وہاں سے جلدی جلدی نبٹ کر لوٹ آؤں گا۔ تم ساڑھے سات بجے آ جانا، تم سے ملے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھ رہا ہوں۔ قہ قہ قہ!"

اور میں فوراً دل ہی دل میں اپنے سارے پروگرام تہس نہس کر دیتا ہوں۔ کیونکہ جاں نثار اختر میری سب سے نازک بلکہ اول درجے کی کمزوری ہے۔ باقی سب ہی کمزوریاں سیکنڈ ریٹ بن جاتی ہیں۔ وہ جب بھی بمبئی سے دلّی آتا ہے بمبئی سے ہی کیوں۔ وہ ہماچل سے لوٹتا ہے۔ پنجاب سے۔ راجستھان سے۔ وہ دلّی کو ضرور چھو کر جاتا ہے۔ اور پھر دلّی میں چاہے اُسے راشٹرپتی سے ملنا ہو یا یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے، کسی رئیس کی اہلِ ذوق بیگم سے یا اپنے کسی اس رشتے دار سے جو اُسے بے دلی سے سینے سے چپٹا کر گویا اس کا احترام کرتے ہیں۔ مگر وہ فقیر، حقیر فکر تونسوی سے ضرور ملتا ہے۔ اور اسے احساس دلاتا ہے کہ تم مجھے چاہے تنگ و تاریک کوچہ گھاسی رام میں لے جا کر بٹھا دو۔ میں تمہارے ساتھ پیار کے لمحے گزاروں گا۔ وہ لمحے جن کا رس پینے اور پلانے کے لئے مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے روزانہ والے پوش ہوٹل کے مقابلے پر مجھے کوچہ گھاسی رام کا کمرہ زیادہ رومانٹک اور البیلا لگتا ہے۔ کیونکہ مجھے اس میں ننھی منی معصوم خوبصورتیاں ناچتی، گاتی دکھائی دیتی ہیں۔

" ہیلو فکر بھائی! قہ قہ قہ"

" اوہ، اختر بھائی اب کہاں ہو اور کب سے ہو، کیوں ہو۔؟"

" قہ قہ قہ ..! آج دوپہر کو آیا تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ روزانہ کرایہ "پُرعزیب" کا ہوٹل" میں مقیم ہوں۔ شام کو ایک وزیر صاحب نے

جی چاہتا ہے اسی طرح صفحے الٹتی رہوں اور اس شخص سے بار بار ملاقات کروں جسے ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جانتی مگر جس کے بہت سے رخ ابھی تک اجنبی ہیں۔

اور صفحے الٹتی ہوں۔ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ یہ شخص مچھلی کی طرح پانی کے مخالف دھارے پر کیوں کر تیر سکتا ہے۔ ان روشن مسکراتی آنکھوں نے کون سے تماشے دیکھے ہیں، وہاں سے یہاں تک کن ریشمی ڈوریوں کے سہارے پہونچ پایا ہے۔

ابھی تو کتاب کے کتنے ہی صفحے باقی ہیں! *

" صفیہ سے جاں نثار کی محبت بڑی گہری اور خاموش قسم کی تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ کبھی جاں نثار نے اپنی زبان سے اپنی محبت کا اظہار صفیہ سے کیا ہو۔ لیکن ان کے انداز اور عمل میں محبت کا بانکپن ہمیشہ ہی رہا ہے۔ اُن کے خطوں میں جو اکثر صفیہ مجھے دکھا دیتی تھی۔ اس حزم و احتیاط کے بند ٹوٹ جاتے تھے۔ جاں نثار کو دراصل اپنے جذبات کی پردہ داری عزیز رہی ہے۔ صفیہ کیا اُن کا جادو اور سلمان کے ساتھ بھی یہی رویہ رہا ہے۔ چاہیں گے بے حد لیکن کبھی اظہار نہ ہونے دیں گے۔

فاطمہ زبیر

اور میں انہیں اپنی محبوبہ سمجھتا ہوں۔ یعنی ہم دونوں کے درمیان عاشق غائب ہے ــــ بسا اوقات ہم ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے، ایک دوسرے سے نظریں بچا کر سوچنے لگتے ہیں کہ اگر ہم دونوں میں سے ایک اپنے عاشق ہونے کا اعلان کر دے تو کیا حرج ہے؟ معاملہ ذرا واضح ہو جائے گا۔

لیکن سوچتے سوچتے ایک دوسرے کی متوقع حرکت سے ڈرنے لگتے ہیں کہ کہیں اس سے ہمارے عشق میں خلل نہ پڑ جائے۔ ہم وفورِ جذبات میں ایک دوسرے کو عاشق کہہ بیٹھے تو پھر کہیں محبوبہ غائب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس اَن کہی کیفیت میں اچانک جاں نثار اختر کے منہ سے ایک قہقہہ نکلتا ہے "قہ قہ قہ"۔

"قہ قہ قہ" میری طرف سے تائید ہوتی ہے۔

اور یہ ہم آہنگ قہقہہ بڑا معنی خیز ہوتا ہے جو فیصلہ کر دیتا ہے کہ عشق کا "اسٹیٹس کو" قائم رہے گا یعنی مضحکہ خیز رہے گا۔

یہ سچویشن عشق کی تاریخ میں نئی نہیں ہے۔ کافی پاپولر اور گھسی پٹی ہے۔ لیکن جاں نثار اختر نے اس سچویشن میں اپنا ایک رنگ بھر دیا ہے۔ اسے خالص اپنا بنا لیا ہے۔ فکر تونسوی سمجھتا ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے اور اس ادغام پر ہماری مانوپلی ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ باقی سبھی لوگ بھی اس مانوپلی کے دعویدار ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جن کی ناک اکڑفوں تھی اور دانشوری بھونڈی تھی، اختر صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ مجھے ان صاحب سے ابھی نفرت تو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن محبت بھی نہیں رہی تھی۔ جب وہ چلے گئے تو اختر بھائی نے اچانک ایک مختصر قہقہہ کے ساتھ (قہقہہ حسبِ دستور معصوم تھا، چوٹیلا نہیں تھا) کہا۔ فکر بھائی ان محترم کو اپنی ناک کا بڑا کمپلیکس ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

چند منٹ پہلے جب میں اس محفل میں آیا تھا تو ان محترم کی ناک باقاعدہ موجود تھی۔ وہ باقاعدہ بھونڈی بھی تھی۔ لیکن جب اختر صاحب ان سے باتیں کرنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ وہ ناک غائب ہو گئی۔ یا میری سوچنے اور دیکھنے کی صلاحیت آہستہ آہستہ سرد ہو گئی تھی۔ بہ کیف جب اختر صاحب نے یہ سوال کیا۔ میں چونک گیا اور ہڑبڑا کر کہا "ناک، ہاں ناک مگر اختر صاحب مجھے تو ان کی ناک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ آپ کی قربت میں بیٹھنے کی وجہ سے نہ جانے کہاں گم ہو گئی ــــ اس پر اختر صاحب پھر معصوم بچوں کی طرح مگر ذرا ترنم سے ہنس دیئے۔ "بھائی مجھے کیوں نادم کرتے ہو۔ ہر ناک اپنی شکل میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ ہماری سوچ ہوگی میری نہیں ہوگی"۔ اسی لئے میں نے کہا نا کہ فکر تونسوی کے اندر جو من و تو تھا۔ جاں نثار اختر نے صرف اسے ہی مدغم نہیں کیا بلکہ وہ جس کے قریب بھی سانس لیتا ہے، وہی اسے اپنی محبوبہ سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک روح ہے جو ہر جسم میں گنگنانے لگتی ہے۔ ہر بدن میں عشق بن کر گھل جاتی ہے۔ عاشق بھی، محبوبہ بھی، مضحکہ خیز، لطیف و جمیل بھی۔

اور کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ روح کئی جنموں سے یہی حرکت کرتی چلی آئی ہے۔ اگر جاں نثار اختر آواگون کا قائل ہے (اور میرا خیال ہے وہ اتنا مرنجاں مرنج ہے کہ ضرور قائل ہو جائے گا) تو اس روح کے وجود کا مقصد یہی ہے۔ ہر جنم میں ہر جسم کے اندر جا کے گنگناؤ کچھ اس طرح کہ ہر جسم یہی سمجھے کہ میں خود ہی گنگنا رہا ہوں۔

اے روحِ جاں نثار! تمہارا صرف یہی رول ہے۔

نے چائے کی دعوت پر یاد فرمایا ہے۔ انھیں اپنی جٹائیں اور کرتا پائجامہ سے خوش کر کے لوٹ آؤں گا۔ مگر اصلی شام تو تمہارے ساتھ گزرے گی۔ آرہے ہونا؟ یا میں آدھمکوں۔"

وہ ڈیڑھ روپے کرایہ والے ہوٹل میں بھی ٹھہرتا ہے اور ڈیڑھ سو روپے میں بھی۔ مگر ٹیلی فون پر اس کی آواز میں کوئی زیر وبم نہیں ہوتا۔ وہ وہی پیار میں بھیگا ہوا جاں نثار اختر ہی رہتا ہے۔ اسے ڈیڑھ روپے والے ہوٹل میں بھی وزیر حضرات دعوت دیتے ہیں اور ڈیڑھ سو روپے والے ہوٹل میں بھی۔ مگر اختر بھائی کی روح کو چپہ گھاسی رام میں ہی جاکر تسکین پاتی ہے۔ اگرچہ شہر میں اس کے چاہنے والے ان گنت ہیں۔ اس کا پیٹ بھر احترام کرتے ہیں۔ وہ چاہیں تو اسے تبت کی کنواری بھیڑوں کے اون سے بنے ہوئے قالین پر بٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی رگوں میں چلتا ہوا لہو، ہمیشہ عظیم اور پرشکوہ جھرمٹوں سے کترا کر اس طرف نکل جاتا ہے جہاں تنگی اور ترسی تو ہے مگر جہاں خلوص اور سادگی کی نرمل گنگا بہہ رہی ہے۔ وہ ایک مقبول بلکہ مقبول ترین آرٹسٹ ہے۔ اگر چاہتا تو بمبئی میں جوہو کے سمندر کے کنارے اپنا وسیع محل کھڑا کر لیتا۔ لیکن وہ بمبئی کے باندرہ علاقے کے ایک مختصر سے کوارٹر میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ کیونکہ وہاں کے اختصار میں اسے وسیع محبت رچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہاں اگر بیس برس پرانے ریڈیو سیٹ پر کوئی حقارت کی نظر نہیں ڈالتا۔ کوئی یہ نہیں کہتا۔ "اختر صاحب! مارکیٹ میں انتہائی ماڈرن قسم کے دل فریب ریڈیو سیٹ آچکے ہیں۔ آپ اس کھوسٹ سیٹ سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں۔"

مگر اختر صاحب ہنس کر کہتے ہیں۔

"بھائی! قہ قہ قہ۔ یہ سیٹ، ذرا مجھے ذرا اس سیٹ میں کلاسیکل ٹچ نظر آتے ہیں۔ اس کی آواز سنو، خالص اُدریج نل لگتی ہے کہ نہیں۔ خالص آہنگ۔ نخالص نہیں۔ اور پھر بھائی! قہ قہ قہ۔ دنیا جن چیزوں کو ناکارہ سمجھ کر پھینک دیتی ہے۔ میں انہیں سینے سے لگا لیتا ہوں۔ چاہے وہ ریڈیو ہو۔ ایش ٹرے ہو۔ لباس کی تراش خراش ہو اور میں اسے سینے سے اس لئے لگا لیتا ہوں۔ کیونکہ خدا نے مجھے یہ سینہ اسی لئے عنایت کیا تھا۔"

وہ سچ مچ ایک معصوم بچے کی طرح اور کھنبل ہے۔ ملاوٹ کے ان گنت جھکڑ آئے مگر جاں نثار اختر اپنی معصوم اور کھنلٹی کو مارنے میں ناکام رہا۔

جب جاں نثار اختر سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس شخص کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ شاید پچھلے جنم میں۔ شاید اس سے پچھلے جنم میں۔

چنانچہ میں نے تشریحاً پوچھا "اختر بیا! آپ یوں کیوں لگتے ہیں۔ جیسے اپنے سے ہوں۔"

وہ ہنس پڑے۔ وہ اکثر اوقات حماقت کی حد تک سادہ ہنسی ہنستے ہیں "بھائی! میں کیا کروں۔ سبھی لوگ میرے بارے میں یہی محسوس کرتے ہیں۔"

"سبھی لوگ؟" میں جل بھن گیا۔ "گویا تم میری مونا پلی نہیں ہو۔ بلکہ ہر آدمی ہر پچھلے جنم میں، آپ کو اپنا سا سمجھتا رہا۔ تم کیسے انسان ہو؟ تمہارے اندر کیسی روح ہے؟ مجھے تو تمہارے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر نئے سرے سے غور کرنا پڑے گا۔"

مگر میں غور نہیں کرسکا۔ غور کرنے کے اہل ہی نہیں رہا۔ دراصل جاں نثار اختر اور میرے تعلقات عام روش سے نہ صرف قدرے مختلف ہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں۔ مثلاً ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے وہ مجھے اپنی محبوبہ سمجھتے ہیں ——

دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے ہوں ۔ نظم سننے والا خود بھی اس کیفیت میں اس طرح بھیگ جاتا ہے کہ وہ پہچان نہیں سکتا کہ جاں نثار اختر کون سا ہے اور نظم کون سی ہے ۔

ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اس کا عالمانہ تجزیہ تو بڑے بڑے جغادری نقاد اور نظریہ کار ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف محسوس کر سکتا ہوں ۔ کیونکہ جاں نثار اختر کی شخصیت اور فن دونوں میں صرف احساس ہی احساس ہے ، جذبہ ہی جذبہ ہے ، خلوص ، پیار ، عقیدت ، صداقت ، معصومیت اور نہ جانے کیا کیا اس کی شخصیت میں بھی ہے اور فن میں بھی ۔

اور اوپر میں نے جس روح کا ذکر کیا ہے شاید یہ بھیگا بھیگا پن اور فن اور تن کا ادغام اسی ذات شریف کا کارنامہ ہی ہو سکتا ہے جسے میں سنت کوی کہتا ہوں ۔ اور ایسی روح ہر ایک کے نصیب میں لکھی بھی نہیں جاتی ۔

اور وہ کونسی سوچ ہے جو اس کے فن اور شخصیت میں چمکتی ہوئی بوندیں بن کر نمودار ہوتی ہیں ؟——

اہلِ نظر کا خیال ہے (اور ان اہلِ نظر میں خود جاں نثار اختر بھی شامل ہے) کہ وہ انسانی سماج کی زندگی میں حسن لانے کے خواب دیکھتا ہے ۔ ان میں حسن کی جھالریں تلاش کرتا ہے اور تلاش کر کے لٹکا بھی دیتا ہے ۔ گرد و پیش کے بھونڈے پن کو وہ جمالیاتی احساس سے بدلنے کا متمنی ہے ۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے سے حسن کو محسوس کرتا ہے ، جھوم اٹھتا ہے ، قلم اٹھاتا ہے اور قلم کے ذریعہ اسے اظہار بخشتا ہے ۔

بس یہی جاں نثار اختر کے مصرعوں کی گنگناہٹ کا راز ہے کہ وہ زندگی کے ہر سانس کو محسوس کرتا ہے ، ہر سانس سے پیار کرتا ہے اور ہم سب سے ایک معصومانہ طلب کے ساتھ کہتا ہے "یارو تم بھی میری طرح محسوس کرو ، میری طرح گنگناؤ کیونکہ تم بھی میری طرح جاں نثار اختر ہو ۔ قہ قہ قہ ۔ "

میں جانتا ہوں کہ وہ ایک مخصوص سماجی نظریہ کا مالک ہے ۔ اس نظریہ کے مدعی کئی دوسرے آرٹسٹ بھی ہیں ۔ مگر وہ شور و غل زیادہ مچاتے ہیں ۔ جاں نثار اختر شور و شغب کا شاعر نہیں ہے بلکہ محسوسات کے ہلکے ہلکے آہنگ کا شاعر ہے ۔ اس لیے اس کی نظموں میں صداقت اور خلوص کی چاشنی باقی سبھی آرٹسٹوں سے زیادہ نمایاں رہتی ہے ۔ نظریہ کی صداقت اس کے فنکارانہ اظہار کی صداقت کے ساتھ ہم آواز ہو جاتی ہے اور ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ جاں نثار اختر تو اپنی ہی نہیں ، ہماری صفیہ اختر کی بات کر کے گیا ہے ، ہماری محبوبہ کی ، ہماری بیوی کی ، ہماری بیٹی کی ، ہمارے ہمالیہ کی ، ہماری گنگا کی ، ہمارے سوچ اور ہمارے نظریہ کی ۔

معاف کیجئے میں سیریس ہو گیا ورنہ یہ میرا پیشہ نہیں ہے ۔ نقادانِ کرام کا ہے ۔ ورنہ جاں نثار اختر تو میرا یار ہے ، میری محبوبہ ہے ، میرا عاشق ہے ۔ اور مجھے اس کی نظمیں سن کر اور شخصیت جان کر کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وہ ایک جینٹل روح کیوں ہے ۔ کیوں کسی دوسرے کے استحصال پر صرف مسکرا دیتا ہے ۔ اور باندرہ کے علاقے کے ایک عام سے کوارٹر میں اپنے آپ کو بے نیازانہ خوشی عطا کئے ہوئے ہے ۔

اور یہ بے نیازانہ خوشی ایک سنت کوی میں ہی ہو سکتی ہے ، کسی مہنت کوی میں نہیں ۔

اور کہتے ہیں ایسی روحیں خدا اپنے ریزرو اسٹاک سے کبھی کبھی نکال کر دنیا میں بھیجتا ہے۔ ورنہ عام طور پر تو چالو مال سے ہی اپنی دنیا چلا رہا ہے۔ (حوالہ کے لئے دیکھو فکر تونسوی کو) اور اسے لئے میں ہمیشہ اسے سنت کوی کہا کرتا ہوں۔ جب بھی اس کے جھکے جھکے چہرے اور اس چہرے پر چہرے سے بھی زیادہ جھکی آنکھیں۔ اور سر پر نرم نرم سانپ کی طرح لپٹی سپید سپید جٹائیں اور ناتراشیدہ قسم کے سفید سادہ کرتے پائجامہ اور اس سادہ پاکیزہ کرتے پائجامہ میں لپٹا ہوا ایک لطیف و حسین شاعر کا جسم دیکھتا ہوں۔ جس میں کسی بھی سطح کی نمود و نمائش کا فقدان ہوتا ہے تو مجھے بے ساختہ اُس سنت کوی کا خیال آجاتا ہے جو ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ مگر جو میرے تخیل میں جنم لے چکا ہے اور میں جاں نثار اختر کی طرف لپکتا ہوں۔ "تم وہی تو نہیں ہو؟ وہی میرے سنت کوی"۔

"ہی ہی ہی۔ بھائی! میں تو جاں نثار اختر ہوں۔ تم کس سنت کوی کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جس کے جنم کا میں انتظار کر رہا تھا۔"

"اس کے نین نقش؟ اس کا حلیہ؟"

"میرے رگ و پے میں اس کے نین نقش سرسراتے ہیں۔"

"تو پھر تم ہی جانو بھائی۔ شاید تم نے ہی اسے تخلیق کیا ہے۔ قہ قہ قہ"

"مگر جاں نثار تم میری ہی تخلیق ہو۔ میں صدیوں سے اپنی تمناؤں کے لہو سے سینچتا رہا ہوں اور تم ہی مجھے ٹیلیفون پر آواز دیتے رہے ہو۔ فکر بھائی میں آگیا ہوں۔ میں جنم لے چکا ہوں اور آجکل ڈیڑھ سو روپے روزانہ کرایہ والے عریض ہوٹل میں ٹھہرا یا گیا ہوں۔ تم فوراً آجاؤ تاکہ تمہیں دکھاؤں اس ہوٹل کے بیرے کی وردی میرے لباس سے چار گنا بہتر ہے۔ کہو کہو تم ایسا کہتے رہے ہو کہ نہیں۔ سنت کوی! اس کا مطلب ہے کہ تم پیدا ہو چکے ہو۔"

اور جاں نثار اختر پھر وہی معصوم بے داغ قہقہہ لگا کر کہتا ہے۔ اچھا اچھا فکر بھائی تم کو مذاق کرنے میں لطف آتا ہے۔ یہ لو دُردِ تہہ جام پی لو۔ اور سنو۔ ایک تازہ نظم کہی ہے۔

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شر کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستہ حسین ہے

اور جب بھی وہ اپنی نظم سنانے لگتا ہے۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اس کی آواز، اس کا سراپا، اس کے مسام، اس کے روئیں روئیں کی جنبش سبھی، اس کی نظم میں ڈوب جاتی ہیں۔ وہ نظم کے مفہوم میں پوری طرح بھیگ جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس کی پوری شخصیت نظم میں سے ابھر رہی ہے۔ نظم کی ایک ایک بوند میں جاں نثار اختر کی سوچ چمک رہی ہے۔ اس کے محسوسات چھلک رہے ہیں۔ اس کا فکر و نظر جھلک رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ نظم سناتے وقت نہ صرف خود اس میں ڈوب جاتا ہے بلکہ نظم بھی اس میں ڈوب جاتی ہے۔ نظم اور جاں نثار کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ نظم شروع ہو رہی ہے یا جاں نثار اختر۔ میں نے بہت کم بلکہ بہت ہی کم فنکار ایسے دیکھے ہیں جن کی سوچ اور اظہار ایک

آج پلین سے روس جاتا ہے اور پلین ہی سے دہلی بمبئی پہنچتا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں لیکن ادب اور آرٹ کی لازوال قدریں کبھی نہیں بدلتیں۔ جاں نثار اختر کے سینے میں کلا کی جوت جو اس وقت روشن تھی جب وہ فلم میں جدوجہد کی ناکام زندگی بسر کر رہے تھے۔ کلا کی وہی جوت آج بھی اسی طرح جل رہی ہے جب ان کے پاس زندگی کی ہر آسائش موجود ہے . . .

دراصل اختر صاحب کی شاعرانہ شخصیت دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو وہ ہے جسے دیکھ کر آج کی فلم پرست اور فیشن پسند نسل ان کا احترام کرتی ہے، ان کے آٹو گراف لیتی ہے اور انہیں صرف اپنی گیتوں کی وجہ سے جانتی پہچانتی ہے جو ہر روز ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اور شخصیت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کے آغوش میں ان گنت شاہکار نظمیں اور کتابیں ہیں مشاعروں اور ادبی محفلوں میں باذوق سامعین ان کے اشعار پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن ان مشاعروں میں کبھی کبھی وہ ماڈرن لڑکے لڑکیاں بھی شامل ہو جاتے ہیں جو تقاضہ کرتے ہیں کہ آٹو گراف بک پر "یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے" والا پورا گانا لکھ دیجئے۔ ایسے عالم میں اختر صاحب کی بے بسی قابل دید بھی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ قابل رحم بھی، لیکن چونکہ وہ فطرتاً ایک پُرخلوص اور شریف انسان ہیں۔ اس لئے کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ ان موقعوں پر وہ کسی نہ کسی بہانے اپنا دامن تو بچا لیتے ہیں۔ لیکن وہ سخت مجبور ہوتے ہیں اور اس کا اعتراف وہ اپنے اس شعر میں بھی خوب کرتے ہیں ع

مجھے معلوم ہے میں ساری دنیا کی امانت ہوں
مگر وہ لمحہ جب میں صرف اپنا ہو سا جاتا ہوں

تخلیق کا وہ جادوئی لمحہ! جو فلمی اور غیر فلمی ماحول سے چھین کر انہیں ایک نئی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں صرف وہ ہوتے ہیں۔ خدا اور کوئی رسول تک نہیں ہوتا۔ تخیئل اور شعور کے پُراسرار جزیرے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی وجود تخلیق کی دھرتی سے اُگ کر ساری دنیا میں آکاش بیل کی طرح پھیل جاتا ہے۔

لیکن فکرِ معاش پھر انہیں کسی میوزک ڈائریکٹر کے ہاں کھینچ لاتی ہے۔ کسی ریکارڈنگ تھیٹر میں، کسی فلمی پارٹی میں، جہاں تخلیق کی روح کا پرستار کوئی نہیں ہوتا۔ صرف حسن شہرت، دولت اور گلیمر کے دیوانے ہوتے ہیں۔ لیکن فلم کا ماحول ہو یا خالص ادب کا اُن کی درویشانہ شان کہیں کم نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت کا تخلیقی وقار ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ سادگی ہی بانکپن اور انکساری میں عظمت کا پہلو دیکھنا ہو تو کوئی جاں نثار اختر کو دیکھے۔ انھوں نے اپنا شاعرانہ رتبہ کبھی کم ہونے نہیں دیا۔ چاہے وہ فلم ایکٹر یا پروڈیوسر کے گھیرے میں ہو یا فن کار خواتین کے جھرمٹ میں۔ یوں تو ان کی شاعری کے ہزار رنگ اور ہزار پہلو ہیں، لیکن ان کے اشعار، اُن کی نظمیں اور غزلیں نسبتاً صنفِ نازک میں زیادہ مقبول ہیں۔ (یہ میرا نہیں میری ایک ادب دوست خاتون کا خیال ہے)

اختر اُن شعرا میں سے نہیں جنہوں نے شاعری میں صرف نعرے بلند کئے ہیں۔ وہ یقیناً ایک سچے اور کھرے وطن پرست شاعر ہیں۔ انھوں نے صرف قلم سے جنگِ آزادی نہیں لڑی۔ اپنے ہر ہر عمل سے اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انتہائی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود معمولی مزدوروں کی سی زندگی بسر کی ہے اور محنت کشوں کی طرح عملی زندگی میں ان تھک محنت کی ہے۔ ان کا قلم جسم، دل اور دماغ سب قوم کی امانت ہیں۔ اختر صاحب کی ہر سانس حب الوطنی کی خوشبو سے معطر ہے۔ ذاتی مکان اور آسائش کے لئے انھوں نے کبھی سیاست کی غلط اقدار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے اور ترقی پسند مصنفین کے صدر بھی! انہی دنوں جب ترقی پسندی کی تحریک پر پابندی عائد کی گئی تھی تو انھوں نے سب سے پہلے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس قدر ایثار کی توفیق ہر شخص اور ہر شاعر کو نہیں ہوتی۔ لیکن انھیں زندگی کے سچے آدرشوں سے محبت تھی۔ اس کے لئے اتنا بڑا عہدہ ٹھکرا کر وہ بمبئی چلے گئے۔ اور وہاں انھیں مدتوں بھٹکنا پڑا۔ ناقابلِ برداشت اذیتیں اٹھانا پڑیں مگر ان کے اصولوں میں لرزش پیدا نہ ہوئی اور فاقہ مستی کے عالم میں بھی وہ بقول شخصے اس شعر کی تفسیر بنے رہے۔

پریم وار برٹنی

دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا آدمی

کیمرے کی آنکھ سے جب کوئی تجربہ کار آنکھ جھانکتی ہے تو زندگی کی فلم مختلف حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ دُکھ اور سکھ کے سین آنسو اور آہیں۔ دھرتی، سمندر اور آکاش سلولائیڈ کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ڈائیلاگ، گیت، اسکرین پلے، متضاد واقعات اور کردار سب مل کر ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں۔ فلم کی کہانی جو لیبارٹری کے اندھیرے کمرے میں ایڈیٹ ہوتی ہے اور پھر تھیٹر کے اندھیرے ہی میں دکھائی جاتی ہے۔ یہی فلم کبھی نہایت کامیاب ہونے پر بھی ناکام ہو جاتی ہے اور کبھی انتہائی بکواس ہونے کے باوجود باکس آفس پر ہٹ ہوتی ہے اور لاکھوں روپے کماتی ہے۔

یہی حال زندگی کا ہے کھوٹی اور کھری زندگی کا! جو بعض اوقات بھرپور عظمتوں کے باوجود اندھیروں میں سسکتی رہتی ہے اور کبھی دفعہ کوئی صلاحیت نہ ہونے کے باوجود انتہائی روشن اور عظیم دکھائی دیتی ہے لیکن اہلِ نظر پتھروں اور ہیروں کی چمک کا فرق بخوبی پہچان لیتے ہیں۔

نہرو ایوارڈ لینے اور روس کی یاترا کرنے کے بعد جاں نثار اختر پچھلے دنوں دہلی لوٹے تو اُن کے اعزاز میں ایک مخصوص نشست کا انتظام کیا گیا۔ شاعر دوستوں کی مسکراہٹیں، جگمگاتے چراغوں کی لَو بن کر مئے کے پیالوں میں ڈھلنے لگیں۔ کالی سیاہ زندگی کے "گھر آنگن" میں شاعری کی رنگارنگ پھوار برسنے لگی۔ لیکن یہ فضا ابھی سحر کے دھندلکوں میں تبدیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دوسرا سین بدل گیا یعنی جاں نثار اختر بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے بمبئی کے لئے پرواز کر گئے۔ انھیں نوشاد میاں کے ساتھ ایک نئی فلم کا گیت لکھنا تھا۔ لیکن یہ خبر پڑھ کر میری آنکھوں میں ایک پرانا منظر گھومنے لگا۔

بمبئی باندرہ ٹاکیز کے سامنے ایک چھوٹا سا بس اسٹینڈ ہے جس کے شیڈ میں پھنس پھنسا کر مشکل سے پندرہ سولہ اشخاص پناہ لے سکتے ہیں۔ مگر موسلا دھار بارش میں تقریباً چالیس آدمی رین کوٹ پہنے اور چھتریاں تانے بس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک سرے پر میں کھڑا تھا اور اسی میں شیڈ کے باہر چھاتا تانے مگر کھلے پاجامے کے پائینچے اٹھائے اختر صاحب کھڑے بھیگ رہے تھے۔ ہم دونوں کو ایک ہی بس سے دادر جانا تھا جہاں کی اسٹوڈیو میں لیکن ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ Contribution سے ٹیکسی لے کر منزل مقصود تک پہنچ سکتے۔ شاید ہم دونوں کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے۔

وہ بھی ایک دور تھا کہ اختر صاحب خستہ حال، چپل میں کرتا پاجامہ اور مخصوص جیکٹ پہنے بکھرے بکھرے بالوں کے ساتھ بمبئی کے اسٹوڈیوز میں دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت اُن سے کوئی اسسٹنٹ فلموں کے گیت بھی خوشی سے نہیں لکھواتا تھا۔ اور ایک یہ دور بھی ہے کہ ابھی چند ماہ قبل سوویٹ دیس سے نہرو ایوارڈ لے کر آئے ہیں۔ بس کے انتظار میں دیر تک کھڑا رہنے والا وہی شخص

اور میری نظم سب سے کمزور۔ لیکن پروگرام کے اختتام پر میں جب خلوص دل سے مبارکباد دینے آگے بڑھا تو اختر صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور الٹا میری نظم کی تعریف شروع کردی! تعریف اگر مناسب نہ ہو تو زہرخند معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اختر صاحب شاعر کے انداز میں کسی ماہر ایکٹر کا رول ادا کر رہے ہیں۔ شاعری اور ایکٹنگ! اس تاثر نے جاں نثار اختر کو پھر سے دو متضاد ٹکڑوں میں تقسیم کردیا.....

فلم کی ٹیکنک میں فلیش بیک ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر شاید ہی کسی فلم کی کہانی مکمل ہوتی ہو! کمال اسٹوڈیو کی سیڑھیوں پر اچانک مصوّر راشد میاں سے مڈبھیڑ ہوئی تو ان کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا۔ "یہ مسٹر جادو ہیں۔ اور ——— راشد کی بات کاٹتے ہوئے جادو نے کہا "بس اور کچھ نہیں میں صرف جادو ہوں!" ہم تینوں کمال اسٹوڈیو کے کاسٹیوم ڈیپارٹمنٹ میں پیچھے گدوں پر آکر بیٹھ گئے جہاں ہمارے شاعر کفیل آذر اور عثمان عامر بھی موجود تھے۔ اس ملاقات میں جادو سب سے زیادہ بولتا رہا۔ اور شرارتی ذہین مگر بے حد باتونی لڑکا! خطرناک حد تک چرب زبان اور صاف گو! بہت ہی معمولی کپڑوں میں بیڑی پیتے ہوئے وہ مجھے اسلئے بھی عجیب لگا کہ اس کی ضروری غیر ضروری فقرہ بازی سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ "مجھے اپنے باپ سے محبت ہے نہ نفرت! میں گھر میں نہیں رہتا بلکہ یہاں اسٹوڈیو کی کسی بینچ پر سو جاتا ہوں!" ہر کسی کا مذاق اڑانے والا لطیفہ گو جادو! اندھیری والی اتّی کے اڈّے میں کچی شراب کے دو پیگ پینے کے بعد ہمیشہ کہا کرتا۔ "میں اپنے باپ سے بڑا رائیٹر بن کر دکھاؤں گا۔"

"جادو تم ہالی وڈ چلے جاؤ۔ وہاں تمہاری کہانیاں خوب بکیں گی۔" میں نے ایک بار اسے چھیڑا تو وہ بپھر گیا۔ آپ اچھے شاعر سہی۔ مگر فلم میں کامیاب ہونے کا ایک گر بھی آپ کو نہیں آتا۔ میں اس کامیابی کے راز کو جانتا ہوں۔ اور ایک دن سب کو دکھادوں گا کہ میں ایک بڑا آدمی ہوں۔ عظیم رائیٹر ہوں۔

یہ کس قدر تلخ مگر سچی بات ہے کہ میں تو فلم سے کنارہ کش ہو چکا ہوں۔ لیکن وہی جادو جو دوستی ہونے کے بعد کمال اسٹوڈیو کی کینٹین سے ہمارے لئے چائے اور سگریٹ لایا کرتا تھا اور جسے میں تو کیا میرا کوئی ادیب دوست بھی رائیٹر ماننے کو تیار نہ تھا۔ آج وہی جادو 'جاوید' کے نام سے (سلیم جاوید) کا نصف بن کر ہاتھی میرے ساتھی، زنجیر، دیوار اور شعلے جیسی سلور جوبلی فلموں کی کہانیاں لکھ چکا ہے اور پروڈیوسروں سے لاکھوں روپیہ معاوضہ وصول کرکے اپنی شخصیت کا لوہا منوا چکا ہے۔ اور اپنے قلم کے زور سے ثابت کر چکا ہے کہ امیتابھ بچن ہو یا دلیپ کمار، کوئی بھی اسٹار اچھی کہانی کے بغیر سُپر اسٹار نہیں بن سکتا.....

ایک حسّاس آنکھ پھر متحرک ہوتی ہے اور کیمرہ زوم کرتا ہوا ایک بڑے سے چہرے پر آکر رک جاتا ہے جس کے پہلو میں کچھ کانٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ فلمی دنیا کی آب و ہوا واقعی بڑی عجیب اور پراسرار ہے جو راتوں رات ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی بنا دیتی ہے۔ میرے حافظے کی تاریخ میں فلمی زندگی کے شب و روز نے حادثات کے قلم سے اختر صاحب سے متعلق نفرت اور بیزاری کے جو ورق لکھے تھے، فن کے مقدس ہاتھ نے انھیں پھاڑ کر ہوا میں منتشر کردیا ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری ان کی انسان دوستی اور کردار کی خصوصیت میرے ذہن کے اندھیرے اجالے میں کسی انمول فلم کے رنگین مناظر کی طرح گھوم رہی ہے۔ صہبائے تند و تیز کا عالم یہ ہے کہ ڈر لگتا ہے۔ کہیں پھر سے تخلیقی احساس اور وجدان کا آبگینہ نہ پگھل جائے ——!

میں جاں نثار اختر کی ذات اور شخصیت کے متعلق نجی یادوں پر مبنی یہ آرٹیکل لکھ رہا ہوں کوئی قصیدہ نہیں اور نہ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کوئی ناراض ہوگا یا میری تحریر سے خوش ہوگا۔ سچائی اور حقیقت کا اظہار میں نے ہمیشہ کیا ہے اور یہ مضمون بھی اسی کا آئینہ دار ہے۔ میں اختر صاحب کو فرشتہ بنا کر نہیں دکھانا چاہتا۔ کہ وہ ایک اچھے شاعر اور بھلے آدمی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں کمزوریاں ہیں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ کیا خود ہم میں نہیں ہیں؟

دل بھکاری ہے مگر شانِ امیری بھی تو دیکھ
اس کے دامن سے کئی زخموں کے زیور نکلے!

بعض بڑی شخصیتیں بہت پہلو دار ہوتی ہیں۔ ان گنت سنہری پردوں میں لپٹی ہوئیں! لیکن جب ان پردوں کے اسرار کھلتے ہیں اور نقلی نقاب اترتے ہیں تو حقیقت کا چہرہ کبھی کبھی بڑا بھیانک نظر آتا ہے اور کبھی بے حد حسین بھی! میرے اور اختر صاحب کے ابتدائی تعلقات اور مراسم کے سلسلے میں اول الذکر تاثر کچھ عجیب سا بلکہ کسی حد تک نفرت انگیز ثابت ہوا۔۔۔

میں نے فلم انڈسٹری میں جانے سے پہلے صفیہ آپا کے خطوط کا مجموعہ "زیر لب" پڑھا تھا اور میری انسانی اور تخلیقی صلاحیتوں کو ان خطوط نے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں جاں نثار اختر سے زیادہ صفیہ آپا کی عظمتوں کا پرستار ہو گیا تھا۔ اگرچہ ان خطوط کا مرکز اختر ہی تھے۔ لیکن مجھے ان سے زیادہ صفیہ آپا کی بھرپور محبت اور بے پناہ خلوص نے متاثر کیا تھا۔ محبت اور خلوص کا وہ جذبہ جو صرف ذاتی نہ تھا۔ ہمہ گیر تھا بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ غم دوراں کے تاریک و طویل سفر میں اسی جذبہ کی قندیل نے اختر صاحب کو نیکی، آدرش اور انسانیت کا راستہ دکھایا تھا اور یہ وہی جذبہ تھا جس کی آگ کسی شخص کو سونے سے کندن بنا دیتی ہے۔

زیر لب نے میرے تخلیقی اور جمالیاتی انداز فکر کو زندگی کا ایک نیا زاویہ عطا کیا تھا۔ لیکن پھر، مجھے معلوم ہوا کہ اختر صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس دوران اگرچہ صفیہ آپا کا انتقال ہو چکا تھا اور مسلم معاشرے میں دوسری شادی کوئی غیر اخلاقی یا غیر فطری عمل نہیں! لیکن پھر بھی میرے احساس کو ایک ٹھیس لگی۔ ع "انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو" ایک پرانا مصرعہ سہی مگر بے انتہا خوبصورت ہے اور حساس دلوں کو شدت سے متاثر کرتا ہے! فلم ٹیکنک کے مطابق کٹ ٹو کٹ cut to cut کے مطابق چند تصاویر میں مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ صفیہ آپا کا انتقال۔ ان کے بارے میں جاں نثار اختر کی سوز و گداز میں مستغرق ایک ماتمی نظم۔ پھر صفیہ آپا کے مزار پر ایک پریشان و خستہ حال شخص کی رسائل میں شائع شدہ تصویر اور اسی شخص کی دوسری شادی۔ یہ سب اس وقت ہوا تھا جب میں جاں نثار اختر سے نہیں ملا تھا اور ان ہی واقعات کی چنگاریاں میرے اندر کی آگ کو ہوا دے کر جہنم بنا گئی تھیں۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی بہت ہی پیاری اور محبوب شخصیت سے ہم محض ایک معمولی واقعہ کی بنا پر نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ردعمل پیش آیا یعنی اختر صاحب کی انتہائی خوبصورت نظمیں اور غزلیں پڑھنے کے باوجود میں ان کے لئے اپنے دل میں کوئی لگاؤ پیدا نہ کر سکا۔ دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے آدمی کے لئے میری نفرت نفسیاتی اعتبار سے بڑھتی رہی۔ اور اس واقعہ کے بعد تو میرا وجود جھنجھلا سا گیا۔

میں فلمی دنیا کی خاک چھان رہا تھا۔ ان ہی دنوں انجمن ترقیِ اردو کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کے موضوع پر آٹھ مختلف علاقائی زبانوں کا ایک مشترکہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں انگریزی اور مراٹھی سے لے کر پنجابی تک کے شعراء شامل تھے۔ یہ مشاعرہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اپنی طرز کا واحد اور انوکھا مشاعرہ تھا جو آل انڈیا ریڈیو کے ہر اسٹیشن سے نشر ہوا تھا۔ اور جس میں پڑھی نظموں کو انجمن ترقی اردو نے مشاعرے سے کتابی صورت میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس لئے کہ جب کوئی بنگالی، گجراتی یا مدراسی شاعر اپنا کلام اسٹیج سے پیش کر رہا ہو تو سامعین میں سے اس زبان کو نہ سمجھنے والے لوگ نظم کا انگریزی روپ دیکھ کر اس کا مفہوم سمجھ سکیں۔ اس مشاعرے میں ملک بھر سے اردو کے سات شعراء کو مدعو کیا گیا تھا اور حسنِ اتفاق سے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نام کے لحاظ سے ایک ہندو شاعر ہوں۔ یا پھر اس لئے کہ مجھے تقسیم وطن کے بعد کی نسل کے شعراء کی نمائندگی کا حق دیا گیا تھا۔ بہر حال مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ اس مشاعرے کے تمام شعراء میں جاں نثار اختر کی نظم سب سے بہتر تھی۔

کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بھی میری طرح کہیں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور اختر صاحب فرما رہے تھے۔

نامرادی کے بعد بے طلبی　　　ایسا ایسا سکون جینے میں
جیسے دریا میں ہاتھ لٹکائے　　　سو گیا ہو کوئی سفینے میں

بس! بس اور نہیں! ایک آواز میرے پورے وجود کو چیر گئی۔ کرب و احساس کی چٹانیں جن سے ٹکرا کر میرا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ میں اپنا کلام سنائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل آیا۔ میری اور جاں نثار اختر کی آخری ملاقات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی پھر میں دوسرے ہارٹ اٹیک کے بعد پنجاب آگیا تھا۔۔۔ اور اس کے بعد امید نہیں تھی کہ کوئی اور ملاقات ہو سکے گی مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اب زندگی مجھے زیادہ رہنے کی اجازت نہیں دے گی۔

— o —

لیکن وقت کے پاس میری سانسوں کا حساب کچھ اور تھا۔ اور ابھی اس مضمون کے مقدر میں اضافہ ہونا بھی باقی تھا۔ حالانکہ اسے میں مدتے بہت دن پہلے مکمل کر لیا تھا۔ لیکن میری انا اور خودداری نے میرے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ مضمون میں نے ان ہی دنوں لکھنا شروع کر دیا تھا جب صاآبردت نے مجھے 'جاں نثار اختر نمبر' میں لکھنے کی دعوت دی تھی۔

۱۴ ستمبر صبح کو میری ذاتی درخواست پر جاں نثار اختر اور صاآبردت میری کٹیا پر تشریف لائے۔ "غریب خانہ" میں دانستہ استعمال نہیں کروں گا کہ بہر حال اس میں "خانہ" جیسا باوقار لفظ شامل ہے۔ اور میں اپنی بیوی اور بچی سمیت ان دنوں جہاں رہتا ہوں اسے کٹیا کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دراصل علی سردار جعفری، جاں نثار اختر اور صاآبردت ایک مشاعرے میں شمولیت کی غرض سے آئے تھے۔ علی سردار جعفری صاحب سے گذشتہ شب ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ کسی نامعلوم شخص کے مہمان تھے۔ لیکن اختر صاحب اور صاآبردت کشمیری لال ذاکر کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سویرے جب میں ذاکر صاحب کے ہاں پہونچا تو پہلی خبر یہ ملی کہ ذاکر آؤٹ آف اسٹیشن ہیں۔ مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ جاں نثار اختر میری دعوت قبول فرمائیں گے کیونکہ انھیں اسی شام بمبئی واپس جانا تھا۔ اور شہر میں اُن سے ملنے والوں کی تعداد بے شمار تھی۔ لیکن اختر صاحب کی "خلوص دلی" سادگی اور معصومیت نے کوئی اعتراض نہ کیا اور فوراً میرے ساتھ رکشا میں سوار ہو کر تشریف لے آئے۔ ہمارے ساتھ ہندی کے مشہور ریکھک یشپال بھی تھے جو میری طرح اختر صاحب سے ملنے آئے تھے۔

اختر میرے ہاں آئے تو ان سے ملنے کے لئے ارد گرد کے کئی لوگ بے چین ہو اٹھے مگر میں نے انھیں اس جم غفیر سے بچانا چاہا۔ پھر بھی نئی نسل کے ایک صاحب جو فلمی کہانیاں لکھتے تھے اور ایک لڑکی جو ہیروئن بننا چاہتی تھی، میرے ہاں اختر صاحب کے دیدار کی خاطر تشریف لے ہی آئے۔ میری بیوی چونکہ اچھی طرح اردو پڑھ لیتی ہے اور اس کے پسندیدہ شعرا میں اختر صاحب بھی شامل ہیں۔ لہٰذا وہ بھی ہمہ تن گوش تھیں۔ اختر صاحب مختلف غزلوں کے چند متفرق اشعار سنا کر خاموش ہو گئے اور پھر مجھ سے اور صاآبردت سے سنانے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ لیکن ہم تو صرف اختر صاحب کو سننے کے خواہش مند تھے۔ اس لئے میں نے ان کی فنکارانہ رگ کو ایک خاص انداز سے چھیڑا۔ اور میری یہ کوشش کامیاب ہو گئی۔ اختر صاحب اپنی نظم "آخری لمحہ" سنانے لگے اور پھر سناتے ہی چلے گئے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو بے حد خوب صورت ہے اور جو انھوں نے اپنی بیٹی کے نام منسوب کی ہے۔ نظم بڑی تاثراتی اور اثر انگیز ہے اور مختلف بحروں میں لکھی گئی ہے۔ بحریں بدل رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اختر صاحب کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ اس نظم کے آخری حصے میں انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا ہے۔

"دنیا کے غموں سے نہ گھبرانا کہ غم ہی تو زندگی کی سب سے بڑی قوت ہے۔" اور ہم آخری لمحے میں یعنی نظم کے آخری حصے

اتنی باتیں! اتنی ملاقاتیں یعنی آتشِ سیّال کے اتنے گھونٹ کہ اگر اس مضمون کی صراحی میں جمع کروں تو صراحی ضرور چھلک جائے گی اور ظاہر ہے کہ باظرف حضرات چھلکنے والی چیزیں کم ہی پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا میں جاں نثار اختر سے آخری بار ملاقات تازہ کروں گا۔ چار برس قبل میں بمبئی میں تھا۔ وہ عید کی رات تھی۔ میں نشے میں دھت بلا وجہ جذباتی ہو رہا تھا۔ جیب میں چونکہ کچھ پیسے بھی تھے۔ اس لئے ایک ایک دوست کے گھر جاکر اسے عید مبارک کا پیغام دے رہا تھا۔ گلے مل رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہاں عید کی رات کتنی فلمی اور غیر فلمی چہرے موجود ہوں گے! لیکن اختر صاحب کے ہاں صرف باقر مہدی اور عزیز قیسی ملے۔ وہ تینوں ہمہ تن نوش تھے اور بھابی کچن میں کچھ پکا رہی تھیں۔ میں نے سب کو عید کی مبارکباد دی۔ اور پھر میرے دیرینہ دوست عزیز قیسی لپک کر کہیں سے ایک بوتل اور اٹھا لائے کہ انھیں میری بلا نوشی کا عالم معلوم تھا۔ لیکن اس رات میں پہلے سے بہت پیئے ہوئے تھا۔ پھر عید کی خوشی میں چار جام لہرائے۔ اور اس رات میں نے جاں نثار اختر سے ایک بات پوچھی جو شاید میں صوفی حالت میں کبھی نہ پوچھتا۔ شراب میں لاکھ عیب سہی لیکن ایک وصف بھی ہے کہ آدمی بہت بے تکلف اور بولڈ ہو جاتا ہے۔

اختر صاحب! آپ نے "بہو بیگم" جیسی عظیم فلم پروڈیوس کی۔ لیکن خود بہت اچھا شاعر ہونے کے باوجود آپ نے اس فلم کے گیت ساحر لدھیانوی سے کیوں لکھوائے؟ اختر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں دھیمے سے مسکرا کر کہا "کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ڈسٹری بیوشن میں میرا نام تب نہیں بکتا تھا۔ اور ساحر کی مانگ تھی۔ پھر ساحر دوست بھی تو ہے"۔ دوستی اور ایسی دوستی تو بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم سب کسی حد تک سبھی خود غرض ہوتے ہیں یا...... میں نے بحث کرنا چاہی تو اختر صاحب نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "چھوڑو میاں لو ایک تازہ غزل سنو۔ لیکن یہ تلخ حقیقت بھی جان لو کہ دراصل بہو بیگم لاکھ دو لاکھ روپیہ کما کر میں فلم لائن چھوڑنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ فلم فلاپ ہوگئی۔ اس طرح مجھے زندگی سے ایک بار پھر نبرد آزما ہونے کا موقع مل گیا۔"

اختر صاحب نے غزل کا پہلا مصرعہ پڑھا،

"دل وہ مجرم ہے جو اپنی سزا مانگے ہے"

ہم سب دم بخود اور ہمہ تن گوش تھے۔ اختر صاحب کے پرسکون چہرے پر ایک بھونچال سا تھرتھرا رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔

"زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے!"

خدا کی پناہ۔ یہ زندگی آخر اور کیا مانگتی ہے۔ جاں نثار اختر کو کن مرحلوں اور کن سمتوں کا تجسّس ہے۔ یہ ساری روداد اس مصرعے میں سمٹ آئی ہے۔ مکرّر مکرّر! صرف دو تین آوازیں بلند ہوئیں اور پھر جاں نثار اختر نے دوبارہ مصرعہ پڑھا۔ آنکھوں کی پتلیاں متحرک تھیں اور چہرے کی ایک ایک جھرّی مرتعش ہو کر سوالی کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی،

زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے

اور پھر دوسرے رنگ میں یوں کہ ــــــ

سانس ویسے ہی زمانے کی گھٹی جاتی ہے
وہ بدن اور بھی کچھ تنگ قبا پہنے ہے

لیکن میرا دھیان تو اسی مصرعے میں "زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے" الجھا ہوا تھا اور اختر صاحب غزل کے بعد اور قطعات سُنا رہے تھے۔ ہر شعر ہر بات اور ہر لفظ میں ان کا اپنا منفرد ایکسپریشن، کروٹ کروٹ مچل کر نمایاں ہوتا اور دل کے اضطراب کو اور بڑھا جاتا۔ اس عالم سکون نے اضطراری کیفیت کو کتنا نمایاں کر دیا۔ میں عزیز قیسی سے اور باقر مہدی سے نگاہوں ہی نگاہوں

اندر اور باہر ہر طرف ہو کا عالم ہے ۔ میرے تنگ کمرے میں دوسری کھاٹ پر میری بیوی اور بچی بے سُدھ سو رہی ہیں ۔ انھیں میرے اضطراب کا اندازہ کیوں ہوگا ؟ دل کہتا ہے چلو اٹھو ۔ اور گوتم کی طرح بیوی اور بچی کو چھوڑ کر کسی اندھی گپھا کی طرف نکل جاؤ ! لیکن ہر شخص تو گوتم نہیں ہو سکتا ! اور پھر تیاگ اور فرار کی راہوں میں فرق بھی تو ہے ۔ لیکن گوتم کی طرح میں سب کچھ چھوڑ کر کسی جنگل میں نکل بھی جاؤں تو کیا بھروسہ ہے کہ وہاں مجھے سکون مل سکے گا ! مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی ایک آواز بار بار گونجتی رہے گی اور چیخ چیخ کر مجھ سے کہے گی ۔

زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے !!

" جاں نثار اختر بیک وقت عمر کی تینوں منزلوں میں ہیں ۔ تینوں عمریں کو ایک ساتھ جی رہے ہیں ۔ اُن کی شخصیت کا یہ رستار ، اُس وقت تو اور بھی جھنجھنا اُٹھتا ہے جب کوئی خوبصورت چہرہ اور جام شراب اُن کے سامنے ہو ۔ مجاز تو ساری دنیا کے حُسن کو ایک نظر میں اور ساری دنیا کی شراب کو ایک گھونٹ میں پی جانا چاہتا تھا ، اختر بھائی کی تینوں عمریں اُس وقت بیدار ہو جاتی ہیں ، اُسے تین نظر اور تین گھونٹ میں بانٹ لیتے ہیں ۔ وہ اُسے سہ آتشہ کر کے پیتے ہیں ۔ وہ ایسے میں بچوں کی طرح ہُمکتے ہیں ، جوانوں کی طرح لپکتے ہیں اور بزرگوں کی طرح محتاط رہتے ہیں ۔

شہاب جعفری

میں جب شاعر بستر مرگ پر کروٹ بدل رہا ہے۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ تمام ماحول دھندلا گیا ہے۔ وہ بے حد جذباتی انداز میں فرماتے ہیں۔ "آؤ بیٹی! تمہارے چاند سے ماتھے کو چوم لوں۔ یہ نظم تمہارے نام ایک ہدیہ ہے۔ ایک باپ کا نذرانہ۔ اور پھر جب وہ نظم اختتام پر ہے تو میری کٹیا پر ایک گہرا سناٹا محیط ہے۔ کسی کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ اور اختر صاحب اپنی بیٹی سے جو بیل کی طرح پروان چڑھ چکی ہے، کہتے ہیں۔ میرے ان اشعار کا نذرانہ قبول کرنا کہ یہ میرے خواب ہیں۔ اور اگر میں مر بھی جاؤں تو خواب تو نہیں مر سکتے ——؟

اللہ۔ کیا عظیم اور ہمہ گیر کیفیات ہیں جو اس نظم کے پیکر میں ڈھل گئی ہیں۔ سننے والوں کی آنکھیں بے اختیار نم آلود ہو جاتی ہیں۔ مگر بدلتے ہوئے تاثرات والا احساس چہرہ پتھر کی طرح خاموش اور جامد کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ راز تو عام لوگ نہیں جان سکتے صرف تخلیق کاروں کو معلوم ہوتا ہے۔ علی سردار جعفری نے اختر صاحب کی اس نظم کے بارے میں یہ کہا تھا کہ یہ جواہر لعل نہرو کی وصیت کی طرح انتہائی انمول ہے۔ اس سے بڑا تبصرہ اور کوئی کیا کرے گا؟ ہم سب خاموش ہیں۔ سکوت کا گہرا طلسم توڑنے کے لئے اختر صاحب نے ایک اور سگریٹ سلگائی ہے اور کہیں کھو گئے ہیں۔ میں کیا سناؤں گا؟ صابر دت تم ہی کچھ سناؤ؛ صابر دت نے کہا ہے اس نظم کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں سنا سکتا؟ چائے آگئی ہے۔ میں رسماً شکریہ ادا کرنے کے لئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ تلاش کرتا ہوں۔ مگر الفاظ گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ میری بیوی نے کہا ہے۔ "آپ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں آئے جو آپ کے قابل نہیں اور ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکے —" اب صابر دت جذباتی ہو جاتا ہے۔ بھابی! آپ کے اور پریم کے پاس یہ چھوٹا سا گھر تو ہے۔ نیاز حیدر اردو کے اتنے بڑے لفنے بلند شاعر ہیں۔ پچھلے دنوں جب دنیا کے سفر پر گئے تو ایک ملک کے عقیدت مندوں نے انھیں بیس ہزار کے تحائف (ٹیپ ریکارڈر، کیمرے، گھڑیاں وغیرہ) جانے کیا کیا کچھ پیش کیا؟ مگر نیاز حیدر نے صرف ایک بات کہی! میں ان تحائف کو رکھوں گا کہاں؟ میرے پاس ملک تو ہے لیکن گھر نہیں! اس فقرے کو سن کر سب سُن ہو گئے ہیں۔ لیکن اختر صاحب بدستور مسکرا رہے ہیں۔ جیسے ان کے لئے یہ اچنبھے کی بات نہ ہو! وہ تو اس قسم کا تمام زہر پہلے پی چکے ہیں!

"اچھا اب اجازت دیں" اختر صاحب جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں! میں اداس ہو کر ٹائم پیس دیکھتا ہوں۔ اختر صاحب کو آئے ہوئے پورے ڈھائی گھنٹے بیت گئے ہیں حالانکہ وہ صرف پندرہ منٹ کے لئے آئے تھے!! کتنے عجیب لوگ ہیں کتنے عظیم فنکار ہیں؟ ہمارے دیش میں! صرف ہمارے دیش کیوں؟ دنیا کے تمام دیشوں میں ساری دھرتی کے فنکار۔ جو انسانیت کی آن کے لئے، زندگی کا سارا زہر پی کر بھی مسکرا رہے ہیں۔ اختر صاحب ..... ——!!

—○—

جب میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا تھا تو میں اپنی کٹیا میں اکیلا تھا۔ میری بیوی گئی ہوئی تھی اور بچی اسکول پڑھنے! لیکن آج جب میں اس مضمون کی آخری سطور لکھ رہا ہوں تو رات کے دو بجنے والے ہیں۔ نیند آنکھوں سے اس طرح روٹھ گئی ہے جیسے کبھی میرا کہا نہ ماننے گی۔ میں ایک عرصہ سے شراب نوشی ترک کر چکا ہوں مگر آج نہ جانے کیوں بے اختیار جی چاہتا ہے کہ خوب پیوں۔ اتنی پیوں کہ کسی کا کچھ ہوش نہ رہے۔ لیکن رات کے دو بجے شراب کہاں سے ملے گی؟ تمام دکانیں بند ہیں۔ سارا شہر سونا اور تاریک پڑا ہے اور میرا لاابالی ذہن ایک تیز کٹار کی طرح رات کے سینے پر لرز رہا ہے۔ ترک مئے کے بعد ان دنوں میں ہر رات نیند کی ایک گولی کھاتا ہوں۔ نیند آور گولیوں کی شیشی میری الماری میں محفوظ رکھی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمام گولیاں ایک ساتھ کھا جاؤں تاکہ صبح کا سورج مجھے جگا نہ سکے لیکن دور بہت دور اندھیرے سے ایک دھیمی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے!

ہے۔ مجھے اس نظم میں ایک ایسے سماج کی بنیاد نظر آتی ہے جو ابھی ہے نہیں، لیکن جسے ہونا ہے۔ اس نظم میں انسان اور زندگی سے ایک ایسی بھرپور محبت پائی جاتی ہے کہ موت اپنے کامیاب ترین لمحوں میں زندگی سے ہراساں نظر آتی ہے اور جدائی کے آخری کربناک ثانیوں میں بھی وصال کا شبہ ہوتا ہے۔ جیسے صفیہ کا ہاتھ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جیسے اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اب بھی تمہارے ماتھے پر مچلی رہی ہے۔ جیسے اس کی نگاہوں کی گرمی اب بھی تمہارے دل کو مئے شبانہ سے مخمور کئے ہوئے ہے۔ ذرا سوچو تو نو سال کی بلند اور متوازن رفاقت نے "اردو" کو یہ نظم دی ہے۔ اگر یہ رشتہ محض جسمانی ہوتا جیسا کہ ہمارے سماج کی بدنصیبی اور کوتاہی اور جہالت سے لاکھوں گھروں میں ہوتا ہے۔ تو یہ نظم کہاں سے ہوتی؟"

مندرجہ بالا حادثہ ۱۹۵۳ء کا ہے۔ اس کے بعد آختر تین چار ماہ تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک پاگل پن تھا جو اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے لئے پھرتا رہا۔ اُس نے اور بھی بری طرح پینی شروع کر دی تھی اور بے راہ روی اس کی زندگی بن گئی تھی۔ چند دنوں بعد جب اختر کے نام صفیہ کے خطوط کتابی صورت میں شائع ہوئے تو اس کے پڑھنے سے لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی یہ حقیقت کھلی کہ صفیہ کو نہ صرف اختر سے بے انتہا محبت تھی بلکہ وہ اس کی نگراں بھی تھی۔ زندگی کے ہر موڑ پر نہ صرف اس نے اختر کا ساتھ دیا تھا۔ بلکہ ہر کڑے وقت میں اس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔

اختر وکٹوریہ کالج گوالیار میں اردو کا لکچرر تھا۔ اور وہاں اس کی زندگی کالج سے گھر اور گھر سے کالج تک محدود تھی۔ نہ کوئی ادبی سرگرمی تھی اور نہ ہی کوئی میل ملاقاتی۔ صفیہ نے اُسے ایک خط میں لکھا تھا:

"گوالیار میں تمہاری ذات سے اتنی کم چیزوں کو وابستہ پاتی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم وہاں کیسے ہو"

اور پھر جب ۱۹۵۰ء میں اختر حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو، فارسی شعبہ کا صدر تھا اور اس کی زندگی بڑی متوازن تھی۔ بھارت سرکار نے سرکاری لوگوں پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے کسی قسم کا کوئی ناتا نہیں رکھ سکتے۔ آختر کے لئے یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف روزی روزگار اور سماجی ذمہ داری تھی، اور دوسری طرف اصول اور عزائم۔ اس امتحان میں جب اختر پورا اترا تو صفیہ نے بڑے فخر سے اُسے لکھا۔

"تم نے استعفےٰ دے دیا، اچھا کیا۔ ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یوں ہی ممکن تھا۔ میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی، میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ بہرحال تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا اور سچ جانو میں تمہاری فوقیت کے احساس سے سر جھکانے کو تیار رہوں"

ایسی محبوب دوست اور رہبر بیوی کی جدائی آختر کے لئے کوئی معمولی سانحہ نہ تھا جسے وہ چپ چاپ سہن کر لیتا۔ اس ناقابل برداشت غم میں جیسے کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ وہ بے تحاشہ شراب پینے لگا تھا اور اس کے دل کی حالت ایسے نیم پاگل کی سی ہو گئی جسے اگر کچھ دیا جائے تو کوئی شکریہ نہیں، اگر کچھ چھین لیا جائے تو کوئی غم نہیں۔ اُس کے بال الجھے ہوئے ہیں لیکن وہ بے فکر ہے۔ صبح وہ اس لئے کپڑے بدلتا ہے کہ شام کو میلے چیکٹ ہو جائیں اور روزمرہ زندگی گزارنے کی اس کی خواہش تو اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ اب وہ کوئی اصولی زندگی نہیں گزار سکتا۔ لیکن تین سال بعد ۱۹۵۶ء میں ایشین رائیٹرز کانفرنس کے موقع پر دہلی میں جب میری اس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو خلاف توقع وہ کافی خوش نظر آیا۔ کالے رنگ کی بڑھیا شیروانی اُس کے بدن پر تھی اور اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی خوب صورت سی لڑکی تھی، جس سے میرا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا: "یہ ہیں خدیجہ طلعت... میری بیوی!" اور اس کے ساتھ ہی جب اس نے مجھے بتایا کہ یہ شادی "لو میرج" تھی۔ نستے کہتے ہوئے مجھے سردار جعفری کا یہ شعر یاد آ گیا۔

"صبر کرلیں گے تیری یادمیں رونے والے
جھلملا جاتے ہیں انسان کی یادوں کے چراغ"

فن اور شخصیت

پرکاش پنڈت

کھلی کتاب

بیئر کا ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا : "پرکاش ! میں بمبئی سے تنگ آچکا ہوں ۔ عجیب مشینی شہر ہے ۔ دوست کی دوستی پر تو کیا ، آدمی دشمن کی دشمنی پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتا ۔ تم نہیں جانتے میں کیسی زندگی گذار رہا ہوں !"

اپنی بیوی صفیہ (جو مشہور ترقی پسند شاعر مجاز کی چھوٹی بہن اور خود ایک ادیبہ تھی) کے اچانک انتقال اور بچوں کی دیکھ ریکھ کا کوئی خاص بندوبست نہ ہونے پر اُن دنوں وہ بہت پریشان اور دکھی تھا ۔ بیئر کا پہلا گھونٹ لیتے ہی جب بمبئی کا ذکر چھڑ گیا ، جہاں اسے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ۔ تو وہ اور بھی اداس ہو گیا ۔

اُس کی کربناک اداسی کو کم کرنے کے لیے میں نے گرہ لگائی : "لیکن تم نے ہی تو اچھی خاصی پروفیسری چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا تھا اور پھر بمبئی میں اپنے کئی ساتھی ہیں ۔ عصمت چغتائی ہیں ، کرشن چندر ہیں ، ساحر لدھیانوی ، سردار جعفری ، مجروح سلطان پوری اور راجندر سنگھ بیدی ...."

"ہاں ہاں" میری اس لمبی فہرست سے بوکھلا کر اس نے کہا ۔ "یہ سب تو ٹھیک ہے ، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؟ ہر ایک اپنے اپنے چکروں میں پھنسا ہوا ہے اور پھر فلم کا چکر تم جانو آدمی کو بالکل گھن چکر بنا دیتا ہے ۔" اُس نے بیئر کا ایک اور لمبا گھونٹ لیا ۔ اور کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا ۔ "یار ! بیئر سے بات نہیں بن رہی ہے وہسکی چلنی چاہیئے ۔"

وہسکی چلنے لگی اور دو تین پیگوں کے بعد کچھ سرور میں آکر اس نے بمبئی کی فلم لائن کے جو واقعات جس درد بھرے ڈھنگ سے سنائے وہ نشہ تو نشہ ہوش تک اڑا دینے والے تھے ۔

"اور تو اور" اس نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا : "فلم انارکلی کا مشہور گانا "اے جانِ وفا" میرا لکھا ہوا ہے لیکن دوسری فلم کمپنیوں کے پروڈیوسر اسے کسی دوسرے شاعر کا سمجھ کر مجھ سے کہتے ہیں ۔

"اختر صاحب ! ویسا گانا لکھیئے"

باتیں تو وہ زیادہ تر بمبئی اور وہاں کے فلمی ماحول کے بارے میں ہی کر رہا تھا لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ ایسی باتیں جان بوجھ کر ہی کر رہا ہے ۔ اس غم کو بھلانے کے لیے جو رہ رہ کر اس کا دل محسوس کر رہا تھا ۔ اور جو اس کی محبوب بیوی صفیہ کا غم تھا اسی غم نے اس سے خاکِ دل اور خاموش آواز جیسی اردو کی اہم ترین نظمیں کہلوائیں ۔ خاص کر "خاکِ دل" جس کے بارے میں مشہور کہانی کار کرشن چندر نے لکھا ہے :-

"اِس نظم پر تمہارے ذاتی غم کی چلمن تو پڑی ہوئی ہے ۔ لیکن اس چلمن کے پیچھے ایک پورا ہندوستانی گھر آباد

یہ چلتی زمیں پہ نگاہیں جماتی
وہ ہونٹوں میں اپنی قلم کو دباتی
کسی کی وہ ہر بار تیوری سی چڑھتی
دکانوں کے تختے ادھورے سے پڑھتی
کوئی ایک طرف کو سمٹتی ہوئی سی
کنارے کو ساڑھی کے بٹتے ہوئی سی

وہ لاری میں گونجے ہوئے زمزمے سے
دبی مسکراہٹ سبک قہقہے سے
وہ لہجوں میں چاندی کھنکتی ہوئی سی
وہ نظروں میں کلیاں چٹکتی ہوئی سی
وہ آپس کی چھیڑیں وہ جھوٹے فسانے
کوئی ان کی باتوں کو کیسے نہ مانے

فسانہ بھی اُن کا ترانہ بھی اُن کا
جوانی بھی اُن کی زمانہ بھی اُن کا

اس واقعہ کے چار چھ دن بعد جب علی گڈھ میگزین شائع ہوا اس میں اختر کی ایک نظم "اب بھی میرے ہونٹوں پہ ہیں بے گائے ہوئے گیت" چھپی تو لوگوں نے سمجھا، اختر نے اس نظم کے رد کیے جانے کی ضد میں یہ نظم کہہ دی ہے۔ اس کا ایک مصرعہ "کمبخت نے گانے نہ دیا ایک بھی گانا" گرلس کالج میں اتنا مقبول ہوا کہ مستقل طور سے لڑکیوں کی اس سپروائزر کا Nickname "کم بخت" پڑ گیا۔

علی گڈھ سے جاں نثار اختر نے ۱۹۳۹ء میں فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے کیا۔ اپنے طالب علمی کے دور میں وہ کئی انجمنوں کا صدر رہا۔ اور علی گڈھ میگزین کا مدیر بھی۔ ۱۹۴۰ء میں وکٹوریہ کالج گوالیار کے بلاوے پر وہ لکچرار کی حیثیت سے گوالیار چلا گیا جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک رہا۔ گوالیار میں اختر کے کہنے کے مطابق اُسے علی گڈھ جیسا ادبی ماحول نہ مل سکا۔ لے دے کے ہندی کے پرسدھ کوی شیو منگل سنگھ سُمن تھے (جو خود اس کالج میں لکچرر تھے) جن سے دو باتیں ہو جاتی تھیں۔ لہذا گھر تھا اور اختر تھا یا پھر کالج تھا اور اختر تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب اختر حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو فارسی شعبہ کا صدر ہوا۔ ایک بار پھر اُسے پسندیدہ ماحول مل گیا بھوپال میں اُس نے انجمن ترقی پسند مصنفین میں نئی امنگیں اور نئے عزائم پیدا کرنے میں نمایاں رول انجام دیا اور وہاں کے نوجوان شاعروں اور قلمکاروں پر بڑا صحت مند اثر ڈالا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک وہ خود بھی ترقی پسند مصنفین کا صدر رہا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں اپنی انہی خدمات کی وجہ سے بھوپال چھوڑ کر روزی روٹی کے لئے بمبئی آنا پڑا۔ کیونکہ بھارت سرکار نے سرکاری عہدیداروں پر پابندی عائد کردی تھی کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین، انڈین پیوپلز تھیٹر وغیرہ ادبی اور سماجی انجمنوں سے نہ تو رشتہ رکھ سکتے تھے اور نہ ہی ان کے پروگراموں میں کسی طرح کا حصہ لے سکتے تھے۔

بمبئی میں پاؤں جمانے کے لئے اختر پورے تین برس تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ فلمی گیت لکھنے کا تھوڑا بہت کام ضرور ملا لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔ تین سال کا یہ زمانہ اختر پر بڑی مصیبتوں کا زمانہ رہا ہے۔ ایک طرف مالی فکریں تھیں دوسری طرف صفیہ کی بیماری نے اُسے بے حال کر رکھا تھا۔ آخر جنوری ۱۹۵۳ء میں صفیہ کا انتقال ہو گیا جس نے اختر کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لکھنؤ سے بیوی کی بیماری کا سبب اُسے آخری تار ملا تو اُس کے پاس کرایہ تک کے پیسے نہ تھے۔ پورے چوبیس گھنٹے کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ کسی طرح کرایہ کا انتظام کر سکا لیکن جب لکھنؤ پہونچا تو صفیہ کے بجائے صفیہ کی قبر دیکھنے کو ملی۔

اختر کی شاعری کا آغاز اردو کے زیادہ تر شاعروں کی طرح غزل سے ہوا۔ اور ۱۹۳۵ء تک اس نے روایتی عاشقانہ غزلیں ہی کہیں پھر اپنے ہم عصر شاعروں کی دیکھا دیکھی اُس نے رومانی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ انہی دنوں ۱۹۳۶ء میں جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد پڑی تو بہت سے دوسرے شاعروں اور قلمکاروں کی طرح وہ بھی اس ادبی تحریک کا حامی بن گیا۔ اردو کے مشہور نقاد احتشام حسین کے لفظوں کے مطابق "اب اختر کے محبت کی رومانی جذبوں میں دھیرے دھیرے ایک رومانی انقلاب رونما ہوتا گیا اور جب سماجی

لیکن یادوں کے چراغ جھلملا ضرور جاتے ہیں بجھتے شاید زندگی بھر نہیں۔ کیونکہ ۱۹۵۸ء میں بھوپال کی ایک ادبی تقریب میں جس میں اس کی دوسری بیوی خدیجہ بھی موجود تھی۔ اس نے بڑی درد بھری آواز میں اپنی نظم 'خاکِ دل' سنائی۔ اور بیٹھک کے بعد خدیجہ کا مایوس چہرہ دیکھ کر اس نے کہا۔ "خدیجہ! صفیہ سے میری محبت بٹ ضرور گئی ہے لیکن ختم نہیں ہو سکتی۔ کسی اگلے مشاعرے میں میں ایسی نظم پڑھوں گا جسے سن کر تم خوش ہو جاؤ گی۔" اور سچ مچ دوسرے دن کی بیٹھک میں ہی اس نے "خدیجہ کے نام" عنوان سے ایسی نظم پڑھی جسے سنتے ہی خدیجہ شرما گئی۔ اور یہاں بمبئی میں آج کل میں دیکھتا ہوں خدیجہ ہی کی وجہ سے اس کی زندگی کافی حد تک راہ راست پر آگئی ہے۔ اس نے باقاعدہ فلمی گیت لکھنے کا کام شروع کر دیا ہے اور جلد ہی اچھے فلیٹ میں منتقل ہونے والا ہے۔ خود اختر کا کہنا ہے اسے اپنے آغازِ محبت میں انجم سے جو ناکامی ہوئی تھی خدیجہ کی محبت سے اس کی خانہ پُری ہو گئی ہے۔

جاں نثار اختر کے اجداد کی سرزمین تو خیرآباد (ضلع سیتاپور) ہے لیکن اس کی پیدائش ۸ فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار میں ہوئی۔ شروع سے ہی اس کا گھرانا علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی جیسے دانشور جن سے غالب نے اپنے دیوان کو مرتب کرایا تھا اور جنہیں ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے پر کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اور مولانا عبدالحق خیرآبادی جو علم منطق کے عالم تھے اسی گھرانے سے اٹھے تھے۔ خود اختر کے والد مضطر خیرآبادی اردو کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ یوں شاعری اختر کو وراثت میں ملی اور دس گیارہ برس کی عمر میں ہی اس نے تک بندی شروع کر دی۔ پھر گوالیار سے میٹرک کرنے کے بعد جب علی گڈھ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو ادبی ذوق اور اپنی ذہانت کی وجہ سے پہلے سال ہی انٹرمیڈیٹ کالج میگزین کا ایڈیٹر چن لیا گیا۔ علی گڈھ آنے سے پہلے اختر صرف غزلیں کہا کرتا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم اور ماحول نے اس کا رجحان نظم کی طرف موڑا اور ابھی وہ بی۔ اے ہی کا طالب علم تھا کہ اس کی شہرت علی گڈھ سے نکل کر سارے ہندوستان میں پھیلنے لگی۔ اس کی پہلی نظم جس نے اُسے شہرت کی سیڑھیوں پر لا کھڑا کیا "گرلس کالج کی لاری" تھی۔ یہ ایک بیانیہ نظم تھی اور جاں نثار اختر کے کہنے کے مطابق "اِک جوانی کی شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ پھر بھی یہ نظم اپنی غنائیت اور رومانی کیفیت کی وجہ سے پڑھنے والوں میں بہت ہی مقبول ہوئی۔ اس نظم کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں اس نظم کی اشاعت کے کچھ دن بعد علی گڈھ یونیورسٹی کے ممبرس ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ اختر صاحب کو جب اسٹیج پر بلایا گیا تو ہال میں 'گرلس کالج کی لاری' سنانے کی فرمائش گونج اٹھی۔ ہال کی گیلری کیونکہ اسکول اور کالج کی لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس لئے اختر یہ نظم سنانے سے کترا رہا تھا۔ لیکن جب صدر مشاعرہ نے اصرار کیا تو اختر کو مجبوراً وہ نظم سنانی پڑی۔ چار چھ شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ گیلری سے لڑکیوں کی سپروائزر نے صدر کے پاس پرچہ بھیجا کہ اختر یہ نظم نہ پڑھیں تو مناسب ہوگا۔ اختر نے وہ نظم ادھوری چھوڑ دی لیکن ہال میں ایک اودھم مچ گیا۔ ہر کوئی یہ نظم سننا چاہتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشاعرہ ہی بند کرنا پڑا۔ دلچسپی کے لئے ستر اسّی شعروں کی اس نظم کے کچھ شعر یہاں پیش کر رہا ہوں۔

فضاؤں میں ہے صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلس کالج کی لاری
گئی ہے ابھی گونجتی گنگناتی
زمانے کی رفتار کا راگ گاتی
وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی بنتی
اِدھر سے اُدھر سے حسینوں کو چنتی
جھلکتے وہ شیشوں میں شاداب چہرے
وہ کلیاں سی کھلتی ہوئی منہ اندھیرے

وہ ماتھوں پہ ساڑھی کے رنگیں کنارے
سحر سے نکلتی شفق کے اشارے
کسی کی نظر سے عیاں خوش مذاقی
کسی کی نگاہوں میں کچھ نیند باقی
یہ کھڑکی سے رنگین چہرہ ملائے
وہ کھڑکی کا رنگین شیشہ گرائے
یہ کھڑکی سے اِک ہاتھ باہر نکالے
وہ زانو پہ گرتی کتابیں سنبھالے

اختر سعید خاں

جاں نثار اختر کے دو برس بھوپال میں

عام طور پر جب کسی شخصیت کے بارے میں مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں لیکن آج میں جب اختر صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ کیا نہ لکھوں۔ مجھے پچھلے ۲۵ برسوں سے اختر صاحب کی رفاقت کا فخر حاصل ہے۔ میں نے انہیں ہر حال میں دیکھا ہے، طلبا کو پڑھاتے ہوئے، شعر کہتے ہوئے، غمِ عشق اور غمِ روزگار سے گزرتے ہوئے نظامِ کہن سے لڑتے ہوئے، فلمی خداؤں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے، مئے و مینا کی محفلیں آراستہ کرتے ہوئے۔ مستند ادیبوں سے اپنی بات منواتے ہوئے، ناکسوں کی باتوں پر "ہاں بھائی" کہتے ہوئے، بری سے بری شراب کی قدر اور اچھے سے اچھے کھانے کی ناقدری کرتے ہوئے صفیہ آپا کے لئے روتے ہوئے اور خدیجہ کے لئے ہنستے ہوئے۔ ترنم سے تحت اللفظ تک شعر پڑھتے ہوئے، ترکی ٹوپی اور شیروانی سے لمبے بالوں اور بنگالی کرتے تک آتے ہوئے، جوانی سے بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھتے ہوئے۔ غرض زندگی کے ہر موڑ پر میں انھیں دیکھتا چلا آرہا ہوں اس لئے اگر غزل کی اشاراتی زبان میں بھی کچھ کہنا چاہوں تو سفینہ چاہیے۔۔۔

یوں تو اختر صاحب سے ۱۹۴۷ء کے آخر میں میری رسم و راہ بڑھی جب وہ گوالیار سے بھوپال آگئے۔ لیکن ان کی ایک جھلک میں ۱۹۴۳ء میں دلی میں دیکھ چکا تھا۔ یاد ش بخیر قبلہ جوش صاحب دلی آئے ہوئے تھے۔ میرا بھائی اظہر سعید، پھوپی زاد بھائی یوسف علی خاں مرحوم اور میں اُن دنوں دلی میں پڑھتے تھے۔ ہم تینوں بھائی جوش صاحب کے سلام کو گئے۔ وہاں ایک صاحب جوش صاحب کو اپنی نظم سنا رہے تھے ؎

"ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو"

جوش صاحب ہر بند پر داد کہتے جاتے تھے، ہم نے نہ واہ کی نہ آہ، مودّب بیٹھے رہے۔ شام ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ان صاحب نے نظم ختم کی اور بولے ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے جوش صاحب نے ہمارا تعارف کروایا۔ اختر صاحب نے ایک خاص انکساری اور بے تعلقی کے ساتھ آداب عرض ہے کہا اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو جوش صاحب نے ہم لوگوں سے کہا "بھائی اب تم لوگ جاؤ۔ ہم شراب پئیں گے"۔ اس جھلک کا اتنا ہی تاثر ذہن میں رہ گیا کہ جاں نثار اختر سے ہمارا بھی تعارف ہے ۱۹۴۴ء میں ہم دونوں بھائی علی گڑھ چلے گئے۔ رمضان کا مہینہ۔ دن میں ڈائننگ ہال کا کھانا بند، گوالیار کے ایک دوست ملنے آئے۔ میں نے کہا بھائی کچھ کھانے کا بند و بست کرو۔ بولے پریشان کیوں ہوتے ہو؟ میرے ساتھ چلو۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ایک دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ صورت پہچانی ہوئی تھی ۔۔۔ جاں نثار اختر صاحب، وہی انکسار اور کچھ بے تعلقی۔ آداب عرض ساتھی نے کہا، جاں نثار بھئی بھوکا ہوں اور اختر سعید بھی۔ کچھ کھانے کا انتظام کرو۔ معلوم ہوا ہمارے گوالیاری دوست اختر صاحب

حقیقتوں نے شاعر کے دل و دماغ میں جگہ بنالی تو اس کی نظر ایک حقیقت پسند کی طرح زندگی کے ہر پہلو پر پڑنے لگی۔ اور زندگی اور انقلاب کا جذبہ بھی اس کے لئے اُسی طرح محبوب ہو گیا جس طرح انجم کی محبت! اُس وقت کی اختر کی انقلابی شاعری میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے شدید جذبہ بھرا ہوا ہے۔ اُس کی شاعری نے ہر قدم اور ہر موڑ پر تحریک آزادی کا ساتھ دیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندوستانی رہنماؤں کے آپسی جھگڑے، عام جنتا کے دکھ درد، اقتصادی بدحالی، بنگال کا کال اور دوست ممالک کی جیت، سیاسی غلامی، ملک کی تقسیم، امریکی اور انگریزی حکومتوں کے جھنڈے تلے تیسری جنگ عظیم کی تیاری، روس کے جھنڈے تلے امن و شانتی کے لئے عملی تحریک، چین کا انقلاب، سارے ملک اور بین الاقوامی مسائل کا عکس اس کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ کبھی فردا سے مایوس نہیں ہوا۔ اس کی شاعری اسی جذبے سے نمودار ہوتی ہے کہ آج کل کی زندگی کی جدوجہد آنے والے کل کی بنیاد ہے۔ اس لئے زندگی کی جدوجہد سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ آج اس کی شاعری میں سماجی حقیقتوں کا گہرا عکس ملتا ہے۔ اور اب اس کا موضوعِ سخن وہ آدمی ہے جو سماج اور فطرت پر فتح پاکر خوب صورت، سادہ، اور متوازن زندگی کے لئے لڑ رہا ہے۔"

سیاست کی طرح جاں نثار اختر کی تخلیقی قوت کا کنویس بھی بہت وسیع ہے۔ اس سلسلے میں اس سے بہت کم چوکیں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو شاعری اسے ورثے میں ملی دوسرے اس نے اساتذہ کے کلاسیکل ادب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اختر اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر فن کی عظمت کا خیال رکھتے ہوئے، موضوع کی شدت کو کم نہیں ہونے دیتا۔

اپنے بیشتر ہم عصر شاعروں کی طرح اختر کی ابتدائی شاعری پر بھی جوش ملیح آبادی کی شاعری کا کافی اثر تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس نے خود کو اُس سے چھڑا لیا اور رنگ، رس کی خوبصورت آمیزش سے نئے نئے خاکے بنائے۔ جوش کے بعد کے شاعروں کی پیڑھی میں اس کا نام مجاز، فیض، جذبی، مخدوم، سردار جعفری وغیرہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی تخلیقات کا بھنڈار اپنے ان ہم عصر شاعروں سے سب سے زیادہ ہے ★

"کبھی ایسا موقع میسر نہ ہوا کہ جاں نثار اختر سے شرف ملاقات نصیب ہوتا۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں بلکہ قطعی ضروری نہیں کہ کسی شاعر یا ادیب سے ذاتی تعلقات ہی ہوں تو اُس کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ اُن کے شعروں سے میری گہری جان پہچان ہے۔ اور میں اسے کافی سمجھتا ہوں۔"

وائی۔ اے۔ عرفانی

مجبوریاں اور ایک نئی تحریک کے ساتھ نئے آنے والوں کا فطری پس و پیش! اس بات کا متقاضی ہے کہ انجمن کا دستور لچکدار ہو اور ایسے لوگوں کے لئے گنجائش ہو جو سوچتے تو ہماری طرح ہیں لیکن ہماری طرح کھل کر بول نہیں سکتے!

انجمن کے ہفتہ وار جلسوں میں تخلیقات پر جو مباحثہ ہوتا اُس میں آختر صاحب کی باتوں کو غور سے سنا جاتا تھا ایک تو اس لئے کہ وہ ایک پختہ ذہن کی باتیں ہوتی تھیں۔ دوسرے ان کی گفتگو میں معاندانہ پہلو نہیں ہوتا تھا۔ ان کی تنقید ہمدردانہ ہوتی تھی اور ان کا لب ولہجہ نرم اور دلپذیر۔ عام طور پر اختر صاحب کی رائے سند کا کام دیتی تھی۔ انجمن میں کی جانے والی بحثیں کبھی کبھی دل آزار بھی ہوتی تھیں کچھ لوگ دیدہ دانستہ بعض لکھنے والوں کو اپنا ہدف بناتے تھے۔ بعض محض قابلیت کے اظہار کے لئے لمبی لمبی تقریریں کرتے تھے۔ اور انجمن میں کشیدگی کی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ انجمن کے ایک جلسے میں اتفاق سے جگر صاحب بھی شریک تھے اور جذبی صاحب بھی مہمان تھے۔ بعض اراکین نے اس شام (شاید جگر صاحب کو مرعوب کرنے کے لئے) بڑی عالمانہ بحثیں کیں۔ تخلیقات کے پُرزے اڑا دئے۔ خود میں نے اختر صاحب کی نئی نظم پر الزام عائد کیا اور نظم کو ترقی پسند ادب کے باہر کی چیز قرار دیا۔ جذبی صاحب نے میری تردید کی اور نظم کو سراہا۔ جب ہم لوگ ایک دوسرے پر نشتر زنی کر چکے تو جگر صاحب سے درخواست کی کہ وہ کچھ سنائیں۔ جگر صاحب نے کچھ پریشان سے انداز میں فرمایا۔ "مگر صاحب میں اس آپریشن کی تاب نہ لا سکوں گا"!

انجمن میں پڑھی جانے والی تخلیقات پر تنقید کا رویہ دلآزار رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہی مباحث کی بدولت فکر و نظر کے وہ مراحل طے ہو جاتے تھے جو عام طور پر تنقیدی کتب کے ذریعے نہیں ہوتے تھے۔ انہی مباحث نے نوجوان ذہنوں کو جلا بخشی اور انھوں نے یہ جانا کہ وہ کیوں لکھتے ہیں، کس کے لئے لکھتے ہیں اور انہیں کیا لکھنا چاہیئے!؟

ہم نے اپنی سرگرمیاں انجمن تک محدود نہیں رکھیں اور آختر صاحب کی سرکردگی میں ایک دوسرا محاذ کھول لیا۔ شہر میں آئے دن مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ہم نے پابندی سے ان میں شرکت کرنا شروع کر دیا۔ خالص غزل کے ماحول میں نظمیں پڑھتے یا نظم نما غزلیں۔ اور بزرگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے۔ لیکن جب وہ دیکھتے کہ ہمارے ساتھ ایک ہندوستان گیر شہرت کا شاعر بھی ہے جو اپنے مخصوص اسلوب میں ان ہی خیالات، و جذبات کا ترجمان ہے تو ان کا رویہ بدل جاتا! اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ بزرگ شعرا ہم سے مانوس ہو گئے اور ہمارے اندازِ فکر کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ہم شاعروں سے زیادہ سامعین کے لئے فکر مند رہتے تھے۔ سب پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔ پھر وہ دن بھی جلد آگیا جب سامعین ہمارے شاعری میں کچھ زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ یہ لوگ جب کسی مشاعرے کا اہتمام کرتے تو مشاعرے کی صدارت کبھی اختر صاحب اور کبھی میرے سپرد کر دیتے۔ ہم لوگ اس موقعے سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ وہ اس طرح کہ مشاعروں میں صدارتی خطبات پڑھتے، خطبے کیا ہوتے ترقی پسند ادب کا مینی فیسٹو ہوا کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رجعت پسند اور ترقی پسند ادب کا فرق کھل کر سامنے آگیا۔ جو لوگ جنس زدہ ادب کو ترقی پسند ادب سمجھتے تھے ان کی غلط فہمیاں بھی دور ہوئیں۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر اس میں وہ سلیقہ اور حسن تو نہیں ہے جو ہمارے بزرگوں کا حصہ ہے لیکن جو کچھ ہے وہ وقت کی آواز ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہماری باتوں میں زخموں کی پردہ پوشی نہیں ہے، زخموں کی نمائش کے ساتھ مرہم کی جستجو بھی ہے۔ سماج کے تاریک گوشوں تک اُجالے کی کرن پہونچانے کی کوشش یقیناً ہمارے بزرگوں کا کارنامہ تھا۔ لیکن پورے نظام کو بدل دینے کی بات لوگوں کو زیادہ جرأت مندانہ اور حوصلہ کن نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری صفوں میں بہت سے نئے ناموں کا اضافہ ہو گیا۔ شاعری کی حد تک یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر ترقی پسند نظریات شعراء کا موضوع سخن بن گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں اکثر شعراء محض تقلیدی انداز سے ترقی پسند رجحانات کو اپنائے ہوئے تھے۔ وہ شعوری طور پر تحریک سے وابستہ تھے۔ کسی رجحان کی تقلید فنکار کی نہیں، لیکن رجحان کی کامیابی کا کھلا ثبوت ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا مشن کامیاب تھا۔ اور اس کا سہرا اختر صاحب کے سر تھا۔

اختر صاحب کی بھوپال میں انجمن کے جلسے اور شعر و ادب کی محفلیں تو ہماری آماجگاہ تھیں ہی، خود اُن کا گھر ترقی پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جہاں ہمہ وقت ہنگامہ رہتا۔ گھر پہ اختر صاحب کا انداز دوستانہ بھی ہوتا اور استادانہ بھی۔ شعر سنتے وقت (عام طور پر گھر پہ

سے خاصے بے تکلف ہیں۔ یہ وہ دن تھے جب صفیہ آپا سے اختر کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اُن سے ملنے علی گڑھ آئی ہوئی تھیں۔ بڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، شعر انھوں نے سنائے نہ میں نے۔ دوسرے دن احسان رشید (رشید احمد صاحب صدیقی کے صاحب زادے) کے گھر جب ہم لوگ یعنی ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور کچھ دوسرے احباب جمع ہوئے تو میں نے جاں نثار صاحب کی موجودگی کا ذکر کیا۔ طے ہوا کہ ان کے گھر چلا جائے اور کچھ شعر و شاعری ہو۔ اس روز اختر صاحب نے بڑے خوب صورت رومانی قطعات سنائے واپسی پر احسان نے پوچھا "کیا خیال ہے؟" میں نے کہا، "جوش اسکول کے نمائندہ شاعر ہیں۔" دوسرے دن میں نے اختر صاحب کو اپنے ہاسٹل میں شام کو مدعو کیا۔ حسب وعدہ جذبی صاحب کے ساتھ آئے لیکن تھوڑی ہی دیر میں معذرت کر کے چلے گئے۔ مجھے کچھ اُن کا اس طرح چلا جانا اچھا نہیں لگا۔ مگر جوش صاحب کا فقرہ یاد آگیا۔ "بھائی اب تم لوگ جاؤ....."

اِس کے بعد اختر صاحب سے بھوپال میں ملاقات ہوئی جب وہ فسادات سے تنگ آکر گوالیار کو خیر باد کہہ کر بھوپال آگئے۔ اختر صاحب کے بھوپال آتے ہی جن لوگوں کو ان کے قریب آنے کا موقع ملا۔ اُن میں میرا نام بھی تھا۔ ریاست بھوپال ابھی انڈین یونین میں ضم ہوئی تھی۔ اختر صاحب ملازمت کے لئے کوشاں تھے۔ حمیدیہ کالج میں اردو لکچرر کی جگہ خالی ہوئی اور اس کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی۔ لیکن اختر صاحب کی راہ میں کچھ رکاوٹیں تھیں۔ وہ غیر بھوپالی تھے اور انقلابی خیالات کے آدمی۔ اُن دنوں کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بھوپال کے ایک سرکاری افسر جو علی گڑھ میں پڑھ چکے تھے اور جنھیں اختر صاحب کی "گرلز کالج کی لاری" اس وقت تک یاد تھی بھوپال سے دور کسی میلے کے سلسلے میں مشاعرہ کرانا چاہتے تھے۔ ہم لوگوں کے پاس آئے، بڑی منت سماجت سے مشاعرے کے لئے مدعو کیا اور اختر صاحب کو راضی کیا۔ تاریخ مقررہ پر ہم چار چھ شاعر سرِ شام پہنچ گئے اور ایک عزیز کے گھر قیام کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سرکاری افسر گھبرائے ہوئے آئے اور دست بستہ عرض پرداز ہوئے کہ "خدارا آپ لوگ مشاعرے میں نہ جائیے گا ورنہ میری نوکری پر بن جائے گی۔ کلکٹر صاحب کو معلوم ہوگیا ہے کہ آپ صاحبان شاعرے کے پردے میں لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتے ہیں" ہم لوگ اُن صاحب کی خاطر مشاعرے میں تو نہیں گئے۔ قصبے کے لوگوں کو جب اختر صاحب کی موجودگی کا علم ہوا تو انھوں نے ہماری قیام گاہ پر ہی مشاعرہ کر ڈالا اور ہم بقول شخصے لوگوں کو بھڑکا کر چلے آئے۔

آخر کار اختر صاحب کو نوکری مل گئی۔ انہیں حمیدیہ کالج میں شعبۂ اردو کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ ہم لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اختر صاحب یہیں رہیں گے۔ اور اب ہمارے درمیان ایسا شخص آگیا ہے جو اردو شاعری میں اہم مقام حاصل کر چکا ہے اور ترقی پسند ادب کا رکن ہے۔ ہر چند کہ اختر صاحب صرف ۲ سال اور چند ماہ بھوپال میں رہے لیکن اُن کا رشتہ بھوپال اور اہلِ بھوپال سے کچھ ایسا مستحکم ہوگیا جیسا اختر صاحب کا وطن یہی ہو۔ اختر صاحب سے حمیدیہ کالج کے طلبہ نے تو جو سیکھا سو سیکھا، بھوپال کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں نے بہت کچھ پایا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اُس زمانے کے نوجوان شاعروں کی ذہنی تربیت میں اختر صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہ اپنے ساتھ ترقی پسند ادب کا رچا ہوا شعور لے کر آئے تھے اور ہمیں ایسے ہی صاحبِ نظر کی ضرورت تھی جو راہوں کے پیچ و خم سے پوری طرح واقف ہو۔ انجمن ترقی پسند پہلے سے بھوپال میں سرگرم عمل تھی۔ قدوس صہبائی، صہبا لکھنوی، وحیدی الحسینی، کیف بھوپالی، عنبر چغتائی، اشتیاق عارف، رشدی، مقصود عمرانی، احسن علی خاں، محمد علی تاج، حبیب فخری، ابراہیم یوسف، انجم سلمانی، قمر جمالی، عرشی بھوپالی، سندر لال انجمن کے پرجوش اراکین تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں جب اظہر اور میں علی گڑھ سے آگئے تو ہم دونوں بھی انجمن سے وابستہ ہوگئے۔ اختر صاحب کے آنے سے انجمن میں نئی جان پڑ گئی۔ جیسے ہی انجمن کا اگلا انتخاب ہوا اختر صاحب اس کے صدر منتخب کر لئے گئے۔ اختر صاحب نے آتے ہی انجمن کے اغراض و مقاصد کو از سرِ نو ترتیب دیا اور دستور کو پھر سے مرتب کیا۔ وہ فطرتاً اعتدال پسند ہیں اس لئے ہماری انجمن میں جو انتہا پسند اراکین تھے اُن سے اختر صاحب سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ تاہم بیشتر ممبران اختر صاحب کی رائے کو انجمن کے مقاصد کی ترجمانی سمجھتے تھے۔ اختر صاحب اس کے قائل تھے کہ اگر کوئی ادیب ترقی پسند ادب کا اس حد تک ساتھ نہیں دے سکتا جہاں مارکسزم کے ڈانڈے ملتے ہیں لیکن وہ ہمارے نظریات کا مخالف نہیں ہے تو اسے انجمن کا ممبر بنایا جا سکتا ہے۔ ان کی نظر میں حکومتِ وقت کی گرفت، ادیبوں، شاعروں کی نجی

اب تو جینے کی تمنا ہی نہیں مرنا ہے
در بدر لاشۂ بے گور و کفن سے پوچھو

اور یہ سوالات اسی آرزو مندی پر ختم ہو جاتے ہیں جن سے اختر صاحب کی شاعری عبارت ہے۔

اس زمیں پر بھی کسی روز شفق پھولے گی
دوستو! خاکِ شہیدانِ وطن سے پوچھو

ان سوالات کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جواب کی حسرت لئے بہت سے سوالی چپ ہو گئے ہیں۔ اختر صاحب نے جو چند نظمیں اور غزلیں بھوپال کے قیام کے دوران کہیں ان میں عصری تقاضوں کی گونج اور ایک پُر امید مستقبل کی بشارت سنائی دیتی ہے۔ خوش آئند مستقبل کے خواب جب بھی ٹوٹتے نظر آتے ہیں، اختر صاحب کے یہ شعر تسلی دینے آجاتے ہیں۔

کل یہی خواب حقیقت میں بدل جائیں گے
آج جو خواب فقط خواب نظر آتے ہیں
اور دو چار مراحل سے گزرنا ہے تو کیا
اپنی منزل کی طرف ہم کو بڑے دیر ہوئی
مرحبا انقلاب آ پہونچا
وہ جواں سال عہدِ نو کا رسول

قیامِ بھوپال کی آخری نظم "شکستِ افسوں" میں اختر صاحب نے ذہنِ انسانی پر چھائے ہوئے توہمات کے پردوں کو اٹھایا ہے اور شعور کی بیداری کا ترانہ چھیڑا ہے۔

موج در موج رہی کاہکشاں کی تنویر
خواب آلود شعاعوں میں رہا ذہن اسیر
جھلملاتے رہے نظروں میں طلسمی انوار
فکر و احساس پہ چھاتا رہا زرین غبار
آج ظلمت کا وہ شب تاب فسوں ٹوٹ گیا
اب نہیں حسنِ گماں تابِ یقیں سے بہتر
سطحِ افلاک نہیں روئے زمیں سے بہتر

آج ظلمت کا وہ شب تاب فسوں ٹوٹ گیا

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ موضوعات بھوپال کے ترقی پسند شاعروں کے لئے نئے تھے، ہم سب انہی موضوعات پر لکھ رہے تھے لیکن یہ سچ ہے کہ ہم میں کوئی جاں نثار اختر جیسا نہ تھا۔

وہ دن جب بھی یاد آتے ہیں تو اب بھی سینے میں بجلیاں چمک اٹھتی ہیں۔ ہم سب اس مجاہدانہ شان سے تحریک کے ساتھ تھے جیسے واقعی انقلاب آ پہونچا اور اگر ابھی نہیں آیا تو ہم اپنے نغموں سے برپا کر کے رہیں گے۔ چند افراد پر مشتمل شاعروں اور ادیبوں کی یہ چھوٹی سی انجمن اپنی دانست میں نظامِ حکومت بدلنے کی ذمہ داری لئے ہوئے تھی۔ تلنگانہ کمیونسٹ تحریک رگوں میں خون دوڑا رہی تھی۔ مہاجنی نظام اور استحصالی طاقتوں سے

شاعری ہی ہوتی تھی) وہ نظریہ یا فن کی غلطی پر صرف ٹوکتے ہی نہیں تھے مشورہ بھی دیتے جاتے تھے۔ اصلاح اس لئے نہیں کہتا کہ خود اختر صاحب نے اسے اصلاح کا نام نہیں دیا۔ ان کے مشوروں سے اکثر نوجوان شعراء نے فائدہ اٹھایا اور آگے چل کر اُن کے فکر و ذہن میں ایسی جلا پیدا ہوئی کہ جس نے اہل نظر کو ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔

اختر صاحب بھوپال میں قدیم اور جدید دونوں مکاتیب میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے صرف اس لئے نہیں کہ وہ ایک مشہور شاعر تھے بلکہ اس لئے کہ اُن کی شاعری میں کلاسیکی روایات کی پاسداری بھی تھی اور نئے ذہن کی فکر بھی۔ اختر صاحب کی شاعری کی فضا کسی دور میں اجنبی نہیں رہی۔ ان کی شاعری تاریخ کا تسلسل ہے وہ ماضی کے نہ ہوتے ہوئے بھی ماضی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے شعر ہر حلقہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یوں تو اختر صاحب کے آنے سے پہلے ان کی شاعری بھوپال آچکی تھی لیکن اس کا دائرہ ایک خاص گروہ تک محدود تھا۔ وہ جب بھوپال آئے اور عوام و خواص ان کی شاعری سے متعارف ہوئے تو وہ بوڑھوں اور جوانوں میں یکساں مقبول ہو گئے۔

اختر صاحب جب بھوپال آئے تھے اس وقت ہمارا ملک ایک طرف آزادی کے جذبہ سے سرشار تھا اور دوسری طرف وحشت اور بربریت کے دور سے گزر رہا تھا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ انسان تقسیم ہو رہے تھے۔ آگ اور خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ اختر صاحب نے انہی حالات میں اپنا گھر اور نوکری چھوڑی تھی۔ ملک کے دوسرے حصے میں جب انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ بھوپال امن و امان کا گہوارہ تھا۔ اختر صاحب نے پرسکون زندگی گزارنے کے لئے بھوپال کا انتخاب کیا۔ وہ جب آئے تو ان کے ساتھ ان کی تازہ نظم "فریبِ بہار" تھی۔ ۲۸ سال گزر چکے لیکن اس نظم کا تاثر میں آج تک فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ ان دنوں کوئی مشاعرہ اور کوئی ادبی نشست ایسی نہیں ہوئی تھی جس میں اختر صاحب سے اس نظم کی فرمائش نہ کی جاتی ہو۔ جب تک وہ یہ نظم پڑھتے رہتے، سننے والوں کی آنکھیں پُرنم رہتیں اور رندھے ہوئے گلوں سے داد کی صدائیں بلند ہوتیں۔ اس نظم میں کلاسیکی آہنگ، سوگوار فضا، جذبات کا ٹھہراؤ اور شاعر کی بصیرت کا ایسا حسین امتزاج ہے جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کئے بنا نہیں رہتا۔ اختر صاحب نے جب یہ نظم کہی تھی وہ خود جلتے ہوئے گھروں کے دھوئیں اور دہلیز پر بہتے ہوئے خون سے گزر رہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو جذبات کی رو میں کہیں سے کہیں بھٹک جاتا۔ لیکن یہ ان کی صاحب نظری تھی کہ personal involvement کے باوجود نہ خود یاسیت کے شکار ہوئے نہ اپنے پڑھنے والوں کو شکار ہونے دیا۔ جس شخص کی نگاہ میں منزل کی روشنی ہو وہ راہوں کی ظلمت سے نہیں گھبراتا۔ اختر صاحب نے خون سے لتھڑے ہوئے آزادی کے اس تحفہ کو یہ کہہ کر قبول کر لیا۔

"اِک ذرا صبر کہ گل رنگ گھٹا چھائے گی
اس گلستاں میں بہارِ ابدی آئے گی"

ہو سکتا ہے کہ آج کے تنقیدی نظریات کے مطابق اختر صاحب کی اس نظم کے افق پر جو خط انہیں نظر آتا ہے انہیں کھوکھلی رجائیت کا نام دیا جائے، لیکن کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ وہی گل رنگ گھٹا جس کے اختر صاحب نقیب ہیں آج ہمارے ملک کا مستقبل بنی ہوئی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس نظم کی عام مقبولیت نے اختر صاحب کو بھوپال کے ادبی حلقوں میں صدر نشین بنا دیا۔

آزادی کے بعد ذہنوں میں جو بے شمار سوالات ابھرے ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اس آزادی نے ہمیں کیا دیا۔ بھوپال آکر اختر صاحب نے جو پہلی نظم کہی اس میں اسی سوال کو دہرایا گیا تھا۔ میری مراد ان کی نظم "تابِ سخن" سے ہے جس میں ہماری ادھوری آزادی پر بڑے فنکارانہ انداز سے تنقید کی گئی ہے۔

اب تو پیاسا سرِ ساحل نہیں مرتا کوئی
گنگ دلب آبِ چمن سے پوچھو
اب تو محفل میں نہیں حکم زباں بندی کا
رنگِ خاموشیِ اربابِ وطن سے پوچھو

کانفرنس کے متعلق سرکاری فائلوں میں کیا رپورٹیں درج ہوئیں اس کا تو پتہ نہیں لیکن جون ۱۹۴۹ء میں ریاست بھوپال کے انڈین یونین میں ضم ہوتے ہی انجمن کے ممبران کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ جون یا جولائی ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی میں ترقی پسندوں کی آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس وقت بھوپال کی انجمن کے صدر احسن علی خاں تھے اور میں جنرل سکریٹری۔ ہم لوگ ایک بڑا وفد لے کر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اختر صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ بھیمڑی کانفرنس میں سارے فیصلے دوٹوک ہوئے۔ ہم نے اصلاح پسند ادیبوں کو بھی اپنی صفوں سے باہر قرار دیدیا۔ اور سینوں میں انقلاب کی دھمک لئے بھوپال آ گئے۔

بھوپال میں چیف کمشنری راج نے پہلا حملہ ترقی پسند مصنفین پر کیا۔ میرے گھر کی تلاشی لی گئی اور احسن علی خاں نظر بند کر دیئے گئے اور اب ہم سب اپنی باری کے منتظر تھے۔ تاج اس سے پہلے ہی فلموں میں گانے لکھنے بمبئی جا چکے تھے۔ اختر صاحب نے گرفتار ہونے سے پہلے بھوپال چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور آخر دسمبر ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں بمبئی چلے گئے۔ ۳ مارچ ۱۹۵۰ء کی رات بیشتر ممبران کے گھر چھاپے مارے گئے میں اور قمر جلالی بچ نکلے۔ چھپتے چھپاتے بمبئی جا پہنچے۔ کیف، مقصود عمرانی، عرشی وغیرہ پکڑے گئے اور انہیں جیل پہنچا دیا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کر دی گئی اور ہماری تنظیم درہم برہم ہو گئی۔

بمبئی میں اختر صاحب کچھ دن شاہد لطیف مرحوم کے ساتھ رہے۔ پھر خلیل صاحب کے کمرے میں اُٹھ آئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے بھی رین بسیرا مل گیا تھا۔ اور ایک بار پھر مجھے اختر صاحب کی رفاقت حاصل ہو گئی۔ بمبئی میں اختر صاحب کی سرگرمیاں، ان کی شاعری کا ارتقائی دور اور ان کی خوش و ناخوش زندگی، صفیہ آپا کی بیماری اور دائمی مفارقت ایک جداگانہ داستان ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن بھوپال سے اختر صاحب کے تعلق کا ورق ادھورا رہ جائے گا اگر یہ معلوم نہ ہو کہ صفیہ آپا کی موت کے بعد اختر صاحب کی نئی زندگی پھر بھوپال سے ہی شروع ہوتی ہے۔ خدیجہ نے، جو بھوپال کے ایک مہذب اور علمی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں، ۱۹۵۶ء میں اختر صاحب کی شریک حیات بن کر ان کی اجڑی ہوئی زندگی کو پھر سے لبا دیا۔ اور بھوپال سے ان کا رشتہ جو بظاہر ٹوٹ گیا تھا پھر سے استوار کر دیا۔

اختر صاحب سال میں دو ایک بار بھوپال آتے ہیں۔ ادبی بزمیں جگائی جاتی ہیں۔ صراحیٔ مئے ناب، اور سفینۂ غزل کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ خالی از خلل، رفیق شعر و شراب کے نشہ سے سرشار رات گئے گھروں کو لوٹتے ہیں (یا میں پہنچا آتا ہوں) اور اگلے دن پھر سر شام آ جاتے ہیں۔ جب تک وہ بھوپال میں رہتے ہیں زندگی بھرپور نظر آتی ہے جیسے ہم ابھی عمر کی اسی منزل میں ہیں جب پہلے پہل اختر صاحب سے بچھڑے تھے۔ جیسے دلوں پر انجانی مسرت کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ جیسے یہ لمحہ امر ہے۔ جیسے اختر صاحب امر ہیں۔ جیسے ہم سب جاودانی ہیں —! ★

ٹکرانے کا حوصلہ، محنت کشوں کے راج کا خواب، سماج واد کے قیام کا عزم، ہم نے اپنے قلم سے جانے کیا کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں اور پھر ہماری صفوں میں ایک ایسی شخصیت کا اضافہ ہو گیا جو ہمارے حوصلوں کا نہیں خود اختر صاحب کے عزائم کا نگہبان تھا۔

اختر صاحب کی شریکِ حیات صفیہ آپا حمیدیہ کالج میں لکچرر ہو کر آ گئیں۔ صفیہ آپا ایک بیدار ذہن، پاکیزہ ادبی ذوق اور نکھری ہوئی تہذیب اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ انھوں نے آتے ہی کالج کے طلبا کے ادبی ذوق اور تہذیبی سرگرمیوں کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی۔ انھیں زندگی اور ادب کا رشتہ سمجھایا، ان میں ایک نئی امنگ اور نئی لگن پیدا کی۔ کالج کی ادبی محفلوں کو سنوارا، ترقی پسند ادب کی راہ پر چلنا سکھایا۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین میں جگہ پانے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ تیار کر لیا۔ وہ زمانہ حمیدیہ کالج کا زریں دور تھا۔ اختر صاحب شعبۂ اردو کے صدر، صفیہ آپا اردو لکچرر، شہاب اشرف جیسے خوش مذاق لکچرر، کالج کیا تھا تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ صفیہ آپا واقعی آپا تھیں۔ آپا کے لفظ میں جو تقدس اور عظمت ہے وہ اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ شروع میں وہ انجمن کے کاموں میں شریک نہیں ہوئیں۔ لیکن ہم نے جب اختر صاحب کی رہنمائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس بھوپال میں منعقد کرنے کی ٹھانی تو وہ ہر کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگیں۔

۱۹۴۹ء کے اوائل میں کانفرنس کی تاریخ مقرر ہوئی۔ ہندوستان کے بیشتر ترقی پسند مصنفین کو مدعو کیا گیا۔ اختر صاحب کے تعلقات کام آئے اور بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے شرکت منظور کر لی۔ کانفرنس کے لئے سرمائے کی فراہمی خاصہ اہم مسئلہ تھا۔ اختر صاحب چندہ جمع کرنے کے لئے کتنے غیر موزوں ہیں یہ اس وقت تجربہ ہوا جب وہ اور میں فقیروں کا بھیس بنائے بغیر اہل کرم کا تماشہ دیکھنے نکلے تھے۔ اختر صاحب کے چندہ مانگتے نہ بنتا اور شعر سنانے کی فرمائش ٹالی نہ جاتی۔ نتیجہ میں بہت سا وقت ضائع ہوتا۔ ان دنوں بھوپال ریاست میں چند عوامی نمائندوں پر مشتمل وزارت بن گئی تھی ہم نے انھیں تاکا۔ اور اچھا خاصا چندہ وصول کیا۔ کچھ خاص و عام نے مدد کی۔ اور کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ والد مرحوم حامد سعید خاں صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب کئے گئے۔

علامہ سلیمان ندوی مرحوم نے جو اس زمانے میں قاضی ریاست تھے کانفرنس کے افتتاح کا وعدہ فرمایا۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے مشاعرے کی صدارت قبول فرمائی۔ کرشن چندر افتتاحی اجلاس کے صدر مقرر کئے گئے۔ پنڈت سندر لال لسانی مسائل کی نشست کے صدر بنے۔ عصمت آپا، شاہد لطیف، مجروح سلطانپوری، مہندر ناتھ، غلام ربانی تاباں، عادل رشید، ادھو کمار وغیرہ کانفرنس کی جان تھے۔ حمیدیہ کالج کے عظیم الشان ہال میں (جو اب مدھیہ پردیش اسمبلی ہال ہے) بڑی دھوم دھام سے کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ یہ کانفرنس بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی تھی۔ ایک طرف سید سلیمان جیسے عالم دین، مورخ و مفکر اسلام، دوسری طرف قبلۂ رندانِ جہاں شاعرِ انقلاب جوشِ ملیح آبادی بزرگوں میں پنڈت سندر لال اور حامد سعید خاں تو جوانوں میں کرشن، مجروح، تاباں، مہندر ناتھ وغیرہ۔ اس کے باوجود کانفرنس کسی افتاد کا شکار نہیں ہوئی۔ اور ہر اعتبار سے کامیاب رہی۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ کانفرنس کی کامیابی میں اختر صاحب کی انتھک کوششوں اور ہمارے بزرگوں کے ہمدردانہ رویہ کو بڑا دخل تھا۔ حالانکہ ہم لوگوں کی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بھوپال ریاست کے پرائم منسٹر نے شرکت کے بعد جب کانفرنس کو خطاب کرنے کی خواہش کی تو ہم نے انہیں موقع نہیں دیا۔ کانفرنس میں جو خطبات پڑھے گئے، جو تجاویز پاس ہوئیں اور جو تقاریر ہوئیں اُن سے مقامی اعتبار سے ترقی پسند ادب کو بہت بڑھاوا ملا۔ بھوپال میں کل ہند مشاعرے ضرور ہوتے آئے تھے جن میں ہندوستان کے سبھی بڑے شعراء شریک ہوا کرتے تھے لیکن اس سے پہلے کل ہند پیمانے پر کوئی کانفرنس شاعروں اور ادیبوں کی نہیں ہوئی تھی۔ بھوپال میں اس کانفرنس نے پہلی بار مصنفین کو ان کے مسائل اور فرائض کی طرف متوجہ کیا۔ اور لوگوں نے محسوس کیا کہ شاعر اور ادیب بھی اجتماعی طور پر اس درد کا مداوا رکھتے ہیں جس سے عالم انسانیت نڈھال ہے۔

اس کانفرنس سے بھوپال کے عام لکھنے پڑھنے والوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور حق یہ ہے کہ اس تموج آفرینی میں سب سے زیادہ حصہ اختر صاحب کا رہا جو بظاہر اپنی ذات سے ایک ایسا شانت ساگر نظر آتے ہیں جس میں موج و تلاطم کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

میں ہمیشہ کہا کرتی تھی صفیہ آپا کی شخصیت میں مجھے ماں، بہن، دوست تینوں کی محبت کا امتزاج ملتا ہے۔ کالج کے کاموں میں مجھے ساتھ رکھتیں۔ میرا ساتھ دیتیں، بزمِ ادب کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرتیں۔ کہانیاں لکھنی شروع کیں تو بے حد سراہا، ہمت بڑھائی۔ آپا کی ممتا کا یہ عالم کہ سردی میں اپنا کوٹ اتار کر میرے کاندھوں پر ڈال دیتیں۔ امتحان کی تیاری کے لئے مجھے اپنے پاس بلالیتیں۔ ایک دن میں چلی گئی تو اس قدر اہتمام کیا میری پڑھائی کے لئے — جاوید، اویس بلا کے شریر اور active بچے۔ آپا دروازے بند کر دیتیں مگر چپکے سے کسی نہ کسی طرح آجاتے۔ اپنی بنائی ہوئی پینٹنگز کا مقابلہ، ہر چیز میں مقابلہ دونوں میں ہوتا کس کی اچھی ہے؟ — دونوں اچھی ہیں! — زیادہ اچھی کون سی؟

جاوید نے ایک آدمی کی تصویر بنائی جس کے سر پہ بہت سے سورج تھے۔ جب میں اس کی وضاحت میں ناکام رہی تو انکشاف کیا کہ یہ کارل مارکس ہے اور یہ سورج انقلاب اس کے دماغ میں سے رفتہ رفتہ نکل کر دنیا میں پھیل گیا۔ جس طرح سورج — کہیں دونوں پولس اور انقلابی بن کر کھیلتے۔ کہیں بم بنانے کی ترکیبیں جاوید مجھے سکھاتے جن کے ذریعے وہ انقلاب لانے والے تھے — وہ انقلاب جس کی خاطر "ابی" بمبئی میں تھے۔ اور ان کا معصوم بچپن کھلونوں سے بے نیاز اسی انقلاب کے کھیل کھیلا کرتا تھا۔ مجھے ذہین بچے بے حد پیارے لگتے ہیں۔ ان دونوں سے مجھے بے حد پیار تھا۔ پوری دلچسپی سے ان میں گھل مل جاتی تھی۔ — جاوید نے انقلاب کے بعد ایک شہر کا نقشہ بنایا تھا جس کے چاروں طرف اسکول تھے۔ شہر پناہ کی طرح، تاکہ ہر بچہ گھر سے نکلے اور آسانی سے اسکول پہنچ جائے۔

ذہین خاندان کے دو ذہین بچے اپنی پر حوصلہ ماں کی توانا شخصیت سے چمٹے ہنس کھیل کر دن گزار رہے تھے اور یہ وہم بھی کسی کو نہ تھا کہ جسم کس بری طرح توانائی کو ایندھن فراہم کر رہا ہے۔ آپا کی غیرت، خودداری اور حوصلے کے عقب میں کمزور جسم کسی کو دکھائی نہ دیا۔ پردہ اٹھا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میری مجھ میں اس دن آیا تھا جب کہ آپا فرشی نشست پہ بیٹھیں، مجھے پاس بٹھائیں، میرا سہارا لے کر کھڑی ہوتیں۔ اُس وقت وہ کس قدر ٹوٹی ہوئی تھیں — آپا سے منتیں کیں کالج نہ آئیں، علاج کروائیں۔ کالج میں ان کی کمی بری طرح محسوس ہوتی تھی۔ ان کی ذمہ داریاں گرلز سیکشن کے لئے پرنسپل صاحب نے میرے سپرد کر دی تھیں۔ میں انھیں یقین دلاتی رہتی کہ وہ کسی طرح کی فکر نہ کریں، بے حد آرام سے رہیں — آپا کی چھٹی بڑھتی گئی — پھر وہ لکھنؤ چلی گئیں — میں وہاں ان کو برابر خط لکھتی رہتی۔ اُن کے دو خط آئے۔

"تم جیسی لڑکیوں کی موجودگی سے مجھے کالج میں بھی کس قدر اطمینان رہتا ہے اس کا اندازہ تمھیں نہ ہوگا۔

ڈاکٹر جین کو میں نے خط لکھا تھا ان کا نہایت خشک تفصیلات سے لبریز خط آیا ہے۔ گریڈ، تقرر، حکومت کی پالیسی اور تیدہ کالج کا لیکچر۔ یہ ہو سکتا ہے اس کا عنوان۔"

جاوید اور اویس بیچارے عجیب اکھڑی سی زندگی گزار رہے ہیں ویسے ہنگامہ خیزیوں میں کوئی فرق نہیں ہے"

کافی طویل خط تھا۔ دوسرا خط کسی اور سے لکھوایا تھا۔

"مجبوراً لکھوانے پر اکتفا کر رہی ہوں۔ مستقل بیکاری اور بے چارگی کا عالم طاری ہے۔ گو کہ اس کے خلاف جد وجہد جاری ہے دیکھو انجام کیا ہوتا ہے۔ تم کالج میں ایک شاداب زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتی رہو اور حسبِ دستور اپنے گرد و پیش روشنی پھیلاتی رہو بے دل اور بد حوصلہ مت ہو۔

یہاں کے حالات ٹھیک کیا ہیں۔ میں بستر پہ پڑی رہتی ہوں۔ جاوید اسکول چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ شرارتیں زیادہ کرتا ہے پڑھتا پڑھاتا کچھ نہیں۔ اویس میرے بستر کے ارد گرد گھوم جایا کرتا ہے اور مستقل یہ سوال کرتا رہتا ہے کہ امی بھوپال کب چلیے گا؟

اور پھر — ایک دن ابا جی نے بڑے دکھ سے کہا امی سے "whom Gods love die soon"

بڑی ذہین، قابل اور نیک و شریف خاتون تھیں۔ بڑا المیہ ہے ان کی موت —

فن اور شخصیت
زہرہ جمال

اختر بھائی

تقسیم کی آندھی آئی۔ عزیز و اقارب تو سب بچھڑ گئے زندگی کے پچیس چھبیس سال ادبی رشتوں کے سہارے ہی انسانیت کی بو باس اور خلوص پاتے رہے۔ ہم لوگ ناگپور سے بھوپال آئے۔ جاں نثار اختر اور صفیہ اختر بھی گوالیار سے بھوپال آکر پناہ گزیں ہوئے۔ یہ وہ زرخیز مٹی تھی جسے مہاجرین کا سیلاب بھوپال کی ادب نواز اور ادب پرست زمین پر بہالایا۔ بھوپال نے صفیہ آپا اور اختر بھائی کو اپنا لیا۔ اہلِ لکھنؤ سے زیادہ چاہا سراہا اور شعوری طور پر فیض پایا۔ یہیں سے ہمارے خاندان کا اختر بھائی سے ایک رشتہ جڑا۔ صفیہ آپا کی ذات کے ذریعے۔

صفیہ آپا اور اختر بھائی کو میں نے بھوپال میں ایک نجی مشاعرے میں دیکھا۔ چلمن سے لگی ایک باوقار خاتون، بڑی بڑی روشن آنکھیں ملیح رنگت۔ چہرے پر عجیب مسکراہٹ، جس میں انسانی محبت اور ہمدردی کے گہرے درد کی جھلک تھی۔ خواتین سے سنا صفیہ آپا ہیں یہ جاں نثار اختر کی محبوب اور شریکِ حیات۔ ناگپور میں آپا جی نے جن سے غائبانہ تعارف کرایا تھا۔

آپا (اختر جمال) کالج میں داخل ہوئیں تو رات دن صفیہ آپا کا ذکر رہتا۔ اختر بھائی اور آپا دونوں پروفیسر تھے اردو کے۔ بھوپال کے طلبہ اور طالبات، شعر و ادب کے پروانوں نے ان شخصیتوں کی تابناکی سے ذہن کو جلا دی، شعور کو نکھارا اور زندگی کی نئی راہیں تلاش کرنے میں رہنمائی حاصل کی۔ بھوپال کی ادبی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا اور اختر بھائی کے ساتھ، ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی۔ کانفرنس ہوئی۔

۱۹۵۰ء میں میں نے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ اس وقت اختر بھائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے غیر قانونی قرار دئے جانے کی وجہ سے حکومت کے عتاب کا شکار ہو کر بمبئی جا چکے تھے۔ شری وشوانا تھن کا دورِ چیف کمشنری بھوپال میں ترقی پسند اور اشتراکی تحریکوں کے لئے ایک دورِ ابتلاء تھا۔ گوالیار سے بھوپال آکر اختر بھائی نے از سرِ نو ایک آشیاں بنایا تھا ننھے جاوید اور سلمان کو آغوش میں لئے وہ ذاتی غموں سے بے نیاز غمِ حیات کے بکھیڑوں میں الجھ گئے۔ اور یہ آشیانہ بھی برقِ حوادث کا شکار ہو گیا۔ محبوب منزل، منزلِ فراق بن گئی میری بہن اختر جمال اور بہنوئی احسن علی خاں بھی اسی تیرِ ستم کا شکار ہو کر کالج چھوڑ چکے تھے مجھے بمشکل پرنسپل ملہوترا نے داخلہ دیا تھا۔ اس یقین پر کہ میرے خیالات انقلابی نہیں۔

رفتہ رفتہ میرا ذہن انقلابی خیالات کو سمجھنے لگا! ور اقبال کی پروردہ عقابی روح بیدار ہونے لگی۔

آپا کالج میں زندگی کی خاطر، ننھے بچوں کی خاطر مصالحت کر کے دن گزار رہی تھیں۔ مجھے بھی سمجھاتی رہتی تھیں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میں ان کے ذہنی مذاق کے لئے ایک تنکا بن گئی جو تنہائی کے طوفانوں میں ہاتھ آجائے۔ وہ ایک دوست کی طرح باتیں کرتیں۔ ماں کی طرح چاہتیں، بہن کی طرح ہمدردی کرتیں۔

پر آزادیٔ نسواں کو ترجیح دی تھی۔ وہ باشعور عورت تھیں اور ہر باشعور عورت کی طرح رفیقِ حیات ذی شعور چاہتا تھا۔ اس شعوری یکجہتی کی خاطر بہت سی کمزوریاں بھی اختر بھائی کی نظر انداز کردی تھیں — (ہم اور آپ انھیں کریدنے والے کون؟)

۱۹۵۴ء میں ہم نے بھوپال میں حلقۂ اربابِ ادب کی جانب سے مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ میں حلقہ کی جنرل سکریٹری تھی۔ اختر بھائی کی پُر اعتماد شفقت نے مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ انھوں نے بمبئی میں تمام شعرا کو اخراجاتِ سفر کے معمولی سے انتظام کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت پر راضی کرلیا۔ چنانچہ ان کی صدارت میں صدر منزل میں بھوپال کی تاریخ کا ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، وامق جونپوری اور بہت سی ہستیاں پہلی بار سرزمین بھوپال پر رونق افروز ہوئیں — اسی عرصہ میں مجھے ایک، دو بار خدیجہ اور ان کے گھرانے سے ملنے کا موقعہ ملا۔

یوں تو میں نے خدیجہ کو پہلی بار یومِ اقبال کے ایک جلسے کے موقعے پر دیکھا تھا۔ نازک اندام دلکش سی یہ خاتون اپنی بہنوں میں مجھے منفرد سی نظر آئیں اور میں پہچان گئی کہ یہی خدیجہ ہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو اباجی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ ۳۱ کو وہ قیدِ حیات سے رہا ہو کر ابدی نیند سو گئے۔ پہلی جنوری کو جب مَیں نے بھوپال اسٹیشن پر قدم رکھا۔ قیامت میری منتظر تھی۔

سب بہنیں بھائی چھوٹے چھوٹے زیرِ تعلیم تھے۔ مجھے اسکول میں سروس مل گئی تھی مگر تنخواہ تھی ۹۳ روپے، مکان دار نے فوراً مکان خالی کروالیا تھا۔ چند رشتہ دار تھے جو سر پہ ہاتھ رکھ کر کہتے تھے۔

"بی بی ہمت سے کام لو۔ اب تو تم ہی ہو۔ تمہیں سب ذمہ داریاں سنبھالنا ہیں۔"

اِن حالات میں مجھے ساحر صاحب کے وہ جملے یاد آئے جو کبھی کبھی انھوں نے ہمارے یہاں آکر کہے تھے۔ "بمبئی آجائیے۔ فلموں کے لئے لکھئے۔ یہاں کیوں اپنی زندگی برباد کررہی ہیں۔"

مَیں نے انہیں لکھا۔ ان کے حوصلہ دلانے پر بمبئی میں قدم رکھا۔ فلمی دنیا کی طرف بڑھنے کا حوصلہ تو نہ ہوا البتہ تعلیمی میدان میں جدوجہد شروع کی۔ اختر بھائی بمبئی میں تھے۔ وہ اسٹیشن پہ ملے۔ میرا قیام تو شوکت آپا (بیگم کیفی) کے پاس تھا۔ لیکن اختر بھائی روزانہ ہی ریڈفلیگ ہال آجاتے۔ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ صفیہ آپا کی، اپنی، خدیجہ کی۔ کبھی شوکت آپا اور میں ان کے ساتھ چلے جاتے۔ کافی بمبئی دکھائی انھوں نے تاج محل وغیرہ۔ وہ او۔ پی۔ نیرّ کے ساتھ لکھ رہے تھے۔ معاشی طور پر مطمئن تھے۔

اسی اثنا میں خدیجہ بمبئی آئیں کچھ دن کے لئے۔ اور پھر میری موجودگی میں ہی اختر بھائی کی ان سے شادی ہوگئی۔ اس وقت جدید طرز کا آراستہ سا کمرہ اختر بھائی نے لے رکھا تھا۔ میری والدہ کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ — اور میری جدوجہد اور اس سے حاصل ہونے والی ملازمتیں ادھوری رہ گئیں۔ میں بھوپال واپس چلی گئی۔ جانے کے لئے مَیں نے اختر بھائی سے کرائے کے روپے لئے تھے۔ وہ نہ انھوں نے واپس لئے نہ خدیجہ نے۔

پھر دو سال بعد دسنوی صاحب نے غیاث الدین قاضی مرحوم کے ایما پر میری معاونت کی۔ بھیمڑی میں ملازمت اور مکان دلوا دیا۔ اس طرح میں اور میرا خاندان امی، بھائی بہنیں بمبئی آگئے — مجروح بھائی اور بھابی کی ہمدردیوں نے بہت سے مراحل طے کرا دئے اور بمبئی آ بسے — اس دوران میں اختر بھائی جب اور جہاں ملتے مجھے اپنے گھر کا پتہ سمجھاتے، بڑے اصرار سے بلاتے — مگر میں نے طے کرلیا تھا کہ جب تک گردشیں ختم نہ ہوں، پاؤں جم نہ جائیں، سماجی، ادبی روابط و مراسم سے بھی کنارہ کش ہی رہنا چاہئے۔ غلط فہمیوں اور الجھنوں سے خودداری کی حفاظت کا یہ ایک طریقہ تھا۔

اختر بھائی بہت ہی بے ضرر انسان ہیں۔ وہ کسی کو فیض نہ پہونچا سکیں تو نقصان بھی نہیں پہنچاتے۔ کسی کی ہتک، ایذا رسانی

"کس کی ؟" میں بے قرار ہو کر دوڑی —

"تمہاری صفیہ آپا رحلت کر گئیں ۔"

صفیہ آپا — میری ماں، میری بہن، میری دوست — اُن کی موت نے، ان کی جدائی نے جاوید اور اویس کی معصوم زندگیوں کی مامتا سے محرومی نے برسوں تڑپایا ۔ رلایا ۔

اور یہی آپا ایک رشتہ جوڑ گئیں اختر بھائی سے — یہ رشتہ مجھے محترم اور عزیز رہا — میں نے اختر بھائی کو تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھا ۔ صفیہ آپا کی مرگِ ناگہاں کو ان پر الزام نہیں بنایا ۔ اس لئے کہ میں جانتی تھی آپا، اختر بھائی سے کس درجہ گہری، شدید اور سچی محبت کرتی تھیں ۔ ان کی آخری دنوں کی قریبی ساتھی رہی تھی میں — جب ان کا خط آتا تھا آپا گلنار ہو جاتی تھیں ۔ اکثر کوئی بات سنا بھی دیا کرتی تھیں — کبھی انھیں اختر بھائی سے شکوہ نہیں ہوا ۔ ان کی خاطرداری ہی ہر طرح ان کا ایمان بنی رہی ۔ اس والہانہ محبت کا ایک مشرقی عورت کی "پتی ورتا" کا احترام ہی سکھاتا تھا کہ اختر بھائی کی قدر کروں ۔ ادب اور احترام کروں ۔

اختر بھائی بھوپال آئے ۔ کالج میں آئے ۔ آپا نے مجھے گھر سے بلا کر کہانی پڑھوائی اور خود اختر بھائی سے بے حد تعریفیں اس کہانی کی کرتی رہیں — اختر بھائی پھر آئے — آپا نہیں ہیں ۔ وہی کالج ۔ وہی ہال ۔ وہی مجمع ۔ اختر بھائی 'خاکِ دل' سنا رہے ہیں ۔

اور آپا سے وابستہ سبھی آنکھیں اشک خوں برسا رہی ہیں — محبوب منزل کا آپا کا گھر ۔ جس کے آباد ہونے کی تمنا تھی اہلِ بھوپال کو، ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا ۔

۱۹۵۳ء میں برہانپور میں ایک کانفرنس ہوئی ۔ اس کی صدارت کے لئے مجھے بلایا گیا ۔ کیفی بھائی اختر بھائی وغیرہ بھی وہاں تشریف لائے ۔ میں B. A. میں پڑھتی تھی ۔ بے حد دبلی — کیفی بھائی مجھے چھیڑا کرتے کہ "مجھے مشاعرے کے دوران یہی فکر رہی کہ ایسا نہ ہو کہ ہوا کا تیز جھونکا آ جائے اور صدر صاحبہ اڑ جائیں ۔" ہم لوگوں نے بھوپال میں حلقۂ اربابِ ادب کی تنظیم کے تحت ترقی پسند نظریات کو آگے بڑھایا تھا ۔ اختر بھائی نے ہم لوگوں کی بہت حوصلہ افزائی کی ۔ انھوں نے بھوپال میں نئے ادیبوں کی کانفرنس رکھنے کا مشورہ دیا ۔ برہانپور میں اختر بھائی نے اپنی دوست کا ذکر کیا جو صفیہ آپا کی شخصیت سے بے حد متاثر ہیں ۔ سوتی ساڑیاں پسند کرتی ہیں ۔ اختر بھائی ان کے لئے سوتی ساڑیاں خریدنا چاہتے تھے ۔ یہاں پہلی بار مجھے علم ہوا کہ صفیہ آپا کے اختر کی زندگی میں خدیجہ قدم رکھ چکی ہیں — لوگوں نے اختر بھائی کے اس فیصلہ یا اقدام پر طرح طرح کی باتیں کیں ۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کے متعلق کبھی نہ سوچا اور نہ کہا — ذاتیات میں دخل میرے اصولوں کے خلاف رہا ہے ۔ تاہم مجھے اس کا بھرپور یقین تھا کہ آپا کی شخصیت، ان کی محبت اختر بھائی کی شاعری اور شعور ہی میں نہیں ان کی زندگی میں بھی رچ بس چکی ہے ۔ وہ انہیں فراموش نہیں کر سکتے — انھوں نے "زیرِ لب" شائع کروا کے آپا کی شخصیت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے — وہ آپا کو خود سے "بڑا" ہی سمجھتے رہیں گے "کم تر نہیں" ۔

اختر بھائی کی شاعرانہ طبیعت، ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز آپا نے جذباتی انداز سے نہیں سنجیدگی سے قبول کئے تھے ۔ اپنی متانت میں شاید انھوں نے کبھی فرق نہ آنے دیا ہو ۔ وہ اختر بھائی کی شخصیت اور صحبت میں شعور کی پختگی پا چکی تھیں ۔ یہی پختگی ان کے پختہ شعور کی رفیق رہی ۔ وہ جسمانی طور پر دور رہ کر بھی ذہنی طور پر ہمیشہ قریب رہیں ۔ اختر بھائی کی ہر نئی تخلیق ان کے لئے پیام جانفزا تھی ۔ ان کی نظم کو ٹیبلو کی شکل میں مرتب کر کے آپا کتنی مسرور ہوتی تھیں ۔ ہم سب نے دیکھا تھا ۔ وہ بڑے فخر سے، بڑے اعتماد سے بڑے پیار سے ان کے اشعار پڑھتی تھیں ۔ عطارد مجھے بنایا تھا ۔ قمر اعجاز بنی تھی ناہید، سدھا اور بہت سی لڑکیاں — ستاروں کے یہ رول انھوں نے ہی ہمیں بانٹے تھے ۔

آپا ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو شوہر سے دولت، ثروت، عیش و آرام کا تصور وابستہ رکھتی ہیں ۔ انھوں نے زمرد کے گلوبند

اختر بھائی کی ازدواجی زندگی میں دو عورتیں آئیں۔ اسے مکمل کرنے میں دونوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔ اور ایک دوسرے کی کمی پوری کی۔ یعنی صفیہ آپا نے جو ادھوری کہانی زندگی کی چھوڑی تھی خدیجہ نے اُسے مکمل کر دیا۔

جاوید اور سلمان نے بھی ماشاء اللہ بڑی ذہانت سے، بڑے تحمل سے اپنی زندگیاں اور مستقبل سنوار لئے ہیں۔ مجبوب منزل سے آج تک ــــ ایک گھر نہیں۔ تین گھر آباد ہیں۔ جاوید کا اپنا گھر۔ سلمان کا اپنا گھر۔ اختر بھائی کا گھر ــــ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے۔ آپا کی روح جو لحد میں بھی برسوں سکون سے نہ سو سکی ہوگی آج پوری طرح آسودہ اور مطمئن ہو کر سو گئی ہے۔ سب کے لئے فکر مند، بے چین و بے قرار ہو جانے والی صفیہ آپا ــــ اُن کا اپنا سکون اور چین، خوشی اور آسودگی کا راز یہی تھا "سب کا چین سب کا سکھ"۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے آپا کو کہیں سے لے آؤں۔ "آپا یہ ہے آپ کا جادو ــــ آپ کی دلہن۔ آپ کی پوتی لبنیٰ آپ کا پوتا فرحان ــــ یہ آپ کا سلمان ہے ۔۔ یہ آپ کی چھوٹی دلہن ــــ یہ ہیں اختر بھائی۔ آپ کے وہی اختر۔ خدیجہ آپ کی جانشین ــــ"، تو جو مسرت اور درخشانی آپا کے چہرے پر بکھر جائے گی ــــ اُسے میں تصور میں پالیتی ہوں۔

اور شاید آپ یقین نہ کریں۔ جب میں یہ مضمون مکمل کر رہی ہوں۔ مجھے صفیہ آپا کا وہ اطمینان کا سانس صاف سنائی دے رہا ہے جب وہ میرے سپرد کوئی ذمہ دارانہ کام کرتی تھیں اور مجھ سے (جو اس وقت بڑی لا اُبالی شریر لڑکی تھی) پورا کروا کے، لیا کرتی تھیں۔ *

"آپ کوئی بھی ہوں۔ کہیں سے بھی آئے ہوں۔ آپ کو کوئی رسپانس نہیں ملے گا۔ جب تک ہونٹوں کے درمیان سگریٹ نہ ہو۔ اور جب سگریٹ کا دھواں اُن کے ذہن کے دریچوں میں داخل ہو جائے اور خیالات کی رو زبان پر آنے کے لئے بیتاب ہو جائے تو آپ خود بخود ان کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔ مگر آپ اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوگی وہ کسی ایک سلسلے کی حامل نہ ہوگی۔ ان کی باتوں میں کچھ ایسا جادو ہوگا۔ کہ آپ کھو سے جائیں گے۔ آپ سوچنے لگیں گے کہ آپ ایک ایسے بچے سے ہم کلام ہیں معصومیت جس کی فطرت ہے۔ بھولا پن اور سادگی جس کی صفت ہے یا پھر ایسے سن رسیدہ انسان سے محو گفتگو ہیں جو زندگی کے گھرے گمبھیر مسائل سے اس قدر آشنا ہے کہ اب ان کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی۔"

محمد ایوب واقف

کو دور کی بات ہے وہ زبان سے کبھی ایسی بات کہتے بھی نہیں جو کسی کے لئے رنج و آزار کا باعث ہو ــــ اختر بھائی کی ذات سے مجھے کوئی گزند نہیں پہونچا۔ ان کی شفقت اور خلوص میرے لئے ہمیشہ قابل قدر رہے، لیکن اُن دنوں خود میری افتاد طبع ہی اس قدر پراگندہ تھی کہ گوشہ نشینی ہی میں سکون ملتا تھا۔

اس کے باوجود اختر بھائی نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ بہو بیگم کے پریمیئر پر انھوں نے مجھے بلایا۔ ایک عرصہ بعد اُن سے ملاقات ہوئی۔ دو بچیوں کا ہاتھ تھامے وہ ایک ذمہ دار باپ کے روپ میں نظر آئے۔ اُن کا یہ روپ بڑا انوکھا تھا میرے لئے ــــ پھر وہ ہارٹ اٹیک کے سلسلہ میں نور ہاسپٹل میں داخل تھے۔ جاوید نے جو بمبئی آگئے تھے مجھے اطلاع دی۔ میں اسی وقت جاوید کے ساتھ ان کی عیادت کے لئے گئی ــــ اب اُن کی بچیاں کافی بڑی ہو گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا۔ اختر بھائی کے اندر "باپ" دو بیٹوں کے وجود سے پگھل نہ سکا تھا۔ ان کے لاابالی شاعرانہ مزاج میں فرق نہیں آیا تھا مگر دو بیٹیوں نے 'باپ' کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ ان کے مستقبل، ان کی تعلیم، ان کی زندگی کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔

آپا، اختر جمال، پاکستان سے آئیں۔ اختر بھائی نے انھیں رخصت کرتے وقت کہا۔ "اب جب تم دوبارہ آؤ گی تو ہمیں نہیں پاؤ گی۔" ہم دونوں بہنیں ضبط نہ کر سکے ــــ اختر بھائی کے اس جملے نے مجھے بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور پھر میں نے گاہ گاہ ان کی خیریت معلوم کرنا اور ملتے رہنا معمول بنا لیا۔ کئی سالوں کا جمود ٹوٹ گیا۔

میں نے پھر وہی دیکھا۔ کہ اختر بھائی بیٹھے ہیں اور نئے ادیب اور شاعر۔ اختر بھائی اپنا وقت فلمی اور ادبی مصروفیات سے بچا کر نئی نسل کو دینے میں بخل نہیں کرتے۔ نئی نسل باغی ہو یا سرکش۔ رشتہ تو ایک جوڑنا ہے آج اور کل کے درمیان۔ اختر بھائی کی سادگی میں آج بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

خدیجہ کہیں گی۔ "وہ آپ نے خوبئی نظم کہی ہے زہرہ کو سنا دیجئے۔" اختر بھائی سنا دیں گے۔ اختر بھائی اپنے چھوٹوں کے درمیان خود کبھی یہ احساس نہیں رکھتے کہ وہ اُن سے کس درجہ بڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتنے بڑے ہیں یہ احساس ہمیشہ چھوٹوں کو رہتا ہے زندگی کے پچیس سالہ رابطہ کے دوران کبھی میں نے ان کو خود ستائی کا شکار نہیں پایا۔

چند سالوں سے انھوں نے غزل کو نیا رنگ۔ نیا شعور اور لے دی ہے۔ محسوس ہوتا ہے۔ میر عہد حاضر کے تقاضے پورے کرنے پھر سے چلے آئے ہیں۔ باوجود مصروفیات کے جب انہیں اردو کے تحقیقاتی کام کا موقعہ ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی کی طرف سے ملا۔ تو عجیب عالم تھا۔

انسان جس کام کے لئے پیدا ہوا ہو وہ کام نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح ہاتھ آجائے ــــ کس قدر دلچسپی، انہماک اور عرق ریزی کا ثبوت اختر بھائی نے دیا ہے۔ فلمی مکھڑوں پر گیت لکھنا آج بھی ان کے لئے کربناک ہوتا ہے۔ کہنا ہی پڑتا ہے (پروڈیوسر تو پڑھیں گے نہیں یہ مضمون)

اختر بھائی کی ایک اور خصوصیت وضعداری ہے۔ صفیہ آپا کے ناطے اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر وہ ہمیشہ اسی طرح پیش آئے۔ ۱۹۵۶ء سے۔ ایک بار ایک دعوت میں ساحر صاحب کے یہاں اختر بھائی نے میری موجودگی میں شغل مے نوشی سے احتراز کیا سب حیران تھے۔ لیکن اختر بھائی کی قدر آج تک میرے دل میں ہے۔ وہ عورتوں کا سگریٹ اور شراب پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ مشرقی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے۔ اختر بھائی نے روس اور چین کے انقلاب آفریں دور سے اثر تاثر لیا۔ لیکن مخصوص بھارتی رنگ ان کے مزاج، کلام اور مذاق میں رچا ہوا ہے۔ وہ عورت کے جس روپ کو آدرش سمجھتے ہیں وہ "ہندوستانی" ہے، گھریلو ہے۔ خدیجہ نے اپنی خوش قسمتی سے اختر بھائی کا گھر آباد کیا اور اس طرح گھریلو زندگی میں سکھ چین پیدا کر دیا کہ اختر بھائی نے اردو شاعری

کی عاشقی سے آگے نہیں بڑھتا، اوپری اور سطحی محسوس ہوتا ہے جبکہ جاں نثار اختر کے یہاں رومان شاعری کی باقاعدہ ایک قدر ہے۔ اس میں جو عشق کی متانت، دیدہ وری اور حسیت ہے اُسے ذہن میں رکھتے ہوئے جاں نثار کی شاعری رومانی کم اور جمال پرست کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ لیکن اگر اُن کی شاعری کو کلیتاً وہی شاعری کہیں گے تو صحیح نہیں ہوگا۔ جاں نثار کا تعلق شروع سے ترقی پسند تحریک سے رہا ہے۔ اُن کی بہت سی نظمیں ہیں جو خالصتاً اسی زاویہ سے لکھی گئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انقلابی شاعری بھی رومانیت کی غمازی کرتی ہے۔

دلی کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد جب میں علی گڑھ ایم اے کرنے کے لئے پہنچا، جاں نثار اختر اس سے بہت پہلے علی گڑھ سے ایم اے کر کے جا چکے تھے۔ پہلے وہ وکٹوریہ کالج گوالیار میں لکچرر رہے۔ اس کے بعد حمیدیہ کالج کے اردو کے شعبہ کے صدر ہو کر بھوپال چلے گئے ــــ اور بھوپال اس وقت چھوڑنے پر مجبور ہوئے جب حکومت نے یہ پابندی لگائی کہ جو شخص ترقی پسند تحریک کا ممبر رہے گا اُسے سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا جائے گا۔ ترقی پسند تحریک سے اس وابستگی کے باوجود بھی جاں نثار گنتی کے ان دو ایک شاعروں میں ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو اپنے مفاد کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا۔ میں ایسے بہت سے شاعروں کو جانتا ہوں جنہوں نے ترقی پسند تحریک میں شمولیت ہی اس لئے اختیار کی تھی کہ ادبی شہرت کا یہ آسان راستہ تھا۔ ایسے کئی شاعر ہیں جو جب تک ترقی پسند تحریک کامیاب رہی نامی شاعر اور ادیب گنے جاتے رہے اور جب ترقی پسند تحریک کو زوال آیا ان شاعروں کی شہرت اور نام کو بھی زوال آ گیا۔ آج اُن میں سے بہت سوں کے نام سننے میں بھی نہیں آتے۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے زوال کا سبب بھی خود تحریک میں یہی لوگ ہیں۔ جب اچھے شاعروں اور ادیبوں کو ترقی پسند تحریک نے پہلی تو کیا کوئی بھی حیثیت نہیں دی، تو عوام کا اعتماد کا تحریک پر سے اٹھ گیا۔ اور جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے وہ غلطی آج بھی اسی طرح ہو رہی ہے ــــ مگر وہ سب میری اس بحث سے خارج ہے۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی طرح بھوپال چھوڑنے کے بعد جاں نثار اختر بھی بمبئی آ گئے اور فلم میں کسب معاش کی کوشش کرنے لگے۔ میری ملاقات اُن سے یہیں بمبئی میں ہوئی۔

جب اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی ان کی پہلی بیوی صفیہ حیات تھیں۔ میں نے انہیں اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا اور جب جاں نثار سے تفصیلی باتیں ہوئیں تو مجھے احساس ہوا جاں نثار بہت کم گو، سادہ دل اور سادہ لوح شاعر ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ بہت دلچسپ بھی۔ جب سے وہ بمبئی آئے ہیں میری ان کی ملاقات کا دھوپ چھاؤں کا سا رنگ ہے۔ ملے تو مستقل مل رہے ہیں، نہیں ملے تو مہینوں ایک دوسرے کی خبر نہیں۔ مگر اُن کی شاعری برابر سنتا اور پڑھتا رہا ہوں "خاکِ دل" صفیہ کی موت سے متعلق جو نظم انہوں نے کہی تھی ان کی اچھی نظموں میں سے ہے۔ اُن کی کئی بہت اچھی نظمیں میں جو مجھے پسند ہیں۔ اُن میں ایک آخری ملاقات بھی ہے مگر ان سب کے باوجود مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ جاں نثار اختر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی اکثر نظموں کا انداز بھی مسلسل غزل کا سا ہے، دراصل نظم کا جو آہنگ اور جو رکھ رکھاؤ ہونا چاہیئے وہ اس دور کے کسی شاعر میں نہیں۔ خود جوش جو غزل کے بہت بڑے مخالف ہیں ان کی اکثر نظمیں نظم کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔ ان سب میں ایک مسلسل غزل کا انداز ہے۔ اُس دور میں جب اُن شعراء نے شاعری شروع کی تھی نظم گوئی کا وہ شعور رکھتا ہی جو آج ہے۔ آج بھی اس دور کے لوگ جب نظم کہتے ہیں تکنیک کا وہ خیال نہیں رکھتے جو آج کے نظم گو شعراء میں پایا جاتا ہے۔

سلاسل، تارِ گریباں، نذرِ بتاں، جاوداں اور خاکِ دل، جاں نثار اختر کے اب تک پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ چھٹا حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "پچھلے پہر"۔ جس رعایت سے جاں نثار اختر نے یہ نام

فن اور شخصیت

اختر الایمان

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر کے نام سے پہلا تعارف آج سے پینتیس چھتیس برس پہلے ہوا تھا۔ میں اُن دنوں دلّی کالج میں پڑھتا تھا۔ جاں نثار کی ایک نظم "گرلز کالج کی لاری" ۱۹۳۶ء میں رسالہ 'ساقی' دہلی میں چھپ چکی تھی۔ جاں نثار خود بھی اُن دنوں طالب علم ہی تھے، اور اُن کا ، غالباً ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ (۳۹-۱۹۳۸ء) نظم کسی نے یہ کہہ کر دی تھی "یہ شاعر آج کل لڑکیوں میں بہت مقبول ہے۔" نظم پڑھ کر اس کا عشقیہ حصّہ تو رفت گزشت ہوگیا۔ البتہ نظم کی روانی، سلاست اور صفائی ذہن میں رہ گئی۔ ایک شعر ابھی تک ذہن میں ہے ؎

وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی بنتی
اِدھر سے اُدھر سے حسینوں کو چُنتی

وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر کا نام روز بروز زبان زدِ عام ہوتا گیا۔ جاں نثار ہمارے یہاں مجاز اور جذبی کے سلسلے کے شاعر ہیں۔ اُن دنوں خاص طور پر جہاں کوئی ادبی بحث یا تذکرہ ہوتا، جاں نثار، مجاز اور جذبی تینوں نام ساتھ لیے جاتے تھے۔ کچھ نقادوں نے ان ناموں کے ساتھ اسی طرح کی ایک رومانی تحریک وابستہ کردی تھی۔ جو انگریزی ادب میں شیلے، بائرن اور کیٹس کے ساتھ وابستہ تھی۔ جاں نثار، جذبی، مجاز اور شیلے، بائرن، کیٹس میں کوئی مماثلت یا قدرِ مشترک تھی یا نہیں وہ بعد کی بات ہے۔ مگر یہ موازنہ لوگ جس وجہ سے کرتے تھے اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انگریز حاکم تھے اور اردو میں جو نئے تصورات اور میلانات آرہے تھے وہ سب انگریزوں اور انگریزی ادب کی دین سمجھے جاتے تھے۔ اور ایک حد تک آج بھی۔ دوسرے یہ کہ جب کسی شاعر یا ادیب کو وقیع ثابت کرنا ہوتا تھا اس کا تقابل اس وقت کے یا اس سے پہلے کے کسی معروف انگریز ادیب یا شاعر سے کر دیا جاتا تھا، اور یہ بدعت آج تک بھی چلی جاتی ہے۔ آج بھی بعض لکھنے والے جن میں کچھ نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں، جب اپنی بات کو وقیع یا باوزن کہنا چاہتے ہیں کسی بیرونی ادیب کے حوالے سے کہتے ہیں۔ خود انہیں اپنی ذات پر اتنا اعتماد نہیں معلوم ہوتا اپنے حوالے سے اپنی بات کہہ سکیں۔

خیر یہ بات تو ایک جملۂ معترضہ تھی مگر اس میں شک نہیں کہ جاں نثار اختر بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ جہاں تک اردو شاعری میں عشقیہ مضامین کا تعلق ہے، اختر شیرانی کا نام سرِفہرست ہونا چاہیے تھا، مگر ایسا اس لئے نہیں کہ اختر شیرانی میں وہ حسیت اور جمال پرستی نہیں جو جاں نثار اختر کے یہاں ہے۔ اختر شیرانی کا اردو شاعری پر یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کے محبوب کے صیغے کو تذکیر سے تانیث میں بدل کر قبولِ عام دیا۔ اس کے باوجود بھی اُن کا رومان لڑکپن

اس ملک کے شاعروں کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ عوام اور خواص دونوں انہیں محفل گرم کرنے کی چیز سمجھتے ہیں، اور اس بات سے خوش نہیں ہوتے کہ ان کی مالی اور معاشی زندگی بہتر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شاعر یا ادیب فلم میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اُسے دو وقت کی روٹی میسّر ہونے لگتی ہے۔ وہ ایک چھوٹا موٹا گھر بھی لے لیتا ہے اور اگر توفیق ہوئی تو ایک موٹر کار بھی، تو خواص و عوام دونوں میں سے اکثر کو یہ غم ستانے لگتا ہے کہ یہ شاعر فلم میں جاکر ختم ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ جاں نثار اختر پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اُن کی شاعری بہتر سے بہتر ہوتی گئی ہے۔ "پچھلے پہر" کی شاعری اس کی مثال ہے۔

زمیں ہوگی کسی قاتل کا داماں ہم نہ کہتے تھے
اکارت جائے گا خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے

غزل کی ہر اچھی شاعری پڑھ کر مجھے ملال ہوتا ہے۔ وقت گذر جانے پر اُس کا سیاق و سباق نہیں ملتا اور سماجی ناانصافیاں جن سے متعلق وہ تخلیقات ہوتی ہیں اپنے پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ ہر اچھی بات ہوائی ہو کر رہ جاتی ہے۔

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

اچھی شاعری کا بنیادی عنصر دردمندی ہے۔ دردمندی کا دامن کتنا وسیع ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ مزید کوئی اور وضاحت بھی نہیں کروں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ جاں نثار اختر کو اگر مجسم دردمندی کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ کبھی وقت ملا تو ان پر زیادہ تفصیل سے لکھوں گا۔ اس وقت ختم کرتا ہوں۔ جاں نثار اختر کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کے ساتھ۔ *

رکھا ہے۔ وہ بہت معنی خیز ہے۔

وہ کون سی آہٹ ہے جو خوابوں میں در آئی
کیا جانئے کیوں چونک پڑے پچھلے پہر ہم

وہ آہٹ ہے موت کے قدموں کی چاپ۔ جانے کیوں موت کا احساس جاں نثار اختر پر اتنا حاوی ہو گیا ہے اسی تاثر کے تحت انہوں نے اپنی بیٹی عنیزہ کے نام ایک طویل نظم کہہ ڈالی۔

تم میری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے
دل کی دھڑکن ہے ڈوبنے کے قریب
سانس ہر لمحہ پیچ و تاب میں ہے

جاں نثار اختر کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ دل کے مریض بھی ہیں۔ ان پر دو بار دل کے شدید دورے پڑ چکے ہیں۔ عنیزہ کے نام نظم انہوں نے دل کے دورے کے بعد کہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں موت کے اس احساس کا تعلق جسمانی یا واقعاتی اتنا نہیں جتنا روحانی ہے ـــ ہو سکتا ہے اس میں اپنے اوپر رحم کا جذبہ بھی شامل ہو۔ اس لئے کہ جاں نثار لشتم پشتم جیتے ہیں۔ عمر کے ساٹھویں سال میں اپنی پوری معاشی کشمکش۔ اس کے ساتھ اپنی کم مائیگی، حالات پر دسترس نہ ہونے کے سبب بیچارگی ذہن پر عود کر آئی ہو اور یہی بیچارگی شہادت کے احساس میں بدل گئی ہو۔ ہر ادیب، شاعر کی زندگی میں حالات سازگار ہوں یا ناسازگار ایسا وقت ضرور آتا ہے اور آتا رہتا ہے جب اُسے یہ احساس ہوتا ہے اس نے ادب اور شاعری کی تخلیق کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہی احساس دراصل اس کا سرمایہ بھی ہے اور وہ جذبہ بھی جو اسے ادب اور شاعری کی تخلیق میں مصروف رکھتا ہے ورنہ تو نظیری کے الفاظ میں یہ کام "باغبانیِ صحرا" کے علاوہ ہے اور کیا۔؟

زندگی کا لاابالی انداز جاں نثار اپنے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اپنے اوپر وہ ظلم کرتے ہیں۔ ڈاکٹری تنبیہ کے باوجود وہ کوئی احتیاط نہیں کرتے، نہ ہی کوئی پرہیز کرتے ہیں۔ نہ سیڑھیاں چڑھنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کا مکان دوسری منزل پر ہے مگر ایک بار نہیں وہ دن میں کئی کئی بار سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہیں۔ شراب بھی خوب پیتے ہیں اور پینے میں بھی کوئی اچھی یا بری کی قید نہیں۔ راتوں کو جاگتے بھی خوب ہیں مشاعروں اور ایسی محفلوں میں خوب خوب حصہ لیتے ہیں جہاں وقت کی کوئی پابندی نہ ہو۔ غرض کوئی بداحتیاطی نہیں جو انہوں نے اٹھا رکھی ہو۔ میں اُن کی اس بداحتیاطی کو قابلِ تعریف نہیں سمجھتا مگر اس پورے اندازِ حیات سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ جاں نثار کو جینے کی ہوس نہیں۔ اور یہ جذبہ اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس پر اکثر اوقات اپنے بیوی بچوں کی خوشیاں، معمولی ضرورتیں تک قربان کر دیتے ہیں۔ جاں نثار اختر بہت فارغ البال اور متمول آدمی نہیں مگر آپ اکثر ان کے گرد ملنے والوں کی بھیڑ دیکھیں گے جن میں نوخیز بھی شامل ہیں اور بالیدہ بھی۔ یہ سب اُن سے ملنے آتے ہیں۔ اور اتنی دیر تک ملتے رہتے ہیں کہ پینے کا وقت بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کھانے کا بھی۔ اور جاں نثار بغیر کسی خدیجہ سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ اس وقت جتنے آدمی موجود ہیں اُن سب کے کھانے کا انتظام ہو، اور انتظام ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں صرف وہی شامل نہیں جو اُن کے مداح ہیں ان میں وہ بھی شامل ہیں جو زینے سے اترتے ہی اُن کے خلاف باتیں کرنے لگتے ہیں۔ باتیں ہی نہیں بدگوئی تک کرتے ہیں۔ جاں نثار کو یہ سب معلوم ہے مگر اگلے روز وہ جب اُن کے مکان پر آتے ہیں تو جاں نثار اسے پچھلے دن کی بات سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔ انہیں کبھی شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

چاندنی میں ہی جنم لیتا ہے ۔۔!

تو اُس رات روشنیوں کے اس شہر بھوپال کی " صدر منزل " کے منقش در و دیوار، اس کے پُرشکوہ محراب، اس کے حسین طاق، چودھویں رات کی چاندنی سے زیادہ پُرنور تھے۔ وہاں ایک نہیں کئی راتوں کی چاندنی انڈیل دی گئی تھی ۔!

اقبال لائبریری کی طرف سے جشن اقبال کے سلسلے میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں اس خاکسار نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں اور بڑی دھڑکنوں اور تڑپنوں کے ساتھ شرکت کی تھی (سامع کے رول میں ۔!) کیونکہ مجھے اس ناگپور سے آئے ہوئے صرف گیارہ دن ہوئے تھے جو ادبی اعتبار سے بنجر، بیابان بلکہ ریگستان کہلاتا ہے ۔

وہ مشاعرہ عظیم الشان عرف " آل انڈیا " تھا یا نہیں یہ تو مجھے یاد نہیں (ویسے جو کچھ یاد آچکا ہے اُسی کو غنیمت سمجھئے اور اسی تھوڑے کو بہت جانئے کہ اس میں آپ کا بھی بھلا ہے اور میرا بھی ۔!!) ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ جب آدھی رات کے بعد جذب و مستی میں ڈوبی ہوئی دھیمی دھیمی، سنبھلی، سنبھلی پُراعتماد آواز فضا میں اُبھری تو سب سنبھل گئے۔ اور اس وسیع اور پُروقار ایوان نے اپنی سانسیں روک لیں ۔

آج کی رات تو منسوب تیرے نام سے ہے

درمیانہ قد۔ دبلا پتلا جسم۔ کھڑکھڑاتا ہوا سفید براق ڈھیلا پاجامہ، سیاہ شیروانی۔ جھوٹ بولنے والے پر خدا کی مار اور دنیا کی پھٹکار ۔! اگر شیروانی نہ پہنی ہوگی تو بادامی کرتے پر فاختئی صدری پہن لی ہوگی (خود اُن کا حافظ کب تردید کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔!) لہٰذا ایسے دیوالیہ پن کے عالم میں قرض اور فرض سے ہی نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے حاضرین اور ناظرین۔ سامعین و قارئین سے عرض ہے کہ ہر قدم پر قرض کے نذرانے فراخدلی سے قبول کرتے چلئے کہ یہی ہم سب کی نجات کا واحد ذریعہ ہے ۔!!

ہاں تو عرض کیا ہے۔ دبلا پتلا جسم۔ لمبی لمبی زلفیں جن کے سنورنے میں کچھ پریشانی کا رنگ بھی تھا۔ حادثات کی آگ سے سانولایا چہرہ، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، ذرا ذرا سی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ جو ایک عزم ایک اعتماد کا پتہ دیتے تھے۔

مہکی مہکی تیری زلفوں کی گھٹا چھائی ہے
تو مجھے کون سی منزل پہ اُڑا لائی ہے
زندگی دور بہت دور شورشِ آلام سے ہے
آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

" ہائے بیچاری صفیہ آپا " میرے قریب بیٹھی ہوئی انور اسمٰعیل نے جو اس زمانے میں گرلز کالج میں فارسی پڑھاتی تھیں اور از راہِ ہمدردی مجھ غریب الوطن سے دوستی کر لی تھی۔ ایک اسٹائلش سی آہ بھری۔ اہلِ بھوپال صفیہ آپا کو پرستش کی حد تک چاہتے تھے ۔!

" جی نہیں، یہ نظم صفیہ آپا کے لئے نہیں ہے۔ یہ تو انھوں نے ابھی سال بھر پہلے کہی ہے ۔"

ہم لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گوری سی دھان پان خاتون، آنکھوں میں سیاہ بادل تیرتے اور ڈوبتے ہوئے شانوں پر ساون کی گھٹائیں جھومتی ہوئیں ۔

" یہ خدیجہ ہیں " انور کی سرگوشی میں اس کی مرعوبیت صاف جھلک رہی تھی۔

" خدیجہ کون ؟" ۔ میں نے اپنی جہالت کا ڈھنڈورا پیٹا۔

" جاں نثار کی دوسری بیوی ۔"

پروفیسر شفیقہ فرحت

محبوب شخصیت

کچھ اُلجھی اُلجھی تحریریں　　　کچھ دُھندلی دُھندلی تنویریں
پھر دل کے آئینہ خانے میں　　　جاگی ہیں کتنی تصویریں

آئینہ خانہ تو خیر وہ کیا ہوتا ___ بس اِک قطرۂ خون ہے۔

سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی ___ !

بلکہ میرا تو خیال ہے اس بازی گری میں تھوڑا بہت وہ بھی ٹپک چکا ہوگا - !

تو اس آدھے، تہائی چوتھائی قطرۂ خوں میں کیا تصویریں ___ کیا تحریریں اور کیا تنویریں ___ !!

مگر معجزے کب نہیں ہوتے ___! ایک تصویر اس قطرے میں اتر تو رہی ہے۔ بے حد دُھندلی دُھندلی، بے حد مٹی مٹی، اُلجھی اُلجھی ___! سترہ برس کی گرد جو اس پر جمی ہے۔

حافظے کا برش کہاں سے لاؤں کہ پھیرا اور سارے میں یادوں کا اُجالا پھیل گیا۔

آج کا جاں نثار تو میرے سامنے ہے۔ اس کا دُھلا دُھلایا Retouch کیا ہوا پرنٹ میں ابھی پیش کر سکتی ہوں لیکن مجھے تو وہ پہلی ملاقات والے جاں نثار کی تلاش ہے مگر کچھ بھی تو یاد نہیں ___!

نہ کچھ یاد آتا ہے نہ کچھ یاد رہتا ہے۔ اسی لئے دسویں اور بیسویں ملاقات بھی پہلی ہی معلوم ہوتی ہے اور حساب کتاب برابر کرنے کے لئے پہلی ملاقات میں بیسویں ملاقات کی بے تکلفی اور خلوص پیدا کرنا پڑتا ہے ۔۔ !!

یہ نکتہ دادطلب ہے کہ اس المناک حقیقت کے باوجود کہ ہم کتاب میں نہ سہی مگر حساب میں قطعی صفر ہیں۔ حساب کتاب برابر کرنے کی عبرتناک کوشش پورے پورے خلوص سے کرتے ہیں اور نتیجے میں خود برابر (یعنی صفر ___!) ہو جاتے ہیں ___ !!

تو خیر ___ بند کیجئے اس ناگرک بینک کو یعنی اس حساب کتاب کے دفتر بے حساب کو، اور آئیے اصل قصّے کی طرف کہ جو اب تک ہماری فنکارانہ دانشوری کی وجہ سے موضوعِ سخن نہیں بن پایا یعنی پہلی ملاقات ۔۔۔۔ !

چلئے اس ہیرا پھیری سے وہ پہلی ملاقات کی گھڑی تو ہاتھ آئی -

کاوش کے دل نے تقاضا کیا - جستجو کے ناخن نے اس گرہ نیم باز کا قرض ادا کیا ___! مگر وائے ناکامی ۔!

اس ملاقات کے ہیرے تو ہیں ہی نہیں - محض دیدار کے شیشے ہیں اور اشعار کے موتی !!

دو اکتوبر ۱۹۵۶ء کی سرد رات جو یقیناً چاند کی روشنی میں ڈوبی ہوئی ہوگی ۔ کیونکہ روایت ہے کہ ہر اہم واقعہ چودھویں کی

لیکن قلب و نظر کی اس بزم میں خوشبو اور دھوئیں کی طرح اپنے وجود میں مٹا دینے کے بجائے صفیہ اختر دل کا خالی پیالہ لئے جاں نثار کے بے پرواہ، بے نیاز دل کے دروازے پر دستک دیتی رہیں۔ اُن کے جذبے کی آگ نے پندار کے کتنے صنم کدے ویران کئے۔ ان کی آرزوؤں نے الفاظ کے نقاب میں چھپ کے کوئے ملامت کے طواف کئے تب ہماری شاعری کی دنیا کے اس بانکے ترچھے محبوب نے شانِ دلبری سے اپنے وجود کے بتکدے میں انھیں شرفِ باریابی بخشا۔

"عزیزم اختر صاحب

آپ کو یہ اجنبی تحریر دیکھ کر حیرت ہوگی اور واقفیت ہونے پر کیا احساس پیدا ہوا اس کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔"

اِس سہل تمہید کے اٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے آپ کی جانب سے ایک تحریک ہوئی۔

اِس خواہشمندی کے بعد ایک طویل خاموشی نے مجھے یقین دلایا کہ آپ کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اور آپ نے دامن سمیٹ لیا۔

میری مسلسل ذہنی کوفت کا نتیجہ اس تحریر کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ آخر ش عورت بھی کسی قسم کی قوتِ احساس وغیرہ رکھتی ہے لسنے آپ لوگ بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس تحریر کو آپ کس قدر اہمیت دیں گے۔ لیکن کم سے کم یہ توقع ضرور ہے کہ بے جا رسوائی نہ کیجیے گا۔!" (حرفِ آشنا ص ۱۸-۱۹)

شادی کے بعد صفیہ آپا نے اپنے شوہر کو ٹوٹ کے چاہا۔ شادی کے پہلے اور شادی کے دس بارہ ہفتے بعد تک پیار کرتے ہیں تو کو دیکھا اور سنا مگر زندگی کے آخری لمحے تک ایسی شیفتگی ایسا والہانہ پن بس صفیہ کی تقدیر اور جاں نثار کی قسمت تھی۔

شادی کے بعد دو خوش نصیب سال ایسے تھے جنہوں نے صفیہ آپا کو اپنے محبوب کی قربت عطا کی۔ باقی تو سب فرقت کے دن تھے اور ہجر کی راتیں جنہیں صفیہ آپا نے قطرہ قطرہ پگھل پگھل کے گذار دیا۔ ان کے وجود کے ایک ایک قطرے کو ٹپکتے ہوئے ہم اُن کے خطوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

وہ کیسے تڑپ تڑپ کے صبح شام خط لکھتی تھیں۔ چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ اختر صاحب کی خوشی اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ تھی۔ اور اختر صاحب کا غم ان کے آنسو۔ اس والہانہ عشق اور بے پناہ پرستش نے اختر صاحب کو انسانوں کی دھرتی سے اُٹھا کے مندر کے طاق پر بٹھا دیا۔ وہ اپنی تیسری آنکھ کھول کر بے نیازی سے محبت اور عبادت کے نذرانے قبول کرتے۔ چار چار پانچ پانچ خطوط کا جواب تین چار سطروں میں دے کر پھر آنکھ بند کر لیتے۔۔ اور ۔ صفیہ!

ان کے اس بت کو صفیہ کی زندگی بھر کی عبادت اور ریاضت نہیں توڑ سکی۔ توڑا تو اُن کی موت نے۔ "خاکِ دل" درد میں ڈوبی ہوئی ایسی شکست کی آواز ہے جو ہر دل میں نشتر بن کے اتر جاتی ہے۔

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زارِ وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں

"اچھا تو یہ اُن کی بیوی ہیں" مگر انداز قطعی بیویوں والا نہیں۔ نہ وہ رعونت، نہ وہ ٹھسّا، نہ وہ احساسِ تسخیر۔!
کس عقیدت سے سن رہی ہیں۔ جیسے میاں کی نظم نہیں نعتِ رسول ہو۔ اور کیسی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ اور کیسی مسرت، کیسی سرشاری چھائی ہے۔ گویا جانِ دلفریبیٔ عنواں پہ نذر ہے۔!! یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اور جب یہ پہلی ملاقات لاتعداد ملاقاتوں کے قالب میں ڈھل گئی تو یہ ایک نہیں ایسے بہت سے عجیب و غریب ماجرے سامنے آتے گئے۔!

اکتوبر ۵۳ء سے لے کر اس گھڑی تک یعنی ۴ مارچ ۵۴ء رات کے تین بج کر پچیس منٹ تک (اگر خدا کے نیک بندے اس گھڑی پر رات کے بجائے صبح کا فتویٰ دیتے ہوں تو راقم الفضول کو قطعی اعتراض نہیں۔!) اختر صاحب کتنی مرتبہ بھوپال آئے۔ کتنی مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کیا سنایا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ کاش امتحان کی اس گھڑی کی پہلے سے خبر ہوتی تو پولیس کے روزنامچہ کی طرح ایک ایک بات مع مثالوں کے داخل دفتر کر لیتی۔!

کچھ زیادہ یاد نہ ہوتے ہوئے بھی اتنا ضرور یاد ہے کہ دھیرے دھیرے ان کی آمد پر "ہلال منزل" (اختر صاحب کی سسرال) میں میری آمد معمول بنا دی گئی۔ کبھی جذبۂ شوق کشاں کشاں لئے جاتا۔ اور کبھی حکمِ حاکم۔!

"ہلال منزل" کے لمبے دیوان خانے میں دیوار سے لگا تخت بچھا ہے اور اس کے دائیں بائیں صوفوں اور کرسیوں کی لمبی قطاریں۔ تخت کو تختِ طاؤس کا درجہ عطا کرتے ہوئے بے شمار تکیوں اور گاؤ تکیوں کے سہارے اختر صاحب نیم دراز ہیں۔ اس سادگی سے جس میں پُرکاری بھی ہے خود پہ ایسی بے خودی طاری کئے ہوئے جس میں ہوشیاری اور ہوشمندی بھی ہے سلگتا ہوا سگریٹ ہاتھ میں ہے اور بجھے ہوؤں کا ڈھیر ایش ٹرے میں۔!! آس پاس مداحوں کا، عقیدتمندوں کا۔ دوستوں کا جمگھٹ ہے جیسے راجہ اندر کا دربار لگا ہو! دھیمے دھیمے سُر میں تھمے لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ دبے دبے قہقہے لگا رہے ہیں کبھی آپ کی داردائیں سن رہے ہیں کبھی اپنی داستانیں سنا رہے ہیں۔ کالج کے قصے، فلم انڈسٹری کی باتیں، شاعروں اور مشاعروں کی حکایتیں۔ ان کی صبح نیچے تلے قدم رکھتی ہوئی ان کی شام کی حدوں میں داخل ہو رہی ہے۔ اس صبح سے اس شام تک چائے کے پیالے کھنک رہے ہیں اور کھانے کے برتن کھڑک رہے ہیں۔ لوگ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں مگر گرمیٔ بزم میں ذرا کمی نہیں۔ گفتگو اب بھی جاری ہے۔ کیونکہ ان کی گفتگو میں زندگی بھی ہے اور زندہ دلی بھی۔ آنکھوں میں اپنائیت بھی ہے اور محبوبیت بھی۔

یہ محبوبیت یہ چاہے جانے کی تمنّا۔ یہ پرستش کا جذبہ یہی اُن کا رنگ ہے۔

ہو گیا شاید میرا ذوقِ تجسّس کامیاب — آج خود مجھ پر پڑی میری نگاہِ انتخاب

نام جاں نثار ہے مگر اپنے نام کے مفہوم میں ڈھلنے کے بجائے دوسروں کی جان خود پر نثار کروانے کا جذبۂ بے اختیار رکھتے ہیں۔ یہ طالب نہیں مطلوب ہیں۔ سرتاپا ناز ہیں اور ناز والے نیاز کیا جانیں۔!

کچّی عمر میں دو ایک عشق ضرور کئے ہیں جس میں آہیں اور سسکیاں تو ہیں مگر وہ سوز نہیں کہ جو رگ رگ سے لہو ٹپکا دے! ناکامی کے ایک ہی جھٹکے سے جنونِ عشق کے سارے انداز چھوٹ گئے۔ اور ان کی ہوشمندی نے ان کا وہ پیکر تراش دیا جس کا سنگِ آستاں اوروں کے نشانِ سجدہ سے گھسنے لگا۔

اپنی زندگی کی رفاقت کے لئے صفیہ اختر کا نام خود انھوں نے تجویز کیا۔ یہ عشق کی دیوانگی ہرگز نہیں تھی علم کی فرزانگی تھی بہرحال یہ فرزانگی ہو یا دیوانگی یہ ادائے کافرانہ ملاحظہ فرمائیے کہ اس التفاتِ نظر کے بعد بے نیازی۔ یعنی انکار۔ دوسرے سال پھر پیام بھیجا۔ اور پھر وہی انداز ___ کہ

"بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا"

بمبئی میں ابھی پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن صفیہ آپا نے سارے غم اپنے آنچل میں جھیل لئے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ خدیجہ سے شادی ہونے کے بعد بھی بہت سے نشیب و فراز سے زندگی کا قافلہ گزرا اور صفیہ کی طرح خدیجہ نے بھی وقت کی کڑی دھوپ سے اختر صاحب کو بچانے کے اپنا آنچل پھیلا دیا۔ یہ آنچل اب بھی پھیلا ہے اور دعا کے لئے ہاتھ اب بھی اٹھے ہیں کہ "الٰہی ہر بلا سے محفوظ رکھیو"

اس مخصوص محبت اور پرستش کو جو ہندوستانی عورت کا تو مقدر ہے مگر شاعر کا نصیب نہیں۔ اس محبت اور محافظت اس خانگی سکون اور ہم آہنگی نے اختر صاحب کی فطرت میں ایک خاص نرمی۔ دھیماپن۔ توازن۔ رکھ رکھاؤ۔ تہذیبی قدروں کی پاسداری۔ متانت اور دلنوازی پیدا کر دی ہے۔ ان کے کلام کے بڑے حصے میں اسی نرمی، رچاؤ اور دلنوازی کی جھلک ہے جو کہیں کہیں احساس کی شدت پر بھی پہرے بٹھا دیتی ہے۔

ناظرین با تمکین اس بندگی اور اخلاقی قدروں کی سرپرستی نے نظروں کو بہکنے کے آداب سکھلا دئے ہیں اور ان کی اٹکھیلیوں کے لئے ایک حصار کھینچ دیا ہے ــــ اسی لئے نظریں بار بار خدیجہ کی نیلی پیلی ساڑیوں میں الجھی رہتی ہیں ــــ ان کی مشین چلاتے ہوئے۔ بٹن ٹانکتے ہوئے۔ آٹا گوندھتے ہوئے۔ توے پہ روٹی ڈالتے ہوئے ہاتھوں پر اٹکتی ہے اور دل کے دروازے پر ان دھڑکنوں اور سانسوں کی دستک سنائی دیتی ہے جو بیوی کے سینے میں ہلچل مچائے دیتی ہیں۔ اور یہ ادراک یہ احساس "گھر آنگن" جیسی نازک لطیف، اور بے حد جانے پہچانے موضوعات کو جنم دیتا ہے۔ یہ اردو شاعری میں گراں بہا اضافہ ہے۔ یہ وہ انمول موتی ہیں جس سے اردو کا خزانہ خالی تھا۔ ★

"جاں نثار اختر کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔

اختر صاحب ایک مکمل انسان، ایک بہت ہی پیارے دوست، ایک درد مند دل رکھنے والے ہیں۔ اردو شاعری اور اردو ادب اختر صاحب پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ ایسے خوبصورت خیالات اور اتنا صاف ستھرا ذہن رکھنے والے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"

جمیلہ بانو

ہر شعر کے ساتھ اختر کی محبوبیت کا بُت ٹوٹتا جاتا ہے اور آخر میں ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتا ہے۔

چوم کر آج تیری خاکِ لحد کے ذرّے
ان گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گذر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں

لیکن وقت اس بکھرے ہوئے ایک ایک ریزے کو اپنی پلکوں سے اٹھالیتا ہے۔ اپنی سانسوں سے اس میں نئی روح پھونک دیتا ہے اور سال بھر بعد جب اختر صاحب صفیہ کی قبر پہ جاتے ہیں تو صفیہ کی خاموش آواز پھر اپنے اس خدا — اپنے صنم کی بارگاہ میں ہزار سجدے کرتی ہے۔ پھر وہ عاشق ہے اور اختر صاحب محبوب —— !

دل کی دھڑکن ڈوب بھی جائے
دل کی صدائیں تھک نہ سکیں گی
مٹ بھی جاؤں پھر بھی تم سے
میری وفائیں تھک نہ سکیں گی

آج تمہارا رستا تکتے
میں نے پورا سال بتایا
کتنے طوفانوں کی زد پر
میں نے اپنا دیپ جلایا

اس خاموش آواز کے ساتھ اختر صاحب کی زندگی کا ایک تار بے آواز ہو گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد دوسرا تار صدا دینے لگا۔

خدیجہ کے لئے اگر اختر صاحب کے دل میں پسندیدگی اور آنکھ میں لگاوٹ تھی تو خدیجہ کے دل میں شعلے لپک رہے تھے اور نگاہوں میں سیکڑوں سجدے تڑپ رہے تھے۔ اور یہ جاں نثار کی خوش قسمتی تھی اور اختر (شاعر) کی بدقسمتی کہ وہ عاشق بننے سے پہلے پھر محبوب بنا دیا گیا۔

صفیہ آپا کی طرح خدیجہ نے بھی اختر صاحب سے بے محابا عشق کیا ہے۔ انہیں کی طرح اختر صاحب کی پرستش کی ہے انھیں کی طرح روئیں روئیں سے ایک سانس سے ان کی عبادت کرتی ہیں۔ دیوانوں کی طرح خدمت کرتی ہیں اور فرزانوں کی طرح خود کو مٹا کے ان کو بنا رہی ہیں بالکل ایسے ہی جیسے صفیہ آپا نے مٹایا اور صفیہ آپا نے بتایا ۔ !

اسی لئے "گھر آنگن" کو خدیجہ کے نام منسوب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

خدیجہ کے نام
جو
میرے لئے صفیہ کا دوسرا روپ ہے۔

صفیہ آپا کی زندگی کے آخری چند سالوں میں اختر صاحب مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ بھوپال کی ملازمت ختم ہو چکی تھی اور

آدمی نہیں تھا جس سے ادب کی باتیں کرتا۔ وقت نکال کر کچھ پڑھ لیتا۔ کوئی بھولا بھٹکا آ جاتا تو اس سے باتیں کر لیتا۔ اور وقت نکال کر کچھ لکھ لیتا۔ بس یہی ادبی سرگرمی تھی۔

لیکن روشن پہلو یہ تھا کہ ہر تین چار مہینے پر دہلی جانا ہوتا تھا اور وہاں دس پندرہ دن قیام ہوتا تھا۔ اُس زمانہ کی دہلی بھری ہوئی تھی اور رانچی میں جو تشنگی رہتی تھی وہ دہلی میں آکر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجازؔ نے ملازمت چھوڑ دی تھی اور اُن پر وارفتگی کا عالم تھا۔ شراب نوشی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور احباب کترانے لگے تھے۔ اُن دنوں وہ لکھنؤ کو چھوڑ کر دہلی چلے آئے تھے اور ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے ساتھ ان کا قیام تھا۔

میں جب دہلی میں ہوتا تھا تو میرا قیام انجمن ترقی اردو کی عمارت میں ہوتا تھا۔ انجمن کا دفتر ڈاکٹر انصاری کی شاندار کوٹھی میں دریا گنج میں تھا۔ مولوی عبدالحق اور پنڈت دتاتریہ کیفیؔ کا قیام بھی اُسی عمارت میں رہتا تھا جب میں دہلی میں رہتا تو بالکل پیچھے کی جانب ایک کمرے میں رہتا تھا۔

مولوی عبدالحق کا زیادہ تر وقت کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ اور ضائع کرنے کے لئے اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اگر وہ کام کرتے ہوتے اور کوئی ملنے آجاتا تو انہیں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اُن دنوں مجازؔ نو بجے دن کو انجمن کے دفتر پہنچ جاتے اور مولوی صاحب سے باتیں شروع کر دیتے تھے۔ مولوی صاحب مجازؔ کو بہت مانتے تھے لیکن تنگ بھی رہتے تھے۔ اُن کا وقت خراب ہوتا تھا۔ اور یہ بات انہیں بڑی ناگوار ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ مجازؔ پر اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے لاابالی پن کے باوجود انہیں پیارے تھے۔

ایک بار میں دہلی پہنچا۔ مولوی صاحب سے باتیں ہوئیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا "اچھا ہوا تم آگئے۔ میری جان بچے گی۔ اب مجازؔ آئیں گے تو تمہارا وقت خراب کریں گے۔" دہلی میں میرے پاس ان دنوں کچھ زیادہ کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑا بہت کام ہوتا تھا اور مولوی صاحب سے ہدایت لینے جانا ہوتا تھا۔

ایک دن صبح کا ناشتہ کر کے اٹھا ہی تھا کہ مجازؔ آگئے اور مجھے دیکھ کر لپٹ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جاں نثار اور جذبیؔ بھی دہلی میں ہیں۔ مجازؔ بہت بدلے ہوئے تھے۔ باتوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور باتیں بھی بے ترتیب۔ لکھنؤ کی باتیں کرتے کرتے یکایک علی گڑھ کی باتیں کرنے لگتے اور وہاں سے پھر کہیں اور کی بات۔

اُسی دن شام کے وقت مجازؔ کے ساتھ جاں نثار آئے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ جاں نثار علی گڑھ سے ایم۔ اے کر چکے تھے اور جذبیؔ بھی۔ دونوں کو ملازمت کی تلاش تھی۔ جذبیؔ سرائے روہیلہ میں اپنے کسی عزیز کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ اور جاں نثار، شان الحق حقی کے ساتھ۔ حقی، دہلی کے ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے۔ جو صدیوں سے علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ شان الحق کے والد بزرگوار مولانا احتشام الحق مولوی عبدالحق کے دوست اور دست راست تھے۔ وہ انجمن کے لئے اردو لغت کا کام کر رہے تھے۔ شانؔ نے ایم اے کر لیا تھا لیکن ملازمت نہیں شروع کی تھی۔ یعنی بیکاروں کی ایک ٹولی تھی۔ مولوی عبدالحق غروب آفتاب کے بعد کھانا کھا لیا کرتے تھے اُس وقت تک میری حاضری ضروری تھی، اُس کے بعد آزادی۔ پھر یہ چوکڑی کبھی جامع مسجد، کبھی چاندنی چوک اور آخر میں تراہا بہرام خاں میں گیارہ بجے رات تک بے معنی اور کبھی با معنی باتیں کرتی رہتی۔

ہم سب لوگ گہرے دوست بن چکے تھے۔ عمر بھی لگ بھگ ایک تھی۔ اُن دنوں جاں نثار کو کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا مجھے جاں نثار کی شخصیت میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ بکھرے ہوئے بال، چہرے کے نقوش تیکھے۔ لاابالی پن کے باوجود بیحد پیاری شخصیت ہر لحاظ سے ایک خوبصورت فنکارانہ شخصیت تھی اُن دنوں جاں نثار اختر کی۔

جاں نثار اختر اُن دنوں ایک دوست کی حیثیت سے عزیز تھے ہی لیکن میں اُن کی شاعری کا بھی بے حد دلدادہ تھا۔ وہ میرے

سہیل عظیم آبادی

بیتے دن

وہ خیال و خواب کی رعنائیاں جاتی رہیں
جن کو چھو لیتے تھے وہ پرچھائیاں جاتی رہیں
وہ "ندیم و مطرب و ساقی" کہاں گم ہو گیا
خلوتوں کی انجمن آرائیاں جاتی رہیں

(جاں نثار اختر)

بیتے دنوں کی یاد عجیب ہوتی ہے۔ جب آتی ہے تو دل کو تڑپا جاتی ہے اور کبھی کبھی تو کسی پیاری اور خوشگوار یاد کے آتے ہی دل اقبال کے لفظوں میں بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

لیکن گردشِ ایام کی رفتار مقرر ہے۔ وہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں لوٹتی۔ ماضی کی طرف اپنا رخ کبھی نہیں کرتی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے ادب کے آسمان پر بہت سے ستارے بکھیر دئے تھے۔ نئے لکھنے والے، نئے خیالات، نئے حوصلے اور نئے ارادوں کے ساتھ تخلیق ادب کے میدان میں آئے تھے۔ اُن کا رنگ نیا تھا، اُن کا انداز نیا تھا، اُن کی آواز نئی تھی۔ اُن نئے شاعروں میں مجاز، جاں نثار اختر اور جذبی کا چرچا تھا۔ مجاز کی مقبولیت اُن دنوں انتہا پر تھی۔ اور وہ اکثر مشاعروں میں پٹنہ آتے تھے۔ اُن سے ملاقات ہوتی تھی اور پھر گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔ گرچہ وہ مجھے دوست بھی کہتے تھے اور دشمن بھی۔ دشمن اس لئے کہ میں انہیں زیادہ پینے سے روک دیا کرتا تھا۔ اور وہ رند بلانوش تلملا کر رہ جاتا تھا۔ جاں نثار اور جذبی سے ملاقات نہیں تھی۔ گرچہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اس زمانے کی ادبی تحریک نے ہم سب کو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے کافی قریب کر دیا تھا۔ مجاز سے جاں نثار کا ذکر بار بار سنا تھا۔ لیکن ملاقات نہیں تھی۔

اچانک جاں نثار اور جذبی سے بھی دہلی میں ملاقات ہو گئی۔ غالباً ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ میں اُن دنوں انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ تھا۔ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ میرے ذمہ اردو کی اشاعت اور تعلیم کا شعبہ تھا۔ رانچی بہار میں چھوٹا ناگپور اردو مرکز انجمن ترقی اردو کا ایک شعبہ تھا۔ ہم چھوٹے چھوٹے اسکول، شبینہ مدرسے اور تعلیمی مرکز قائم کرتے تھے۔ اور غیر اردو داں طبقے کو اردو پڑھانے کا انتظام کرتے تھے۔ اُس وقت کا رانچی آج کے رانچی سے بالکل مختلف تھا۔ میں وہاں چلا تو گیا اور کام بھی کر رہا تھا۔ لیکن عجیب قسم کی تنہائی محسوس کرتا تھا۔ کوئی آدمی ایسا

جہاں قدر چغتائی

جاں نثار اختر

اگر مسلمان تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہیں تو جاں نثار اختر زلفوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندوستان میں عام طور پر مسلمانوں میں خاص طور سے سخت مذہبی ماحول تھا۔ مضطر خیرآبادی کے گھر کا ماحول بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ مضطر خود پکے مسلمان تھے۔ ان کا گھر 'نیاز و درود' کا مرکز تھا۔ ہر سال پابندی سے محفلِ میلاد منعقد ہوتی تھی جس میں شہر کے سنجیدہ، متین اور بزرگ لوگ شریک ہوتے تھے۔ مضطر ہر محفل میں نئی نعت کہتے۔ اور انھوں نے اتنی نعتیں کہی ہیں کہ دو نعتیہ دیوان مرتب ہو جائیں۔

مضطر کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ شاعری کی شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو جس میں انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ایسے شعری اور مذہبی ماحول میں جاں نثار نے آنکھ کھولی۔ محرم کے دس دن سبز کپڑے پہنے اور فقیر بنے پھرے۔ تعویزوں کی مالا گلے میں پڑی ہوئی، سر پر ہر وقت ٹوپی منڈھی ہوئی۔ نماز و روزہ نہ صرف ضروری بلکہ لازمی۔ لباس بھی وہی جو عام طور پر مسلمان بچوں کا ہوا کرتا تھا۔ جاڑوں کے موسم میں روئی کی موٹی جاکٹ، کان کنٹوپ میں چھپے ہوئے۔ تنگ موری کا پاجامہ اور انگرکھا۔ اس دور کا تقاضہ ہی شاید یہ تھا کہ سر کے اصلی بال کاٹ دئے جاتے تھے اور مصنوعی بالوں کی ٹوپی سر پر لگائی جاتی تھی۔ وہ زمانہ اصلی معنوں میں اولاد پر والدین کی تاناشاہی کا زمانہ تھا۔ بچوں کی گفتار و رفتار پہ بڑے کڑے پہرے تھے۔

لڑکے اور لڑکیاں، عزیز اور رشتہ دار مضطر کے بڑے گھر میں ایک ساتھ رہتے اور کھیلتے تھے۔ جب لڑکیاں سیانی ہونے لگتیں تو ان کی بانہیں پکڑ کر ان بچوں کی محفلوں سے باہر کھینچ لیا جاتا تھا۔ جاں نثار مذہبی دباؤ تو دیر تک سہہ سکتے تھے لیکن لڑکیوں کو اس طرح آنکھوں کے آگے سے چھپا دیا جانا ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس طرح مذہب اور عشق میں جنگ شروع ہو گئی۔

۱۹۳۷ء میں آخری عید کی نماز پڑھی اس کے بعد نہ پڑھی نہ قضا کی۔ گوالیار سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جاں نثار اختر علی گڑھ چلے گئے اور ان کے ساتھ چلی گئیں لڑکپن کی یادیں اور وہ صورتیں اور شکلیں جو اُن کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں شاعری تو گھٹی میں پڑی تھی۔ علی گڑھ نے شاعری پر مزید پالش کر دی۔ غزل نے نظم کا جامہ اختیار کر لیا۔ تھوڑے دن بعد جاں نثار اختر کی شاعری میں ایک 'نیا چہرہ' ناہید کا نظر آنے لگا۔ لیکن جاں نثار کے لئے یہ چہرہ نیا ہرگز نہ تھا۔ لڑکپن کا زمانہ اس چہرے سے واقف تھا۔ گھر کے صحن میں، آنگن میں، کمرے اور دالان میں اس کی آوازیں گونج چکی تھیں۔ معصوم شرارتیں بجلیاں کوندا کر چکی تھیں۔ جاں نثار کی نظموں نے شہر بھر میں ناہید کے نام کا ڈنکا پیٹ دیا۔ ناہید کے گھر والوں کو نام کا چرچا ایک آنکھ نہ بھایا اور نتیجہ میں محرومی کے سوا جاں نثار کے ہاتھ کچھ نہ لگ سکا۔ 'سپہرِ انجم' کا ظہور جاں نثار کی نظموں میں ہوا۔ کچھ دنوں بعد یہ ستارہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ان واقعات نے جاں

پسندیدہ شاعروں میں تھے۔ ان کی شاعری کو میں بے حد پسند کرتا تھا۔ ایسی شاعری جسے سن کر دل کی نیا ڈگمگانے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری کا جو صاف ستھرا رچاؤ اور بات کہنے کا جو سلیقہ جاں نثار کے یہاں ہے ویسی مثال ہمارے یہاں کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ جاں نثار کا کلام سنتا تھا اور خاص کر ان کی زبانی تو ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے دل کے تاروں کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو البتہ جاں نثار سے مجھے ایک شکایت ضرور تھی اور وہ یہ کہ وہ کم کیوں کہتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے شعری سرمائے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کریں۔ تاکہ آگے چل کر یہ ہماری زبان کے شعری ادب کا قابلِ قدر اور عظیم سرمایہ ہو۔ بہر کیف جاں نثار کے ساتھ اُن دنوں کافی ساتھ رہا اور ان کی فنی اور شخصی دونوں حیثیتیں مجھے محبوب رہیں۔

پھر جاں نثار کی شادی صفیہ سے ہو گئی اور وہ بھوپال چلے گئے، پھر بمبئی۔ اور ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ لیکن دل کا رشتہ آج بھی قائم ہے اور کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ البتہ ملک کی تقسیم نے زندگی بدل دی۔ مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ انجمن کی سرگرمیاں کچھ دنوں کے لئے ختم ہو گئیں اور حالات نے مجھے رانچی چھوڑ کر پٹنہ آنے پر مجبور کر دیا۔ میری زندگی ادبی سے زیادہ سیاسی بن گئی۔ یعنی افسانہ نگاری کے بدلے روزانہ اخبار کی ادارت۔ بس کبھی بھولے بھٹکے کسی شاعر یا ادیب سے ملاقات ہو گئی اور جاں نثار تو بہت دور یعنی بمبئی رہے۔ بہت دور کا لفظ میں نے عمداً استعمال کیا ہے۔ فلمی زندگی سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ایک بار جب لٹ پٹ گیا تھا اور ضرورت تھی تو قسمت آزمائی کا شوق ہوا تھا لیکن دوستوں کے حالات سنے تو دور ہی رہا۔

پھر ۱۹۵۳ء میں جاں نثار سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں دہلی میں ہوئی۔ ہم دونوں کافی محبت اور گرمجوشی سے ملے۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے شریک ہوئے تھے۔ فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی سردار جعفری، مہندر ناتھ۔ وامق جونپوری۔ جذبی، مجروح، رضیہ سجاد ظہیر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ سے بھی اس تاریخی اجلاس میں ملاقات ہوئی تھی۔

اس کے بعد ۶۲ء میں جاں نثار سے ملا۔ یہ ملاقات کہاں ہوئی تھی یاد نہیں۔ اس کے بعد آخری ملاقات ان سے دہلی میں ہوئی اُن سے مل کر دلی مسرت کا احساس ہوا۔ اور الگ ہوتے وقت دل بھر آیا۔

جاں نثار اختر اور دوسرے دوستوں کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی یاد میری زندگی بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اب اتنے دنوں بعد یہ ممکن نہیں کہ ساری باتیں یاد رکھی اور دہرائی جائیں۔

جاں نثار میرے خاص دوستوں میں تھے اور آج بھی ہیں۔ ادھر اُن کی شاعری میں جو نیا موڑ آیا ہے وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ اُن کی شاعری میں آج کے انسان کا کرب صحیح طور پر ملتا ہے اور اُن کی شاعری میں اس عہد کا صحیح شعور موجود ہے۔ اس بات سے مجھے بے حد خوشی ہے کہ وہ ان دنوں خوب کہہ رہے ہیں۔ اس طرح میری دلی آرزو کی تکمیل ہو رہی ہے۔ آج کل ان کی رچی ہوئی غزلیں پڑھتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں۔ خدا کرے اُن کا یہ تخلیقی سفر اسی طرح کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔ سنتا ہوں کہ وہ خوش ہیں۔ پھر دیکھوں کب ملنا ہوتا ہے۔ پیاروں سے ملنے کو جی تو بہت چاہتا ہے لیکن انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہے — ✶

کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ ایک بار میں نے کوٹ پتلون پہننے کا مشورہ دیا تو مجھے جواب ملا ـ میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں سوانح نگار یہ جملہ لکھے "مرحوم آخری عمر میں سوٹ پہننے لگے تھے"۔ روٹی کپڑا ملک کے لئے کتنا ہی بڑا مسئلہ کیوں نہ ہو جاں نثار کے لئے بہر حال یہ کوئی مسئلہ نہ تھا نہ اب ہے۔ جاں نثار کو بھی غالب کی طرح کھانے کی نہیں پینے کی فکر رہتی ہے۔ ان کی ساری زندگی امید و بیم کے درمیان گزری ہے۔ صبح کو شام کی فکر نہیں کرتے۔ دوسروں کی برائی اور غیبت کم سے کم کرتے ہیں۔ غصہ کرنا کم آتا ہے۔ غصہ کی حالت میں بھی آواز بلند نہیں ہوتی۔ جملہ کی ساخت اور لہجہ کا انداز ایسا ہوتا ہے جس سے غصہ کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ بیمار رہنا پسند ہے لیکن منت کش دوا ہونا پسند نہیں کرتے جب سے ریل کے سفر میں ٹکٹ کی دشواری پیدا ہو گئی ہے تب سے سفر اور ٹکٹ کا خیال پہروں بے قرار رکھتا ہے۔ ٹیلی فون پر بات کرنا اور ہوائی جہاز سے سفر کرنا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے۔

جاں نثار کی "موم دلی" کا تجربہ اس دن ہوا جب انھوں نے لکھنؤ سے واپسی پر "خاکِ دل" پہلی بار مجھ کو سنائی۔ بچوں کی طرح آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔ ایک اور بڑی خوبی میں نے جاں نثار میں دیکھی وہ یہ کہ اپنی کمزوری چھپاتے نہیں، دوسروں کی کمزوریاں بتاتے نہیں۔

جاں نثار اختر ایک حقیقت پسند اور ذمہ دار شوہر ہیں لیکن گھر کے معاملہ میں جس قدر ان دنوں فکر مند رہتے ہیں پہلے نہ تھے۔ اس کی وجہ وہ حالات بھی رہے ہوں گے جن سے وہ گزر رہے ہیں۔ اس دور میں اچھے اچھوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا یہ نہ کبھی نون تیل لکڑی کے چکر میں پڑے نہ آج ہیں۔ باپ کا کردار بھی انہوں نے خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ اپنے دونوں بیٹوں کے لئے برابر کسی نہ کسی طرح خرچ کی رقم پہنچاتے رہے ہے۔

جاں نثار کی ذات کسی انجمن سے کم نہیں۔ ہزاروں قصے کہانیاں اور لطیفے ان کو یاد ہیں ہزاروں اشعار حفظ ہیں پھر انداز بیان اور ہی ہے۔ رات گئے تک محفلیں گرم رہتی ہیں اور جاں نثار میر محفل بنے رہتے ہیں۔ یادداشت بہت اچھی ہے۔ پرانی سے پرانی غزل، طویل سے طویل نظم ان سے سن لیجئے۔ مگر چند دنوں سے یادداشت پہلے جیسی نہیں رہی۔

جاں نثار کے ملنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے کوئی شخص بھی اتنے لوگوں کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ لیکن یہ ہر شخص سے ملتے وقت اس طرح پیش آتے ہیں جیسے یہ اس کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بات جانتے ہی نہیں یہ شخص کون ہے؟ جس سے وہ باتیں کر رہے ہیں۔ ایسے شخص سے باتیں کرتے وقت ان کا بڑا دلچسپ انداز ہوتا ہے ڈرتے بھی جاتے ہیں کہ کہیں بھید نہ کھل جائے۔ چنانچہ اس شخص پر سوالوں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں اگر اس شخص نے پوچھا اختر صاحب، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ تو بڑے مسکراتے ہوئے لہجے میں یگانوں کی طرح کہیں گے ارے واہ بھئی کیوں نہیں پہچانا۔ بھلا کوئی اپنے ملنے والوں کو بھلا سکتا ہے۔ میری یادداشت اس سلسلے میں بہت اچھی ہے ایک بار جس سے ملاقات ہو جائے برسوں بعد بھی اس کو پہچان لیتا ہوں۔ اور کہو آج کل کہاں ہیں آپ؟ کیا کر رہے ہیں؟ یہ دو سوال اس لئے کہ جواب ملنے پر شاید کوئی حوالہ مل جائے۔ ملنے والا کبھی تو سمجھ لیتا ہے بشرطیکہ سمجھ دار ہو کہ دھول میں لٹھ گھما رہے ہیں۔ اور وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے اس ذیل میں مزید معلومات نہ کرے۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے بھوپال سے بمبئی ضروری ہی جانا تھا۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ مل سکا۔ لیکن ٹکٹ لانے والے نے کسی غلام علی بھائی کا ٹکٹ جاں نثار کو لا کر دے دیا۔ اس شخص کو ٹکٹ کی رقم بھی ادا کر دی۔ تھوڑی دیر بعد میں پہنچا اور ٹکٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ بہت پژمردہ انداز میں بولے۔ ٹکٹ تو مل گیا ہے مگر بمبئی میں نہیں، غلام علی بھائی جائیں گے۔ اگر راستہ میں کسی نے میرا نام پوچھا تو مجھے اپنا نام غلام علی بھائی بتانا پڑے گا۔ نہیں بھائی میں غلام علی نہیں بن سکتا۔ اور وہ ٹکٹ شام کو واپس کرا دیا۔

کالج کے زمانہ کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ساغر نظامی اختر صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے کالج کے مشاعرے میں مدعو کئے

نثار اختر کی شاعری کو آنچ دے گیا اُبال دیا، جس کی بدولت جاں نثار کی شاعری میں 'محبت' کی شدت اور واقعات قلبی میں ایک قسم کی تڑپ نمایاں ہونے لگی۔ حسن کے شعلے آنچ دیتے رہے۔ دامن بچانے کی کوشش کے باوجود دامن جلتا اور جھلستا رہا۔ جاں نثار کو تلاش تھی ایک چارہ ساز کی، غمگسار کی، ایسا چارہ ساز بھی دور نہ تھا جاں نثار کے گھر کے قریب ایک اور گھر تھا جہاں حکیم مومن خاں مومن کی نواسی فاطمہ زبیر رہتی تھیں وہی تنہا جاں نثار اختر کی ہمدم و دمساز تھیں۔ یہ وہی فاطمہ زبیر ہیں جنھوں نے 'حرف آشنا' کا دیباچہ لکھا ہے۔ اختر اور فاطمہ زبیر ایک طویل عرصہ تک محض دوست اور ہمدرد بنے رہے۔ اختر کی اپنی الجھنیں تھیں فاطمہ زبیر کی پریشانیاں علیحدہ نوعیت کی تھیں۔ وقت گزرتا گیا اور ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ زبیر اور فاطمہ زبیر کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا قدرتی طور پر اختر اور فاطمہ زبیر کا درمیانی فاصلہ کم سے کم تر ہوتا گیا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ایک دن ایسا بھی آیا کہ فاطمہ زبیر جاں نثار کا گھر چھوڑ کر میرے گھر چلی آئیں۔ ہم چار بہن بھائیوں میں یہ سب سے بڑی تھیں لہٰذا ڈیڑھ سال تک فاطمہ آپا کا حکم میرے گھر پر چلتا رہا۔ اسی دور فراق میں جاں نثار کے کئی پھیرے علی گڈھ کے ہوئے اور مجاز مرحوم کی بہن صفیہ بیگم جاں نثار سے شادی کر کے گوالیار آگئیں۔ تھوڑے دن بعد فاطمہ زبیر سے بھی میل ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب جاں نثار اختر گوالیار چھوڑ کر بھوپال آگئے تو فاطمہ زبیر گوالیار میں ہی رہ گئیں جہاں وہ گرلس اسکول میں معلمہ تھیں۔ دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند تحریک جرم قرار دیدی گئی۔ جاں نثار اختر بھوپال میں اس تحریک کے روح رواں تھے۔ بھوپال چھوڑ کر بمبئی میں پناہ گزیں ہوئے اور حمیدیہ کالج بھوپال کی پروفیسر شپ کو خیرباد کہہ دیا۔ چند دن بعد جاں نثار اختر کی جگہ پر صفیہ اختر کا حمیدیہ کالج میں تقرر ہو گیا۔ میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا کے مصداق۔ صفیہ اختر بھوپال آگئیں۔ جاں نثار اختر بمبئی جا بسے۔ پھر کیا ہوا 'زیر لب' میں دیکھئے۔

حمیدیہ کالج میں صفیہ اختر تین سال کے قریب رہیں۔ بیمار ہو کر لکھنؤ چلی گئیں جہاں جنوری ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت بھی بمبئی میں جاں نثار کے حالات بہتر نہ تھے۔ لہٰذا بروقت لکھنؤ نہ پہنچ سکے۔ 'خاکِ دل' وہ نظم ہے جس کو مرنے کے بعد کا سلام کہنا چاہئے۔ ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد جاوید اور سلمان جاں نثار اختر کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آگئے۔ ان دونوں بچوں کو خالہ کے سپرد کر کے جاں نثار پھر بمبئی چلے گئے۔ خالہ لاکھ ماں کی طرح ہو مگر ماں تو نہیں ہو سکتی، اس پر ستم یہ کہ باپ کا پیار کبھی، دور بمبئی میں جا پڑا۔ بچے دونوں ہی ذہین تھے ذہنی طور پر بکھر کر رہ گئے۔ بیوی کی وفات کے بعد جاں نثار اختر تین چار سال تک بمبئی، بھوپال اور لکھنؤ کے درمیان وقفہ وقفہ سے سفر کرتے رہے۔ بھوپال سے خدیجہ ان کو ہمسفر مل گئیں۔ یہ میری بیوی کی بڑی بہن اور ہارون عرب کی سب سے بڑی بیٹی ہیں۔

۱۹۳۰ء میں جاں نثار اختر گوالیار میں جس وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول سے پاس ہو کر نکلے۔ نو برس بعد میں اسی اسکول میں داخل ہوا۔ دو برس بعد ہائی اسکول پاس کر کے وکٹوریہ کالج میں پہنچا جہاں جاں نثار اختر ایم اے پاس کر کے اسی کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ ہم جو پہلے آپس میں دوست تھے۔ استاد و شاگرد ہو گئے اور ۵۶ء میں جاں نثار اختر زلف کے پھندے میں پھنس کر میرے ہم زلف بن گئے۔ تب سے ہم دونوں یا تینوں رشتہ بخیر و خوبی نباہ رہے ہیں۔

جاں نثار اختر نے جس قدر کمایا اسی قدر گنوایا۔ وہ اخراجات بے دریغ کرتے ہیں مگر عیاش نہیں ہیں۔ طبیعتہً سادہ، مرنجاں مرنج کے اصول پر کاربند۔ دوست و دشمن کو ایک ہی میز پر بٹھا کر پیتے اور پلاتے ہیں۔ ترقی پسند اور قدامت پرست دونوں گروہوں سے برابر کا سلوک روا رکھتے ہیں اس لئے دونوں قسم کے لوگ ان سے خوش رہتے ہیں۔ لوگ دوسروں کی پگڑی اچھال کر خوش ہوتے ہیں مگر جاں نثار اختر ریل گاڑی کی کھڑکی سے اپنی ترکی ٹوپی ہوا میں اُچھال کر خوش ہوئے۔ یہ سن اکتالیس کا واقعہ ہے۔ پیروں تلے سے جوتے کب کھسک گئے صحیح تاریخ نہیں معلوم۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آزادی کے بعد کسی نے جاں نثار کے پیروں کو جوتوں میں بند نہیں دیکھا۔ شیروانی حالات نے اتار لی۔ شانے کوٹ نے منت کش نہ ہو سکے۔ اب کرتہ پائجامہ اور چپل لباس ٹھہرا ہے۔ جب اہتمام سے کپڑے پہننا چاہتے ہیں تو ایک کٹ

احسان الحق

ٹوٹے پھوٹے شعر جوڑ والو

روس جاتے ہوئے اختر بھائی دہلی کے مشہور ہوٹل جن پتھ میں دو دن کے لئے رکے۔ میں ایک مدت کے بعد اُن سے ملنے گیا۔ اُن کے بارے میں جیسا سوچا تھا بالکل ویسا ہی پایا۔ ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں صوفہ بھی تھا اور کرسیاں بھی، لیکن وہ حسب عادت پلنگ پر پالتی مارے اس طرح بیٹھے تھے جیسے حقّے کا انتظار کر رہے ہوں۔ کچھ لوگ، کچھ گلاس اور ایک دم توڑتی ہوئی بوتل کے علاوہ دو عدد لڑکیاں تھیں جو دوسری ان گنت لڑکیوں کی طرح ان کی شاعری کی پرستار معلوم ہو رہی تھیں۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی ان کے کھدر کے کرتے پر بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ پکّے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر بار بار اس طرح گر رہی تھی جیسے ان کی شرارت بھری زیر لب مسکراہٹ کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

باتوں کا موضوع پلٹے کھا رہا تھا۔ میں جس وقت محفل میں داخل ہوا ہوں تو ایک لڑکی کہہ رہی تھی "میں آپ پر کچھ لکھ رہی ہوں اس لئے آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اختر بھائی کے ہونٹوں پر چٹکی کاٹنے والی مسکراہٹ پھیل گئی۔ آہستہ سے بولے "اکیلے میں؟" لڑکی بڑی زور سے ہنس دی۔

اس کے بعد موضوع اردو کو زندہ رکھنے کے مسئلہ پر پہنچ گیا۔ میں نے کہا کہ "اردو کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ میرے ناول "کالا شہر گورے لوگ" کا معاوضہ مجھ سے زیادہ کاتب کو ملا تھا۔"

کہنے لگے "بھئی کاتب ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا جزو ہے۔ مولانا آزاد 'غبارِ خاطر' کے کاتب کو ہوائی جہاز سے بلوایا کرتے تھے۔ خود ہم لوگ اچھے کاتب کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ باقر مہدی کی کتاب "آگہی و بے باکی" کے جب پروف پڑھے جا رہے تھے، تو ایک مضمون کے حاشیے میں لکھا تھا "کاتب کا مصنف سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کاتب کے بعد اسے 'تقدیر' کا لفظ اور بڑھا دینا چاہیے تھا۔" "کاتب تقدیر کا باقر مہدی سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔" ویسے مجھے یاد ہے کہ ظ انصاری جب اپنا مشہور رسالہ 'آئینہ' نکالتے تھے تو اُن کے اسٹاف میں بھی سب سے زیادہ جس شخص کی خاطر مدارات ہوتی تھی وہ اُن کا کاتب "سرفراز" تھا۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے جے جے اسپتال کے سامنے آرکیڈیا بلڈنگ کے ایک دس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے میں کچھ لوگ رہا کرتے تھے۔ ان میں ایک اختر بھائی بھی تھے۔ وہ جدوجہد کے دن تھے دال روٹی کے لئے۔ اُن دنوں بھی اختر بھائی دن کے تقریباً بیس گھنٹے اپنے پلنگ پر گزارتے تھے۔ قرض پر گزر ہو رہی تھی اور اختر بھائی چائے والے کا حساب

گئے تھے۔ میں علی الصبح وہاں پہنچا۔ ساغر نظامی، میں اور اختر صاحب کمرے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں رحمٰن (خواجہ سرا) چائے کی ٹرے لے کر آیا۔ جب وہ چائے رکھ کر جانے لگا تو ساغر صاحب نے بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا 'اختر! یار تیرے نوکر کی چال تو غضب کی ہے'۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا 'رشک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے نقش قدم پر چلنے لگئے'۔ ساغر خفا ہو کر بولے۔ 'اختر یہ گستاخ لڑکا کون ہے؟' جواب ملا۔ لڑکا گستاخ ہے مگر مشورہ غلط نہیں دے رہا۔۔ بات مذاق میں ٹل گئی۔

ابھی تک میں نے جاں نثار اختر کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ میں ان کی شخصیت کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ لیکن کیا ایک شاعر کی شخصیت بغیر شاعری کے مکمل ہو سکتی ہے لہٰذا چند باتیں شاعری کے سلسلے میں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کبھی کہ نمبر میں اس کا ذکر بہت زیادہ ہو گا۔

میرے خیال میں شاعر اور پیر و مرشد میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔۔ پیر اڑتا ہے اور مرید اُس کو اڑاتے ہیں، یہی حال شاعر کا بھی ہے۔ وہ مشہور ہوتا ہے۔ اس کے دوست اس کو مشہور کرتے ہیں۔ جاں نثار اختر جس بلندی تک پہنچے ہیں اپنے پروں سے اُڑ کر پہنچے ہیں اُن کو اُڑانے والے نہیں ملے۔ اگر ان کا سارا وقت علی گڑھ میں ہی گزرا ہوتا تو شاید کوئی دوسرا شاعر شہرت میں اس مقام تک پہنچ سکتا جو جاں نثار اختر کو حاصل ہوتا۔ گوالیار کے قیام نے ان کی شہرت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ ادیب اور شاعر کو وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیئے۔ اور جاں نثار نے بھی ایسا ہی کیا۔ حالانکہ وہ حسن و عشق کی باتیں کرنے کا سب سے زیادہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ 'امن نامہ' ہو یا 'ستاروں کی صدا'، 'قصیدہ' ہو یا 'مرثیہ' اشعار کا انداز، بیان کا اسلوب، تراکیب کا ڈھنگ وہی ملے گا جو غزل کے اشعار میں ہوتا ہے۔ جاں نثار کی انقلابی شاعری بھی دلہن کی طرح سنگھار کرتی ہے۔ ہر حالت میں وہ الفاظ کے صوتی اور معنوی پہلوؤں کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ایک مصور کی طرح 'شعر' کی نوک و پلک سدھارتے ہیں۔ ان کی شاعری کا لہجہ نازک ہے۔ الفاظ ترنم پیدا کرتے ہیں۔ یہ خوبی ان کے ہم عصروں میں کم ملتی ہے۔ غنیمت ہے کہ فلم انڈسٹری میں ان کے بہت اچھے دن نہیں آئے ورنہ ہم اُن کی اچھی شاعری سے محروم ہو گئے ہوتے۔ ★

جاؤں۔

ایک دفعہ کرشن چندر کے یہاں پارٹی تھی۔ آخر میں خدیجہ، میں اور دلیپ رہ گئے۔ دلیپ نے کہا کہ اختر صاحب میں آپ لوگوں کو گھر پہنچا دوں گا۔ جاد و پر اس وقت باپ کی محبت کا دورہ پڑ چکا تھا کہنے لگا اختر صاحب کو کوئی چھوڑنے نہیں جائے گا، صرف میں چھوڑنے جاؤں گا۔ اور بالآخر اس نے ہم لوگوں کو دلیپ کی کار سے اتار کر خود گھر پہنچایا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ ذہین لڑکا ہے لیکن بہرحال ابھی لڑکا ہے۔ میں نے کہا "آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں بہرحال باپ ہوں اور باپ اور بیٹے میں جنریشن گیپ ہونا لازمی ہوتا ہے۔"

اختر بھائی کی شخصیت کے گرد ایک اور سیارہ گردش کرتا رہتا ہے اور وہ ہے خدیجہ بھابی کا۔ یہ سیارہ اختر بھائی کے تیزی سے بدلتے ہوئے جوار بھاٹی مزاج کو معتدل بنانے کے کام آتا ہے۔ یہ بفر (BUFFER) کی مانند ہے جس کا کام ٹکراؤ کی شدت کو کم کرنا ہوتا ہے۔

خدیجہ بھابی کا کام اس غصہ گرمی کو برداشت کرنا بھی ہوتا ہے جو کسی پروڈیوسر یا میوزک ڈائرکٹر پر نہ اتارا جاسکا ہو۔ اختر بھائی کی نازک اور حساس طبیعت خانہ داری کے لئے ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ 'گھر آنگن' کی ہیروئن کو ناگواری کے اسباب کا بہت دیر بعد پتہ چلتا ہے۔ ایک دن خانگی غصہ گرمی کے ایسے ہی لمحے پر اتفاق سے میں پہنچ گیا۔ یہ دال روٹی کی اسٹرگل والے دور کی بات ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اختر بھائی، بھابی کے سوٹ کیس سے ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور انتہائی قیمتی ساری نکال کر لائے۔ پھر آرام سے پلنگ پر بیٹھ کر اس کی دھجیاں کرنے لگے۔ بھابی دور بیٹھی دیکھتی رہیں۔ ساری کی چندیوں کا جب ایک بڑا سا ڈھیر پلنگ پر جمع ہو گیا تو ایک سکون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر خاموشی سے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم نہیں کہ آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے یا گھر آنگن کے لئے کوئی گیت لکھ رہے تھے۔ کچھ دن گزر گئے۔ ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے ایک دوکان پر تقریباً ایک گھنٹے تک ساریاں دیکھتے رہے اور جب واپس لوٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت سی ساری تھی جو انھوں نے مسکراتے ہوئے بھابی کے پاس رکھ دی۔

مجھے یاد ہے کوئی آٹھ نو سال پہلے ایک دفعہ اختر بھائی پر دوبارہ دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹر نے مریض کو تو نہیں ہاں خدیجہ بھابی کو سمجھا دیا کہ "اس دفعہ تو بچ گئے ہیں لیکن اب اگر انھوں نے زندگی کا ڈھنگ نہ بدلا تو زیادہ دن نہ چل سکیں گے۔" اور پھر چلتے چلتے ڈاکٹر نے جانے کیا بات بھابی سے کہی کہ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

اسپتال سے گھر واپس آکر ان کی آسائش کے سارے سامان مہیّا کر دیئے گئے۔ لیکن ڈاکٹر نے کسی مولوی کی طرح ممنوعات کی ایک طویل فہرست لکھوا دی جو دوزخ سے ڈرانے والی دھمکیوں کی طرح دلکش تھی۔ شراب و کباب بند، سگریٹ بند کہنے لگے اس بیوقوف کو نسخے میں یہ بھی لکھ دینا تھا کہ گھر چھوڑ کر کسی مسجد میں منتقل ہو جاؤ۔

رات کو سوتے وقت بھابی جانے کیا بہانہ کر کے دوسرے کمرے میں جا کر سو رہیں۔ دوسری رات، تیسری رات، غرض کئی راتوں تک جب یہی تماشہ ہوتا رہا تو اختر بھائی کو کچھ شبہ ہوا۔ انھوں نے جب حقیقت معلوم کرنا چاہی تو سارا پتہ چل گیا۔ کہنے لگے "بھئی اتنا بے وقوف ڈاکٹر ہم نے نہیں دیکھا۔ یہ تو سانس کا رشتہ ٹوٹنے سے پہلے ازدواجی رشتہ توڑے دے رہا ہے۔" چنانچہ اسی وقت وہ سارے کام شروع کر دیئے گئے۔ جن کی فراہمی جنت کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے۔

آج جب میں نے صحت کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے "نو سال گذر چکے ہیں ڈاکٹر کی پیشین گوئی کو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جس دن میں مروں گا۔ وہ کسی سے کہے گا "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ایک دن ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

گفتار کی روانی دیکھنے کے لئے صنف نازک کا موضوع ضروری ہے۔ اختر بھائی کا خیال ہے کہ عورت چاہے بندوق سنبھالے

تکیہ کے پاس والی دیوار پر لکھتے رہتے تھے۔

کرتے کی جیبیں عام طور پر بھری رہتی تھیں لیکن ٹکسال کے چھپے ہوئے کاغذ سے نہیں بلکہ عام سادہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے۔ ان میں سے کسی پر مکھڑا لکھا ہوتا تھا کسی پر فون نمبر، کسی پر کسی کا پتہ اور کسی پر کسی بے ہنگم جگہ ہونے والے مشاعرے کی تاریخ۔ اختر بھائی نے جب ہوٹل کے بل پر دستخط کرنے کے لئے جیب سے پنسل نکالنا چاہی تو کاغذوں کا وہی پلندہ ایک دفعہ پھر بیس سال بعد باہر آ گیا۔ پہلے کی طرح آج بھی ان کی جیب میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔

غمِ روزگار کی شدت آج کل نسبتاً کم ہے کوئی چھ سات فلمیں گانے لکھنے کے لئے ملی ہوئی ہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ سب کی سب بڑی فلمیں ہیں، شاید اسی لئے ابھی تک ان میں سے ایک بھی سیٹ تک نہیں پہونچی ہے۔ ویسے بات یہ ہے کہ اختر بھائی ان لوگوں میں سے ہیں جس کا ساتھ اگر میوزک ڈائرکٹر چھوڑ دے تو بعد میں پچھتاتا ہے۔ بس اسی دن سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے کئی موسیقاروں کی مثالیں سامنے ہیں۔ لیکن نام نہ بتانا ہی مناسب رہے گا۔

بات مشاعروں تک پہنچ گئی۔ بنگلور کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے ہنسنے لگے۔ تفصیل پوچھی تو بولے "جب ہم مشاعرے میں پہنچے تو بہت مزے میں تھے۔ منتظمین ہماری طرف ایسے لپکے جیسے مدت سے انتظار کر رہے ہوں۔ فوراً ایک صاحب سے تعارف کرایا گیا۔ "آپ گورنر ہیں"۔ ہم گورنر سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک صاحب ہمارے سامنے لائے گئے۔ اور ہماری طرف مخاطب ہو کر کسی نے کہا۔ "آپ ہیں جان نثار اختر"، میں نے ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ "آپ کی تعریف؟" منتظمین کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پہلے گھبرائے، جھجکے پھر کئی آوازیں ایک ساتھ اٹھیں۔ "آپ گورنر ہیں"۔ بہت سے لوگوں نے میرے سوال کا برا مانا۔ لیکن میں یہی سوچتا رہا "تو پھر وہ کون تھا جس سے ابھی کچھ دیر پہلے گورنر کہہ کر ہاتھ ملایا گیا تھا"۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تامل ناڈو کے گورنر تھے۔

اردو شاعری کے گھٹیا اور مہمل شعروں کی یادداشت کے سلسلے میں اختر بھائی مشہور ہیں۔ ایک دفعہ غالباً سردار جعفری ساحر اور تاج ان کے ساتھ تھے۔ سردار نے بیت بازی شروع کرا دی، لیکن طے یہ ہوا کہ اچھا اور بامطلب شعر کوئی نہیں پڑھے گا۔ اگر کسی شعر کا کوئی معقول مطلب نکلے گا تو پڑھنے والے کے نمبر کٹ جائیں گے۔ سردار نے خود شرکت سے انکار کر کے جج کی کرسی سنبھال لی۔ ساحر اور تاج ایک طرف ہو گئے۔ بیت بازی تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اردو شاعری کے جتنے مہمل شعر ہو سکتے تھے ان تینوں نے مل کر دہرا ڈالے۔

اختر بھائی جانے کہاں سے شعر نکال کر لائے کہ وہ حاصلِ مشاعرہ ثابت ہوا۔

یہ دعا کر کہ مرے دل کو قرار آ جائے
کہیں اڑ کر نہ ترے گھر میں مزار آ جائے

اختر بھائی کے بیٹے جاوید کا اس وقت فلم انڈسٹری میں سب سے اچھے مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے چاہا کہ اختر بھائی سے باپ اور بیٹے کے تعلقات پر بات کی جائے۔

"تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں اس سے کسی مالی امداد کا نہ خواہاں ہوں اور نہ محتاج۔ ایک دن کافی رات گئے جاوید کا فون آیا۔ اس کی آواز میں وہی لکنت تھی جو پیمانوں کی طویل سنگت سے طاری ہو جایا کرتی ہے۔ جاوید بول رہا تھا۔ "آپ فلم انڈسٹری میں کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کو جتنے روپئے درکار ہوں۔ میں کل آپ کو بھیج دیتا ہوں"۔ میں نے اس سہارے کو اپنانا پسند نہیں کیا، کیونکہ اگر ایک دفعہ میں یہ کر بیٹھوں تو کیا معلوم کل میں اس کا محتاج بن کر رہ

پروفیسر جوگندر پال

ایک تاثّر

جو بارشیں درویشی عبادت کو بذاتِ خود اہم سمجھ لیتے ہیں ان کا مقدر اُنہیں جنّت سے نیچے ہی کہیں خلاء میں لٹکا کر چھوڑ دیتا ہے۔ جنت کی سرزمین پر پاؤں رکھنا تو اُن قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے جو زندگی کو اپنے محبوب کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کا ایک حیلہ قرار دیں اور بس۔ ادراک و عرفان کے سارے سفر کی تکمیل کا انحصار اس پہ ہے کہ ہم جو بھی کریں، جیسے بھی اور جہاں بھی، سب اس لئے کریں کہ اس سے ہمارا محبوب خوش ہو جائے، اور ایک وہ خوش ہو جائے تو پھر ہمیں اور کیا چاہیئے؟ یہی والہانہ وابستگی ہمیں زندگی کے عین مرکز میں لا کھڑا کرتی ہے، جہاں سے سب کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے، سارے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے بارے میں سوچتا ہوں تو اُس سے پہلے صفیہ اختر کا خیال آتا ہے: 'زیرِ لب' کے خطوط کی مصنفہ، جس کی بڑی خواہش تھی کہ میرا شوہر بہت بڑا شاعر بنے، اپنے ادراک سے، میرے ادراک سے، اور پھر ہم دونوں کا ادراک بکھر بکھر کر کائناتی ہو جائے، جاں نثار اختر کی شاعری کی بنیاد اپنی اس محبت کی انہی توقعات سے وابستہ ہے۔

کئی سال پیشتر جب میں نے 'زیرِ لب' پڑھی تو اِس تحریر کی جھنجھوڑ میں ہی اختر کے مستقبل کو محسوس کر لیا۔ آج کا اختر دراصل وہی ہے جس کے بارے میں صفیہ نے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ اور جس کی پُر توقع محبت کے شعوری یا لاشعوری عہد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اختر کو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ آج وہ اپنے اسی روپ میں ہوتا جس میں ہے۔

صفیہ کی موت کے بعد جاں نثار اختر نے اپنے آپ کو کئی سہولتی بوکھلاہٹوں کا شکار بنایا ہوگا، پھر شاید اسے صفیہ کی آسیبی یادوں سے آزادگی کا احساس بھی ہوا ہو۔ لیکن پھر یوں ہوا ہوگا کہ صفیہ اُس کے تحت الشعور سے صرف خیال ہی خیال بن کر ابھری ہوگی اور اس کی معصوم محبّت کا یہ بے پیکر خیال اس کی زندگی کا ایک محبوب سمبل بن گیا ہوگا۔ اور پھر—— پھر جو شئے، جو چہرہ بھی اختر کو بھلا معلوم ہوتا ہوگا، یہی سمبل اُس میں رچ بس جاتا ہوگا۔ اور کسی لُٹے ہوئے آدمی کے انداز سے پھر نو کچھ پا لینے کے احساس سے اس کی توانائیاں لوٹ آتی ہوں گی۔ اور وہ اپنی نئی دلچسپیوں میں بیک وقت مسرت اور غم سے منہمک ہو جاتا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ جاں نثار اختر اِدھر چند سال سے جو اتنی اچھی شاعری کرنے لگا ہے وہ اُس کی اِسی ذہنی کیفیت کی دین ہے، وہ اپنے غموں سے مسرور ہے اور مسرتوں سے غمگین، گذشتہ دنوں چنڈی گڑھ کے سیمینار میں اُس کی اُداس مسکراتی ہوئی خاموشیوں کا جائزہ کرکے میں نے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہا کہ وہ اپنی غیر اطمینانیوں کو بڑے اطمینان سے جھیل رہا ہے۔

جاں نثار اختر اپنی دونوں آنکھیں کھول کر آپ کی طرف بغور دیکھ رہا ہو تو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی آنکھیں بند ہیں اور وہ آپ سے ہمکلام ہونے کی بجائے اپنی ہی کسی بات کا جواب دے رہا ہے اور مجلس کے حالیہ سیاق و سباق سے ٹوٹا ہوا ہے اور نہ جانے یہاں سے ٹوٹ کر کہاں جڑا ہوا ہے یا وہاں سے بھی ٹوٹ کر کہیں اور جڑ جانے کو بیتاب ہے، لیکن بظاہر وہ بڑے سکون سے سگریٹ سلگا کر اپنی دونوں آنکھوں سے مسکرا مسکرا کے آپ کی طرف دیکھتا رہے گا —— "ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں!" ایسے موقع پر اختر سے یہ پوچھنے پر اصرار نہ کیجئے کہ میں نے کیا کہا تھا جو ٹھیک ہے۔ مست آدمی ہے، وہ آپ کی بات چیت میں شریک نہیں تو کیا، آپ ہی چپکے سے اُس کی مستی میں شریک ہو جایئے! ☆

چاہے جھنڈا اٹھائے اور چاہے گھنگرو باندھ کر قالین پر اتر آئے۔ اس کی انفرادیت بہرصورت قائم رہتی ہے"۔ میری زندگی میں عورت کا بہت بڑا رول رہا ہے اسی لئے میری شاعری میں آپ کو عورت کے لطیف سے لطیف احساسات پر شعر مل جائیں گے۔

ایک دن کہنے لگے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ میں عورت کو کبھی غور سے نہیں دیکھتا۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ نظریں اس کے لباس یا جسم کے کسی ایک حصے پر یا پھر اس کی کسی ادا پر اٹک کر رہ جاتی ہیں پھر اس کے بعد سر سے لے کر پیر تک دیکھنا یاد ہی نہیں رہتا۔

ایک واقعہ تو شاید میں زندگی بھر نہ بھول سکوں۔ میں ایک صاحب کے گھر مہمان تھا۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ ایک محترمہ کافی دیر تک اس محفل میں شریک رہیں۔ اس کے بعد جانے انھیں کیا ہوا کہ بے وجہ خفا ہو کر چلی گئیں۔ میں سمجھا کہ صاحب خانہ کی شاید کوئی بات ناگوار گزری ہوگی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ناگواری کا باعث میں تھا۔ میں ان کو پندرہ سال سے جانتا تھا لیکن اس انجان جگہ پر انہیں پہچان نہ سکا۔

اختر بھائی اپنی کمزوریوں کو نہ صرف کیریکٹر کا ایک جزو بلکہ اپنا نشانِ امتیاز سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ کبھی کوئی "ہیراپھیری" چھپاتے نہیں ہیں۔ اسی لئے خدیجہ بھابی کو ان کی ہر بات کا علم رہتا ہے۔

اختر بھائی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی بور نہیں ہوتے۔ اُن کی محفل میں بھانت بھانت کے لوگ جمع رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جہاں قدرِ مشترک کا دور دور تک شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ سب کی ایک جیسی خاطر مدارت میں لگے رہتے ہیں ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ فلاں شخص صبح سے بے وجہ ساتھ لگا ہوا ہے۔

اختر بھائی سنتے بالکل نہیں ہیں۔ میرا مطلب بہرے پن سے نہیں ہے۔ آپ اپنا کوئی قصہ سنا رہے ہوں وہ آپ کی طرف دیکھتے رہیں گے اور پھر ایک دم کہیں بیچ میں سے آپ کی بات ایسے کاٹ دیں گے کہ حیران و پریشان ہو کر آپ کو چپ لگ جائے گی۔

ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آپ کے اچانک آنے کو بھی ایسے لیتے ہیں۔ جیسے انھوں نے خود آپ کو بلایا ہو۔ یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ بھئی کیسے آنا ہوا؟ کیسے ہو؟ بس ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کے لئے کہہ دیں گے۔ محفل میں جو قصے چل رہے ہوں گے وہ چلتے رہیں گے۔ اگر دور چل رہا ہوگا تو ایک خالی گلاس کا حکم صادر ہو جائے گا۔ اور یہ حکم کسی کا نام لے کر نہیں دیا جاتا۔ یہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی اٹھے اور جا کر گلاس لے آئے۔

ایک اور عجیب بات اس محفل میں دیکھنے کو ملتی ہے جو عام طور پر بلا نوشوں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اور وہ یہ کہ شراب پیش کرتے وقت اختر بھائی یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ بوتل میں کتنی اور باقی ہے۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ یہ آخری جرعہ ہے۔ ان کے قریب رہ کر کبھی کبھی سچ مچ ایسا لگتا ہے جیسے اللہ میاں نے ان سے کہہ دیا ہو کہ جاؤ شراب تو ہم پلا ہی دیں گے، کھانے کا انتظام خود کر لینا۔ اور خود انتظام کرنے کا کوئی بھی کام ہو وہ اختر بھائی کے لئے مشکل ہوتا ہے۔

آرکیڈیا بلڈنگ کے نیچے جو پان سگریٹ بیچنے والا تھا اُس سے تعلقات اچھے رکھنا اُن دنوں اپنا سب سے بڑا پبلک ریلیشن کا کارنامہ سمجھتے تھے۔ وہ ان کو مہینوں سگریٹ سپلائی کرتا رہتا تھا پھر جب کوئی میوزک ڈائرکٹر حالات کا فائدہ اٹھا کر کسی گانے کے دو سو روپے ہاتھ پر رکھ دیتا تو سیدھے پان والے کے پاس پہنچتے اور پچھلا حساب صاف کر کے نیا کھاتہ کھول دیتے۔

لیکن اختر بھائی اب اس دور سے نکل چکے ہیں۔ جہاں ہر صبح کان پر قلم لگا کر تلاش روزگار کے لئے نکلنا پڑتا ہو اور پروڈیوسروں کے دروازے پر جا کر صدا لگانی پڑتی ہو۔

"ٹوٹے پھوٹے شعر جُڑ والو"

اور شاعر، دونوں ہم آہنگ اور ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں غالب کے کمر بند کا کافی دخل ہے۔ غالب کے کمر بند اور جاں نثار اختر کے کمر بند میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کے کمر بند میں گرہیں ہی گرہیں ہوا کرتی تھیں اور موخرالذکر کا کمر بند، اس گرہ سے کبھی بے نیاز ہوتا ہے جس کے بغیر حالات دگرگوں ہو سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جاں نثار اختر کو ان کی شاعری سے الگ کر کے دیکھا اور پرکھا نہیں جا سکتا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ زیادہ سے زیادہ شاعر ہوتے جا رہے ہیں۔

جاں نثار کو جہاں بولنا چاہیئے وہ ہرگز نہیں بولیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں انھیں نہیں بولنا چاہیئے وہ بولتے ہیں۔ وہ بولتے ہی کب ہیں۔ صرف شام کے وقت، سورج کی روشنی میں وہ اس لئے نہیں بولتے کہ کوئی انہیں بولتا دیکھ نہ لے۔ مسکرانے میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ انہیں جب بھی کسی کی رائے سے اتفاق کرنا ہو تو وہ مسکرا دیتے ہیں۔ اختلاف کی صورت میں بھی وہ یہی کرتے ہیں۔ یہ بھی وضعداری کی ایک شکل ہے اب تو یہ بھی ہو گیا ہے کہ انہیں باتیں کرتے سننا ہو تو کان لگا کر سننا پڑتا ہے۔ تھوڑے دنوں سے انہوں نے نصف جملوں میں باتیں کرنے کا طریقہ ایجاد کر لیا ہے (یہ کس قسم کی کفایت شعاری ہے سمجھ میں نہیں آتی) باقی کا نصف جملہ سننے والے کو صرف سمجھنا پڑتا ہے۔ ع تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟ اگر ان کا یہ طریقہ بدلا نہیں گیا تو خطرہ ہے کہ وہ صرف ایک مصرعہ کا شعر بھی کہنے لگیں۔ انہوں نے چار چار شعر کی غزلیں بکثرت کہی ہیں۔

جاں نثار اختر پینے کی ہر چیز پیتے ہیں بلکہ غصہ تک پی جاتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ "گھر آنگن" کی تخلیق کے بعد اُن کے رہن سہن میں بڑی حد تک تبدیلی آگئی ہے، اور وہ کئی باتوں میں "ہاں" بولنے لگے ہیں (ورنہ وہ ہر "نہیں" کو "ہاں" سے بڑا سمجھتے ہیں) اب وہ باقاعدہ غسل وغیرہ کرنے لگے ہیں۔ اُجلے کپڑے پہننے میں بھی انہیں اب شرمندگی نہیں ہوتی۔

جس طرح بعض لوگ نہانے کے لئے پانی گرم کرواتے ہیں اور اس وقت تک نہیں نہاتے جب تک کہ پانی بالکل ٹھنڈا نہ ہو جائے اسی طرح جاں نثار اختر بھی آج سے تھوڑے دنوں پہلے تک 'لانڈری کے دھلے ہوئے کپڑے بھی اس وقت تک نہیں پہنتے تھے جب تک کہ وہ رکھے رکھے میلے نہ ہو جائیں۔ اس انقلاب کی مبارکباد کسے بھیجی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ دن اب زیادہ دور نہیں جب اختر بھائی، دستی بھی استعمال کرنے لگیں گے ـــــ انہیں البتہ اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس ملک میں صرف چپلیں ہی نہیں، جوتے بھی پہنتے ہیں۔ خیر یہ اطلاع انہیں نہ بھی ملے تو کوئی حرج نہیں۔ اچھی شاعری کے لئے جوتے پہننے ضروری کب ہیں؟ *

یوسف ناظم

معمّر نوجوان

(مزاحیہ خاکہ)

آدمی کی عمر پر کائی لگ سکتی ہے لیکن اگر اسے نوجوان بنے رہنے کا نسخہ معلوم ہے تو یہی کائی ایسی معلوم ہونے لگتی ہے جیسے سبزہ آغاز ہو رہا ہو۔ جس طرح دفعِ بلا کے لئے آیتیں اور اشلوک پڑھنے پڑتے ہیں اسی طرح رفعِ عمر کے لئے ایسے شعر کہنے پڑتے ہیں جو صرف ولولہ انگیز ہی نہیں شر انگیز بھی ہوں ـــــ یہ نسخۂ کیمیا جاں نثار اختر کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور جاں نثار اختر، یہ گُر کسی کو بتانے کے لئے رضامند نہیں ہیں۔ اُن کے ہاں بعض بعض جگہ تو ایسے خطرناک اشعار ملتے ہیں جو صرف پوشیدہ خط و کتابت میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ (عُشّاق چاہیں تو یہ اشعار ضرور استعمال کریں لیکن کامیابی کی ضمانت نہیں) یہ وہ اشعار ہیں جن کے بارے میں شاعر خود کہتا ہے ؎

کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لئے ہیں ـــ کبھی ہو سکا تو جاں نثار اختر سے یہ خاص الخاص اشعار اُن موصوفہ کی موجودگی میں سننا چاہئیں جنہیں شاعر نے ''اُن'' کہا ہے۔ لیکن پہلے معلوم تو ہو کہ یہ 'اُن' ہیں کون؟ لیکن جاں نثار اختر صرف عاشقانہ کلام کے ماہر نہیں، شوہرانہ کلام کے بھی 'اساتذہ' ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صرف عاشقانہ شعر کہنے کا نتیجہ کچھ اچھا برآمد نہیں ہوتا۔ اس لئے شعر کی سوجھ بوجھ رکھنے والے رفتہ رفتہ عاشقانہ شاعری کے ساتھ شوہرانہ جذبات کے اظہار کے لئے بھی تھوڑا بہت وقت نکالنے لگے۔ ورنہ اس سے پہلے کسی شاعر کے کلام سے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ شادی شدہ بھی ہے۔ جو شعر پڑھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ شاعر ابھی ناکتخدا ہے۔ ہاں اس کے شعر سے یہ البتہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر نے، کسی کو اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے منتخب ضرور کیا ہے۔ لیکن منتخبہ شخص کسی اور جگہ مصروف ہے اور اس تک بیچارا شاعر پہنچ نہیں پا رہا ہے!

جاں نثار اختر نے کس طرح اپنی شاعری کے بینک بیلنس کو سنبھال کر کے رکھا اِس موضوع پر غور کیا جائے تو ریاضی اور کامرس کے کئی نکات سامنے آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اُن کی اصل رقم، سیف ڈپازٹ میں جمع ہے اور یہ سب معاملہ (یعنی گھر آنگن اور پچھلے پہر وغیرہ) منافع کے حساب میں ہے۔ جاں نثار اختر ہر کام چپ چپاتے ہی کر لیتے ہیں۔ صبح اچھے بھلے رہتے ہیں۔ بڑی حد تک بے ضرر نظر آتے ہیں لیکن چند ہی گھنٹوں میں ایک خوبصورت 'غزل'، 'برآمد' کر لیتے ہیں۔ اسے برآمد کہا جائے یا درآمد۔ ٹھیک سے کہنا مشکل ہے لیکن ہوتا اس کا تعلق بہر حال 'آمد' سے ہے۔ جو نوجوان شاعر گرلز کالج کی لاری، جیسی نشہ آور نظم کہے اور بعد میں اُسے رہنے کی جگہ 'پریالیہ' نام کی عمارت میں ملے تو وہ شاعر کس طرح دل پر جبر کر سکتا ہے وہ جو بھی شعر کہے گا اس میں عشق کی مہک ہوگی۔

اُس کا کیا من بھید بتاؤں اُس کا کیا انداز کہوں
بات بھی میری سننا چاہے، ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

عاشقانہ شاعری میں بڑا حصہ شاعر کے 'حُلیے' کا بھی ہوا کرتا ہے۔ غیر معمولی مہذب یا انتہا درجے کے مصنوعی 'حلیے' کے شاعروں کو عاشقانہ شاعری زیادہ زیب بھی نہیں دیتی۔ بال بکھرے رہیں، ابروئیں چڑھی رہیں، آنکھیں بند یا نیم بند رہیں اور کمر بند لٹکتا رہے تو شعر

گی۔ دس اور گیارہ کے درمیان کھانا ملے گا۔ اختر صاحب کے گھر میں ہونے والی اِن ادبی صحبتوں کی حیثیت چلتے ہوئے ریگستان میں نخلستان کی ہے۔ جہاں مسافر کچھ دیر کے لئے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

اختر صاحب سقراط اور بقراط بن کر کم عمر ادیبوں اور شاعروں پر دھونس نہیں جماتے، بلکہ انہیں کی سطح پر اُتر کر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ خود سے بڑا تو شاید کچھ لوگوں کو مانتے ہوں لیکن خود سے چھوٹا کسی کو نہیں مانتے۔ نئے ابھرتے ہوئے فنکاروں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے ہیں، لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ساتھی اور ایک دوست کی حیثیت سے۔ کسی کو مشاعرے کی دعوت دلوا رہے ہیں، کسی کی کتاب پر انعام کی کوشش کر رہے ہیں۔ منتظمین سے کہہ کر کسی کی مشاعرے کی فیس بڑھوا رہے ہیں۔ کسی کی ملازمت کے لئے سفارش کر رہے ہیں اور کسی کے ذاتی مسائل پر گھنٹوں بحث کر کے حل تلاش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شامیں ایسے نوجوان فنکاروں کے ساتھ گزرتی ہیں جو ذہنی طور سے خود کو اُن سے قریب پاتے ہیں۔

بعض بڑے لوگ یہ ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں کہ وہ پیدا ہی بڑے آدمی ہوئے تھے۔ اپنے ماضی کو وہ ہر ممکن طریقے سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اختر صاحب اپنے برے دنوں کے واقعات بڑے مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں وہ بھوپال میں لیکچرار تھے اور ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہے تھے۔ بھوپال میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ اختر صاحب انجمن کے صدر تھے۔ ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین بعض وجوہ سے حکومت کی نظروں میں معتوب تھی۔ کانفرنس کے بعد ان حضرات کی فہرست مرتب کی گئی جنہیں سرکار اپنا مہمان بنانا چاہتی تھی۔ ایک رات کو بارہ بجے اختر صاحب کا ایک طالب علم آیا اور اس نے سرکار کے ارادوں سے واقف کیا۔ اختر صاحب کے سامنے دو راستے تھے۔ انجمن سے استعفٰی دے کر سرکار سے معافی مانگ لیں یا بھوپال سے فرار ہو کر لڑائی جاری رکھیں۔ پہلے راستے کے لئے صرف ضمیر فروشی کافی تھی، دوسرے راستے کی کٹھنائیاں بہت تھیں۔ انھوں نے دوسرے راستے ہی کو ترجیح دی، اور اپنے بیوی بچوں، عیش و آرام کو خیرباد کہہ کر بمبئی چلے آئے۔ بمبئی میں وہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے کئی لوگوں کے ساتھ رہے۔ ان ہی لوگوں میں ایک خلیل صاحب بھی تھے۔ یہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں تین سو، ساڑھے تین سو کے ملازم تھے۔ خلیل صاحب کے پاس رہنے کو بس ایک کمرہ تھا جس میں دو پلنگ اور دو کرسیاں تھیں۔ اُن کے ایک ڈاکٹر دوست بمبئی سے جاتے ہوئے مریضوں کو دیکھنے کی اپنی میز اور ایک اسکرین دے گئے تھے۔ اسکرین سے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ ایک کمرہ خلیل صاحب کا اور دوسرا اختر صاحب کا۔ کچھ عرصہ بعد اختر صاحب کے ایک اور بے روزگار دوست خلیق ابراہیم کی رہائش کا مسئلہ سامنے آیا تو خلیل صاحب سے اجازت لے کر اختر صاحب انہیں بھی اسی کمرے میں لے آئے۔ خلیق صاحب کی رات مریضوں کو دیکھنے والی میز پر گزرتی اور دن اختر صاحب کے سرہانے رکھی ہوئی ٹوٹی ہوئی کرسی پر۔

اختر صاحب کا اٹھنا، بیٹھنا، لکھنا، پڑھنا، کھانا، ادبی اور اقتصادی مسائل پر گفتگو کرنا، سوتے جاگتے خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھنا، سب اسی پلنگ پر ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اختر صاحب اور خلیق صاحب دونوں کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ خلیل صاحب ان دونوں کی مالی حالت سے بخوبی واقف تھے وہ ہر دوسرے تیسرے دن صبح کام پر جاتے ہوئے میز کے ایک خانے میں کچھ روپے رکھ جاتے۔ یہ دونوں گیارہ بجے سو کر اٹھتے۔ اختر صاحب میز کے خانے میں سے خلیل صاحب کے رکھے ہوئے روپے نکالتے اور اپنے سرہانے کی دیوار پر پنسل سے رقم لکھ دیتے۔ نیچے کے ایک ریسٹوران سے ناشتہ منگوایا جاتا۔ اور پھر یہ دونوں مستقبل کے خواب بُننے میں مصروف ہو جاتے۔ یہ حساس اور خوددار شاعر کام کے لئے خود کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا سکا، اور کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلیل صاحب سے قرض لی جانے والی رقمیں چارپائی کے سرہانے والی دیوار پر کئی لائنوں تک پہنچ گئیں۔ ایک دن اختر صاحب جب سو کر اٹھے تو انکشاف ہوا کہ خلیل صاحب کام پر جاتے ہوئے قرض کے روپے رکھنا بھول گئے۔ بہت دیر تک اختر صاحب اور خلیق صاحب پیٹ کی آگ

ڈاکٹر خلیق انجم

بے وقت کا آدمی

جاں نثار کا خیال آتے ہی مندر میں جلتے ہوئے اس دیئے کا تصور ابھرتا ہے جس کی لو میں اندھیروں کو دور کرنے والا نور ہی نہیں ایک بے نام تقدس بھی ہوتا ہے۔ جس میں صرف روشنی ہی نہیں بلکہ روحانی سکون و طمانیت کا سامان بھی ہوتا ہے۔

اختر صاحب سے میری پہلی ملاقات تیرہ چودہ سال پہلے دہلی کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ اوپر سے نیچے تک شاعر، چوڑی موری کا پاجامہ، سفید شیروانی جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے، بکھرے ہوئے بال۔ جنہیں وہ بار بار سنوار رہے تھے۔ سوتی سوتی آنکھیں، چہرے پر مہاتماؤں والا سکون، بچوں والی معصومیت، مشاعرے اور اس کے ماحول سے بے نیاز، سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جا رہے تھے۔ تیرہ چودہ سال پہلے کے اور آج کے اختر میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں اُن کے قہقہوں کا کھوکھلا پن ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ زیادہ جاندار اور زیادہ سچے لگتے ہیں۔ ہر بات کے جواب میں ان کے ہونٹوں پر کھلنے والی شرمیلی سی مسکراہٹ اور زیادہ حسین اور زیادہ دلنواز ہو گئی ہے۔ اب اُن کے قہقہوں اور مسکراہٹوں میں خود اعتمادی کی جھلک بہت نمایاں ہو گئی ہے اب اُن کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس کی زندگی کا بڑا حصہ پتھروں سے سر ٹکرانے میں گزرا ہے۔ جس کی یادوں کا بڑا سرمایہ زندگی کی ناکامیوں اور تلخ تجربوں پر مبنی ہے۔

اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک کلچر بھی ہے۔ آزادی کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے ہمارے سیاسی اور سماجی حالات اور بڑے پیمانے پر انتقالِ آزادی نے اردو زبان اور اردو کلچر دونوں پر زبردست حملہ کیا۔ اردو ان حملوں سے متاثر ضرور ہوئی۔ اس کی ترقی کی رفتار سست پڑی۔ بعض صوبوں میں تو کچھ عرصے کے لئے بے حال ہو گئی۔ چونکہ سخت جان تھی ذرا پانی پڑا پھر لہلہانے لگی۔ لیکن اردو کلچر ان حملوں سے جانبر نہ ہو سکا۔ نئی نسل اپنے اس قابلِ فخر سرمائے سے محروم ہو گئی۔ چند ہی لوگ باقی ہیں۔ (خدا انہیں ہمیشہ سلامت رکھے) جو صدیوں کی کاوشوں سے پیدا ہونے والے اس کلچر کی یادگار ہیں۔ مجھے ایسے جتنے لوگوں سے نیاز حاصل ہے ان میں جاں نثار اختر کا نام سرِ فہرست ہے۔ اختر اردو کلچر کے سچے نمائندے ہیں۔ وہ پچھلے پچیس سال سے ممبئی میں ہیں لیکن ممبئی جیسا صنعتی شہر اختر کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ وہ شاید اردو کے واحد بڑے شاعر ہیں جن کی شخصیت اور سیرت کو یہ شہر قطعی متاثر نہیں کر سکا ذہنی اعتبار سے وہ آج بھی بھوپال اور لکھنؤ میں رہتے ہیں۔

اختر صاحب کو ادبی صحبتوں کی لت ابھی تک ہے۔ لمحوں کے حساب سے زندگی گزارنے والے شہر میں وہ ہر روز کئی گھنٹے اپنے دوستوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن سے پہلے سے وقت لینے کی ضرورت نہیں۔ سورج ڈھلنے پر آپ بے تکلف ان کے گھر جا سکتے ہیں۔ ایک دردمند دل ملے گا۔ محبت ملے گی، خلوص ملے گا، پینے کو شراب ملے گی۔ سننے کو نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ادبی موضوعات پر گفتگو ملے

ہر قدم تو نے کبھی عزم جواں بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لئے جاتا ہوں

عزم جواں بخشنے والے اپنے جیون ساتھی کو خاک میں سلا کر اختر صاحب پھر بمبئی آکر تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہو گئے۔ اختر صاحب تنگ دست رہے، بھوکے رہے لیکن انھوں نے خودداری کی دولت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس دولت کی حفاظت کے لئے انھوں نے بڑے بڑے خطرے مول لئے۔

اختر صاحب کے گانے جب مقبول فلمی زبان میں ہٹ ہونے لگے تو ایک میوزک ڈائرکٹر نے انھیں مستقل طور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اختر صاحب کی مالی حالت بہتر ہونے لگی۔ خلیل صاحب کے کمرے میں دیوار پر لکھی ہوئی قرض کی تمام رقمیں چکا دی گئیں۔ حالات اور بہتر ہوئے اور اتنے بہتر ہوئے کہ اختر صاحب نے ایک ہزار روپے مہینہ کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد اختر صاحب کو علم ہوا کہ وہ میوزک ڈائرکٹر ایک فلم کے کچھ گانے کسی اور سے بھی لکھوا رہا ہے انہیں یہ بات ناگوار گزری۔ کسی قسم کی تلخی پیدا کئے بغیر وہ خاموشی سے علیحدہ ہو گئے۔

اس دفعہ حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ کیونکہ پہلے خلیل صاحب کے کمرے میں کھانا کھائے بغیر بھی گزارا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب ایک ہزار روپے مہینے کے فلیٹ کا ہاتھی بندھا ہوا تھا۔ اور پھر اخراجات بھی اسی نوعیت کے تھے۔ اختر صاحب فلیٹ چھوڑ کر ساڑھے تین سو روپے ماہوار کے مکان میں آ گئے۔ سخت پریشان تھے۔ ایک دن اچانک میوزک ڈائرکٹر نوشاد صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ کسی فلم کے چار گانے ہیں۔ ایک اختر صاحب کو لکھنا ہے۔ اختر صاحب اس راز سے واقف تھے کہ نوشاد جس پر مہربان ہو جائیں اس کی قسمت بدل جاتی ہے۔ لیکن انا نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ بولے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں صرف ایک گانا لکھوں اور باقی تین کوئی اور۔ نوشاد صاحب نے جواب دیا۔ یہ میری نہیں پروڈیوسر کی خواہش ہے۔ اختر صاحب نے کہا تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔ پہلا گانا میں لکھوں گا۔ اس شرط میں کیا پریشانی تھا۔ نوشاد صاحب مان گئے۔ لیکن انھوں نے پوچھا ضرور کہ اس شرط کا فائدہ؟ اختر صاحب نے جواب دیا۔ پروڈیوسر میرا پہلا گانا سن کر باقی بھی مجھ ہی سے لکھوائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔

اختر صاحب اکثر ہنس ہنس کر اپنے بارے میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً میں نے ایک دفعہ مذاق میں پوچھا۔ اختر صاحب آپ جب بمبئی آئے تھے تو جوان تھے۔ فلمی دنیا کا ساتھ تھا لیکن آپ کے کسی سکینڈل کی کوئی خبر نہیں سنی۔ میرے اس سوال پر بڑے زور سے قہقہہ لگا کر بولے۔ بھائی جب دانت تھے تو چنے نہیں تھے اور جب چنے ہیں تو دانت نہیں۔ عرض کیا کہ دانت اور چنوں کا سکینڈل سے کیا تعلق؟ بولے جب میں جوان تھا تو چوکیدار اسٹوڈیو میں داخل تک نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس وقت عشق کا کیا سوال تھا۔ ہمارا اور روٹیوں کا سکینڈل تھا۔ اس اسکینڈل کی خبریں اخباروں میں نہیں آئیں۔ آج بھی فلم انڈسٹری میں چار سو سے اوپر ادیب اور شاعر اسی سکینڈل کا شکار ہیں اور بمبئی سے باہر کسی کو اس کا علم نہیں۔

اکثر فلمی شاعروں اور ادیبوں نے مکمل طور سے خود کو فلموں کے حوالے کر دیا ہے یعنی انھوں نے اپنا مزاج بھی اسی سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ جس کا فلمی دنیا متقاضی ہے۔ ان کا رہن سہن، طور طریق، سوشل لائف سب پر گہرا کاروباری رنگ آ گیا ہے لیکن اختر صاحب آج تک فلمی زندگی سے سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ فلم اُن کے لئے صرف روٹی کمانے کا ذریعہ ہے اور بس۔ اس لئے فلمی دنیا کے کرتا دھرتاؤں سے اُن کے تعلقات بہت کم ہیں۔ اور ملاقات تو اور بھی کم لوگوں سے ہوتی ہے۔ فلم میں کام حاصل کرنے کے جو ماڈرن ہتھیار ہیں اختر صاحب ان کا استعمال کیا خاک کریں گے۔ انہیں شاید ان ہتھیاروں کا صحیح علم بھی نہیں۔ آج کل اُن کے پاس کافی کام ہے لیکن بے تعلقی کا عالم یہ ہے کہ انہیں ان ساری فلموں کے نام بھی یاد نہیں جن کے وہ گانے لکھ رہے ہیں۔ بس میوزک ڈائرکٹر کے حوالے سے بات کرتے ہیں

بجھانے کی مختلف ترکیبوں پر غور کرتے رہے۔ جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو خلیق صاحب نے اپنی پرانی اور بوسیدہ شیروانی پہنی اور کسی دوست سے قرض لینے کے لئے نکل گئے۔ بارہ بجے کے گئے وہ تین بجے لوٹے، کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے کہا۔ اختر۔ میں کل لکھنؤ واپس جارہا ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی نہیں جو دو چار روپے قرض دے سکے۔ دراصل ہمارے دوست بھی وہی لوگ ہیں جو شکل دیکھتے ہی الٹا ہم سے قرض مانگنے لگتے ہیں۔ پھر انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ کس کس کے پاس گئے تھے۔ کیا کیا جواب ملا۔ بالآخر ایک ایسا حاتم بھی ملا جس کے پاس ایک روپیہ تھا۔ آٹھ آنے اس نے اپنے کھانے کے لئے رکھ لئے اور آٹھ آنے دیدیئے۔ خلیق صاحب کے پاس چار آنے پہلے سے تھے۔ دونوں ایک ریسٹوران میں گئے اور بارہ آنے میں جتنا کھانا مل سکتا تھا۔ کھالیا۔ اس واقعہ نے خلیق صاحب کی کمر توڑ دی تھی۔ اور دوسرے دن اختر صاحب کے بہت اصرار کے باوجود وہ پہلے لکھنؤ اور پھر پاکستان چلے گئے۔ جہاں پہنچ کر وہ بہت بڑے آدمی بنے۔ نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اختر صاحب تنہا رہ گئے۔

تنگدستی اور افلاس کے ہاتھوں اختر صاحب نے زندگی کے بدترین دن دیکھے ہیں۔ لکھنؤ سے جب تار آیا کہ عزیز ترین ہستی یعنی ان کی بیوی صفیہ کی طبیعت سخت خراب ہے تو اُن کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ وہ اُس وقت نمی کی ایک فلم "ڈنکا" کے گانے لکھ رہے تھے۔ گانوں کے کچھ پیسے باقی تھے اُن میں سے صرف ۵ روپئے مل سکے، اور وہ بھی دوسرے دن۔ اختر صاحب جب لکھنؤ پہنچے تو اُن کے انتظار میں دروازے پر ٹکٹکی لگاتی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔

اختر صاحب کے لئے صفیہ کی موت محض ایک بیوی کی نہیں بلکہ ایک دوست، ہمدرد، اور جیون ساتھی کی موت تھی۔ سخت ترین نامساعد حالات میں بھی صفیہ کے خطوط انہیں سہارا دیتے تھے۔ زندگی کی تاریکیوں میں امید کی ایک ہی کرن تھی، وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ صفیہ کی موت پر اختر صاحب نے خاکِ دل کے نام سے جو مرثیہ لکھا ہے وہ اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ اُس میں خونِ دل کی آمیزش ہے چند اشعار آپ بھی سن لیجئے۔

کوئی اے کاش! بجھا دے مری آنکھوں کے دیئے
چھین لے مجھ سے کوئی کاش نگاہیں میری
اے مری شمعِ وفا! اے مری منزل کے چراغ
آج تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری
تجھ کو رووُں بھی تو کیا روُوں کہ ان آنکھوں میں
اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے
زندگی عرصہ گہِ جہدِ مسلسل ہی سہی
ایک لمحے کو قدم جم سے گئے ہیں میرے
پھر بھی اس عرصہ گہِ جہدِ مسلسل سے مجھے
کوئی آواز پہ آواز دیئے جاتا ہے
آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غمِ دوراں کا اٹھانا ہوگا
زندگی دیکھ مجھے حکمِ سفر دیتی ہے
اک دلِ شعلہ بجاں ساتھ لئے جاتا ہوں

اختر صاحب کی انسان دوستی، رکھ رکھاؤ، دوست نوازی وغیرہ دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاگیرداری نظام میں کچھ صالح اقدار بھی تھیں۔ اور اختر صاحب کی شخصیت ان اقدار کی مکمل آئینہ دار ہے۔ غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب بہادر شاہ ظفر نے انہیں خلعت اور خطابات سے نوازا تو قلعہ کے ملازمین کو انعام دینے کے لئے انھیں اپنی خلعت گروی رکھنا پڑا تھا۔ اس معاملے میں اختر صاحب بھی غالب سے کچھ کم نہیں ہیں۔ ایک دفعہ کسی دوست نے اچانک اطلاع دی کہ وہ شام کو کھانے پر آرہا ہے۔ اختر صاحب گھبرا گئے۔ کیونکہ نہ کھانے کے پیسے تھے اور نہ شراب کے۔ کھانے کا تو خیر جیسے تیسے انتظام کر لیا گیا۔ شراب کا مسئلہ خاصا مشکل تھا۔ انھوں نے ایک بے تکلف دوست سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔ دوست نے وعدہ کر لیا کہ شام کو بوتل لے آئے گا۔ شام کو مہمان آگئے۔ لیکن دوست اور بوتل نہ آئی۔ سخت پریشان ہوئے۔ کافی دیر تک انتظار کیا۔ جب ناامید ہو گئے تو بیوی اپنی چوڑی گروی رکھوا کر شراب لے آئی۔

میرے ایک بزرگ ہیں جن کی ناموں اور چہروں کے معاملے میں یادداشت بہت کمزور ہے اور اس حد تک کمزور ہے کہ ایک دن بازار میں جا رہے تھے۔ سامنے سے اُن کی بیوی آرہی تھیں۔ بیوی انھیں دیکھ کر مسکرائیں۔ یہ ہاتھ جوڑ کر فرمانے لگے، بہن جی نمستے۔ اختر صاحب کی حالت اتنی تو خراب نہیں ہے مگر پھر بھی خاصی تشویشناک ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ تپاک سے ملے۔ اختر صاحب نے اُن سے بھی زیادہ تپاک دکھایا۔ اب بڑی مخلصانہ گفتگو ہو رہی ہے اور اختر صاحب کا ذہن یہ معلوم کرنے میں اُلجھا ہوا ہے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا نام کیا ہے؟ کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ چونکہ ذہین آدمی ہیں اس لئے گفتگو اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اختر صاحب انھیں پہچانتے بھی نہیں۔ لیکن اگر ملاقاتی ان سے زیادہ ذہین ہو تو پکڑے بھی جاتے ہیں۔ اُن کی اس کمزوری کی وجہ سے بہت سے دلچسپ واقعات رونما ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ اختر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ پارٹی میں اختر صاحب کچھ دوستوں میں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی ایک میز پر بیٹھی کسی نوجوان خاتون سے باتیں کر رہی ہیں۔ یہ بھی اس میز پر جا بیٹھے۔ دعا سلام کے بعد اس خاتون سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ خاتون کسی اور طرف دیکھ رہی تھیں۔ اختر صاحب نے چپکے سے اپنی بیوی سے پوچھا۔ یہ کون صاحبہ ہیں؟ بیوی نے ذرا بلند آواز میں جواب دیا۔ آپ پہچانے نہیں۔ یہ وحیدہ رحمٰن ہیں۔ اختر صاحب کی وحیدہ رحمٰن سے پرانی جان پہچان تھی کئی دفعہ ان کے گھر بھی جا چکے تھے۔ ظاہر ہے انھیں یہ بات ناگوار گزری۔ بولیں، اختر صاحب آپ مجھے پہچانے نہیں۔ اب اختر صاحب کی حالت خراب۔ کہنے لگے۔ اصل میں آپ کچھ دبلی ہو گئی ہیں۔

ایک دفعہ آل انڈیا ریڈیو۔ دلّی پر ایک صاحب نے اختر صاحب کو اتنے تپاک سے سلام کیا کہ جواباً اختر صاحب نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ اختر صاحب کی گرفت سے آزاد ہو کر ان صاحب نے پوچھا۔ آپ مجھے پہچان گئے؟ اس موقع کے لئے اختر صاحب کا ایک مخصوص فقرہ ہے۔ ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی بھی بھول سکتا ہے؟ وہ صاحب بولے تو پھر بتائیے میرا نام کیا ہے؟ پھنس گئے اختر صاحب۔ پھر بھی ایک ترکیب نکالی۔ معاف کیجئے۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ ان صاحب نے دوسرا وار کیا۔ اچھا تو پھر ہماری ملاقات کہاں ہوئی ہے؟ اختر صاحب نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے سوچا کہ آل انڈیا ریڈیو پر ملاقات ہوئی ہوگی۔ بولے صاحب یہیں ہوئی تھی۔ اب انھوں نے اختر صاحب کو چاروں خانے چت کرتے ہوئے کہا حضرت میں آپ کا عقیدت مند اور مداح ہوں۔ میری آپ سے آج پہلی ملاقات ہے۔

اختر صاحب حکومت ــــ، اور قانون کے ساتھ کسی طرح کے مذاق کے قائل نہیں ہیں۔ انکم ٹیکس سے لے کر ریڈیو اور ٹی وی کے لائسنس تک ہر چیز کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ وقت سے پہلے ہی یہ تمام کام کر دیتے ہیں۔ اگر قانونی طور سے ممکن ہو تو زندگی بھر کا انکم ٹیکس ایک ساتھ ہی ادا کر دیں اور زندگی بھر کے لئے ٹی وی کے لائسنس کی فیس ادا کر دیں۔ میں نے بہت کم لوگ

مثلاً فلاں کے ساتھ اتنی فلموں کے گیت لکھ رہا ہوں اور فلاں کے ساتھ اتنی فلموں میں۔ کام انہیں جوڑ توڑ سے نہیں اپنی صلاحیتوں اور صلاحیتوں سے زیادہ قسمت کی وجہ سے ملا ہے۔ کچھ یہ بھی ہوا ہے کہ اُن کے بہت سے ایسے گانے ہٹ ہوئے جو انھوں نے اپنے بُرے دنوں میں معمولی معاوضے پر دوسرے شاعروں کے نام سے لکھے تھے۔ میوزک ڈائرکٹرز کو اس کا علم ہوگیا۔ اس لئے وہ براہ راست انہیں کو کام دینے لگے۔

اختر صاحب نے کئی بار فلمی دنیا سے نجات پانے کی بھی کوشش کی۔ اس سلسلے کی ایک کڑی وہ فلم ہے جو "بہو بیگم" کے نام سے انہوں نے بنائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوگئی اور دو۔ ڈھائی لاکھ روپے بچ گئے تو وہ روپیہ لے کر لکھنؤ یا بھوپال چالیں گے۔ اور باقی زندگی آرام سے گزاریں گے۔ فلم کی کاسٹ بہت زبردست تھی۔ کہانی انھوں نے خود لکھی تھی (یہ ان کی اکلوتی، پہلی اور آخری کہانی تھی) فلم پر سینتیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ روپیہ اُن کے ایک دوست نے لگایا تھا۔ فلم ریلیز ہوئی۔ خاصی کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن اختر صاحب کی ساری امیدیں اور مستقبل کے خواب خاک میں مل گئے۔ کیونکہ پورے ڈیڑھ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ فلموں میں ڈیڑھ لاکھ روپے کے نقصان کی کوئی حیثیت نہیں لیکن ہمیشہ کے لئے اختر صاحب کے حوصلے ختم کر دینے کے لئے کافی تھے۔ اختر صاحب نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر کے قلم کی مزدوری پھر شروع کردی۔ اور بمبئی سے بھاگ نکلنے کی تمنا کا غالباً ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دیا۔

ایک دفعہ اختر صاحب سنا رہے تھے کہ فلمی شاعر کو شروع شروع میں کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو میوزک ڈائرکٹر گانے میں ہزاروں عیب نکالتا ہے۔ یعنی گانا سننے سے پہلے ہی کہنا شروع کردیتا ہے۔ وہ بات نہیں پیدا ہوئی جو میں چاہتا ہوں۔ "وہ بات" پیدا کرنے کیلئے شاعر بار بار الفاظ، مصرعے، شعر اور کبھی کبھی پورا گیت دوبارہ کہنا پڑتا ہے۔ جب یہ مشکل تمام میوزک ڈائرکٹر کو لگتا ہے کہ "وہ بات" پیدا ہوگئی اور مطمئن ہو جاتا ہے تو ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کا نمبر آتا ہے۔ انھیں ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ وہ بات نہیں پیدا ہوئی۔ شاعر بے چارا بیٹ کی خاطر "وہ بات" پیدا کرنے میں کئی دن اور کئی راتیں تباہ کرتا ہے۔ تب کہیں یہ حضرات مطمئن ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سب سے کٹھن منزل آتی ہے اور وہ اُس وقت آتی ہے جب ڈائرکٹر، پروڈیوسر کی بیویاں، رشتے دار اور دوست اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی کہتا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بعض کامیاب فلمی گانوں سے اس گانے کا مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا ہے کہ فلم کی ناکامی اور لاکھوں روپے کے نقصان کی ذمہ داری اسی شاعر پر ہوگی۔ اور شاعر بے چارا پھر "وہ بات" پیدا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جب اختر صاحب یہ تفصیل سنا چکے تو میں نے شرارتاً پوچھا۔ آپ بھی کبھی ان منزلوں سے گزرے ہیں۔ بڑے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ نہ گزرتا تو اتنی تفصیل سے کیسے سناتا۔ آج جو بڑے بڑے تیس مار خاں ہیں۔ وہ سب ان منزلوں سے گزرے ہیں۔

اختر صاحب بڑے بے ضرر قسم کے آدمی ہیں۔ وہ خود کسی کی برائی کرتے نہیں اور نہ کسی کی برائی سننا پسند کرتے ہیں۔ دل آزاری اُن کے بس کی بات نہیں۔ اگر کوئی دوست اُن کی ذات پر حملہ کرتا ہے یا کوئی غلط بات کہتا ہے تو خاموش ہو جاتے ہیں اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ اس دوست کو کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن اس کی غلطی کا اپنی ذات سے دل کھول کر انتقام لیں گے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک صاحب نے ان کے بارے میں کچھ غلط اور بے بنیاد باتیں کہہ دیں۔ اختر صاحب کے اُن پر کافی احسانات تھے۔ انہیں یہ باتیں سن کر بہت تکلیف ہوئی۔ ایک دن ان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اختر صاحب نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بس اتنا کہا اگر آپ کو مجھ سے واقعی شکایت ہے تو ملنا بند کر دیجئے۔ یہ گویا اظہار ناراضگی کی انتہا تھی۔

جھکایا ہے اور ہمیشہ سر ہی جھکاؤں گی۔ تم بہت اونچے اور بہت پیارے ہو۔ اور اپنی اس بلندی ہی کے باعث ہمیشہ ہمیشہ (UNATTAINABLE) تمہیں چاہے زیادہ پا لینے پر بھی یہ احساس غالباً مجھے باقی رہتا ہے کہ تمہیں نہیں پایا۔"

ایک اور خط میں لکھتی ہیں :-

"ان سات سالوں میں جس قدر خوشگوار سمجھوتہ ہم دونوں کے درمیان رہا ہے اس کی مثال ازدواجی زندگی میں مشکل سے ملے گی۔ میرے سامنے راستہ واضح تھا۔ مجھے ہر حال میں تمہارے ساتھ ہی رہنا تھا۔ لیکن تم نے بھی اپنی کشمکشوں اور الجھنوں کے باوجود مجھے کسی قدم پر اپنے سے علیحدہ نہ سمجھا۔ تم نے اکثر اپنے دل و دماغ کا خون کر لیا لیکن میری پاسداری میں فرق نہ لائے۔"

صفیہ نے آخری خط میں لکھا تھا۔

نظم ملی۔ تمہارا بہت پیارا تحفہ۔ سچ جانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے۔ آج میں کتنی مغرور ہوں اور نازاں۔ مجھے تمہاری محبت، دوستی، شفقت، خلوص اور اعتماد سب کچھ تو حاصل رہا ہے۔ آج تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے تمہاری شاعری کو جیت لیا ہے۔ اب مجھے اور کیا چاہئے۔"

کیا "زیر لب" کے خطوط میں ایک ایسے انسان کی شخصیت نہیں ابھرتی جو محبت کا مجسمہ ہے۔ جو دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہے۔ لیکن اپنا غم سب سے اور حد تو یہ ہے کہ اپنے جیون ساتھی سے بھی چھپائے رہتا ہے۔ کیا یہ شخصیت لاابالی شاعر کے بجائے ایک ایسے انسان کی نہیں جسے اپنی سماجی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس ہے۔ ٭

"اختر کے ذہن کا سفر 'عشقیہ رومان' سے ہوتا ہوا ان کے 'نشاطیہ رومان' کی طرف ہے۔ ان کا جمالیاتی مشاہدہ اور لمسیاتی کیف اتنا Involved اور پھر اتنا detached ہوتا ہے کہ وہ عمر کی ہر سطح پر دھتے ہوئے اس سے بلند بھی رہتے ہیں۔ والہانہ جذب و انجذاب (Involvement) اور بے خبری ان کی فطرت ہے۔ اور پاسِ وضع، دکھ رکھاؤ (detachment) اور باخبری ان کی تہذیب۔"

شہاب جعفری

دیکھے ہیں جو اتنی جلدی نروس ہو جاتے ہیں۔ اگر اختر صاحب کو کناٹ پلیس سے پالم ہوائی اڈے تک جانا ہے تو اُن کے ذہن پر یہ سفر بری طرح سوار ہو جائے گا۔ ہر اچھے اور برے امکان پر غور کریں گے۔ کیا وہاں تک کی ٹیکسی مل جائے گی؟ اگر ٹیکسی مل گئی تو انہیں یہی خیال پریشان کرتا رہے گا کہ کہیں راستے میں ٹیکسی خراب نہ ہو جائے۔ غرض جب تک پالم نہ پہنچ جائیں گے۔ اندیشہ ہائے دور دراز کی گرفت سے آزاد نہ ہوں گے۔

اگرچہ اختر صاحب نو سال تک گوالیار اور بھوپال میں لیکچرر رہے ہیں۔ ہزاروں مشاعرے پڑھے ہیں لیکن آج تک اجنبی لوگوں کے سامنے گفتگو کرنے سے شرماتے ہیں۔ محفلوں میں اجنبی لوگوں کی باتوں کا جواب مختصر ترین لفظوں سے یا صرف مسکراہٹ سے دیتے ہیں۔ اسٹیج پر تقریر کرنے سے تو بہت ہی کتراتے ہیں۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہوگی۔ لکھنؤ میں ایک سمینار ہو رہا تھا۔ اختر صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ سمینار میں جدیدیت کے حامی ایک نوجوان نے مقالہ پڑھا۔ کچھ تو جدیدیت کا معاملہ اور مقالہ نگار نوجوان، لہٰذا مقالے میں استدلال کم اور غم و غصہ اور جوش و خروش زیادہ تھا۔ مقالے پر بحث نے بھی کچھ اس طرح کا رخ اختیار کر لیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اردو میں جدید شاعر اور ادیب ہی پہلی بار ادب پیدا کر رہے ہیں، ورنہ اس سے پہلے جتنا کچھ لکھا گیا اور خاص طور سے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وہ سب بکواس اور مہمل۔ میں اختر صاحب کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میری طرح اختر صاحب کو بھی یہ انداز گفتگو ناگوار گزر رہا تھا چپکے چپکے وہ مجھ سے اپنی ناگواری کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ بھی گفتگو میں حصہ لیجیے۔ بولے نہیں، نہیں بولوں گا۔ میں نے کہا۔ دیکھتا ہوں کہ یہاں سے بغیر بولے آپ کیسے جاتے ہیں۔ میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا۔ اختر صاحب بھی بولنا چاہتے ہیں۔ اور وہ کاغذ اناؤنسر کو بھیج دیا۔ اختر صاحب کے چہرے پر جو گھبراہٹ کے آثار تھے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگے۔ ماتھے پر کچھ سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اناؤنسر نے فوراً اختر صاحب کے نام کا اعلان کر دیا۔ اب اسٹیج پر اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اصرار کر رہے ہیں اختر صاحب ضرور بولیں گے۔ غرض کافی حیل حجت کے بعد وہ مائیک پر آئے۔ پہلے دو تین منٹ معذرت کرتے رہے کہ انہیں تقریر کی عادت نہیں پھر اصل موضوع پر آئے۔ کچھ دیر بعد وہ دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ادب کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے اور ہر معاملے میں ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اسی دن مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ وہ رسائل اور تازہ ترین مطبوعات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

صفیہ کے خطوط کے مجموعے "زیر لب" کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں صرف صفیہ کی شخصیت کے دلنواز پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ ان خطوں میں خود اختر صاحب کی شخصیت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کہاں تک درست ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کی شخصیت اور سیرت کا اندازہ کرنا ہے تو بیوی بچوں سے اس کے تعلقات کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ سماجی رشتوں میں تو ہم اپنے چہرے پر مصلحتوں کی نقابیں ڈال کر خود کو بہت مہذب بنائے رکھتے ہیں۔ لیکن بیوی بچوں کا چونکہ دن رات کا ساتھ ہے اس لئے اُن کے ساتھ یہ ممکن نہیں۔

صفیہ محض ایک بیوی نہیں بلکہ ایک حساس اور ذہین عاشق ہیں۔ اُن کے عشق میں جذباتیت ضرور ہے لیکن عقل کو بھی دخل ہے۔ وہ اپنے محبوب کی خوبیوں اور خامیوں سے خوب واقف ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ اختر صاحب کی محبت اور اعتماد دونوں انہیں حاصل ہیں۔ سات سال تک اختر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد صفیہ کا اُن کے بارے میں خیال ہے:۔

تمہاری بلندیاں میں نہ چھو سکوں گی دوست! میں وہ رفعتیں کہاں سے لاؤں کہ تمہارے برابر خود کو کر سکوں۔ میں اُن اچھوتی بلندیوں کی پوجا ہی کر سکتی ہوں میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے سر

ایک اور بھی ہستی ہے جس کا نام لکھتے لکھتے بھی میری آنکھیں بھری چلی آرہی ہیں ! میری صفیہ آپا —— میری ماں !

میں بچپن ہی سے ان معنوں میں سخت بدنصیب رہی ہوں کہ ماں جیسی محبت نہ دیکھی نہ پرکھی نہ سنی نہ محسوس ہی کی — ہاں ذرا بڑی ہوئی تو یہ احساس ضرور ہوا کہ بڑی پیاری شے کی کمی اس زندگی میں ہے — یہی احساس اور بڑی ہوئی تو جیسے ناسور بن گیا — خواہشوں اور آنسوؤں سے مرے ہوئے لوگ زندہ — ہوتے تو آج دو ہستیاں پھر سے دنیا میں آجاتیں — ایک میری ماں اور دوسری صفیہ آپا — جنہیں میں نے ماں ہی کی طرح چاہا —— ہاں بالکل سگی ماں کی طرح — میں جب بہت چھوٹی تھی. تو نماز کے بعد جہاں اور چیزوں کی دعائیں مانگتی تھی وہیں ایک دعا یہ بھی ہوتی کہ "اللہ میاں آپ میری امّی کو جلدی سے واپس بھیج دیجیے" — لیکن یہ بہت — بہت — بہوت بچپن کی بات تھی — کتنے معصوم بچپن کی جب واقعی یہ احساس رہتا ہو کہ گو ہم اپنی مری ہوئی ماں کو واپس مانگ رہے ہیں، مگر وہ ضرور مل جائے گی۔" — لیکن ۱۹ — ۲۰ سال کی ایک سمجھ دار عمر میں، جب زندگی اور موت کے سارے فلسفے سمجھ میں آجاتے ہیں، اور دعاؤں کے قبول ہونے نہ ہونے کا ڈانواں ڈول احساس، خدا کے معبود ہونے کا بھرپور یقین دلا دیتا ہے کہ ہاں خداوند تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اور جو بھی اُس نے حکم دے دیا اٹل ہے اور جو بھی جان اُس نے اپنے پاس بُلالی کبھی نہ واپس کرنے کے لئے بلالی ہے، میں نے اپنی سی ایک کوشش، ایک دعا خدا کے حضور اتنی پکّی عمر میں بھی کی تھی — شاید کوئی یقین کرے بھی نا —— میں نے جب پہلی بار صفیہ آپا کی کتاب — "زیرِ لب" پڑھی اور احساس ہوا کہ کیسی حسرت بھری جان اس دنیا سے یونہی نامراد اُٹھ گئی ہے تو میں نے شبِ قدر میں، ماتھا پٹخ پٹخ کر، سجدے میں گر گر، رو رو کر اللہ سے دعا کی کہ "اللہ پاک تو تو قادرِ مطلق ہے تو جو چاہے کر سکتا ہے تو میری صفیہ آپا کو پھر سے زندہ کردے —" !

میں اختر بھائی کو صفیہ آپا کے ناطے سے جانتی ہوں — اگر میں "زیرِ لب" نہ پڑھتی تو شاید ہی کبھی اختر بھائی سے ملنے، انھیں دیکھنے، انہیں جاننے، انہیں چاہنے اور اُن کے آنسو پونچھنے کی چاہت کرتی۔ صفیہ آپا کے خط کا ایک ایک لفظ، اپنے محبوب سے لپٹا نظر آتا ہے — دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ بہت ساری بیویاں ہوں گی جو اپنے میاں کو چاہتی ہوں گی —— چاہتی ہیں، چاہتی رہیں گی —— لیکن صفیہ آپا کی محبت ایسی دل ہلا دینے والی محبت ہے کہ وہ خود تو محبت میں تڑپیں ہی، جو پڑھتا ہے سنتا ہے وہ بھی تڑپ کر رہ جاتا ہے — صفیہ آپا کی میاں سے ایسی دیوانگی کی محبت مرنے والی کی مٹّی کو بھی چین سے قبر میں نہیں ٹکنے دیتی ہوگی —— میں نے اس شخص کو دیکھنے اور اس خوش نصیب سے ملنے کی تمنّا کی جسے ایسی بے مثال عورت نے یوں دیوانہ وار چاہا ——

اور اس طرح میں نے اختر بھائی کو زندگی میں پہلی بار — آج سے کوئی بیس اکیس سال پہلے پہلا خط لکھا — روتا ہوا خط —— جسے پڑھ کر اختر بھائی نے لکھا تھا —— "اتنے زمانے بعد تمہاری تڑپ اور آنسو دیکھ کر پھر سے صفیہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ مدتوں بعد پھر میرے آنسو نکل آئے —"

میری ماں کا جب انتقال ہوا ہے میں صرف ایک سال کی تھی — میرے ابّا بہت پرانے وقتوں کے تھے انھوں نے کبھی امّی کی تصویر تک نہ کھنچوائی کہ بے پردگی ہوگی —— کہنے سننے ملنے جُلنے والے میری امّی کا ناک نقشہ کچھ یوں بتایا کرتے — سانولا رنگ — کھڑی ناک — چمکدار ذہین آنکھیں اور چہرے پر سدا ایک پیاری سی مسکراہٹ — وہی شبیہ میرے لئے میری ماں تھی جو میرے ننھے منّے تصور نے بنائی تھی —— جب اختر بھائی نے پہلے ہی خط میں مجھے صفیہ آپا کی تصویر بھیجی تو مجھے اس قدر حیرت ہوئی —— ارے یہ صفیہ آپا ہیں — میں اس تصور کو سالوں سے پال رہی تھی — ارے یہ تو میری ماں ہے۔ میری اپنی ماں — "اور پھر سے میرے آنسو برسنے لگے — "کیا میری قسمت میں ماں ہے ہی نہیں —— کیا صرف ماں کا تصوّر — شبیہ اور تصویر — یہی میری کائنات ہے"

واجدہ تبسم

پتھّر

مَیں اُن میکے کی ماری ہوئی عورتوں میں سے ہوں جو کبھی بھی منڈیر پر کوّا پکارے تو یہ طے کر لیتی ہیں کہ ہو نہ ہو یہ میرے میکے کا سندیسہ لایا ہے۔

میکہ ـــ! وہ پیارا لفظ ـ جو ماں، باپ، بہنوں اور بھائیوں جیسی محبت بھری ہستیوں کا مشترکہ نام ہے ـــ میں نے ماں کی صورت دیکھی نہ محبت ـــ سال بھر کی جان جو صحیح طور سے ماں بھی نہ بول پائی اور ماں کی ممتا اور محبت سے محروم ہو گئی ـــ دو سال میں باپ بھی ختم ہو گئے ـــ نانی اماں اور بہن بھائی ـ یہی میرا میکہ ـ یہی میری دنیا ـــ شادی کے بعد نانی اماں بھی چھوڑ کر چلی گئیں ـــ سب بہنیں اور بھائی وقت کی بھیڑ میں اِدھر اُدھر ہو گئے ـ خدا کا شکر ہے کہ سب اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں، لیکن دوری ـ جان لیوا دوری بھی تو بیچ میں حائل ہے ـ بہنیں پاکستان میں ہیں۔ بھائی امریکہ اور کینیڈا میں جا بسے ہیں ـ اور میں دلیس میں ہو کر بھی "پردیسن" ہوں ـــ لیکن دو بھائی میرے، ابھی بمبئی ہی میں ہیں ـــ قیصر بھائی اور ـ اور اختر بھائی ـــ میرا پانچواں بھائی ـ

اس کارگاہِ ہستی میں ایک عجیب و غریب شئے ہے بمبئی ـ گھروں کے فاصلے لاکھ قریب ہوں ـ بمبئی آپ کو مہلت نہیں دیتی کہ ہفتوں، مہینوں، سالوں آپ کسی سے مل پائیں ـ! میرے گھر میں اُس آم کے پیڑ کی ڈالیں گھسی پڑتی ہیں جس کے تنے میں ایک کوّے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا ہے ـ میرے بچے جب کیریاں توڑنے پتھر مارتے ہیں تو کوّا زور زور سے کائیں کائیں کر کے میرے کمرے کی کھڑکی پر بیٹھ کر چلانے لگتا ہے ـ وہ شاید شکایت کرتا ہو کہ دیکھو تمہارے بچے میرا گھونسلا توڑے دیتے ہیں ـ" میں یہ سوچ بیٹھتی ہوں شاید وہ کہتا ہو ـ "آج اختر بھائی آنے والے ہیں ـ"

لیکن اختر بھائی نہیں آتے ـ ویسے ہمیشہ ہی دل میں بسے رہتے والے نہ بھی آئیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا ـ دل کو اگر ایک گھر سے تشبیہ دوں تو اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس گھر کے چار چھ کمروں میں سے ایک کشادہ کمرے میں اختر بھائی کا مستقل قیام ہے ـ اور یہ بھی میں کہہ سکتی ہوں کہ اختر بھائی کے دل میں بھی میرے لئے ایک چھوٹی سی جھونپڑی تو ضرور ہوگی ـ!

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کسی شخصیت پر کچھ لکھنے بیٹھو تو سب سے پہلے بیچ میں "میں" آ موجود ہوتا ہے ـ بعد میں جب مضمون چھپ جائے تو ناقدانِ فن الزام لگاتے ہیں کہ اس میں اپنی ذات کو بہت اُچھالا گیا ہے ـ تنقید کرنے والے یا تو سخت ناانصاف ہوتے ہیں یا سخت احمق ـ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کسی پر کچھ کہتے وقت اپنی ذات کو اچھوت کی طرح الگ بٹھا دیا جائے ـ لیکن اس وقت سب سے عجیب بات تو یہ لگ رہی ہے کہ اختر بھائی پر کچھ کہتے ہوئے نہ اختر بھائی کی شخصیت بیچ میں آ رہی ہے نہ میری ذات ...

اُن کی محبّت کی ——— اُس تڑپ کی جو اُن کے مرنے کے بعد بھی اختر بھائی کو چین نہیں لینے دیتی تھی ——— اور بھی محبت اور کرب کی بے حساب داستانیں ——!

اور پھر یوں ہوا کہ انہی اختر بھائی نے جو صفیہ آپا کے دیوانے تھے ——— اور صفیہ آپا تو خیر انہی کے لئے جئیں اور انہی کے لئے مر گئیں ، انہی اختر بھائی نے سنا کہ دوسری شادی کر لی ——!

میں نے زندگی میں بےحد تکلیفیں جھیلی تھیں ۔ اتنی تکلیفیں کہ جس کی حد و انتہا نہیں ۔ مالی ، جسمانی ، روحانی ، ذہنی ۔ لیکن جب اختر بھائی کی دوسری شادی کی اطلاع ملی تو مجھے اتنی تکلیف ہوئی کہ محض لفظ تکلیف اس جذبے کی شدت کے اظہار کے لئے کافی نہیں ۔ شاید اس کے لئے مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے ——— ایسا لگا کہ اب تک تو صفیہ آپا واقعی زندہ تھیں مری تو اب ہیں ——— اور اپنی موت نہیں مریں ——— اختر بھائی نے انھیں قتل کر دیا ہے ——— کچھ ایسا احساس ہوا کہ صفیہ آپا پر سوکن لا بٹھائی ہے ——— یہ قطعاً الگ موضوع ہے کہ بعد میں جب میں خدیجہ آپا سے ملی تو وہ اتنی محبت والی پیاری سی خاتون نکلیں کہ اگر میں ڈکشنری میں لفظ محبّت کے معنی تلاش کرنے جاؤں تو اس کے سامنے لکھا ہوگا ——— محبت = خدیجہ ——— لیکن خدیجہ آپا کے اچھے ہونے سے اختر بھائی کے جرم پر پردہ نہیں پڑ سکتا ——— میں نے سوچا ایسا نرم دل شاعر اس طرح کا پتھر بھی ہو سکتا ہے جس نے "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" جیسی لافانی اور سوز و کرب میں ڈوبی ہوئی نظمیں کہی ہیں ——؟ اُن دنوں اگر میں نے کوئی ایسا جرم کیا ہوتا جس کے صلے میں مجھے پھانسی کی سزا ہوئی ہوتی اور پھانسی چڑھانے سے پہلے مجھ سے میری آخری خواہش پوچھی جاتی تو میں کہہ دیتی ——" میں اختر بھائی کو شوٹ کر دینا چاہتی ہوں "

اس کے بعد میری اپنی زندگی نے ایک نیا اور خوب صورت موڑ لیا ——— میری شادی ہو گئی اور میں بیاہ کر بمبئی ہی آئی اور شادی کے بعد سب سے پہلی دعوت اختر بھائی اور خدیجہ آپا نے ہی کی ——— اُن کی شادی کے بعد یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی ۔ بظاہر تو کچھ بھی نہیں بدلے تھے ——— وہی کھویا کھویا انداز ۔ وہی اپنے آپ میں گم رہنے کی ادا ——— میں نے اپنے دل میں سوچا ۔ "اس سمندر کی گہرائی ناپنے کون اس میں اُترے" عجیب بات یہ تھی کہ انھیں دیکھ کر رحم کا ایسا جذبہ دل میں بھر آتا تھا کہ شوٹ کرنے کی بات تو دور رہی انہیں کلیجے سے لپٹا لینے کو جی چاہتا تھا ——— کیونکہ پتہ نہیں کیا بات تھی وہ زندگی سے خوش نہیں لگتے تھے ———

بمبئی میں رہ کر اختر بھائی کو قریب سے دیکھنے ، پرکھنے ، سمجھنے کا موقع ملا ——— میری اور اختر بھائی کی دوستی ، رفاقت ، محبت دشمنی بیس سالوں پر محیط ہے ——— اس شخص نے مجھے گلے بھی لگایا ہے ، پیار بھی دیا ہے ۔ کچوکے بھی لگائے ہیں ۔ ایسا ڈھیٹ کرائے دار ۔ ہے جیسے دھکے دے کر بھی دل سے نکالنا چاہوں تو نہیں نکال پاتی ———

ہر انسان کی طرح اختر بھائی میں بھی خامیاں ہیں ۔ خوبیاں بھی ——— کبھی لگتا ہے خوبیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا ۔ کبھی لگتا ہے نہیں خامیاں زیادہ ہیں اس شخص میں ——— ایک واقعہ کبھی نہیں بھول سکتی ۔ وہی کچوکے دینے والی بات ۔ کسی محفل میں مجھ سے گانا سنانے کی فرمائش کی گئی ۔ میں نہیں کہتی ، لوگ کہتے ہیں کہ میں گانا اچھا گاتی ہوں ——— کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت ہی اچھا گاتی ہوں ——— اکثر محفلوں میں جہاں اچھے اچھے گانے والے موجود ہیں ، لوگ مجھے گانے پر مجبور کر دیتے ہیں ——— ساحر صاحب کے ہاں اکثر ایسا ہوا ہے کہ فلمی دنیا کے ایک سے ایک گانے والے موجود ہیں اور ساحر صاحب نے یہ کہہ کر مجھے کھڑا کر دیا ——— " بھئی آپ لوگ تو ہیں ہی گانے والے ۔ پر دیکھئے کہ یہ ہماری رائٹر ——— رائٹر ہو کر بھی اتنا اچھا گا سکتی ہے اور گاتی

اور میں نے رو رو کر سر پٹخ پٹخ کر خدا سے دعائیں کیں کہ مالک میری صفیہ آپا کو پھر سے زندہ کردے ۔۔! میرے لئے ۔ اختر بھائی کے لئے ۔۔ اُن کے معصوم بچوں کے لئے ۔۔ میں اُن دنوں اتنا روتی تھی کہ روتے روتے سوکھ کر کانٹا ہوگئی ۔۔ اور جب اور زیادہ دل بھر آتا تو اختر بھائی کو خط لکھنے بیٹھ جاتی ۔ اختر بھائی میرے خطوں کا خلافِ عادت اور خلاف توقع، بڑی پابندی سے جواب دیتے، ایک بار انہوں نے لکھا بھی تھا ۔۔ "صفیہ کے مرنے پر ۔۔ اس کی کتاب "زیرلب" پڑھ کر کئی لوگوں، عورتوں اور لڑکیوں نے مجھے خطوط لکھے، لیکن جس طرح کے محبت بھرے، آنسو بھرے خط تم لکھتی ہو وہ مجھے بھی اپنی جگہ سے ہلا دیتے ہیں ۔"

یوں اختر بھائی میرے دل میں داخل ہوئے ۔ ہمارے گھرانے میں سخت پردہ تھا ۔۔ میرا اختر بھائی سے ملنے کو بیحد جی چاہتا تھا ۔۔ نانی اماں بیحد پرانے خیال کی ۔۔ بھائی لوگ نانی اماں سے بڑھ کر ۔۔ میں نے اختر بھائی سے ملنے کی چاہت ظاہر کی اور اختر بھائی نے اگلے ہی خط میں لکھا کہ "میں حیدرآباد آرہا ہوں ۔" یہ میرے لئے اتنا بڑا اعزاز تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اختر بھائی صرف مجھ سے ملنے آرہے ہیں ۔۔ مگر یہ حقیقت تھی ۔ اِدھر گھر میں مہابھارت چھڑی ہوئی تھی ۔۔ نانی اماں! اور بھائی لوگ کہتے تھے ۔۔ "سیدوں کی بیٹیاں پردے سے باہر نہیں آتیں ۔۔" میں مر مر کر کہتی تھی میں انہیں شروع سے اختر بھائی کہہ کر لکار رہی ہوں، لکھ رہی ہوں ۔۔ بھائی سے بہن کا کیسا پردہ ۔۔" لیکن کوئی میری بات سننے کو راضی نہ تھا ۔۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کی کوئی ایسی خاص قدر نہیں ہوتی کہ بھوک ہڑتال کریں یا اَٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جائیں تو مطالبہ مان لیا جائے ۔۔ ہمارے گھر کا اصول یہ تھا ۔ لڑکیاں ضد کرتی ہیں تاکہ بڑے انہیں توڑیں ۔۔ مجھے پتہ تھا کہ یہاں کوئی عرض نہیں سنی جائے گی ۔۔ بس میں نے نانی اماں سے کہہ دیا کہ "نانی اماں میں اختر بھائی سے ملوں گی بھی اور آپ کو بھی ملواؤں گی ۔۔" نانی اماں پرانے زمانے کی خاتون تھیں ۔ الف ۔ ب بھی نہیں آتی تھی ۔۔ گھر میں خط آتے تو میں ہی انھیں پڑھ کر سناتی ۔۔ انھوں نے مجھ سے اختر بھائی کے متعلق پوچھا کہ "ہیں کون؟" ۔۔ میں نے نانی اماں کو یہ تو نہیں بتایا کہ وہ شاعر ہیں ۔۔ میں نے کہا کہ وہ صفیہ آپا کے شوہر ہیں ۔۔ اور صفیہ آپا کے سارے خطوط روتے اٹکتے انہیں پڑھ کر سنائے ۔۔ وہ سارے خطوط میں نے کیوں کر سنائے اور نانی اماں نے کیسے سنے ، یہ الگ داستان ہے ۔۔ میری ماں یعنی نانی اماں کی اکلوتی بیٹی بھی جوان ہی، مرادوں بھری، اس دنیا سے چلی گئی تھیں ۔۔ انھیں اپنی بیٹی یاد آگئی ۔

جس دن اختر بھائی ہمارے گھر آئے ۔۔ نانی اماں سفید کرتا ۔ سفید آڑا دوپٹہ ۔ کالا پاجامہ پہنے ایسی منتظر تھیں جیسے اُن کا بیٹا آنے والا ہو ۔۔ نانی اماں کسی کی آمد کا اہتمام کرتیں تو اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جاتا کہ انھوں نے دھوبی کے ہاں کے دھلے کپڑے پہنے ہیں، ورنہ وہ سدا ہاتھ کے دھلے کپڑے پہنتیں ۔ اُس دن نانی اماں نے دھوبی کے ہاں کے دُھلے سفید سفید کپڑے پہنے تھے ۔ اور سامنے کی سڑک سے کوئی بھی رکشا چھن چھناتا گزرتا تو بے صبری سے پوچھ لیتی تھیں ۔

"اختر میاں آگئے کیا ماں ۔۔"؟

اُس دن جب اختر بھائی ہمارے گھر آئے تو صفیہ آپا کو مرے مدت ہوچکی تھی، لیکن ہم بہنیں اور نانی اماں اختر بھائی سے مل کر یوں روئے جیسے صحن میں صفیہ آپا کی میت رکھی ہوئی ہو ۔

اُس دن اختر بھائی میرے لئے ایک چھوٹی سی خوبصورت رِسٹ واچ لائے تھے ۔ میں نے سوچا تھا اختر بھائی مجھے گھڑی نہیں، وہ گھڑیاں بخش رہے ہیں جو وقت کی پابند نہیں ۔۔ اِن گھڑیوں کی ۔ ان لمحوں کی یادیں امٹ رہیں گی ۔۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔۔

لیکن ایسا نہیں ہوا ۔۔ ۔

اختر بھائی آئے ، ٹھہرے تو کہیں اور تھے، لیکن ہمارے گھر روزانہ آتے تھے ۔ صفیہ آپا کی بے حد باتیں سناتے، بیحد قصے ۔۔

انداز بتا رہے تھے کہ گھر آئے مہمان کو چھوڑ کر نہ جانا، خود انہیں بھی نہیں بھا رہا ہے — مجھے وہ پہلے والا سلسلہ اب یاد آیا جہاں میں یہ سنا رہی تھی کہ مجھے ساحر کا وہ گیت بیحد ہی پسند ہے ؎ چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے۔

اور ہر ہر محفل میں، میں لوگوں کی فرمائش پر وہی گیت سب سے پہلے گاتی تھی (اور گاتی ہوں) بعد میں بھلے ہی کچھ بھی گاتی رہوں — اسی سلسلے میں ایک مزے کی بات یہ بھی ہوئی کہ دہلی میں ایک بار مشاعرے میں لوگوں نے فرمائش کی کہ وہ گیت سنائیں ؎ چاند مدھم ہے — تو ساحر صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا — "جملہ حقوق بذمہ واجدہ تبسّم محفوظ ہیں" بہر حال —

ہر اس محفل میں جہاں میں یہ گیت گاتی اختر بھائی بھی موجود ہوتے ہی تھے — مگر کچھ کہتے نہیں تھے — اب ۲۔۳ سال پہلے کی بات ہے (جب سننے میں آیا تھا کہ اختر بھائی اور ساحر صاحب کی لڑائی ہو چکی ہے) ایک ایسی محفل میں کسی نے مجھ سے گانے کی فرمائش کی — ابھی میں نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ اختر بھائی ایک دم بولے — "واجدہ! خدا کے لئے اب وہی گیت گانے مت بیٹھ جانا — چاند مدھم ہے — کان پک گئے —" میں اختر بھائی سے پوچھنا چاہتی تھی پوچھ نہ سکی — آج پوچھ رہی ہوں کہ جس زمانے میں ساحر صاحب سے آپ کی دوستی تھی اور میں یہی گیت بار بار گاتی تھی اُس وقت ایک بھی بار آپ نے یہ بات کیوں نہ کہی — اُس وقت آپ میں اتنی اخلاقی جرأت کیوں نہیں تھی؟ آپ لوگوں کے ڈر سے، مصلحت پسندی کے تحت اپنے دل کی آواز کو دبا کیوں دیتے ہیں —؟

لیکن میری اس بات سے اختر بھائی کو خودداری اور حمیت پر حرف نہیں آتا — خودداری کی ایسی ایسی منزلیں اختر بھائی نے جھیلی ہیں کہ دیکھ کر دل ٹوٹنے لگتا ہے — لیکن ہاتھ وہ کسی کے آگے نہیں پھیلاتے — مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب اختر بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا — میں بھولنا چاہتی ہوں مگر بھول نہیں پاتی — کیسے جان لیوا دن تھے وہ بھی — میرا چھوٹا بچہ دو یا تین دن کا تھا جب خبر ملی کہ اختر بھائی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے — ساتویں دن میں گھر لوٹ آئی، جانا چاہتی تو جا بھی سکتی تھی لیکن میں نے اشفاق سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے اختر بھائی کو اس حال میں نہیں دیکھ پاؤں گی کہ ناک سے آکسیجن کی نلی لگی ہے — خاموش اور بے بس سے بستر پر پڑے ہوئے ہیں — خدا کرے وہ جلدی سے اچھے ہو جائیں — بس آپ مجھے اُن کی خیریت کی خبر سناتے رہئے گا — فون کی گھنٹی بجتی تو میرا دل باہر نکل پڑتا — میرے خدا خیریت کی خبر سنانا — میں نے فون ریسیو کرنا چھوڑ دیا تھا — اشفاق سے کہہ دیا تھا کہ باہر سے آتے ہوئے گاتے ہوئے گھر میں داخل ہوا کیجیے تاکہ میں سمجھ لیا کروں کہ خدا کے فضل سے اختر بھائی اچھے ہیں — تبھی آپ ہنستے گاتے ہوئے گھر میں داخل ہو رہے ہیں — میرے میاں دنیا کے سب سے بُرے گانے والوں میں سرِ فہرست رکھے جا سکتے ہیں — لیکن اُن دنوں جب وہ اپنی بھونڈی آواز میں گھر میں گاتے ہوئے داخل ہونے تو میں سوچتی "اتنا اچھا گیت گانے والا دنیا میں اور بھی کوئی ہو سکتا ہے؟"

پھر جب اختر بھائی کی طبیعت کافی سنبھل گئی تو میں انہیں دیکھنے کے لئے گئی — بڑے نڈھال اور کمزور نظر آ رہے تھے، مگر چہرے پر وہی معصومیت اور مسکراہٹ — میری آنکھیں بھری ہوئی تھیں بات منہ سے نہ نکلتی تھی — اُلٹے اختر بھائی مجھے دلاسہ دے رہے تھے — "سب ٹھیک ہو جائے گا — ویسے اب بھی اللہ کا فضل ہے بس چند دنوں کی بات ہے —"

اس کے بعد اختر بھائی پر واقعی خدا نے فضل کیا اور چلنے پھرنے بھی لگے — اور کام دھندے سے بھی لگ گئے — ڈاکٹر نے سیڑھیاں چڑھنے منع کیا تھا — اختر بھائی دوسری منزل پر رہتے ہیں — اس قدر میرا دل ٹوٹتا ہے کہ کتنی تکلیف اُٹھا رہے ہیں لتنے پیسے پاس نہ تھے کہ گراؤنڈ فلور پر کوئی گھر لے لیتے — ایک دن میں نے پوچھا —

"اختر بھائی، ساحر صاحب کا ایک گھر "پرچھائیاں" میں گراؤنڈ فلور پر ہے اور بالکل خالی پڑا ہے ..... ابھی میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اختر بھائی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا — "بس — بس بس — یہی ایک بات نہیں" ایسے کتنے واقعے میرے دل و دماغ میں تازہ ہیں کہ جہاں کہیں ایسی بات آئی اور اختر بھائی نے بات وہیں کاٹ دی —

ہے — "گانا میں نے کبھی سیکھا نہ شوق ہی ہے۔ ویسے ہر انسان تھوڑا بہت گا ہی لیتا ہے — مجھے مدتوں سے ساحر صاحب کا یہ گیت بےحد پسند ہے ؎ چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے" اکثر محفلوں میں وہی گاتی ہوں۔ ذرا رکیے یہ تو دوسرا سلسلہ نکل آیا۔ پہلی بات ختم کر لوں۔ کسی محفل میں میں نے ایک نعت گا دی — محفل کچھ ادبی قسم کی تھی۔ لوگوں نے مجھے بڑی حیرت سے دیکھا — تقریباً سارے ہی شاعر اور ادیب جمع تھے۔ کچھ چاؤں چاؤں سی ہونے لگی — مخدوم محی الدین مجھے بےحد چاہتے تھے۔ کسی نے کچھ اعتراض کیا تو مخدوم بھائی بولے — "بھئی یہ اس کے دل کی بات ہے۔ نعت گاتی ہے تو گانے دو۔" اس محفل میں سجاد ظہیر بھی تھے۔ مجھے نہیں پتہ انہوں نے کیا کہا — بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جس محفل میں مجھ سے گانے کی فرمائش کی جاتی — میرے شروع کرنے سے پہلے اختر بھائی طنز اور کچھ ہنسی سے بولتے — "گانا —؟ نہیں بھئی واجدہ تو نعت گائے گی۔" یہ سلسلہ کوئی ۶-۷ سال چلتا رہا۔ پھر 'بلٹز' میں ایک سلسلہ شروع ہوا 'پرانی یادیں یا پرانی باتیں' — کچھ ایسا ہی عنوان تھا — جب اس سلسلے میں اختر بھائی لکھنے لگے تو ایک بار انھوں نے ایک چھوٹا سا واقعہ لکھا — عنوان تھا — "پاگل لڑکی" — جس میں انھوں نے دلی میں ہوئی اس ادبی محفل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ حیدرآباد کی واجدہ تبسم بھی اس محفل میں مدعو تھیں اور جب افسانہ پڑھنے کے لئے ان کا نام پکارا گیا تو انھوں نے آکر نعت گانی شروع کر دی۔ اس پر بنّے بھائی (سجاد ظہیر) بولے کہ بھئی یہ کس پاگل لڑکی کو تم لوگ پکڑ لائے ہو۔"

بس اُس دن میرا پیمانہ چھلک گیا — میں نے بلٹز کے انہی صفحات پر اختر بھائی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا — میں اب بھول رہی ہوں لیکن متن یاد رہ گیا ہے۔ کچھ یہ لکھا تھا کہ "نعت تو حضور سرورِ کائنات کی تعریف ہوتی ہے — اور میں اس بات پر شرماتی نہیں ہوں کہ میں حضورؐ کی تعریف میں کچھ کہوں، گاؤں یا پڑھوں تو یہ سوچوں کہ لوگ کیا کہیں گے — جبکہ میں آئے دن اپنے آس پاس یہ دیکھتی ہوں کہ لوگ اپنے ہی جیسے بے مایہ لوگوں کی خواہ مخواہ تعریف خوشامد چاپلوسی کرتے ہیں تاکہ تھوڑا بہت کام نکل جائے — تو "لوگ" جب حقیر لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے شرماتے نہیں تو میں دنیا کی اُس عظیم ترین ہستی کی تعریف کرتے کیوں شرماؤں جس کی خوشنودی ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔" اور اسی طرح کے چند جملے تھے — اس حادثہ کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ دن اور آج کا دن (اور اس بات کو بھی کم سے کم ۶-۷ سال گزر چکے ہیں) پھر کبھی اختر بھائی نے یہ جملہ نہیں دہرایا کہ "ہاں بھئی واجدہ تو نعت گائے گی —" ممکن ہے اختر بھائی کو میرے الفاظ نے یہ احساس دلایا ہو کہ واقعی وہ ایک طرح سے حضورؐ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں — کیونکہ جہاں تک میں سوچتی ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نعت گاتی یا غزل یا گیت — اختر بھائی کو کیا فرق پڑتا؛

اختر بھائی کی ایک چیز جو اور مجھے کبھی پسند نہ آئی وہ مصلحت اندیشی کے تحت ان کا باتوں کو پی جانا اور خاموش رہ جانا — ایک بار اختر بھائی کے ہاں میں اور میرے میاں کھانے پر مدعو تھے — اُن دنوں ساحر صاحب اور اختر بھائی میں شدید دوستی تھی، اکثر یہ ہوتا کہ ساحر صاحب آتے اختر بھائی کو لے کر چلے جاتے اور پھر دوسرے دن کہیں واپس آتے — ہفتہ میں دو تین بار کا معمول تھا — مرد دن بھر باہر رہے تو عورت کو غصہ نہیں آتا۔ لیکن رات کو وہ اپنی ملکیت سمجھتی ہے — شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہر دولہن کی وداعی رات کو ہوتی ہے اور جب پہلی بار وہ میکہ چھوڑ کر سسرال آتی ہے تو ایک خوشیوں اور ارمانوں بھری رات ہی اس کا سواگت کرتی ہے۔ اور یہ پہلا احساس زندگی بھر کے لئے عادی ہو جاتا ہے کہ میں رات کی رانی ہوں — رات میری ہے — یہ میں نے اکثر دیکھا کہ ساحر صاحب آئے، چند منٹ بیٹھے، پھر اختر بھائی کو لے کر چلے جاتے، وہاں شراب کا دور چلتا — شعر و شاعری ہوتی، کھانا ہوتا اور پھر اختر بھائی وہیں رہ جاتے — آپا اس بات پر اس قدر بھناتی تھیں کہ حد نہیں۔ مگر اختر بھائی خاک بھی نوٹس نہ لیتے — اس دن (جس دن کی میں بات سنا رہی ہوں) ہم لوگ کھانے پر مدعو تھے کہ اچانک ساحر صاحب آ گئے۔ کم سے کم میں اپنی جگہ پر یہ سمجھی کہ آج تو میری وجہ سے اختر بھائی رک جائیں گے — لیکن ساحر صاحب کے کہتے ہی اختر بھائی خدا حافظ کہہ کر چلتے بنے مجھے سخت غصہ آیا۔ لیکن کیا کہہ سکتی تھی۔ پتہ نہیں کون سی مصلحت تھی جس کی وجہ سے اختر بھائی خاموشی سے چلے گئے — حالانکہ اُن کے

کہ ساحر صاحب کہتے تو میں نہ بھولتا۔ مطلب یہ کہ اختر بھائی کو ہم لوگوں سے کوئی محبت نہیں۔ بس دکھاوا ہے۔ تو اس دکھاوے اور بناوٹ سے فائدہ ــــ اچھا ہے تعلقات ختم کر دئے جائیں۔"

اور تعلقات ختم ہو گئے۔

اختر بھائی خطوں میں کہتے تھے کہ تمہارے خطوں نے رلا دیا۔ــ صفیہ کی یاد دلا دی ــ میں اپنی جگہ سے ہل گیا ــ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ سب خطوں کی باتیں تھیں۔ میں ہزار بار اختر بھائی سے ملی، لیکن کسی بھی بات پر۔ کسی بھی غم پر، کسی بھی بیماری پر، دکھ پر انہیں روتے نہ پایا۔ "ارے یہ شخص تو پتھر ہے پتھر" میں اپنے دل میں کہتی ــــ یہ شخص اور آنسو ــ؟ ہونہہ ناممکن ــ! لیکن ــ؟

ابھی پونے دو سال پہلے میرے میاں کا ٹرک کا حادثہ ہوا ــ میرا جوان دیور جس کی دس دنوں بعد شادی تھی، موقع واردات پر ہی ختم ہو گیا اور میرے میاں اس طرح واپس لائے گئے کہ پاؤں گھٹنے کے پاس سے چند نسوں کے ذریعہ لٹک رہا تھا۔ بس دو ٹکڑے ہونے ہی والے تھے سمجھئے۔ خدا کو زندگی دینی تھی اور ہاتھ پاؤں سلامت رکھنے تھے ــ ڈاکٹرز خود بھی سمجھتے تھے کہ پیر کاٹ دینا پڑے گا۔ ۶ گھنٹوں تک آپریشن ہوتا رہا ــــ زندگی اور موت کی دوڑ میں خدا نے زندگی کو فتح دی۔ پھر بھی ۴ ــ ۵ مہینے ہاسپٹل میں رہنا پڑا۔ بے حساب لوگ دیکھنے آتے تھے ــ نہیں آئے تو اختر بھائی ــ میں سوچتی اختر بھائی واقعی پتھر ہیں۔ ایسے وقتوں میں تو لوگ ساتھ میں دشمن کو بھی معاف کر دیتے ہیں اور میں تو انہیں دل میں لئے پھرتی ہوں ــ کیا میرے سہاگ کی انہیں اتنی بھی خوشی نہ تھی ــ ہم ہاسپٹل سے گھر آئے، اشفاق بیساکھیاں لگا کر چلتے تھے۔ ایک دن اچانک اختر بھائی کا فون آگیا۔ "واجدہ ــ وہ رک رک کر کہہ رہے تھے ــ میں نے بہت آنا چاہا ــ مگر.... میں اشفاق کو ایسی حالت میں شاید نہ دیکھ پاتا ــ آج.... میں گھر آرہا ہوں۔ تمہارے ــ"

شام کو اختر بھائی اور خدیجہ آپا آئے۔ اشفاق بیساکھیوں کے سہارے اختر بھائی کے استقبال کو اٹھے ــ اختر بھائی نے اشفاق کو بری طرح سینے سے لپٹا لیا ــــ اختر بھائی کا جسم کانپنے لگا۔ میں نے دیکھا اختر بھائی بری طرح آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن لمبے لمبے آنسو ان کے گالوں پر بہہ کر قمیض میں جذب ہو رہے ہیں ــ اختر بھائی آپ نے میرا برسوں کا بھرم کھو دیا ــــ اب میں آپ کو پتھر کیسے کہوں گی ــ!!

اختر بھائی کی ایک اور عادت جس سے میں بیحد چڑتی ہوں وہ یہ کہ وہ "ادھار کھاتے" کے بیحد عادی ہیں ــ اختر بھائی بیس برسوں سے میرے کھاتے میں ادھاریاں رکھواتے پھر رہے ہیں ــ ہر تہوار پر میں ان سے ساڑی مانگتی ہوں اور وہ مزے میں کہتے ہیں ــ "ارے بھئی واجدہ۔ ایک اور جوڑ لو پہلی والی ساڑیوں میں ــ"

ان بیس سالوں میں ایک ساڑی میٹھی عید کی۔ ایک رکھشا بندھن کی ــ اس طرح ہر سال کی دو۔ دو ساڑیوں کے حساب سے چالیس ساڑیاں ہو گئیں۔

پچھلے سے پچھلے سال آپا نے مجھے فون کیا۔ راکھی کا دن تھا۔

"ارے واجدہ۔ تم پاگل ہو۔ آئیں نہیں اب تک۔ اختر صاحب بیٹھے ہیں کہیں گئے نہیں کہ واجدہ آکر راکھی باندھے گی ــ"

اختر بھائی شرابی ہیں ــــ شراب مذہباً حرام ہے۔ شرابی جنت میں نہیں جائیں گے، لیکن اختر بھائی خدائے معبود کے اتنے زبردست معتقد اور حامی ہیں کہ لگتا ہے وہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔ حکایت ہے کسی بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے فرمائش کی میں جیتے جی دیکھنا چاہتا ہوں کہ جنتی کیسے ہوتے ہیں ــ وہ بزعم خود سمجھ رہے تھے خداوند تعالیٰ فرمائے گا تم جنتی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو ــ لیکن ارشاد ہوا فلاں فلاں درخت کے نیچے جاؤ تمہیں ایک جنتی ملے گا۔ وہ بزرگ وہاں پہنچے تو دیکھا ایک شرابی نشے میں دھت پڑا ہے کہ بات کرنے سمجھنے کی تمیز نہیں ــ انہوں نے بمشکل اُسے ہلا جلا کر بات کرنے پر آمادہ کیا اور پوچھا ــ صبح سے جو جو گذری مجھے کچھ سناؤ ــ شرابی نے جواب دیا۔ کچھ بھی نہیں۔ یہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے اُن کے پاس ایک آدمی آیا اور پوچھنے لگا کہ ہاں مولوی صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ ایک سوئی کے ناکے سے اونٹ گذر جائے جیسا کہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن ہوگا ــ مولوی صاحب چلّانے لگے کہ پاگل ہے ، بکتا ہے ، بھلا سوئی کے ناکے سے اونٹ گذر سکتا ہے ــ ؟ پھر وہ آدمی میرے پاس آیا اور وہی سوال دہرایا ــ میں نے کہا "ارے بھائی میرے خدا کی شان اس سے بھی بڑی ہے ، وہ چاہے تو سوئی کے ناکے سے اونٹ کیا پہاڑ گذار دے" بس صبح سے یہی کچھ ہوا ، مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟ ۔ بزرگ رو کر بولے ــ "میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ ان گناہ گار آنکھوں سے جنتی کو دیکھتا ہوں اور اس لئے روتا ہوں کہ میرا ایمان بھی کاش اتنا ہی پختہ ہوتا"

وہ جو اختر بھائی نے نعت گانے پر میری ہنسی اڑائی چھوڑ دی۔ شاید وہ قائل ہو گئے ہوں گے کہ واقعی وہ اتنے سالوں حضورؐ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرتے رہے ہیں ۔ حضورؐ کی حدیث بھی ہے ــ "گناہ ایسی کیفیت ہے جو تیرے دل میں کھٹکے" اختر بھائی گناہ کرتے ہیں تو اس پر شرمسار بھی ہو جاتے ہیں ۔ یہی ایک سچے انسان کی پہچان ہے ۔

میرے ایک بچے کو نمونیہ ہو گیا ۔ ڈاکٹر نے برانڈی پلانے کو کہا ۔ ہم ایسے گنہ گاروں کے ہاں برانڈی کہاں ــ فوراً اختر بھائی یاد آئے ۔ میرے میاں نے فون کیا ۔ آپا نے بتایا ساحر صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں ــ انہوں نے وہاں فون کیا ۔ اختر بھائی نے وعدہ کر لیا کہ میں ساحر کے ہاں سے لیتا آؤں گا ــ اور خدیجہ کے بھائی کے ہاتھ سے تمہیں بھجوا دوں گا دس گیارہ بج جائیں گے مگر ــ " دس چھوڑ گیارہ ۔ بارہ ۔ ایک ۔ دو بج گئے ــ نہ کوئی آیا نہ برانڈی لایا ــ بچّے کی طبیعت اتنی خراب کہ ہر سانس پر گمان ہوتا کہ آخری ہے ۔ اسی حالت میں جاگتے جاگتے صبح ہو گئی ۔ اشفاق نے صبح ہی صبح بھنا کر اختر بھائی کو فون کیا ــ

"بھئی میں بھول گیا تھا" اختر بھائی نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

"میرا بچہ مرتا پڑا ہے اور آپ نے سادگی سے کہہ دیا کہ بھول گیا ۔ نہ بھجوانی تھی تو آپ یوں کہہ دیتے"

"سچی کہہ رہا ہوں نا بھول گیا تھا ۔ اصل میں نشہ زیادہ ہو گیا تھا ۔" اختر بھائی نے معذرت کی ۔

اب اشفاق نے تیزی دکھائی ــ مجھے یہ بتایئے کہ اگر ساحر صاحب آپ کو کہتے بھی نشے میں ہوتے برانڈی لانے کو بولتے ، آپ بھول جاتے ۔"

اختر بھائی کی سچائی ملاحظہ کیجئے ــ "نہیں تب شاید نہ بھولتا ۔" بات ختم ہو گئی ــ مگر بات ختم نہ ہوئی ــ یہاں سے ایک طویل لڑائی اور رنجش کی ابتدا پڑی ــ پھر سے کئی دنوں کے لئے بول چال ، فون ، آنے جانے سب بند۔ میں اپنے میاں سے بولی بھی ــ "ارے بابا اللہ میاں خود نہیں چاہتے تھے کہ ہم جیسے نمازی اور پکے مسلمانوں کے گھر میں برانڈی آئے اور معصوم بچے کے منہ میں ناپاک چیز جائے ، مگر میرے میاں کا کہنا تھا کہ اختر بھائی خود اپنے منہ سے اقرار کر چکے ہیں

رہتے ہیں ۔۔ بچیوں کے پاس وہی کپڑے تھے جو پہلے ہوا کرتے تھے ۔ خود اختر بھائی کے پہناوے اور خرچ میں کوئی فرق نہ پڑا تھا ۔ وہی سگریٹ کا برانڈ ۔۔ وہی پوشاک ۔ وہی چپل ۔ وہی صوفہ ۔ وہی اختر بھائی ۔۔ جب جاؤ تب لاکھوں کی باتیں سننے میں آئیں ۔ ایک دن میں اور میرے میاں بہت دیر تک بیٹھنے کے بعد، کھا پی کر چلنے کو ہوئے تو پتہ نہیں اختر بھائی نے کیا محسوس کیا ۔۔ مجھے پتہ نہیں ۔ بہرحال میرے ہاتھ میں چالیس روپے دے دیئے ۔ اور بڑی لجاجت، عجیب سی ندامت اور شرمندگی کے ساتھ بولے ۔۔

"واجدہ میرے پاس میرے اپنے خرچ کے لئے بھی بس اتنے ہی روپے ہیں ۔۔ یہ تم رکھ لو ۔"

"اختر بھائی ۔۔" میں بس اتنا ہی بول سکی ۔ میں نہیں سمجھ سکتی ۔ میری کیا حالت ہوئی ۔۔ اختر بھائی کو یہ کیسے پتہ چلا کہ آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے ۔۔ نہ میں نے کچھ پوچھا نہ انہوں نے کچھ کہا ۔۔ اُس کے بعد میرے ہاتھوں میں کتنے روپے آئے اور گئے مجھے یاد نہیں ۔ چھوٹے بچوں تک کے ساتھ امریکہ تک گھوم آئی مگر وہ چالیس روپے مجھے زندگی بھر کبھی نہیں بھولیں گے ۔۔ ہمدردی، محبت اور مدد کا یہ جذبہ، چاہنے کا جذبہ اختر بھائی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتے ۔ کرنا نہیں چاہتے ۔۔ میرا شاعر بھائی ۔۔ میرا حسین بھائی ۔۔ میرا خوبصورت اور دلکش بھائی ۔۔ میرا اتنا عظیم بھائی ۔۔ میرا وہ بھائی جو ہارٹ اٹیک کا مریض ہے ۔ جو چالیس سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بے دم ہو جاتا ہے اُسے دیکھ کر میرا دل کیسے کیسے کڑھتا ہے ۔ کیا یہ عمر اس قابل نہیں کہ اختر بھائی جیسا شاعر ایک پرسکون سی جگہ بیٹھ کر جی بھر کر لکھے پڑھے، شاعری کرے اور آنے والی نسلوں کے لئے بھرپور خزانے اپنی شاعری کے چھوڑ جائے ۔۔ یہ شاعر جو پل دو پل کا نہیں، صدیوں کا شاعر ہے ۔ جس نے "خاکِ دل"، "خاموش آواز"، اور "آخری لمحہ" جیسی لافانی نظمیں لکھی ہیں ۔۔ اُسے تو ساحل سمندر پر وہ پرسکون محل میسر ہونا چاہیے تھا جس کے لان پر ہری ہری گھاس کا مخملیں فرش ہوتا کہ وہ صبح صبح شبنم سے بھیگے ہوئے ہرے مخمل پر چہل قدمی کرتا، نرم نرم آرام دہ بستر پر سوتا ۔ فکر معاش سے بیگانہ ہوتا ۔ اور دنیائے ادب کو مزید مالا مال کرتا رہتا ۔ کئے جاتا ۔ لیکن یہ بھی اختر بھائی کا ہی حوصلہ ہے کہ اتنی بڑی بیماری جھیلنے کے بعد بھی اس طرح حالات اور دنیا کی نامہربانیوں کا مقابلہ کیا ہے ۔ جینے کا سبق سیکھا بھی اور دوسروں کو سکھایا بھی ۔۔ آج کوئی شاعر سوائے اختر بھائی کے سر اُٹھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلموں کی جدوجہد کے باوجود بھی ادب میں اتنے حسین اضافے کئے ہوں ۔ میں اختر بھائی کی شاعری سے اتنی ہی آگاہ ہوں جتنے اختر بھائی میری افسانہ نگاری سے واقف ہیں ۔۔ ہم دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے ادبی کارناموں سے سروکار نہیں رکھتے ۔ لیکن جب کسی مشاعرے میں میں اپنے اختر بھائی کو شعر پڑھتے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، دنیا میں اتنی پیاری اور حسین شکل بھی کسی کی ہوگی ۔ ؟ شعر پڑھتے وقت اختر بھائی پہ ایک ایسا نور اور حسن چھا جاتا ہے جو صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے ۔۔ یہی نور اور حسن اُن کی شاعری میں بھی موجود ہے ۔۔ میں اختر بھائی کی شخصیت کے بارے میں تو شاید کچھ لکھ بھی سکوں، بھلا میں جاہل اُن کی شاعری کے بارے میں کیا لکھ سکتی ہوں ۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ آج کل اختر بھائی جو بھی کہہ رہے ہیں اُس کی مثال پچھلے دس سالوں کے شعری ادب میں مشکل ہی سے ملے گی ۔۔ اختر بھائی نے خود اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اوروں کی بات تو جانے دیجیے ۔۔ 'گھر آنگن' ان کی ایسی خوبصورت کتاب ہے کہ پڑھتے پڑھتے جی الٹ پلٹ ہو جاتا ہے ۔۔ جی چاہتا ہے اس لکھنے والے کی انگلیاں چوم لی جائیں ۔۔ میں نے یہی کیا بھی تھا ۔ ایک دن اختر بھائی کی دی ہوئی یہی کتاب پڑھتے پڑھتے اُن پر اتنا پیار آیا کہ میں اُٹھی اور سیدھی ان کے گھر پہونچ گئی ۔۔ ویسے اختر بھائی کے گھر میرا پہنچنا کوئی انہونی بات نہیں ہے ۔ کبھی کبھی تو مجھ پر اختر بھائی کے ہاں جانے کے دورے پڑتے ہیں ۔۔ اتنا جاتی ہوں، اور آپا اور اختر بھائی

"اچھا آپ اختر بھائی کو فون دیجئے ذرا ــ" کسی بھی آدمی کی مالی حالت کا پتہ چلانا ہے تو اس کے کچن سے بات شروع کیجئے ـ صحیح علم ہو جائے گا ـ

"اختر بھائی ــ آپ کے ہاں کیا پکا ہے آج ــ" اختر بھائی ہنسے ــ ٹھہرو پوچھ کر بتاتا ہوں ــ (کچھ دیر بعد) ہاں بھئی ماش کی دال ــ مرغ اور کچھ کباب بھی ہیں ـ"

میں ہنس کر بولی ــ "میرے ہاں دال پکی ہے ـ اس کا مطلب ہے آپ سیٹھ ہیں آج کل ــ کچھ امید رکھوں ساڑی کی ــ"

اختر بھائی زور سے ہنسے ــ "صرف کھانا کھانے آجاؤ ــ ساڑی پہلے والی ساڑیوں میں جوڑ لو ـ" اب لگتا ہے اتنی ساڑیاں اکٹھی ہو جائیں گی کہ مجھے ایک ٹرک کرائے پر لینا پڑے گا ــ بس اسی صورت میں وہ ساڑیاں گھر لا سکوں گی

اختر بھائی کسی کی بے بسی کو جتنا انجوائے کرتے ہیں اس کا اندازہ سوائے میرے کون لگا سکتا ہے؟ اس سمے وہ اتنے ظالم ہو جاتے ہیں کہ پوچھئے نہیں ـ میرے خیال میں میرے آس پاس جتنے لوگ ہیں وہ سبھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ہر موضوع پر بات کرنا پسند کرتی ہوں سوائے اپنی افسانہ نگاری کے ـ مجھ سے اگر کوئی یہ بھی پوچھ لے کہ "سناؤ بھئی آج کل کیا لکھ رہی ہو ــ" تو میں بیحد اپ سٹ ہو جاتی ہوں ــ کبھی آخر دوسرے بھی تو موضوع دنیا میں ہوتے ہیں ـ

ایک دن اختر بھائی کے ہاں اردو کے ایک بہت بڑے نقاد کی دعوت تھی ـ اور بھی کئی دوسرے لوگ مدعو تھے ــ شامتِ اعمال سے میں بھی تھی ــ کھانا کھاتے ہی نقادِ محترم نے مجھ سے بڑی عالمانہ قسم کی گفتگو شروع کر دی ــ

"اتنی باریکی سے آپ جزئیات نگاری کس طرح کر لیتی ہیں ــ؟"

"جی ــ؟" میرا حلق کا نوالہ حلق ہی میں اٹک گیا ـ میں نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا ـ سب لوگ مزے سے کھا پی رہے تھے ـ بس اکیلی میری جان مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی ــ (اختر بھائی مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھے جا رہے تھے) ایک دم میری نظر بریانی کی پلیٹ پر پڑی ــ "ارے میں بریانی لئے آتی ہوں ختم ہو گئی ــ" میں پلیٹ اٹھا کر بھاگی ــ واپس آئی تو نقاد صاحب جب تک دوسری توپ داغنے کے لئے تیار ہو چکے تھے ـ

"آپ کے فن کے ادبی محرکات کیا ہیں ـ اس بارے میں اگر تفصیلی طور پر نہیں تو مختصراً بتا سکیں گی آپ؟"

میں نے وہ سارا وقت سخت خلفشار میں کاٹا ـ میں اور اشفاق ہاتھ دھوتے کھڑے تھے کہ اختر بھائی آئے اور میرے کان میں جھک کر بس اتنا ہی بولے ـ

"اور لکھو افسانے ــ" میں اور اشفاق اتنی زور سے ہنسے کہ سارے مہمان پلٹ پلٹ کر ہمیں دیکھنے لگے ـ مگر اختر بھائی اس بلا کے سنجیدہ تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ــ

اختر بھائی بے بسی کو انجوائے ہی نہیں کرتے ساتھ بھی دیتے ہیں ــ میں اس واقعہ کو آج تک نہیں بھولی ـ اختر بھائی "بہو بیگم" بنا رہے تھے ـ روپے پیسے کی ایسی ریل پیل میں نے تو کبھی نہیں دیکھی جو ان دنوں اختر بھائی کے ہاں دیکھی ــ نوٹوں کی گڈیاں کی گڈیاں اختر بھائی کی الماری میں رکھی رہتیں ـ لیکن اختر بھائی کو داد دوں گی کہ کبھی اس روپے کو اپنا نہ جانا ــ آپا کا وہی چڑنا تھا کہ خرچ کو اتنے کم پیسے دیتے ہیں اور مہمان سارا دن کھاتے

سریندر ناتھ ورما

دھرتی کا شاعر

خالی پیریڈ تھا۔ یار لوگ کالج میں گلابی جاڑوں کی دھوپ کی تمازت کا لطف لے رہے تھے کہ اتنے میں صابر دت کہیں سے انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی کتاب "جاں نثار اختر" لے آئے۔ ہم سب نے مل کر اس کتاب میں شامل رومانوی نظموں اور غزلوں کو بڑے چاؤ سے پڑھا اور کئی مرتبہ پڑھا۔ حتیٰ کہ کچھ منظومات ہمیں زبانی یاد ہو گئیں جنہیں ہم اکثر گنگناتے اور کالج کی تقریبات میں گا کر سناتے۔ یہ واقعہ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے کا ہے، اور یہ میرا جاں نثار اختر سے پہلا تعارف تھا۔

سنہ ۱۹۷۰ء میں جب میں بمقام دھرم سالہ ضلع کانگڑہ میں بطور مجسٹریٹ درجہ اول تعینات تھا، وہاں میں نے ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں جاں نثار اختر کے علاوہ سردار جعفری اور کئی دوسرے مقتدر شعراء نے شرکت کی۔ اس ادبی اجتماع کا تذکرہ تمام مقامی اخبارات و رسائل میں رہا۔ اس مشاعرہ کو جو اس دلفریب وادی میں ہوا پندرہ ہزار شائقین نے رات گئے تک نہایت انہماک کے ساتھ سنا اور سراہا۔ اختر صاحب پاجامہ کرتا اور نہرو جیکٹ زیب تن کئے خراماں خراماں اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک جاذبیت تھی، اور چہرے پر ایک لطیف سی مسکراہٹ۔ اور میں نے محسوس کیا عمر کے ساتھ ان میں کافی سنجیدگی اور متانت آگئی ہے۔ ایام جوانی کا وہ لاابالی پن جو اُن کے اس دور کے کلام میں نمایاں تھا اب مفقود ہے۔ اور جب وہ اپنی غزل پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو زندگی کا گہرا تاثر ان کے کلام میں بھی موجود تھا۔ جاں نثار اختر کی شاعری خیالات کی لطافتوں، زبان کی ملائمیت اور احساس کو خوبصورت شعر میں ڈھالنے کی روایتوں سے مالامال تھی۔ ان کی ذات اور زندگی عبارت ہے پیار، خلوص، انسانی رشتوں میں ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کے خلاف ذہنی بغاوت کے رویہ سے۔ اُن کا زندگی کا مطالعہ بہت وسیع ہے، یہی وسیع النظری اُن کی شاعری کا خاصہ رہی ہے۔

علاوہ ازیں اختر کی شاعری میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہے، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ اس دھرتی کے شاعر ہیں۔ ہندوستانیت جتنی ان کے کلام میں رچی بسی ہے اُن کے ہم عصر شعراء میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ اُن کی نظم "امن نامہ" ہو چاہے "اتحاد"، "ہماری تاریخ" ہو چاہے "جشن سیمیں"، اپنے دیس سے ان کا والہانہ عشق ہر جگہ ٹپکتا ہے۔ یہی حال ان کی غزلوں کا بھی ہے وہ اپنی تشبیہیں اور استعارے ہندوستان کی فضا سے لیتے ہیں۔ ان کی محاکات میں بھی یہی رچاؤ ہے۔ اختر صاحب کی رباعیات، جو "گھر آنگن" کے نام سے شائع ہوئی ہیں ان کو پڑھ کر جس عورت کی تصویر اور تصور ابھرتا ہے وہ خالص ہندوستانی ہے۔ اس کا رہن سہن، شوہر پرستی، ماں بننے کی خواہش، اس کا انداز، اس کے اطوار، اس کا لباس اور وضع سبھی کچھ اپنا ہے۔ اختر صحیح معنوں میں ہندوستان کے ترجمان ہیں اور اُن کی شاعری بجا طور پر ہندوستان کی شاعری کہی جا سکتی ہے۔

اتنا کھلاتے ہیں کہ وزن بڑھنے لگتا ہے تو پھر اپنے آپ کو بار بار جانے سے روک لیتی ہوں۔ جو لوگ اختر بھائی کے لاابالی پن اور اپنے آپ میں کھوئے رہنے کی بات کرتے ہیں وہ یہ بات بتانا بھول جاتے ہیں کہ اپنی ذات میں گم رہنے والا یہ شاعر کس قدر خیال والا ہے — چائے، پان، کھانے سے لے کر ہر ہر چیز کا خیال — اتنی خاطر مدارات کرتے ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شاعر ہے کھویا کھویا سا —

آپا کو اختر بھائی سے ایک ہزار ایک شکایتیں ہیں — آپا بے حد اپنائیت سے اختر بھائی کی موجودگی ہی میں مجھے سب بکھیڑے سنانے بیٹھ جاتی ہیں — دیکھو واجدہ — صوفہ کس قدر خراب ہو گیا ہے۔ یہ تمہارے بھائی بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں ایک صوفہ سیٹ کو پیسے نہیں دیتے — واجدہ تم نے کبھی دیکھا کہ میں نے ساڑیوں بلاؤزوں کی شکایت کی ہو۔ لیکن کم سے کم انہیں الماریاں .....

اختر بھائی مسکراتے رہتے ہیں — کچھ بھی نہیں کہتے — غصہ بھی نہیں ہوتے۔ جب آپا خاموش ہی نہیں ہو چکتیں تو اپنی روایتی نرمی اور دھیمی دھیمی آواز میں بس اتنا کہتے ہیں —

"ارے بھئی سب ہو جائے گا —"

میں اس لمحے کا فائدہ اٹھا کر فوراً پوچھ لیتی ہوں "اور اختر بھائی — میری ساڑیاں بھی نا —"

اختر بھائی کھل کھلا کر ہنس دیتے ہیں اور بڑی خوشی سے کہتے ہیں — "ہاں ہاں اس میں تو کچھ شک ہی نہیں —"

میری منڈیر پر پھر کوّا پکارنے لگا ہے۔ میں جاگتی آنکھوں کا ایک خواب دیکھنے لگی ہوں — اختر بھائی لمبی سی گاڑی سے اتر کر میرے ہاں آئے ہیں۔ میں تھالی میں دیے جلا کر، پھول سجا کر، زری کی ساڑی پہن کر اپنے بھائی کی آرتی اتار رہی ہوں — میرا سونے جیسا بھائی۔ جس کے سینے میں موم جیسا دل ہے۔ پتھر نہیں ...... ٭

حنفیہ اختر

پرایا مگر اپنا

صفیہ آپا کا مضمون 'گھر کا بھیدی' ایک ایسا سیر حاصل مشاہدہ اور تجزیہ ہے۔ اختر صاحب کے گھریلو کردار کا اس میں کوئی اضافہ ممکن نہیں تھا ۔۔ لیکن صفیہ آپا کی موت نے انہیں بہت حد تک بدل ڈالا ہے۔ مجھے اختر صاحب کی وہ عبارت یاد آرہی ہے جو انہوں نے زیرلب کی پہلی جلد پر صفیہ آپا کے نام لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر رکھی ہے" ابھی ابھی جب میں نے تمہارے خطوط کا مجموعہ زیرلب تمہارے سامنے رکھ دیا تو تم نے کہا "اختر تم نے اتنا فضول کام کیوں کیا" میں نے کہا۔ میں نے یہ فضول کام نہیں کیا ہے تمہارے خطوط مجھے ایک بہتر سے بہتر انسان بننے میں مدد دیں گے"

اور یقیناً صفیہ آپا کی موت کے غم اور زیرلب کے خطوط نے انہیں بہت سے پہلوؤں سے متاثر کیا۔ صفیہ آپا نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ان کی فطرت میں تھکاوٹ کا احساس نہیں وہ سہارا پاکر بالیدگی سے آشنا ہو سکتی ہے۔ اور اس میں نشوونما ممکن ہے۔ غالباً انہیں یہ سہارا ان کی تحریروں اور ان کے خطوط ہی سے ملا ہو۔ میں اکثر سوچتی ہوں یہ کتنے مہان انسان ہیں۔ دنیا کی یہ ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھانے کی شکتی رکھتے ہیں۔ دنیا ان کے ساتھ کتنا ہی ناروا سلوک کرے وہ ہنستے ہنستے سہہ لیتے ہیں۔ میں اکثر انہیں ایسے سمے "بابو مشائے" کہتی ہوں۔ یہ بنگلہ بھاشا کا لفظ ہے 'شریف انسان'۔ یہ نہیں کہ یہ کائر ہیں۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی اُسکے خلاف قدم اٹھانا تو الگ رہا اس کے لئے برا سوچنا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسے سمے مجھے صفیہ آپا کی یاد آتی ہے ان کی قوت برداشت کے سلسلے میں باقر مہدی نے ان کی شخصیت پر جو مضمون نئے رائٹرس کی میٹنگ میں پڑھا تھا اُس میں بہت صحیح روشنی ڈالی ہے۔

کوئی عورت اپنے مرد کا کوئی ذہنی رشتہ بھی کسی دوسری عورت سے نہیں چاہتی لیکن آپ مانیں یا نہ مانیں میں نے اختر صاحب کو صفیہ کی شخصیت کے ساتھ چاہا ہے۔ بغیر اُن کے انا میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ اُن کے غم میں نڈھال ہونے سے ان میں کتنی خوبصورتی اور کتنی گمبھیرتا مچبر گئی ہے۔ اس بات کی نزاکت کو زیادہ لفظوں میں لکھنے کی شکتی نہیں رکھتی ہوں۔ اور آج بھی میں ان کو اپنے سے زیادہ اُن ہی کا سمجھتی ہوں۔

اکثر محفلوں میں جب اختر صاحب 'خاک دل' یا 'خاموش آواز' سنا رہے ہوں تو بار بار جانے کیوں لوگوں کی نظریں میری طرف اٹھتی ہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے لیکن شاید انہیں مایوس ہونا پڑتا ہو ۔۔ بھوپال میں دو ایک لڑکیاں جو اپنے خیال سے صفیہ آپا کے قریب رہی تھیں میرے اختر صاحب کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد کھنچ کھنچ کر ملتی رہیں جبکہ میں نے صفیہ آپا سے انہیں چھینا نہیں تھا۔ میرا اپنا تو یہ حال ہے اختر صاحب کے ساتھ صفیہ آپا کا عکس میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

یہ بات چھوٹی نہیں کہ صفیہ آپا کے رشتہ داروں نے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ مجھے مان دیا۔ حمیدہ آپا نے مجھے ایک چھوٹی بہن کی

ادب کی دنیا میں اپنا مقام حاصل کر کے جاں نثار اختر نے فلمی دنیا میں بھی اپنی گیت نگاری کا سکہ منوالیا۔ اُن کے کتنے گیت زبان زد خلائق ہوئے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا ایک گیت "یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے" ہندوستان گیر شہرت کی حد تک مقبول ہوا۔ یہ اتنا خوبصورت اور دلکش گیت ہے اور اس کی دھن بھی موسیقار جے دیو نے اتنی حسین مرتب کی ہے کہ میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اس گیت کو ہمارے صوبہ کی سرسبز اور شاداب پہاڑیوں کا نغمہ قرار دے دیا جائے۔ تو مناسب ہوگا۔

جاں نثار اختر نے منوالیا کہ وہ واقعی ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ Genius کہے جانے کے لائق ہیں۔

"جاں نثار اختر کا شمار اس دور کے ممتاز شعراء میں کیا جاتا ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری نے زندگی کا کرب سمیٹا ہے تو دوسری طرف زندگی کے حسن، دلکشی اور مسرت سے بھی دامن بھرا ہے۔ دوست سے بے اعتنائی کی شکایت سہی لیکن اس کے پس پردہ محبت کا جذبہ بھی موجزن ہے۔ اس کی نظم "ایک زخم تمنا اور سہی" سے شاعر کی بلند اخلاقی کا پتہ لگتا ہے۔"

ربابؔ جعفری

"میں تم سے اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے صفیہ کا تذکرہ نکال لیتا ہوں۔ بہر کیف اس کے لئے میں تم سے معذرت نہیں کروں گا۔ یہ تو میری زندگی کا راز ہے۔ شاید تمہیں چاہنے کا راز بھی یہی ہو کہ تمہاری بعض باتیں مجھے صفیہ کی یاد دلاتی ہیں۔ تم اس راز کو جانتی ہو یہ مجھے معلوم ہے تم اپنی اور میری باہمی زندگی میں ایک خفیف سے لمحے کو بھی اس راز کو بھلا نہ دینا ورنہ تم اسی لمحے مجھے کھو دو گی۔"

رہا میرا سوال۔ تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں میں نے اس کی ٹٹلنا کبھی نہیں کی۔ ہاں ان کی کتاب 'گھر آنگن' کی ایک رباعی اس سلسلے میں لکھنا کافی ہے۔ یا ہوگی۔

وہ ضد پہ اتر آتے ہیں اکثر اوقات
ہر چیز پہ وہ بحث کریں گے میرے سات
ہرگز بھی نہ مانیں گے میں جو چاہوں گی
لیکن جو میں چاہوں گی کریں گے وہی بات

○

طرح سو سیکار کیا اور فرید بھائی نے لکھنؤ میں مجھے اپنے گھر اپنی عزیز سمجھ کر مدعو کیا۔

ایک بار حمیدیہ کالج کی ایک محفل میں سردار بھائی، ساحر صاحب، سلام مچھلی شہری سبھی موجود تھے۔ اختر صاحب نے گیان چند کی فرمائش پر "خاموش آواز" سنائی۔ سلام نے یہ سمجھا کہ شاید مجھے اچھا نہ لگ رہا ہو۔ سلام کو نہ جانے کیوں میری دل جوئی کا خیال ستانے لگا۔ انہوں نے بالکل ہی شاعرانہ انداز میں سوچا ہوگا۔ یہ بہت جذباتی ہو گئے۔ اختر صاحب کی نظم ختم ہوتے ہی اس نظم کی فرمائش کر ڈالی اور سنانے کے لئے بہت زبردستی کی جو انہوں نے میرے بارے میں کہی تھی۔ آپ یقین جانئے یہ بات میرے لئے مصیبت بن گئی۔ 'خاموش آواز' میرے ذہن میں گونجتی رہی۔ صفیہ آپا کے لئے میری بے حد عقیدت کا یہ حال ہے۔ اس کا میں کوئی ثبوت تو دینا نہیں چاہتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی شبنم (عنیزہ) کی پیدائش پر جو پہلا فراک اس کے گلے میں ڈالا تھا وہ صفیہ آپا کے کرتے کو کاٹ کر میں نے سیا تھا۔

اختر صاحب کی نازک مزاجی کے بارے میں صفیہ آپا نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "اختر صاحب کی نازک مزاجی کو گوارا بنانے کے لئے گاندھی جی کے اہنسائی قلب و جگر کی ضرورت ہے خواہ اپنا دل شیشے سے سوا نازک کیوں نہ ہو۔ اکثر جو مثالیں انہوں نے دی ہیں وہ بالکل ویسی ہی ہیں۔ تبدیلی ان کے مرنے سے ہی آئی ہے کہ یہ بہت ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کا دل شکستہ تر ہو چکا ہے۔ کبھی وہ اپنی صفیہ کو بھول نہیں سکتے ہیں۔ آج بھی وہ 'خاک دل' یا 'خاموش آواز' ٹھیک سے سنا نہیں سکتے ہیں اُن کی آواز بھر جاتی ہے۔ آنسوؤں کو پی جانے کے لئے درمیان میں رہ رہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ جیسے آگے کیا کہا ہو سوچ رہے ہوں۔ اختر صاحب نے ایک نظم اور کہی ہے۔ صفیہ آپا پر مجھے دو شعر یاد ہیں۔ انھوں نے جیسے اپنے آٹوگراف میں لکھا ہے تم نے مجھے ہمیشہ اچھا بننے میں مدد دی ہے اس نظم میں وہی بات دوہرائی ہے۔

تم ایسی ویسی محفل میں اکتا کے اگر جا بیٹھو گے
میں چپکے آؤں گی اور تم کو اٹھا لے جاؤں گی
اوروں سے خفا کیا ہوتے ہو اپنے سے خفا ہو جاتے ہو
تم چاہے کسی سے روٹھے ہو میں تم کو منانے آؤں گی

اختر صاحب کی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے جو خط انہوں نے مجھے لکھے اُن میں اکثر صفیہ آپا کا تذکرہ ہوتا تھا۔ میں اُن خطوط کے ایک دو اقتباس دیتی ہوں تاکہ صفیہ آپا سے اُن کی محبت کا اندازہ ہو سکے۔

"عورت کے بارے میں رسکن Ruskin نے لکھا تھا کہ مرد کے سینے پر عورت ہی کے نرم و نازک ہاتھ نیکی کا زیور سجاتے ہیں۔ آج کی عورت نے اس خدمت کو پوری طرح اپنایا ہے۔ وہ اپنی نیکی سے مرد کو نیکی سکھاتی ہے اپنے سماجی اخلاق سے مرد میں سماجی اخلاق پیدا کرتی ہے۔ خود زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے کر مرد کو زندگی کی جدوجہد کا سبق دیتی ہے۔ ایسی عورت کی جھلک تم "زیر لب" میں پڑھوگی۔ خود صفیہ کے کردار میں پاؤگی۔ وہ اگر مجھ سے شدید محبت کرتی تھی تو اس لئے کہ خود اسے میری محبت حاصل تھی۔ میں جب کبھی بھی اس سے کہتا تھا کہ صفیہ میں تمہیں چاہتا واہتا نہیں ہوں۔ تو ہمیشہ کہا کرتی تھی 'اختر تم اپنے منہ سے کبھی اعتراف نہ کروگے لیکن مجھے معلوم ہے تم مجھے بہت چاہتے ہو۔ ہاں جس دن میں یہ محسوس کروں گی کہ تم مجھے واقعی نہیں چاہتے اس دن میں تمہارے ساتھ خود بھی نہیں رہوں گی کیونکہ وہ تو صرف جسم فروشی رہ جائے گی جس کے لئے میں کسی قیمت پر تیار نہیں۔ تم اس کے خطوط کو بہت غور و خوض سے پڑھنا۔ تمہیں نئی عورت کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی۔"

میرے پسندیدہ گیت کار

جاں نثار اختر

کے

لئے

نیک خواہشات

راجیش کھنہ

اپنے محبوب شاعر

جاں نثار اختر

کے

لیے

خلوص عقیدت کے ساتھ

دھرمیندر

جاں نثار اختر

کیلئے

"ہم نے چاہا ہے تمہیں، چاہنے والوں کی طرح"

راج کھوسلہ

(فلمساز، ہدایتکار)

خوبصورت لب و لہجہ

کے شاعر

جاں نثار اختر

کے لئے

دلی عقیدت

گلزار

(فلمساز، کہانی کار، ہدایتکار)



سحر ہونے تک

غیر مطبوعہ کلام

نیارگ وید

آؤ نیا رگ وید لکھیں
انسان کیا تھا آج بنا کیا، سمے سمے کا بھید لکھیں
آؤ نیا رگ وید لکھیں

صدیاں بیتیں انساں نے جب پہلے پہلے گیت بُنے
آنکھوں میں من جوت جلائی، سانسوں میں سنگیت بُنے

پل پل بہا اندر کی گائی، بادل بادل جھوم اٹھا
لمحہ لمحہ امبر جھک کر دھرتی کا منہ چوم اُٹھا

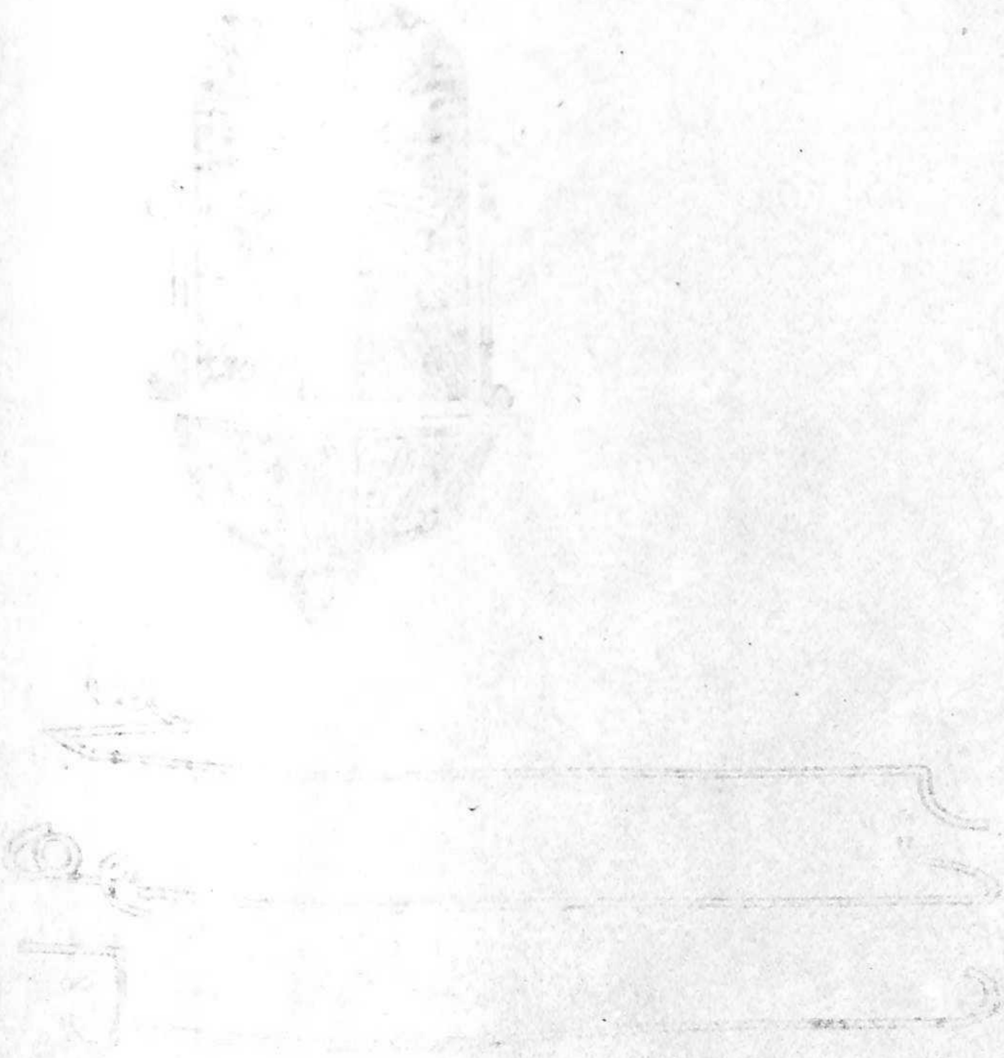
قدرت کا ہر منظر اس کو اپنے سے بلوان لگا
سب کچھ اُن کو اُن کی شکتی اُن کا ہی وردان لگا

پیاس بجھاتی ہر اک ندی کو دیوی کا استھان دیا
سرسوتی کے ہاتھ میں اس نے جگ کا سارا گیان دیا

آپ قناعت کر کے بیٹھا، اُن کو سارے کام دیئے
اپنی لالچ اپنے ڈر کو جانے کتنے نام دیئے

سینس نوا سئے، کر جوڑے جب اوشس جھانکی بھور بھئے
مانو کتنا بھولا بھالا دھرتی سے آکاش کہے

ایک سی صبح و شام مگتی آخر، دنیا کا من اوب گیا
ڈھیرے ڈھیرے بھولی بھولی سوچ میں انساں ڈوب گیا



پہلا سفر

(اپنشدوں کی روشنی میں)

ذہن آدم پہ کئی صدیوں تک
چھایا چھایا تھا دھندلکا کوئی
زندگی مہر بہ لب تھی کب سے
کتنی رسموں کے شکنجوں میں اسیر
اک گھٹن حبس کا عالم جیسے
نہ تصور، نہ تخیل، نہ ضمیر
توڑ کر تنگ عقیدوں کے حصار
چل پڑے کتنے مسافر جانے
کوئی رہبر، نہ کوئی راہ نما
تن بہ تقدیر، اکیلے، تنہا
اک طلب، ایک تڑپ ایک تلاش
ذہن میں کتنے سوالوں کی خراش

رہ گئے کتنے بھٹک کر جانے
کوئی راہب کوئی پاشان بنا
ترک دنیا کہیں ایمان بنا
اور کچھ تھے کہ جو اپنی دھن میں
اس طرح کھوئے کہ منزل پائی

عقل انسان کی رہبر ہے مگر
صرف تہذیب جہاں کی حد تک
صرف تعمیر جہاں کی حد تک
صرف تکمیل جہاں کی حد تک

سورج جیسے اُدھر کھڑا ہے، بھاگ گئی ہر چھاؤں کہاں
دن کے ہوتے کھو جاتا ہے تاروں کا وہ گاؤں کہاں

من میں صدیوں کھوج چلی تو گیان کا مدھم راگ اُٹھا
رفتہ رفتہ انساں میں تب ذات کا عرفان جاگ اُٹھا

صدیوں کا ہر جادو ٹوٹا، اپنی جانب دھیان گیا
اپنی قوت، اپنی طاقت، اپنا کس بل جان گیا

اگنی، ماٹی، جل اور وایو سب پر اس کا راج بنا
کل کی بگڑی حالت سدھری، کل کا بگڑا کاج بنا

دھرتی ورے راہ تراشی، اونچے پربت توڑ دیئے
ساگر کی تہ ناپ کے لایا، ندیوں کے رُخ موڑ دیئے

دھاراؤں سے بجلی کھینچی، شہروں کو خورسند کیا
ایٹم کی شکتی کو اپنی مرضی کا پابند کیا

موسم اس سے بازی ہارے ایسا اس نے داؤں چلا
ہاتھ بڑھا کر تارے توڑے، چاند پہ رکھ کر پاؤں چلا

اس کی قوت فطرت کے سب رازوں کی پہچان بنی
کل تک جو مخلوق تھا اس کی خالق جیسی شان بنی

کل کا ہر مفروض تصور ذہنوں سے نابود ہوا
کل جو انساں آپ تھا ساجد، آج وہی مسجود ہوا

آؤ جس نے سب کو جیتا، اس کا جیون بھید لکھیں
آؤ نئے ہم گیت بنائیں
آؤ نیا رگ وید لکھیں

آدمی کا گیت

یہ زمیں، یہ فلک، یہ ہوا
سب مرے جسم کے انگ ہیں
یہ شفق، یہ چمن، یہ فضا
سب مرے مختلف رنگ ہیں
زندگی کا فسانہ ہوں میں
خود سمے، خود زمانہ ہوں میں

میرے اعضاء سے نسلیں اُگیں
آدمیت کی فصلیں اُگیں
پر کبھی میں نے سوچا نہ تھا
نسل اور آدمیت کبھی*
چار ورنوں میں ڈھل جائے گی
اک چھری مجھ پہ چل جائے گی
انگ سے انگ کٹ جائے گا
جسم ٹکڑوں میں بٹ جائے گا

اور اب اپنے ٹکڑے لئے
پھر رہا ہوں کہ شاید کوئی
مجھ کو پھر جوڑ دے، اور میں
پھر وہی راگ اپنا سکوں
پھر وہی گیت دوہرا سکوں
یہ زمیں، یہ فلک، یہ ہوا
سب مرے جسم کے انگ ہیں

---

* یہ عنوان رگ وید کے دسویں حصے کے ایک بھجن سے لیا گیا ہے۔ بھجن میں انسان کی حیثیت ایک "کُل" کی ہے۔ اس بھجن کو جس میں چار نسلوں کا ذکر ہے۔ دو نوں اور ذاتوں کا مبداء کہا جاتا ہے جو بعد میں متعین کی گئیں۔

آتما جوہر انسانی ہے
اور برہم جوہر کل عالم ہے
کام دیتے نہیں یاں عقل و حواس
صرف وجدان بنا اصل اساس

جو نہ محسوس تھا، محسوس ہوا
جو نہ معلوم تھا معلوم ہوا
یہی وجدان حقیقت کا شعور
یہی وجدان ہے "آنند" کا نور
حرف آنند ہے اک حرفِ نجات
اور انسان کو اس طرح لگا
مل گیا آبِ بقا، آبِ حیات

تشنگی پھر بھی بجھائے نہ بجھی
تشنگی آج تلک طاری ہے
ذہن انساں کا سفر جاری ہے

ابھی رگ رگ میں اپنی زندگی کی آگ باقی ہے
ابھی تو آرزومندی کا دل میں راگ باقی ہے
تو آؤ دوست اس اپنی زمیں کو اک چمن کر دیں
اُبلتے ولولوں کی زندگی نذرِ وطن کر دیں
یقیں رکھنا مرے ہمدم یقیں اس جہدِ پیہم پر
وہ تارا جو ہر اک دل کو خوشی سے گھیر لیتا ہے
وہ تارا زندگانی کے افق پر جلوہ گر ہو گا

ہمارا ملک جو مدّت سے گہری نیند سوتا ہے
یکایک جاگ جائے گا جو اعلان سحر ہو گا
نظامِ کہنہ کے ٹوٹے ہوئے ہر ایک ٹکڑے پر
ہمارا اور تمہارا نام ہی زیبِ نظر ہو گا

(آزاد ترجمہ)

یہ شفق، یہ چمن، یہ فضا
سب مرے مختلف رنگ ہیں
زندگی کا فسانہ ہوں میں
خود سمے، خود زمانہ ہوں میں

وہ دن آئے گا ہمدم

(مشہور روسی شاعر پشکن نے یہ نظم ۱۸۱۸ء میں کہی تھی)

ترانے یہ محبت کے یہ اُمیدوں کی شہنائی
یہ خاموشی سے بڑھتی شہرتوں کی جلوہ آرائی
یہ رنگیں دل ربا دھوکے ہمیں اپنا نہیں پائے
یہ بہلاوے بہت دن تک ہمیں بہلا نہیں پائے
کوئی دم میں جوانی کا فریبِ آرزو ٹوٹا
حقیقت جب کھلی تو یوں طلسمِ رنگ و بو ٹوٹا
کہ جیسے انکھڑیوں سے خواب کوئی دور ہو جائے
کہ جیسے صبح کا کہرا کہیں کافور ہو جائے
دھندلکے چھٹ گئے آنکھوں سے جھوٹی آرزوؤں کے
ہمارے دل میں لیکن زندگی کی شمع روشن ہے
ہوا کیا وقت کے منحوس فولادی شکنجے میں
اگر اپنی تڑپتی روح کا خاموش مسکن ہے
ہماری روح پھر بھی گوش برآواز رہتی ہے
کہ ہونٹوں پر وطن کے ہر گھڑی فریاد و شیون ہے
امیدیں مضمحل ہیں پھر بھی آزادی کے لمحے کا
اسی بے تاب شدت سے ہمیں ہے انتظار اب تک
جو خاصہ ہے فقط ایسے مچلتے نوجواں دل کا
جسے تڑپا رہا ہے وعدۂ دیدارِ یار اب تک

غزلیں

یہ زندگی مجھے کھلتی ہوئی کتاب لگے
ورق ورق کوئی تاریخ انقلاب لگے

لہو میں کاش پگھل جائے روشنی بن کر
یہ ایک داغ جو سینے میں آفتاب لگے

ادائے ناز سے اس درجہ انحراف بھی کیا
ترا نظر نہ چرانا مجھے خراب لگے

ملا ہوں آج، مگر اس میں کوئی جھوٹ نہیں
کہ تو مجھے کوئی دیکھا ہوا سا خواب لگے

نشہ کی چیز یہاں صرف شغل بادہ نہیں
کبھی کبھی تو یہی زندگی شراب لگے

شکستہ میز پہ رکھی ہوئی یہ بند گھڑی
نہ جانے کیوں مری ہر بات کا جواب لگے

رُخوں کے چاند، لبوں کے گلاب مانگے ہے
بدن کی پیاس، بدن کی شراب مانگے ہے

میں کتنے لمحے نہ جانے کہاں گنوا آیا
تری نگاہ تو سارا حساب مانگے ہے

تمام عرصۂ ہستی دھواں دھواں ہے تو کیا
ہر ایک آنکھ محبت کا خواب مانگے ہے

میں کس سے پوچھنے جاؤں کہ آج ہر کوئی
مرے سوال کا مجھ سے جواب مانگے ہے

دلِ تباہ کا یہ حوصلہ بھی کیا کم ہے
ہر ایک درد سے جینے کی تاب مانگے ہے

بجا کہ وضعِ حیا بھی ہے ایک چیز، مگر
نشاطِ دل تجھے بے حجاب مانگے ہے

جو اضطراب بظاہر سکون لگتا ہے
ہر ایک شعر وہی اضطراب مانگے

تانیا

لینن گراڈ میوزیم میں Tanya کا فوٹو اور اس کی ڈائری محفوظ ہے۔ اس ڈائری کے صفحات پر اس آٹھ سالہ بچی نے جرمن حملے کے دوران اپنے بھائی، اپنی بڑی بہن، اپنی ماں، غرض ہر رشتہ دار کے مارے جانے کی تاریخ درج کی ہوئی ہے۔ آخری صفحے پر لکھا ہے "اب میں اکیلی ہوں"
میں نے یہ نظم اس ڈائری سے متاثر ہو کر لینن گراڈ ہی میں لکھی تھی)

دل میں جاگی ہیں دھڑکنیں کتنی
اور ان دھڑکنوں میں لرزاں ہے
تیری تصویر کھوئی کھوئی سی
تیری چھوٹی سی نوٹ بک کے ورق
میری سانسوں میں تھرتھراتے ہیں
ہر صفحے پر لکھی ہے اک تاریخ
آج چاچا مرے سدھار گئے
چل بسے آج میرے باپو بھی
آج میری بڑی بہن نہ رہی
آج مارا گیا مرا بھائی
آج ماں بھی تو مجھکو چھوڑ گئیں
آج تنہا ہوں میں، اکیلی ہوں

تو بہت دور جا چکی لیکن
وقت کی سرحدوں کو ٹھکراتی
پار کرتی لہو کی دھارائیں
پھاندتی بے حساب لاشوں کو
آج بھی آ رہی ہیں کانوں میں
تیری معصوم دکھ بھری آواز
میں اکیلی ہوں، میں اکیلی ہوں

لینن گراد
۱۰ر جون ۷۵ء

آج مدت میں وہ یاد آئے ہیں
در و دیوار پہ کچھ سائے ہیں

آبگینوں سے نہ ٹکرایا کرے
کوہساروں سے تو ٹکرائے ہیں

زندگی تیرے حوادث ہم کو
کچھ نہ کچھ راہ پہ لے آئے ہیں

سنگ ریزوں سے خزف پاروں سے
کتنے ہیرے کبھی چن لائے ہیں

اتنے مایوس تو حالات نہیں
لوگ کس واسطے گھبرائے ہیں

ان کی جانب نہ کسی نے دیکھا
جو ہمیں دیکھ کے شرمائے ہیں

دیدہ و دل میں کوئی حسن بکھرتا ہی رہا
لاکھ پردوں میں چھپا کوئی سنورتا ہی رہا

روشنی کم نہ ہوئی وقت کے طوفانوں میں
دل کے دریا میں کوئی چاند اترتا ہی رہا

راستے بھر کوئی آہٹ تھی کہ آتی ہی رہی
کوئی سایہ مرے بازو سے گزرتا ہی رہا

مٹ گیا پھر تری بانہوں نے سمیٹا نہ مجھے
شہر در شہر میں گلیوں میں بکھرتا ہی رہا

لمحہ لمحہ ہے آنکھوں میں اندھیرے لیکن
کوئی سورج مرے سینے میں ابھرتا ہی رہا

وہ لوگ ہی ہر دور میں محبوب رہے ہیں
جو عشق میں طالب نہیں مطلوب رہے ہیں

اس درجہ وفاؤں پہ یہ اندازِ تغافل
ہم تجھ سے تو کیا آپ سے محجوب رہے ہیں

طوفان کی آواز تو آتی نہیں لیکن
لگتا ہے سفینے سے کہیں ڈوب رہے ہیں

اُن کو نہ پکارو غمِ دوراں کے لقب سے
جو درد کسی نام سے منسوب رہے ہیں

ہم بھی تری صورت کے پرستار ہیں لیکن
کچھ اور بھی چہرے ہمیں مرغوب رہے ہیں

الفاظ ہیں اظہارِ محبت کے طریقے
خود عشق کی نظروں میں بھی معیوب رہے ہیں

اس عہدِ بصیرت میں بھی نقاد ہمارے
ہر ایک بڑے نام سے مرعوب رہے ہیں

اتنا بھی نہ گھبراؤ نئے طرزِ ادا سے
ہر دور میں بدلے ہوئے اسلوب رہے ہیں

عشق خوں نابہ فشانی جو نہیں تو کیا ہے
دل کی تجویز دوانی جو نہیں تو کیا ہے

کیوں نہ اے دوست کلیجے سے لگائے رکھوں
داغِ دل اُن کی نشانی جو نہیں تو کیا ہے

وہ بھی کیا موجِ لہو ہے کہ جو تھم تھم کے بہے
گرم چشموں کی روانی جو نہیں تو کیا ہے

چھائی چھائی ہوئی مقتل پہ نشے کی صورت
میرے قاتل کی جوانی جو نہیں تو کیا ہے

کوئی مبہم سا تصور کوئی مدھم سی خلش
ہجر کی رات سہانی جو نہیں تو کیا ہے

بن گئے میرے سوالوں کا دل آویز جواب
تیری آنکھوں کی زبانی جو نہیں تو کیا ہے

اے مرے ہمدمِ دیرینہ مرے شعروں میں
عمرِ رفتہ کی کہانی جو نہیں تو کیا ہے

گھر آنگن

(رباعیاں)

آواز سے شہنائی کی گونجا ہوا گاؤں
شرما کے دلہن ڈولے میں رکھتی ہوئی پاؤں
مکھڑے پہ وہ دولہا کے جھمکتے ہوئے رنگ
بہنوں کے دوپٹوں کی رنگا رنگ وہ چھاؤں

گلدانوں میں کھلتی ہوئی کلیوں کی چٹک
کمرے میں بسی یہ دھوپ دانی کی مہک
چھڑنا یہ ستارئہ بند ہوتی آنکھیں
گودی میں گری ہوئی دوپٹے کی دھنک

چہرے کے جواں چاند تو کھلتے دیکھے
ہم گیتوں کے دل ربا حسین مکھڑوں میں
لیکن یہ تری پیٹھ کی گہری کھائی
تو جیسے بٹی ہوئی ہو دو ٹکڑوں میں

ہر بات ہے اس کی جس میں صدیوں کا رچاؤ
جو میرے شعور سے قریں لگتی ہے
کہتی ہے سبب بتا نہ پاؤں لیکن
چولھے کی مجھے آنچ حسیں لگتی ہے

جنونِ شہر نوردی نے کیا دیا ہے مجھے
بس اپنی آنکھ سے سب کچھ دکھا دیا ہے مجھے

نہ پوچھ مجھ سے زمانے کا حشر کیا ہو گا
ترے سوال نے پاگل بنا دیا ہے مجھے

میں سوچتا تھا کہ کچھ دن ہیں کٹ ہی جائیں گے
ترے خیال نے لیکن ہلا دیا ہے مجھے

کسی نے ہو نہ ہو دنیا کے اس خرابے میں
خزانہ جان کے شاید چھپا دیا ہے مجھے

ڈرا نہ پائے کبھی لاکھ فاصلے مجھ کو
کبھی بس ایک قدم نے تھکا دیا ہے مجھے

میں زندگی میں بڑی دور تک چلا آیا
کسی کے غم نے بڑا آسرا دیا ہے مجھے

کوئی بھی شے ہو مجھے تو حسین لگتی ہے
اسی نگاہ نے شاعر بنا دیا ہے مجھے

بہت دل کر کے ہونٹوں کی شگفتہ تازگی دی ہے
چمن مانگا تھا پر اس نے بمشکل اک کلی دی ہے

مرے خلوت کدے کے رات دن یونہی نہیں سنورے
کسی نے دھوپ بخشی ہے، کسی نے چاندنی دی ہے

نظر کو سبز میدانوں نے کیا کیا وسعتیں بخشیں
پگھلتے آبشاروں نے ہمیں دریا دلی دی ہے

محبت ناروا تقسیم کی قائل نہیں، پھر بھی
مری آنکھوں کو آنسو، تیرے ہونٹوں کو ہنسی دی ہے

مری آوارگی بھی اک کرشمہ ہے زمانے میں
ہر اک درویش نے مجھ کو دعائے خیر ہی دی ہے

کہاں ممکن تھا کوئی کام ہم جیسے دیوانوں سے
تمہیں نے گیت لکھوائے، تمہیں نے شاعری دی ہے

اُن کی زبانی

ماتھے کا اُجھا اُجھا سا لاگے ٹیکا
رہتا ہے کئی دنوں سے بہنڈا پھیکا
جلتا ہے تجھے مری سکھی ان کے لئے
نقصان کرے ہے کا ہے اپنے پی کا

کمرے کی تپی تپی انگیٹھی سے فضا
وہ نرم لحافوں میں دبکنے کی ادا
آنکھوں میں چمک بن کے بکھر جاتی تھی
چپ چاپ سے کوئلے چٹخنے کی صدا

ہم سے نہ بنا ارے بہانے جھوٹے
کس طرح چھپیں عیش جو شب بھر لوٹے
کہتے ہیں سکھی رات کی باتیں ساری
ریشم کے یہ سیج بند ٹوٹے ٹوٹے

دل میں تو مرا خیال رکھتے ہیں ضرور
خاطر میں بظاہر مجھے لاتے ہی نہیں
ہر بات ادھوری سی سنائیں گے مجھے
پوری مجھے وہ بات بتاتے ہی نہیں

تو یوں ہی سجی لگے ہے اے میری سکھی
آرائشِ حسن تجھ کو کیوں ہو درکار
لاکھا ہو کہ لالی ہو کہ کاجل کہ مسی
اعضا سے ترے بنتے ہیں خود سولہ سنگھار

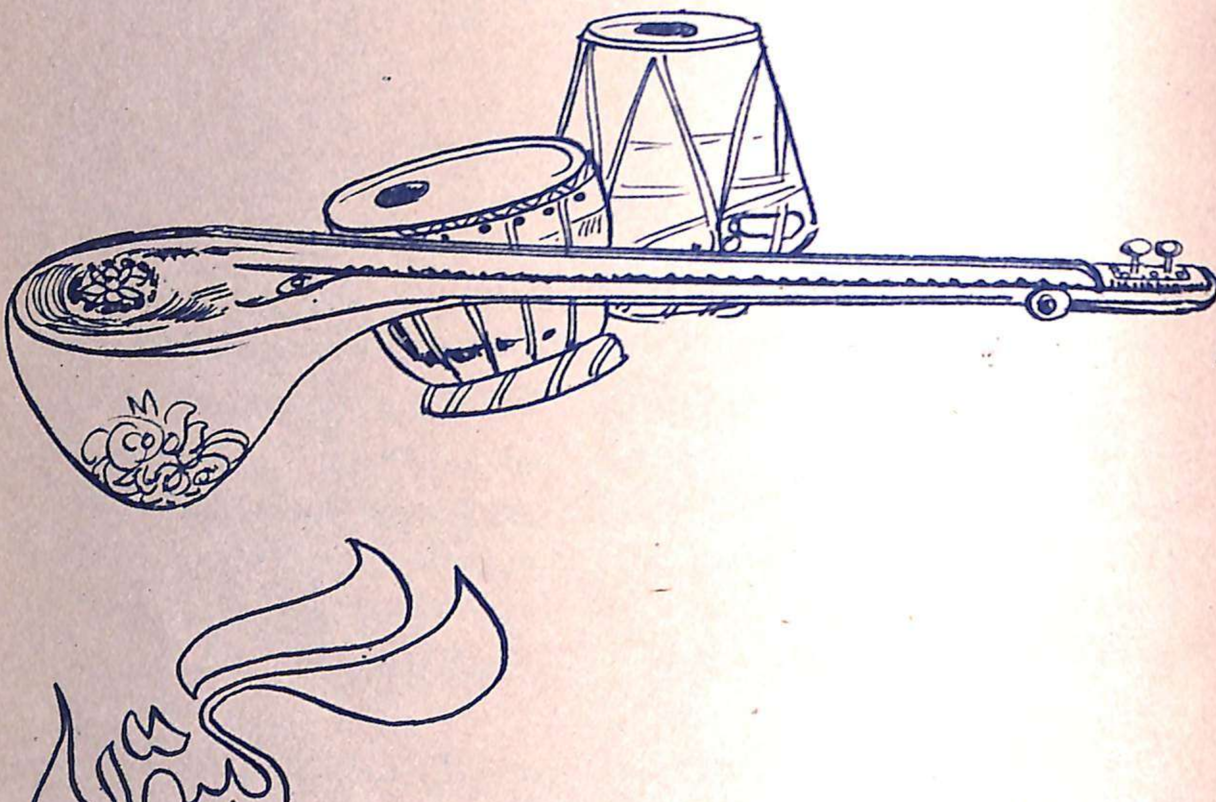
مُسکائے کوئی تو کہکشاں سی چھلکے
آنکھوں میں ہزار میکدے سے چھلکے
یہ تیری جوانی کا بلاخیز اُبھار
دوڑے بھی تو سینے سے نہ آنچل ڈھلکے

چپ چپ سی ہے برہ کے صدمے جھیلے
آنکھوں میں لگے ہوئے ہیں غم کے میلے
کیا جانیے کس سوچ میں کھوئی کھوئی
چھلکے پہ بڑی دیر سے روٹی بیلے

ملتی ہے کہاں اس کے سلیقے کی مثال
ہر کام میں اس کے حل نفاست کا کمال
دیکھے تو کوئی اُس کی کلائی کا گھماؤ
کرچھے سے بگھارتی ہو جب ماش کی دال

شائستہ نگاہ جیسے شبنم کی پھوار
لہجہ ہے کہ پچھلی رات بجتا ہے ستار
یہ تیرا تکلّم، یہ تبسّم، یہ تمیز
ہر حُسن ترے سامنے لگتا ہے گنوار

مجھ سے نہ ملا کوئی بھی ملنے کی طرح
ہر حسن ملا جسم چرا کر مجھ سے
یہ بات میں تیرے لئے کہہ سکتا ہوں
کچھ بھی نہ رکھا تو نے بچا کر مجھ سے



دفتر وہ ابھی ابھی گئے ہیں لیکن
جلدی سے کہیں شام ہو گوری سوچے
آئینے کے سامنے کھڑی پلو سے
گالوں پہ لگی پان کی سرخی پونچھے

آ جاؤ بلاتی ہیں تڑپتی باہیں
آ جاؤ گلے مجھ کو لگا لو بڑھ کر
حد ہوتی ہے بتلاؤ تڑپتے دل کو
بہلاؤں گی کب تلک میں کتابیں پڑھ کر

بس آپ نے پان خود لگایا ہوگا
کر دی ہے مرے لئے مصیبت اچھی
میں سوچ رہی تھی کہ بھلا کتھے میں
چونے کی یہ کس نے ڈال دی ہے چمچی

ہٹو میں ذرا آنچ تو کم کر آؤں
اتنی بھی بھلا کس لیے پی لی دیکھو
تم ہاتھ تو چھوڑو میں ابھی آتی ہوں
جل جائے نہ سگ پتے کی ہانڈی دیکھو

چھڑ جاتی ہے بے نام کہانی کوئی
چھو جاتی ہے دل کو لہر اک انجانی
ہر بار ہنڈولے میں جھلاتا ہے مجھے
مٹی کے گھڑے سے یہ چھلکتا پانی

ہر کمرے میں بکھری ہیں کتابیں ان کی
پھر آئے خطوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں
وہ آپ سلیقے سے تو کیا رکھیں گے
میں ان کو اٹھاتی ہوں تو جھلاتے ہیں

نرگس دت

ایک خط

عزیزم صابر دت!

تمہارا رسالہ "فن اور شخصیت" دیکھ کر خوشی ہوئی اور ساتھ میں حیرت بھی ہوئی کہ اس دورِ گرانی میں تم نے اتنا ضخیم رسالہ کیسے نکال لیا۔ اکثر لوگوں کو میں یہ کہتے سنتی ہوں کہ آج کل اردو پرچے نکالنا یا اردو میں کتابیں شائع کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے میں نہیں جانتی پر اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے ہندوستان میں اردو پسندوں اور اردو پرستوں کی کمی نہیں ہے۔ انہیں میں اردو نواز بھی ہیں۔ یہ زبان ملنسار اور مخلص ہے اور ہر مذہب اور ہر ذات کے آدمی کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہے۔ چنانچہ آج اردو ہندوستان کے چپّے چپّے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور غیر اردو داں حضرات آج یہ زبان سیکھنا چاہتے ہیں بلکہ سیکھ رہے ہیں۔ اور اس زبان میں اخبارات اور رسائل کسی بھی دوسری ہندوستانی زبان کے مقابل کم نہیں نکلتے۔ پریس رجسٹرار کی رپورٹ کے مطابق اردو کا شمار ان دو چار زبانوں میں ہوتا ہے جس میں تعداد کے لحاظ سے اخبارات اور رسائل بہت زیادہ چھپتے ہیں۔ جب زیادہ چھپتے ہیں تو ظاہر ہے بکتے بھی ہوں گے اور اگر بکتے ہیں تو گھاٹے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خیر میں تمہارے رسالے کی بات کر رہی تھی اور لے بیٹھی دوسری باتیں۔ تم نے اپنے رسالے کے پہلے ہی شمارے کو نمبر کی شکل دی ہے۔ یہ میں سمجھتی ہوں کہ اردو دنیا میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی رسالہ کا پہلا شمارہ اتنا ضخیم نکلا ہو اور اتنا مقبول ہوا ہو۔ دوسری بات یہ کہ تم نے نمبر نکالنے کے لئے مہندر ناتھ کا انتخاب کر کے اپنی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ مہندر ناتھ کی شخصیت واقعی اس کی مستحق تھی۔ مہندر ناتھ اچھے ادیب ہی نہیں اچھے انسان بھی تھے۔ ان دونوں خوبیوں کا یکجا ہونا مشکل ہے انہیں وہ مقام دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔ تم نے "مہندر ناتھ یادگار نمبر" میں ہندو پاک کے مشاہیر قلمکاروں سے مہندر ناتھ پر مضامین اور مقالے لکھوا کر شائع کئے ہیں۔ اور ان کی تخلیقات کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح مہندر ناتھ کا فن اور ان کی شخصیت کے کئی پہلو روشن ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس نمبر کی اشاعت کے بعد مہندر ناتھ کا ادبی مرتبہ اور بلند ہو گیا۔

میں فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے باوجود بہت مصروف رہتی ہوں۔ گھریلو کام کے علاوہ باہر کے کام میرا مطلب سوشیل کام اتنے رہتے ہیں کہ میں بڑی مشکل سے ہی پڑھنے اور لکھنے کے لئے وقت نکال دیتی ہوں۔ میں ابھی "مہندر ناتھ نمبر" ہی پورا پڑھ نہیں پائی تھی کہ تم نے "جاں نثار اختر نمبر" کا اعلان کر دیا اور سنا ہے کہ اس نمبر کے لئے مختلف مکتب خیال کے لوگوں نے مضامین اور مقالے لکھے ہیں اور یہ "مہندر ناتھ نمبر" سے زیادہ ضخیم ہو گا۔ تم نے اس نمبر میں مجھ سے لکھنے

نوشاد
(موسیقار)

اچھّی شاعری کا حُسن

غالباً ۱۹۴۷ء کے وسط کی بات ہے ملک کی سیاسی فضا انتہائی خراب ہو چکی تھی۔ چاروں طرف سے بڑھتے ہوئے قتل و غارت گری کے سیلاب نے رفتہ رفتہ عروس البلاد بمبئی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ڈائرکٹر ایس۔ یو۔ سنی، شکیل بدایونی مرحوم اور میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے نکل جائیں اور جب اس طوفان کے تھمنے کے آثار نظر آنے لگیں تب واپس آجائیں۔

بھوپال اُن دنوں نسبتاً محفوظ مقام تھا۔ چنانچہ نظر انتخاب بھوپال پر ٹھہری اور ہم تینوں خاموشی سے بھوپال جا پہنچے۔ منجھلی بیگم صاحبہ کے بھائی محمد میاں کے یہاں قیام کیا۔ ہم لوگوں کے قیام کے دوران وہاں کے مشہور و محترم شاعر حامد سعید مرحوم نے اپنے دولت کدے پر ایک مخصوص شعری نشست کا اہتمام فرمایا اور ہم لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ اسی مخصوص نشست میں پہلی بار جاں نثار اختر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اختر صاحب نے نظمیں بھی سنائیں اور غزلیں بھی۔ اُن کے کلام نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ ایسے خوبصورت اشعار کہنے والے شاعر کو فلموں میں ضرور آنا چاہیے۔ لیکن چونکہ اختر صاحب اس وقت ایک بے حد باعزت عہدے پر فائز تھے یعنی کسی کالج میں پروفیسر تھے اس لئے میرے دل کی یہ بات میری زبان تک نہ آسکی۔ کچھ دنوں کے بعد ہم لوگ واپس بمبئی آگئے۔ لمحے دنوں میں اور دن مہینوں میں بدلتے رہے۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ اختر صاحب ملازمت سے مستعفی ہو کر بمبئی آگئے ہیں۔ گاہے بگاہے ان سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ پھر پتہ چلا کہ اختر صاحب پروڈیوسر بن گئے اور "بہو بیگم" بنا رہے ہیں۔ چونکہ فلم بہو بیگم اتر پردیش کے بیک گراؤنڈ پر تھی اس لئے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے لئے اختر صاحب مجھے منتخب کرلیں۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ جان کر مجھے بیحد مسرت ہوئی کہ انھوں نے ایک بہت عمدہ فنکار کو اپنی فلم کی موسیقی کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ میری مراد مرحوم روشن لال سے ہے۔ خیر صاحب پتہ نہیں میری اس دلی خواہش کا علم اختر صاحب کو کیسے ہو گیا۔ ایک دن اچانک اختر صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں ایک اور فلم بنا رہا ہوں آپ اس کے لئے میوزک دیجئے۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے فوراً اُن کا آفر منظور کرلیا۔ لیکن بدنصیبی سے وہ فلم نہ بن سکی اور اس طرح ایک بار پھر ان کے گیتوں پر موسیقی ترتیب دینے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ لیکن اگر لگن سچی ہو تو وہ ضرور رنگ لاتی ہے۔ برسوں کے بعد فلم آئینہ کے لئے موسیقی ترتیب دینے کے دوران اختر صاحب سے گیت لکھوانے کا موقعہ مجھے مل گیا۔ ہوا یوں کہ آئینہ کے پروڈیوسر صاحب نے آئینہ کے گیتوں کے لئے مختلف نغمہ نگاروں کے نام پیش کئے کہ میں ایک ایک گیت سب سے لکھواؤں۔ میں نے اپنی طرف سے اختر صاحب کے نام کا اضافہ کر دیا جسے پروڈیوسر نے مان لیا۔ میں نے اختر صاحب سے آئینہ کیلئے ایک گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ میری درخواست سن کر اختر صاحب مسکرا کر فرمانے لگے کہ "بھئی آج تک یہ ہوتا رہا ہے کہ جس فلم کا میں نے ایک گانا لکھ دیا ہے تو پھر اس کے بقیہ سارے گانے بھی مجھ سے لکھوائے گئے ہیں۔" اور اختر صاحب نے گیت لکھ کر اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت کر دیا۔

کے لئے کھلا ہے۔ اتنے ڈھیر سارے دانشوروں کے درمیان مجھ اداکارہ کا کیا کام۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ اداکار اور قلمکار کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ بہتر اداکاری کے لئے "ادب" کی جانکاری بے حد ضروری ہے۔ ادب کے مطالعہ سے ذہن کی کشادگی بڑھتی ہے احساسات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ہم دوسروں کے مشاہدات اور تجربات سے گھر بیٹھے مستفیض ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اداکار کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اور وہ بہتر سے بہتر طریقے سے زندگی کے ہمہ رنگ کے کرداروں کو اپنے فن میں ڈھال سکتا ہے۔

اسی لئے میں جب بھی وقت ملے مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔ میں نے اختر صاحب کا کلام کئی ادبی اور نیم ادبی رسالوں میں پڑھا ہے اور اب بھی پڑھتی رہتی ہوں۔ ان کے کلام میں روزمرہ کی زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کا کلام خاص و عام میں مقبول بھی ہے۔ کیا غزل اور کیا نظم، اختر صاحب کو شعر کہنے پر دسترس حاصل ہے اور دوسرے اصنافِ سخن میں بھی اختر صاحب ملکہ رکھتے ہیں۔ زندگی سے جڑی ہوئی ہزاروں باتیں شعر کے پیرائے میں یہ بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں اور ہمیں ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اختر صاحب نے اپنی نہیں بلکہ ہماری زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بعد شعر کہے ہیں۔ اختر صاحب کے فن کی یہ ترسیل قابلِ داد ہے۔

گیت کاری کے میدان میں بھی اختر صاحب نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ یہ نام، یہ شہرت اُن کے کلام کی وجہ سے ہے۔ فلم انڈسٹری کو اختر صاحب نے خوبصورت گیت دیئے ہیں۔ ان کے گیت فلم میں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر ہم انہیں ریڈیو پر سنیں تو بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اتنے اچھے گیت کار کا ایک بھی گانا پردۂ سیمیں پر نہیں گایا۔ یہ اتفاق ہی ہے ورنہ مجھ پر بہت اچھے اچھے گیت فلمائے گئے ہیں۔ اب میں ان گیتوں کا کیا ذکر کروں کہ وہ گیت تو اپنے زمانے کے ہٹ گیت تھے۔ یہاں میں آپ کو ایک گیت یاد دلاؤں جو "مدر انڈیا" فلم میں مجھ پر فلمایا گیا تھا۔

"دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا
جیون ہے اگر زہر تو پینا ہی پڑے گا"

یہ گیت اور ایسے ہی موڈ کے گیت مجھے بہت پسند آتے ہیں چنانچہ اختر صاحب کا یہ گانا "بے بسی حد سے جب گذر جائے" مجھے بہت پسند ہے۔ ایسے اور بھی کئی گیت ہیں۔ اختر صاحب کے ایسے کتنے ہی گیتوں سے "فن اور شخصیت" کے قارئین اچھی طرح واقف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ گیت ان کے دل کی دھڑکن بھی بنے ہوں گے۔

اختر صاحب کے تازہ ترین گیتوں میں مجھے "پریم پربت" کا یہ گانا "یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے" بہت پسند ہے۔

یہ تو رہیں اختر صاحب کے فن کی باتیں۔ اب میں ان کی شخصیت کے بارے میں کہوں کہ اختر صاحب منکسر المزاج اور ایک مخلص انسان ہیں۔ یہ سیاسی، ادبی اور فلمی سیاستوں سے بہت دور رہ کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی سادگی ان کی شخصیت کا ایک اہم جز ہے۔ اور یہ چیز ان کی عظمت کو اور بلند کرتی ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جب ہم دونوں کو ماسکو ساتھ جانے کا اتفاق ہوا تو انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا اور موقع ملا۔ ان کے بارے میں میرے جو بھی خیالات تھے ان کو اور تقویت پہنچی۔ تاشقند میں ہندوستانی سماج نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ اور وہاں اختر صاحب نے اپنی نظم "آخری لمحہ" سنائی۔ جو انہوں نے اپنی بیٹی کے نام لکھی ہے "آخری لمحہ" مجھے بے حد پسند آئی۔ اور اس کا تاثر آج تک میرے ذہن پر ہے۔ بہرحال صابر دت تم نے اپنے پرچہ کے دوسرے نمبر کیلئے مناسب اور موزوں شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اس نمبر کی سرپرست بھی ہوں۔ میری نیک تمنائیں اس نمبر کے ساتھ ہیں۔

تمہاری بھابی
نرگس

پر ہوگی۔" دوسرے دن جب اختر صاحب تشریف لائے تو پریشانی کے آثار کچھ زیادہ ہی نظر آئے۔ میں نے دریافت کیا کہ "وہ کاؤنٹر بک ملی یا نہیں؟" اختر صاحب نے انتہائی بیزاری کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں کاؤنٹر بک تو مل گئی ہے لیکن اب دشواری یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ چیک کہیں گم ہوگیا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ اور ہے۔ گانوں کی سٹنگس کے سلسلے میں ایک بار جب اختر صاحب تشریف لائے تو مجھے ایسا لگا کہ خلاف معمول ان کا چہرہ بہت تمتمایا ہوا ہے۔ میں سمجھا کہ اختر صاحب کی طبیعت شاید کچھ ناساز ہے۔ لیکن کافی دیر تک بیٹھنے کے باوجود جب انھوں نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تو میں نے اس خیال کو وہم سمجھ کے دماغ سے نکال دیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اختر صاحب کے بدن میں ہلکا سا رعشہ بھی ہے۔" مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے پوچھ لیا کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کہنے لگے کہ ہاں ہلکا سا اضمحلال محسوس ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں سردی سی کیوں لگ رہی ہے۔ میں نے فوراً چائے پیش کی لیکن چائے کے کئی کپ پینے کے بعد بھی جب ان کے جسم کی لرزش ختم نہیں ہوئی تو میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ کافی گرم تھا۔ میں نے تھرمامیٹر منگوا کر جب اُن کا ٹمپریچر دیکھا تو اس وقت انہیں پورے ایک سو دو ڈگری بخار تھا۔ جسے وہ معمولی اضمحلال سمجھ رہے تھے۔ خیر صاحب میں نے فوراً گھر کے اندر سے کمبل منگوایا۔ ٹیکسی بلوائی اور اختر صاحب کو اس کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کے ان کے گھر روانہ کر دیا۔ اُن کے مزاج کی یہ گم گشتگی اور بے نیازی ویسے تو صرف ان کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی لپیٹ میں مجھ سے نیازمند بھی آجاتے ہیں۔

اختر صاحب کے ساتھ گانوں کے سلسلے میں جب بھی سٹنگ ہوتی ہے۔ دوپہر کا کھانا چار بجے سے پہلے نہیں ملا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اختر صاحب آتے ہی گانے کے کسی مصرعے کی تلاش میں اپنے آپ میں بہت دور نکل گئے۔ ایک بجے میز پر کھانا لگ گیا لیکن اختر صاحب اسی طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے دوپہر کا کھانا ایک بجے سے پہلے کھا لینا چاہیئے۔ لیکن اُن کے احترام میں چپ چاپ بیٹھا ہوا ہوں۔ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہیں۔ ایک سے دو، اور دو سے تین بج گئے۔ اس وقت میں انتہائی ادب سے عرض کرتا ہوں کہ چلیئے کھانا کھالیں۔" اختر صاحب جیسے چونک پڑتے ہیں۔" کھانا کھالیں، لیکن بھئی ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے؛ میں گھڑی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہوں کہ تین بج چکے ہیں۔ اختر صاحب بڑی معصومیت سے فرماتے ہیں۔ کمال ہے بھئی تین بج گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بارہ ساڑھے بارہ کا وقت ہوا ہوگا۔" اور یہ سن کر جیسے ساری جھنجھلاہٹ ختم ہو جاتی ہے اور بے اختیار اُن پر پیار آنے لگتا ہے

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک، بات اور کہنا چاہوں گا۔ اِدھر بہت دنوں سے ہماری فلموں سے شاعری غائب ہوتی جارہی ہے میرا دعویٰ ہے کہ اگر اختر صاحب جیسے شعراء کو مناسب مواقع ملیں تو ایک بار پھر ہمارے فلمی گانوں میں اچھی شاعری کا حسن پیدا ہو سکتا ہے وہ شاعرانہ حسن جس سے ہمارے ذہین عوام بہت دنوں سے دور کر دئے گئے ہیں۔ لیکن عوام سے زیادہ یہ فرض اُن پروڈیوسروں کا ہے جو ایک سال میں چار چار، پانچ پانچ بڑی فلمیں بناتے ہیں۔ ★

فن اور شخصیت

فلم آئینہ کے جس گیت کے لئے میں نے اختر صاحب سے درخواست کی تھی اس کی سچویشن کچھ اس طرح کی تھی کہ فلم کا ایک کیریکٹر مندر کا ایک مہنت ہے۔ یہ مہنت اپنی کثیر العیالی کی وجہ سے اکثر پریشان رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس کا وشواس دھرم کرم سے اُٹھنے لگتا ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا۔ اس وقت وہ اپنی بیٹی سے کہتا ہے کہ وہ اسے دوہے سنائے اور اس کی بیٹی اسے ایسے دوہے سناتی ہے جنہیں سن کر مہنت گھر چھوڑنے کا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ اس سچویشن کے لئے اختر صاحب نے جو دوہے لکھے تھے اُن میں سے دو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

گیان دھیان کی جوت بُجھے تو من چھائے اندھ کار
دھرم کو جس نے کرم سے پالا جیت لیا سنسار
جائے اکارت موہ کے کارن پوجا بھگتی جاپ
پاپ میں اپنا سوارتھ نہ ہو تو پاپ نہیں ہے پاپ

میں نے جب یہ اور اس طرح کے دوسرے دوہے پروڈیوسر کو سنائے تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے یہ دوہے کسی وِدوان پنڈت سے لکھوائے ہیں؟ اور جب میں نے پروڈیوسر کو بتایا کہ یہ دوہے کسی وِدوان پنڈت کے بجائے میں نے اردو کے ایک بڑے شاعر جان نثار اختر سے لکھوائے ہیں تو وہ پروڈیوسر اتنے متاثر ہو گئے کہ انھوں نے پھر آئینہ کے سبھی گانے اختر صاحب سے لکھوانے کی فرمائش کر دی۔ آئینہ کے بعد اختر صاحب میرے ساتھ دوبارہ بننے والی فلم 'پکار' اور 'چندر گپت اور چانکیہ' جیسی بڑی فلموں کے لئے گیت لکھ رہے ہیں۔

اختر صاحب کے فلمی نغموں کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ سچویشن چاہے جیسی ہو وہ انتہائی کامیابی سے اپنے گیت میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ شاعری کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ آج کل کے میوزک ڈائرکٹرز کے برخلاف میں پہلے گیت لکھواتا ہوں پھر اُس کی دھن بناتا ہوں۔ کیونکہ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک شاعر کو مکمل آزادی نہ دی جائے وہ خوبصورت نغمے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دھن پہلے تیار ہو جاتی ہے اور بعد میں اسی دھن پر گیت لکھوانا پڑتا ہے۔ لیکن اختر صاحب جیسے گیت کاروں کے لئے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ وہ جتنا خوبصورت گیت آزادی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں اتنا ہی خوبصورت گانا وہ دھن کی قید میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر مجھے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ اختر صاحب ایک گیت کار کی حیثیت سے وہ شہرت نہیں پا سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اختر صاحب بنیادی طور پر ایک سنجیدہ، کم گو اور شریف النفس ہیں، اور فلم انڈسٹری میں ترقی کرنے کے لئے جس جوڑ توڑ، خوشامد پسندی اور کمرشیل ذہنیت کی ضرورت پڑتی ہے اختر صاحب کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

فلم آئینہ کے نغموں کی تخلیق کے دوران مجھے اختر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اُن کے مزاج میں ایک خاص قسم کی قلندرانہ بے نیازی اور گم گشتگی پائی جاتی ہے۔ ان کے مزاج کی یہ افتادہ کیفیات اکثر و بیشتر ان کے احباب کو ہکا بکا کر دیتی ہیں۔ وہ بیچارے یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اختر صاحب کو ان افتادہ کیفیات کے زیر اثر ظہور میں آنے والے واقعہ کو لطیفہ سمجھ کر ہنسیں یا سانحہ جان کر اظہار ہمدردی کریں۔ اس قسم کی نازک سچویشنز سے مجھے بھی دو چار ہونا پڑا ہے۔ آئینہ کے گیتوں کی سٹنگس جاری تھیں۔ اختر صاحب تقریباً روزانہ ہی غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔ ایک دن جب وہ آئے تو کافی پریشان سے دکھائی دئے۔ کچھ دیر تک میں ان کی اضطرابی حرکات و سکنات کا خاموشی سے مشاہدہ کرتا رہا۔ پھر میں نے ان سے اس پریشانی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اتفاق سے آل انڈیا ریڈیو سے معقول رقم کا ایک چیک آ گیا۔ سوچا کہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا کے ایک دو روز میں پیسے نکلوا لوں گا۔ لیکن بینک میں کیش یا چیک جمع کروانے والی کاؤنٹر بک کہیں گم ہو گئی ہے۔ صبح سے اسی کو تلاش کر رہا تھا۔ جب اختر صاحب رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا کہ "ذرا توجہ سے ڈھونڈئیے گا وہیں کہیں گھر

کمال امروہوی

حسین اور معیاری نغمہ نگار

کبھی میرا بھی ادب اور شاعری سے قریبی تعلق تھا۔ مگر آج اُس رشتے کو ٹوٹے ہوئے ۳۵، ۳۶ سال ہو چکے ہیں۔ اِن ۳۵ - ۳۶ سالوں میں میں ادب اور شاعری کی سرزمینوں سے بھٹک کر بہت دور نکل آیا ہوں۔ اور اب صرف ایک فلمی شخصیت ہی بن کر رہ گیا ہوں۔ لہٰذا میرے لیے یہ امر محال ہے کہ میں ایک مسلّم شاعر کی شاعری پر اظہارِ خیال کر سکوں۔ مگر اپنے اس جذبۂ بے اختیار کو کیا کروں جو مجھے اکسا رہا ہے کہ میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اُس محفل کے کسی گوشے میں جا کھڑا ہوں جو "فن اور شخصیت" کے "جاں نثار اختر نمبر" کو مرتب اور آراستہ کرنے میں مصروف ہے۔

اس محفل میں ہندوستان کے بڑے بڑے نقّاد ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں۔ یقیناً انھوں نے اختر صاحب کے شاعرانہ لے کراں سمندر میں غوطے لگا کر گراں قدر موتی نکالے ہوں گے اور قرار واقعی نکتہ سنجیاں کی ہوں گی۔ لیکن میں بس اپنی ہی حدود میں رہ کر اختر صاحب کے اُس فن شاعری پر اپنے تاثرات بیان کروں گا جس کا واسطہ فن سے ہے۔

وہ جو کبھی مجھے بھی ادب اور شاعری سے اک گونہ دلچسپی تھی اُسی دلچسپی کے باعث میری یہ شروع ہی سے تمنا تھی کہ اردو ہندی کی معیاری شاعری ہندوستانی فلموں میں شریک ہونا چاہیے۔ بہت دنوں تک ہمارے شعراء کو یہ غلط فہمی رہی کہ ہندوستانی فلمیں اُن کے شاعرانہ معیار کی متحمل نہیں ہو سکیں گی۔ اور انھیں اپنے مرتبے سے کچھ نیچے اترنا پڑے گا۔ جو انہیں کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ لیکن آخر وقت بدلنے لگا اور فلموں نے کسی نہ کسی طرح چند بلند پایہ شعراء کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا۔ شدہ شدہ وہ شاعر ادھر آنے ہی لگے جو باقاعدہ شاعر ہیں۔ ایک میں بھی اُن خوش نصیب فلمسازوں میں سے ہوں جسے چند مسلّم شاعروں کی معاونت حاصل ہوئی۔ جیسے مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، کیف بھوپالی اور جاں نثار اختر۔

یوں تو اختر صاحب سے مجھے دیرینہ عقیدت تھی اور میری عین خواہش تھی کہ اپنی کسی فلم کو ان کی نغمہ نگاری سے آراستہ کروں۔ ایسا ایک موقعہ "پاکیزہ" کے وقت آیا بھی لیکن ایک میوزک ڈائرکٹر کی رقابت کے باعث ہمارا ساتھ ممکن نہ ہوا اور مجھے افسوس رہ گیا۔ لیکن اسی زمانے میں اختر صاحب سے اک گونہ قربت کا عجیب بہانہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اختر صاحب ایک دن تشریف لائے اور فرمایا کہ جاوید میرا بیٹا ہے، اگر ہو سکے تو آپ اُسے اپنے معاونین کے زمرہ میں شامل کر لیجیے۔ میرے لیے کسی پس و پیش کا سوال نہ تھا۔ جاوید کو دوسرے ہی دن سے میں نے بلوا لیا۔ بہرکیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

لتا منگیشکر

رچی ہوئی ادبیت

اچھے گیتوں میں خیال اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی ترتیب اُن کی اپنی موسیقیت اور ایک مکمل آہنگ کا ہونا ضروری ہے۔

جاں نثار اختر کے گیتوں میں یہ خوبیاں (qualities) مجھے ملتی ہیں۔ میں نے اے آر۔ کاردار کی فلم "یاسمین" سے لے کر آج تک میری مراد ہے کمال امروہوی صاحب کی "لقدیر" "رضیہ سلطان" تک ان کے بہت گیت گائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کا "یاسمین" کا یہ گیت ؎

مجھ پہ الزامِ بے وفائی ہے
اے محبت تیری دہائی ہے

یا "رضیہ سلطان" کا یہ گانا:

؎ اے دلِ ناداں آرزو کیا ہے، جستجو کیا ہے؟
ہم بھٹکتے ہیں، کیوں بھٹکتے ہیں، دشت و صحرا میں
ایسا لگتا ہے موج پیاسی ہے اپنے دریا میں
کیسی الجھن ہے، کیوں یہ الجھن ہے ایک سایہ سا روبرو کیا ہے
اے دلِ ناداں آرزو کیا ہے جستجو کیا ہے؟

سب میں ایک رچی ہوئی ادبیت پائی جاتی ہے۔ ان کے بعض گانے پورے طور پر ادبی ہوتے ہیں۔ مجھے اختر صاحب کے گانے گا کر دلی خوشی ہوتی ہے۔

"فن اور شخصیت" کا یہ خاص نمبر جو جاں نثار اختر کی شاعری اور زندگی پر چھپ رہا ہے میں اس کے لئے اپنی نیک خواہشات بھیجتی ہوں۔

آشا بھونسلے

میرا پسندیدہ شاعر

★ مجھے مسٹر او۔ پی۔ نیّر گانا لکھا رہے تھے پکچر تھی "کلپنا"، بول تھے:

بے کسی حد سے جب گزر جائے

کوئی اے دل جیے کہ مر جائے

میں لکھتے لکھتے رک گئی، نظر اٹھا کر نیّر صاحب کی اور دیکھ کر بولی، "بہت ہی اچھے بول ہیں کنہوں نے لکھا ہے یہ گیت؟" نیّر صاحب نے نظریں اٹھا کر ایک کونے کی طرف دیکھا میں نے بھی ان کی نظریں جہاں تھیں اسی کونے کو دیکھا ایک عورت کی نظروں نے دیکھا کہ لیکھک بھولا بھالا اور سادہ مزاج ہے جس کی نظریں شرافت ہیں۔ عورت کے سامنے بیٹھنے کی تہذیب کو وہ برابر جانتے ہیں۔ سر کے بال ناک تک لمبے تھے۔ ناک سیدھی لمبی جتنی چاہئے اتنی ہی تھی۔ ہونٹ پتلے اور چہرہ لمبا، سفید کرتا۔ براؤن جاکٹ پاجامہ جو ہر شاعر پہنتا ہے۔ وہی ان کا لباس تھا۔ میں نے پھر ان کی اور دیکھا تو وہ ہنسنے۔ ہنستے سمے ان کی آنکھیں باریک ہوتی ہیں۔ میری پہچان کرائی گئی۔ یہ ہیں جانے مانے لیکھک جاں نثار اختر، انہوں نے کہا آپ نے تو میرے گانے پہلے بھی گائے ہیں پر میں سامنے کبھی نہیں آتا ہوں، میں نے کہا: "تبھی تو میں آپ کو نہیں جانتی ہوں۔ ہماری فلم لائن کی سبھیتا ہی ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی ملتا ہی نہیں۔ سب سوچتے ہیں کہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایسے حالات میں زیادہ بات نہ کرنے والا آدمی پیچھے نہ رہے تو اور کیا ہوگا۔ نانی کہتی تھیں بولنے والے کی مونگ پھلی بک جاتی ہے نہ بولنے والے کے بادام بھی نہیں بکتے"، خیر جاں نثار بھائی میں میں نے ایک خاص بات دیکھی ہے۔ وہ اپنا گانا سناتے سمے "میں نے کیا مصرعہ لکھا ہے" کبھی نہیں کہتے۔ دوسروں کی طرح اپنے گانوں کی واہ واہ کرنا ان کے سبھاؤ میں نہیں ہے میں نے ان کے اتنے گانے گائے پر سبھیتا کو چھوڑا ہوا انہوں نے کوئی گانا نہیں لکھا۔ زندگی کی اونچ نیچ نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا پر وہ ہمیشہ چپ رہے۔ ان کی خود کی بنائی ہوئی پکچروں میں گا رہی تھی اور مجھے پتہ نہیں تھا یہ ان کی پکچر ہے۔ انہیں ریکارڈنگ تھیٹر میں دیکھ کر میں نے پوچھا، "آپ کا گانا ہے بھائی صاحب"، وہ ہنس کر بولے، "اجی نہیں یہ پکچر میں خود بنا رہا ہوں"، میں نے کہا! "آپ سے کیا پیسے لینے بھائی صاحب"، انہوں نے جھٹ سے کہا میرے پاس ہیں لیجئے نہیں ہوں گے تو آپ سے کہہ دوں گا"، یہ کہنے میں بھی بہت مزا تھا۔ میں دیکھتی رہی اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پورا فائدہ اٹھاتا پر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

میرے لئے وہ آدرشیے، سبھیہ (مہذب) اور مہا پُرش (اعلیٰ انسان) ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ فلم کے لئے نغمے لکھنے میں بے چارے شاعر کو کئی پہلو بدلنے پڑتے ہیں۔ اس کی تمام شاعرانہ آزادیاں چھین لی جاتی ہیں اور اسے کئی طرح سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ کئی پابندیوں کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے مثلاً کہانی کی سچویشن کا، کیریکٹر کی نوعیت کا، کردار کے موڈ کا، موضوع کے وقت اور زمانے کا، ڈائرکٹر کی ضرورت اور اس کے مزاج کا، میوزک ڈائرکٹر کی موسیقیت کے تقاضوں کا اور حتی الامکان کلام کے سہل ہونے کا، اور پھر ان تمام پابندیوں کے ساتھ سب سے مقدم اپنے شاعرانہ معیار کا۔

مجھے اختر صاحب سے اپنی فلموں کے گانے لکھوانے میں ایک حیرت انگیز تجربہ ہوا۔ وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ سچویشن سنتے سنتے ہی اختر صاحب نے گانے کا (فلمی اصطلاح میں) مکھڑا اتنا برجستہ کہا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ مکھڑا پہلے کہا گیا تھا اور سچویشن اس کے بعد گڑھی گئی۔ پھر اس اہتمام کے ساتھ جیسے کردار اپنی ذہنی سطح کے مطابق اپنے ہی خیال کا اظہار کر رہا ہے، کسی شاعر سے مانگ کر نہیں۔ اور یہ تبحر صرف اردو شاعری کے لئے ہی مخصوص نہیں ہندی کویتا پر بھی انہیں اتنی ہی قدرت حاصل ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میوزک ڈائرکٹر نے کسی سچویشن کے لئے پہلے سے ہی کوئی دھن بنالی ہے۔ ایسے میں پھر شاعر کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ دھن کے اوزان پر اپنے الفاظ، اور کردار کے جذبات کو تول کر گانا لکھے۔ ایسے میں شاعری محض لَے بندی سی رہ جاتی ہے اور الفاظ بیڑیوں میں بندھے قیدی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ لیکن مجھے اختر صاحب کی اِس قادر الکلامی سے بڑی حیرت ہوئی کہ اس دشواری کی اُن کے کلام میں ذرا سی بھی رمق نہیں آنے پاتی۔ چنانچہ میری تصویر "رضیہ سلطانہ" کا سب سے حسین اور معیاری نغمہ وہی ہے۔

"اے دلِ ناداں! آرزو کیا ہے؟ جستجو کیا ہے؟"

وہ دن دور نہیں جب یہ فلم انڈسٹری اختر صاحب کو سر آنکھوں پر بٹھائے اور وہ مرتبہ دے جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ ✱

اختر صاحب ہندوستان کی ادبی فضا میں اپنے کلام کے گل بوٹے بکھیرنے کے بعد فلمی نگری میں آئے تھے۔ زندگی کے اندھیرے اجالوں سے آنکھ مچولی کھیل چکے تھے۔ زبان اور بیان پر قابو تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اسی زمانے میں ان کی کامیابی کا یقین ہو گیا تھا۔ جس فلم میں پہلی بار میرا ان کا ساتھ ہوا اُس کا نام تھا "ہم ہیں راہی پیار کے"، فلم تو مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن گانوں نے خوب دھوم مچائی۔

زندگی حسین ہے زندگی سے پیار کر
پھول ہوں کہ خار ہوں تو سبھی سے پیار کر

راز سینے میں محبت کا چھپائے رکھنا
شمع جو دل میں جلائی ہے جلائے رکھنا

یہ گانے آج تک یاد کئے جاتے ہیں۔ 'شعلہ اور شبنم' فلم کے دو گانے اختر صاحب نے بیحد خوبصورت لکھے۔

کون آتا ہے ادھر کوئی نہیں کوئی نہیں

اور

محبت ایسی ہوتی ہے محبت اس کو کہتے ہیں

یہ دونوں گانے محمد رفیع اور جگجیت کور نے گائے تھے۔ اس کے بعد بہت سے مختلف گیت اختر صاحب نے میرے لئے لکھے۔

جیسے جیسے اختر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع آتا گیا اور ہم دونوں کی بیٹھکیں ہوتی گئیں اختر صاحب کی خصوصیات ایک ایک کر کے مجھ پر واضح ہوتی گئیں۔ فلمی گیت لکھنے کے لئے برج بھاشا، کھڑی بولی، اردو اور ہندی زبان کی خاصی جانکاری ہونی چاہئے۔ اور ہندوستان کے فوک لٹریچر کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اختر صاحب کا ان زبانوں پر میں نے قابو دیکھا ہے اور لوک گیتوں کی جانکاری بھی اختر صاحب کو ہے۔ الفاظ کا بے پناہ خزانہ اختر صاحب کے پاس موجود ہے جو ایک فلمی گیت کار کے لئے بیحد ضروری ہوتا ہے۔

کام سے تھک جانا یا اُکتا جانا بہت بڑی کمزوری مانا جاتا ہے۔ اختر صاحب نے اس کمزوری سے بھی اپنے آپ کو بہت دور رکھا ہے۔ نہ تھکتے ہیں نہ اُکتاتے ہیں۔ گیتوں کے متعلق دوسروں کے مشورے بڑے غور سے سنتے ہیں اور خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔ ایک ہی گیت کو جتنی بار بھی لکھتے ہیں نئے انداز سے لکھتے ہیں نئے نئے الفاظ چن چن کر پروتے ہیں۔ آسان اور معیاری زبان کا استعمال انوکھی تشبیہات کا لانا اختر صاحب کی بہت بڑی خوبی ہے اور شاید اسی خوبی کی وجہ سے اختر صاحب کے گیتوں میں ایک صحت مند ادب بھی موجود ہوتا ہے۔

اختر صاحب کو میں نے کبھی گنگناتے ہوئے نہیں سنا لیکن موسیقی اُن کے ذہن میں اس طرح رچی بسی ہے کہ جو کچھ بھی قلم سے نکلتا ہے موسیقی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ آج تک ان کے کسی بھی گیت میں مجھے نغمے کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ردم یعنی لے یا تال کی باقاعدہ سمجھ بوجھ اختر صاحب کو ہے جس کی وجہ سے دُھن پر گیت بڑی آسانی سے لکھ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو فلم سند ھیا کا گیت:

انگ انگ رنگ چھلکائے نجر لگائے بلمارے

اور

کب تیرے حسن سے انکار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

خیّام
(موسیقار)

الفاظ کا بے پناہ خزانہ

رنجیت اسٹوڈیو ۱۹۵۲ء میں میوزک روم میں بیٹھا ہوا ضیا سرحدی کی فلم فٹ پاتھ کے لئے موسیقی ترتیب دے رہا تھا کہ ایک صاحب کرتے پاجامے میں ملبوس داخل ہوئے۔ ہارمونیم پر رینگتی ہوئی میری انگلیاں رک گئیں۔ اتنے میں ان صاحب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے عرض کیا، مجھے جاں نثار اختر کہتے ہیں۔ میں نے ہاتھ ملایا ہی نہیں بلکہ ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ کیونکہ نام سے واقف تھا، کلام سے واقف تھا، شکل سے آج متعارف ہوا۔ دیکھتے ہی مجھے لگا اکتائے ہوئے چہرے پر بڑے بڑے بال سایہ کئے ہوئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وقت کی دھوپ ان دنوں کڑی گذر رہی تھی۔ اس کے بعد کیا کیا باتیں ہوئیں یہ تو یاد نہیں، ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہم دونوں کے اندر کے کلاکاروں نے ایک دوسرے سے دل بدل لئے۔ میں بھی جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ بھی اسی نیت سے بمبئی وارد ہوئے تھے۔ ملاقات کی ابتدا چائے کی پیالی سے ہوئی تھی لیکن بعد میں ہم دونوں اپنے اپنے غم بوتل سے گلاس میں بانٹنے لگے۔ وقت تیزی سے پیچھے سرکتا رہا۔

اور پھر وہ مبارک گھڑی آئی جب میری طرزوں سے اختر صاحب کی غزلوں نے چھیڑ خوانی شروع کی۔ مطلب یہ کہ H.M.V. میں اختر صاحب کی تین غزلیں میں نے ریکارڈ کیں۔ جن میں دو طلعت محمود نے گائی تھیں مطلع تھا ع

تجھ میں جو بات ہے گلشن کے نظاروں میں نہیں
تجھ سا رنگیں تو کوئی پھول بہاروں میں نہیں

اور دوسری غزل کا مطلع تھا۔ ع

کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے
تیری یادوں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے

باقی ایک غزل محمد رفیع نے گائی تھی جس کا مطلع تھا۔

پوچھ نہ مجھ سے دل کے فسانے
عشق کی باتیں عشق ہی جانے

اور ....؟

حالانکہ میرا شاعری میں کوئی دخل نہیں مگر اچھے کلام کی پرکھ ضرور ہے۔ آج تک جتنے گیت کاروں کا مجھ سے سابقہ پڑا ہے۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جس طرح میں اپنی طرزوں کی نوک پلک سجا کر رکھتا ہوں اسی طرح یہ بھی چاہتا ہوں کہ اُس پر آیا ہوا کلام بھی عام فلمی گیتوں سے ہٹ کر ہو۔ بات situation پر پوری اترے اور زبان و بیان کے اعتبار سے گھٹیا یا ہلکی نہ ہو۔

آواز دو ہم ایک ہیں

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کے لیے اختر صاحب نے ایک گیت لکھا اور میں نے ریکارڈ کیا۔ جس کے بول تھے

اپنے دشمن چاہے مل کر ساری طاقت جوڑ لیں
یہ نہ ہوگا اپنے آدرشوں سے ہم منہ موڑ لیں

فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے میں نے اختر صاحب کو جتنا سمجھا ہے اس سے کم ہی اس وقت بیان کر سکا ہوں۔ اس سے زیادہ اگر کوئی انھیں سمجھنا چاہتا ہے تو میری رائے ہے کہ وہ "صفیہ کے خطوط" پڑھے یا "گھر آنگن" ★

جاں نثار — نام کا مقصد ہے اپنا جیون دینا، زندگی قربان کر دینا، بھلے ہی وہ کویتا کیوں نہ ہو۔ اردو ادب میں جاں نثار کا نام نہایت ادب سے لیا جاتا ہے۔ شاعر سے میرا تعارف اچھا خاصا ہے۔ میری فلموں کے لئے لکھتے وقت اُن سے جو ملاقاتیں اور باتیں ہوتی رہیں اُن کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ پیدائشی شاعر ہیں، محنت مشقت کر کے نہیں بنے، شاعری اُن کے خون میں ہے، شاعری اُن کی آنکھوں سے بہتی ہے۔ بھگوان انھیں لمبی عمر اور نئی شاعری کا سمندر بخشے۔

باسو بھٹاچاریہ
(پروڈیوسر، ڈائریکٹر)

یا فلم مٹھی بھر چاول میں :

کا ہے پگلی برکھا چھائی تیرے اِن دو نینن میں
اچھا کیا ہے۔ بُرا ہے کیا
کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے تجھ کو مجھ کو پتا ہے کیا

فلم ' پیاسے دل ' میں :

تم مہکتی ہوا، چاندنی ہو
جھکتی گھٹا ہم سے کہے کیوں یہ دل پیاسا رہے آج

اختر صاحب عام فلمی گیت نگاروں سے اس لئے بھی مختلف ہیں کہ ان کے گانوں میں کبھی بھی شعریت کم نہیں ہونے پاتی۔ گہری اور بے پناہ جذبات نگاری اختر صاحب کا ایک اور کمال ہے۔ فلم شنکر حسین کی ایک مشکل Situation بڑی ہی خوبصورتی سے اختر صاحب نے نبھائی۔ اس نغمے کو اگر میں ایک دھڑکتا ہوا دل کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

آپ یوں فاصلوں سے گزرتے رہے
دل سے قدموں کی آواز آتی رہی
آہٹوں سے اندھیرے چمکتے رہے
رات آتی رہی رات جاتی رہی

قطرہ قطرہ پگھلتا رہا آسمان
روح کی وادیوں میں نہ جانے کہاں
اِک ندی دِل رُبا گیت گاتی رہی
آپ یوں فاصلوں سے گزرتے رہے

کمال امروہی صاحب کی فلم ' رضیہ سلطان ' کے حبشی غلام یا قوت کے سینے میں پکتا ہوا عشق کا لاوا اختر صاحب نے اس طرح قلم بند کیا ہے۔

آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے
دِل ہوا کس کا گرفتار خدا خیر کرے
جانے یہ کون میری روح کو چھو کر گذرا
اِک قیامت ہوئی بیدار خدا خیر کرے

ڈائریکٹر کمال امروہی کی ہدایت کاری اور اب اختر صاحب کے قلم کا فسون راجیش کھنہ کی پیشکش 'مجنون' میں جاگنے والا ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے مکیش بھائی کی آواز میں اختر صاحب کی چھ غزلوں کا ایک L.P. ریکارڈ H.M.V. نے مجھ سے تیار کروایا جو شاید اپنی مثال آپ ہے۔

اختر صاحب کامیاب شاعر اور باکمال فلمی گیت نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حب الوطن ہندوستانی بھی ہیں۔ چینی حملے کے دوران اِن کی ایک نظم میں نے ریکارڈ کی۔ اور سارے ہندوستان میں یہ صدا گونج رہی تھی۔

موسیقی بھی بیحد مقبول ہوئی تھی ———— یوں تو میں نے ہندوستانی زبان کی بہت سی فلموں کی موسیقی ترتیب دی ہے لیکن کافی عرصہ گذرا ایک نیپالی زبان کی فلم "ماٹیتی گھر" میں بھی میوزک دے چکا ہوں ۔ اب میں اپنی اس بات کو ایک بار دہرانا چاہوں گا ۔ کہ جب تک میوزک ڈائرکٹر اور شاعر دونوں میں ذہنی طور پر رابطہ قائم نہ ہو اُس وقت کوئی شاہکار جنم نہیں لے سکتا ۔

دراصل مجھے صحیح معنوں میں کام کرنے کا مزہ اُس وقت آیا جب میری فلمی زندگی میں اردو کے مشہور شاعر جاں نثار اختر آئے جاں نثار صاحب نہ صرف یہ کہ اردو زبان کے صفِ اوّل کے شاعر ہیں انہیں ہندی اور انگریزی زبانوں پر بھی اتنی ہی دسترس حاصل ہے ———— اور ہندی کے الفاظ کو ان کی مناسب جگہوں پر استعمال کرنے میں جاں نثار صاحب کو ملکہ حاصل ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فلم و موسیقی کے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ اُن کے ساتھ کام کرتے وقت میں گیتوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاتا ہوں کیونکہ جاں نثار صاحب بالکل اسی طرح کے گیت لکھتے ہیں جیسا میں ذہنی طور پر چاہتا ہوں شاید اسی کو ذہنی رابطہ کہتے ہیں کہ ساتھ کام کرنے والے دو مختلف فنکار بغیر اظہار کے ایک دوسرے کی پسند و ناپسند اور دل کے اندر کی بات سمجھ لیں ۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ جاں نثار صاحب کے ساتھ کام کرنے میں میرا بلڈ پریشر نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے ۔ ہاں ایک بات اور کہوں گا کہ جس طرح میں آخر وقت تک سنگیت کو بہتر سے بہتر بنانے میں لگا رہتا ہوں بالکل اُسی طرح جاں نثار صاحب آخری لمحوں تک الفاظ پر محنت کرتے رہتے ہیں ۔ اُن میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہترین اور حساس شاعر ہونے کے ساتھ بیحد پُرخلوص انسان بھی ہیں ۔ ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ فلم انڈسٹری میں قدم رکھتے ہی آدمی بالکل بیوپاری بن جاتا ہے ۔ اور اس درجہ خود غرض ہو جاتا ہے کہ جب تک اُس کو آپ سے فائدہ ہوتا رہے یا کسی فائدے کی اُمید ہو وہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتا رہے گا ۔ اور مطلب نکل جانے کے بعد یا آپ سے کوئی فائدہ ہونے کی امید نہ ہو تو آپ کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا ———— ایسے ماحول میں بھی جاں نثار اختر جیسے بلند کردار کے انسان مل جاتے ہیں تو یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا ۔ جاں نثار صاحب کے خلوص کا اُن کے کچھ دوستوں نے ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا ۔

یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں نے اُن کے ساتھ اب تک صرف ڈیڑھ فلموں میں کام کیا ہے اس کے باوجود بھی ایوارڈ حاصل کئے ———— اب جب بھی مجھے کوئی فلم ملتی ہے تو میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے ساتھ جاں نثار اختر ہی کام کریں تاکہ میں اُن کے اشتراک سے عوام کے سامنے کوئی شاہکار پیش کر سکوں ۔

جے دیو

موسیقار

آپ اپنی مثال

یوں تو مجھے بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ رہا ہے اور تب ہی سے میں اس میدان میں محنت اور لگن سے کام کر رہا ہوں۔ لیکن باقاعدہ طور پر ۱۹۵۱ء سے اسسٹنٹ کی حیثیت سے فلمی دنیا میں داخل ہوا جہاں استاد علی اکبر خاں اور برمن دا (ایس ڈی۔ برمن) جیسے چوٹی کے فن کاروں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

۱۹۵۴ء سے میں پورے طور پر موسیقار بن گیا۔ اور جورو کا بھائی۔ انجلی، کنارے کنارے، ہم دونوں اور مجھے جینے دو وغیرہ فلموں کی موسیقی خود ترتیب دی جو کافی مقبول ہوئیں۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب چیتن آنند صاحب نے مجھے پہلی فلم جورو کا بھائی دی تو ان کی خواہش تھی کہ فلم کے گیت ساحر لدھیانوی لکھیں لیکن میں وشوامترا عادل سے لکھوانا چاہتا تھا اور ایسے وقت میں جبکہ میں اپنی پہلی فلم میں موسیقی دے رہا تھا اور اس لائن میں میرے قدم بھی نہیں جمے تھے، میں اپنے وقت کے مقبول ترین گیت کار کو لینے سے منکر ہو گیا۔ ویسے میں آج بھی اس بات کا معترف ہوں کہ ساحر صاحب بہترین گیت کار ہیں۔ بہرحال چیتن صاحب نے میری بات مان لی اور گیت وشوامترا عادل سے لکھوائے گئے۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ اُس وقت پیش آیا جب چیتن آنند صاحب نے ایک اور فلم انجلی کا میوزک میرے سپرد کیا۔ چونکہ انجلی کی کہانی نریندر شرما کی تحریر کردہ تھی غالباً اسی وجہ سے فلم کے گیت لکھنے کے لئے نیائے شرما کے نام کی سفارش آئی۔ میں نے اُس وقت تک گیت کار کی حیثیت سے نیائے شرما کا نام نہیں سنا تھا۔ اس لئے تذبذب میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔ اُس وقت ایسی پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنی پسند کے کسی شاعر سے گیت لکھوا سکوں اس لئے مجبوراً نیائے شرما سے گیت لینا پڑے۔ فلم کنارے کنارے کے پروڈیوسر نیائے شرما تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اُن کے سوا اور کون گیت لکھتا۔ ان تمام باتوں سے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میوزک ڈائریکٹر کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی پسند کے گیت کار سے گیت لکھوائے تاکہ آپسی ذہنی ربط قائم ہونے کی بنا پر اچھے گیت پیش کر سکے لیکن افسوس کہ فلم انڈسٹری میں اول تو فنکاروں کے دل کا درد سمجھنے والے ہیں ہی نہیں اور جو چند ایک ہیں بھی تو وہ فلم انڈسٹری کی اندرونی سیاست کے دباؤ کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آتے۔ ساحر لدھیانوی کے ساتھ میری فلم "ہم دونوں" کا میوزک کافی مقبول ہوا جس کی وجہ سے ساحر کے ساتھ مجھے ایک اور فلم "مجھے جینے دو" لیکن اس میں ساحر صاحب سے صرف چار گانے لکھوائے وجہ وہی کہ ذہنی طور پر میں مطمئن نہیں ہو پاتا تھا حالانکہ اس فلم کی

اُن کے گیتوں سے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں جن میں شاعر آشا ، نراشا ، ہمت اور مایوسی کی جانے کن کن منزلوں سے گزر گیا ہے ۔

آہٹیں دل کی طرح ڈوب کے رہ جاتی ہیں
سانس لیتی ہوں تو ہر درد اُبھر آتا ہے

اور پھر ؎

سانس لیتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
جیسے میرے دل کی ہر دھڑکن میں شامل آپ ہیں

یہ بھی نہیں کہ میں تمہیں الزام دے سکوں
یہ بھی نہیں کہ تم سے شکایت نہیں مجھے

اور پھر ؎

مجھ پہ الزامِ بے وفائی ہے
اے محبت تری دُہائی ہے

تصوّر سے تمہارے روشنی کی بھیک مانگی ہے
اندھیرے دل میں کچھ شمعیں جلانے کی تمنا ہے

اُف یہ گھونگھٹ میں جھمکتا ہوا مکھڑا تیرا
سرخ پھولوں میں کوئی شمع جلادے جیسے

یہی نہیں ، اختر صاحب کی فلمی شاعری میں ہمیں دیش بھگتی کے گیت بھی ملتے ہیں جن میں ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے محبت رچی ہوئی ہے ۔ سماجی اصلاح بھی اُن کے گیتوں کا موضوع رہا ہے ۔ ایسے گیت ان کی سیاسی اور انقلابی شاعری کا حصہ کہے جا سکتے ہیں ۔

یہ خاص نمبر جو اختر صاحب کی شاعری اور شخصیت پر نکل رہا ہے ۔ اس میں اُن کے گیتوں کا ایک باب رکھنا بہت ضروری تھا ۔ یہ پہلو بھی منظرِ عام پر لایا گیا مجھے اس کی خوشی ہے ۔ *

رامانند ساگر

گیت اور ادبی خوشبو

گیت کی مکمل تعریف کیا ہے۔ اس کا جواب دینا آسان نہیں۔ ایک خیال ہے کہ شاعری کا کوئی ٹکڑا تب تک گیت کہلانے کا حقدار نہیں جب تک اُسے سنگیت کے سروں سے سجایا نہ گیا ہو، یعنی کویتا اور سنگیت کے ملن سے ہی گیت کا جنم ہوتا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ جو کویتا گائی جا سکے وہ گیت ہے۔ بہرحال تمام تعریفیں اتنا تو ثابت کرتی ہیں کہ صرف وہی شاعری یا کویتا گیت ہو سکتی ہے جس میں سنگیت کے سُروں میں پروئے جانے کی صلاحیت ہو۔ اس قید کا اثر سب سے زیادہ گیت کی زبان پر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے جن الفاظ کو موسیقی کی لطافتوں کا حامل ہونا ہے وہ کثیف اور کھُردرے نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے گیتوں کی بھاشا میں نسائیت کا لوچ ملتا ہے، بھلے ہی مضمون کیسا ہی ہو۔

جہاں تک مضمون کا تعلق ہے۔ گیت اور غزل میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ غزل کی طرح گیتوں میں بھی اکثر محبّت کے مضامین ملتے ہیں۔ جنہیں ہندی میں شرنگار رس کی باتیں کہا جاتا ہے۔ مگر جیسے شاعروں نے غزل کی وساطت سے سیاست، فلسفہ اور روحانیت کی باتیں بھی کی ہیں اسی طرح گیت نگاروں نے بھی ہر طرح کے مضامین کو چھُوا ہے۔ بہت سے بھگتوں اور صوفیوں نے گیت کی صنف کا پورا فائدہ اٹھا کر روحانیت کے دقیق مسائل کو بہت سہل بھاشا میں عوام تک پہنچایا ہے۔

گیت خالص ہندی یا اردو کی ملکیت ہو ایسی بات بھی نہیں۔ انگریزی میں لفظ song اور فارسی میں لفظ نغمہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر ملک اور ہر دور کا انسان جب دل کے ہاتھوں مجبور ہوا ہے تو اس نے اپنی محبت کی شاعری کو سنگیت کے سریلے پن میں کچھ اس طرح ڈبو دیا ہے کہ اس ڈوبی ہوئی پکار کو سُن کر کوئی محبوب ساحل پر کھڑا نہ رہ سکے۔ بلکہ پیار کی لہروں میں کودنے پر مجبور ہو جائے۔ جب دل کی بات تاثر کے اس مقام پر پہونچتی ہے تو گیت ہو جاتی ہے۔

اختر صاحب کے گیت پڑھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب اُن جیسا اعلیٰ پایہ کا شاعر گیت لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو شاعری کی یہ صنف اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ گیت کے دامن کو نئے نئے مضامین کے جواہر پاروں سے بھر دیتا ہے۔ وہ گیت کے آسمانوں میں، نئی واردات، نئے معانی، نئی تشبیہوں کے ستارے اس طرح بکھیر دیتا ہے جیسے افق کی وسعتوں میں اضافہ کر دیا ہو۔ یا اس کے الٹ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ آسمانوں کی وسعتوں کو دل کی دھڑکنوں کے مختصر سے وقفے میں بند کر دیتا ہے۔ جیسے جاں نثار اختر کا یہ شعر ؎

جھلملاتے ہوئے تاروں سے نہ جھانکو مجھ کو
دل کی دھڑکن کی طرح میرے قریب آجاؤ

محبت میں جیسے مختلف مقاموں پر دل مختلف کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے ایک حسّاس شاعر کے گیتوں کا بھی یہی حال ہونا قدرتی ہے۔ اختر صاحب کے گیتوں میں بھی نوع در نوع کیفیتوں کا کیف طاری ہے جو فلموں میں آنے کے باوجود اپنی ادبی خوشبو نہیں کھو سکا۔

نہیں ہوگی ۔ ظاہر ہے اُن بڑے شعراء کی فہرست میں اختر صاحب کا نام بھی شامل تھا ۔

بڑی مشکلوں اور الجھنوں کے بعد آخر فیض صاحب آ ہی گئے ۔ صابو صدیق پالی ٹیکنیک کے گراونڈ میں نہایت عظیم الشان مشاعرہ ہوا لیکن اب اسے میری بدنصیبی سمجھیئے کہ مجھے اُس فوج میں بھرتی کر دیا گیا تھا جسے آرگنائزرس کہا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض صاحب کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو سکون کے ساتھ سننا نصیب نہیں ہوا لیکن اُس مشاعرے کے اگلے دن ایک چھوٹا سا مخصوص مشاعرہ کسی ہال میں رکھا گیا تھا ۔ اختر صاحب اس مخصوص مشاعرے میں بھی شریک ہوئے ۔ اور میں نے پہلی بار انہیں جی بھر کے سنا !

اب اگر میں ان کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا تو لوگ کہیں گے کہ میاں پہلے اردو سیکھو پھر اختر صاحب کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا ۔ اس لئے میں صرف اُن کے پڑھنے کے اسٹائل کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہوں گا ۔ شعر پڑھتے ہوئے اختر صاحب کی شخصیت کافی بدل جاتی ہے ۔ اُن کا شرمیلا پن غائب ہو جاتا ہے اور ان کی دھیمی آواز میں ایک خاص قسم کا وزن پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہر لفظ پر وہ اس طرح زور دے کر پڑھتے ہیں کہ گویا وہی ایک لفظ اس غزل یا نظم کی جان ہے ۔ اُن کے پڑھنے کے اس خاص اسٹائل کا فائدہ یہ ہے کہ اُن کی نظم یا غزل کا ایک ایک لفظ اور اس میں چھپے ہوئے معنی ۔ سننے والوں پر کھلتے چلے جاتے ہیں ۔

اس مشاعرے کے بعد جب میں نے اُن کے کچھ اور فلمی گیت سنے تو وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ اچھے لگے ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب میں شاعری کے ساتھ ساتھ شاعر کے بھی قریب آ چکا تھا ۔

اس طرف مجھے اختر صاحب کے جن گیتوں نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے ان میں سے کچھ گیت اس طرح ہیں " یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے " " رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی " اور " وہ جو اوروں کی خاطر جیئے مرتے " ۔ فلمی گیتوں کے پرستاروں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ان دنوں بعض بڑی فلمیں اختر صاحب کے گیتوں سے سنواری جا رہی ہیں جیسے " رضیہ سلطانہ " " پکار " ۔ " مجنوں " اور چند رگپت اور چانکیہ " وغیرہ وغیرہ ۔

ہمارے لئے یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ اختر صاحب نے فلمی دنیا کو اپنے گیتوں کے علاوہ اپنا جاوید بھی دیا ہے (سلیم جاوید والے جاوید) جنہوں نے نثر کے میدان میں نہ صرف اپنا سکہ جما رکھا ہے بلکہ جنہوں نے فلمی دنیا میں رائٹر کا امیج بدل دیا ہے ۔

فلمی گیتوں کے قدردانوں کو جاں نثار اختر صاحب نے جو کچھ دیا ہے ۔ میں اس کے لئے ریڈیو سننے والوں کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ اور دعا کرتا ہوں کہ وہ اسی طرح برسوں تک فلمی گیتوں کو شاعری کے حسن سے سنوارتے رہیں ، سجاتے رہیں ۔ ★

امین سایانی

خوبصورت طرزِ کلام

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ راکٹ ایج ہے۔ تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ اپنے ساتھ ایک نئی تبدیلی لاتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں ترقی بھی شامل ہے اور بربادی بھی۔ آج کی مشینی اور کاروباری زندگی کی جھلستی ہوئی دھوپ اور بھاگتے دوڑتے انسانوں کے جنگل میں اگر اتفاقاً کوئی اچھا شعر یا خوب صورت گیت سننے میں آجائے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ریگستان میں بھٹکنے والے مسافر کو اچانک کسی ہرے بھرے درخت کا سایہ مل گیا ہو۔ ایک اچھا شاعر انسانوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتا ہے اور اُن دکھوں کا علاج بھی بتاتا ہے۔ وہ انسانوں کو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا حوصلہ بھی دیتا ہے اور زندگی کو اُس کے ہر روپ، ہر رنگ میں پیار کرنے کا سلیقہ بھی۔

کب ترے حسن سے انکار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

اس لئے میرے نزدیک ہر سچے اور بڑے شاعر کی شخصیت قدرت کا ایک ایسا شاہکار ہوتی ہے جسے وقت اور زمانوں کی دھول کبھی نہیں چھپا سکتی۔ میرا مطلب شاعر کی اس شخصیت سے ہے جو اُس کے شعروں اور گیتوں میں چھپی ہوتی ہے۔

ایسے ہی ایک شاعر ہیں جاں نثار اختر صاحب۔ زمانے کی رو میں بہتے ہوئے بھی اختر صاحب زمانے سے پرے ہٹ کر اسے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ اُن کی سوچ بھی خوبصورت ہے اور طرزِ کلام بھی۔

اختر صاحب سے پہلا تعارف اُن کے فلمی گیتوں کے ذریعہ ہوا۔ اگر میں اردو سے محروم نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ اس پہلی ملاقات کا سبب اُن کی نظمیں اور غزلیں ہوتیں۔ بہرحال جب "بنا کا گیت مالا" کے گیتوں کی قطاروں میں "مجھ پہ الزام بے وفائی ہے"، "تم اپنی یاد بھی دل سے بھلا دیتے تو اچھا تھا"، "یہ کسی حد سے جب گزر جائے"، "من مورا باورا"، "اب وہ باتیں کہاں اب وہ راتیں کہاں" اور "پیا سا مورا جیا پکارے" جیسے خوبصورت گیت شامل ہوئے تو جی چاہا کہ ان گیتوں کے شاعر سے ملوں۔ لیکن شاید میری قسمت ضرورت سے زیادہ ہی کاروباری تھی کیونکہ میری اُن سے پہلی ملاقات کسی فلم کی پبلسٹی کے سلسلے میں ہوئی اور اس قسم کی کمرشیل ملاقاتوں میں بھلا شعر و ادب کا گذر کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد برسوں تک میرے اور اختر صاحب کے دائرے الگ الگ رہے۔ لیکن اُن کے گیتوں کے ذریعے اُن سے ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں: "اے جانِ وفا آ"، "ستارے راہ تکتے ہیں چلے آؤ چلے آؤ"، "غریب جان کے ہم کو نہ تم مٹا دینا" اور "چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا" جیسے دل کش گیتوں کو سننے کے بعد جب "بے مروت بے وفا بیگانۂ دل آپ ہیں" کی باری آئی تو مجھ سے میری والدہ صاحبہ (شریمتی کلثوم سایانی) نے فرمایا کہ وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان سے فیض احمد فیضؔ کو بلوانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر فیض صاحب کو آنے کی اجازت مل گئی تو پھر اس مشاعرے میں ہندوستان کے دوسرے بڑے شاعروں کو مدعو کرنے میں کوئی دشواری

ہے۔ بوڑھے خاوند کے ناکارہ اور بیمار جسم کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے وہ دل سوختہ ہو چکی ہے۔ پڑوس میں اُس کی ایک سہیلی ہے جس کا خاوند کئی مہینوں بعد گھر آیا ہے۔ دوسرے دن جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو سہیلی نے اُسے گا کر بتانا شروع کیا کہ اتنے مہینوں کے بعد اس کے خاوند نے کل آتے ہی کیا کیا "دراز دستیاں" کیں ـــ بس یہی گیت کا موضوع تھا۔ اختر صاحب نے کہانی سنی اور پھر موسیقار جے دیو سے دھن۔ گیت لکھنے میں انہوں نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ ثابت ہوا کہ وہ سچ مچ "بھولے بادشاہ" ہیں۔ پہلا بند انھوں نے یوں لکھا ۔

سیّاں جی نے جادو پھیرا   بانہوں کا ڈالا گھیرا
کر کے ذرا اندھیرا   اپرا جو کھینچا میرا
گود پیا کی تنگ لاگی رے سکھی
رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی

فلم کی جس ہیروئن نے بیاہتا ہو کر بھی کبھی سہاگ رات نہ منائی ہو۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی؛ کہانی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ہیروئن کی حالت اور بھی سوختہ ساماں ہو۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اختر صاحب نے اتنی مشکل کیفیت کو کیسے سنبھالا۔ جذبات کو لوک شاعری کی سطح پر لا کر سادگی کا جادو جگا دیا تھا۔ "گود پیا کی تنگ لاگی" کہہ کر انھوں نے گیت کو آلودگی سے بچا لیا تھا۔ سادہ لفظوں میں انتہائی شدت کا اظہار کیا تھا۔ اب آگے کی کیفیت سنئے۔ دوسرا بند یوں تھا۔

سیّاں جی نے ڈاکہ ڈالا   الجھا لٹوں میں بالا
بکھری گلے کی مالا   بھڑکی بدن کی جوالا
دیہہ دھنش رنگ لاگی رے سکھی
رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی

پہلے تو مجھے لگا کہ "دیہہ دھنش رنگ لاگی" بہت ادبی ہو گیا ہے۔ فلم دیکھنے والے عام لوگ جو زیادہ تر اَن پڑھ ہوتے ہیں، شاید اس بے حد حسین تخیل کو نہ سمجھ سکیں، لیکن پھر خیال آیا کہ میں تو اس فلم کو عام روش سے ہٹ کر بنا رہا ہوں۔ کیوں نہ اس خوبصورت تصوّر کی تصویر بنا کر فلم کے پردے پر پیش کروں۔ یہ سوچ کر فیصلہ کر لیا کہ اس مصرعہ کو رہنے دوں گا۔ تیسرا بند یوں تھا۔

گجرا سہانا ٹوٹا   کجرا نین کا چھوٹا
سب تن بھیا رے جھوٹا   جتنا ستایا لوٹا
اور بھی وا کے انگ لاگی رے سکھی
رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی

شائد یہ جادو صرف اختر صاحب ہی جگا سکتے تھے۔ گیت کے بھیتر وہ سب کچھ تھا جسے زندگی کی روح کہتے ہیں جسے ہندی شاعری میں "راج رس" کہا جاتا ہے، یعنی شرنگار رس، مگر گیت کا باہری جامہ بے داغ، بے حد حسین، سادہ اور دل فریب تھا۔ ماہرِ فن موسیقار جے دیو نے اُسے بے انتہا خوبصورت دھن میں باندھا تھا۔ لگتا تھا کہیں دور پہاڑوں میں آہستہ روی سے میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ بطور ڈائرکٹر میں نے اس گیت کی فلم بندی کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ نفس پرور اشاروں کنایوں سے گریز کر کے زیادہ سے زیادہ ہیروئن کے ذہنی خلفشار کی تصویر اتاروں۔ فلم میں یہ گیت رکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ سہیلی کی "رات کتھا" سن کر ہیروئن زندگی سے بے زار ہو جائے۔ مگر صاحب سنسر والے ایسی بے زاری کے قائل نہیں۔ اُن کی نظریں بھی چیزوں کے بھیتر زیادہ جاتی ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں چھپا ہوا "شرنگار رس"، اُن کی نظروں سے بھلا کہاں چھپ سکتا تھا۔ گیت کی پکچرائزیشن پر انہیں کوئی اعتراض نہیں سوجھا۔ بولے

وید راہی

ایک گیت کی کہانی

اختر صاحب نے ایک گیت لکھا۔ "رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی، چین پڑا جو انگ لاگی رے سکھی" اور ہم بےچارے فلم پروڈیوسروں کا دن کا چین رات کی نیند حرام ہو گئی۔ چھ مہینوں تک ہم لوگ فلم سنسر کے ناخداؤں سے برسرِ پیکار رہے۔ فلم "پریم پربت" کو نمائش سے روکے رکھا۔ شٹل کاک کی طرح بمبئی سے دلّی اور دلّی سے بمبئی دوڑتے بھاگتے رہے۔ لاکھوں کا گھاٹا اٹھایا اور آخر میں جب ہم کہیں کے نہ رہے تو سرکارِ عالیہ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم اس گیت کے ساتھ فلم کو ریلیز کر سکتے ہیں۔" ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"۔

اختر صاحب بظاہر لاپرواہ سے اور دین و دنیا سے غافل نظر آتے ہیں، مگر اُن کے جاننے والے اُن کے تجاہلِ عارفانہ کو بخوبی جانتے ہیں۔ اشعار میں وہ اپنے اس انداز کو پسِ پشت نہیں رکھتے ؎

شکستہ میز پر رکھی ہوئی یہ بند گھڑی
نہ جانے کیوں میری ہر بات کا جواب لگے

'نہ جانے کیوں' کے بنا شعر مکمل ہی نہیں، اور اس 'نہ جانے کیوں' میں جاں نثار اختر صاحب کا اپنا انداز ہے۔ ایک اور شعر سنئے ؎

کوئی ثبوت ملے گا تو ہم بھی جانیں گے
سنا تو ہے کہ بُرا وقت ٹل گیا ہے میاں

جس بات کا ثبوت پاس نہیں، اُس پر اتنی بڑی چوٹ اختر صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ سمجھنا اور سب کچھ دیکھتے ہوئے کچھ نہ دیکھنا ہی اُن کا شیوہ ہے۔ اُن کے گیسوئے دراز آنکھوں کے آگے چلمن کا کام دیتے ہیں جن کی درزوں میں سے وہ ہر وقت ہر متعلقہ یا بے تعلق چیز کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار انہیں جب میں نے یہ بات کہی تو بولے۔ " مجھے دانش مند فقیر کہا جائے تو برا نہیں۔" پنجابی میں ایسے دانش مند فقیروں کو "بھولے بادشاہ" کہا جاتا ہے۔

تو صاحب پہلے پہل اس 'بھولے بادشاہ' پر مجھے بالکل بھروسہ نہیں تھا کہ وہ اتنا مشکل گیت لکھ سکے گا۔ پھر مجھے اس کی دانش مندی کا خیال آیا۔ اُس سے منسوب 'زیرِ لب' کی یاد آئی۔ اور اُس کے قلم سے نکلے 'گھر آنگن' کا خیال آیا۔ اور سوچا کہ اختر صاحب سے بہتر اس گیت کو اور کوئی نہیں لکھ سکے گا۔ کیونکہ اس گیت میں بھی کچھ ایسے تیور اور ایسے انداز کی ضرورت تھی جسے اختر صاحب کے انداز میں یعنی صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اور یہی سوچ کر میں نے اختر صاحب کو سچویشن ــ کہانی کا وہ موڑ بتانا شروع کیا، جہاں وہ گیت چاہیئے تھا۔ کہانی یوں تھی کہ ریحانہ سلطان (فلم کی ہیروئن) کی شادی ایک ستّر سالہ بوڑھے (نانا پلیسکر) سے ہو جاتی

نہیں، بلکہ خوبصورت سیکس اور سیکسی مناظر کو جگہ دینی چاہیئے۔ جاں نثار کا یہ گیت اس کی ایک روشن مثال ہے۔"

سردار جعفری نے اس گیت کی طرفداری کرتے ہوئے ودّیا پتی کے پریم گیتوں کی کچھ بہترین مثالیں دیں، جن میں سیکس ہی سیکس ہے مگر حسین و جمیل سیکس۔ پھر انھوں نے کہا، "سیکس ایک وحشیانہ جذبہ ہے، لیکن انسان نے اسے محبت کا رتبہ عطا کیا ہے۔ جسم کی لذتوں کا سفر نشاطِ روح کے حسین ترین محسوسات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اعلیٰ شاعری اسی لذت و نشاط کا حسین امتزاج ہے۔ انسان کو ایسی خوبصورت شاعری سے محروم رکھنا اُس کو وحشیانہ جذبے تک محدود رکھنے کی ایک بیہودہ کوشش ہے۔"

ہم بہت خوش تھے۔ گیت کی ایسی تعریفیں اور سیکس کی ایسی تصریحات و تشریحات سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ ہم اب بھی گردن زدنی ٹھہریں گے۔ بڑے اہتمام کے ساتھ ہم نے اپنے علماء و فضلاء احباب کی رائیں سائیکلو اسٹائل کروا کر نظرثانی کرنے کی درخواست کے ساتھ عزت مآب آفیسرانِ سنسر کے پاس بھیج دیں۔ چند دنوں کے بعد اُن کا صرف ایک سطر کا جواب آیا، "ریوائزری کمیٹی کے ممبران آپ کی باتوں سے متفق نہیں۔"

میرے دل سے اس دانش مند فقیر کے لئے دعائیں نکلیں، جس نے اپنے بھولے پن میں ہمارے ہی کہنے پر ایک سیدھا سادہ گیت لکھ کر ہمیں سولی پر لٹکا دیا تھا۔ ہم بھی کیا کرتے۔ بُرے دنوں کے آثار تھے۔ عام روش سے ہٹ کر اور لاکھوں روپوں کا لالچ چھوڑ کر شانتی ساگر اور میں نے یہ فنکارانہ فلم بنانے کی سوچی تھی۔ بیس بیس سالوں کا کیریئر داؤ پر لگا دیا تھا۔ ناچار ہم بھی فقیری چولا پہننے پر مجبور ہو گئے۔ مالی حالت تنگ ہوتی جارہی تھی۔ جنگ پر آمادہ ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اختر صاحب کو ساتھ لیا، اور دونوں دلی دربار میں حاضر ہو گئے۔ دس دنوں تک ہمیں وہاں ہوٹلوں میں دربدر ہونا پڑا۔ اُس وقت کے وزیرِ اطلاعات جناب اندر کمار گجرال کے در دولت پر جبا کھڑے ہوتے ——— ——— وہ فوراً باہر آئے۔ اختر صاحب سے بڑے تپاک سے ملے۔ اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پائیں باغ میں ٹہلانے لے گئے۔ میرے دل سے دعائیں اُٹھنے لگیں۔ اختر صاحب نے گجرال صاحب سے کہا، "اس عمر میں مجھ میں فحاشی کا الزام لگا ہے، بتایئے یہ کہاں کا انصاف ہے۔" گجرال صاحب نے بڑے ہمدردانہ رویّہ سے ہر بات سنی، پھر انھوں نے پوری فلم کا ٹرائل دیکھا۔ اور اگرچہ مکالموں میں کچھ cut دیئے گئے اور فلم کو اے سرٹیفکٹ دیا گیا۔ لیکن وہ گیت مع پکچرائزیشن کے پاس ہو گیا۔ یہ سب کچھ تو ہوا — مگر سود در سود کی شکل میں ہم اتنے زیرِ بار تھے کہ مناسب طریقے سے فلم کی نمائش کا اہتمام کرنا ہمارے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ تقسیم کاروں کے ہتھکنڈوں سے بچ نکلنا محال تھا۔ مقدمے بازی تک نوبت آچکی تھی۔ بوکھلاہٹ میں جو انجام ہونا تھا سو ہوا۔ ان باتوں کو کبھوں کبھی چکے تھے کہ اتنے سالوں کے بعد ایک ہلکی سی آواز آئی "جاں نثار اختر صاحب کا خاص نمبر نکل رہا ہے، کچھ لکھئے۔" "آپ ہی بتایئے۔ اختر صاحب پر اس کے علاوہ مجھے اور کیا سوجھ سکتا تھا۔ اُن سے منسوب تمام تر یادیں اسی حادثے کے نام لکھی جا چکی ہیں۔

آج کل میں اپنی فلم "کالی گھٹا" بنانے میں مصروف ہوں۔ اُدھر شانتی ساگر "آخری ڈاکو" بنا رہا ہے۔ دونوں فلمیں یہ سوچ کر بنائی جارہی ہیں کہ عام آدمی کے معیار پر پوری اتریں، چاہے کوئی بھی فارمولا استعمال کرنا پڑے۔ ان فلموں کو زیادہ سے زیادہ چلنا چاہئے۔ تاکہ 'پریم پربت' میں جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ہو سکے۔ فنی تقاضوں سے دور ہم صرف ڈسٹری بیوٹروں کے تقاضے پورے کر رہے ہیں، اسی لئے ان میں سے کسی فلم میں بھی جاں نثار اختر کے گیت نہیں ہیں۔ جے دیو کی موسیقی نہیں ہے۔ بھلا بتایئے اس شہرِ دجّال میں ایسے دانش مند فقیروں اور بھولے بادشاہوں کا کیا کام ——؟ ✦

"فلم بے شک جوں کی توں رہنے دیجیے، گیت کے الفاظ بدل دیں"، ستم ظریفی کی بات تھی۔ پکچرائزیشن تو انہی الفاظ پر ہونٹوں کی حرکات و سکنات کے مطابق تھی۔ انہیں کیسے بدلا جا سکتا تھا، بالکل ناممکن بات تھی۔ سب سے بڑا اعتراض ان کو ان سطور پر تھا۔ "گودیا کی تنگ لاگی رے سکھی، دیہہ دھنش رنگ لاگی رے سکھی اور سیّاں جی نے ڈاکہ ڈالا"۔ سننے میں آیا کہ دیہہ دھنش رنگ لاگی رے سکھی کا مطلب وہاں لیا گیا ہے کمان کی طرح پوز میں آیا ہوا جسم۔ یعنی کوکا پنڈت کے پراچین شاستر میں سے نکالا گیا ایک آسن۔ یہ بات سن کر میں نے غور سے اختر صاحب کی طرف دیکھا۔ ماننا پڑا کہ یہ فقیر دانشمندوں کا بادشاہ ہے۔

میں نے اور شانتی ساگر نے بطور ڈائریکٹر پروڈیوسر کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اس گیت کے بغیر چونکہ پکچر کی تھیم لڑکھڑا جائے گی، اس لئے سنسر والوں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر یہ بھی سعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ اہلِ سنسر سے رجوع کرنا چاہا تو پتہ چلا اُن کے نام اور پتے حاصل کرنے کا دستور نہیں۔ پردہ داری کی حد تھی۔ مدعی یا مدعا علیہ کو حکم زباں بندی دے دیا گیا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں۔ ادھر اُدھر کچھ نظر نہیں آیا تو سوچا دوستوں کو احوال سے آگاہ کر کے دل کا غبار تو نکالیں۔ اختر صاحب کو ساتھ لے کر سب سے پہلے ہم جناب کرشن چندر کے پاس پہنچے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہندوستانی ادب میں کرشن چندر کا کیا مقام ہے۔ قبولِ عام کی سند کے علاوہ انہیں کئی اعلیٰ سرکاری اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ انہوں نے اختر صاحب کی زبانی پورا گیت سنا اور لکھ دیا۔ "میری رائے میں ہندی گیتوں کے شاندار روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ یہ گیت نہ غیر شائستہ ہے نہ اشتہا انگیز، نہ قابلِ اعتراض۔ اس گیت میں محبّت کا فنکارانہ اظہار ہے۔" جناب کرشن چندر کی یہ رائے پا کر ہم بہت خوش ہوئے۔ لگا کہ سنسر والوں کی تسلی کے لئے اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔ اُس وقت مجھ پر یہ راز کھلا کہ سرکار کیوں پدم شری اور پدم بھوشن جیسے خطابات بخشتی ہے۔ ایسے اعلیٰ خطابات پانے والے معزز اشخاص دوسرے عام لوگوں کے حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ کرشن چندر صاحب نے اپنی رائے قلم بند کرنے سے پہلے سنسر چیف صاحب کو فون کیا اور کہا، "اگر آپ میری رائے کی ذرا سی بھی قدر کرتے ہیں تو یقین کیجیے دیہہ دھنش رنگ لاگی رے کا مطلب جسم کا قوس و قزح کے رنگوں میں رنگ جانا ہے۔"

پھر میں اور اختر صاحب شری نریندر شرما کے پاس پہنچے۔ شری شرما ہندی کے موجودہ شاعروں میں سب سے زیادہ مستند اور معتبر شاعر ہیں اور کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ انہوں نے لکھ کر دیا، "یہ گیت لوک شیلی میں لکھا گیا ہے۔ اور فلم میں ایک بیاہتا عورت نے گایا ہے۔ مجھے اس گیت میں کچھ بھی غیر واجب یا قابلِ اعتراض نہیں لگا۔"

خواجہ احمد عباس نے کافی لمبا چوڑا لیٹر دیا۔ اس سے پہلے اپنی ایک فلم کے سلسلے میں ہی وہ سنسر بورڈ سے سپریم کورٹ تک لڑ چکے تھے، اور مقدمہ جیت چکے تھے۔ انھوں نے کہا: "اس گیت میں گودیا کی تنگ لاگی رے سکھی" اور "دیہہ دھنش رنگ لاگی رے سکھی" جیسی پُر اثر سطور خاص کلاسیکی اسٹائل میں لکھی گئی ہیں اور میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اس گیت کی نازک خیالیاں اور باریکیاں دیکھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا۔ تعجب ہے کہ سنسر نے اس گیت کی انہی سطور پر اعتراض کرتے ہوئے پورے گیت کے بولوں کو فلم میں سے نکال دینے کے لئے کہا ہے۔ میرے خیال میں بمبئی کے تمام اردو ہندی کے فنکاروں اور شاعروں کو اپنے ایک سمجھ دار، حساس اور ذمہ دار شاعر ساتھی کے دفاع کے لئے ایک صف میں کھڑے ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اس پر غیر شائستگی، سفلگی اور فحاشی کے الزام لگائے گئے ہیں۔"

سردار جعفری تو ایک دم غصے میں آ گئے۔ انھوں نے کہا، "میں صرف اتنا ہی نہیں کہوں گا کہ یہ گیت قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ میری نظر میں نازک الفاظ میں بنا ہوا یہ ایک بہت ہی خوب صورت گیت ہے۔ اسے سن کر ہندوستان کے عوامی ادب کی کچھ بہترین مثالیں یاد آ جاتی ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں بدصورت سیکس بھرا ہوتا ہے۔ اس رَو کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں فلموں سے سیکس نکالنے کی ضرورت

سے گیتوں کو نغمگی ملی۔ گذشتہ تیس چالیس سال کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گیت کا وہ تصور جو صدیوں سے چلا آرہا تھا فلموں میں آکر یکسر بدل گیا ہے۔ فلمی گیت کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ اس میں بلموا اور سجنوا سے لے کر صنم اور دیر و حرم تک سما گئے ہیں۔ آج گیت محض گیت نہیں، نظم بھی ہے، غزل بھی ہے اور نوحہ بھی۔ "اے ری میں تو پریم دیوانی" بھی ہماری فلموں کے لئے گیت ہے اور "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" بھی۔

فلمی گیتوں کو یہ وسیع کینوس عطا کرنے والوں میں کئی نام نظر آتے ہیں۔ ان چند گیت نگاروں نے گیت کی تلاش میں ملک کا چپہ چپہ اور اس کی تہذیب کا گوشہ گوشہ چھانا ہے۔ کبھی وہ کوٹھے پر نظر آتے ہیں، کبھی کھیت میں۔ کبھی پنگھٹ پر کسی گوری کو گدگدا کر اس کے گلے سے گیت گنگا جاری کراتے ہیں۔ تو کبھی کسی جلسہ گھر میں محفلِ غزل سجا دیتے ہیں۔ ان چند لوگوں نے عوامی اظہار اور ادبی تخلیقات کے درمیان ایک انوکھا پُل بنا دیا ہے جس کے نیچے موسیقیت اور نغمگی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔

جان نثار اختر کا نام ان میں بہت نمایاں نظر آتا ہے

اوروں کی طرح جاں نثار اختر بھی کچھ ضرورتاً فلموں میں گئے۔ شاید وہ سرے سے فلمی گیت نگار بننا ہی نہیں چاہتے تھے ورنہ "بہو بیگم" نہ بناتے۔ لیکن فلم انڈسٹری انہیں تاجر نہیں شاعر ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر کچھ ان کی طبیعت بھی بھی جسے سمٹنا پسند نہ تھا۔ اُسے لگا کہ فلم کا یہ میدان تفریحی بھی ہے اور تخلیقی بھی۔ ہلکے پھلکے گیتوں میں بڑے بڑے پیغام دئے جا سکتے ہیں۔ اور اپنی آواز کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ صرف لہجہ ذرا تبدیل کرنا ہوگا اور "بام و سقف" کی جگہ "اٹریا" کھڑی کرنی ہوگی۔

جاں نثار اختر اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔

اُن کی کامیابی کی قوسِ قزح "آ جانِ وفا آ" سے "یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے" تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس قوسِ قزح میں "بے مروت، بے وفا، بیگانۂ دل آپ ہیں" جیسی حسین غزل کا رنگ بھی ہے۔ اور "شیام منوہر کنج بہاری کتنا پیارا ناؤں رے" جیسے روایتی گیت کا نور بھی اور پھر "دیس ہمارا ایک ہے بھارت سارا ایک ہے" جیسے وطنی ترانوں کے پھول بھی کھلے ہیں۔

فلمی گیتوں کی خاطر جاں نثار نے اپنے مسلک کو ترک نہیں کیا۔ آج بھی جہاں اور جب موقع ملتا ہے وہ نغمگی اور رومانیت کے ساتھ ساتھ اپنا پیغام بھی دے دیتے ہیں۔

لڑنا ہے اب غربت سے　　　　بے کاری کی لعنت سے
فاقوں کی ان دھوپوں سے　　　　کال کے کالے روپوں سے
ظلم کے پھیلے جالوں سے　　　　پونجی وادی چالوں سے
اپنا نعرہ ایک ہے　　　　دیس ہمارا ایک ہے

جاں نثار کو بیٹھے بیٹھے خیال آتا ہے کہ شمع کی عمرِ طبیعی ایک رات ہے، چاہے وہ ہنس کر کاٹے یا رو کر۔ چنانچہ ان کے قلم سے یہ گیت ابل پڑا۔

ہنس کر جی لے او ناداں
ہنسنا جینے کی پہچان
ایسا لگتا چارو، اور

فن اور شخصیت

سردار عرفان

نغمۂ اندوہ رُبا کا خالق

گیتوں کے بغیر ہندوستانی فلم کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ چند فلمیں ایسی بنی ہیں جن میں گیت نہیں تھے لیکن ان فلموں کی حیثیت تجرباتی ہو کر رہ گئی ہے۔ لبا اوقات تو ایسی فلموں پر گمان ہوتا تھا کہ "منفرد" بننے کے جوش میں گیتوں سے دانستہ پرہیز کیا گیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایسی فلمیں عوامی دھارے سے کٹ گئیں اور عموماً ناکام ہی رہیں۔

فلموں میں گیتوں کی ضرورت دو اسباب کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے۔ ایک تو عوامی مانگ اور دوسرے پبلسٹی۔ عام فلم بین کو فلم میں دو چار گانے ضرور چاہئیں۔ باکس آفس فارمولے پر بننے والی فلموں میں رقص و سرود کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان میں گانوں کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔ جہاں تک پبلسٹی کا تعلق ہے، جب تک ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر پر کسی فلم کے گیت نشر نہ ہوں، اس کا چرچا عوام میں بہت کم ہوتا ہے۔ اور اب تو ٹیلی ویژن کے پھیلاؤ کے پیش نظر وہ لوگ بھی جو پہلے تجربے کی خاطر گیتوں سے کنارہ کشی کرتے تھے، فلموں میں گیتوں کی اہمیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ صورتحال غالباً اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اردو ہندی میں موضوعاتی فلمیں نہیں بنیں گی۔ ہالی ووڈ، روس، جاپان وغیرہ کی فلمیں دیکھیے تو ان میں گانوں کا گزر اس وقت تک نہ ہوگا جب تک وہ "میوزیکل" نہ ہوں یا پھر کسی "ویسٹرن" فلم میں اکھڑ اور آوارہ مزاج ہیرو کے لاابالی پن کو اجاگر کرنے کے لئے ایک آدھ گانا ڈال دیا جاتا ہے۔ ورنہ عموماً یہ فلمیں اپنے موضوع کے دائرے میں رہتی ہیں اور بے جا ناچ گانے پر سیلولائیڈ ضائع نہیں کرتیں۔

اس کے برعکس ہندوستانی فلموں کا دائرہ عموماً روایتی عشق و محبت ہے۔ یا تو وہ راجا رانی کی کہانی ہوگی یا کالج گرل اور کالج ہیرو کی یا پھر کوئی اشک آور فیملی ڈرامہ۔ ظاہر ہے، ایسی فلم کا لباس برہ کے گیت یا ملن کے نغمے کے بغیر کیوں کر تیار ہو سکتا ہے حد تو یہ ہے کہ جنگ جیسے بھیانک اور خشک موضوع پر بننے والی ہندوستانی فلموں میں بھی ایک دو نہیں، گیتوں کا پورا کوٹہ موجود ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی فلموں میں گیتوں کی شمولیت بھرتی کے لئے نہیں ضرورت کی بنا پر ہے۔ موسیقی ہندوستانی زندگی اور تہذیب کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ماضی میں دربار سے بازار تک اور دیوستھان سے کھلیان تک گیت سنگیت کا راج رہا ہے۔ اگر راج سنگھاسن کو ڈانواڈول کرنے کے لئے ایک مست شباب حسینہ اپنی شعلہ سی لپکتی آواز کا سہارا لیتی ہے تو ایک پیکرِ تقدس ماں بھی اپنے ننھے پھول کو رات کی آغوش میں سونپنے کے لئے گنگناتی ہوئی لوری کو آواز دیتی ہے۔

فلموں میں گیت خواہ عوامی مانگ کا نتیجہ ہوں یا تہذیب کی حقیقی عکاسی کی خاطر، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ گیت اور فلم کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے اور خدا جانے کب تک رہے گا۔ اس تعلقِ باہمی نے جہاں گیتوں سے فلموں کو نکھارا وہیں فلموں

ڈاکٹر عنوان چشتی

جاں نثار اختر بحیثیت گیت کار

گیت ہندوستانی ادب اور موسیقی کی قدیم ترین اصطلاح ہے۔ "گیتا" اور "گاتھا" بھی گیت کے وصف سے متصف ہے۔ گیتا کے معنی ہیں جو گایا گیا ہو۔ گاتھائیں بھی گائی جاتی ہیں۔ اس لئے گیت کے دائرے میں آتی ہیں۔ ویدوں کے گائیکوں نے بھی ویدوں کو گیت کہا ہے "گیرم کر دن سیم ہی" کا مفہوم ہے کہ "اے میرے خالق میں تجھے گیتوں میں باندھتا ہوں"۔ انگریزی میں "لرک" کی اصطلاح تقریباً گیت کا مفہوم رکھتی ہے۔ "لرک" جرمنی کے لفظ "لائرہ" سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک مخصوص قسم کا ساز تھا۔ اس ساز پر گائی جانے والی ہر نظم کو "لرک" کہا گیا۔ اپنے قدیم مفہوم میں وہ نظم "لرک" کہلاتی ہے، جو سازوں پر گائی جاتی ہے۔ "سنگیت" کی اصطلاح دو لفظوں یعنی "سم" اور "گیت" سے مرکب ہے۔ "سم" بمعنی عمدہ۔ گیت تو گیت ہے ہی یعنی نغمہ۔ سنگیت، عمدہ گیت ہوا۔ ہندوستانی سنگیت کی اصطلاح میں جو نظم، سُر، پد اور تال کے مطابق ہوتی ہے، گیت کہلاتی ہے۔ ہندی میں گیت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ "ویدک گیت" اور "لوکک گیت"۔ ویدک گیت کا بہترین نقش "سام وید" ہے۔ لوک گیت، عوامی زندگی اور جذبات کا بیساختہ اظہار ہے۔ لوک گیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو مارگ گیت اور دوسرے کو دیشی گیت کہتے ہیں۔ مارگ گیت میں "شدھ راگ اور راگنیاں" شامل ہیں۔ اور دیشی گیت میں ہلکے پھلکے گانے مثلاً دادرا، ٹھمری اور ٹپہ وغیرہ۔ موسیقی کے نقطۂ نظر سے گیتوں کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نیتر گیت اور گاتر گیت۔ نیتر گیتوں میں سازوں کا نغمہ شامل ہے اور گاتر گیت میں انسانی لحن کا نغمہ۔ عام طور سے گیت سے گاتر گیت یعنی لحنِ انسانی کا نغمہ ہی مراد ہے۔ ہندی کے نقادوں نے ہیئت کے نقطۂ نظر سے گیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ہیں شدھ گیت اور پرگیت مکتک۔ انگریزی میں شاعری کی قسمیں ہیں۔ بیانیہ، ڈرامائی اور غنائی شاعری میں لرک کو اہم مقام حاصل ہے۔ شدھ گیت گیت میں وہ گیت شامل ہے جو مختصر ہو اور سازوں پر موسیقی کے اصولوں کے مطابق گایا جا سکے۔ پرگیت تکنک میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جن میں غنائی شاعری کی داخلی خصوصیات تو ہوتی ہیں مگر اُن میں گائے جانے کی صلاحیت نہیں ہوتی یا نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور یہ نظمیں شدھ گیت سے ہیئتی نقطۂ نظر سے بھی قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ اردو میں بھی خالص گیت اور گیت نما نظمیں ملتی ہیں۔ اردو گیتوں کے سرمائے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لوک گیت، ادبی گیت اور فلمی گیت۔

اردو میں گیتوں کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ اردو شاعروں نے غزل کی تخلیق پر سارا زور صرف کیا۔ نظم کی طرف بھی توجہ ہوئی، مگر گیتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ اردو میں گیتوں کا اتنا سرمایہ نہیں ملتا جتنا ملنا چاہیے اور اچھے گیتوں کی تو عبرت ناک حد تک کمی ہے۔ ڈاکٹر بھاگیرتھ مشر کا خیال ہے کہ گیت کو جو چیز عام غنائی نظموں سے الگ کرتی ہے وہ "ٹیک کی بنکتی ہے" جو پد پورا ہونے پر دہرائی جاتی ہے میری رائے میں اس پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ گیت میں محض ٹیک کی بنکتی ہی کافی نہیں، بلکہ اس سے قبل ایک اور بنکتی کی موجودگی بھی ضروری

خود بھی ہنستا ہے بھگوان
دل کی خوشیاں جتنی بہنگی اتنی سستی رے
میں بھی ہنستی رے

جاں نثار کی شاعری دردِ انسانی میں ہاتھ بٹانے اور زندگی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا کام کرتی رہی ہے۔ فلمی گیتوں میں بھی وہ اپنے مشن کو نہیں بھولے۔ انہیں احساس ہے کہ زندگی کی دشواریوں کا نام ہے۔ ایک طویل سفر ہے جس میں کئی تاریک راتوں کا بوجھ سر پہ اٹھانا ہوگا لیکن وہ اپنے نغموں سے ان راہوں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہر قدم پہ سو دیئے جل رہے ہیں راہ میں
اک نہ ایک بات ہے ہر جواں نگاہ میں
زندگی کو سونپ دے عشق کی پناہ میں
دل پکارنے لگے ہر کسی سے پیار کر
زندگی حسین ہے زندگی سے پیار کر

جاں نثار کا یہ پیغام محض خطیبانہ نہیں، وہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ زندگی کے اس کٹھن دور میں جب بہت سے لوگ جاں نثار کو ایک تھکا ہوا مسافر سمجھنے لگے تھے جو کسی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا ہو، جاں نثار زیرِ لب مسکراتے رہے وہ تماشائیوں کا تماشا دیکھ رہے تھے اور ان کا ذہن نئے نئے شگوفے مرتب کر رہا تھا۔ لیکن حیرت! جب یہ گلے اور شکوے لفظوں کا روپ دھار کر نکلے تو نغمے بن گئے تھے۔ یہ ایک نیک انسان کا کمال تھا۔ ایک اچھے شاعر کے خلوص کا کرشمہ تھا اور اس محبت کا فیضان تھا۔ جو جاں نثار اختر کو حقیقی معنوں میں زندگی سے ہے۔

کب ترے حسن سے انکار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

زندگی سے بہت پیار کرنے والا انسان ہی دوسرے انسانوں سے پیار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے سوزِ دروں اور آہِ سحر گاہی کو لفظوں کے صدف میں رکھ کر پیش کر سکتا ہے لیکن موقع آنے پر وہ یہ احتیاط بھی برت سکتا ہے۔

"میرے نغموں سے اُن کا دل نہ دکھے
غم نہیں مجھ پہ جو گذر جائے"

○

کی فنّی اور تکنیکی خصوصیات ہوتی ہیں۔ موسیقی کا اپنا تکنیکی نظام ہے اور شاعری کا الگ اپنا۔ غنائی شاعری کو موسیقی کے دائرے میں محدود کرنے سے اس کی وسیع خصوصیات نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ موسیقی کی اہم خصوصیات، غنائی شاعری کی سرشت میں تو داخل ہوتی ہی ہیں، مگر اس میں شاعر جذباتی قدروں کو نغمے کی لہر میں تبدیل کر دیتا ہے اور جذبے کو آواز، آواز کو دُھن اور دُھن کو موسیقی بنا دیتا ہے۔ شاعر الفاظ کو موسیقی کے سانچے میں نہیں ڈھالتا، بلکہ جذبے اپنے آہنگ، وحدت اور شدّت کے ساتھ الفاظ کے پیکر، آواز اور موسیقی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لئے غنائی شاعری میں وہ ساری خصوصیات ہوتی ہیں، جو موسیقی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ پھر بھی غنائی شاعری محض موسیقی نہیں ہے اور اسی سے ان گیتوں کا جواز بھی ملتا ہے جو گیت کی ہیئت کی خارجی خصوصیات کے حامل نہ ہوتے ہوئے بھی، اپنی داخلی خصوصیات کی بنیاد پر گیت کہلاتے ہیں۔

اردو گیتوں کے سرمائے کے تجزیئے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے عناصر ہوتے ہیں (الف) موسیقی کے عناصر (ب) چھندوں یا اوزان و بحور کے عناصر (ج) داخلی شاعری کے عناصر۔ موسیقی کے عناصر اور خصوصیات پر سطورِ بالا میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ موسیقی کے عناصر و اسلوب اور شاعری کے اوزان و بحور میں جو نازک امتیازات ہیں، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اردو کے وہ گیت جو ادبی ہیں، اُن میں لوک گیتوں کے برعکس بحر اور قوافی کا مخصوص التزام موجود ہے۔ لوک گیتوں کے آہنگ کے اپنے اصول ہیں۔ اُن کا اردو بحروں کا پابند ہونا ضروری نہیں۔ جاں نثار اختر کے فلمی گیتوں پر اردو کے ادبی گیتوں کا گہرا اثر ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے گیت غزل کی داخلی اور خارجی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے بیشتر گیت موسیقی کی دھنوں پر گائے گئے ہیں، مگر وہ موسیقی کی تکنیک کے پابند نہیں بلکہ اُن کے گیتوں کی بحروں اور آہنگ نے اُن کی دھنوں کو متاثر کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو اوزان و بحور اور موسیقی کی تکنیکی دھنوں میں بھی مطابقت ہو سکتی ہے۔ جاں نثار اختر کا یہ گیت پڑھئے اور دیکھئے کہ وہ موسیقی اور اوزان و بحور کے آہنگ کا خوبصورت آمیزہ ہے کہ نہیں۔

یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے
مجھے گھیر لیتے ہیں، باہوں کے سائے

پہاڑوں کو چنچل کرن چومتی ہے
ہوا ہر ندی کا بدن چومتی ہے
یہاں سے وہاں تک ہیں چاہوں کے سائے
یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے

لپٹتے یہ پیڑوں سے بادل گھنیرے
یہ پل پل اُجالے، یہ پل پل اندھیرے
بہت ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں راہوں کے سائے
یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے

دھڑکتے ہیں دل کتنی آزادیوں سے

ہے جو ٹیک کی پنکتی سے باہم مقفیٰ ہو۔ اردو میں چونکہ گیتوں پر خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا ۔ اس لئے گیت کی ہیئت کا شعور عام نہیں ہوا ۔ ہمارے نقاد اور شعراء ہر ہیئت کی غنائی تخلیق کو گیت کہتے ہیں ۔ میں نے اپنے ایک مضمون اردو گیت کی ہیئت (مطبوعہ سب رنگ جنوری ۱۹۷۴ء) میں گیت کی ہیئت پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ جاں نثار اختر کے یہاں اگرچہ بعض ایسی تخلیقات بھی ملتی ہیں جو خارجی طور پر گیت کی خصوصیات کی حامل نہیں ۔ مگر ان کے گیتوں میں ایسے گیتوں کی کمی نہیں ہے جو گیت کی داخلی خصوصیات کے ساتھ خارجی خصوصیات کے حامل بھی ہیں ۔ جاں نثار اختر نے بیشتر گیت فلمی ضرورتوں کے پیش نگاہ لکھے ہیں ۔ ان میں بھی اکثر گیتوں میں گیت کی ہیئت کی تکمیل کا خیال رکھنا ، جاں نثار اختر کی فنی مہارت کا مظہر ہے ۔

میں بھی ہنستی رے
دھرتی ہنستی رہے ، چھلکے مستی رے
کنواری آنچل کو ڈھلکائے
بالک جیسی ہنستی جائے
دنیا روکے ٹوکے لاکھ
چھنکے چوڑی کنگنا گائے
پاؤں میں بجتی پاگل پائل ، دل کو ڈستی رے
میں بھی ہنستی رے

شیام منوہر کنج بہاری ، کتنا پیارا ناؤں رے
میری تیری پریت تو چھلیا جانے سارا گاؤں رے
تو ہی میرے من میں باسے ، تو ہی میرے انگ میں
میں تو سارے رنگ بھلاکر ، ڈوبی تیرے رنگ میں
من میں ڈولے بندرابن کی ٹھنڈی ، ٹھنڈی چھاؤں رے
شیام منوہر کنج بہاری ، کتنا پیارا ناؤں رے

ان ٹکڑوں میں "میں بھی ہنستی رے" اور "شیام منوہر کنج بہاری کتنا پیارا ناؤں رے" ٹیک کی پنکتی ہے اور ہر بند کے اختتام پر دہرائی جا رہی ہے ۔ ان دونوں گیتوں میں ٹیک کی پنکتی سے قبل انھیں ردیف اور قوافی میں ایک اور پنکتی بھی ہے اس التزام سے گیت کی ہیئت مکمل ہوئی ہے ______ جاں نثار اختر کے گیتوں کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں گیت کا تصور ، خارجی یا ہیئتی خصوصیات کے ساتھ نہیں ، بلکہ اس کی داخلی خصوصیات کے ساتھ ابھرتا ہے اس لئے ان کے گیت بہت سی ہیئتوں میں ہیں ۔ بہت سے گیتوں میں ٹیک کی پنکتی ہے مگر اس سے قبل ، انھیں قوافی میں ایک دوسری پنکتی موجود نہیں ۔ کہیں محض غزل کے فارم میں گیت ہے ۔ ہیئت کی یہ رنگا رنگی ، اس بات کا ثبوت ہے کہ جاں نثار اختر گیت کی ہیئت پر کم اور اس کی داخلی خصوصیات یعنی غنائیت ، جذبے کی وحدت اور شدت نیز اختصار پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔

گیت کے وسیع تصور میں غنائی شاعری کی تمام قسمیں اور صورتیں شامل ہیں ۔ غنائی شاعری سے یہ مراد نہیں کہ اس میں موسیقی

اور صوفیانہ وجدانی گیت بھی شامل ہیں۔ جاں نثار اختر کے بیشتر گیت "حسی گیتوں" کے دائرے میں شامل ہیں۔ اگرچہ ان پر فلمی sitvation کو ذہن میں رکھنا ضروری تھا یعنی ان پر خارجی پابندیاں شعوری تھیں، پھر بھی انھوں نے داخلیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ گلاب رائے نے گیتوں کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے راگ آتمکتا (موسیقیت) سنشکپتا (اختصار) بھاو ایکتا (جذبے کی وحدت) اور داخلیت پر زور دیا ہے۔ ان میں ایک پانچویں خصوصیت کا اضافہ اور کر لیجیے اور وہ ہے جذبے کی شدت۔ جاں نثار اختر کے یہاں فلمی قدغن کی وجہ سے یہ خصوصیات پوری طرح تو نہ ابھر سکیں۔ پھر بھی، ان میں یہ خوبیاں کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہیں۔ ان کے گیتوں میں کبھی زندگی درد کے طوفان میں ڈوبتی ہے، کبھی محبوب کی یادیں تصویریں بن کر سطحِ ذہن پر رقص کرتی ہیں۔ کبھی درد سے روح کو آرام ملتا ہے۔ کبھی بھیگی چاندنی سینے میں آگ لگا دیتی ہے۔ کبھی ٹھنڈی ہوائیں ناگن بن کر دل کو ڈستی ہیں۔ اور جب باہوں میں زندگی بھرنے کا امکان ہوتا ہے تو اُن کے گیتوں میں لہو دن ہنسنے اور سورج آنگن میں پگھلنے لگتا ہے۔ چاند پیار بن کر برسنے لگتا ہے۔ دلوں میں رنگ اور نگاہوں میں روشنی بھر جاتی ہے۔ ان کے گیتوں میں ہجر و وصال کا کرب و کیف، منظروں کا حسن اور کہیں کہیں حسن و عشق کی نفسیات کا عالم انہیں حسی گیتوں کے دائرے میں شامل کرتا ہے۔

جہاں تک جاں نثار اختر کی گیتوں کی زبان کا تعلق ہے اس پر اردو شاعری کی اس زبان کا گہرا اثر ہے جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے اردو غزل کا ذریعۂ اظہار رہی ہے۔ اسی لیے اس میں مانوس تشبیہیں اور استعارے اور روایتی ذخیرۂ الفاظ کی بہتات ہے۔ اور انہیں عناصر سے ان کے گیتوں میں عمومی اسلوب کی جلوہ گری ہے۔ فلمی ضرورتوں کے پیشِ نگاہ یہ عیب نہیں ہنر ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ جاں نثار اختر اگرچہ گیت کی ہیئت کا شعور رکھتے ہیں مگر اُن کے یہاں بہت سی ہیئتوں میں گیت نظر آتے ہیں۔ وہ گیت کی خارجی خصوصیات سے زیادہ اُس کی داخلی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اُن کے گیتوں کا تعمیمی رنگ جو غزل کے رنگ کا ہی ایک حصہ ہے، انہیں منفرد گیت نگار تو نہیں بناتا مگر مقبول ضرور بنا دیتا ہے۔ اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ فلمی sitvation کے جبر کے باوجود انھوں نے اردو شاعری کے بنیادی تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کی۔ اور گیتوں میں بھی اردو شاعری کی دلکش اور ارفع روایتوں کو اپنایا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ فلمی گیت کاروں میں بہت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ★

بہت ملتے جلتے ہیں ان وادیوں سے
محبت کی رنگیں پناہوں کے سائے
یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے

اس گیت کے وزن پر غور کیجیے ' فعولن فعولن فعولن فعل ' یہ وزن اردو مثنویوں کا پسندیدہ وزن ہے اور اس میں غزلیں بھی ملتی ہیں ۔ جاں نثار اختر نے بیشتر گیت اردو کی مروجہ بحروں میں لکھے ہیں ۔ انھوں نے ہندی چھندوں میں گیت نہیں لکھے ۔ بحروں کا انتخاب بھی انھیں اردو غزل کے مزاج سے قریب کرتا ہے ۔

غنائی شاعری میں شعور پر وجدان کو ، تعقل پر جذبے کو خارجیت پر داخلیت کو فوقیت حاصل ہے ۔ اس میں تجربے کی سچائی اور احساس کی خالصیت کی بہت اہمیت ہے ۔ گیتوں میں شاعر کا انتہائی ذاتی اور انفرادی ردعمل ابھرتا ہے اور اس کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے ۔ اس کی داخلی کیفیت ، خود اظہاریت کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ جاں نثار اختر نظم نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئے اور ایک کامیاب غزل گو کی حیثیت سے بھی سامنے آئے ہیں ۔ اُن کی نظموں میں اگرچہ ربط اور تسلسل ہے ۔ آغاز ، ارتقا ، نقطۂ عروج اور اختتام کی تکنیکی خصوصیات بھی ہیں ، مگر ان کے عمیق تجزیے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے ان میں غزل کے فن کی بنیادی خصوصیت یعنی تعمیم کا رنگ ہے ۔ یہی تعمیمی رنگ ان کے گیتوں کی فضا پر چھایا ہوا ہے ۔

(الف) زندگی حسین ہے ، زندگی سے پیار کر

کون سی خوشی نہیں ، کون سا نشا نہیں
دل میں ہو جو حوصلہ ، غم بھی بے مزا نہیں
مستیوں میں ڈوب جا ، زندگی سے پیار کر
زندگی حسین ہے ، زندگی سے پیار کر

(ب) نظر نواز نظاروں میں کھو گیا ہوں میں

ہر ایک پھول مہکتا ہوا شرارا ہے
ہر ایک ذرہ چمکتا ہوا ستارہ ہے
انہیں زمیں کے ستاروں میں کھو گیا ہوں میں
نظر نواز نظاروں میں کھو گیا ہوں میں

ان ٹکڑوں میں الفاظ اور اُن کی ترتیب ، ردیف و قوافی کا شدید اہتمام ، لب و لہجہ کا مانوس انداز اور ان سب کی مجموعی فضا میں جو تعمیمی رنگ ہے وہ غزل کی طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے ۔ یہی تعمیمی رنگ جاں نثار اختر کے گیتوں کی طاقت ہے اور یہی اُن کی کمزوری بھی ۔ طاقت اس لئے کہ اُن میں وہ مانوسیت ہے کہ جو روایت کا حسن ہوتا ہے ، اور کمزوری اس لئے کہ ان میں وہ انفرادیت نہیں جو شاعر کو دوسرے گیت کاروں سے ممتاز کرتی ہے ۔

اردو گیتوں کے دائرے میں فکری گیت ، وجدانی گیت اور جذباتی گیت شامل ہیں ۔ جذباتی گیتوں میں "حسّی گیت" ، "تخیلی گیت"

گیت

ہماچل

اور

وزیر اعظم کا ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام

کامیابیاں :

* دیہات کے تمام بے زمین کسانوں کو زمینیں دی گئیں ۔
* دیہات کے تمام بے گھر لوگوں کو گھر بنانے کے لئے زمینیں دی گئیں ۔
* دیہی کاریگروں، کھیت مزدوروں اور چھوٹے کسانوں کو قرض سے نجات دلائی گئی۔
* چھوٹے کسانوں کے قرض پر ایک سال کی چھوٹ دی گئی ۔
* زمین پر قابض رعیتوں کو مالکانہ حق دیئے گئے ۔

زیر عمل اقدامات

* ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء تک ہر قسم کی رعیت کو مالکانہ حقوق دیئے جارہے ہیں۔
* جن کسانوں کے پاس پانچ بیگہ سے کم زمین ہے انہیں مزید زمین دی جائے گی ۔

نمبر۔ pub -75/6-15.　　　ہماچل لوک سمپرک

فلم :- سنکلپ

موسیقی :- خیام

آواز :- مہندر کپور

کب ترے حسن سے انکار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

مسکراتی ہے کبھی آنکھ میں کاجل بن کے
کسی سینے پہ دھڑک اٹھتی ہے آنچل بن کے
کبھی پھولوں کے کٹوروں سے چھلک جاتی ہے
کبھی شعلے، کبھی شبنم سے ٹپک جاتی ہے

کیسے کیسے ترا دیدار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے!

تو ہر اک رنگ ہر اک شے میں نظر آتی ہے
روشنی بن کے ستاروں سے اتر آتی ہے
تیرے جادو، تری خوشبو، تری مسکانوں کو
تیرے مچلے ہوئے، امنڈے ہوئے طوفانوں کو

اپنی سانسوں میں گرفتار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ کو بہت پیار کیا ہے میں نے

تجھ کو چاہا تو، مگر کوئی تقاضا نہ کیا
میں نے بھولے سے ترے پیار کو رسوا نہ کیا
تو بتا میں نے کبھی تجھ سے چرائیں آنکھیں
تیرے چہرے سے کہاں میں نے ہٹائیں آنکھیں

خود کو کب تیرا گنہگار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ کو بہت پیار کیا ہے میں نے

"یہ مختصر انتخاب جاں نثار اختر کے کہے ہوئے فلمی گیتوں سے دیا جا رہا ہے۔ جاں نثار صاحب نہ صرف ایک بڑے شاعر ہیں بلکہ versatile بھی ہیں۔ آج کل فلم انڈسٹری کی سب سے اہم پکچریں مثال کے طور پر "رضیہ سلطان"، "مجنوں"، "پکار"، "جانکیہ اور چندرگپت" وغیرہ کے نغمے لکھ رہے ہیں۔ اُن کے گیتوں کا عوام کو شدومد سے انتظار ہے۔"

(مدیر)

آ جانِ وفا آ

کہتے ہیں کسے پیار، زمانے کو دکھا دے
دنیا کی نظر عشق کے قدموں پہ جھکا دے

آ جانِ وفا آ

آ جا یہ مرا ناز اُٹھانا ہی پڑے گا
جب پیار کیا ہے تو نبھانا ہی پڑے گا
آ دل کے لئے جان کی بازی بھی لگا دے

آ پیار کے طوفان میں لہرا کے چلا آ
ہر قید کو ہر رسم کو ٹھکرا کے چلا آ
عاشق ہے تو ہر چیز محبت پہ لٹا دے

دیوانہ محبت کا کہیں ڈر کے رُکا ہے
دربار میں شاہوں کے کہیں عشق جھکا ہے
خود عشق کے دربار میں شاہوں کو جھکا دے

آ جانِ وفا آ!
آ جانِ وفا آ!!

فلم : انارکلی
موسیقی : وسنت پرکاش
آواز : گیتا رائے

موت آئے گی تو اک پل کی نہ فرصت دے گی
سانس لینے کی بھی کم بخت نہ مہلت دے گی
جیتے جی کس لئے پھر آپ کو ناشاد کریں
زندگی ایک بھی پل کیوں ترا برباد کریں

لمحہ لمحہ یہی اصرار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

O

چھوٹی تسلیوں کی ضرورت نہیں مجھے
کہہ دو کسی کے پیار کی فرصت نہیں مجھے

یہ بھی نہیں کہ میں تمھیں الزام دے سکوں
یہ بھی نہیں کہ تم سے شکایت نہیں مجھے

میں بھی تمہاری یاد کو دل سے بھلا تو دوں
پر کیا کروں کہ دل کی اجازت نہیں مجھے

موسیقی :-
این - دتّہ
آواز :-
آشا

غریب جان کے ہم کو نہ تم مٹا دینا
"تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا"

لگی ہے چوٹ کلیجے پہ عمر بھر کے لئے
ترس رہے ہیں محبت میں اک نظر کے لئے
نظر ملا کے محبت سے مسکرا دینا
"تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا"

نظر تمہاری مرے دل کی بات کہتی ہے
تمہاری یاد تو دن رات ساتھ رہتی ہے
"تمہاری یاد کو مشکل ہے اب بھلا دینا"
"تمہیں درد دیا ہے تمہیں دوا دینا"

لے گا کیا جو یہ دنیا ہمیں ستائے گی
تمہارے بن تو ہمیں موت بھی نہ آئے گی
کسی کے پیار کو آساں نہیں مٹا دینا
"تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا"

فلم: چھو منتر
موسیقی: او۔پی۔نیر
آواز
محمد رفیع، گیتا رائے

بے چین نظر، بے تاب جگر، یہ دل ہے کسی کا دیوانہ
کب شام ہو اور وہ شمع جلے، کب اُڑ کر پہنچے پروانہ

ہے دل کا چمن کھلنے کے لئے
آئے گا کوئی ملنے کے لئے

پھولوں سے کہو تاروں سے کہو چپکے سے سجا دیں ویرانہ

جب ان ذرا شبنم سے دُھلے
لہرائی ہوئی وہ زلف کھُلے

نظروں سے نظر اک بھید کہے، دل دل سے کہے اک افسانہ

رنگین فضا چھائے تو ذرا
وعدے پہ کوئی آئے تو ذرا

اے جوشِ وفا، دل چیز ہے کیا، ہم جان بھی دیدیں نذرانہ
کب شام ہو اور وہ شمع جلے، کب اُڑ کر پہنچے پروانہ

فلم : یاسمین
موسیقی : سی رام چندر
آواز : طلعت محمود

بے مروت، بے وفا، بیگانۂ دل آپ ہیں
آپ مانیں یا نہ مانیں میرے قاتل آپ ہیں

آپ سے شکوہ ہے مجھ کو، غیر سے شکوہ نہیں
جانتی ہوں دل میں رکھ لینے کے قابل آپ ہیں

سانس لیتی ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے مجھے
جیسے میرے دل کی ہر دھڑکن میں شامل آپ ہیں

غم نہیں جو لاکھ طوفانوں سے ٹکرانا پڑے
میں وہ کشتی ہوں کہ جس کشتی کا ساحل آپ ہیں

فلم: سوشیلا
موسیقی: سی۔ ارجن
آواز: مبارک بیگم

بے کسی حد سے جب گزر جائے
کوئی اے دل بچے کہ مر جائے

زندگی سے کہو دلہن بن کے
آج تو دو گھڑی سنور جائے

ان کو جی بھر کے دیکھ لینے دے
دل کی دھڑکن ذرا ٹھہر جائے

ہم ہیں خود اپنی جان کے دشمن
کیوں یہ الزام ان کے سر جائے

میرے نغموں سے اُن کا دل نہ دُکھے
غم نہیں مجھ پہ جو گزر جائے

فلم : کلپنا
موسیقی : او۔ پی۔ نیر
آواز : آشا بھونسلے

زندگی ڈوب گئی درد کے طوفانوں میں
چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا

یہی یادیں کبھی تصویر سی بن جاتی ہیں
ایسا لگتا ہے کہ وہ پاس چلے آئے ہیں
دل یہ کہتا ہے کہ دھوکا ہے تری نظروں کا
وہ کہاں اب تری قسمت میں یہی سائے ہیں
چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا

اشک بن کر مری پلکوں پہ جھلکنے والے
آنسوؤں میں ترا دیدار تو کر سکتی ہوں
جسم مجبور سہی، روح تو مجبور نہیں
میں تجھے پا نہ سکوں، پیار تو کر سکتی ہوں
چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا، کچھ نہ رہا

میرے خوابوں میں خیالوں میں بھٹکنے والے
درد ہی دے کہ مری روح کو آرام ملے
تو اگر مل سکا مجھ کو ترا غم تو ملا
اور کیا مجھ کو مرے پیار کا انعام ملے
چند یادوں کے سوا، کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا

فلم۔ بیس سال پہلے
موسیقی۔ سی ارجن
آواز۔ آشا بھونسلے

کون آتا ہے اِدھر؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں

دور راہوں پہ گھنی رات کے سناٹے میں
کوئی راہی کبھی خاموش گزرتا ہے
آہٹیں دل کی طرح ڈوب کے رہ جاتی ہیں
سانس لیتی ہوں تو ہر درد ابھر آتا ہے

کون آتا ہے اِدھر؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں

کون کرتا ہے یہ چھپ چھپ کے اشارے مجھ کو
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے کہیں آج مجھے
ایک تصویر سی بنتی ہے بگڑ جاتی ہے
اپنی آنکھوں پہ نہیں خود بھی یقیں آج مجھے

کون آتا ہے اِدھر؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں

پاس آ آ کے کہاں دور نکل جاتی ہو
دل کی دھڑکن کی طرح میرے قریب آجاؤ
جھلملاتے ہوئے تاروں سے نہ جھانکو مجھ کو
جگمگا جائے محبت کا نصیب آجاؤ!
آجاؤ، آجاؤ،

فلم: شعلہ و شبنم
موسیقی: خیام
آواز: رفیع
اور
جگجیت کور

دھرتی ہنستی رہے، چھلکے مستی رہے
رنگ ہنسے، روپ ہنسے
کلی کلی پہ دھوپ ہنسے
ہر بار میں بھی ہنستی رہے

دھرتی اور امبر کے دوار
یوں ہنستا ہے رم بار
سورج پگھلے انگنا بیچ
چندا بر سے بن کے پیار
ہنستے گاتے موسم چھائیں بستی رہے
میں بھی ہنستی رہے

کنواری آنچل کو ڈھلکائے
بالک جیسی ہنستی جائے
دینا رد کے لڑکے لاکھ
چھنکے چوڑی گنگنائے
پاؤں میں بجتی پاگل پائل دل کو ڈستی رہے
میں بھی ہنستی رہے

ہنس کر جی لے او ناداں
ہنسنا جینے کی پہچان
ایسا لگتا چاروں اور
خود بھی ہنستا ہے بھگوان
دل کی خوشیاں جتنی مہنگی اتنی سستی رہے
میں بھی ہنستی رہے

فلم: آئینہ
موسیقی: نوشاد
آواز: لتا منگیشکر

تم مہکتی جواں چاندنی ہو
چلتی پھرتی کوئی روشنی ہو
زندگی بھی، روپ بھی، راگنی بھی
جو بھی سوچوں تمہیں، تم وہی ہو

نرم آنچل سے یہ چھنتی خوشبو
میرے ہر خواب پر چھا گئی ہے
جب بھی تم پر نگاہیں پڑی ہیں
دل میں اک پیاس لہرا گئی ہے
تم تو بیچ بیچ چھلکتی ندی ہو
جو بھی سوچوں تمہیں، تم وہی ہو

جب سے دیکھا ہے چاہا ہے تم کو
یہ فسانہ چلا ہے یہیں سے
کب تلک دل بھٹکتا رہے گا
مانگ لوں آج تم کو تمہیں سے

تم کہ خود پیار ہو، زندگی ہو
جو بھی سوچوں تمہیں، تم وہی ہو

موسیقی : خیام
فلم : پیاسے دل
آواز : آشا بھونسلے

دیش ہمارا ایک ہے
بھارت سارا ایک ہے، یہ بھارت سارا ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

دھرتی ہے یہ گوتم کی　　ویر اشوک اعظم کی
دھرتی ہے یہ چشتی کی　　نانک، میرا، تلسی کی
دھرتی ہے یہ باپو کی　　اپنے پیارے نہرو کی
اپنا نعرہ ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

بستی یہ مدھوماس کی ہے　　صدیوں کے اتہاس کی ہے
کوئی نہ اونچا نیچا ہے　　باغ یہ سب نے سینچا ہے
یہ جو ترنگا پرچم ہے　　تہذیبوں کا سنگم ہے
اپنا نعرہ ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

صوبوں کی دیوار ہے کیا　　بھاشا کی تکرار ہے کیا
دین دھرم کی بات ہے کیا　　ذاتوں کی اوقات ہے کیا
دیش دھرم سے اونچا ہے　　ہم نے جس کو پوجا ہے
اپنا نعرہ ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

جب بھی کوئی وقت کڑا　　اپنے وطن پر آن پڑا
جان کو ہم نے وارا ہے　　دشمن کو للکارا ہے
کتنے طوفاں ٹالے ہیں　　دیش کے ہم رکھوالے ہیں
اپنا نعرہ ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

لڑنا ہے اب غربت سے　　بے کاری کی لعنت سے
فاقوں کی ان دھوپوں سے　　کال کے کالے روپوں سے
ظلم کے پھیلے جالوں سے　　پونجی وادی چالوں سے
اپنا نعرہ ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے
بھارت سارا ایک ہے، یہ بھارت سارا ایک ہے
دیش ہمارا ایک ہے

یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے
مجھے گھیر لیتے ہیں باہوں کے سائے

پہاڑوں کو چنچل کرن چومتی ہے
ہوا ہر ندی کا بدن چومتی ہے

یہاں سے وہاں تک ہیں چاہوں کے سائے

لپٹتے یہ پیڑوں سے بادل گھنیرے
یہ پل پل اجالے، یہ پل پل اندھیرے
بہت ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں راہوں کے سائے

دھڑکتے ہیں دل کتنی آزادیوں سے
بہت ملتے جلتے ہیں ان وادیوں سے
محبت کی رنگیں پناہوں کے سائے

فلم: پریم پربت
موسیقی: جے دیو
آواز: لتا منگیشکر

سکھدیو پرشاد۔ آئی۔ اے۔ ایس

جاں نثار اختر سے پہلی ملاقات

ادبی شخصیتوں سے اصلی ملاقات تو ان کی تحریروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ تحریریں ہی وہ آئینے ہیں جن میں ادیبوں اور شاعروں کے صحیح خد و خال نظر آتے ہیں اور ان کا صحیح روپ نکھرتا ہے اور اُن کی شخصیت کے نقوش ابھرتے ہیں۔ زندگی کی چوکھٹ میں کون ادیب کہاں فٹ آتا ہے یہ انداز اس کی تحریروں سے ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے ادیبوں سے اس طرح ملاقات کرنے کا شوق ہے اور اسی شوق نے مجھ سے اکثر لائبریریوں کی خاک چھنوائی ہے اور بک اسٹورز کے چکر لگوا دیئے ہیں۔ جاں نثار اختر بھی ایسا ہی ایک فن کار ہے جس سے میرا تعارف زیر لب، کے خطوط سے ہوا تھا۔ مجھے ان خطوط کے آئینے میں جاں نث[illegible] اختر کی شخصیت کے کچھ بنیادی عناصر نظر آئے تھے اور اُن عناصر سے میں نے اُس کی ایک ذہنی تصویر بنالی تھی۔ یہ اُس محبت کرنے والے شاعر کی تصویر تھی جس کی شریک حیات نے اُسے ایک محبوب کی طرح توچاہا اور پرستش کی وہی آگ دل میں لئے منوں مٹی تلے دب کر اس سے جُدا ہو گئی تھی۔

جاں نثار اختر سے یہ پہلی ملاقات ادھوری تھی۔ اس ملاقات کی تکمیل اُس شام کو ہوئی جب چار پانچ برس پہلے میں اپنے عزیز دوست کشمیری لال ذاکر کے ساتھ چنڈی گڑھ کے وسیع سڑکوں سے نکل کر صرف گھومنے کے لئے کالکا کی طرف نکل گیا تھا۔ میرا یہ دوست میرے بہت سے ایسے لمحوں کا ساتھی ہے جب میں تنہا رہ کر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کرتا ہوں۔ پنجور گارڈنز سے آگے نکلے تو ذاکر نے کہا

بھائی صاحب میں پچھلے دنوں بمبئی میں جاں نثار اختر کے ساتھ کچھ وقت گذار کر آیا ہوں اور اُس سے اُس کی کچھ غزلیں بھی سُنی ہیں۔ کچھ اشعار سُنئے۔

یہ کہہ کر اس نے اختر کی غزلوں کے کچھ اشعار مجھے سُنائے۔ اُن شعروں سے میں نے اختر کی شاعری کے ایک نئے موڑ کو دیکھا۔ حسین سڈول اور نکھرا ہوا موڑ۔ اُن میں سے کچھ اشعار مجھے اب بھی یاد ہیں۔

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے کب سے کھڑی ہے یارو

(۲)

عہد کرتے ہیں ہم اس ترنگے تلے
کھائے ہیں قسم اس ترنگے تلے

ایک ہو جائیں گے ہم وطن کے لئے
دیں گے اپنا لہو ہم چمن کے لئے

اپنا آدرش ہرگز نہ چھوڑیں گے ہم
واسطہ اپنا محنت سے جوڑیں گے ہم

اپنی دھرتی کو جنت بنائیں گے ہم
ہند میں اک نیا دور لائیں گے ہم

عہد کرتے ہیں ہم اس ترنگے تلے
کھا رہے ہیں قسم ہم ترنگے تلے

فلم: ہماری کہانی
موسیقی: سی۔ ارجن
آواز: محمد رفیع اور کورس

دوستوں کے اشتراک سے حالی پارک میں بدل ڈالا تھا۔

یہ ارادہ ہوا کہ اسی حالی پارک میں ایک شاندار کل ہند مشاعرہ کیا جائے۔ کشمیری لال ذاکر سے بات ہوئی تو وہ مسرت سے کھل اٹھا۔ چنانچہ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ اتنا کامیاب مشاعرہ ادھر شمالی ہند میں شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ مشاعرہ رات کے نو بجے شروع ہوا اور صبح ساڑھے تین بجے تک چلتا رہا۔ سننے والے اس وقت بھی پنڈال سے اٹھنے کو تیار نہ تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی اسٹیج سکریٹری تھے اور انہوں نے مشاعرہ بڑی خوبصورتی سے سنبھالا تھا۔

اُس شام کو جب سردار جعفری اور جاں نثار اختر پانی پت پہونچے تو ذاکر نے میرا تعارف اُن سے کرایا تو مجھے واقعی خوشی ہوئی۔ جاں نثار اختر سے یہ میرا ذاتی تعارف تھا۔ میں نے جب اُس شخص کی سوئی سوئی آنکھوں کو دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ کسی غزل کا کوئی گم شدہ شعر تھا۔ مجھے آپ سے آپ اُس کا یہ شعر یاد آگیا۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

مجھے لگا جیسے اُس نے اپنی جلتی ہوئی شخصیت پر بے نیازی کی ہلکی ہلکی دھول جما رکھی تھی۔ گفتگو کرتے وقت اُس کی وہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ وہ کم بولنے اور خاموش رہ سکنے کی کوشش اور بولتے بولتے ایک دم کھو جانے کا انداز مجھے لگا صفیہ نے جس اختر سے محبت کی تھی۔ وہ دراصل یہی اختر تھا جو میرے سامنے بیٹھا تھا اور جسے اپنے فن کی عظمت کا خود بھی صحیح اندازہ نہ تھا۔

اگلے دن جب جاں نثار اختر مجھ سے رخصت ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ اس سے میری پہلی ملاقات جس کا آغاز کئی برس پہلے زیرلب، سے ہوا تھا دراصل اُس روز مکمل ہوئی تھی۔

اور اب میں اُس سے دوسری ملاقات کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس برس بھی حالی پارک میں ۱۳ ر اپریل کو ایک مشاعرہ ہو رہا ہے اب حالی پارک پہلے سے زیادہ دل کش بن چکا ہے۔ اور اب اُسے دیکھ کر کبھی کبھی مجھے اپنے آپ پر بھی رشک ہونے لگتا ہے۔ یہیں پھر ایک حسین شام کا آغاز ہوگا۔ یہیں جاں نثار اختر اپنی معصوم اور بے لوث مسکراہٹ اور خاموش رہنے کی کوشش میں مجھ سے گفتگو کرے گا اور مجھے اُس کا وہ شعر یاد آئے گا۔

یہ شمع کون جلائے، یہ جام کون بھرے
ذرا ذرا سے ترے کام یاد آتے ہیں

اور رات دبے پاؤں گذرتی جائے گی۔ اور مشاعرہ جوان ہوتا جائے گا۔

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو
فاصلہ چند قدم کا ہے منالیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح
خود بخود نیند سی آنکھوں میں گھلی جاتی ہے
مہکی مہکی ہے شب غم تیرے بالوں کی طرح
اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں
دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں
یہ علم کا سودا، یہ کتابیں، یہ رسالے
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کیلئے ہیں

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی دیتا ہے

اور جب میں اور ذاکر چنڈی گڑھ واپس پہونچے تو مجھے محسوس ہوا کہ اب جاں نثار اختر سے میری پہلی ملاقات مکمل ہو چکی تھی۔

لیکن یہ بات بھی غلط نکلی۔

فروری ۷۵ میں مولانا حالی پانی پتی کی یاد میں پانی پت میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا خیال آیا۔ پانی پت کا وہ حصہ جو بالکل بے مصرف تھا اور ایک دم نبلے کا رپڑا تھا میں نے اپنے کچھ رفیق کار

ایک ہمارے دوست تھے شنکر جی! چند ہی دن پہلے داغِ مفارقت دے گئے۔ شنکر جی۔ جامعہ عثمانیہ کی اس پیڑھی سے تعلق رکھتے تھے جس نے مخدوم، میر حسن اور اشفاق (مرحوم) جیسی بڑی شخصیتیں پیدا کیں۔ موجودہ گورنر اڑیسہ اور ہمارے وضعدار بزرگ جناب اکبر علی خاں کے ساتھ مل کر شنکر جی نے عثمانیہ گریجویٹس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام برسوں پہلے ہمارے شہر میں صنعتی نمائش کا اہتمام کیا۔ اور اب یہ نمائش ہر سال بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوا کرتی ہے۔ ایسے کام کے آدمی کے مر جانے پر کتنی آنکھیں اشکبار نہیں ہوئیں۔ لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ والی بات جانے اس سائنسی عصر میں کیوں ختم نہیں ہوتی۔ ہموں کے لئے تو "آج مرے دوسرا دن"۔ لیکن جو نفس زندگی بھر کارِ خیر میں لگا رہتا ہے موت کے بعد بھی لوگ اسے بڑے پیار سے یاد کرتے ہیں۔ شنکر جی کے صاحبزادوں نے یہ سوچ کر کہ شنکر جی کو اردو سے بڑا پیار رہا تھا۔ اُن کی یاد میں محفلِ شعر سجانے کی تجویز لے کر مجھ سے ملے۔ میں نے ہاں کر دی۔ اور مشاعرے کے لئے (۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء) کی تاریخ بھی طے پا گئی۔ لیکن باتوں باتوں میں شنکر جی کے صاحبزادے نے کہا مشاعرہ میں جاں نثار اختر صاحب کو ضرور بلا یئے۔ سورگیہ پتا جی اُن کے کلام کے دیوانہ تھے۔ شنکر جی کی اس ادبی وصیت کی لاج جاں نثار اختر تو رکھ ہی رہے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شنکر جی یادگار مشاعرہ کو دہلی کے شنکر شاد مشاعرہ کی طرح ہر سال منعقد کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

اس داستان کو سنانے کا مقصد یہ تھا کہ جاں نثار اختر خود بھی اندازہ کر لیں کہ حیدرآباد والوں کو وہ کتنے عزیز ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے پڑھتے وقت بھی انہیں کن کن مراحل سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ایک حلقہ تازہ غزل سننے پر مصر، کچھ لوگ "گھر آنگن" کی گھریلو شاعری سننے کے مشتاق، چند دبی دبی آوازیں "گرلز کالج کی لاری" کی فرمائش کر رہی ہیں۔

ان مشاعروں میں جاں نثار اختر گذشتہ سات آٹھ سال سے مسلسل حیدرآباد آ رہے ہیں لیکن وہ جب آتے ہیں مشاعرہ پڑھتے ہی جا نہیں سکتے۔ انہیں مختلف کالجس کے طلباء و طالبات اور ادبی انجمنوں کے نمائندے دو تین دن تک حیدرآباد میں روک رکھتے ہیں۔ صبح میں کالج میں ادبی جلسہ، شام میں کہیں جلسہ، اور رات میں محفلِ شعر۔ جاں نثار اختر صاحب کی حیدرآباد میں مقبولیت کی وجہ ان کی مرنجان مرنج خاموش شخصیت اور اُن کا کلام ہے جو اہلِ حیدرآباد کو بہت پسند ہے۔

اختر۔ رومانیت اور انقلاب کے ایک خوش گوار امتزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری بھی اور ان کی شخصیت بھی۔

انقلاب کو دلہن کے روپ میں پیش کرنے کا حق انہیں خوب آتا ہے۔ جن لڑکیوں کے جھرمٹ کو دیکھ کر انہوں نے گرلز کالج جیسی رومانی نظم لکھی تھی۔ وہ اب مائیں بن چکی ہونگی۔ لیکن اختر کی شاعری پر وقت اور زمانہ کی گرد جمتی ہی نہیں۔ اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے کے بجائے اگر وہ اپنی غزلوں میں اپنے آپ کو ڈھونڈ لیں۔ تو وہ ویسے ہی جوان بلکہ نوجوان نظر آئیں گے۔ جیسے آج سے ۳۰۔۴۰ برس پہلے تھے۔

نہ تو میں اختر کے لئے نیا ہوں اور نہ اختر میرے لئے۔ لیکن ان کی ہر غزل پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ سر سے پیر تک نئے ہیں۔ ★

عابد علی خان
مدیر "سیاست"، حیدرآباد

سراپا نوجوان شاعر

جناب صابر دت گزشتہ چند دنوں سے ہمارے ملک کے اردو کے نامور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے فن اور ان کی شخصیت پر "فن اور شخصیت" ہی کے نام سے ایک ضخیم با تصویر اور خوبصورت رسالہ ممبئی سے شائع کر رہے ہیں، اور اب کی دفعہ انھوں نے میرے عزیز دوست اور اردو کے بلند پایہ شاعر "جاں نثار اختر" کو اپنے رسالہ کا موضوع بنایا ہے۔ بلاشبہ صابر دت کی یہ کاوشیں نئی نسل کے ان ریسرچ اسکالرس کے لئے "انتھالوجی" کا کام دیں گی۔ جو قدیم مکتب خیال کے شعراء اور ادیبوں کے بجائے جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ عصر حاضر کے دانشوروں پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ ایم۔ اے کے مقالے لکھ رہے ہیں۔ ان ادیبوں میں جاں نثار اختر بھی ہیں جن کی عظمتِ فن اور ان کی پُرکشش شخصیت نے انہیں بھی "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے گل" کا مرکز تحقیق بنا دیا۔

اس دورِ آزمائش و ابتلا میں جبکہ ریاست حیدرآباد ہی کیا پورے ہندوستان میں "ترقی پسند" کہلایا جانا پابند سلاسل ہونے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اپنے شہر حیدرآباد میں قائم کردہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے اور میں اس دور سے جناب جاں نثار اختر کو جانتا ہوں جبکہ انہوں نے کوچۂ انقلاب میں قدم رکھا تھا۔ مخدوم، سردار جعفری، مجاز، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور جاں نثار اختر کچھ ایسے نام ہیں جنہوں نے اردو کو اس نئے موڑ سے آگے بڑھایا، جہاں پریم چند اسے چھوڑ گئے تھے۔ انقلابی شاعروں اور ادیبوں کی اس نسل نے نذرل کی طرح زلزلوں اور دہکتے ہوئے لاوہ کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن ان کی نظروں میں، ایک نئی دنیا کی تصویر بھی ابھر رہی تھی جس میں "مہاجن" کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آج کے ہندوستان کا کسان گئودان کے ہوری سے بدلا ہوا تو نظر آتا ہے لیکن مہاجن کی اولاد، نو دولتیہ (Neo-Rich) طبقہ کا روپ دھار کر بڑی عیاری سے اسے لوٹ رہی ہے۔ بات بہت آگے نکل جاتی ہے۔ لیکن جاں نثار کے فن اور ان کی شخصیت کی قد و قامت کو ناپنے کے لئے تو انہیں "اوزان و پیمانوں" کی ضرورت ہوگی۔

ذہنی قربت اور فکری مماثلت کے باوجود، مجھے جاں نثار اختر سے زیادہ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جب وہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ میں شرکت کی دعوت پر حیدرآباد آئے تو میزبان کی حیثیت سے ان سے میرے روابط کافی بڑھ گئے۔ اور آج جب کہ میں یہ چند سطریں ان کی فن اور شخصیت پر نکلنے والے نمبر کے لئے لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں ان کے کس پہلو پر لکھوں۔ وہ تو جیسے سراپا محبت ہیں، منکسر المزاج، حلیم الطبع۔ یہاں حیدرآباد میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جب کسی بڑے مشاعرے کے انعقاد کا اعلان ہوتا ہے تو لوگ دلوں پہلے سے پوچھنے لگتے ہیں جاں نثار بھی آ رہے ہیں نا۔

"آخری لمحہ" — "آخری ملاقات"

جیسی

خوب صورت نظموں کے خالق

جاں نثار اختر

کیلئے

نذرِ خلوص

سپریم جی (فلمساز)

سچترا فلمز — باندرہ، بمبئی ۵۰

کیا آپ جانتے ہیں کہ :-

★ آپ روزن اور ٹرپینٹائن کے بغیر نہیں جی سکتے۔ ملک بھر میں بہترین ہم روزن اور ہم ٹرپینٹائن دستیاب ہیں ؟

★ غسل کے بعد آپ ان کی بدولت خود کو صاف وشفاف اور تازہ دم محسوس کرتے ہیں ؟

★ آپ کے کپڑوں کو صاف وشفاف اور دل کش بنانے میں یہ آپ کی مدد کرتے ہیں ؟

★ یہ آپ کو کھانسی، زخم اور کٹنے جلنے سے نجات دلاتے ہیں ؟

★ آپ کی بیوی اور محبوبہ کی خوشبودار مہک انہیں کی بدولت ہیں ؟

★ یہ آپ کے گھر کو چمکدار اور صاف رکھتے ہیں ؟

★ یہ آپ کے اسپتالوں سے جراثیم کو دور رکھتے ہیں ؟

★ یہ آپ کے طیاروں، کاروں، اسکوٹروں اور سائیکلوں کو ہمہ وقت رواں دواں رکھتے ہیں ؟

★ یہ آپ کے لئے اور آپ کے بچوں کے لئے چکنا کا فذ فراہم کرتے ہیں ؟

ہماچل پردیش اسٹیٹ فاریسٹ کارپوریشن لمیٹڈ

ہر سال درج ذیل اشیا پیدا کر کے ملک و قوم کی خدمت کرتی ہے :

★ ۸۵۰۰ ٹن ہم روزن

★ ۲۲ لاکھ لیٹر ہم ٹرپینٹائن

★ ۲ لاکھ لیٹر ہم فینٹائل اور ہم وارنش

★ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور دوسرے ممالک میں ہم روزن کی بڑی مانگ ہے۔

★ صرف ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران اس نے ۵۵ لاکھ روپے غیر ملکی زرمبادلہ کمایا۔

تفصیلات کے لئے براہ کرم درج ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں :

مینجنگ ڈائریکٹر

ہماچل پردیش اسٹیٹ فاریسٹ کارپوریشن لمیٹڈ

ڈیلو بنک - مال - شملہ - ۱

فون : ۴۱۰۸ اور ۵۲۸۸

NoHP.SFC/4444.



مہندر ناتھ یادگار نمبر کے بارے میں

تین فائدوں والی اسکیم

قومی بچت کا اینیوٹی سرٹیفکیٹ

3,200 روپے اور 6,400 روپے کی رقموں میں دستیاب قومی بچت کے اینیوٹی سرٹیفکیٹ۔

1۔ جمع شدہ رقم مکمل واپس 2۔ سات برسوں تک ہر ماہ مقررہ آمدنی 3۔ میعاد کی تکمیل پر اچھا بونس

یہ آپ کے بچے کی تعلیم یا آپ کے لئے مزید پنشن کی اسکیم ہے:

دو برسوں تک کسی ڈاک گھر میں ہر ماہ 146 روپے جمع کرائیے۔ 36 مہینوں کے بعد آپ کو ہر ماہ 50 روپے ملنے لگیں گے۔ جو 84 مہینوں تک ملتے رہیں گے۔ آپ یہ رقم آٹھ سہ ماہی، چار چھ ماہی یا دو سالانہ قسطوں میں بھی جمع کرا سکتے ہیں۔ اور آپ کو اس تناسب سے کم رقم دینا ہوگی۔ اگر آپ یکمشت رقم جمع کرانا چاہیں تو آپ کو سرٹیفکیٹ کی اصل قیمت یعنی 3,200 روپے ادا کرنا ہوں گے۔ آپ کی اصل جمع شدہ رقم میعاد مکمل ہونے پر آپ کو واپس مل جائے گی اور اپنے ساتھ 120 روپے کا بونس بھی لائے گی۔

آپ اپنی جمع شدہ رقم رکھا کے 84 مہینوں تک ہر ماہ 100 روپے کی آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ یہ رقم یکمشت جمع کرائیں یا اوپر دی گئی قسطوں میں ـــــ میعاد مکمل ہونے پر آپ کو 6,400 روپے ملیں گے اور اس کے ساتھ 2,240 روپے کا بونس بھی ملے گا۔

مشترکہ کھاتوں، نامزدگی اور ایک ڈاک گھر سے دوسرے ڈاک گھر میں کھاتہ منتقل کرنے کی سہولت موجود ہے۔

جمع شدہ رقم اور آمدنی ایک نظر میں

آپ جمع کرائیں (یکمشت)	آپ وصول کریں گے (پانچ برس بعد)	مزید آمدنی (میعاد مکمل ہونے پر)
3,200 روپے	84 مہینوں تک ہر ماہ 50 روپے (کل 4,200 روپے)	اصل جمع شدہ رقم 3,200 روپے + بونس 1,120 = 4,320 روپے
6,400 روپے	84 مہینوں تک ہر ماہ 100 روپے (کل 8,400 روپے)	اصل جمع شدہ رقم 6,400 روپے + بونس 2,240 = 8,640 روپے

تفصیلات کے لیے لکھیے:
قومی بچت کمشنر
پوسٹ بکس 96، ناگپور

davp 76/29

پروفیسر رشید احمد صدیقی ــــ علی گڑھ

مکرمی

تسلیم!

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ جولائی صادر ہوا۔

اس سے پہلے "مہندر ناتھ یادگار نمبر" بھی موصول ہو چکا ہے۔ یاد فرمائی اور عزت افزائی کا شکر گزار ہوں۔ یہ نمبر بے حد خوب صورت اور قابل ستائش ہے۔

میری صحت ایسی نہیں رہی ہے کہ آپ کی فرمائش کی تکمیل کر سکوں۔ شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ــــ دہلی

برادرم صابر دت

آپ سے دو تین دفعہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ آپ مسیحائے اردو بھی ہیں۔ نرے شاعر نہیں، عملی آدمی ہیں۔

"مہندر ناتھ نمبر" اس کا روشن ثبوت ہے۔ حسنِ ترتیب، خوش سلیقگی، حُسن طباعت سب ایک سے ایک بہتر ہیں۔ کس کس چیز کی داد دوں۔ یہ کام بغیر اردو کی محبت کے نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی بے لوث اور بے غرض اور اس میں آپ بلاشبہ صفِ اول میں ہیں۔

آپ کا　　خواجہ احمد فاروقی

ریوتی سرن شرما ــــ دہلی

پیارے صابر

مہندر ناتھ نمبر ملا۔ تم نے مہندر ناتھ کی زندگی کی آرزو کو موت کے بعد پورا کیا۔ یہ مہندر سے تمہاری دوستی اور ثابت قدمی کا ثمر ہے جس کے لئے تم تعریف اور مبارکباد دونوں کے یکساں طور پر مستحق ہو۔ تمہاری محبت اور محنت کو ہمیشہ کامیابی ملے، دل سے یہی دعا نکلتی ہے۔

نمبر کے بارے میں کیا لکھوں۔ مہندر ناتھ کہا کرتا تھا "جو زینا ہے زندگی میں دے دو۔ موت کے بعد دیا تو کیا دیا۔" افسوس ہے کہ عقیدت کا یہ خوبصورت تحفہ دیر سے تیار ہوا۔ ورنہ جس پیار اور سلیقہ سے تم نے چھاپا

جگن ناتھ آزاد ـــــــ سری نگر

محب صادق صابردت
تسلیم

"مہندر ناتھ یادگار نمبر" ملا۔ شکریہ
مہندر ناتھ کی یاد میں جو صفِ ماتم تم نے بچھائی ہے یہ ایک آنسوؤں کی ندی ہے جو تمہارے خلوص دل کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ یہ خاص شمارہ "نام نیک رفتگاں" کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔

نیاز مند
جگن ناتھ آزاد

شکیلہ اختر ـــــــ پٹنہ

پیارے بھائی صابردت
آداب عرض ہے۔

خدا کرے کہ آپ اچھے ہوں۔
آپ کی خدمت میں یہ خط لکھتے ہوئے میں بڑی شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے بہت پہلے آپ کو شکریہ کا خط لکھنا چاہئے تھا۔ اب پہلے تو میں آپ سے معافی مانگوں گی پھر آپ کو اس بات کے لئے مبارک باد پیش کروں گی کہ آپ نے "مہندر ناتھ یادگار نمبر" سچ مچ میں ایک بڑا ہی شاندار نمبر نکالا ہے۔ کاش اتنا حسین اور ساری خوبیوں سے بھرا ہوا نمبر مہندر ناتھ کی زندگی میں نکلتا۔ مگر اس کو کیا کیجیئے گا کہ ہم ہندوستانی باوجود کوششوں کے مردہ پرست ہی ثابت ہوتے ہیں اور اپنی سچی سچائی بارات کا دولہا بےچارہ یہ دھوم دھڑکا ہمیشہ عرش بریں پر سے ہی دیکھا کرتا ہے
دت جی! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میں اس یادگار نمبر کی تعریف لکھوں۔
آپ کی مخلص بہن
شکیلہ اختر

کشمیری لال ذاکر ـــــــ چنڈی گڑھ

"فن اور شخصیت" کا مہندر ناتھ نمبر سال ۱۹۷۵ء کے ادبی میدان میں یقیناً ایک بہت بڑا event ہے۔ مہندر ناتھ کے انتقال پر اُس کے مرتبے کے مطابق اس سے متعلق کوئی ادبی کام کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ اس کا اپنا وجود اور اس کی وابستگیاں اور اس کا خلوص اور ایثار تھا۔
صابردت میرا بھائی ہے اس لئے میں اس کی ذہنی اپج سے اچھی طرح واقف ہوں وہ تو ایک مجاہد ہے جو منزل

مہندر ناتھ کی آنکھوں میں محبت اور خوشی کے آنسو اُبھر آتے۔ کتابت بہت اچھی، گٹ اپ بہت اچھا، سرورق بہت اچھا، پروڈکشن کے اعتبار سے کسی چیز کی کمی نہیں۔ مہندر ناتھ کے نمائندہ افسانے، اس کی تحریر کے نمونے اس نمبر کی سب سے بڑی خوبی ہے اس ایک نمبر میں مہندر ناتھ کے ادب کی بالائی موجود ہے پڑھنے والے اس ایک نمبر سے مہندر ناتھ کے ادب کا چنا ہوا جام انڈیل کر پی سکیں گے۔

ایک بار پھر مبارک

تمہارا

[illegible]

کیفی اعظمی ـــــ بمبئی

صابر

تم نے مہندر ناتھ کے فن اور شخصیت پر بہت اچھا نمبر مرتب کیا ہے۔ بہت خوب۔ اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم سال میں دو مرتبہ کسی نہ کسی فنکار کے فن اور شخصیت پر مسلسل نمبر نکالا کرو گے۔

میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

مخلص

کیفی اعظمی

سہیل عظیم آبادی ـــــ پٹنہ

برادرم صابر دت

آپ کشمیری لال ذاکر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ تو میرے بھی چھوٹے بھائی ہیں۔ ویسے میں اپنے بعد کی پیڑھی کے ہر لکھنے والے کو اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔

مہندر ناتھ کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھ سکا۔ صرف اس لئے کہ وہ مجھے بیحد عزیز تھے۔ ان کی سنجیدگی، شرافت اور صلاحیتوں کا نقش میرے دل پر ہے اگر وہ مجھے عزیز نہ ہوتے تو لکھنا آسان ہوتا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مجاز جیسے عزیز دوست پر آج تک دو سطریں بھی نہ لکھ سکا۔ حالانکہ بیسیوں بار کوشش کی، لیکن اُسے یاد کر کے دل اُداس ہوگیا آنکھیں بھر آئیں۔ اور کچھ نہ لکھ سکا۔ کسی عزیز کی موت کے بعد لکھنا میرے لئے امتحان ہے جس میں ناکام ہو جانا یقینی ہے۔

جاں نثار اختر پر مضمون ضرور لکھوں گا۔ میرے اچھے دوست ہیں۔ خیر ہے کہ اُن کی زندگی میں ہی لکھنا ہے اُن موت کے بعد شاید ناممکن ہی ہوتا۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

خیر اندیش

سہیل

رام لال ——— لکھنؤ

'مہندر ناتھ نمبر' دیکھنے کے بعد اُس کے بارے میں میرے اندر فوری تاثر یہ پیدا ہوا کہ اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ اُن کے مرنے کے بعد ایسا شاندار نمبر ضرور نکالا جائے گا تو آج کئی ادیب فوراً مر جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

اتنا بڑا نمبر شائع کرنے کے لئے میں کس کو مبارک باد دوں؟ نگراں کو، سرپرستوں کو، مدیر کو یا اہلِ قلم حضرات کو جنھوں نے دامے، درمے، قدمے، قلمے ہندوستان میں پہلی بار کسی بھی مرحوم ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایسا شاندار نمبر شائع کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

ہندوستانی ادبیات میں یہ نمبر ہمیشہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل رہے گا۔

آپ کا مخلص

رام لال

سکھدیو پرشاد ——— کرنال

محترمی صابر دت

کل "فن اور شخصیت" کا 'مہندر ناتھ یادگار نمبر' موصول ہوا۔ حیرانی سی ہوئی کہ "نقوش" کے بعد کس کی جسارت کہ ایسے نمبر شائع کریں۔ یہ جان جوکھم کا کام ہے۔ لیکن آپ نے کمال کر دیا۔

اس کا اندازہ میں نہیں لگا سکتا تھا کہ صابر جیسا نحیف اور لاغر انسان اتنے آہنی عزم کا مالک ہے کہ اتنا ضخیم نمبر شائع کرے گا۔

آپ نے بلاشبہ اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ میری مبارک باد قبول کریں۔

آپ کا سکھدیو پرساد

سریندر ناتھ ورما ——— شملہ

پیارے صابر آداب

"فن اور شخصیت" کا 'مہندر ناتھ یادگار نمبر' کل نظر نواز ہوا۔ بہت ہی دیدہ زیب شمارہ ہے۔ ایسا شاندار نمبر نکالنے پر تمہیں داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعی عرق ریزی کا کام تھا۔ تمہارا ہی حوصلہ تھا کہ اس دور میں تم ایک بے مثال نمبر نکال پائے۔ سبھی قلمکار ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ اور پاکستانی ادیبوں کے مضامین اور خطوط نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ میری طرف سے اس بہترین کامیابی پر مبارک باد قبول کرو۔

مخلص:

سریندر ناتھ ورما

کی طرف اکیلے ہی چل پڑتا ہے چاہے اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک سفر ہو یا نہ ہو۔ اس کی نگاہیں اپنی منزل پر جمی ہوتی ہیں۔ اور قدم راستوں کی سنگلاخ زمین پر۔ یہ اسی مجاہد کی ہمت تھی کہ اس نے رات دن بھاگ دوڑ کر کے آخر یہ ادبی محاذ سر کر لیا۔

اب سبھی اس نمبر کی تعریف کر رہے ہیں۔ صابر دت کی لگن اور محنت کو سراہ رہے ہیں۔ کچھ احباب تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان میں کسی رسالہ کا اتنا شاندار نمبر کسی نے ترتیب نہیں دیا۔

مخلص　کشمیری لال ذاکر

ڈاکٹر قمر رئیس ——— دہلی

برادرم صابر دت صاحب

عزیز و مکرم

"مہندر ناتھ یادگار نمبر" آپ نے جس شوق، محنت، سلیقہ اور سوجھ بوجھ سے ترتیب دیا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کاروبار اور شوق کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اس نمبر کے مضامین پڑھ کر مجھے پہلی بار ایک انسان کی حیثیت سے مہندر ناتھ کے قد و قامت کا صحیح اندازہ ہوا۔ صرف یہی نہیں ان کے بہت سے معاصرین مجھے ان کے مقابلے میں بونے سے نظر آنے لگے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس نمبر کا ہیرو خود انسانیت کا ہیرو تھا۔ اس کی ساری زندگی سارا وجود صرف پیار ہی پیار تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ترقی پسند اقدارِ حیات کا امین و محافظ تھا۔

نیاز مند　قمر رئیس

جیلانی بانو ——— حیدرآباد

محترم صابر دت

تسلیم!

"فن اور شخصیت" کا "مہندر ناتھ یادگار نمبر" ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ مہندر ناتھ کی عظیم شخصیت کو آپ کا یہ خراجِ تحسین بہت متاثر کن ہے۔ مہندر ناتھ کے کردار اور شخصیت کی بلندی کے چھپے ہوئے گوشوں کو مجھ جیسے ناواقف لوگوں تک پہونچا کر آپ نے بہت اہم کام کیا ہے۔

مخلص

جیلانی بانو

پریم چند جوہری ——— بمبئی

یہ میری بد قسمتی تھی کہ میں مہندر ناتھ سے کبھی نہیں مل سکا۔ حالانکہ ان کی کہانیاں میں نے پڑھیں، پسند کیں۔ پھر ایک دن اچانک سنا مہندر ناتھ نہیں رہے۔ پھر صابر دت نے جب "مہندر ناتھ نمبر" پڑھنے کو دیا تو پورا پڑھنے پر لگا کہ میں مہندر ناتھ سے ملا بھی ہوں، انہیں اچھی طرح جانتا بھی ہوں۔ ایک عظیم انسان، ایک اچھے افسانہ نگار کو یہ خراجِ عقیدت اس طرح پیش کرنا اس انوکھے ڈھنگ سے ایک بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ جس کے لئے میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پریم چند جوہری

ہفت روزہ بلٹز — بمبئی

چھ ماہی "فن اور شخصیت" کا پہلا شمارہ "مہندر ناتھ یادگار نمبر" کی شکل میں چھپا ہے۔ "سرپرست" اس کے دو منسٹر، دو فلم سٹار، ایک اعلیٰ سرکاری افسر اور صرف دو ادیب ہیں۔ "مجلس مشاورت" ادیبوں پر مشتمل ہے، جن میں سے شاذ ہی کسی نے مشورہ دیا ہو، سوائے ایک دو کے۔

لیکن مدیر صابر دت اور مدیر اعزازی سی۔ ایل۔ کاوش نے جو اردو کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ "اپنے صبر" اور "کاوش" سے مہندر ناتھ نمبر اتنی خوبیوں سے مزین کر دیا ہے کہ ۴۰۴ صفحات کا یہ جنگی سائز کا اردو رسالہ (یعنی مواد کے حساب سے آٹھ دس پاکٹ بکس سے زیادہ) آج کے زمانے میں ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

یہ رسالہ مہندر ناتھ کی زندگی ہی میں اُن کے فن اور شخصیت کا جائزہ لینے کے لئے مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اُن کی بے وقت موت نے اُن کے دوستوں اور اُن کے فن کے مداحوں کو ایک ایسا تازیانہ لگایا کہ لگتا ہے کہ مواد ابل پڑا۔ مگر یہ واقعہ نہیں ہے کہ لوگوں کے آئے ہوئے رسمی افسوس کے خطوط اور پیغامات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ بلکہ واقعی ایک اعلیٰ ادیب کے "فن اور شخصیت" کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا کام ہے جس سے نہ صرف مرنے والے کو خراجِ تحسین دیا جا سکتا ہے بلکہ ایک ادب کو اور (بقول مسز نرگس دت کے) ایک زبان کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ تاریخی نمبر کرشن چندر کے ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے جن کو اس کا "تعارف" یا "دیباچہ" سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہے۔

"ماہ و سال کے حساب مہندر جی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، لیکن انسان، دوستی، دردمندی، حاجت روائی اور کھری سچائی کے اظہار میں مجھ سے بڑے تھے۔"

مہندر ناتھ "چھوٹا بھائی" ضرور تھا، مگر بڑا احساس تھا۔ اس میں اور کرشن چندر میں بڑا فرق یہ تھا کہ کرشن چندر نے فارغ البالی کی حالت میں تعلیم پائی تھی اور اپنا کیریئر شروع کیا تھا لاہور کے ادبی، صحافی اور ریڈیائی ہنگاموں میں۔ اور مہندر ناتھ نے بمبئی آکر یہاں کے تجارتی ماحول میں، یہاں کی اقتصادی کشمکش میں، یہاں کی چالیوں اور گلیوں میں۔ دونوں کے ادب میں بھی یہ فرق بین نظر آتا ہے۔ کرشن چندر کے ہاں نفاست ہے، الفاظ کی جادوگری ہے فراغت ہے اور فیاضی ہے۔ مہندر ناتھ کے ہاں زندگی کو، اس کی کلفتوں کو، اس کے تقاضوں کو بہت قریب سے دیکھا گیا ہے اس لئے اس کے ہاں ایک کھردراپن ہے جو (میرے خیال میں) اس کے فن کو ممتاز کرتا ہے۔ مہندر ناتھ جب "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" لکھتا ہے تو زندگی کے چہرے سے سب نقاب اتار پھینکتا ہے وہ سیکس کو اس کے اصلی اور کھردرے روپ میں دکھاتا ہے۔ جہاں اس کی تجارت ہوتی ہے۔ دلالی ہوتی ہے، استحصال ہوتا ہے۔

کسی تنقید نگار کو فرصت ہو تو وہ بجائے "چھوٹے بھائی" کی لکھائی میں "بڑے بھائی کا اثر" معلوم کرنے کے بجائے کرشن چندر کی بعد کی کہانیوں اور ناولوں پر مہندر ناتھ کے ادبی اثر کا تجزیہ کریں۔"

یوں تو ہندوستان کے تقریباً سب ہی نامور اردو ادیبوں نے حصہ لیا ہے مگر کئی نام ہندی کے ساہتیہ کاروں کے بھی نظر آتے ہیں جو اردو۔ ہندی بھائی چارے کے لئے ایک نیک فال ہے۔

سب سے اچھا سب سے پُراثر مضمون سی۔ ایل۔ کاوش کا ہے جو مہندر ناتھ کے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن میں ان کے رفیق کار بھی۔ اور جو مہندر ناتھ کو اتنے قریب سے جانتے تھے جتنا شاید کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ بہت ہی جذباتی مضمون ہے۔ لیکن جذبات کے پردے میں مہندر ناتھ کی شخصیت، اس کی انسان دوستی، اس کی قربانیاں اس کا ایثار اور اس کا کردار ابھر آیا ہے

فکر تونسوی ——— دہلی

مہندر ناتھ نمبر ——— اردو زبان کے ادبی بحران کو ایک مجاہدانہ چیلنج ہے۔ پانچ سو صفحات کے اس تخلیقی اجتماع نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ اردو ادیبوں کا قافلہ اب بھی زندہ اور متحرک اور رواں دواں ہے، اب بھی وہ سماج کی تہذیب اور آرٹ کا قافلہ سالار ہے۔ اب بھی وہ رجعت قہقہری کو تازیانہ اور صحت مند قدروں کا حدی خواں ہے۔

اور مہندر ناتھ تو اس قافلے کی حرکت و حرارت کا ایک سمبل ہے۔

فکر تونسوی

ڈاکٹر خلیق انجم ——— دہلی

بہت سے وجوہ تھے جن کی بنا پر مہندر ناتھ کو اردو میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ آپ نے فن اور شخصیت کا خاص نمبر نکال کر مرحوم کی فنی خدمات کا جائزہ اعتراف کیا۔ یہ نہ صرف مرحوم کے شایانِ شان ہے بلکہ اردو صحافت کا ایک نیا سنگ میل ہے۔

ایسا معیاری، شاندار اور خوبصورت خاص نمبر اردو صحافت کی تاریخ میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔

خدا آپ کو ہمت اور حوصلہ دے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

کے۔ ایل۔ رپوسوال ——— چنڈی گڑھ

پیارے صابر صاحب

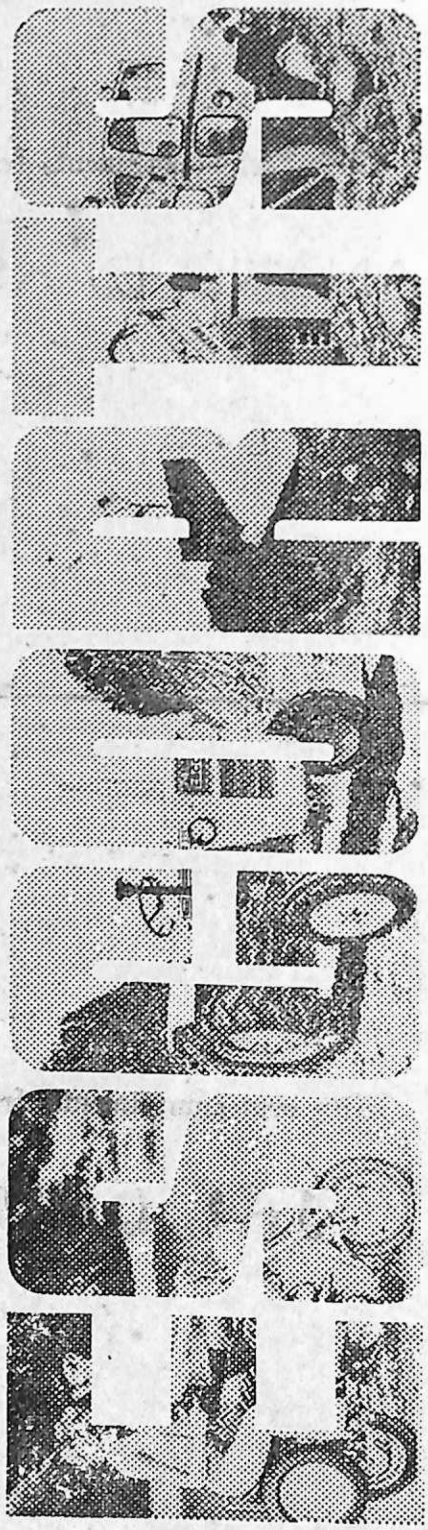
آپ کا خط اور "مہندر ناتھ یادگار نمبر" دونوں ملے۔ بہت بہت شکریہ۔

مجھے یہ نمبر بہت ہی پسند آیا۔

"مہندر ناتھ نمبر" — "نقوش" سے کئی گنا اچھا ہے۔ میں آپ کے پرچے کا معاون ہوں اور کچھ نہ کچھ کروں گا۔ جاں نثار اختر نمبر کے لئے پیغام بہت جلد روانہ کر رہا ہوں۔

آپ کا

کے۔ ایل۔ رپوسوال



اس مہندر ناتھ نمبر میں پاکستانی ادیبوں کی شرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں مہندر ناتھ کو، اس کے فن کو اور اس کی شخصیت کو سب بڑے ادیب جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اس نمبر کے لئے جن پاکستانی ادیبوں نے مضامین لکھے ہیں ان میں محمد طفیل ایڈیٹر "نقوش" لاہور، مرزا ادیب، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور صہبا لکھنوی ایڈیٹر "افکار" شامل ہیں۔

مہندر ناتھ کے مرنے کے بعد ان کے دو دوستوں (صابر دت اور سی۔ ایل۔ کاوش) نے آنا شاندار نمبر نکال کر نہ صرف دوستی کا حق ادا کیا ہے بلکہ مہندر کے ان سوالات کا جواب بھی دیا ہے۔ "کس نے پوچھا ہے؟"

ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً ہر ممتاز اردو اور ہندی کے ادیب اور شاعر نے "کون پوچھے گا"

فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے ممبروں کے دل سے پوچھیے کہ وہ مہندر ناتھ کو اب کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں — اور اگر کوئی پوچھے بھی نے تو فائدہ؟ فائدہ ادب کو ہوا ہے۔ فائدہ اردو ادب کو ہوا ہے (اس نمبر میں مہندر ناتھ کے ایک درجن سے زیادہ افسانے اضافے بھی شامل ہیں) فائدہ اردو زبان کو ہوا ہے، فائدہ ہندوستان کو ہوا ہے۔ فائدہ ہندو پاکستان کی دوستی کے جذبے کو ہوا ہے۔

فائدہ انسانیت کو ہوا ہے ...... کہ ایک شخص جو نہ صرف اونچے درجے کا ادیب تھا، بلکہ اونچے درجے کا انسان بھی تھا۔ اس کی یادگار میں اتنے بہت سے ادیبوں نے مل کر اس کے "فن اور شخصیت" کا چراغ ہمیشہ کے لئے روشن کیا ہے۔ اس شان کے ساتھ۔ اس آب و تاب کے ساتھ!

(خواجہ احمد عباس)

ماہنامہ تعارف ادب —— دہلی

بہت دنوں کے بعد بلکہ تقسیم ملک کے بعد پہلی بار ہندوستانی صحافت میں ایک ایسا قابلِ رشک خاص نمبر دیکھنے میں آیا۔ جو ہر اعتبار سے ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ کیا ترتیب و تزئین، کیا مضامین "نظم و نثر" سب کچھ ہی تو خوب ہے۔ اول تو کوئی کمی نہیں ہے، اگر ہے بھی تو ایسی ہی ہے جیسے چاند میں خوشنما دکھائی دینے والے ہلکے گہرے سائے ہوتے ہیں ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر نامور ادیب اور شاعر اور سربرآوردہ شخصیتیں کسی نہ کسی انداز میں اس خاص نمبر میں شامل ہیں۔ صابر دت کی محنت، کاوش اور سلیقہ کی داد نہ دینا سخت بے انصافی ہوگی۔

سرورق سے لے کر پشتی ورق تک ہر چیز دیدہ زیب اور دلنشیں انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ سرورق تو مہندر ناتھ کی شخصیت اور سیرت کی مانند مسکراتا ہوا، جگمگاتا ہوا اور مہکتا ہوا ہے، تصاویر نصف صدی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ اور مہندر ناتھ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

صابر دت نے بڑی کوشش کی ہے کہ یہ خاص نمبر کسی طرح معنوی اعتبار سے ہلکا نہ رہنے پائے۔ اس لئے انھوں نے ہر طرح سے اسے گراں پایہ بنانے میں کسی قسم کی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مضامین کا حصہ کافی وقیع ہے۔ مہندر ناتھ کی زندگی سے متعلق مضامین سے بہت سی یادداشتوں اور سیرت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے

یہ خاص نمبر بہت زمانے تک یاد رہنے والی خصوصیتوں کا حامل ہے، اور بہت سے ادیبوں کے دل میں اپنے لئے ایسے ہی خاص نمبر کی آرزو پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

(ظفر ادیب)

हिमाचल कला–संस्कृति–भाषा अकादमी, शिमला-९

हिमाचली लेखकों द्वारा लिखित कला-संस्कृति एवं भाषा के क्षेत्र में शोध पूर्ण पुस्तकों की खरीद हेतु अकादमी की अग्रिम खरीद योजना के अंतर्गत निम्नलिखित विषयों पर गत वर्षों मे छपी पुस्तकों के सम्बन्ध में सूचना आमंत्रित है:—

(१) पी. एच. डी. का प्रकाशित शोध-प्रबन्ध जिसमे हिमाचल से सम्बध्द किसी विषय पर विवेचन किया गया हो। (एक पुस्तक)

(२) शोध-पूर्ण पुस्तक (जिसे किसी डिग्री के लिये प्रस्तुत न किया गया हो।) (एक पुस्तक)

(३) हिमाचल की आदिम जातियों से सम्बंधित पुस्तक (शोध ग्रन्थ अथवा उसी स्तर की कोई पुस्तक) (एक पुस्तक)

(४) हिमाचल की कला-संस्कृति-भाषा अथवा इतिहास आदि पर मानक ग्रन्थ। (दो प्रतियां)

इस योजना के अन्तर्गत हिमाचल कला-संस्कृती-भाषा अकादमी २५००/- रुपये के मूल्य की कमीशन काट कर प्रति पुस्तक के हिसाब से प्रति वर्ष पुस्तके खरिदती है, लेखक तथा प्रकाशक अपनी उक्त विषय से सम्बन्धित विचारार्थ प्रस्तुत की जाने वालि पुस्तक की कम से कम एक प्रति निःशुल्क अकादमी कार्यालय को प्रार्थना पत्र सहित भेजने का कष्ट करे (फार्म अकादमी कार्यालय से टिकट का लिफाफा भेजकर प्राप्त किया जा सकता है)। पुस्तक की खरीद का निर्णय अकादमी की पुस्तक मूल्यांकान उपसमिति की संस्तुती पर अधिशासी निकाय द्वारा लिया जाएगा।

इस सम्बन्ध में विस्तृत जानकारी के लिए अधोहस्ताक्षरित से सम्पर्क स्थापित करें:.......

सचिव

हिमाचल कला-संस्कृती-भाषा अकादमी

परिमहल, शिमला-१७१००९. हि. प्र.